لغات
قرآن اور عورت
کی شخصیت

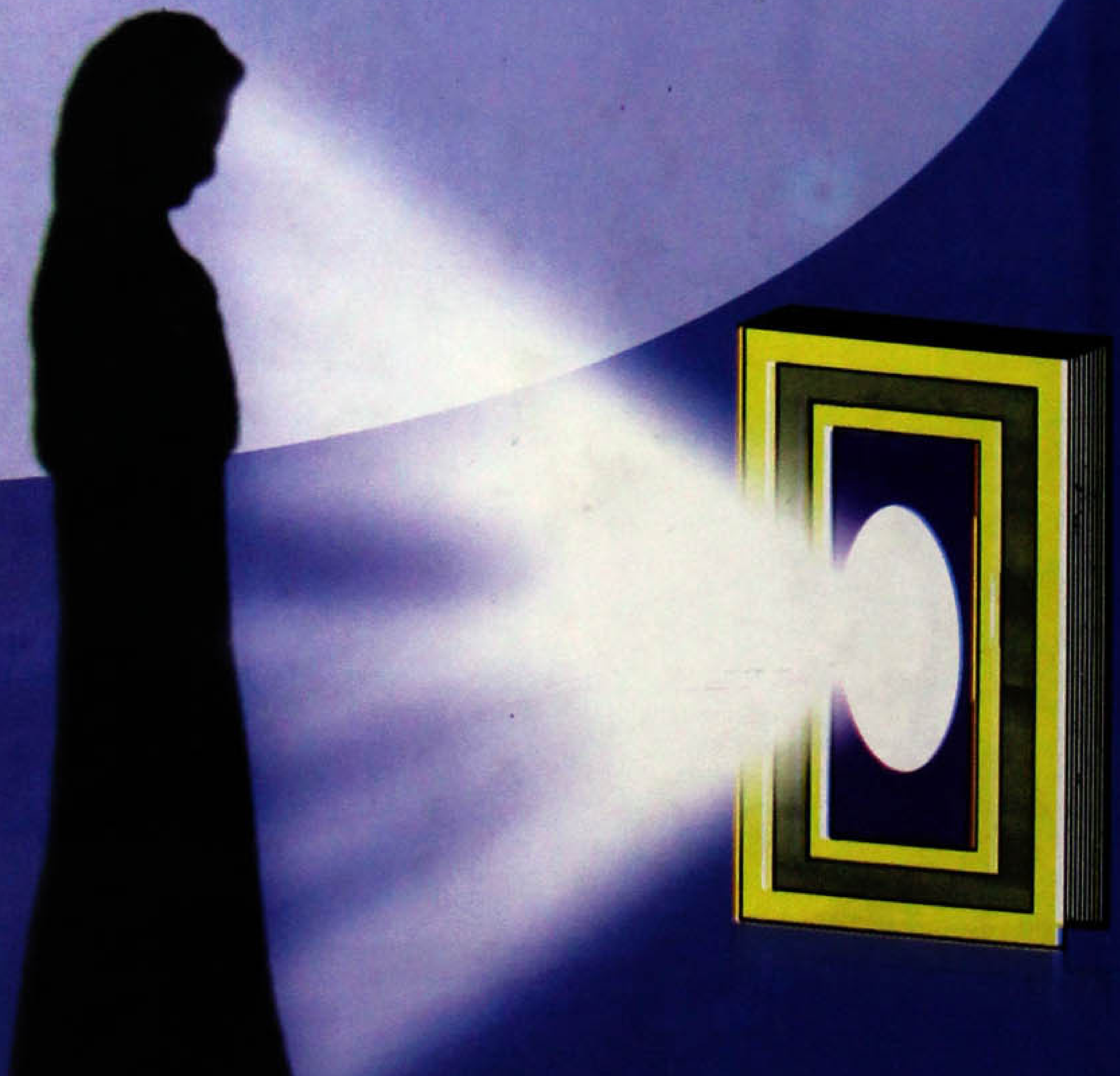

خورشید عالم

لغاتِ قرآن اور عورت کی شخصیت

پروفیسر خورشید عالم

چوہدری غلام رسول اینڈ سنز پبلشرز
الکریم مارکیٹ اُردو بازار لاہور فون: 37233909-37243055

Marfat.com

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں

نام کتاب : لغاتِ قرآن اور عورت کی شخصیت

مصنف : پروفیسر خورشید عالم

کمپوزنگ : سپیڈ گرافکس

ناشر : چوہدری غلام رسول اینڈ سنز پبلشرز

پریس : اے۔ وائی پرنٹرز، آؤٹ فال روڈ لاہور فون: 7151047

اشاعت : 2011ء

قیمت : -/850 روپے

ISBN NO. 978-969-582-103-6

نوٹ:

قارئین سے درخواست ہے کہ ہماری تمام تر کوشش (اچھی پروف ریڈنگ معیاری پرنٹنگ) کے باوجود اس بات کا امکان ہے کہ کہیں کوئی لفظی غلطی یا کوئی اور خامی رہ گئی ہو تو ہمیں مطلع فرمائیں تاکہ آئندہ اشاعت میں اس غلطی یا خامی کو دور کیا جائے۔ شکریہ (ادارہ)

چوہدری غلام رسول اینڈ سنز پبلشرز

الکریم مارکیٹ اردو بازار لاہور فون: 37243055-37233909

Marfat.com

انتساب

استاذِ گرامی و والد مرحوم مولانا نور عالم کے نام

جنھوں نے مجھے قلم پکڑ کر لکھنا سکھایا

اور جو تا دمِ زیست مجھے عربی پڑھاتے رہے۔ **اللھم اغفرہ**

Marfat.com

فہرست مضامین

پیش لفظ 21

دیباچہ 25

باب۔1 أخت (بہن) 33

لغوی مفہوم 33

حقیقی معنی 36

بہن کا مرتبہ اور مقام 38

مجازی معنی 42

باب۔2 الأم (اصل ماں) 45

لغوی مفہوم 45

مجازی معنی 46

امت 50

اُمّی 51

امام 52

اُم موسیٰؑ 55

اُم عیسیٰؑ 61

اُم مریم کی منت 61

حضرت مریم کی پیدائش 63

Marfat.com

حضرت زکریا علیہ السلام کی کفالت 67

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش 72

باب۔3 **اَلمرءَ ۃ۔ امرأ ۃ** (خاتون یا بیوی) 85

لغوی مفہوم 85

المرء یا **امری** کا استعمال (مرد وزن دونوں کے لیے) 85

المرء ۃ بمعنی خاتون 88

من رجالکم (اپنے مردوں میں سے) 89

وان لم یکونا رجلین (اور اگر دو مرد گواہ نہ ہوں) 89

فرجل" وامرأتان (تو پھر ایک مرد اور دو خواتین) 90

ممن ترضون (ان گواہوں میں سے جن پر تم باہم رضامندی کا اظہار کرتے ہو) 90

أن تضل احداھما فتذکر احداھما الأخری (مبادا اگر ان میں سے ایک بھول جائے تو دوسری اسے یاد کرادے) 90

ایک مرد کے ساتھ دو خواتین کیوں؟ 91

کیا اکیلی خاتون گواہی دے سکتی ہے؟ 93

آیت کا صحیح مفہوم 96

خاتون کی شہادت کے بارے میں فقہا کا اختلاف 97

ملکہ بلقیس 99

قابل تقلید مومن خواتین 107

Marfat.com

سیاق وسباق 115
خاتون کا دائرہ کار.................. 129
باب۔4 **الانس** (انسان).................. 132
الناس.................. 132
الانسان.................. 132
قرآن مجید میں انسان (مرد اور عورت) کی مشترکہ خوبیاں اور خامیاں 133
عجلت پسندی اور بے صبری.................. 137
ہر انسان (مرد ہو یا عورت) اپنے کیے کا ذمہ دار ہے 144
بحث کا خلاصہ 154
باب۔5 **الانثی** (مؤنث).................. 156
لغوی مفہوم.................. 156
انثی کے بنیادی معنی 156
تخلیقی اعتبار سے مذکر اور مؤنث میں مساوات.................. 157
خلاصہ 163
مرد اور عورت میں امتیاز 165
دوسرا نقطۂ نظر.................. 166
اعمال کی جزاء وسزا۔ مرد وزن میں مکمل مساوات.................. 169
خلاصہ 174
فرشتے اور اللہ کی بیٹیاں؟.................. 174

Marfat.com

کیا مؤنث گھٹیا ہوتی ہے؟ 176

لڑکیوں کو زندہ درگور کرنے کی رسم 179

باب۔6 **أهل** (بیوی) 192

لغوی مفہوم 192

بیوی کا مرتبہ اور مقام 193

قرآن میں أهل البیت کے معنی 194

خلاصہ 195

باب۔7 **البشر** (انسان) 196

لغوی مفہوم .... [illegible]

تخلیق بشر یا انسان 197

تخلیق کا پہلا مرحلہ 199

تخلیق کا دوسرا مرحلہ 200

تخلیق کا تیسرا مرحلہ 201

تخلیق کا چوتھا مرحلہ 202

تسویہ اور نفخہ ربانی 204

نفخہ الٰہی کی حکمت 205

ملکوتی اور حیوانی صفات یا ارضی وسماوی عناصر میں اعتدال 206

بشر مسجود ملائک 206

بشریت اور رسالت 208

Marfat.com

اعتراضات 208

اعتراضات کا جواب 210

رسول بشر یا رجل (انسان) 214

رجل 214

رجل بمعنی بشر 217

کیا عورت نبی ہو سکتی ہے؟ 222

دلائل 224

مخالف رائے 225

دلائل 225

حضرت مریم کے بارے میں امام قرطبی کی رائے 227

امام ابن حزم اور عورت کی نبوت 228

وحی کا مطلب 228

عورت کی نبوت 229

مریم 230

خلاصہ بحث 232

عورتوں کو رسول کیوں نہیں بنایا گیا؟ 233

باب۔8 **بعضکم من بعض** 235

لغوی مفہوم 235

من ذکر و انثی 237

Marfat.com

بعضکم من بعض 237

واللہ اعلم بایمانکم 239

باب۔9 بنت۔ ابنۃ (بیٹی) 242

لغوی مفہوم 242

بنوآدم 243

شان نزول 246

من ظھورھم (ان کی پیٹھوں سے) 250

أشھدھم علی انفسھم 251

انسان کی عظمت 252

باپ اور بیٹی کا رشتہ 257

باب۔10 حلیلۃ (بیوی) 261

لغوی مفہوم 261

باب۔11 حُور 265

قرآن میں حور کے اوصاف 266

حُورٌ عِین 267

قاصرات الطرف 267

حورانِ بہشت کون ہیں؟ 272

جنت کی نعمتیں کیا صرف مردوں ہی کے لیے ہیں؟ 274

باب۔12 رحم (بچہ دانی) 277

Marfat.com

لغوی مفہوم 277

آیت کا اعراب 278

رَحم کی عظمت 280

جنس کا قرآنی تصور 283

رحمِ مادر اللہ تعالیٰ کے علم، قدرت اور حکمت کا مظہر 283

أولوالأرحام (رشتے دار) 288

قطع رحمی اللہ کی زمین پر فساد پھیلانے کے مترادف ہے 290

رحم مرد اور عورت میں تمیز کی نفی کرتا ہے 292

رحم کا رشتہ اور اس کی حدود 294

باب۔13 **زوج** (جوڑا) 296

لغوی مفہوم 296

زوج 297

کائنات کی ہر چیز میں زوجیت کا قانون 299

کائنات اور فلسفہ زوجیت 302

قرآن حکیم میں نباتات کے زوج (نر اور مادہ) 304

قرآن حکیم میں حیوانات کے زوج 307

جانوروں کا زوج اور نفس واحدہ 307

جانوروں کا زوج بھی انسانوں کی طرح ہم جنس ہے 308

انسانوں میں زوجیت کا تصور 309

Marfat.com

جوڑے اللہ تعالیٰ کی قدرت اور نعمت کے دلائل ہیں 309

زوج (جوڑا) بنانے کی غرض و غایت 311

جوڑے (زوج) کی نفسِ واحدہ سے تخلیق 312

خلق منھا زوجھا 318

حوا کی پیدائش 320

ٹیڑھی پسلی سے حوا کی تخلیق اور شیخین کی روایت 321

نفسِ واحدہ سے تخلیق کی حکمت 323

قرآن حکیم میں نر اور مادہ کا انسانی زوج 323

زوج یا ازواج بیوی کے معنوں میں 331

زوج خاوند کے معنوں میں 331

زوج ہم خیال ساتھی کے معنوں میں 331

لفظ زوج حافظ امام ابن قیمؒ کی نظر میں 336

قرآن حکیم میں لفظ زوج کا بطور فعل استعمال 339

باب۔14 **صاحبة** (ساتھی۔بیوی) 343

لغوی مفہوم 343

صحبت یا ساتھ کی نوعیت 343

باب۔15 **الصالح جمع صالحون** (نیک مرد اور عورت)، 351

صالحة جمع صالحات (نیک عورت) ....

لغوی مفہوم 351

Marfat.com

	صالحات کون ہیں؟	353
	صالحین اور خلافت ارضی	357
	اہل ایمان اور صالح لوگ خواہ مرد ہوں یا عورت	359
باب۔16	**طائفہ** (جماعت۔گروہ)	360
	لغوی مفہوم	360
باب۔17	**عبد** (بندہ،غلام)	364
	لغوی مفہوم	364
	علم اور عباد	367
	شیطان اور عباد	368
	رزق اور عباد	370
	وراثتِ جنت اور عباد	372
	وراثت ارضی اور عباد	373
	نبوت اور عباد	374
	زینت اور عباد	378
باب۔18	**عورۃ** (عیب،شرم گاہ)	380
	لغوی مفہوم	380
	خلاصہ بحث	386
باب۔19	**الفتیٰ** (نوجوان)	388
	لغوی مفہوم	388

Marfat.com

شان نزول	391
پس منظر	392
فتیات	393
بغاء	393
لتبتغوا عرض الحیاۃ الدنیا	394
خلاصہ بحث	395
مسئلے کا حل	396
باب۔20 **فریق** (جماعت۔گروہ)	398
لغوی مفہوم	398
فریق	398
فریقین	398
قوت وضعف کا نظریہ	399
امن وسلامتی کس فریق کے لیے ہے	401
اسلام کا نظام تعلیم	402
آغاز اسلام میں خواتین کی تعلیم	406
تصنیفات	407
باب۔21 **قوم**	410
لغوی مفہوم	410
خلاصہ بحث	420

Marfat.com

باب۔22 مسلم اور مسلمہ، مومن اور مومنہ 421
شانِ نزول 421
عورت کی قدر و قیمت 424
باب۔23 **الناس** (لوگ) 427
لغوی مفہوم 427
مجازی معنی 429
لغوی بحث کا خلاصہ 430
انسان اور انسانیت 431
امت وسط 432
مرغوب چیزوں سے فطری محبت 433
بہترین امت 435
الناس اور ان کو دیے گئے احکام میں مرد اور عورتیں دونوں شامل ہیں 436
احترام آدمی 437
کائنات کا مزاج 439
لفظ الناس بشر کے معنوں میں 440
فطرتِ انسانی 440
انسانوں میں فضیلت کا معیار 441
انسانیت کی بہبود 442
باب۔24 **النساء** (عورتوں کی جماعت) 444

Marfat.com

لغوی مفہوم	444
قرآن حکیم اور جنسی میلانات	444
رفث	449
حرث	454
باب۔25 **نفس**	462
لغوی مفہوم	462
مجازی معنی	462
نفس اور روح	463
نفس انسانی کی انفرادیت۔قرآن کی آخری آیت	465
کوئی نفس اپنی طاقت سے بڑھ کر کسی چیز کے لیے مکلف نہیں	466
کیا نفس ہی روح ہے؟	467
نفس واحدہ سے تخلیق	268
خارجی شہادت	471
قرآن کی داخلی شہادت	473
نفس واحدۃ	476
حواء کی تخلیق	479
جوڑے کے ہم جنس ہونے کی حکمت	482
خلاصہ بحث	484
نفس انسان میں مساوات	484

Marfat.com

شانِ نزول 484

نفس انسانی قرآن کی صداقت کی دلیل 486

نفس کا نگہبان اللہ اور انسان 486

نفس میں ازدواجیت کی صلاحیت اور اس کا نشوونما 488

ازدواجیت 490

ہر نفس اپنے کیے کا خود ذمہ دار ہے 490

نفس کی تین صفات 492

نفس امارہ 492

نفسِ لوّامہ 493

نفس مطمئنہ 494

باب۔26 **ولد** (لڑکا۔لڑکی) 496

لغوی مفہوم 496

ولید 497

والدان 497

بچے کی تربیت میں ماں اور باپ کا اشتراک 498

المولودله 499

اولاد اور وراثت 501

نسلی بیٹے کا اور صرف ماں کے بیٹے کا ایک ہی حکم ہے 502

مرد کا حصہ عورت سے دُگنا کیوں ہے؟ 502

Marfat.com

قتلِ اولاد 505

بیٹیوں کو زندہ در گو کرنا 506

بیٹیوں کے زندہ در گور کرنے اور ضبط ولادت یا خاندانی منصوبہ بندی 507
میں کیا کوئی مشابہت ہے؟ ....

اللہ کی طرف اولاد کی نسبت 510

والدین کے ساتھ حسن سلوک 511

اللہ کی توحید اور عبادت پھر والدین کے ساتھ حسن سلوک 512

حسن سلوک کے خدوخال 515

حسن سلوک کی علت 517

ماں کی فضیلت 518

باب۔27 **ولی** (دوست، مددگار، کارساز) 519

لغوی مفہوم 519

ولایۃ 520

تذکیر و تانیث 520

اردو میں ولی کے معنی 521

مرد اور عورت ایک دوسرے کا جزو 524

مومن مرد اور مومن عورتیں ایک دوسرے کے دوست ہیں 526

اولیاء اللہ کون ہیں؟ 529

کافروں سے ترک موالات کا مفہوم 531

Marfat.com

اہل کتاب سے قتال کا حکم کیوں دیا گیا؟ 531
ترک موالات 532
باب۔28 **الیتیم** (یتیم لڑکے اور لڑکیاں) 534
لغوی مفہوم 534
شانِ نزول 541
بعض مفسرین کے نزدیک عورت غیر عاقل ہے 544
ذلك أدنى أن لا تعولوا 545
امام شافعی کی تفسیر 547
تعدد ازدواج 548
أصل الأصول 551
أو ما ملكت ايمانكم 552
غلامی کا مسئلہ اور قرآن 553
تعدد ازدواج کے نقصانات 555
پس منظر 558
شانِ نزول 558
يستفتونك 558
لا تؤتونهن ما كتب لهن 559

Marfat.com

بسم اللہ الرحمن الرحیم

پیش لفظ

از: جناب ڈاکٹر شیر محمد زمان

سابق وائس چانسلر علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد

سابق چیئرمین اسلامی نظریاتی کونسل، اسلام آباد

برسوں پہلے پروفیسر خورشید عالم سے میری پہلی ملاقات ہوئی تو مجھے اچنبھا ہوا کہ اس مسوٹ، متوٹ ومنکٹ (سوٹ بوٹ نکٹائی میں ملبوس) 'پہلوانِ رعنا' کے اندر عربی وعلوم اسلامیہ کا ایک جید عالم پوشیدہ ہے۔ اپنے عالم و فاضل والد مولانا نور عالم سے کما حقہٗ استفادہ کے علاوہ مغربی منہج میں پروفیسر ڈاکٹر شیخ عنایت اللہ مرحوم اور روایتی اسلامی مکتب کے علما میں مولانا رسول خاں مرحوم جیسے اساتذہ سے شرف تلمذ ان کے لیے بطور سندِ افتخار کافی ہے۔ ایم اے (عربی) کے امتحان میں جامعہ پنجاب سے طلائی تمغہ جات کا اعزاز عربی زبان وادب میں ان کی فضیلت علمی کا نشان ہے۔ پنجاب کے متعدد کالجوں میں عربی زبان وادب کی تدریس کے علاوہ ریاض (سعودی عرب) کی جامعہ محمد بن سعود میں اسی امتیازی شان سے تدریس عربی کا ڈپلومہ اس پر مزید اضافہ ہے۔ سعودی عرب میں کئی سال قیام کے بعد تجدید ملاقات میرے مرحوم ومغفور بزرگ دوست عالمِ درویش پروفیسر حافظ احمد یارؒ کی تدفین (۹ محرم الحرام، ۱۵ مئی ۱۹۹۷ء) کے موقعہ پر ہوئی تو ان کی مزید علمی فتوح کا تذکرہ بھی آیا۔

زیرتالیف سے پہلے ان کی کتاب 'چہرے کا پردہ واجب یا غیرواجب' دار التذکیر، لاہور سے شائع ہو چکی ہے۔ مگر موجودہ کتاب کا افق وسیع تر ہے۔ 'لغات قرآن اور عورت کی شخصیت' کے عنوان کے تحت ۱۲۸ابواب میں خواتین سے متعلق قرآن کریم کے ایسے کلمات ومصطلحات کو باعتبار حروف تہجی جمع کر دیا گیا ہے جس کا کسی پہلو سے عورتوں کے مسائل کے ساتھ کوئی تعلق بنتا ہے۔ اس میں الانسان، البشر، طائفة، عبد، الناس، النفس اور الیتیم جیسے کلمات بھی آ گئے ہیں جو عورتوں کے لیے مختص نہیں مگر عورتیں

Marfat.com

ان میں شامل ہیں۔ ہر باب میں اس لفظ (ولی، عورۃ، اخت وغیرہا) کے معانی و مطالب قرآن کریم میں اس کے محلِ استعمال کی روشنی میں معتبر تفاسیر، صحیح روایاتِ حدیث، ثقہ کتب لغات اور اشعار عرب کے حوالوں سے واضح کیے گئے ہیں۔ عربی زبان پر مؤلف کی گرفت اور عربی ادب و لغت پر ان کی گہری نظر کتاب کے ہر صفحہ سے مترشح ہے۔

فاضل مصنف کا منہج بالعموم عالمانہ و محققانہ ہے، مناظرانہ و مسلکیت پرستانہ نہیں۔ یہ اپروچ قرآنی متون کی صحیح تفہیم میں نہایت مفید رہنمائی فراہم کرتی ہے۔ کسی کلمہ یا اصطلاح کے مفہوم کی تحقیق میں وہ (مصنف) مربوط و متعلق لغوی مباحث کی دقیق اور لطیف تفصیلات کے بعد استثنا جا اپنی رائے کا اظہار بھی کرتے ہیں تاہم کسی کلمہ کے لغوی اور قرآنی مفہوم پر معروضی و مفصل بحث کے بعد اس کلمہ کے حقیقی مفہوم کے بارے میں نتیجہ اخذ کرنے کا بار قاری پر ہی چھوڑ دینا کتاب کے معروضی منہج سے زیادہ قریب و موافق معلوم دیتا ہے۔

فصل مقال میں رجحانی اسلوب کی ایک مثال اُمِ موسیٰؑ کی طرف وحی کی ہے (۲۰، ۳۸، ۴۰، ۹۴)۔ اس ضمن میں مصنف نے امام رازیؒ کی 'اپنی تفسیر میں اس لفظ پر قدرے تفصیل سے خامہ فرسائی' پر استخفاف کے رنگ میں بحث کی ہے۔ امام رازی نے اس آیت سے عورت کی نبوت کے اثبات کا رد کیا ہے اور متعدد توجیہات پیش کی ہیں جن میں بعض واقعی عقل علیم کے لیے قبول نہیں۔ مگر آپ کی بعض خاص معقول واقرب الی الصواب تاویلات کو بھی فاضل مصنف نے درخورِ اعتنا نہیں سمجھا۔ فرماتے ہیں: 'آخر میں اُنھوں نے ایک ایسی بات کہی ہے جو ان کے قول کی تردید کرتی ہے۔ فرماتے ہیں کہ ہوسکتا ہے اللہ نے فرشتہ ان کی طرف نبی کی حیثیت سے نہ بھیجا ہو، بالکل اسی طرح مریم کی طرف بھیجا گیا۔ کم از کم اس سے یہ بات تو ثابت ہوگئی کہ خاتون میں یہ صلاحیت موجود ہے کہ اللہ تعالیٰ فرشتوں کے ذریعہ اس سے ہم کلام ہو۔ رازیؒ کی ناقابل قبول توضیحات کا تمسخرانہ انداز میں ذکر کیے بغیر ان کی اس تاویل کو اثباتی اسلوب میں بیان کر دیا جاتا تو مصنف کے عالمانہ منہج سے اقرب ہوتا۔ مگر وہ شاید صراحت سے کہے بغیر وحی کو 'وحی' (یعنی اس کے لغوی معنی میں نہیں بلکہ اصطلاحی معنی میں) ثابت کرنے کے لیے حتمی لہجے میں کہتے ہیں کہ 'مذکورہ آیات کے الفاظ بتا رہے ہیں کہ یہ وحی ہی تھی الہام یا خواب نہ تھا'۔ آگے چل کر کہتے ہیں: 'اب

Marfat.com

اس تعبیر پر غور کریں 'اس کو ڈال دو' [اقـذفیـه] اس پر دلالت کرتا ہے کہ یہ قول وحی ہے نہ کہ الہام یا خواب۔ پھر اللہ کا یہ وعدہ کہ میں اسے تیرے پاس لوٹاؤں گا اور نبی رسول بناؤں گا، کیا وعدہ الہام یا خواب میں کیا جا سکتا ہے؟ یہ بات صرف وحی کے ذریعے بتائی جا سکتی ہے۔ محض الہام یا خواب کی بنیاد پر کون اپنے گوشۂ جگر کو اپنی آغوش سے نکال کر دریا کی آغوش میں پھینک سکتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ صالحین کے لیے الہام یا خواب (رؤیاءِ صادقہ) کے ذریعے امرِ ربی میں کیا مانع ہے؟ کیا حضرت ابراہیمؑ نے خواب میں اپنے بیٹے کی قربانی کا اشارہ (قرآن، ۳۷:۱۰۲) پا کر اس کی تعمیل کا قصد نہیں فرمایا؟ کیا ان کے فرزندِ ارجمند نے باپ سے اس خواب کا ذکر سن کر 'افعل ماتؤمر' کہتے ہوئے رضاء و تسلیم کا حق ادا نہیں کر دیا تھا؟ حقیقت یہ ہے کہ عورت کے لیے نبوت کے عدم امکان کے ردّ میں فاضل مصنف اس طویل بحث میں چلے گئے ہیں ورنہ 'وحی' کے لفظ سے اس کے لغوی معنی مراد لینے میں تو کوئی مشکل ہے نہ مضائقہ کہ وحی کے کلمہ کی نسبت تو شہد کی مکھیوں کی طرف بھی کی گئی ہے، ارشادِ قرآنی ہے: 'واوحی ربک الی النحل ان اتخذی من الجبال بیوتا'۔ بلکہ یہ لاطائل بحث تو اُم موسیٰؑ کی عظمت کے ضمن میں فاضل مصنف کے مفید لغوی نکات (مثلاً خوف کا تعلق مستقبل سے ہوتا ہے اور رنج و حزن کا ماضی سے) اور ممتا کے جذبات کی حکایت میں ان کے نہایت لطیف اور مؤثر پیرایۂ بیان سے بھی توجہ ہٹا دیتی ہے۔

اسی طرح کبھی فاضل مصنف کسی مسئلہ پر اپنے مؤقف کا دفاع کرتے ہوئے رواداری میں ایسے جملے استعمال کر جاتے ہیں کہ جن کے بارے میں بعض اوقات شدید تحفظات ہو سکتے ہیں حالانکہ وہ عبارات اس کے مؤقف کے اثبات میں کسی ناگزیر تائیدی اہمیت کی حامل نظر نہیں آتیں۔ مثال کے طور پر قتلِ اولاد کے عنوان کے تحت مؤلف کا یہ کہہ جانا کہ 'اولاد صرف وہ ہوتی ہے جو ماں کے پیٹ سے زندہ باہر آ جائے' (ص ۲۰۳) اپنے اندر خوفناک احتمالات رکھتا ہے۔ کیا بطنِ مادر میں جنین (Foetus) کا اسقاط بلا لحاظ مدتِ حمل جائز قرار پائے گا؟ اس صفحہ میں آیۂ کریمہ 'خلقك من تراب ثم من نطفة' (۱۸:۳۷) کے ضمن میں ان کا یہ ملاحظہ کہ 'اللہ نے نطفہ کو انسان (اولاد) نہیں کہا، ایک ادب شناس ماہر زبان کے قلم سے عجیب لگتا ہے۔ کیا یہاں مراحل کے ضمن میں نطفہ کی بجائے انسان کہنا ممکن ہے؟ یا کیا انسان اور اولاد مترادف الفاظ ہیں؟

Marfat.com

دو مرد گواہوں کی عدم موجودگی میں ایک مرد اور دو خواتین کی گواہی کی حکمت پر فاضل مصنف کی بحث خاصی چشم کشا ہے جس میں انھوں نے قدیم و جدید مفسرین کی آراء کی روشنی میں قرآنی حکمت کو واضح کیا ہے (ص ۷۱ و بعد)۔ ضمناً ضلال کے معنی پر بھی مفید بحث آ گئی ہے۔ اسی طرح امرؤ یا المرء کے عمومی استعمال میں بلا لحاظِ تذکیر و تانیث مطلقاً انسان (بشمول عورت) مراد ہونے کے بارے میں آیات قرآنی، کلام عرب اور تاریخی وقائع کے حوالوں سے اطمینان بخش گفتگو کی گئی ہے (ص ۶۵ تا ۶۸)۔

المرأة کے تحت مرد کی طرح عورت کے صاحب رائے (بلکہ صائب الرائے) ہونے کے اثبات میں صلح حدیبیہ کے بعد نبی کریم ﷺ کے جناب اُم سلمہؓ کے مشورہ پر عمل فرمانے اور حقِ مہر کی تحدید کے مسئلہ میں ایک عورت کے اعتراض واستدلال پر حضرت عمرؓ کی اپنی رائے سے رجوع کرنے جیسے دلائل مؤلف کے محققانہ، منصفانہ منہج کی تائید کرتے ہیں۔

الغرض فاضل مؤلف نے خواتین کے متعلق قرآنی مواد (کلمات و مصطلحات) کے معنی و مطالب معتبر کتب لغت، مستند تفاسیر، ثقہ روایات اور اقوال علما و مجتہدین کی روشنی میں بسیار محنت و کاوش کے ساتھ واضح کر دیے ہیں اور اکثر اپنی ترجیح کی تصریح بھی دلائل کے ساتھ کر دی ہے۔ قارئین کو اختیار ہے کہ وہ مؤلف کے استنتاج (Conclusion) سے اتفاق کریں یا نہ کریں۔ پیش کردہ بنیادی مواد کی روشنی میں قارئین کے لیے اپنی آنکھیں اور ذہن کھلا رکھتے ہوئے صحیح نتائج اخذ کرنے کی سہولت پہلی دفعہ اس منفرد و مفید اسلوب کے ساتھ مہیا کر دی گئی ہے اور اس کے لیے مؤلف قارئین و طلاب کی طرف سے تحسین و تشکر کے مستحق ہیں۔

ناچیز
شیر محمد زمان چشتی

Marfat.com

دیباچہ

قرآن حقیقتاً اللہ کا کلام ہے۔ اس کے الفاظ بھی من جانب اللہ ہیں اور اس کے معانی بھی۔ اس کی وسعت اور ہمہ گیری کا تقاضا تھا کہ وہ اس زبان میں نازل ہوتا جو اس کی وسعت کی متحمل ہوتی اور اس کے اعجاز کو اپنے اندر سمو سکتی۔ یہ وسعت عربی زبان میں پائی جاتی ہے۔ فصاحت و بلاغت کے جو پہلو اس زبان میں پنہاں ہیں، اشتقاقات اور مرادفات کی جو کثرت اس میں پائی جاتی ہے۔ لفظی اور معنوی خوبیاں جو اس میں موجود ہیں دوسری سامی اور ایریائی زبانوں کا دامن ان سے خالی ہے۔ جبھی تو قرآن نے عربی کے ساتھ مبین (واضح کرنے والی) کی صفت کا اضافہ کیا ہے اور تبھی تو امیر خسرو کو دوسری زبانوں کے مقابلہ میں اپنی زبان کی خوبیاں بیان کرنے کے بعد کہنا پڑا۔ ع۔ بجز تازی کہ میر ہر زبان است یعنی میری زبان عربی کا مقابلہ نہیں کر سکتی کیونکہ وہ سب زبانوں کی سربراہ ہے۔

الفاظ تصورات کا مظہر ہوتے ہیں۔ اگر ایسی تمام قرآنی آیات یکجا کر لی جائیں جن میں ایک لفظ مختلف مقامات پر حقیقی و مجازی معنوں میں استعمال ہوا ہو تو اس لفظ کے پیکر میں چھپا قرآنی تصور نکھر کر سامنے آجاتا ہے۔ اس طرح قرآن پاک ہر موضوع کے بارے میں مربوط تصور پیش کرتا ہے۔ زیر نظر کتاب میں میں نے وہ تمام الفاظ یکجا کر دیئے ہیں جو قرآن حکیم نے عورت کی ذات اور صفات کے بارے میں استعمال کئے ہیں۔ تاکہ دیکھا جائے کہ ان کے پیکروں میں عورت کی شخصیت اور اس کے مرتبہ و مقام کے بارے میں کونسا مربوط تصور چھپا ہوا ہے۔ قرآن کے الفاظ میں معانی کا ایک سمندر پنہاں ہے۔ میں نے اپنی بساط کے مطابق اس سمندر سے کچھ موتی نکالنے کی کوشش کی ہے۔ ع۔ گر قبول افتد زہے عز و شرف

جب سے عربی زبان سے شناسائی ہوئی اور قرآن حکیم کو سمجھ کر پڑھنا شروع کیا تو ایک سوال ذہن میں بار بار ابھرتا رہا کہ کیا قرآن کے مخاطب زیادہ تر مرد ہیں کیونکہ قرآن کے مفردات اور افعال زیادہ تر مذکر ہی استعمال ہوئے ہیں مؤنث نسبتاً کم۔ یہی خیال قتادہ کی روایت کے مطابق صحابی خواتین اور ایک دوسری روایت کے مطابق حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے ذہن میں آیا تو سورۃ احزاب (۳۵:۳۳) کی آیت نازل ہوئی جس میں مومن مردوں اور عورتوں کی صلاحیتوں کا پہلو بہ پہلو ذکر کیا گیا ہے۔ اس روایت کو امام طبری نے اپنی تفسیر میں بیان کیا ہے۔ جوں جوں عربی ادب اور شعر کا ذوق پیدا

Marfat.com

ہوا اور قرآن حکیم کے اسلوب بلاغت کو سمجھنے کا موقع ملا تو یہ عقدہ کھلا کہ قرآن نے تو انسان کو مخاطب کیا ہے اور انسان میں مرد اور عورت دونوں شامل ہیں۔

قرآن مجید پڑھتے اور سمجھتے وقت علم معانی و بیان کا اسلوب تغلیب پیش نظر رکھنا چاہیے وگرنہ ٹھوکر لگے گی۔

اسلوب تغلیب

علم معانی و بیان میں اسلوب تغلیب کا میدان بڑا وسیع اور متنوع ہے۔ قرآن حکیم میں یہ اسلوب کئی مقامات پر استعمال ہوا ہے۔ کبھی ایک لفظ یا ایک صیغہ میں موجود و غیر موجود اور حاضر و غائب دونوں کو جمع کر دیا گیا ہے جیسا کہ سورۃ بقرۃ (۲:۲۱) میں اور سورۃ اعراف (۷:۸۹) میں ایک چیز ہو چکی ہو اور دوسری کے ہونے کی توقع ہو دونوں کو ایک ساتھ سورۃ بقرۃ (۲:۴) میں شامل کر دیا گیا ہے۔ کبھی عاقل اور غیر عاقل سورۃ شوریٰ میں کبھی ایک چیز کو جو کسی خاص سبب سے وقوع پذیر ہوئی ہو ایک ایسی چیز کے ساتھ جو اس سبب سے واقع نہ ہوئی ہو سورۃ آلِ عمران (۳:۱۸۲) میں جمع کیا گیا ہے۔ کبھی جنس کے بہت سے افراد کا اطلاق اس فرد پر ہوا ہے جو اس جنس سے نہیں جیسا سورۃ اعراف (۷:۸۰) میں فرشتوں کا اطلاق ابلیس پر کیا گیا ہے۔

تغلیب کا ایک انداز وہ ہے جو ہمارے موضوع سے متعلق ہے جو قرآن میں کثرت سے وارد ہوا ہے اور جسے نظر انداز کر کے عورت کے بارے میں غلط تصورات پیدا ہوئے ہیں۔ قرآن کے اکثر اوامر و نواہی مذکر کے صیغہ میں ہیں اور سب کا اتفاق ہے کہ اس میں عورتیں بھی شامل ہیں۔ جیسے وَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ وَارْكَعُوا مَعَ الرَّاكِعِينَ (البقرۃ ۲:۴۳) اے مرد و اور عورتو نماز قائم کرو، زکوۃ ادا کرو۔ لَا تُسْرِفُوا (الانعام ۶:۱۴۱) فضول خرچی نہ کرو۔ فَلَا تُزَكُّوا (النجم ۵۳:۳۲) اپنے آپ کو پاکباز نہ ٹھہراؤ۔ ان جیسی بے شمار آیات ہیں جن میں مذکر کے صیغہ میں مؤنث لازمی طور پر شامل ہے۔ اسی طرح اللہ کا قول وَكَانَتْ مِنَ الْقَانِتِينَ (۶۶:۱۲) مریم فرمانبرداروں میں سے تھی۔ وہ لوط علیہ السلام کی بیوی پیچھے رہ جانے والوں میں سے تھی كَانَتْ مِنَ الْغَابِرِينَ (الاعراف ۷:۸۳)۔ تاکہ موسیٰ علیہ السلام کی ماں مومنوں میں سے ہو جائے لِتَكُونَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ (القصص ۲۸:۱۰)۔ یہاں سیدہ مریم، لوط کی

Marfat.com

بیوی اور موسیٰ علیہ السلام کی ماں کے لیے مذکر کے صیغے استعمال کیے گئے ہیں۔ قنوت اور ایمان مرد اور عورت کی مشترکہ صفت ہے اور چونکہ مرد اور عورت ایک دوسرے کا جزو ہیں۔ (**بعضهم من بعض**) مذکر اور مؤنث پر اس کا اطلاق اس مفہوم کے لیے ہے جس کے لئے اس لفظ کو اصلاً وضع کیا گیا ہے۔ حضرت لوط علیہ السلام کی بیوی میں بھی وہی صفت تھی جو پیچھے رہ جانے والے آپ کے مخالفین میں تھی۔ اس لئے اس کے لیے بھی مذکر کا صیغہ استعمال ہوا ہے۔ یہ صیغہ استعمال کر کے اللہ نے مذکر اور مؤنث میں صفات اور اعمال کے بارے میں کوئی فرق روا نہیں رکھا۔

قرآن حکیم میں اسلوب تغلیب کا استعمال تثنیہ کی شکل میں بھی ہوا ہے۔ جیسے ابوان (ماں باپ)، والدان (والدہ اور والد)، بحرین (میٹھا اور کھارا سمندر) یعنی دو ساتھیوں اور دو ملتی جلتی چیزوں میں سے دوسری چیز کو پہلی جیسی بنا کر اس اسم کا تثنیہ کا صیغہ استعمال کیا جاتا ہے۔ عام طور پر بولنے میں جو لفظ آسان ہو وہ دوسرے پر غالب آتا ہے۔ یا مفرد مرکب پر غالب آتا ہے۔ بعض مفسرین جو مرد کو صرف مرد ہونے کی وجہ سے افضل سمجھتے ہیں ان کا خیال ہے کہ ان صیغوں میں عورت کو تبعیت کے طور پر شامل کیا گیا ہے۔ یہ تصور قطعی طور پر غلط ہے امام سیوطی اپنی کتاب عقود الجمان فی المعانی والبیان صفحہ ۱۳۸ پر فرماتے ہیں کہ اس کا کوئی قاعدہ نہیں بعض اوقات کوئی ادنی اعلیٰ پر غالب ہوتا ہے جیسے عمرین سے عمر اور ابوبکر مراد ہیں۔ عمر کو پہلے رکھا گیا حالانکہ ابوبکر ان سے افضل ہیں۔ اسی طرح قمرین سے مراد چاند اور سورج ہیں۔ قمر کو پہلے رکھا گیا حالانکہ وہ سورج سے ادنیٰ ہے۔ اسلوب تغلیب کی وہی توجیہ ٹھیک ہے جس کا تذکرہ آلوسی نے روح المعانی میں کیا ہے یعنی مرد اور خاتون ایک دوسرے کا جزء لاینفک ہیں اس لئے عورت کے لئے مذکر کے صیغے استعمال کیے گئے ہیں۔ جو خوبیاں اور صلاحیتیں مرد میں موجود ہیں وہی خوبیاں اور صلاحیتیں خواتین میں بھی موجود ہیں۔

علماء نے اس بارے میں اختلاف کیا ہے کہ آیا قرآنی خطاب میں مردوں کے ساتھ عورتیں بھی داخل ہیں؟ اصول فقہ کے بہت سے علما کی یہ رائے ہے کہ مذکر کے صیغے میں داخل ہونے کے لیے مؤنث کے لیے کوئی قرینہ ہونا چاہیے۔ یہ بحث بدرالدین محمد بن عبداللہ الزرکشی کی کتاب البرھان فی علوم القرآن (۳۰۲:۳) اور امام الحرمین الجوینی کی کتاب البرھان فی اصول الفقہ (ص ۳۵۱) میں دیکھی جا سکتی ہے۔ بجائے اس کے کہ وہ یہ بات کہتے کہ جمع مذکر سالم کے صیغوں میں مؤنث کا صیغہ تغلیباً شامل ہوتا ہے اور

Marfat.com

اس کے خروج کے لیے قرینہ ہونا چاہیے۔ انہوں نے اُلٹ بات کہی ہے۔ اس رائے کا عکس قران کی تفسیروں میں دیکھا جاسکتا ہے جہاں عورت کو مرد سے کم تر دِکھایا گیا ہے۔ مثال کے طور پر وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَاءَ أَمْوَالَكُمُ (النساء ۴:۵) میں السُّفَهَاءَ (بیوقوف) کی تفسیر ابن کثیر نے عورتیں اور بچے کی ہے۔

علما نے اس رائے کی غلطی کی طرف اشارہ کیا ہے:

امام ابن حزم الاحکام فی اصول الأحکام (۳:۳۲۷) میں فرماتے ہیں کہ اللہ کے رسول ﷺ مردوں اور عورتوں کی طرف مساویانہ طور پر مبعوث تھے۔ اللہ اور اس کے نبی کا خطاب دونوں کے لیے ایک جیسا تھا عورتوں کو چھوڑ کر مردوں کے ساتھ کسی حکم کی تخصیص صرف اس صورت میں جائز ہے جب کوئی قطعی نص ہو یا اس پر اجماع ہو کیونکہ یہ ظاہر کی تخصیص ہے جو نا جائز ہے۔

ابن رشد بدایۃ المجتھد (۱:۱۷۲) میں مرد اور عورت سے شارع کے خطاب کے سلسلے میں مکمل مساوات کا اقرار کرتے ہوئے فرماتے ہیں: 'اصلاً دونوں کا حکم ایک جیسا ہے سوائے اس بات کے، کہ اس بارے میں کوئی شرعی فرق ثابت ہو جائے'۔

حافظ ابن قیم اعلام موقعین (۱:۷۲) میں فرماتے ہیں: 'عرف شارع میں یہ بات ثابت شدہ ہے کہ اگر مذکورہ احکام کے لیے مذکر کا صیغہ مطلقاً استعمال ہو اور عورت کا اس میں کوئی ذکر نہ ہو تو بھی اس صیغے میں مرد اور عورت دونوں شامل ہوں گے'۔

ابن العربی احکام القران (۴:۲۱۹۳) میں فرماتے ہیں: 'قرآنی خطاب میں عورتوں کا علیحدہ ذکر محض تاکید کے لیے ہوتا ہے'۔

اس کتاب کا طرزِ تحقیق یہ ہے کہ اس میں ان تمام الفاظ کو حروفِ تہجی کے اعتبار سے جمع کر دیا گیا ہے جو قرآن حکیم میں صرف عورت، ماں، بہن، بیٹی اور بیوی کے لیے وارد ہوئے ہیں۔ توجہ طلب بات یہ ہے کہ ماں بہن بیٹی کے لئے قرآن میں عربی زبان کی مانند صرف ایک ہی لفظ وارد ہوا ہے جبکہ بیوی کے لئے اسم ذات امرأۃ کے علاوہ چار صفاتی نام بھی وارد ہوئے ہیں جن کو قرآن نے اسم ذات کی جگہ استعمال کیا ہے۔ مثلاً اھل (اہلیہ، گھر والی) حلیلۃ (ایک ساتھ رہنے والی) زوج (جوڑا) صاحبہ (ساتھی)۔ خاندان کی شیرازہ بندی میں بیوی کی اہمیت کے پیش نظر قرآن نے وہ صفات ظاہر کر دی ہیں جو

Marfat.com

اس کی شخصیت، مرتبہ و مقام اور میاں سے اس کے تعلق کی نوعیت کو ابھار کر آنکھوں کے سامنے لے آتی ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ ان اسمائے جمع (Collective Nouns) کا ذکر کیا ہے جن میں مرد اور عورت دونوں شامل ہیں جیسے انس، انسان، ناس، أناس، طائفة، فریق، قوم یا ایسے الفاظ جو مذکر اور مؤنث کے لیے یکساں استعمال ہوتے ہیں جیسے بعض، عبد، نفس، ولد، ولی اور یتیم۔ ذہن میں تھا کہ ان تمام ضمائر اور اسمائے اشارہ کا بھی ذکر کردوں جو قرآن حکیم میں مؤنث استعمال ہوئی ہیں اور ان دینی اجتماعی اور معاشرتی مسائل کا ذکر کروں جن کی طرف وہ اشارہ کرتی ہیں اس کے لیے معجم الادوات والضمائر فی القرآن الکریم مطبوعہ مؤسسة الرسالة بیروت خریدی مگر موضوع میری طاقت سے زیادہ پھیل چکا تھا اس لیے ہمت جواب دے گئی۔ ہوسکتا ہے کہ کوئی قرآن کا طالب علم یہ کام کرڈالے۔ بہرکیف قرآن کے جن مفردات کا ذکر میں نے کتاب میں کیا ہے وہ عورت کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالنے کے لیے کافی ہیں۔

ہر لفظ کی پہلے لغوی تشریح کی گئی ہے اس سلسلہ میں زیادہ تر انحصار احمد بن فارس بن زکریا (التوفی ۳۹۵ھ) کی معجم مقاییس اللغة اور امام راغب اصفہانی (۵۰۲ھ) کی مفردات القرآن پر کیا گیا ہے۔ پہلی کتاب میں ہر لفظ کا مادہ بتایا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ اگر مادہ میں فلاں حروف مثلاً ہمزہ اور باء ہوں تو فلاں بنیادی معنے ہوں گے۔ دوسری کتاب قرآن کے الفاظ کی مستند اور جامع لغت کے طور پر واحد دستیاب کتاب ہے جس سے ابن حجر اور علامہ عینی جیسے شارحین استفادہ کرتے رہے ہیں۔ یہ اسی سلسلہ کی بہترین کتابوں میں سے ہے۔ ان کتابوں کے علاوہ میں نے جوہری (متوفی ۳۹۳ھ) کی صحاح، ابن منظور (۶۳۰ھ) کی لسان العرب، مجدالدین فیروزابادی (۷۲۹ھ) کی القاموس المحیط، فیومی (۷۷۰ھ) کی المصباح المنیر اور Lane کی Lexicon سے استفادہ کیا ہے۔ Lane کی لغت اس لحاظ سے منفرد ہے کہ اس میں لغت کی امہات الکتب کا خلاصہ پیش کیا گیا ہے۔ ان کتابوں کے علاوہ میں نے ان تفاسیر کی طرف بھی رجوع کیا ہے جن کے لکھنے والے مفسر ہونے کے ساتھ ساتھ لغت کے بھی امام تھے۔ مثلاً الفرا (التوفی ۲۰۷ھ) اور اخفش (التوفی ۲۱۰ھ) کی معانی القرآن، ابن قتیبہ دینوری (التوفی ۲۷۷ھ) کی القرطین، امام زمخشری (التوفی ۵۳۸ھ) کی اساس البلاغة اور تفسیر کشاف، ابوحیان اندلسی (التوفی ۷۴۵ھ) کی البحر المحیط اور بیضاوی (التوفی ۷۹۱ھ) کی انوار التنزیل۔

Marfat.com

میں نے پہلے سورۃ کا نمبر دیا ہے پھر آیت کا۔ اس لیے میں حوالہ دیتے وقت نہ میں نے تفسیر کے مقامِ طباعت کا ذکر کیا ہے نہ سالِ طباعت کا بلکہ صرف تفسیر یا مفسر کے نام کو کافی سمجھا ہے۔ زیرِ نظر آیت کے تحت حوالہ آسانی سے ڈھونڈا جاسکتا ہے۔

معنوی تشریح میں، مَیں نے امام راغب کی مفردات کے اصول منہج کی پیروی کی ہے۔ سب سے پہلے ہر لفظ کے جوہری معنی متعین کیے ہیں اور ان معانی کو پیشِ نظر رکھا ہے جو نزولِ قرآن کے وقت سمجھے جاتے تھے۔ یہ دیکھنے کے لیے کہ نزولِ قرآن کے وقت عرب ان الفاظ سے کیا معنی مراد لیتے تھے عربی شعراء اور محاورہ کی طرف رجوع کرنا ناگزیر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ علما نے عربی اشعار اور محاورے کو شاہد اول کے طور پر تسلیم کیا ہے کیونکہ عربی زبان کا تمام ذخیرہ شعراء کے کلام میں محفوظ ہے۔ امام ابن تیمیہ نے اصول التفسیر کے مقدمہ میں ابن عباس کا قول نقل کیا ہے: الشعر دیوان العرب فاذا تعاجم علینا شئی من القرآن رجعنا الیہ یعنی شعر عربوں کا دیوان ہے اگر ہمارے لیے قرآن کا کوئی لفظ مبہم ہوتا تو ہم اس کی طرف رجوع کرتے۔ عربوں کے یہاں نثر کی کوئی کتاب موجود نہیں تھی۔ اس اعتبار سے قرآن نثر کی پہلی عربی کتاب ہے۔ البتہ زمانہ جاہلیت کے اشعار جو پہلے روایت کی شکل میں موجود تھے اب مدون شکل میں موجود ہیں۔ صحابہ کرام قرآنی الفاظ کو سمجھنے کے لیے اشعار ہی سے مدد لیتے تھے۔ علامہ عطار جوہری صحاح کے مقدمہ میں لکھتے ہیں وکانوا یستعینون بالشعر و کلام العرب لبیان معانی القرآن و کان اول اتجاہ للعنایۃ اللغویۃ (مقدمہ صحاح ص ۴۲) صحابہ قرآن کے معانی بیان کرنے کے لیے عربی شعراء اور محاورے سے مدد لیتے تھے۔ سب سے پہلے لغت کی طرف محض دینی مقصد کے لیے توجہ دی گئی۔ یہی وجہ ہے کہ غریب القرآن نامی سب سے پہلی کتاب عبداللہ بن عباس کی طرف منسوب ہے۔ امام بخاری نے اپنی صحیح میں اس کتاب پر اعتماد کیا ہے اور امام احمد بن حنبل نے اس کی تحسین کی ہے۔ بروکلمن نے تاریخ ادب العرب میں اس کتاب کے بعض خطی نسخوں کی نشاندہی کی ہے۔ عربی شعر اور محاورہ کو بطور شاہد پیش کرنے میں حضرت ابن عباس کو ممتاز حیثیت حاصل تھی۔

مجاہد نے ابن عباس سے روایت کی ہے کہ فاطر السمٰوات کا صحیح مفہوم میرے ذہن میں نہیں آرہا تھا کہ دو بدو ایک کنویں کے بارے میں تنازعہ میرے پاس لائے۔ ان میں سے ایک حق ملکیت کو جتانے کے لیے کہنے لگا۔ انا فطرتھا اس کنویں کو پہلی مرتبہ میں نے کھودا۔ یہ بات سن کر میری مشکل

Marfat.com

حل ہوگئی۔ حضرت عمر کے زمانہ میں جب عربوں اور غیر عربوں کا میل جول بڑھا تو حضرت عمر مدینہ والوں سے کہا کرتے تھے کہ اگر قرآن سمجھنا چاہتے ہو تو کچھ دن صحرا میں بدؤں کے ساتھ گزارو۔ کیونکہ جس زبان میں قرآن حکیم نازل ہوا ہے وہ زبان ان کے ہاں اصل شکل میں موجود ہے۔ یہ الفاظ قرآن کریم میں زیادہ تر انہی معنوں میں استعمال کیے گئے ہیں جن میں وہ عربی اشعار اور محاورے میں استعمال ہوتے تھے۔ اس لیے علماء تفسیر نے شعر اور عربی محاورے کو شاہد اول کے طور پر پیش کیا ہے۔

قرآنی الفاظ کو سمجھنے کا ایک ماخذ خود قرآن حکیم ہے۔ قرآن کا ایک حصہ دوسرے کی خود تفسیر کرتا ہے۔ قرآن کے ایک مقام پر اگر اجمال ہے تو دوسرے پر تفصیل ہے۔ اگر ایک جگہ تعمیم ہے تو دوسری جگہ تخصیص ہے۔ اگر مختلف آیات میں استعمال ہونے والے ایک لفظ کو یکجا کر دیا جائے تو اس لفظ کے معانی خود بخود واضح ہو جاتے ہیں اور اس کا قرآنی تصور نکھر کر سامنے آ جائے گا۔ اس سلسلہ میں، میں نے عربی تفسیر کی کم و بیش تمام قدیم و جدید کتابوں سے استفادہ کیا ہے۔ اردو کی ان تفاسیر کی طرف رجوع کیا ہے جن کے لکھنے والوں کا عربی زبان کا ذوق مسلم ہے۔ مثلاً مولانا حمید الدین فراہی، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا امین احسن اصلاحی، اور بیان القرآن کے مصنف مولانا محمد علی۔

مفتی محمد عبدہ نے تفسیر المنار کے مقدمہ میں قرآن فہمی کے سلسلہ میں بڑی اہم باتوں کا ذکر کیا ہے جن کا خلاصہ یہ ہے کہ اکثر مفسرین قرآن کریم کے الفاظ کا ترجمہ ان اصطلاحات کی رو سے کرتے ہیں جو پہلی تین صدیوں میں ملت میں رواج پا چکی تھیں۔ اس سلسلہ میں بہتر طریقہ یہ ہے کہ خود قرآن سے مدد لی جائے اور مکرر آنے والے الفاظ کا قرآن میں مطالعہ کیا جائے کیونکہ القرآن یفسر بعضه بعضا قرآن کا ایک مقام دوسرے کی تفسیر کرتا ہے۔ سب سے پہلے لفظ کے مادہ کے بنیادی معنوں کا تعین کیا جائے اس کے بعد دیکھا جائے کہ عربوں کے کلام میں اس کا استعمال کن معنوں میں ہوا ہے۔ پھر یہ دیکھا جائے کہ قرآن کریم میں وہ لفظ کہاں کہاں کن کن معنوں میں استعمال ہوا ہے۔

قرآن کے بعد ایک اہم ماخذ حدیث ہے اہل تحقیق نے قرآن کے کسی لفظ کی تشریح کے لیے صرف اس روایت باللفظ پر اعتماد کیا ہے جس کی نسبت نبی کریم ﷺ سے ثابت ہو۔ روایت باللفظ کی تعداد روایت بالمعنی کے مقابلہ میں بہت ہی قلیل ہے۔

اگر تفسیری روایات مستند ہوتیں تو امام احمد بن حنبل کے پایہ کے محدث کو یہ کہنا نہ پڑتا۔ ثلاثة ليس

Marfat.com

لھا اصل: التفسیر، الملاحم والمغازی (موضوعات ملاعلی قاری ص ۸۵) یعنی تین قسم کی روایات بے بنیاد ہیں۔ تفسیر، ملاحم (قتل وغارت) اور غزوات۔

زیر نظر کتاب میں میں نے یہی طرز تحقیق اختیار کیا ہے جس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔ اردو زبان میں عربی کے بہت سے الفاظ اپنے اصل معانی سے مختلف معانی میں استعمال ہوتے ہیں۔ زیر نظر کتاب میں، مَیں نے بطور خاص ایک ایسے لفظ سے بحث کی ہے جو قرآن حکیم میں عیب، خلل اور شرم گاہ کے معنوں میں استعمال ہوا ہے مگر اردو زبان میں اسے خاتون کے لیے اسم جنس کے طور پر چسپاں کیا گیا ہے۔ میری مراد لفظ عورۃ (اردو عورت) سے ہے۔ یہ فخر صرف اردو زبان کو حاصل ہے کہ اس نے سنسکرت ہندی اور فارسی کے خوبصورت الفاظ کی بجائے اس تحقیر آمیز لفظ کو نوع بشر کے لیے ایسے رائج کیا ہے کہ اسم ذات کے طور پر اس کا کوئی بدل نہیں ملتا۔

ناسپاسی ہوگی اگر میں اپنے دو فاضل دوستوں کا ذکر نہ کروں جو قدم قدم پر محبت وخلوص کے ساتھ میری مدد کرتے رہے۔ میری مراد جناب عبدالستار غوری صاحب اور جناب سید منظور الحسن صاحب مدیر اشراق سے ہے۔ غوری صاحب نے حسب معمول اس کتاب کی طباعت کا راستہ ہموار کیا۔ کمپوزر مہیا کیا اور ساتھ ساتھ رہنمائی بھی کرتے رہے۔ سید منظور الحسن صاحب نے کمپوز شدہ کتاب کا ابتداء سے لے کر انتہا تک مطالعہ کیا۔ زبان کی نوک پلک درست کی اور املا کے بارے میں مفید فنی معلومات تجویز کیں۔ مَیں قرآن کالج کے اپنے دیرینہ رفیق کار حافظ نذیر احمد ہاشمی صاحب کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں کہ انہوں نے پوری کتاب پر نظر ثانی کر کے مجھے قیمتی مشوروں سے نوازا (عربی گرامر اور حنفی فقہ پر ان کی گرفت بڑی مضبوط ہے)۔ جب تک سانس میں سانس ہے میں ان تینوں کے لیے دعا گو رہوں گا۔ جزاھم اللہ خیرا۔

ایک طویل عرصہ تک والد مرحوم کی شاگردی اختیار کر کے کم وبیش تیس برس تک پنجاب کے کالجوں میں عربی پڑھانے اور سعودی عرب کے دارالحکومت ریاض میں تعلیم اور ملازمت کے سلسلہ میں ۱۹ برس بتانے کے باوجود اپنے آپ کو عربی زبان اور خصوصاً قرآن کریم کا ایک ادنیٰ طالب سمجھتا ہوں۔ عیب سے پاک ذات اللہ کی ہے۔ اگر کوئی صاحب علم محض علمی بنیاد پر میری کسی غلطی کی نشاندہی کرے گا تو اسے بسر وچشم قبول کروں گا۔

پروفیسر خورشید عالم

Marfat.com

أخت (بہن)

لغوی مفہوم

المفردات اور لسان العرب کے قول کے مطابق 'اخ' اور 'اخت' کا مادہ 'أخو' ہے اور 'اخت' کے آخر میں جو 'تا' ہے وہ مؤنث کی 'تا' نہیں بلکہ آخر سے 'واو' کو حذف کر کے اس کے بدلے 'تا' لائی گئی ہے۔ اس کی جمع 'اخوات' ہے۔ لفظ 'اخ' ایک قول کے مطابق 'آخِيّة' سے مشتق ہے۔ 'آخِيّة' جس کے معنی ہیں: 'وہ رسی یا کھونٹا' جس سے جانور کو باندھا جاتا ہے۔ اس اعتبار سے اس میں لزوم اور وابستگی کا مفہوم پایا جاتا ہے۔ لسان العرب میں بعض نحویوں کا قول نقل کیا گیا ہے کہ 'اخ' یا 'اخت' کا مادہ 'وَخى' ہے جس کے معنی ہیں: 'قصد کرنا'۔ گویا کہ اس میں ہم مقصد اور ہم مشرب ہونے کا مفہوم پایا جاتا ہے۔

بنیادی طور پر لفظ 'اخ' (بھائی) اور 'اخت' (بہن) اس شخص کے لیے بولا جاتا ہے جو ماں باپ دونوں کی طرف سے یا کسی ایک کی طرف سے ولادت یا رضاعت میں شریک ہو۔ لیکن مجازی طور پر اس کا اطلاق ہر اس شخص پر ہوتا ہے جو دوسرے کے ساتھ دین یا قبیلے یا صفت یا معاملہ یا محبت یا اور کسی تعلق میں شریک ہو۔

بہن کا رشتہ اور مقام تمام ادیان سماوی میں اور تمام انسانی معاشروں میں تسلیم شدہ ہے۔ بھائی اور بہن کا رشتہ خلوص، محبت، ایثار اور پاکیزہ جذبات پر برابری کی سطح پر قائم ہوتا ہے۔ بہن بھائی پر اور بھائی بہن پر اپنی جان نچھاور کرنے سے گریز نہیں کرتا۔ یہ رشتہ ازلی اور ابدی ہے اور زندگی بھر قائم رہتا ہے بلکہ انسانی معاشرے میں دیکھا گیا ہے کہ شادی کے بعد بھائی کی طرف سے یہ بندھن ڈھیلا پڑ جاتا ہے جبکہ بہن کی طرف سے یہ بندھن شادی کے بعد مضبوط تر ہو جاتا ہے۔

قرآن حکیم میں 'اخت' کا لفظ اپنے حقیقی معنوں میں بھی استعمال ہوا ہے اور مجازی معنوں میں بھی۔ قرآن حکیم نے بھائی اور بہن کے تعلق کو نہ صرف تسلیم کیا ہے بلکہ اس نے اس میں دو طرح سے نیا رنگ بھرا ہے۔ ایک تو اس نے متعدد مقامات پر 'اخ' (بھائی) اور اس کی جمع 'اخوان' اور 'اخوۃ' تذکیر و تانیث کی تمیز کے بغیر استعمال کر کے اس رشتہ میں برابری کے پہلو کو نمایاں کیا ہے اور اس بات کی طرف رہنمائی کی ہے کہ بہن اور بھائی ایک جیسا کردار ادا کر سکتے ہیں۔ دوسرے قرآن حکیم نے

Marfat.com

بہن اور بھائی کے رشتے کو ایک اور بنیاد پر قائم کیا ہے جو نسب سے قوی تر ہے وہ بنیاد ایمان ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ قرآن نے یہ بنیاد فراہم کر کے انسانیت پر بہت بڑا احسان کیا ہے۔ اگر حقیقی معنوں میں یہ بنیاد قائم ہو جائے تو علاقائیت، وطنیت اور عصبیت کی جڑ کٹ سکتی ہے۔ یہ بنیاد معاشرے میں بھائی چارہ قائم کر کے امن و سکون کا باعث بن سکتی ہے۔

سب سے پہلے ان مقامات کی نشان دہی کی جائے گی جہاں پر 'اخ'، 'إخوان' اور 'إخوة' کے الفاظ تذکیر و تانیث کی تمیز کے بغیر استعمال ہوئے ہیں اور ساتھ ساتھ یہ بھی بتایا جائے گا کہ قرآن نے نسب کی جگہ ایمان کا نیا رشتہ کہاں قائم کیا ہے؟

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: لَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ كَفَرُوا وَقَالُوا لِإِخْوَانِهِمْ (آل عمران ۳:۱۵۶)۔ 'ان لوگوں کی مانند مت ہو جاؤ جنھوں نے کفر کیا اور اپنے بھائی بہنوں سے کہا'۔ یہاں لفظ 'إخوان' میں وہ سب بھائی بہنیں شامل ہیں جو ان کے ساتھ کفر میں شریک تھے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: إِخْوَانًا عَلَىٰ سُرُرٍ مُّتَقَابِلِينَ (الحجر ۱۵:۴۷)۔ 'وہ بہن بھائی بن کر آمنے سامنے مسند نشین ہوں گے'۔ یہاں پر بھی لفظ 'إخوان' میں بہن بھائی دونوں شامل ہیں۔ اس سے مراد یہ ہے کہ وہ دونوں ہم مشرب ہوں گے۔ وہ محبت اور خلوص میں ایک دوسرے کے شریک ہوں گے۔ ان کے دل سے ہر طرح کے بغض و عناد کو نکال باہر کیا جائے گا، صرف بھائی بندی کا جذبہ رہ جائے گا۔ یہ تو جنت میں ہوگا۔ دنیا میں إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ إِخْوَةٌ (مومن مرد و زن آپس میں صرف بھائی بند ہیں) نے اخوت کا یہی تصور پیش کیا ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: إِنَّ الْمُبَذِّرِينَ كَانُوا إِخْوَانَ الشَّيَاطِينِ (الاسراء ۱۷:۲۷)۔ 'بے شک دولت لٹانے والے شیاطین کے بھائی ہیں'۔ جس طرح الْمُبَذِّرِينَ میں مرد و زن دونوں شامل ہیں بالکل اسی طرح لفظ 'إخوان' میں دونوں شامل ہیں۔ ہم مشرب مرد و زن دنیا اور آخرت میں ایک دوسرے کے ساتھی ہوں گے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ إِخْوَةٌ (الحجرات ۴۹:۱۰)۔ 'مومن مرد و زن تو صرف آپس میں بھائی بند ہیں'۔ یہاں پر لفظ 'اخوۃ' میں مذکر اور مؤنث دونوں شامل ہیں۔ جو ایمان کے بندھن میں بندھے ہوئے ہیں۔ زمخشری کشاف میں لکھتے ہیں کہ 'إِنَّمَا' حرفِ حصر ہے جس کے معنی محض اور صرف کے ہیں یعنی بھائی بہن کے تصور کے علاوہ مومنوں کے ذہن میں اور کوئی تصور نہیں، وہ اس تصور

Marfat.com

میں مخلص ہیں اور ان کے درمیان اجنبیت کا شائبہ تک نہیں۔ مومن مرد و زن کا آپس میں کس قدر مقدس رشتہ ہے۔ اگر سب کے ذہنوں میں یہ تصور جاگزین ہو جائے تو کس قدر پاکیزہ معاشرہ قائم ہو سکتا ہے۔

امام رازی نے تفسیر کبیر میں اس آیت کے ضمن میں ایک نہایت ہی لطیف نکتہ بیان کیا ہے۔ فرماتے ہیں: 'بعض اہلِ لغت کے نزدیک 'اِخوۃ' سے مراد ہم نسب بھائی ہیں اور 'اِخوان' سے مراد وہ بھائی ہیں جو نسب کے علاوہ کسی اور بندھن میں بندھے ہوئے ہوں'۔ یہاں پر اللہ تعالیٰ نے 'اِخوۃ' کے لفظ میں اس طرف اشارہ کیا ہے کہ ان کے درمیان وہی رشتہ ہے جو ہم نسب بہن بھائیوں کا ہوتا ہے گویا اسلام ان کے لیے بمنزلہ باپ کے ہے۔ چنانچہ کسی نے خوب کہا ہے:

أبی الاسلام لا أب (لی) سواہ

اِذا افتخروا بقیس أو تمیم

'جب لوگ قیس اور تمیم کے نسب پر فخر کرنے لگیں

تو اس وقت میرا باپ اسلام ہوتا ہے، اس کے سوا میرا کوئی باپ نہیں'۔

یہ بھائی بندی تو صرف مومن مرد و زن کے درمیان ہے۔ مومن اور کافر کے درمیان اس کا کوئی وجود نہیں چنانچہ اگر کوئی مسلمان فوت ہو جائے اور اس کا باپ بیٹا یا بھائی کافر ہو تو وہ اس کے وارث نہیں بن سکتے، بلکہ مسلمان اس کے مال کے وارث ہوں گے۔ کافر کا مال کافر کو اور مسلمان کا مال مسلمان کو ملے گا۔ اس سے یہ ثابت ہوا کہ اسلام کا رشتہ نسبی رشتے سے قوی تر ہے'۔

صاحب روح المعانی اس آیت کے ضمن میں رقمطراز ہیں: 'مومنوں کے لیے لفظ 'اِخوۃ' کا اطلاق بہت ہی پُر مغز تشبیہ ہے۔ ان کو بھائیوں کے ساتھ اس لیے تشبیہ دی گئی ہے کہ وہ ایک ہی اصل یعنی ایمان کی طرف منسوب ہیں۔ ایمان اور نسب میں شرکت کا سبب یہ ہے کہ جس طرح نسب اس دنیا میں نسلِ انسانی کی بقا کا سرچشمہ ہے، بالکل اسی طرح ایمان جنت میں ابدی بقا کا سرچشمہ ہے'۔

اس اخوت کا تقاضا ہے کہ مسلمان مرد و زن سوسائٹی میں ایک دوسرے سے تعاون کریں اور ایک دوسرے کے دست و بازو بنیں۔ سورۃ توبۃ میں اسی فکر کو واضح انداز میں یوں پیش کیا گیا ہے:

وَالْمُؤْمِنُونَ وَالْمُؤْمِنَاتُ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ يَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ (التوبۃ ۹:۷۱) 'مومن مرد اور مومن خواتین ایک دوسرے کے دوست اور ساتھی ہیں نیکی کا حکم کرتے ہیں اور برائی سے روکتے ہیں'۔

Marfat.com

ان دونوں آیات مبارکہ میں مومن مرد و زن کے باہمی تعلقات کو نمایاں کر کے ان کے مشترکہ کردار کی طرف رہنمائی کی گئی ہے۔ قرآن حکیم کی رو سے مومن مرد اور خواتین ایک دوسرے کے دوست، ساتھی اور دست و بازو ہیں جنھیں مل جل کر معاشرے کی اصلاح کرنی چاہیے۔ حیرت کی بات ہے کہ اس مقدس رشتے کو نظر انداز کر کے ہم عورت کو سوسائٹی سے اسلام کے نام پر علیحدہ کرنے پر تلے بیٹھے ہیں۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: فَإِن كَانَ لَهُ إِخْوَةٌ (نساء ۴:۱۱)۔ 'اگر اس میت کے بہن بھائی ہوں'۔ یہ آیۂ کریمہ ورثے کے بارے میں بنیادی آیت کا جزو ہے۔ امام طبری فرماتے ہیں: رسول کریم ﷺ کے صحابہ کرام، تابعین اور تبع تابعین اس بات پر متفق ہیں کہ یہاں 'إخـوة' سے مراد ہے: 'دو یا اس سے زیادہ مرد، دو یا اس سے زیادہ خواتین یا ایک مرد اور ایک خاتون'۔ امام بیضاوی کا قول ہے کہ 'جمہور علما نے یہاں 'إخوة' سے مراد مرد و زن دونوں لیے ہیں'۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: أَيُحِبُّ أَحَدُكُمْ أَن يَأْكُلَ لَحْمَ أَخِيهِ (الحجرات ۴۹:۱۲)۔ 'کیا تم میں سے کوئی اس بات کو پسند کرتا ہے کہ وہ اپنے مردہ بھائی یا مردہ بہن کا گوشت کھائے'؟ اس آیت میں لفظ 'اخ' (بھائی) کا اطلاق بہن بھائی دونوں پر ہوتا ہے۔

مندرجہ بالا آیات کی روشنی میں کہا جا سکتا ہے کہ 'قرآن کے مفردات اور افعال اگر قرینے کے بغیر استعمال ہوں تو ان کا اطلاق تذکیر و تانیث کی تمیز کے بغیر دونوں پر ہوتا ہے اور ترجمہ کرتے وقت اس پہلو کو پیش نظر رکھنا از بس ضروری ہے۔

حقیقی معنی!

'اخـت' کا لفظ مفرد اور جمع قرآن حکیم میں اپنے حقیقی معنوں میں کم و بیش دس مرتبہ استعمال ہوا ہے اور مجازی معنوں میں صرف تین مرتبہ۔ قرآن حکیم نے لفظ 'اخـت' کو جہاں جہاں حقیقی اور بنیادی معنوں میں استعمال کیا ہے۔ وہاں بہن اور بھائی کے رشتے اور اس سلسلے میں معاشرے میں بہن کے کردار پر روشنی بھی ڈالی ہے۔ قرآن حکیم نے سب سے زیادہ جس قصے کا ذکر کیا ہے، وہ موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کا قصہ ہے۔ فرعون کو ظلم و استبداد کی علامت کے طور پر پیش کیا گیا ہے جبکہ موسیٰ علیہ السلام حق و صداقت اور حق گوئی و بے باکی کی علامت ہیں جو جابر سلطان کے دربار میں سچی بات کہتے ہوئے اپنی جان تک کی پرواہ نہیں کرتے۔ موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کی اس چپقلش سے فارسی محاورے 'ہر فرعونے را موسیٰ علیہ السلام' نے

Marfat.com

جنم لیا۔ قرآن حکیم کے مطابق حق و باطل کی اس کشمکش میں حق کی حمایت میں تین عورتوں کا کردار انتہائی اہم ہے۔ موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کا، موسیٰ علیہ السلام کی بہن کا اور فرعون کی بیوی آسیہ بنت مزاحم کا۔ درج ذیل آیات میں موسیٰ علیہ السلام کی بہن کے کردار کو اُجاگر کیا گیا ہے۔ اُنھوں نے اپنی جان جوکھم میں ڈال کر موسیٰ علیہ السلام کی رضاعت اور پرورش کا اہتمام کیا۔ اس سلسلہ میں ان کی جرأت، دلیری اور دانشمندی ہر مسلمان بہن کے لیے روشنی کا مینار ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: إِذْ تَمْشِيٓ أُخْتُكَ فَتَقُولُ هَلْ أَدُلُّكُمْ عَلَىٰ مَن يَكْفُلُهُۥ فَرَجَعْنَاكَ إِلَىٰٓ أُمِّكَ كَيْ تَقَرَّ عَيْنُهَا وَلَا تَحْزَنَ (طٰہٰ ۲۰:۴۰)۔ 'جب تمھاری بہن چلی جارہی تھی اور پھر کہہ رہی تھی کہ میں تمھیں اس کا پتہ نہ بتادوں جو اس کی پرورش کرے اور پھر ہم نے تمھیں، تمھاری ماں کی طرف لوٹا دیا تاکہ اس کی آنکھیں ٹھنڈی ہوں اور اس کا غم دور ہو۔

ماضی کے واقعہ کو بیان کرنے کے لیے مضارع کا صیغہ اس لیے استعمال کیا گیا ہے تاکہ محسوس ہو گویا یہ واقعہ ہماری نظروں کے سامنے سے گزر رہا ہے۔ بعض مفسرین نے إِذْ تَمْشِيٓ کو والقیت علیك محبة منی (اور میں نے اپنی طرف سے تیری محبت سب کے دل میں ڈال دی: بہن کے دل میں بھی اور آلِ فرعون کے دل میں بھی) سے متعلق ٹھہرایا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ بہن تیری تلاش میں سرگرداں اس محبت کے تحت چلی جارہی تھی جو میں نے اس کے دل میں تیرے بارے میں ڈال دی تھی۔ قرآن حکیم نے قصہ کی تفصیل سے پہلو تہی کرتے ہوئے صرف ان پہلوؤں کو اُجاگر کیا ہے جو عبرت حاصل کرنے کے لیے اور سیرت کی تعمیر کے لیے اہم ہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بہن چلتے چلتے کہاں پہنچی؟ چھپ چھپا کر انھوں نے موسیٰ علیہ السلام کو کیسے دیکھا؟ یہ تمام تفصیلات محذوف ہیں۔

وحی الٰہی کے زیرِ ہدایت ماں نے لختِ جگر کو تابوت میں ڈال کر دریائے نیل کی لہروں کے سپرد کردیا، آخر کو ماں تھی۔ اسے یہ چنتا تھی کہ بچے کا کیا بنے گا؟ کہیں لہریں تو نہ اسے بہالے جائیں گی؟ کہیں دریائی جانور تو اسے نہ نگل لے گا؟ ممتا نے جوش مارا تو موسیٰ علیہ السلام کی بہن کو حکم دیا پیچھے پیچھے جاؤ اور بھائی کی کھوج لگاؤ۔

اس قصے کو تھوڑی سی تفصیل کے ساتھ سورۃ قصص میں یوں بیان کیا گیا ہے:

وَقَالَتْ لِأُخْتِهِۦ قُصِّيهِ ۖ فَبَصُرَتْ بِهِۦ عَن جُنُبٍ وَهُمْ لَا يَشْعُرُونَ ۝ وَحَرَّمْنَا عَلَيْهِ ٱلْمَرَاضِعَ مِن قَبْلُ فَقَالَتْ هَلْ أَدُلُّكُمْ عَلَىٰٓ أَهْلِ بَيْتٍ يَكْفُلُونَهُۥ لَكُمْ وَهُمْ لَهُۥ نَاصِحُونَ ۝

Marfat.com

(القصص ۲۸: ۱۱ تا ۱۲) ’اور موسیٰ [علیہ السلام] کی ماں نے ان کی بہن سے کہا اس کے پیچھے پیچھے جاؤ پس اس نے دُور سے (شوق سے) دیکھا اور ان لوگوں کو پتہ بھی نہ چلا اور اس سے پہلے ہم نے دودھ پلانے والیوں کو اس کے لیے ممنوع قرار دے دیا تھا۔ پس اس نے کہا! میں تمھیں ایسے گھر والوں کا پتہ نہ بتادوں جو تمھارے لیے اس کی پرورش کریں اور وہ اس کے خیر خواہ ہیں‘۔

بہن کا مرتبہ اور مقام

آگے بڑھنے سے پہلے اس آیہ مبارکہ کے خوبصورت الفاظ اور اندازِ بیان کی طرف اشارہ ضروری سمجھتا ہوں۔ زیر نظر آیت میں یہ نہیں فرمایا گیا کہ اس نے اپنی بیٹی کو حکم دیا بلکہ اس کی جگہ موسیٰ علیہ السلام کی بہن کی تعبیر اختیار کی گئی ہے، تا کہ محبت کی اس گہرائی کو نمایاں کیا جائے جو ایک بہن کے دل میں اپنے بھائی کے لیے موجزن ہوتی ہے اور حکم ماننے کے لیے ضروری ہوتی ہے۔ پھر فرمایا: ’فبصرت بہ عن جنب وھم لایشعرون ‘، ’پس پھر اس نے بھائی کو دُور سے یا کنکھیوں سے یا شوق سے دیکھ لیا‘۔ صاحب التفسیر القرآنی کی رائے ہے کہ اس بہن کا دل آنکھوں سے آگے تھا۔ وہ بھائی کو اپنی آنکھوں سے نہیں ڈھونڈ رہی تھی بلکہ وہ تو مجسم احتیاط بن کر لوگوں کے اشارے کنائے اور حرکات وسکنات، رموز واسرار کا مطالعہ دل کی آنکھوں سے کر رہی تھی۔ بصر سے مراد یہاں علمی بصر ہے جو الہام سے قریب تر ہوتی ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ’بصرت بمالم یبصروا بہ ‘‘اس موقعہ پر ایک بہن نے تدبیر الٰہی کے تحت غیر ارادی طور پر ایک موقف اختیار کیا۔ وھم لایشعرون کے الفاظ ظاہر کرتے ہیں کہ وہ کتنا صاف شفاف اور بلند موقف تھا۔ جہاں بڑے بڑے محتاط لوگوں کے قدم لڑکھڑا جاتے ہیں اور ان سے کوئی نہ کوئی ایسی غلطی سرزد ہو جاتی ہے جس سے سارا راز فاش ہو جاتا ہے۔ ذرا ان جیتے جاگتے اور بولتے ہوئے الفاظ کو دیکھیے جو بے انتہا اسرار کی پردہ کشائی کر رہے ہیں۔ یہ کلام الٰہی ہے یہ نظم قرآن کا اعجاز ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ نور کی یہ کرنیں ایک مجسم وجود کی صورت میں ہمارے سامنے آن کھڑی ہوئی ہیں۔ ان کو آنکھ سے دیکھا جا سکتا ہے اور ہاتھ سے چھوا جا سکتا ہے۔ فرطِ مسرت سے وہ آلِ فرعون سے کہتی ہیں کہ میں تمھیں ایسے گھر والوں کا پتہ نہ بتادوں جو اسے دودھ پلا کر تمھارے لیے اس کی پرورش کریں کیونکہ وہ اس بچے کے خیر خواہ ہیں۔

یہ بہن جس کا نام روایات میں ’مریم‘ آیا ہے اور جو موسیٰ علیہ السلام کی سگی بہن تھیں، کیسے چل کر فرعون کے

Marfat.com

محل تک پہنچی جہاں بچے کی رضاعت کا مسئلہ زیر بحث تھا؟ ان لوگوں کو کیسے قائل کیا؟ بچہ کیسے ماں کی گود میں دوبارہ پہنچا؟ تربیت کے کن مراحل سے گزرا؟ یہ ساری تفصیل قرآن حکیم میں موجود نہیں ہے کیونکہ وہ قصہ کے ان پہلوؤں سے تعرض کرتا ہے جن میں انسانی ہدایت کا کوئی نہ کوئی گوشہ مضمر ہوتا ہے۔ مفسرین نے اس سلسلہ میں دو متضاد روایات بیان کی ہیں۔ ایک روایت ابن اسحاق کی ہے جس کے مطابق حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ہمشیرہ تابوت کے پیچھے پیچھے دریا کے کنارے کنارے چل دیں۔ جب لہروں نے تابوت کو اس ندیا میں ڈال دیا جو فرعون کے محل تک جاتی تھی تو وہ بھی بچتے بچاتے وہاں پہنچیں۔ آلِ فرعون کے ہاتھوں میں بچے کو زندہ پا کر خوش ہوئیں اور فرطِ مسرت سے آلِ فرعون سے کہنے لگیں میں ایسے گھر والوں کو جانتی ہوں جو اس بچے کو دودھ پلا کر اس کی پرورش کریں گے کیونکہ وہ اس کے خیر خواہ ہیں۔ دوسری روایت ابن عباس کی طرف منسوب ہے جس کی رو سے موسیٰ علیہ السلام کی بہن بھیس بدل کر گلی کوچوں اور بازاروں میں موسیٰ علیہ السلام کو تلاش کر رہی تھیں کہ انھوں نے دیکھا کہ فرعون کے دربار والے موسیٰ علیہ السلام کو اُٹھائے ڈھونڈی پٹوا رہے ہیں کہ کوئی ایسی عورت ہے جس کا دودھ موسیٰ علیہ السلام پی لیں۔ موسیٰ علیہ السلام کی بہن نے قرآن حکیم میں مذکور جملہ اُن سے کہا! ان دونوں روایتوں میں پہلی روایت مستند معلوم ہوتی ہے۔ کیونکہ قرآن حکیم کے الفاظ اور تورات کی روایت (خروج ۲:۷تا۹) بھی اسی کی تائید کرتے ہیں۔

'اِذ تمشی' کے الفاظ بتاتے ہیں کہ یہ عمل اُمِ موسیٰ علیہ السلام کی طرف وحی الٰہی کے فوراً بعد شروع ہو چکا تھا۔ فرعون کے محل تک پہنچنے کے بعد جب بہن نے دیکھا کہ بھائی کسی کے دودھ کو منہ نہیں لگا رہا تو انھوں نے ایک گھرانے کا پتہ بتانے کی حامی بھری، بس یہیں سے بہن کا اِمتحان شروع ہو جاتا ہے۔ خیر خواہ کا لفظ سن کر محل والوں کو شبہ گزرا کہ ہو نہ ہو یہ لڑکی بچے کو بھی جانتی ہے اور اس کے گھر والوں کو بھی۔ روایت میں ہے یہ سوال فرعون کے مقرب ہامان نے پوچھا۔ تن تنہا جوان لڑکی، فرعون اور اس کے درباریوں کا ہجوم، پُر خطر ماحول ذرا سی غلطی جان لیوا ثابت ہو سکتی تھی۔ وہ ذہین تھی، پُر اعتماد تھی اور اُسے تائید ایزدی حاصل تھی کیونکہ سب کام تدبیر الٰہی کے تحت ہو رہا تھا۔ اس نے اپنے ہوش و حواس قائم رکھتے ہوئے جواب دیا کہ شہزادے کو دودھ پلانا بڑے امتیاز کی بات ہے۔ بادشاہ کے قرب اور انعام و اکرام کی خاطر وہ لازماً بہی خواہی کریں گے۔ یہ جواب سن کر سب مطمئن ہو گئے اور بچہ دوبارہ ماں کی گود میں پہنچ گیا۔

یہاں غور طلب بات یہ ہے کہ انھوں نے یہ نہیں کہا کہ میں تمھیں ایک ایسی خاتون کا پتہ بتاتی ہوں جو اسے دودھ پلائے گی اور پرورش کرے گی۔ بلکہ یہ کہا کہ میں تمھیں ایسے گھرانے (اہلِ بیت) کا پتہ بتاتی

Marfat.com

ہوں۔ اہلِ بیت سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ گھرانا عزت دار گھرانا ہے اور اس لائق ہے کہ بادشاہ کی خدمت کرے۔ یہ بات بھی اس لڑکی کی ذہانت پر شاہد ہے۔

قصہ کوتاہ وہ موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کو محل میں لائیں۔ جب وہ بچے کو گود میں لے کر دودھ پلانے لگیں تو بچہ ذوق وشوق سے دودھ پینے لگا۔ فرعون ان سے پوچھنے لگا۔ کیا بات ہے اس نے کسی کے دودھ کو منہ تک نہیں لگایا مگر تمھارا دودھ خوشی خوشی پی رہا ہے۔ ان کا تعلق بھی نبوت کے گھرانے سے تھا۔ فوراً جواب دیا کہ میرے دودھ کی خوشبو ہی ایسی ہے کہ جو بچہ اسے سونگھتا ہے فوراً پینا شروع کر دیتا ہے۔ روایت کے مطابق دریائے نیل میں ڈالنے سے پہلے موسیٰ علیہ السلام کی والدہ نے انھیں تین ماہ تک چوری چھپے دودھ پلایا تھا اور وہ اس دودھ سے مانوس تھا۔ چنانچہ بچے کو ماں کے سپرد کر دیا گیا۔ یہ تدبیرِ الٰہی تھی۔ فرعون اعلان کرتا ہے کہ بنو اسرائیل کے ہر نرینہ بچے کو قتل کر دیا جائے کیونکہ نجومیوں نے اسے بتایا تھا کہ اس کی حکومت کا خاتمہ ایسے ہی بچے کے ہاتھوں ہوگا۔ بچہ پیدا ہوتا ہے۔ وحیِ الٰہی کے بعد ماں اپنے لختِ جگر کو دریا میں ڈال دیتی ہے۔ دریا تابوت کو ساحل پر پھینک دیتا ہے۔ بچہ اسی فرعون اور اس کے گھر والوں کے ہاتھ لگتا ہے۔ اللہ کے سوا اس کا کوئی مونس و مددگار نہیں۔ اللہ تعالیٰ کے وعدے کے مطابق بچہ دوبارہ ماں کی گود میں چلا جاتا ہے اور پرورش پاتا ہے۔ پیدا کرنے والے سے ماں کا کرب دیکھا نہ گیا۔ بہن کی کاوش سے ماں کی گود کو پھر ہرا بھرا کیا اور اس کی آنکھوں کو ٹھنڈک بخشی۔ اللہ تعالیٰ نے ماں اور بہن کے مقام کو کس قدر بلندی عطا کی اور ابدالآباد تک دونوں کے نام کو قرآنِ مجید میں امر کر دیا۔ ع یہ مرتبہ بلند ملا جس کو مل گیا۔

قرآن حکیم میں ایک اور اہم مقام ہے جہاں اخت (بہن) کا لفظ اپنے حقیقی معنوں میں استعمال ہوا ہے اور ساتھ ہی ساتھ بہن اور بھائی کے مساویانہ مرتبہ و مقام پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ’’وَإِنْ كَانَ رَجُلٌ يُورَثُ كَلَالَةً أَوِ امْرَأَةٌ وَلَهُ أَخٌ أَوْ أُخْتٌ فَلِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا السُّدُسُ فَإِن كَانُوا أَكْثَرَ مِن ذَٰلِكَ فَهُمْ شُرَكَاءُ فِي الثُّلُثِ (نساء ۱۲:۴)‘‘۔ اگر کسی لاولد مرد یا خاتون کا ورثہ ہو اور اس کا ایک بھائی یا بہن ہو، تو ان سب میں سے ہر ایک کو چھٹا حصہ ملے گا اور اگر ان کی تعداد اس سے زیادہ ہو تو وہ سب $\frac{1}{3}$ میں برابر کے شریک ہوں گے۔ عصبی رشتہ داروں میں اللہ نے عورت کا حصہ مرد سے آدھا رکھا ہے لیکن زیرِ نظر آیت میں مرد و زن کو برابر کا حصہ مل رہا ہے۔ کچھ لوگ وراثت میں دہرے حصے کو مرد کے افضل ہونے کی دلیل سمجھتے ہیں یہ درست نہیں۔ وراثت کا فضیلت سے کوئی

Marfat.com

تعلق نہیں بلکہ اس کا براہ راست تعلق مالی ذمے داریوں سے ہے۔ اگر ان کو پیش نظر رکھا جائے تو خاتون کا حصہ مرد سے زیادہ رہتا ہے کیونکہ مرد اپنا حصہ اپنے زیر کفالت لوگوں پر خرچ کرنے کا مکلف ہے، جبکہ خاتون پر ایسی کوئی ذمہ داری نہیں۔ وہ اپنا حصہ اپنی مرضی سے جہاں چاہے خرچ کر سکتی ہے یا اسے اپنے پاس جمع رکھ سکتی ہے۔ اس کے برعکس مرد کا حصہ بہت سے لوگوں میں بٹ جاتا ہے تو کہاں کی فضیلت اور کیسی برتری؟

زیر نظر آیت میں جمہور علما کے نزدیک بہن بھائی سے مراد صرف ماں کی طرف سے بہن بھائی ہیں نہ کہ عصبی اور یہ حصہ اسی صورت میں ہے جب ماں کی طرف سے ان کے علاوہ کوئی اور رشتہ دار نہ ہو۔ یہ مساوات اس لیے قائم کی گئی ہے کہ بہن بھائی کا رشتہ صرف ماں کی جانب سے ہے۔ علامہ رشید رضا تفسیر المنار میں بات کو ذرا کھول کر کہتے ہیں کہ 'شریعت نے ماں کا حصہ $\frac{1}{6}$ مقرر کیا ہے یا $\frac{1}{3}$۔ یہاں بہن اور بھائی کے حصہ میں اس لیے فرق نہیں کہ ان میں سے ہر ایک اپنی ماں کا قائم مقام ہے۔ اس لیے ہر ایک کو ماں کا حصہ ملے گا۔ مذکر و مؤنث میں کوئی فرق نہ ہوگا۔ اگر بہن بھائی زیادہ ہوں گے تو ایک تہائی میں سب برابر کے شریک ہوں گے'۔ یہ بات اپنی جگہ درست ہے مگر اصل سبب یہ ہے کہ ماں کی طرف سے بہن بھائی پر کوئی مالی بوجھ نہیں ہوتا۔ وہ دونوں بے اولاد مرنے والے کے خاندان میں قریبی سے زیادہ اجنبی ہوتے ہیں۔ خاندان کی شیرازہ بندی میں ان کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔ ان دونوں کو ایک انسان سمجھتے ہوئے برابر کی سطح پر رکھا گیا ہے۔ جہاں شریعت نے مالی بوجھ صرف مرد پر ڈالا ہے وہاں مساوات قرین انصاف نہیں۔ جس طرح وصیت ایک تہائی سے تجاوز نہیں کر سکتی بالکل اسی طرح ماں کی جانب سے بہن بھائیوں کا حصہ ایک تہائی سے کسی صورت میں تجاوز نہیں کر سکتا۔

تحریم کے سلسلہ میں سورۃ نساء میں ایک اہم حکم وارد ہوا ہے۔ جس میں لفظ 'اخت' اپنے حقیقی معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ اس میں اللہ تعالیٰ نے دو بہنوں کی ذہنی کیفیت اور نفسیاتی اُلجھنوں کا خاص خیال رکھا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَأَن تَجْمَعُوا بَيْنَ الْأُخْتَيْنِ (نساء ۴: ۲۳)۔

'اور تم پر حرام ہے کہ تم دو بہنوں کو ایک ساتھ نکاح میں جمع کرو'۔

Marfat.com

اس سے پہلے ان تمام خواتین کی حرمت کا ذکر ہے جن سے جنسی میل، فطرت سلیم کے منافی ہے اور انسانیت کی تحقیر کے مترادف ہے۔ دو بہنوں کو ایک ساتھ نکاح میں جمع کرنے کی حرمت پر تو سب علمائے دین کا اتفاق ہے۔ اختلاف اس بات پر ہے کہ ایک بہن کے ساتھ نکاح ہو تو دوسری بطور لونڈی (ملک یمین) اس کے ساتھ جمع ہو سکتی ہے یا نہیں؟

جواز کو حضرت عثمانؓ اور ابن عباسؓ کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔ امام رازی کہتے ہیں کہ ہمارے شیخ نے آیت کے ظاہری الفاظ کو دلیل پکڑتے ہوئے اسے بھی حرام قرار دیا ہے۔ علامہ رشید رضا المنار میں لکھتے ہیں کہ 'عقد نکاح اور ملک یمین کی صورت میں دو بہنوں کو ایک ساتھ رکھنا حرام ہے۔ صحابہ کرام، تابعین اور تبع تابعین کا اس پر عمل رہا ہے۔ علمائے دین نے اس سلسلہ میں یہ قاعدہ مقرر کیا ہے کہ ایسی دو عورتیں جن میں قریبی رشتہ ہو، ان کو ایک ساتھ مباشرت کی غرض سے رکھنا بھی حرام ہے۔ اسی قاعدہ کے تحت پھوپھی بھتیجی اور خالہ بھانجی کو ایک ساتھ رکھنا بھی حرام ہے'۔ اللہ تعالیٰ نے خواتین کے ذہنی کرب اور ان کی نفسیاتی الجھنوں کا خاص خیال رکھ کر ان کے مقام و مرتبہ کو بلند کیا ہے اور ان سے نکاح کے سلسلے میں ایسے احکام صادر فرمائے ہیں جن میں نوع انسانی کی مصلحت مضمر ہے اور جو خاندان کا شیرازہ بکھرنے سے بچاتے ہیں۔

مجازی معنی

عربی زبان میں اب (باپ) اور ام (ماں) اخ بھائی اور اخت (بہن) کے الفاظ وسیع تر معنوں میں استعمال ہوتے ہیں۔ امام راغب اصفہانی نے المفردات میں لکھا ہے کہ اخ (اسی طرح اخت) کا اطلاق استعارۃً ہر اس شخص پر ہوتا ہے جو دین یا صفت یا معاملہ یا محبت یا کسی اور تعلق میں دوسرے کے ساتھ شریک ہو۔ اس اعتبار سے یہ لفظ قرآن حکیم میں لفظ اخت ساتھی، دوست، ہم مشرب و ہم مقصد اور ہم قبیلہ کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ بے مثال رات کے لیے عربی کا محاورہ ہے 'رماہ اللّٰہ بلیلۃ لا اخت لھا'۔ اللہ نے اس پر ایسی رات نازل کی جس کی مثال نہیں ملتی، اسی طرح اخت یوشع سورج کے لیے کنایہ ہے۔

قرآن حکیم میں لفظ اخت (بہن) تین مرتبہ مجازی معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: 'كُلَّمَا دَخَلَتْ أُمَّةٌ لَّعَنَتْ أُخْتَهَا' (الاعراف ۷:۳۸)۔ 'جب بھی ایک اُمت (جہنم میں) داخل ہوگی تو وہ اپنی بہن اُمت (اپنے جیسی اُمت) پر لعنت بھیجے گی'۔ اس آیت میں اختھا کا اشارہ ان

Marfat.com

کے دیگر ہم مشرب لوگوں کی طرف ہے جو عقیدے کے بندھن میں ایک ساتھ بندھے ہوئے ہیں۔ امام طبری اپنی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ اختھا سے مراد دوسری جماعت ہے جو دین وملت میں اس کے ساتھ شریک ہو یعنی مشرک مشرکوں پر، یہودی یہودیوں پر، عیسائی عیسائیوں پر، ستاروں کے پرستار ستاروں کے پرستاروں پر اور آتش پرست آتش پرستوں پر لعنت بھیجیں گے۔ آپ نے دیکھا کہ اخت کے لفظ نے اخ کی مانند مختصر ہونے کے باوصف کتنے معانی ادا کر دیے۔ صاحب کشاف نے مزید وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے کہ دوسری جماعت کفر میں ان کی پیروی کی وجہ سے گمراہ ہوئی، اس لیے اس کی بہن ٹھہری۔

پھر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے یٰۤاُخْتَ هٰرُوْنَ مَا كَانَ اَبُوْكِ امْرَاَ سَوْءٍ وَّمَا كَانَتْ اُمُّكِ بَغِیًّا '(مریم ۲۸:۱۹) 'اے ہارون کی بہن! نہ تو تمھارا باپ برا آدمی تھا نہ تمھاری ماں بدکار تھی'۔ اس آیۂ مبارکہ میں حضرت مریمؑ کی قوم کے لوگ اُنھیں طعنہ دے رہے ہیں۔ اے ہارون کی بہن! تُو تو ہمارے نزدیک تقویٰ میں ہارون جیسی تھی۔ تیرے ماں باپ پاکیزہ لوگ تھے، کنواری ہوتے ہوئے بچہ کہاں سے لے آئی؟

مسند احمد، مسلم، ترمذی، نسائی، طبرانی اور ابن حبان نے حضرت مغیرہ بن شعبہؓ سے روایت کی ہے کہ 'مجھے محمد رسول اللہ ﷺ نے نجران کی طرف بھیجا وہ لوگ مجھ سے کہنے لگے: کبھی سوچا تم لوگ قرآن میں کیا پڑھتے ہو؟ قرآن میں مریمؑ کو ہارون کی بہن کہا گیا ہے، حالانکہ ہارون علیہ السلام اور عیسیٰ علیہ السلام کے درمیان ایک ہزار برس کا فاصلہ ہے۔ مغیرہؓ کہتے ہیں کہ جب مدینہ لوٹا تو میں نے اس اشکال کو نبی کریم ﷺ کے سامنے پیش کیا۔ آپؐ نے فرمایا کہ تم نے ان کو یہ جواب کیوں نہ دیا کہ لوگ انبیا اور صالحین کے ناموں پر نام رکھ لیتے تھے۔

اس روایت کی روشنی میں اخت ھارون کی دو توجیہیں کی گئی ہیں۔ ایک توجیہ تو یہ ہے کہ سیدۃ مریمؑ کا کوئی بھائی تھا جس کا نام ہارون بنو اسرائیل کے ہارون نامی صالح شخص کے نام پر تھا۔ یہ بھائی مثالی کردار کا حامل تھا۔ زمخشری، امام رازی اور ابنِ حیان نے اسی توجیہ کو قابلِ ترجیح سمجھا ہے۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ آیت کے ظاہری الفاظ سے یہی معنی نکلتے ہیں، اور بھائی مراد لینے سے قوم کا طعنہ شدید تر ہو جاتا ہے کیونکہ بھائی اور ماں باپ سب کا ذکر کرنے سے یہ معنی نکلتے ہیں کہ جس کے بھائی اور ماں باپ تقویٰ کے اس مقام پر فائز ہوں تو اس سے ایسی فحش حرکت کیسے سرزد ہو سکتی ہے؟ مگر تاریخ اس توجیہ

Marfat.com

کی تائید نہیں کرتی۔ جہاں قرآن حکیم نے عمران کی بیوی کی منت کا ذکر کیا ہے وہاں سب تفسیروں میں یہ متفقہ روایت ہے کہ ان کی کوئی نرینہ اولاد نہ تھی ہاں بہن کا ذکر آتا ہے جو ایک روایت کے مطابق حضرت زکریا علیہ السلام کی بیوی تھیں۔ مغیرہ بن شعبہ، قتادہ محمد بن سیرین اور ابن زید کا قول ہے کہ اُختِ ھارون سے مراد ہارون جیسی صالح ہے کیونکہ بنو اسرائیل میں ہارون نامی صالح آدمی تھا اور وہ ہر صالح کو اس کی طرف منسوب کر دیتے تھے۔ اکثر مفسرین نے اسی توجیہہ کو قابل ترجیح سمجھا ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ نیکی میں ہارون کی شبیہہ، المفردات میں امام راغب کا کہنا ہے کہ اُختِ ھارون سے مراد پشت اور نسل مراد نہیں بلکہ صلاح وتقویٰ کے اعتبار سے مریم کو اُختِ ھارون کہا گیا ہے۔ ایک تیسری توجیہہ مشہور تابعی سدی سے مروی ہے کہ حضرت مریمؑ کو اُختِ ھارون اس لیے کہا گیا ہے۔ کہ وہ اُن کی نسل سے تھیں جس طرح تمیمی کو یا أخاتمیم اور مضری کو یا أخا مضر کہہ کر پکارتے ہیں بالکل اسی طرح مریمؑ کو اُختِ ھارون کہا گیا ہے۔ صاحبِ کشاف اور امام رازی نے اس ضمن میں یہ روایت نقل کی ہے کہ محمد رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ہارون سے مراد ہارون نبی علیہ السلام ہیں کیونکہ وہ ان کی نسل سے تھیں۔

بہر کیف خواہ ہارون نبی ہوں یا کوئی صالح شخص، سیدہ مریمؑ کی فضیلت کے لیے کیا یہ بات کم اہم ہے کہ ان کو نیکی و صلاح، تقویٰ و طہارت اور صبر و استقامت میں انبیا اور صلحا کی نظیر ٹھہرایا گیا ہے۔ یہاں أخت ھارون (ہارون کی بہن) کہا گیا ہے نہ کہ بنت ھارون (ہارون کی بیٹی) اس لیے کہ ہارون کے بیٹے تقویٰ اور طہارت میں ایک جیسے نہ تھے۔ ان میں صالح بھی تھے اور غیر صالح بھی۔ مریمؑ اگرچہ ہارون علیہ السلام کے نسب سے تھیں لیکن تقویٰ وطہارت میں ان کی نظیر تھیں اس لیے یہاں اخت کی اضافت استعمال ہوئی ہے جو بنوت کی اضافت سے قوی تر ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: "وَمَا نُرِيهِم مِّنْ آيَةٍ إِلَّا هِيَ أَكْبَرُ مِنْ أُخْتِهَا" (الزخرف ۴۳:۴۸)۔ "ہم جو آیت (نشانی) ان کو دکھاتے ہیں وہ اس جیسی پہلی آیت سے بڑی ہوتی ہے۔ آیات کے درمیان اُخوت سے مراد ان کا ایک جیسا ہونا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی نبوت پر ایک طرح دلالت کرنا ہے۔ گویا وہ آیت اپنی ماقبل آیت کے ساتھ اس صفت میں شریک ہے۔ امام طبری فرماتے ہیں کہ اس سے مراد ہے کہ ہم جو نشانی ان کو دکھاتے ہیں وہ پہلی نشانی کی نسبت حجت میں قوی تر ہوتی ہے اور موسیٰ علیہ السلام کی نبوت کی صحت پر بڑھ کر دلالت کرنے والی ہوتی ہے۔

آپ نے دیکھا کہ اخت (بہن) کا لفظ مندرجہ بالا آیات میں بالکل اخ کی طرح حقیقی اور مجازی معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ لغوی طور پر ان کے استعمال میں سر مو بھی فرق نہیں۔

Marfat.com

الأم (اصل۔ماں)

لغوی مفہوم

مقاییس اللغۃ میں ابنِ فارس کا قول ہے: کہ اس کے بنیادی معنی چار ہیں۔ان معانی کو اس نے ابواب سے تعبیر کیا ہے۔

۱۔ اصل ۲۔ مرجع ۳۔ جماعت ۴۔ دین

اور یہ چاروں معانی ایک دوسرے سے قریب ہیں۔پھر ان چار ابواب سے تین شاخیں نکلتی ہیں جن کو اس نے اُصول سے تعبیر کیا ہے۔

i۔ قد و قامت ii۔ وقت اور زمانہ iii۔ قصد۔

جوھری نے صحاح میں اس قول کی تائید کی ہے۔

المفردات میں امام راغب کا قول ہے: کہ اس کے بنیادی معنی ماں ہے اور یہ لفظ أب کے مقابلہ میں ہے۔اس کا اطلاق حقیقی والدہ پر بھی ہوتا ہے اور نانی، پرنانی سب پر۔اسی لیے حواؑ کو اُمنا (ہماری ماں) کہا جاتا ہے۔حالانکہ ہمارے اور ان کے درمیان کئی واسطے ہیں۔لسان العرب میں ابنِ منظور نے اس قول کی تائید کی ہے اور کہا ہے کہ اُم اور اُمّۃ والدہ کو کہا جاتا ہے۔بلکہ اُنھوں نے ابنِ بری کا شعر نقل کیا ہے جس میں اُمۃ کو بھی ماں کے معنوں میں استعمال کیا گیا ہے۔

تقبلها من أمة ولطالما
تنوزع فی الأسواق منها خمارها

اس ماں کی طرف سے اسے قبول کر
بسا اوقات بازاروں میں اس کی اوڑھنی کو کھینچا گیا ہے

صاحب محیط کا قول ہے کہ یہ بچے کی اس آواز سے ماخوذ ہے جو وہ بولنا سیکھنے سے پہلے اُم کہہ کر نکالتا ہے۔اس لیے اس کے اصلی معنی والدہ کے ہیں۔لفظ اُم انسانوں کے علاوہ حیوانات اور نباتات کے لیے بھی بولا جاتا ہے۔جیسے اُم ظِباء (ہرن کی ماں یعنی صحرا) اور جیسے اُم نخلۃ و شجرۃ۔فرق صرف اتنا ہے کہ یہ جب انسانوں کے لیے بولا جاتا ہے تو اس کی جمع اُمھات آتی ہے اور جب غیر انسانوں کے لیے بولا جاتا ہے تو اسکی جمع اُمات آتی ہے۔

لفظ اُم کی اُب (باپ) کے مقابلہ میں لغوی اہمیت کا اندازہ عربوں کے محاورں سے لگایا جاتا ہے

Marfat.com

وہ کہتے ہیں ما اُمی و اُمنہ یعنی میرا اس سے کیا تعلق ہے؟ (Lexicon)۔گویا کہ اصل تعلق ماں کا ہے باپ کا نہیں۔ پھر وہ مدح وذم کے موقع پر کہتے ہیں لا اُم لك (تیری ماں مرے) یعنی اصل نقصان ماں کے مرنے سے ہوگا، باپ کے مرنے سے نہیں۔ کسی کو دعا دینے کے لیے بھی اور مدح واستحسان کے موقع پر بھی یہ کلمہ بولا جاتا ہے۔عرب جب کسی کی ہلاکت کی دعا مانگتے ہیں تو کہتے ہیں ھوّت اُمہ یعنی اس کی ماں اس کے غم کی وجہ سے ہلاک ہو جائے۔اس میں اپنے بچوں کے لیے ماں کے نازک جذبات کی طرف اشارہ ہے۔قرآن حکیم نے ایک مقام پر بڑی خوبصورتی سے اس رشتے کی گہرائی اور گیرائی کی طرف اشارہ کیا ہے اللہ کا ارشاد ہے: 'قال یبنؤم' (طٰہٰ ۲۰: ۹۴) جب موسیٰ علیہ السلام نے بچھڑے کی عبادت پر غصے میں اپنے بھائی ہارون علیہ السلام کو ڈاڑھی اور سر سے پکڑا تو ہارون نے کہا! اے میری ماں کے بیٹے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام، ہارون علیہ السلام کے حقیقی بھائی تھے۔انھوں نے یا ابن أبی (اے میرے باپ کی بیٹے) نہیں کہا۔ کیوں؟ اس لیے کہ ان کا دل موہنے اور ہمدردی حاصل کرنے کے لیے اُنھوں نے ماں کے رشتے کا واسطہ دیا، بالکل اسی طرح جیسے پنجابی میں ماں جایا کہا جاتا ہے۔عربوں کی عادت تھی کہ وہ ماں کا نام لے کر طبیعت میں نرمی پیدا کرتے تھے چنانچہ زبید الطائی کا مصرعہ ہے:

ع۔ یا ابن اُمی ویا شقیق نفسی

یعنی اے میری ماں جائے، اے میری جان کے ٹکڑے۔

ماں کا حق تو زیادہ ہوتا ہے وہ حمل، تربیت اور رضاعت کے جان لیوا مراحل سے گزرتی ہے۔جب موسیٰ علیہ السلام کی ماں نے اپنے جگر کے ٹکڑے کو سینے پر پتھر رکھ کر نیل کی لہروں کے سپرد کیا۔تو پیچھے پیچھے بہن کو بھیجا اور اس وقت تک تڑپتی رہی، جب تک اللہ ان کو ان کی گود میں واپس نہ لے آیا۔

کیا ماں کا نام سن کر موسیٰ علیہ السلام کے جذبات میں حرکت نہ پیدا ہوئی ہوگی؟ کیا اس حق کے جتلانے سے ان کی گرفت ڈھیلی نہ پڑ گئی ہوگی؟ یہ رقت یہ ہمدردی باپ کا نام لے کر پیدا نہیں ہو سکتی۔

مجازی معنی

لفظ 'اُم' کے مجازی معنوں میں اس قدر وسعت ہے کہ اس پر ایک مستقل کتاب لکھی جا سکتی ہے۔ خلیل کا قول ہے کہ ہر وہ چیز جس کے اندر اس کے تمام متعلقات اور اوصاف جمع ہو جائیں یا سما جائیں اس چیز کی 'اُم' (ماں) کہلاتی ہے۔ابن درید کا قول لسان العرب میں نقل کیا گیا ہے کہ ہر وہ چیز جس میں دوسری چیزیں جمع یا ختم ہو جائیں وہ ان کے لیے 'اُم' کی حیثیت رکھتی ہے۔یہ ان چیزوں

Marfat.com

کا مرکز اور ٹھکانہ ہوتی ہے۔ جیسا کہ 'ام الراس' (سرکی ماں) دماغ کو کہتے ہیں۔'ام الرمح' (نیزے کی ماں) جھنڈے کو یا ہر اُس کپڑے کو کہتے ہیں جسے نیزے کے گرد لپیٹا جائے۔'ام الحرب' (جنگ کی ماں) بھی جھنڈے کو کہتے ہیں کیونکہ سارا لشکر اس کے تلے جمع ہوتا ہے۔'ام النجوم' (ستاروں کی ماں) کہکشاں کو کہتے ہیں کیونکہ آسمان پر ایسا کوئی مقام نہیں جس پر کہکشاں سے زیادہ ستارے ایک ساتھ جمع ہوں۔'ام الطریق' (راستے کی ماں) بڑا راستہ جس کے ادھر گرد چھوٹے چھوٹے بہت سے راستے ہوں اس اعتبار سے زمین کو 'ام الناس' کہا گیا ہے کیونکہ وہ سب لوگوں کو سمیٹے ہوئے ہے۔امیہ بن ابی الصلت کا شعر ہے۔

فالارض معقلنا و کانت امنا
فیھا مقابرنا و فیھا نولد

زمین ہماری جائے پناہ ہے وہ تو ہماری ماں ہے
جس میں ہماری قبریں ہیں اور جس میں ہم پیدا ہوتے ہیں

کسی بستی یا شہر کے اکثر و بیشتر معاملات کا اہتمام کرنے والے کو ام کہا جاتا ہے۔اسی لیے کسی قوم کا رئیس 'امھم' کہلاتا ہے۔عرب کہتے ہیں ھو امنا یعنی وہ ہماری ماں ہے'۔وہ ان کا سہارا ہوتا ہے جس طرح ماں اپنے بچوں کا سہارا ہوتی ہے اور سب اس کے اردگرد جمع ہوتے ہیں۔اسی لیے لشکر کے رئیس کو بھی ام الجیش کہا جاتا ہے اور وہ جھنڈا جو قوم کو ایک لشکر میں جمع کرتا ہے ام القوم کہلاتا ہے۔ امام راغب نے مفردات میں لکھا ہے کہ قبیلہ ازد کے لوگ قبیلے کے سردار کو ام عیال کہتے تھے، کیونکہ وہ اُن کی خوراک کا بندوبست بھی کرتا تھا اور دوسرے کام بھی سرانجام دیتا تھا بالکل ماں کی طرح۔

بہت سی چیزیں ام کی طرف منسوب ہیں۔جب کسی چیز کے متعلق ام الشر کہا جائے گا تو اس میں دنیا جہان کی برائیاں جمع ہونگی۔

المفردات میں امام راغب نے ام کے مجازی معنوں کی بڑی جامع تعریف کی ہے۔فرماتے ہیں: ہر اس چیز کو ام سمجھا جاتا ہے جو کسی چیز کے وجود میں آنے یا اس کی اصلاح و تربیت کا سبب ہو یا اس کے آغاز کا باعث ہو۔

لفظ ام کی لغوی تشریح کا لب لباب یہ ہے کہ یہ لفظ مجازی طور پر بنیاد اور اصل کے معنی دیتا ہے کیونکہ ماں انسان کے وجود میں آنے کا سبب ہے۔اس لیے بنیادی مسائل کو امھات المسائل کہا جاتا ہے۔یہ مرکز اور جائے پناہ کے معنی دیتا ہے کیونکہ دکھ درد کے وقت ماں انسانوں کو اپنی گود میں سمیٹ لیتی

Marfat.com

ہے۔ماں کے رشتے کا حوالہ دیا جائے تو جذبات میں حرکت آتی ہے۔دل پسیج جاتے ہیں اوراس گہرے رشتے کی وجہ سے کسی کو مرنے کی بددعا دینی ہو تو ھوّت اُمہ کہا جاتا ہے۔لشکر یا قوم کے رئیس کو اُم اس لیے کہا جاتا ہے کہ وہ ماں کی طرح لشکر یا قبیلے کی سرپرستی کرتا ہے۔زمین کو مادر گیتی اس لیے کہا جاتا ہے کہ ہم سب ماں کی آغوش کی طرح اس میں سمائے ہوئے ہیں۔

قرآن حکیم نے 'اُم' کے لفظ کو مجازی معنوں میں استعمال کر کے ماں کی شکل میں خاتون کو بہت بڑا شرف عطا کیا ہے۔کبھی اس لفظ کو اپنی کتاب کے ساتھ جوڑا گیا ہے کبھی اس کتاب کی محکم آیات کے ساتھ اور کبھی مکہ مکرمہ کی بستی کے ساتھ۔اللہ کی کتاب بھی مقدس ہے۔اس کی آیات بھی مقدس ہیں اور مکہ مکرمہ کی بستی بھی مقدس۔جس لفظ کی طرف ان مقدس اشیا کو منسوب کیا گیا ہے وہ بھی تو مقدس ہے۔ ماں کے رشتے کو سب مقدس سمجھتے ہیں مگر وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ وہ ہے تو ایک عورت کسی کی بیوی، کسی کی بیٹی اور کسی کی بہن۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: مِنْهُ آيَاتٌ مُّحْكَمَاتٌ هُنَّ أُمُّ الْكِتَابِ (آلِ عمران ۳:۷)۔'اس کتاب میں محکم آیات ہیں جو اس کتاب کی اصل ہیں'۔اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ کتاب کی اساس ہیں اس کا مرجع اور مرکز ہیں۔احکام، فرائض و حدود بلکہ سارے کا سارا قانون ان پر قائم ہے۔ان کو اصل قرار دے کر سارے مسائل ان سے اخذ کیے جاتے ہیں اور ان پر اعتبار کیا جاتا ہے چونکہ وہ مفہوم بالذات ہیں۔اس لیے اگر کسی چیز کے متعلق ہمارے دل میں شبہ پیدا ہو جائے یا نزاع یا اختلاف پیدا ہو جائے تو انھی کی طرف رجوع کیا جاتا ہے۔عربوں کا طریقہ ہے کہ وہ ہر جامع چیز کو جو چیز کے بڑے حصے کو اپنے اندر سمیٹ سکے اور اس کا مرجع بن سکے 'اُم' کہتے ہیں۔(Lexicon) میں ہے: 'اُمهاتهم شتّی' کا مطلب ہے کہ دین ایک ہے لیکن ان کے قوانین مختلف ہیں'۔اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: يَمْحُو اللَّهُ مَا يَشَاءُ وَيُثْبِتُ وَعِندَهُ أُمُّ الْكِتَابِ' (الرعد ۱۳:۳۹)۔'اللہ جسے مٹانا چاہتا ہے اسے مٹا دیتا ہے اور جسے ثبت کرنا چاہتا ہے اسے ثبت کرتا ہے اور اس کے پاس اصل کتاب ہے'۔اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: وَإِنَّهُ فِي أُمِّ الْكِتَابِ لَدَيْنَا لَعَلِيٌّ حَكِيمٌ' (الزخرف ۴۳:۴)۔'اور بے شک وہ (قرآن) ہمارے پاس اصل کتاب میں ہے۔وہ بلند اور حکمت والا ہے'۔کعب کی روایت کے مطابق جسے عبدالرزاق اور ابنِ جریر نے نقل کیا ہے۔اس کی مشہور تفسیر لوحِ محفوظ ہے۔عرب ہر چیز کی اصل کو اسی کی 'اُم' کہتے ہیں۔ہر کتاب بشمول قرآن کی اصل لوحِ محفوظ ہے۔کیونکہ ہر ہونے والا واقعہ اس میں لکھا ہے۔اسے 'اُم الکتاب' اس لیے کہا گیا ہے کہ وہ تمام کتابوں کی جامع ہے وہ وہاں سے آسانی سے نقل کی جاتی ہیں یا منسوخ کی جاتی ہیں

Marfat.com

کیونکہ تمام علوم اسی کی طرف منسوب ہیں اور اسی سے پھوٹتے ہیں (خلیل) ابن عطیہ کا قول ہے کہ 'لوح محفوظ تمام ہونے والے واقعات کا دیوان ہے جن کے بارے میں پہلے ہی قضا و قدر میں فیصلہ ہو چکا ہوتا ہے کہ ان کو تبدیل کر دیا جائے گا یا مٹا دیا جائے گا یا ثبت کیا جائے گا۔ علمائے کرام کے نزدیک اس میں حکمت یہ ہے کہ فرشتوں کو پتہ چل جائے کہ اللہ تعالیٰ تمام معلومات کی تفصیل کا علم رکھتا ہے'۔

دوسرا قول ہے کہ 'اُم الکتاب' سے مراد اللہ تعالیٰ کا ازلی و ابدی علم ہے کیونکہ وہ تمام موجودات اور معدومات کا علم رکھتا ہے۔ اس کا علم تغیر سے پاک ہے۔ ہر چیز اس کے مطابق وقوع پذیر ہوتی ہے اس لیے وہ ان واقعات کے لیے اُم کی حیثیت رکھتا ہے۔ وہ جس چیز کو کتاب میں سے مٹانا چاہتا ہے مٹا دیتا ہے اور جسے ثبت کرنا چاہتا ہے ثبت کر دیتا ہے۔ یہ قرآن حکیم اس کے ازلی علم میں ہے۔ یہ بڑی شان والی کتاب ہے کیونکہ وہ ان اسرار و رموز پر مشتمل ہے جس پر انسان کی سعادت اور ہدایت کا دارومدار ہے۔ یہ دوسرا قول پہلے قول سے صحیح تر ہے کیونکہ لوح محفوظ کی تشریح بھی یہ کی جاتی ہے کہ اس سے مراد اللہ کا ازلی علم ہے۔

امام راغب اور بعض دوسرے اہل لغت مثلاً صاحب القاموس المحیط اور المصباح المنیر نے 'اُم الکتاب' سے مراد سورۃ فاتحہ لی ہے کیونکہ قرآن کا آغاز اس سے ہوتا ہے گویا یہ قرآن کے دیباچہ اور مقدمہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ جبکہ امام طبری نے اپنی تفسیر میں مالک بن دینار کے حوالہ سے 'حسن' کا قول نقل کیا ہے کہ سورۃ فاتحہ کو 'اُم القرآن' کہا جاتا ہے نہ کہ 'اُم الکتاب'، عکرمہ کا قول ہے کہ 'اُم الکتاب' سے مراد قرآن کریم ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: 'وَلِتُنذِرَ أُمَّ الْقُرَىٰ وَمَنْ حَوْلَهَا' (الأنعام ۶:۹۲؛ الزخرف ۴۳:۷)۔ تاکہ آپ بستیوں کی ماں اور اس کے اردگرد کے لوگوں کو آگاہ کریں۔ 'اُم' ہر اُس چیز کو کہتے ہیں جو کسی کی اصل ہو۔ مکہ کی حیثیت اصل کی ہے اور دوسری ساری بستیاں اس کے تابع ہیں، اس لیے کہ وہ زمین کے وسط میں ہے یا اس لیے کہ وہ دنیا والوں کا قبلہ ہے۔ اس میں لوگ ایسے جمع ہوتے ہیں جیسا کہ بچے ماں کی آغوش میں جمع ہوتے ہیں اور اس کی اسی طرح تعظیم کرتے ہیں جیسے کہ وہ اپنی ماں کی کرتے ہیں۔ اس لیے دوسری بستیوں کے مقابلہ میں اس کی شان بڑی ہے یا اس لیے کہ اللہ نے لوگوں کے لیے پہلا گھر وہاں بنایا۔ باقی بستیاں اس کے اردگرد بعد میں بنیں۔ اسے 'اُم القریٰ' بالکل اسی طرح کہا گیا جس طرح عرب اپنے اصل عظیم الشان اور بہترین قصیدوں کو اُمہات القصائد کہتے ہیں۔ ایک اور مقام پر اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: 'وَمَا كَانَ رَبُّكَ مُهْلِكَ الْقُرَىٰ حَتَّىٰ يَبْعَثَ فِي أُمِّهَا

Marfat.com

رَسُوۡلاً' (القصص ۲۸:۵۹)۔'تمھارا رب کسی بستی کو اس وقت تک ہلاک نہیں کرتا جب تک ان بستیوں کی ماں (یعنی مرکزی بستی) میں کوئی رسول نہ بھیج دے۔اس آیت مبارکہ کی رو سے ہر بڑا شہر یا قصبہ اپنے اردگرد کی بستیوں کے لیے اُمّ کی حیثیت رکھتا ہے کیونکہ سب بستیاں اسی کی طرف رجوع کرتی ہیں اور اسی بستی میں ان بستیوں کا حاکم رہتا ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:' وَاَمَّا مَنۡ خَفَّتۡ مَوَازِیۡنُهٗ۝فَاُمُّهٗ هَاوِیَةٌ۝ (القارعۃ۱۰۱:۸تا۹)۔'پس جس کا میزان ہلکا ہوگا اس کی ماں (ٹھکانا) جہنم کا گڑھا ہوگا'۔یہاں 'اُم' سے مراد مسکن اور ہر وہ چیز ہے جس میں دوسری چیزیں جمع ہوں یا سما جائیں۔ماں کی آغوش کے اعتبار سے مسکن کو 'اُم' کہا گیا ہے۔جب کافر کے لیے اور کوئی جائے پناہ نہ ہو تو آگ اس کو اس طرح پناہ دیتی ہے جیسے ماں اپنے بچے کو۔یہاں 'اُم' مسکن کے معنوں میں بالکل اسی طرح ہے جس طرح زمین کو اُم الناس کہا جاتا ہے کیونکہ وہ بھی لوگوں کا مسکن ہے جس میں وہ پناہ لیتے ہیں۔

آپ نے دیکھا کہ مذکورہ بالا آیات میں اللہ تعالیٰ نے لوحِ محفوظ یا اپنے ازلی علم اور تمام آسمانی کتابوں، قرآن حکیم اور اس کی واضح آیات کو لفظ 'اُم' کے ساتھ نسبت دے کر ماں کی صورت میں خاتون کی قدرومنزلت، رفعت اور عظمت کو اجاگر کیا ہے۔پھر اسے جائے پناہ اور سکون کا مقام قرار دیا ہے۔ خاتون کو کم عقل، فتنہ اور بدی کا سرچشمہ سمجھنے والے ان آیات کو بھی دیکھ لیا کریں۔

اُمّت

علمائے لغت کی تشریح کے مطابق ماں کے لیے اُم اور اُمۃ دونوں لفظ استعمال ہوتے ہیں۔خلیل کا قول ہے کہ ہر وہ چیز جس میں اردگرد کی دوسری چیزیں جمع ہو جائیں یا ضم ہو جائیں 'اُم' کہلاتی ہے۔ چونکہ 'اُم' اور 'اُمۃ' (اُمت) کا مادہ ایک ہے۔اس لیے یہ تعریف اُمت پر بھی صادق آئے گی۔ المفردات میں ہے کہ 'اُمت ہر اس جماعت کو کہتے ہیں جن کو ایک عامل مثلاً ایک دین یا ایک زبان یا ایک مکان ایک ساتھ جمع کر دے'۔یہ ایک ایسی جماعت ہوتی ہے جس میں اکثر لوگوں کی اصل ایک ہوتی ہے اور ان میں ایک جیسی موروثی صفات، خواہشات اور مصلحتیں پائی جاتی ہیں۔یہ ساتھ امام راغب کی رائے میں اختیاری بھی ہو سکتا ہے اور اجباری بھی۔اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:'وَمَا مِنۡ دَآبَّةٍ فِی الۡاَرۡضِ وَلَا طٰٓئِرٍ یَّطِیۡرُ بِجَنَاحَیۡهِ اِلَّاۤ اُمَمٌ اَمۡثَالُكُمۡ' (الانعام ۶:۳۸) 'جانوروں کی ہر نوع اس ڈگر پر چل رہی ہے جو اللہ نے تسخیراً ان کی فطرت میں ودیعت کی ہے'۔یہاں حیوانات کی ہر جنس کو اُمت کہا گیا ہے جو اجباری طور پر ایک ساتھ ہیں۔

Marfat.com

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: 'كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَاحِدَةً' (البقرة ۲:۲۱۳)۔ 'لوگ ایک ہی دین یا طریقہ پر تھے' یعنی ایک ہی صنف کفر اور گمراہی کے ایک ہی راستہ پر تھے تو اللہ نے انبیا کو بشیر و نذیر بنا کر بھیجا۔ انسانوں کی جماعت کا یہ اکٹھ اختیاری تھا۔ دوسری جگہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: 'وَلَوْ شَاءَ اللّٰهُ لَجَعَلَكُمْ أُمَّةً وَاحِدَةً' (المائدہ ۵:۴۸) 'اگر اللہ چاہتا تو تم سب کو ایک دین یا ایک طریقے پر لے آتا' یعنی ایمان اور اس کے قول و قرار پر سب کو جمع کر دیتا لیکن یہ اکٹھ اجباری ہوتا۔ جو صاحب اختیار انسانوں کے لیے مناسب نہ تھا'۔ چنانچہ اللہ نے ایک زمانہ کے لوگوں کی طرف انبیا کو بھیجا۔ اُمتِ محمد میں ہر وہ شخص شامل ہے جس کی طرف ان کو بھیجا گیا خواہ وہ ایمان لے آیا یا کفر پر اڑا رہا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: 'إِنَّا وَجَدْنَا آبَاءَنَا عَلَىٰ أُمَّةٍ' (الزخرف ۴۳:۲۲) 'ہم نے اپنے آبا کو ایک طریقہ یا ایک دین پر پایا'۔ پھر اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ 'وَلْتَكُن مِّنكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُونَ إِلَى الْخَيْرِ' (آلِ عمران ۳:۱۰۴)۔ 'تم میں سے ایک جماعت ہونی چاہیے جو نیکی کی دعوت دے'، یعنی ایسی جماعت جو علم و عمل صالح کو اختیار کر کے دوسروں کے لیے نمونہ بن سکے'۔

تمام مذکورہ آیات میں اُمت، دین، طریقہ اور جماعت کے معنی میں استعمال ہوا ہے یعنی وہ تمام ہم مشرب لوگ جو ایک مرکز (اُم) پر جمع ہوئے ہیں۔ اُمت کا لفظ جماعت کے لیے بھی استعمال ہوا ہے اور نسل و جنس کے لیے بھی۔ ان دونوں معنوں میں اسے 'اُم' کی حیثیت حاصل ہے۔

ایک اور مقام پر اُمت کا لفظ بلیغ معنی میں استعمال ہوا ہے۔ ارشاد باری ہے: 'إِنَّ إِبْرَاهِيمَ كَانَ أُمَّةً' (النحل ۱۶:۱۲۰)۔ 'بے شک حضرت ابراہیم علیہ السلام ایک اُمت کے قائم مقام تھے' یعنی ابراہیم علیہ السلام اللہ کی عبادت اور اطاعت میں بمنزلہ ایک جماعت تھے۔ وہ بہت سی خوبیوں کے جامع تھے۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے عربی میں کہا جاتا ہے کہ 'فلان في نفسه قبيلة'، 'فلاں اپنی ذات میں ایک قبیلہ کے برابر ہے' یا اردو میں کہا جاتا ہے کہ وہ اپنی ذات میں ایک انجمن ہے۔ ابن قتیبہ کا قول ہے کہ 'یہاں اُمت امام کے معنوں میں ہے یعنی وہ امام تھے جن کے نقشِ قدم پر چل کر لوگوں نے ہدایت پائی'۔ خلیل کا قول ہے کہ اس سے مراد وہ انسان ہے جو ادیانِ باطلہ کے مقابلہ میں سچے دین پر قائم ہو۔ جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے زید بن عمرو بن نفیل کے بارے میں فرمایا 'يبعث أمة وَاحدة' یعنی اسے ایک اُمت کے قائم مقام کی حیثیت سے اٹھایا جائے گا۔

اُمّی

'اُمی' کا لفظ 'اُم' کی طرف منسوب ہے۔ ابن فارس نے مقاییس میں ابو عبید کا قول نقل کیا ہے

Marfat.com

کہ اُمی' اُسے کہتے ہیں جو اپنی اصل جہالت پر ہو اور لکھنا نہ جانتا ہو اور وہ ایسا ہی ہو جیسا کہ اس کی ماں نے اسے جنم دیا۔ یعنی وہ اپنی جبلت پر ہے اور کتابت کو، جو ایک کسبی چیز ہے، نہیں جانتا۔

اِمام

اس کا مادہ بھی 'اُم' ہے۔ اِمام اُسے کہتے ہیں جس کے پیچھے بہت سے لوگ جمع ہوں اور اس کی پیروی کریں اور اسے تمام معاملات میں مقدم سمجھا جائے جیسا کہ قرآن حکیم کو 'اِمام مبین' کہا گیا ہے۔ المصباح المنیر میں ہے کہ اس کا اطلاق مذکر اور مؤنث دونوں پر ہوتا ہے۔ اُس نے ابن السکیت کا حوالہ دے کر کہا ہے کہ اُنھوں نے اپنی کتاب المقصود والمحدود میں کہا ہے کہ عرب کہتے ہیں: 'عاملنا امرأة۔ امیرنا امراة' ہمارا عامل (گورنر) اور ہمارا امیر (حاکم) خاتون ہے اور فلاں خاتون فلاں کی وصی ہے۔ یہاں امیر، عمل اور وصی کے الفاظ مذکر استعمال کیے گئے ہیں۔ حالانکہ ان کا اطلاق خواتین پر بھی ہوتا ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ فلاں خاتون فلاں قبیلہ کی موذن ہے اور فلاں بات کی شاہد ہے۔ ان تمام الفاظ میں تذکیر و تانیث کا کوئی اِمتیاز نہیں جیسا کہ اللہ نے خود اس آیت میں تذکیر و تانیث کا امتیاز نہیں رکھا: 'اِنَّهَا لَاِحْدَى الْكُبَرِ ٥ نَذِيْرًا لِّلْبَشَرِ ٥' (المدثر ۷۴: ۳۵ تا ۳۶)۔ یہ بڑی نشانیوں میں سے ایک ہے، انسان کو ڈرانے والی۔ نذیر اس آیت میں مذکر ہے جو اِحدیٰ مؤنث کی صفت ہے۔

'اُم' اپنے حقیقی معنوں میں قرآن حکیم میں کئی ایک مقامات پر مذکور ہے۔ پہلے ہم ان آیات مبارکہ کا ذکر کریں گے جن میں والد اور والدہ کا ذکر ایک ساتھ موجود ہے۔ پھر ان آیات کا جن میں لفظ 'اُم' مستقل طور پر استعمال ہوا ہے۔ اس سلسلہ میں ایک اہم نکتے کی طرف اشارہ بے جا نہ ہوگا کہ والدین یا ابوین (ماں باپ) کا لفظ جہاں جہاں قرآن میں استعمال ہوا ہے وہ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ والد اور والدہ کا باہمی تعلق شراکت کا تعلق ہے وہ ایک دوسرے کے شریک حیات ہیں نہ کہ حاکم و محکوم۔ جو لوگ حاکم و محکوم کے نظریے کے قائل ہیں ان کو ان الفاظ کی ساخت پر غور کرنا چاہیے۔ ان کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ عربی زبان میں تثنیہ کا صیغہ اور تثنیہ کی ضمیر مرد اور عورت کے لیے ایک جیسے ہوتے ہیں اور وہ باہمی شراکت پر دلالت کرتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: 'وَوَصَّيْنَا الْاِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ حَمَلَتْهُ اُمُّهٗ وَهْنًا عَلٰى وَهْنٍ وَّفِصٰلُهٗ فِيْ عَامَيْنِ اَنِ اشْكُرْ لِيْ وَلِوَالِدَيْكَ اِلَيَّ الْمَصِيْرُ' (لقمان ۳۱: ۱۴) 'اور ہم نے انسان کو حکم دیا کہ والدین کے ساتھ (حسن سلوک کرے) اس کی ماں نے کمزوری پر کمزوری برداشت کر کے اس کا حمل

Marfat.com

اُٹھایا اور دو سال میں اس کا دُودھ چھڑایا (اور اسے کہا) کہ میرا اور اپنے والدین کا شکر ادا کرے۔ لوٹنا تو تم نے میری طرف ہے۔ اسی مضمون کو سورۃ احقاف میں اس طرح بیان کیا ہے۔ وَوَصَّيْنَا الْإِنسَانَ بِوَالِدَيْهِ إِحْسَانًا حَمَلَتْهُ أُمُّهُ كُرْهًا وَوَضَعَتْهُ كُرْهًا وَحَمْلُهُ وَفِصَالُهُ ثَلَاثُونَ شَهْرًا (احقاف ۴۶:۱۴) اور ہم نے انسان کو حکم دیا کہ وہ اپنے والدین کے ساتھ حسن سلوک کرے۔ اس کی ماں نے درد سہہ کر اس کا حمل اُٹھایا اور درد سہہ کر اسے جنم دیا۔ اس کے حمل اور دودھ چھڑانے میں تیس ماہ کا عرصہ ہے۔ حمل میں کمزوری پر کمزوری اور تکلیف پر تکلیف اُٹھاتی رہی اور لوتھڑے کی شکل، ننگی ہڈیوں کی شکل، گوشت چڑھی ہڈیوں کی شکل، پورے انسان کی شکل (الزمر ۳۹:۶) جوں جوں حمل بڑھتا جاتا ضعف اور تکلیف بھی بڑھتی رہی۔ ماں کا پیٹ اللہ کے کمال علم اور قدرت کا مظہر ہے۔ جو تین اندھیروں میں ایک نطفے کو مکمل انسان بنانے کی قدرت رکھتا ہے۔ وہ انسان کو دوبارہ زندہ رکھنے پر کیسے قدرت نہیں رکھتا جو تین اندھیروں میں بچے کا حال جان سکتا ہے۔ اس سے بندوں کی ظاہری حالت کیسے مخفی رہ سکتی ہے؟ (النجم ۵۳:۳۲) اللہ نے اپنے بندوں کے کان آنکھیں اور دل بنائے، ان کو علم اور عقل ماں کے پیٹ سے نکالنے کے بعد عطا کیا۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کو شرک سے منع فرمایا۔ شکل وصورت میں خدمت اور اطاعت عبادت سے قریب تر ہوتی ہے۔ اللہ نے واضح طور پر بتا دیا کہ اس کی ممانعت نہیں بلکہ بعض صورتوں میں یہ اللہ کے سوا دوسروں کے لیے واجب ہوتی ہے جیسا کہ ماں باپ کی خدمت اور اطاعت بشرطیکہ وہ شرک پر مجبور نہ کریں (العنکبوت ۲۹:۸)۔ جہاں اللہ کا حق اور انسان کا حق باہم متصادم ہوں وہاں انسان کی اطاعت چھوڑ کر اللہ کی فرمانبرداری کرنی پڑے گی لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم والدین کی خدمت سے ہاتھ کھینچ لیں یا ان سے گستاخی سے پیش آئیں۔ ہمارا رویہ بالکل وہی ہوگا جو حضرت سعدؓ بن ابی وقاص کا اپنی والدہ کے ساتھ تھا جو ان کو دین اسلام چھوڑنے پر مجبور کرتی تھیں۔ قرطبی کا قول ہے کہ یہ آیت اور سورۃ العنکبوت کی آیت حضرت سعدؓ بن ابی وقاص کے بارے میں نازل ہوئیں۔

اللہ نے اپنے خاص فضل وکرم سے بندے کو وجود عطا کیا۔ پہلے اسے پیدا کیا۔ پھر اسی کی بقا کے لیے رزق کا سامان فراہم کیا۔ پھر اپنے فضل سے ماں کو بھی یہ دونوں قوتیں عطا کیں، قوت تخلیق اور قوت بقا، جو حقیقت میں نہ سہی شکل وصورت میں ربانی قوتوں کا پرتو ہیں۔ حمل سے وجود میں لانے کی قوت کا اظہار ہوتا ہے اور رضاعت سے بقا اور تربیت کی قوت کا اظہار ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان آیات میں فرماتا ہے کہ ماں کی وجہ سے انسان کو وجود و بقا ملی جو شکل وصورت میں اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ وجود و بقا کا

Marfat.com

مظہر ہے۔اسی لیے انسان پر والدین کی خدمت اور اطاعت واجب ٹھہری کیونکہ ظاہری طور پر یہ خدمت واطاعت عبادت سے ملتی جلتی ہے۔گویا کہ انسان پر اس وصیت کے وجود کا سبب وہ تکالیف ہیں جو ماں طویل عرصہ تک حمل رضاعت اور تربیت کے سلسلے میں برداشت کرتی رہتی ہے۔اسی لیے بطور خاص اکیلا ماں کے عظیم ترحق کو یاد دلایا گیا ہے اور باپ کے احسان کا ذکر کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی۔

البحر المحیط کے مصنف نے زیر نظر آیت کے سلسہ میں ایک لطیف نکتہ یہ بیان کیا ہے کہ آیت میں باپ کا ذکر صرف ایک مرتبہ ہے یعنی والِدَیہِ (اپنے والدین) جبکہ ماں کا ذکر تین مرتبہ ہے یعنی وَالِدَیہِ میں پھر حَمَلَتهُ (اس کا حمل اُٹھانا) میں پھر فِصَالُهُ (اس کا دودھ چھڑانا) اور یہ نبی کریم ﷺ کے اس قول کے عین مطابق ہے جس میں اُنھوں نے تین چوتھائی حسن سلوک ماں کے لیے مخصوص کیا اور ایک چوتھائی باپ کے لیے۔ترمذی اور ابوداؤد نے بہز بن حکیم سے روایت کی ہے کہ ایک آدمی نے اللہ کے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا: اے اللہ کے رسول میرے حسن سلوک کا زیادہ حق دار کون ہے؟ آپ نے فرمایا: تیری ماں۔اس نے دوبارہ پوچھا، پھر کون؟ فرمایا: تیری ماں۔اس نے تیسری بار پھر پوچھا، پھر کون؟ فرمایا: تیری ماں۔پھر پوچھا پھر کون؟ فرمایا: تیرا باپ۔صاحب کشاف نے ایک حکایت بیان کی ہے کہ کوئی عرب ماں کو پیٹھ پر اُٹھا کر حج کر رہا تھا ساتھ ساتھ یہ رجز پڑھتا جاتا تھا۔

أحمل أمّی وھی الحمالہ

ترضعنی الدرّۃ والعلالہ

لا یجاری والد فعالہ

میں اپنی ماں کو اُٹھائے ہوئے ہوں اس حال میں کہ وہ مجھے اُٹھاتی رہی ہے

وہ مجھے ایک بار پھر دوسری بار دودھ پلاتی رہی ہے

اس کے کارہائے خیر کا بھلا والد کیسے مقابلہ کر سکتا ہے؟

قرآن حکیم نے کئی ایک مقامات پر دو ایسی ماؤں کا ذکر کیا ہے جنھوں نے اپنی کھوکھ سے اولوالعزم پیغمبروں کو جنم دیا جن کے ساتھ حق تعالیٰ، فرشتے کے ذریعے ہم کلام ہوا اور جنھوں نے اپنے وقت کی انتہائی طاقتور سیاسی اور اجتماعی قوتوں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔زندہ جاوید کتاب میں ان ماؤں کا بطور خاص ذکر خواتین کے لیے بہت بڑا اعزاز ہے۔میری مراد ام موسیٰ علیہ السلام اور ام عیسیٰ علیہ السلام سے ہے۔قرآن مجید نے ان کا ذکر اپنے معجزانہ انداز بیان میں کیا ہے اور ثابت کیا ہے کہ مردوں کی طرح عورت اعلیٰ ذہنی اور روحانی صلاحیتوں کی حامل ہوتی ہے اور وہ اپنی کاوشوں سے معاشرے اور تاریخ کا رُخ بدل سکتی ہے۔

Marfat.com

اُم موسیٰ

موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کا ذکر چار مرتبہ قرآن مجید میں آیا ہے۔ وہ چار مقامات سورۃ اعراف (۷:۱۰)؛ سورۃ طٰہٰ (۲۰:۳۸ تا ۴۰؛ ۹۴)؛ سورۃ قصص (۲۸:۷ تا ۱۳) میں ہیں۔ ان میں سے دو مقامات میں حضرت ہارون علیہ السلام نے موسیٰ علیہ السلام کو اپنی ماں کا واسطہ دیا ہے۔ اس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔ یہاں ہم باقی دو مقامات کا بیان کریں گے کیونکہ ان میں موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کی شخصیت اور ان کا مرتبہ و مقام اُبھر کر سامنے آتا ہے۔

سورۃ طٰہٰ میں اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ 'ہم نے تیری ماں کی طرف ایسی بات کی وحی کی، جو وحی ہی کے ذریعے بتائی جا سکتی تھی' اور سورۃ قصص میں نبی کریم ﷺ کو موسیٰ علیہ السلام و فرعون کا قصہ بتایا جا رہا ہے اور چلتے چلتے ارشاد ہوتا ہے کہ 'اور ہم نے موسیٰ علیہ السلام کی ماں کی طرف وحی کی'۔ وحی کی تفصیل سورۃ قصص میں نسبتاً تفصیل سے بیان کی گئی ہے۔ وحی یہ تھی کہ موسیٰ علیہ السلام کو دودھ پلاؤ اور جب خوف محسوس کرو تو تابوت (درز بند صندوق) میں ڈال کر دریا میں ڈال دو۔ خوف اور غم بالکل محسوس نہ کرو۔ ہم اسے تمھاری طرف لوٹا دیں گے اور اسے پیغامبر بنائیں گے (القصص ۲۸:۷)۔ دریا کو حکم دیا کہ وہ انھیں ساحل پر پھینک دے۔ پھر میرا اور اس کا دشمن اسے پکڑ لے گا (طٰہٰ ۲۰:۲۹)۔ اللہ نے یہ ساری تدبیر موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کو بذریعہ وحی بتا دی۔

ان آیات میں وہ بات جو سب سے پہلے مفسرین کی توجہ کا مرکز بنی ہے وہ لفظ 'وحی' ہے۔ اللہ نے موسیٰ علیہ السلام کی ماں کی طرف وحی بھیجی یعنی ایک خاتون کی طرف وحی بھیجی، یہ بات ان کو کھٹکی، کیونکہ یہ ان خیالات سے ٹکراتی تھی، جو اس معاشرے کے دباؤ کے تحت ان کے ذہن میں راسخ ہو چکے تھے۔ امام رازی نے اپنی تفسیر میں اس لفظ پر قدرے تفصیل سے خامہ فرسائی کی ہے۔ ان کی رائے میں ایک خاتون جو قضا کی صلاحیت رکھتی ہو نہ امامت کی، بلکہ وہ تو اپنے سرپرست کی اجازت کے بغیر امام شافعی کے نزدیک نکاح بھی نہیں کر سکتی۔ اس میں وحی اور نبوت کی صلاحیت کیسے ہو سکتی ہے؟ چنانچہ اُنھوں نے چھ مختلف توجیہیں کی ہیں۔ ان میں سے ایک توجیہ کو علمائے دین کی طرف منسوب کیا گیا ہے، یعنی یہاں 'وحی' سے مراد 'الہام' ہے۔ ایک قول ہے کہ یہاں 'وحی' سے مراد 'خواب' ہے۔ کچھ توجیہیں انھوں نے ایسی کی ہیں جو خلاف واقع ہیں، مثلاً یہ کہ وحی اس وقت کے پیغمبر شعیب علیہ السلام کو ہوئی، انھوں نے بالمشافہ یا خط و کتابت کے ذریعہ موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کو خبر دی۔ قرآن میں مذکور موسیٰ علیہ السلام کا سارا قصہ اس کی تردید کرتا ہے۔ پھر انھوں نے اس سے بھی بڑھ کر انہونی بات کر دی کہ ہو سکتا ہے یہ وحی حضرت ابراہیم علیہ السلام یا حضرت

Marfat.com

اسحاق علیہ السلام یا حضرت یعقوب علیہ السلام کو کی گئی ہو اور شدہ شدہ یہ بات موسیٰ علیہ السلام کی والدہ تک پہنچ گئی ہو۔ آخر میں اُنھوں نے ایک ایسی بات کہی ہے جو ان کے اپنے قول کی تردید کرتی ہے۔ فرماتے ہیں ہوسکتا ہے کہ اللہ نے فرشتہ ان کی طرف نبی کی حیثیت میں نہ بھیجا ہو، بالکل اسی طرح جیسے مریمؑ کی طرف بھیجا گیا۔ کم از کم اس سے یہ بات تو ثابت ہوگئی کہ خاتون میں یہ صلاحیت موجود ہے کہ اللہ تعالیٰ فرشتوں کے ذریعہ ان سے ہم کلام ہو۔ قرآن حکیم کی صریح نص کی مخالفت کیسے کی جاسکتی ہے؟

مذکورہ آیات کے الفاظ بتا رہے ہیں کہ یہ وحی ہی تھی الہام یا خواب نہ تھا۔ سورۃ طٰہٰ کے الفاظ پر غور فرمائیں 'ہم نے تیری ماں کی طرف اس بات کی وحی کی، جو وحی کے ذریعہ ہی بتائی جاسکتی تھی'۔ یعنی ہم نے ان کی طرف ایک ایسی بات کی وحی کردی جس کی طرف پہنچنے کا یا اس کے بارے میں علم حاصل کرنے کا کوئی اور ذریعہ نہ تھا۔ اس میں دینی مصلحت تھی۔ ایک ہونے والے رسول کی زندگی کا سوال تھا اسے بذریعہ وحی بتانا ضروری تھا۔ اب اس تعبیر پر غور کریں 'اس کو ڈال دو' اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ یہ قول وحی ہے نہ کہ الہام یا خواب۔ پھر اللہ کا یہ وعدہ کہ 'میں اسے تیرے پاس لوٹاؤں گا اور اسے نبی رسول بناؤں گا' کیا وعدہ الہام یا خواب میں کیا جاسکتا ہے؟ یہ بات صرف وحی کے ذریعے بتائی جاسکتی ہے۔ محض الہام یا خواب کی بنیاد پر کون اپنے گوشۂ جگر کو اپنی آغوش سے نکال کر دریا کی آغوش میں پھینک سکتا ہے؟ موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کو یقین تھا کہ یہ وحی الٰہی ہے۔ چنانچہ انھوں نے حکم کی تعمیل میں پل بھر دیر نہ کی اور اسے دریا میں ڈال دیا۔ ابوحیان نے البحر المحیط میں اِن الفاظ سے اِن لوگوں کے قول کے خلاف استدلال کیا ہے جو کہتے ہیں کہ وحی سے مراد الہام یا خواب ہے۔ کیونکہ الہام یا خواب میں اس قسم کا یقینی 'وعدہ' نہیں ہوسکتا۔ یہ ساری کی ساری تدبیر الٰہی تھی جسے کامیاب بنانے کے لیے اللہ تعالیٰ قدم قدم پر موسیٰ علیہ السلام کی والدہ محترمہ کی رہنمائی کر رہا تھا۔ حالات پُرخطر تھے، دشمن جور واستبداد کی علامت تھا اس کا مقابلہ کرنا ایک انسان کے بس کی بات نہیں تھی۔ اس کا مقابلہ کرنے کے لیے ربانی ہدایت کی ضرورت تھی۔ اِمام ابن جریر نے سدی کا قول نقل کیا ہے کہ یہاں وحی سے مراد وحی ہی ہے۔ محمود آلوسی نے سورۃ القصص کی اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے لکھا ہے: 'فرشتوں کو غیر انبیا کی طرف بھی بھیجا جاتا ہے اور وہ ان سے ہم کلام ہوتے ہیں' اور یہی قطرب اور اس کے ساتھیوں کا مذہب ہے ان میں سے مقاتل کا قول ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کی ماں کی طرف جو فرشتہ بھیجا گیا وہ جبرائیل علیہ السلام ہے۔

اب آیئے اصل قصے میں موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کے کردار کی طرف

جب فرعون نے بچوں کی تلاش پر اصرار کیا (روایت ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کی تلاش میں فرعون نے ۹۰

Marfat.com

ہزار بچے ذبح کیے) تو اللہ نے موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کی طرف وحی کی کہ اِسے دریا میں ڈال دو۔ قرآنی الفاظ پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کی تدبیر کو انتہائی سرعت سے عملی جامہ پہنایا گیا۔ سورۃ طٰہٰ ۲۰:۳۹ میں ہے کہ أَنِ اقْذِفِيهِ فِي التَّابُوتِ فَاقْذِفِيهِ فِي الْيَمِّ۔

اللہ نے فرمایا: اِقْذِفِیْہِ (تو اسے پھینک دے) یہ اسی خطرے کی طرف اشارہ ہے جو فرعون کے جاسوسوں کی طرف سے دروازے پر دستک دے رہا تھا اگر والدہ حکم کی تعمیل جلدی سے نہ کرتیں تو وہ بچہ چھین کر فرعون کے پاس لے جاتے۔ تابوت میں ڈالنے کے فوراً بعد بغیر کسی وقت کے ضیاع کے بچے کو دریا میں ڈال دیا گیا۔ اسی لیے دونوں جملوں کو 'ف' سے جوڑا گیا ہے جو تعقیب مع الوصل (ایک کے بعد فوراً دوسرے) کا فائدہ دیتی ہے۔ قرآن حکیم نے قصوں کے بارے میں اپنے انداز بیان کے عین مطابق جن باتوں کو حذف کرنا تھا ان کو حالات کی دلالت پر اعتماد کرتے ہوئے حذف کر دیا۔ والدہ نے ایسا ہی کیا، جیسے ان کو حکم ملا تھا۔ دودھ پلایا، کتنا عرصہ دودھ پلایا اس کا کوئی بیان نہیں۔ بعض روایات میں ہے کہ کچھ مدت تک پلاتی رہیں تورات (خروج ۲:۳) میں ہے کہ تین ماہ دودھ پلاتی رہیں۔ لیکن ان حالات میں ایسا کرنا ناممکن لگتا ہے۔ جب والدہ کو خوف محسوس ہوا، وحی کی ہدایت کے مطابق دریا میں ڈال دیا اُنھوں نے حکم ماننے میں بھی پل بھر دیر نہ کی۔ تابوت کیسا تھا؟ بردی (مصر کا ایک پودا) کی ہلکی پھلکی لکڑی سے بنایا گیا تھا یا سرکنڈوں سے اس کا کوئی ذکر نہیں۔ وحی میں ارشاد ہوتا ہے کہ اپنے گوشۂ جگر کو دریائے نیل کی لہروں کے سپرد کر کے بچے کی ہلاکت کے بارے میں نہ بہت خوفزدہ ہونا اور نہ اس کے فراق میں غمزدہ ہونا، خوف کا تعلق مستقبل سے ہوتا ہے اور رنج و حزن کا ماضی سے۔ سمندر کی لہروں سے مت ڈرنا اور جدائی کا غم نہ کھانا۔ وہ اس پناہ میں ہے جہاں لوگوں کو سکون ملتا ہے۔ جو ہاتھ ابراہیم علیہ السلام کے لیے آگ کو ٹھنڈا کر کے سلامتی اور ٹھنڈک کا باعث بنا سکتے ہیں، کیا وہ ہاتھ دریا کی لہروں پر قابو پا کر انھیں ماں کی گود نہیں بنا سکتے؟ بچے کی سلامتی اس قادر مطلق کے ہاتھوں میں ہے۔ فرعون تو ایک طرف رہا، اللہ کی پناہ میں ہوتے ہوئے دنیا جہان کے سرکش اور جابر اس کا بال بیکا نہیں کر سکتے، غم کا ہے کا؟ خوش ہو جاؤ ہم نہ صرف اسے تیری آغوش میں واپس لے آئیں گے بلکہ اسے رسالت کے منصب پر بھی فائز کریں گے۔ یہ وحی سہمے ہوئے دل کی ڈھارس بندھاتی ہے۔ وہ جس نے انسان کو نفسِ واحدہ سے پیدا کیا ہے، وہ ایک ماں کو کہہ رہا ہے کہ مجھے ممتا کے جذبات کا خیال ہے۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ میرا کہا مان کر تو نے اپنے لختِ جگر کو اپنی آغوش سے نکال کر دریا کی آغوش میں ڈال دیا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ تجھے اپنے جگر گوشہ کی جدائی کا غم کھائے جا رہا ہے۔ تیرے اندر جو جذبات تڑپ رہے ہیں میں ان

Marfat.com

سے باخبر ہوں، مگر پریشان کا ہے کو ہوتی ہے۔ میں ہوں نا تیرے ساتھ، جو میرا کہا مانتے ہیں، میں ان کا ساتھ کبھی نہیں چھوڑتا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ پھر اس بچے کو آلِ فرعون نے نیچے سے اُٹھالیا۔ تابوت محل تک کیسے پہنچا، قرآن اس بارے میں کچھ نہیں بتاتا۔ روایت ہے کہ دریائے نیل سے فرعون کے باغ کی طرف ایک نہر نکلتی تھی۔ فرعون اور اس کی بیوی نہر کے کنارے سیر کو نکلے تو تابوت پر نظر پڑی۔ بیوی کے حکم سے اسے نکالا گیا۔ اسے کھولا گیا تو ایک انتہائی خوبصورت اور دلآویز بچہ نکلا۔ تابوت میں بند نیل کی لہروں پر سوار یکہ وتنہا اور موہنی صورت کا بچہ کس کا دل اسے دیکھ کر نہ پسیجا ہوگا؟ بچے کو دیکھ کر ان کے دل میں رحم آگیا۔ فرعون بھی تو آخر انسان تھا، پتھر تو نہیں تھا۔ قرآن کہتا ہے کہ اس رحم میں زیادہ دخل فرعون کی بیوی کا تھا۔ اس نے فرعون سے کہا! یہ میری اور تیری آنکھوں کی ٹھنڈک ہے اسے قتل نہ کرنا' ہوسکتا ہے یہ ہمارے لیے فائدہ مند ثابت ہو یا ہم اسے گود ہی میں لے لیں۔ یہ محبت کیسے پیدا ہوئی؟ اللہ کو پتہ تھا کہ تابوت اللہ کے دشمن کے ہاتھ لگے گا، اس لیے اللہ نے اس کی محبت دلوں میں ڈال دی تھی۔ یہ اللہ کی تدبیر تھی کہ فرعون اور اس کی بیوی نے موسیٰ علیہ السلام کو گود لے لیا۔ یہ محبت جو ان کے دلوں میں پیدا ہوئی، اللہ کی عطا کردہ تھی۔ جو ہاتھ موسیٰ علیہ السلام کو فرعون کے محل تک لے گیا وہی ہاتھ اسے اس کی بیوی کے دِل میں لے گھسا۔ بچے کی حفاظت نہ تو اسلحہ سے ہوئی، نہ جاہ و مال سے، بلکہ صرف اور صرف محبت سے ہوئی جو اللہ نے اس بچے کے لیے ہر دل میں پیدا کردی تھی۔ اس محبت سے جب فرعون کی سختی، حرص اور مصلحت ٹکرائے تو سب پاش پاش ہوگئے۔ سورۃ طٰہٰ میں اس تدبیر کی حکمت یہ بتائی ہے: لِتُصْنَعَ عَلٰى عَيْنِىْ 'تاکہ میری آنکھوں کے سامنے تجھے بنایا سنوارا جائے۔ اللہ کو یہ منظور تھا کہ موسیٰ علیہ السلام کی تربیت شاہی محل میں بہترین اساتذہ کے ہاتھ سے ہو۔ وہ اس زمانے کے علم وحکمت سے بہرور ہوں اور اس علم وحکمت کو کلمہ حق کی سربلندی کے لیے استعمال کرتے ہوئے فرعون، ہامان اور ان کے لاؤ لشکر کی غلطیوں کی نشاندہی کریں۔ قدرت فرعون، ہامان اور ان کے لشکر کو چیلنج دے رہی ہے کہ تم سب مل کر بھی اسے کوئی گزند نہیں پہنچا سکتے، بلکہ اس کے برعکس یہ بچہ تمھارا دشمن ہوگا اور جب تمھارے مقابلے میں آئے گا تو تم کفِ افسوس ملتے رہ جاؤ گے، اور کہو گے کہ اس کی پرورش کرکے ہم نے غلطی کی۔ ہوا بھی ایسا ہی جیسے اللہ نے انھیں وارننگ دی تھی۔ انھیں پتہ بھی نہ چلا کہ وہ کیا کر رہے ہیں۔

صد ہزاران طفل گشت از بروں
موسیٰ علیہ السلام اندر صدر خانہ در دروں

Marfat.com

اللہ فرماتا ہے کہ کہ آلِ فرعون نے ان کو نیچے سے اُٹھالیا۔مولانا امین احسن اصلاحی جو عربی زبان کے مزاج شناس ہیں فرماتے ہیں کہ 'لفظ آل سے معلوم ہوتا ہے کہ جب صندوق میں پڑے ہوئے بچے کا ذکر شاہی محل تک پہنچا تو شاہی خاندان کے سب چھوٹے بڑے موقع پر پہنچ گئے اور سب اُس کو اُٹھا کر محل میں لے آئے'۔

صندوق میں ڈالنے کے بعد اُم موسٰیؑ پر کیا گزری؟ اس نے وحی کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے اپنے بچے کو دریا کی لہروں کے سپرد تو کر دیا، لیکن آخر انسان تھیں، طرح طرح کے وسوسے پیدا ہونے لگے۔ جانے بچہ کس حال میں ہوگا؟ موجوں نے اس کے ساتھ کیا کیا ہوگا؟ سید قطبؒ اپنی تفسیر میں ادیبانہ الفاظ میں اُم موسٰیؑ کی اندرونی کیفیت کا نقشہ کھینچتے ہوئے فرماتے ہیں۔ 'ہوسکتا ہے کہ انھوں نے اپنے آپ سے یہ سوال پوچھے ہوں: میں نے کس قدر آسانی سے اپنے جگر کے ٹکڑے کو دریا کے سپرد کر دیا؟ وہ کام جو آج تک کسی ماں نے نہ کیا تھا میں کیسے کر گزری؟ خطرات کے ہوتے ہوئے وہ اتنی مطمئن کیسے ہو گئیں؟ ہاتف غیبی کی آواز کے سامنے وہ کیسے جھک گئیں؟' یہ اور ان جیسے کئی سوال ان کے ذہن سے گزرے ہوں گے۔ یہ درست ہے اللہ نے ان سے وحی کے ذریعے موسیٰ علیہ السلام کو ان کی گود میں واپس لانے کا وعدہ کیا تھا اور بشارت دی تھی کہ وہ ان کو پیغمبر بنائے گا۔ مگر یہ اندیشہ ہائے دور و دراز بشریت کا تقاضا ہیں، جبکہ موسیٰ علیہ السلام فرعون سے خوفزدہ تھے حالانکہ خود اللہ نے انھیں اس کی طرف جانے کا حکم دیا تھا۔ قرآنی تعبیر اُم موسیٰ علیہ السلام کے دل کی ایک جیتی جاگتی تصویر پیش کرتی ہے۔ ایک ایسا دل جو ہر چیز سے خالی تھا۔ اس میں عقل تھی نہ ہوش، صبر تھا نہ قرار، قدرت نہ اختیار۔ موسیٰ علیہ السلام کے غم کی وجہ سے اس دل سے کسی اور غم کا احساس بھی جاتا رہا تھا۔ خواہ! آپ فارغ کی تفسیر یہ کریں کہ موسیٰ علیہ السلام کے غم کے سوا سب غموں سے فارغ ہوگیا، یا یہ کریں کہ موسیٰ علیہ السلام کی یاد کے سوا ہر خیال دل سے نکل گیا، یا یہ کریں کہ وہ صبر و قرار سے خالی ہوگیا۔ یہ تعبیر ان تمام مفاہیم کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے۔ صاحب کشاف نے لکھا ہے کہ اسی طرح کی تعبیر 'وَأَفْئِدَتُهُمْ هَوَاءٌ' (ابراھیم ۱۴:۴۳) میں قرآن نے ان معنوں میں استعمال کی ہے کہ ان کے ہوش اُڑ گئے کیونکہ دل (دماغ) عقل کا مرکز ہوتا ہے، چنانچہ ارشاد باری ہے: 'فَتَكُونَ لَهُمْ قُلُوبٌ يَعْقِلُونَ بِهَا' (الحج ۲۲:۴۶)۔ اس کا دل جو جذبات و احساسات کا مرکز ہوتا ہے ایک خالی وجود کی شکل اختیار کر گیا۔ وہ ماں کی بے چینی اور بے قراری کے سلبی جذبات کے علاوہ دوسرے ایجابی جذبات قبول کرنے سے بھی قاصر ہوگیا۔ وہ تو ہوش و حواس کھو بیٹھی تھیں اگر رب العزت ان کے دل پر صبر کی گرہ نہ لگا دیتے تو قریب تھا کہ اس بے قراری میں ان کے منہ سے کوئی ایسی بات نکل جاتی

Marfat.com

جس سے سارا راز فاش ہو جاتا اور لوگوں کو پتہ چل جاتا کہ یہ اسرائیلی ماں کا بچہ ہے۔ عکرمہ اور مقاتل کا قول ہے: جب انھوں نے دیکھا کہ نیل کی لہریں تابوت کو تھپیڑے مار رہی ہیں تو شدت غم میں وہ کہنے ہی والی تھیں 'ہائے میرا بچہ'۔ ربط علی القلب (دل پر گرہ لگانا) مجاز ہے۔ اس کا مطلب ہے ان کے دل کو قرار اور چین عطا کیا، وارفتگی اور پریشان خیالی سے محفوظ رکھا۔ جس طرح کسی چھوٹنے اور بھاگنے والی چیز کو باندھ دیا جائے تو وہ قرار پکڑ جاتی ہے چنانچہ وحی کے ذریعہ سے پرسکون ہو گئیں اور ان کا خوف جاتا رہا۔ اللہ نے ایسا کیوں کیا؟ تاکہ ان کا شمار اہلِ ایمان ہی میں رہے۔

مولانا امین احسن اصلاحی نے اپنی تفسیر تدبر قرآن میں اس سلسلے میں بڑی خوبصورت بات کہی ہے۔ فرماتے ہیں 'حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ نے چونکہ بچے کو دریا میں ڈال کر موجوں کے حوالے کر کے اپنے ایمان اور توکل کی شہادت دی تھی اسی وجہ سے اللہ نے آگے چل کر ان کے دل کو سنبھال لیا کہ اس ایمان و توکل کی لاج رہے اور کوئی ایسی بات صادر نہ ہونے پائے جو اس کے منافی ہو'۔ اُم موسیٰ جس دولت ایمان سے بہرہ ور تھیں، اس کی وجہ سے وہ اس آزمائش میں بھی پوری اُتریں۔ ایک بات ذہن میں رہے کہ یہاں پر مومنات (مومن خواتین) کی جگہ مومنین (مومن مرد) کا لفظ اس بات پر دلالت کر رہا ہے کہ اللہ کی نعمت میں اہلِ ایمان مرد و زن برابر ہیں، ان میں کوئی فرق نہیں۔

اب اس آخری تدبیر کا ذکر ہے جو اللہ تعالیٰ نے دریا میں ڈالے جانے کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ان کی ماں کی طرف لوٹانے کے لیے اختیار کی۔ اس تدبیر کو عملی جامہ پہنانے کے لیے بنیادی کردار بھی ایک خاتون یعنی حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بہن ہی نے ادا کیا۔ جب اُم موسیٰ علیہ السلام کا دل موسیٰ علیہ السلام کے غم کے سوا ہر غم سے فارغ ہو گیا، تو انھوں نے موسیٰ علیہ السلام کی بہن سے کہا کہ اس کے پیچھے پیچھے جاؤ اور کوئی خبر لاؤ۔ اس آیت میں یہاں لفظ أخت کا استعمال بڑا معنی خیز ہے۔ یہ بھی تو کہا جا سکتا تھا کہ انھوں نے اپنی بیٹی سے کہا۔ مگر کہا یہ گیا کہ انھوں نے موسیٰ علیہ السلام کی بہن سے کہا، تاکہ ان جذباتِ محبت کو بیدار کیا جائے جو ایک بہن کے دل میں اپنے بھائی کے لیے ہوتے ہیں۔ قرآن عظیم نے اس تفصیل کو حذف کر دیا ہے کہ وہ چلتے چلتے فرعون کے محل میں کیسے پہنچی۔ بس یہ بتایا ہے کہ انھوں نے دور سے بچے کو دیکھ لیا اور دوسرے لوگوں کو ان کی موجودگی کا احساس تک نہ ہوا۔ قرآن حکیم نے اس بارے میں جو ترکیب استعمال کی ہے وہ ایجاز و اختصار کا مرقع ہے۔ اس ترکیب میں بَصُرَتْ بِهِ (اس نے اسے جان لیا)۔ 'بَصُرَ' کے بنیادی معنی دیکھنے کے نہیں بلکہ جاننے اور سمجھنے کے ہیں، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا قول ہے کہ قَالَ بَصُرْتُ بِمَا لَمْ يَبْصُرُوا بِهِ (طٰہٰ ۲۰:۹۶)۔

Marfat.com

اُم عیسیٰ علیہ السلام

قرآن حکیم میں 'اُم' کا لفظ اپنے حقیقی معنی میں اُم عیسیٰؑ کے لیے چار مرتبہ استعمال ہوا ہے۔ایک مرتبہ (۵:۱۱۰) 'اُم' کی بجائے والدہ کا لفظ استعمال ہوا ہے۔اس کے علاوہ لفظ مریم ذاتی نام کی حیثیت سے دس مرتبہ استعمال ہوا ہے۔ہم صرف ان مقامات کی تشریح کریں گے جن میں حضرت مریم کی شخصیت اور اللہ کی راہ میں ان کی خدمات نمایاں ہیں۔ان کی اپنی پیدائش کا واقعہ اور ان کے بیٹے عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش کا واقعہ دو اہم ترین مقامات ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے نسبتاً تفصیل سے بیان کیا ہے۔ اس کے علاوہ ان کی ایک خاصیت یعنی عصمت کی حفاظت کا ایک سے زیادہ مرتبہ تذکرہ کیا ہے اور ان کو دنیا جہاں کی سب خواتین پر فضیلت عطا کی ہے۔

اُم مریم کی منت

اللہ تعالیٰ نے جناب مریم کی پیدائش کا ذکر سورہ آل عمران کی تین آیات (۳۵:۳۷) میں کیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: 'اِذْ قَالَتِ امْرَاَتُ عِمْرٰنَ رَبِّ اِنِّیْ نَذَرْتُ لَکَ مَا فِیْ بَطْنِیْ مُحَرَّرًا فَتَقَبَّلْ مِنِّیْ اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ' (آل عمران ۳:۳۵)۔'جب عمران کی بیوی نے کہا! میرے رب جو کچھ میرے پیٹ میں ہے اسے میں نے تمام کاموں سے آزاد کر کے تیرے نام پر وقف کر دیا ہے۔بس تو اسے میری طرف سے قبول کر۔بے شک تو سننے والا اور جاننے والا ہے'۔

اس سے پہلی آیت میں بھی آل عمران کا ذکر ہے کہ اللہ نے ان کو منتخب کیا۔زیر نظر آیت میں اس انتخاب کی کیفیت کو واضح کیا گیا ہے پہلے عمران، حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت ہارون علیہ السلام کے باپ ہیں اور ان کی بھی مریم نامی ایک بیٹی تھی جو موسیٰ علیہ السلام اور ہارون علیہ السلام کی بہن تھیں۔دوسرے عمران بن ماثان ہیں۔دونوں عمرانوں کے درمیان ۱۳۰۰ برس کا طویل عرصہ ہے۔بنو ماثان بنو اسرائیل کے سردار، بادشاہ اور کاہن تھے۔ان میں سے ہر ایک کی نسل سے کوئی نہ کوئی بیت المقدس کی خدمت کے لیے وقف ہوتا تھا۔یہ وقف صرف لڑکوں کے لیے روا تھا، لڑکیوں کو اس کے لائق نہیں سمجھا جاتا تھا۔وقف ہونے والا سب کاموں سے کٹ کر اور آزاد ہو کر ہیکل کی خدمت کرتا، جھاڑو لگاتا اور چراغ جلاتا۔بالغ ہونے کے بعد اسے اختیار دیا جاتا، چاہے وہ ہیکل میں قیام کرے یا جہاں چاہے چلا جائے۔ایک دفعہ ہیکل میں قیام کو اختیار کرنے کے بعد پھر وہ اسے چھوڑ نہیں سکتا تھا۔انبیا اور کاہنوں کی نسل میں سے کوئی نہ کوئی بیت المقدس کی خدمت کے لیے وقف ہوتا تھا۔

عمران بن ماثان کی بیوی کا نام حنّہ بنت فاقوذ (لاطینی میں Anna اور انگریزی میں Anne) تھا،

Marfat.com

جوالیشاع (Elisabeth) بنت فاقوذ نامی حضرت زکریا علیہ السلام کی زوجہ کی بہن تھیں۔ اس اعتبار سے حضرت یحییٰ علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام خالہ زاد بھائی تھے۔ حنہ کی قبر دمشق سے باہر ہے اور شام میں عیسائی راہبوں کی خانقاہ دیرِ حنّہ کے نام سے مشہور ہے۔

قرآن کے الفاظ سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ عمران کی بیوی نے حمل ٹھہرنے کے بعد نذر مانی تھی۔ مگر کم وبیش سب مفسرین نے ابن اسحاق کی اس روایت کو پیش کیا ہے کہ وہ بانجھ تھیں۔ ان کی نظر ایک پرندے پر پڑی جو اپنے بچے کو دانا کھلا رہا تھا تو ان کے دل میں بچے کی خواہش نے جوش مارا۔ انھوں نے نذر مانی تو مریمؑ کا حمل ٹھہرا۔ اس کے بعد عمران وفات پا گیا۔ امام رازی نے عکرمہ کا قول پیش کیا ہے کہ وہ بانجھ تھیں اور اولاد کے بارے میں دوسری عورتوں پر رشک کرتی تھیں۔ پھر انھوں نے کہا کہ اے اللہ! میں تیرے نام کی نذر مانتی ہوں کہ اگر تو لڑکا دے دے تو میں اسے بیت المقدس کی دربانی کے لیے وقف کردوں گی۔ انھوں نے حسن بصری کا یہ قول بھی نقل کیا ہے کہ حنہ نے یہ نذر اللہ کے الہام کی وجہ سے مانی تھی۔

نذر یہ مانی کہ میں اسے دنیا کے کام دھندوں اور ماں باپ کی خدمت سے آزاد (محرر) کر کے تیرے لیے نذر مانتی ہوں کہ اسے خالص تیری عبادت کے لیے اور بیت المقدس کی خدمت کے لیے وقف کردوں گی۔ میرا اس پر کوئی اختیار نہ ہوگا، نہ میں اس سے کوئی خدمت لوں گی اور نہ ہی کسی اور کام پر لگاؤں گی۔ محرر وہ ہوتا ہے جو دنیا کا کوئی کام نہیں کرتا، وہ خالص اللہ کی عبادت کے لیے وقف ہوتا ہے۔

نذر کا قصہ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ اس کا دل ایمان سے لبریز تھا اور اللہ کی طرف اس کی توجہ کا یہ عالم تھا کہ وہ اپنی عزیز ترین متاع اکلوتی اولاد کو پیدا ہونے سے بھی پہلے اللہ کے نام پر وقف کرتی ہے۔ پھر خلوص مطلق کی تحریر (آزادی) سے تعبیر بڑی معنی خیز ہے، جس کا مطلب ہے کہ حقیقت میں آزاد وہی ہوتا ہے جو صرف اپنے رب کی بندگی کرتا ہے۔ یہ عبودیت ہی آزادی کی علامت ہے۔ اس کے علاوہ ہر قسم کی آزادی درحقیقت غلامی ہے۔ اس مومن خاتون کی یہ دُعا کہ میں اپنے جگر گوشے کو ہر قسم کی عبودیت کے لیے وقف کرتی ہوں تو اسے قبول فرما۔ ان کے خلوصِ دل، حسنِ نیت اور ایمان کامل کا پتہ دیتی ہے۔ اس نذر میں لڑکے کے بارے میں حسن طلب ہے، کیونکہ ان دنوں بیت المقدس کی خدمت کے لیے لڑکوں ہی کو آزاد کیا جاتا تھا اور لڑکی کو بعض جسمانی عوارض کی وجہ سے اس قابل نہیں سمجھا جاتا تھا۔ دعا کے آخر میں اُم مریم کا یہ قول کہ بے شک تو سننے والا اور جاننے والا ہے'ایک دردمند ماں کے دل کی آواز ہے کہ اے میرے رب تُو تو دعا سنتا بھی ہے اور قبول بھی کرتا ہے اور مناجات کے وقت دلوں کی حالت بھی جانتا

Marfat.com

ہے، اس لیے میری دعا بھی قبول کر لے۔ کس قدر یقین ہے اور توکل ہے ان کو اللہ کی ذات اور مشیت پر!

حضرت مریم کی پیدائش

جب عمران کی بیوی نے اس بچے کو جنم دیا جو ان کے پیٹ میں تھا۔ قرآن نے اس بچے کے لیے مؤنث کی ضمیر استعمال کی ہے۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ پیدا ہونے سے پہلے ہی اللہ کے علم میں یہ بات طے شدہ تھی کہ پیدا ہونے والی لڑکی ہوگی۔ جب لڑکی پیدا ہوگئی تو اس کی ماں نے کہا: اے میرے رب میں نے تو ایک لڑکی کو جنم دے دیا۔ گویا کہ وہ کہہ رہی ہیں خدایا! میرے ہاں تو لڑکی ہوئی ہے اب میں کیا کروں؟ عمران کی بیوی لڑکے کی آس لگائے بیٹھی تھیں، اسی لیے انھوں نے پہلے ہی پیٹ کے بچے کے بارے میں منت مانی تھی کہ وہ اسے بیت المقدس کے لیے وقف کردیں گی۔ ان کے ہاں دستور تھا کہ جسے مقدس ہیکل کی خدمت کے لیے آزادانہ طور پر وقف کیا جاتا ہے وہ لڑکا ہوتا ہے نہ کہ لڑکی۔ جب ان کی اُمید بر نہ آئی تو ان کے منہ سے ازراہِ حسرت وغم یہ بات نکلی۔ انھیں اس بات کا ڈر تھا کہ ان کی منت پوری نہ ہوگی اور اس میں اس شرمندگی کا اظہار بھی ہے جو وہ ایک لڑکی کو اللہ کے سامنے اس کی گھر کی خدمت کے لیے پیش کرنے میں محسوس کر رہی تھیں۔ یہ بات انھوں نے اللہ کو اطلاع دینے کے لیے نہیں بلکہ رہنمائی حاصل کرنے کے لیے حسرت بھرے لہجے میں کہی۔

محمود آلوسی نے روح المعانی میں ایک خوبصورت بات کہی ہے۔ وہ فرماتے ہیں: 'اور یہ جو بعض لوگ کہتے ہیں کہ مولود کو حقیر سمجھ کر اُم مریم قبولیت کی درخواست کر رہی ہے، وہ ہمارے کلام کے مقابلہ میں ایک گھٹیا قول ہے۔' ان کا قول یہ ہے کہ اس کلام کا مقصد اطلاع دینا نہیں محض حسرت وغم کا اظہار ہے۔ اللہ اُم مریم کے حسرت ویاس سے لبریز شعور کا ازالہ کرتے ہوئے اور ان کو دلاسہ دیتے ہوئے فرماتا ہے کہ افسوس کرنے یا غم کھانے کی کیا ضرورت ہے؟ اس نے جو بھی جنا ہے اللہ اُسے بہتر جانتا ہے اور اس میں لڑکے کے مقابلہ میں لڑکی کے فروتر ہونے کے بارے میں اس وہم کا ازالہ بھی ہے جو اُم مریم کے قول سے لوگوں کے ذہن میں پیدا ہوسکتا تھا اور ہوا بھی۔ اَعْلَمُ اسم تفضیل کا صیغہ ہے جو اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ اللہ اس مولود کے بارے میں آنے والے واقعات کی تفصیل جانتا ہے۔ یہ جملہ معترضہ ہے اور اللہ کا کلام ہے۔ یہ بات اللہ تعالیٰ نے مولود کی عظمت وشان بیان کرنے کے لیے کہی ہے اور یہ بتانے کے لیے کہ اگرچہ ماں اس کی قدر ومنزلت سے ناآشنا ہے، لیکن اللہ نے تو اس کے ساتھ بڑے بڑے کام وابستہ کیے ہیں اور وہ اسے دنیا جہان کے لیے نشانی بنانا چاہتا ہے اور اس نے آگے چل کر خانقاہیت کی غیر خداوندی قیود کو توڑ کر کتنے بڑے انقلاب کا موجب بننا ہے۔ ان کے ہاں بن باپ

Marfat.com

کے بچے نے جنم لینا ہے جس نے اپنی ماں کے ساتھ مل کر دنیا والوں کے لیے بدی کے خلاف تصادم کی ایک علامت بننا ہے۔ ماں ان تمام اُمور سے بے خبر ہے اس لیے رنج وحسرت کا اظہار کر رہی ہے جو اللہ جانتا ہے وہ نہیں جانتی۔ یہ سب اس کی مشیت کے باعث ہے۔ وہ اس مولود سے بڑا کام لینا چاہتا ہے۔ وہ کونسا کام ہے؟ آنے والے دن اس سے پردہ اُٹھا دیں گے۔

اکثر قراء نے وَضَعَتْ تا ساکنہ کے ساتھ جیسا کہ قرآن میں موجود ہے پڑھا ہے اور اس کے مطابق وہی معنی نکلتے ہیں جو ہم نے بیان کر دیے ہیں۔ لیکن چند ایک قراء مثلاً عاصم کی روایت سے ابن عامر نے، ابوبکر اور یعقوب نے وَضَعْتُ تاء مرفوعہ کے ساتھ پڑھا ہے اس اعتبار سے یہ جملہ اُم مریم کا کلام ہے۔ وہ اپنے آپ کو تسلی دینے کے لیے کہہ رہی ہیں کہ جسے میں نے جنم دیا ہے اللہ جانے اس میں کیا حکمت ہو۔ جو بات اللہ کے علم اور ارادہ میں تھی اور جس کا اس نے فیصلہ کر لیا تھا وہ اس سے بہتر ہو گی جس کی میں اُمید لگائے بیٹھی تھی۔

آگے ارشاد ہے۔ لَیْسَ الذَّکَرُ کَالْاُنْثٰی (لڑکا لڑکی کی مانند نہیں ہے) یہ جملہ بھی معترضہ ہے اور اللہ کا قول ہے جو پہلے قول وَاللّٰہُ اَعْلَمُ کی وضاحت ہے۔ اللہ کے اس قول میں مولود کی جس رفعت و عظمت کا بیان ہے یہ اس کی تشریح ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ جس لڑکے کی طلب اور تمنا تو نے کی تھی وہ اس لڑکی کی مانند نہیں جو تجھے عطا ہوئی ہے۔ عربی گرامر کی رو سے الذکر سے پہلے جو الف لام (ال) ہے اسے معہود ذہنی (جو چیز ذہن میں موجود ہو) کے لیے استعمال کیا گیا ہے، یعنی جو لڑکا تمھارے ذہن میں موجود تھا۔ صاحب کشاف نے علم بیان کا قاعدہ بیان کرتے ہوئے کہا ہے کہ ایسے جملوں میں ناقص کو کامل سے تشبیہ دی جاتی ہے نہ کہ کامل کو ناقص سے۔ یعنی مُشَبَّہ بہ مُشَبَّہ سے افضل ہوتا ہے۔ محمود آلوسی نے روح المعانی میں اس قاعدے کی تائید کرتے ہوئے یہ اضافہ کیا ہے کہ صرف مولدین (نا خالص عربی بولنے والے اور لکھنے والے) نے مُشَبَّہ کو فضیلت کے لیے استعمال کیا ہے۔ اس بات سے لڑکی کی لڑکے پر فضیلت کا اظہار ہوتا ہے یہاں ایک اصول بیان کر دیا گیا ہے کہ وجہ فضیلت جنس نہیں۔ اگر اس قول کو بھی پہلے قول کی مانند اُم مریم کا کلام مانا جائے تو بھی اس کے معنی یہ ہوں گے کہ جو لڑکا میں طلب کر رہی تھی اس لڑکی کی طرح نہیں ہو سکتا ہے جو اللہ نے مجھے عطا کی ہے۔ اللہ کی باتیں اللہ جانے۔ اس کلام سے پتا چلتا ہے کہ وہ خاتون اللہ کی معرفت میں ڈوبی ہوئی تھی اور جانتی تھی کہ اللہ جو اپنے بندے کے لیے کرتا ہے وہ اس سے بہتر ہوتا ہے جو بندہ اپنے لیے چاہتا ہے۔

بعض لوگوں پر مذکورہ بالا تشبیہ گراں گزری ہے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ لڑکی لڑکے سے بہتر ہو۔ یہ بات

Marfat.com

ان کے قبائلی اور معاشرتی تصورات سے ٹکرائی تو انھوں نے تشبیہ کا عقدہ حل کرنے کے لیے مختلف تاویلیں کیں اور اپنی تاویل کو ثابت کرنے کے لیے قرآن حکیم سے مثالیں تلاش کیں۔انھوں نے آیت زیر نظر کا ترجمہ اسے اُم مریم کا قول قرار دے کر یہ کیا کہ لڑکا (فضیلت درجہ اور مقام میں) لڑکی کی طرح نہیں ہوتا اور تشریح اس طرح کی کہ وہ خدمت پر زیادہ قدرت رکھتا ہے،لوگوں سے آزادی سے مل جل سکتا ہے، اسے کسی تہمت کا خوف نہیں ہوتا،اسے حیض اور نفاس کے عارضے لاحق نہیں ہوتے، وہ راہبوں اور کاہنوں کے ساتھ رہنے کے قابل ہوتا ہے۔ یہاں پر ان کمزور دلائل پر بحث کا موقع نہیں۔موٹی سی بات یہ ہے کہ اگر ان کے کلام کا یہی مطلب ہوتا تو اللہ نے اس کے لیے صحیح جملہ 'لیس الانثی کالذکر' لڑکی لڑکے کی مانند نہیں ہوتی یعنی حرف نفی کا ذکر اس چیز کے ساتھ ہوتا جو اس کے پاس موجود تھی اور پھر اصل مراد تک پہنچنے کے لیے موجود چیز میں صفات کمال کی نفی کی جاتی۔اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ نے ایک فصیح اسلوب بیان کو چھوڑ کر غیر فصیح انداز اختیار کیا۔یہ ایک بہت بڑی جسارت ہے۔ دوسرے اس میں اُم مریم کی توہین کا پہلو نکلتا ہے کہ ان کا ایمان اتنا کمزور تھا کہ انھوں نے اللہ تعالیٰ کی مشیت اور حکمت پر اعتراض کیا۔یہ معنی سیاق کلام کے بھی خلاف ہیں، کیونکہ یہاں مرد اور عورت کی فضیلت کی بحث نہیں بلکہ مسئلہ اس لڑکے کی فضیلت کا ہے،جس کی تمنا مریم نے نذر مان کر کی تھی اور اس لڑکی کی فضیلت کا جو اللہ نے ان کو عطا کی تھی۔پھر اللہ تعالیٰ نے مریمؑ کو بیت المقدس کی خدمت کے لیے نہ صرف قبول کیا بلکہ خوب قبول کیا۔اس لیے اس زمانے کے کاہنوں اور راہبوں کا یہ مفروضہ باطل ہو گیا کہ لڑکی لڑکے کی مانند مقدس ہیکل کی خدمت کرنے کے قابل نہیں اور وہ دلائل جو اس سلسلہ میں لڑکے کی فضیلت کے لیے پیش کیے جاتے تھے،سب ریت کا ڈھیر ثابت ہوئے۔مقام افسوس ہے کہ قرآن کا اردو میں ترجمہ کرنے والے بعض لوگوں نے اس تاویل کی بنیاد پر غلط ترجمہ کیا ہے، صحیح ترجمہ احمد رضا بریلوی، شبیر احمد عثمانی اور عبدالماجد دریابادی نے کیا ہے۔

آیت مبارکہ کا یہ ٹکڑا اس بارے میں نص قطعی کا درجہ رکھتا ہے کہ مرد و زن میں وجہ فضیلت جنس نہیں ذاتی کردار ہے۔آگے اُم مریم کہتی ہیں کہ میں نے اس بچی کا نام مریم رکھا ہے اور اسے اور اس کی اولاد کو تیری پناہ میں دیتی ہوں۔اسے مردود شیطان سے بچائے رکھنا۔اُنھوں نے مریم کے نام کا ذکر اپنے رب سے اس لیے کیا کہ انھیں اللہ کی قربت حاصل ہو اور وہ اس کی حفاظت اور اصلاح کرے تاکہ وہ اسم بامسمی ثابت ہوں، کیونکہ مریم ان کی زبان میں عابدہ کو کہتے تھے۔اپنے رب پر ان کا ایمان اس قدر پختہ تھا کہ وہ صرف اسی سے اپنی بچی اور اس کی اولاد کے بارے میں شیطان سے پناہ مانگ رہی ہیں کیونکہ وہ

Marfat.com

اللہ ہی کے بھروسے پر اپنے لختِ جگر کو بیت المقدس کی خدمت کے لیے چھوڑ رہی تھیں۔ نام اس کا مریم (عابدہ) رکھا۔ اس اللہ کی بندی کی زندگی پیدا ہونے سے پہلے ہی اللہ اور اس کے ہیکل کی عبادت اور خدمت کے لیے وقف ہو چکی تھی اور پیدا ہونے کے بعد دمِ واپسیں تک وقف رہی۔ ایسی اللہ کی بندی کو خدا کی پناہ میں دیا جا رہا ہے۔ آخر کو ماں تھی۔ اس لیے اللہ کے حضور میں بار بار درخواست کر رہی تھیں اور دین و دنیا کی آفات سے سلامتی کی دعا مانگ رہی تھیں۔ آیت میں مریم کی اولاد کا ذکر بتا رہا ہے کہ اللہ نے ان سے بہت بڑا کام لینا تھا۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ مریم کے رب نے بڑے اچھے طریقے سے انھیں قبول کیا اور اچھے طریقے سے نشوونما دی۔ زکریا علیہ السلام نے ان کی کفالت کی۔ جب بھی زکریا علیہ السلام ان کے پاس محراب میں داخل ہوتے، ان کے پاس رزق پاتے۔ وہ پوچھتے 'اے مریم! یہ رزق کہاں سے آیا؟ وہ کہتیں یہ اللہ کے ہاں سے ہے۔ بے شک اللہ جسے چاہتا ہے بغیر حساب کے رزق عطا کرتا ہے'۔

اس رب نے جس نے مریم کو اس کمال تک پہنچایا جو اُن کے شایانِ شان تھا، انھیں قبول کر لیا، یعنی انھیں بطور نذر قبول کر لیا اور اس بات پر راضی ہو گیا کہ وہ دستور کے خلاف اللہ کی عبادت اور بیت المقدس کی خدمت کے لیے وقف ہوں۔ اس لحاظ سے مریمؑ وہ پہلی خاتون تھیں جنھوں نے خود ساختہ رسم خانقاہیت کی زنجیروں کو توڑا۔ تقبل کا فعل قبل سے زیادہ بلیغ ہے۔ یہ قبولیت میں مبالغہ اور توجہ پر دلالت کرتا ہے۔ حسن کی صفت نے قبولیت میں مبالغہ کے معنی پیدا کر دیے ہیں گویا کہ کہا یہ گیا ہے کہ اللہ نے اس نذر کو انتہائی اچھے طریقے سے قبول کیا۔ نہ صرف قبول کیا بلکہ ان کی نشوونما ایسے کی، جس طرح ایک اچھے پودے کی نشوونما کی جاتی ہے۔ یہ بات اللہ نے یہاں استعارۃً کہی ہے، یعنی جیسے زرخیز زمین میں باغبان ایک پودے کی دیکھ بھال کرتا ہے اور وہ نشوونما پا کر پھل پھول دیتا ہے، اس توجہ اور دیکھ بھال کی وجہ سے وہ موسمی آفات سے محفوظ رہتا ہے، اسی طرح اللہ تعالیٰ نے مریمؑ کی تربیت کی طرف بہت زیادہ دھیان دیا۔ انبات (اگانا) میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ یہ تربیت فطری تھی اور ہر قسم کے عیب اور آمیزش سے پاک تھی۔ اللہ تمام حالات میں ان کی خبر گیری کرتا رہا۔ اسی حسن تربیت کے پیش نظر اللہ نے ان کی سرپرستی اور حفاظت ایک نبیؑ کے سپرد کی اور وہ نیکی، عفت وعصمت اور اطاعت و فرمانبرداری جیسی صفات سے متصف ہو کر پروان چڑھیں، اور جب فرشتہ ایک انسان کی صورت میں ان کے سامنے نمودار ہوا تو اسی حسن تربیت کے پیشِ نظر ان کے منہ سے بے ساختہ نکلا: إِنِّي أَعُوذُ بِالرَّحْمَٰنِ مِنكَ إِن كُنتَ تَقِيًّا (مریم ۱۹: ۱۸) 'میں تم سے رحمان کی پناہ مانگتی ہوں (میرے قریب

Marfat.com

مت آنا) اگر تمھارے دل میں خدا کا خوف ہے۔ اس وقت کے یہودی معاشرہ میں فحاشی اس قدر عام ہو چکی تھی کہ اس میں عصمت کی اہمیت کا احساس ہی جاتا رہا تھا۔ اس معاشرے کا نقشہ Encyclopedia of Ethics & Religion جلد سوم میں عفت (Chastity) کے عنوان کے تحت کھینچا گیا ہے۔ ایسے ماحول میں ترغیب کی ہر کشش کو ٹھکرا کر اور تربیت کے ہر خطرے کا مقابلہ کر کے اپنی عصمت کی حفاظت کرنا واقعی قابل ستائش تھا اور یہ حسن تربیت کا نتیجہ تھا۔ قرآن کریم نے عصمت کی حفاظت کے سلسلہ میں دو نمونے پیش کیے ہیں۔ مردوں میں سے حضرت یوسفؑ کا، جن کی تربیت نبوت کے گھرانے میں ہوئی تھی، اور عورتوں میں حضرت مریمؑ کا، جن کی تربیت اللہ نے خود کی تھی۔ اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ اگر بچیوں کی تربیت ٹھیک طریقے سے ہوئی ہو تو ان کے قدم کبھی بھی نہیں ڈگمگاتے اور وہ بالکل مردوں کی طرح معاشرے میں بھرپور کردار ادا کر سکتی ہیں۔ عرب المریم من النساء (عورتوں میں مریم) اس عورت کو کہتے ہیں جو نہایت پاکیزہ زندگی بسر کرتی ہو اور مردوں سے جرأت سے بات کر سکتی ہو۔

حضرت زکریاؑ کی کفالت

قرآن حکیم نے حسب معمول حضرت زکریاؑ کی کفالت کا ذکر انتہائی اختصار کے ساتھ زیر نظر آیت میں کیا ہے یا پھر آیت نمبر ۴۴ میں ان تیروں کا ذکر کیا گیا ہے جو مریمؑ کی کفالت کے سلسلہ میں بطور قرعہ ڈالے گئے۔ اس سلسلے میں امام طبری سے روایت ہے کہ مریم کی ماں اسے خرقہ میں لپیٹ کر مقدس ہیکل میں لے گئیں۔ قتادہ کی روایت کے مطابق انھیں موسیٰ بن عمران کے بھائی ہارونؑ کی نسل کے سامنے رکھ دیا گیا۔ ان دنوں ان کاہنوں کی حیثیت وہ تھی جو کعبہ کے دربانوں کی ہے۔ اب زکریاؑ اور دوسرے کاہنوں کے درمیان کفالت کا جھگڑا ہوا۔ جس کی طرف آیت (آلِ عمران ۳:۴۴) میں اشارہ کیا گیا ہے۔ زکریاؑ نے کہا کہ تمھارے مقابلے میں، میں اس کی کفالت کا زیادہ حق دار ہوں کیونکہ ان کی خالہ میرے عقد میں ہیں۔ مگر انھوں نے انکار کیا اور کہا یہ تو ہمارے امام کی بیٹی ہے، کیونکہ عمران نماز میں ان کی امامت کرتے تھے۔ چنانچہ قرعہ اندازی کے لیے دریائے اردن کی طرف چل دیے۔ صاحب کشاف کے قول کے مطابق ان کی تعداد ۲۷ تھی۔ انھوں نے اپنی قلمیں یا بے پر کے تیر قرعہ کے لیے دریا میں ڈال دیے۔ تمام قلم بہہ گئے سوائے حضرت زکریاؑ کے قلم کے۔ وہ ایسے کھڑا ہو گیا جیسے مٹی میں گڑا ہوا ہے۔ چنانچہ انھوں نے بچی کو لے لیا۔ امام طبری کہتے ہیں کہ قلموں سے مراد وہ قلم ہیں جن سے کاہن تورات کی کتابت کیا کرتے تھے جبکہ دوسرے مفسرین نے ان سے مراد بے پر کے تیر لیے ہیں جن کو بطور قرعہ یا فال استعمال کیا جاتا تھا۔ حضرت زکریاؑ نے ان کو اپنے ساتھ

Marfat.com

محراب میں رکھا تھا۔

جب بھی زکریاؑ حضرت مریمؑ کے پاس محراب میں جاتے تو ان کے پاس رزق پاتے۔ ابن فارس نے مقاییس اللغۃ میں محراب کے معنی صدرِ مجلس یعنی 'بہترین نشست گاہ' کے بتائے ہیں۔ دوسرے معنی انھوں نے بالا خانہ کے بتائے ہیں۔ اس اعتبار سے زکریاؑ نے مریمؑ کو بیت المقدس کی بہترین جگہ پر رکھا یا جیسا کہ ابن عباسؓ کی روایت ہے کہ انھوں نے بیت المقدس کی دیوار کے وسط میں ایک بالا خانہ بنوایا جس تک کعبہ کے دروازے کی مانند سیڑھی سے چڑھا جا سکتا تھا۔ 'المنار' کے مطابق یہاں اس سے مراد وہ جگہ ہے جس کو اہلِ کتاب مذبح (Altar) کہتے ہیں یہ ایک چھوٹا سا کمرہ ہوتا ہے جو ہیکل کے اگلے حصے میں ہوتا ہے۔ اس کا ایک دروازہ ہوتا ہے جس تک سیڑھی سے چڑھا جا سکتا تھا۔ آج کل اس کا اطلاق مسجد میں امام کے کھڑا ہونے کی جگہ ہوتا ہے۔ غالباً اس لیے کہ وہ مسجد کا صدر مقام ہوتا ہے۔ اس لفظ کا مادہ حرب ہے جس کے معنی جنگ ہیں۔ اس مقام کو محراب اس لیے کہا جاتا ہے کہ وہ شیطان سے یا خواہشات نفس سے جنگ کا مقام ہے یا یہاں پر کھڑا ہونے کے لیے لوگ ایک دوسرے سے مقابلہ کرتے ہیں۔

جب بھی حضرت زکریاؑ مریم کے پاس محراب میں جاتے تو ان کے یہاں رزق پاتے۔ رزق کا لفظ نکرہ استعمال ہوا ہے جو اس کی عظمت اور کثرت پر دلالت کرتا ہے۔ جمہور مفسرین کا خیال ہے کہ یہ رزق رضاعت کا بدل تھا اور جنت سے آتا تھا کیونکہ حضرت مریمؑ نے کبھی چھاتی سے دودھ نہیں پیا۔ مگر روح المعانی میں ابن عباسؓ کی روایت نقل کی گئی ہے کہ زکریاؑ نے ان کے لیے اُجرت پر ایک دایہ رکھی ہوئی تھی، جس نے دو برس تک انھیں دودھ پلایا۔ دو برس مکمل ہونے کے بعد ان کو محراب میں اکیلا چھوڑ دیا گیا اور صرف زکریاؑ ان کی خبر گیری کرتے تھے۔ یہ روایت زیادہ قرین قیاس معلوم ہوتی ہے کیونکہ کفالت کا یہی تقاضا تھا۔ جب زکریاؑ نے پوچھا: یہ رزق کہاں سے آیا ہے؟ تو مریمؑ نے جواب دیا کہ وہ اللہ کے ہاں سے آیا ہے۔ ایک قول کے مطابق انھوں نے بھی حضرت عیسیٰؑ کی مانند کم سنی میں کلام کیا۔ علامہ رشید رضا تفسیر المنار میں کہتے ہیں کہ آیت میں ایسی کوئی دلیل نہیں جس سے ظاہر ہو کہ یہ رزق معجزاتی تھا اور اپنے خیال کی تائید میں انھوں نے ابن جریر کی ایک روایت نقل کی ہے لیکن ان کا خیال درست معلوم نہیں ہوتا۔ کیونکہ زکریاؑ کا تعجب سے پوچھنا اور مریمؑ کا جواب اس بات کی سب سے بڑی دلیل ہے کہ اس میں اچنبھے کی بات تھی۔ مریمؑ کے یہاں اس رزق کی موجودگی، ان کی عظمت، رفعت اور منزلت اور سب لوگوں میں ان کی امتیازی حیثیت پر دلالت کرتی ہے۔ جبھی تو بعض مفسرین

Marfat.com

اس کو حضرت مریم کا اعجاز ماننے پر تیار نہیں کیونکہ وہ عورت تھیں۔ کسی نے کہا کہ یہ زکریا علیہ السلام کا معجزہ ہے، لیکن اگر ان کا معجزہ ہوتا، تو وہ اس کے بارے میں کیوں پوچھتے؟ کسی نے اسے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرف منسوب کر دیا حالانکہ وہ ابھی پیدا بھی نہیں ہوئے تھے۔ یہاں رزق سے مراد مادی اور معنوی دونوں غذائیں ہیں۔ مولانا امین احسن اصلاحی نے یہاں رزق سے مراد حکمت و معرفت لی ہے، کیونکہ قرآن مجید میں یہ لفظ وحی و ہدایت کے لیے ایک سے زیادہ مقامات پر استعمال ہوا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ حضرت زکریا علیہ السلام جیسے صاحب کمال، سیب اور انگور سے اتنا متاثر نہیں ہو سکتے تھے۔ بقول اُن کے حضرت مریم کا 'هُوَ مِنْ عِندِ الله' کہنا اس کم سنی میں ان کی پختگی عقل کا شاہد ہے کہ انھوں نے اس رزق کو اللہ کا فضل و احسان قرار دیا۔ حسن سے روایت ہے کہ مریم بچپن ہی سے عقلمند تھیں۔ یہ رزق دیکھ کر حضرت زکریا علیہ السلام نے اپنے رب سے دعا کی کہ 'اے میرے رب مجھے اپنی طرف سے نیک اولا دعطا فرما، بے شک تو دعا سننے والا ہے' یعنی جب انھوں نے مریم سے رزق کے بارے میں سوال کیا اور انھوں نے جواب دیا 'یہ سب اللہ کی دین ہے' تو اس وقت ان کے دل میں خواہش ہوئی کہ اگر ایسا ہے تو پھر خرق عادت کے طور پر ایک بانجھ بڑھیا سے بھی اسی طرح بچے کی اُمید کی جاسکتی ہے۔ اس طرف ان کی توجہ بھی مریم کے حالات سے ہوئی۔

مریم کا مرتبہ اور مقام

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: 'وَإِذْ قَالَتِ الْمَلَائِكَةُ يَا مَرْيَمُ إِنَّ اللَّهَ اصْطَفَاكِ وَطَهَّرَكِ وَاصْطَفَاكِ عَلَىٰ نِسَاءِ الْعَالَمِينَ' (آلِ عمران ۳:۴۲)۔ 'اور جب فرشتوں نے کہا! اے مریم بے شک اللہ نے تجھے چن لیا ہے اور تیری تطہیر کی ہے اور ساری دنیا کی عورتوں پر تجھے فضیلت دی ہے'۔ یہ آلِ عمران کی برگزیدگی کے احکام کا نتیجہ ہے۔ فرشتے بالمشافہہ حضرت مریم سے ہم کلام ہیں۔ قول کی تفسیر وحی ہے۔ اس کی تفسیر الہام سے کرنا اور اسے فرشتوں کی طرف منسوب کرنا کسی طرح بھی درست نہیں، کلام حضرت جبرئیل علیہ السلام نے کیا۔ جمع کا صیغہ اس لیے استعمال ہوا ہے کہ وہ جب بھی نازل ہوتے ہیں ان کے ساتھ فرشتوں کی ایک جماعت ہوتی ہے۔ فرشتوں نے نام لے کر حضرت مریم کو پکارا، تا کہ وہ اجنبیت محسوس نہ کریں اور جو وحی وہ ان کی طرف کرنا چاہتے تھے، اس کے لیے ذہنی طور پر تیار ہو جائیں۔

قرآن کی اصطلاح میں اصطفاء کا لفظ کسی بندے کو کسی خاص کام کے لیے منتخب کرنے کے مفہوم میں استعمال ہوتا ہے۔ اس قرآنی اصطلاح کا اطلاق عام طور پر انبیاء پر ہوتا ہے۔ چنانچہ ابو حیان نے البحر المحیط میں ایک قول نقل کیا ہے کہ اس سے مراد نبوت ہے کیونکہ فرشتے ان کے سامنے ظاہر

Marfat.com

ہوئے اور ان کا نام لے کر اللہ کا پیغام پہنچایا اور انھیں نبوت ملی۔ جبھی تو ابنِ اسحاق کی روایت کے مطابق حضرت زکریا علیہ السلام کہا کرتے تھے کہ عمران کی بیٹی بڑی شان والی ہے'۔ یہاں اس کا تکرار تاکید اور مبالغہ پر دلالت کرتا ہے۔ صاحب کشاف اور امام رازی کا کہنا ہے کہ دو دفعہ اصطفاء کا بیان اس لیے ہے کہ اللہ نے مریم کو دو دفعہ منتخب کیا۔ پہلا انتخاب آغاز عمر میں ان پر کی گئی نعمتوں کی شکل میں تھا۔ لڑکی ہونے کے باوجود بیت المقدس کی خدمت کے لیے انھیں قبول کیا اور خاص طور پر ان کی تربیت کی۔ سب کاموں سے فارغ کر کے اپنی عبادت پر لگایا۔ ان کے لیے معیشت کا سامان بہم پہنچایا اور اللہ ان سے ہم کلام ہوا۔ اللہ نے ان کو کفر و معصیت سے اور ہر قسم کے خَلقی اور خُلقی عیوب سے پاک کیا۔ دوسرا انتخاب اس وقت ہوا جب ان کے یہاں عیسیٰ علیہ السلام بن باپ کے پیدا ہوئے۔ حضرت مریمؑ کو کائنات کی تمام عورتوں پر فضیلت عطا کی گئی ہے جو عورتیں نبی نہیں ہیں ان پر اس لیے کہ مریم نبی ہیں اور جو عورتیں نبی ہیں ان پر اس لیے کہ وہ ان قرآنی نصوص کے پیشِ نظر جو ان کے فضائل و کمال سے تعلق رکھتی ہیں، باقی نبیات پر برتری رکھتی ہیں۔ آیت کا جملہ نساء العالمین عام ہے اور ماضی، حال اور مستقبل کی تمام عورتوں کو شامل ہے۔ حضرتِ مریمؑ کا تقدس، تقویٰ اور طہارت، مرد کے ہاتھ لگائے بغیر معجزہ کے طور پر ان کے بطن سے حضرتِ عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت، بلاشبہ ایسے امور ہیں جن کی بدولت ان کو تمام عورتوں پر فضیلت و برتری حاصل ہے۔ ان کو اور ان کے بیٹے کو ساری دنیا کے لیے معجزہ بنا دیا اور ان کو ساری دنیا کی عورتوں پر فضیلت عطا کی اور یہودیوں کی تہمتوں اور بہتانوں سے بچا لیا۔ قرآن حکیم میں لفظ آیۃ (نشانی) ایسی جگہ آتا ہے جہاں اللہ کو اپنی قدرت تامہ کا اظہار کرنا مقصود ہوتا ہے۔ یہ نشانی خدا کی امانت تھی اور ایک بڑی آزمائش بھی۔ اللہ نے اپنی عظیم امانت سپرد کرنے کے لیے تمام دنیا کی عورتوں میں سے حضرت مریمؑ کا انتخاب فرمایا یہ ایسا شرف ہے جس میں ان کا کوئی شریک نہیں۔

آگے حکم ہوتا ہے اے مریم! اپنے رب کی فرمانبرداری کر اور اس کے آگے سجدہ اور رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کر۔ (اقنتی لربك) میں عبادت میں انفرادیت اور تخصص مراد ہے۔ مجاہد سے روایت ہے کہ وہ اتنے سکون سے قیام کرتی تھیں کہ پرندے انھیں بے جان سمجھ کر ان کے سر پر بیٹھ جاتے۔

اس آیت میں ضمنی طور پر اس بات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ ان سب کمالات کے باوجود مریم بشر تھیں اور ان کو بھی اپنے معبود حقیقی کے سامنے جھکنے اور سجدہ کرنے کی اتنی ہی ضرورت تھی جتنی کسی بشر کو ہو سکتی ہے۔ رومن کیتھولک چرچ والے مریمؑ کی پوجا کرتے تھے، کیونکہ وہ مریمؑ کو اللہ کی ماں قرار دیتے

Marfat.com

تھے۔Council of Ephesus نے ۴۳۱ء میں اس نظریے کی تصدیق کر دی۔ یہ نبی کریم ﷺ کی پیدائش سے تقریباً ایک صدی پہلے کا واقعہ ہے گویا کہ نبی کریم ﷺ کو اس عقیدت کے ابطال کے لیے مبعوث کیا گیا۔ پھر حکم ہوا رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کر۔ وہ چونکہ ہیکل مقدس کے محراب میں مستقل رہائش پذیر تھیں اس لیے حکم ہوا کہ نماز پڑھنے والوں کے ساتھ نماز پڑھ۔ یہ ضروری نہیں کہ یہودیوں کی نماز کی شکل وصورت اس زمانے میں ہماری نماز کی طرح ہو۔ مطلب یہ کہ بیت المقدس میں تو بھی دوسرے لوگوں کے ساتھ مل کر باجماعت عبادت کر اور اللہ کے سامنے خشوع وخضوع کا اظہار کر۔ یہاں پھر مردوں کے ساتھ باجماعت نماز ادا کرنے کا حکم ہمارے قائم کردہ تصورات کے ساتھ لگا نہیں کھاتا۔ اس لیے مفسرین کو یہ بات کھلی ہے جس کی ماتریدی نے یہ توجیہ پیش کی ہے کہ ان کے لیے یہ باجماعت نماز مکروہ نہیں تھی کیونکہ وہ سب رشتے دار تھے۔ اسی لیے ان کے ساتھ مریمؑ کے شامل ہونے کا خاص طور پر ذکر ہے۔ درحقیقت قرآن حکیم نے اہلِ ایمان کو نماز قائم کرنے یعنی نماز باجماعت کا حکم دیا ہے اور اس حکم میں مومن مرد اور مومن عورتیں سبھی شامل ہیں۔ اسی لیے عہد نبوت میں خواتین پنجگانہ نماز مسجد نبوی میں ادا کرتی رہیں۔ یہاں تک کہ جب ان کے کسی بچے کے رونے کی آواز آتی تھی تو نبی پاک قرأت کو مختصر کر دیا کرتے تھے۔ عہد رسالت، خلافت ابوبکر اور خلافت عمر کے ابتدائی برسوں میں عورتیں مسجد میں پنجگانہ نماز ادا کرتی تھیں۔ حضرت عمرؓ نے ازراہ احتیاط ایک تجویز پیش کی تھی کہ اگر عورتیں گھر میں نماز ادا کریں تو بہتر ہے۔ یہ کوئی حکم نہ تھا۔ حکم یہی تھا کہ لا تمنعو اماء اللّٰہ مساجد اللّٰہ، یعنی اللہ کی بندیوں کو اللہ کی مسجدوں سے مت روکو۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کی بیوی عاتکہ اس دن مسجد میں نماز پڑھ رہی تھیں جب آپ کو خنجر لگا۔ ہم نے عورت کو سوسائٹی سے باہر نکالنے کے لیے کئی ضعیف حدیثوں کا سہارا لیا۔ اللہ بھلا کرے امام ابن حزم اندلسی کا۔ انھوں نے المحلی (آلِ عمران ۳:۱۲۹ تا ۱۴۰) میں اس مسئلہ پر تفصیلی بحث کی ہے اور گھر کی تاریکی میں نماز پڑھنے والی احادیث کا تجزیہ کیا ہے۔ میں نے ماہنامہ اشراق کے جنوری، فروری ۲۰۰۶ء کے شمارے میں اس بحث کا اردو ترجمہ کر دیا ہے۔ شیخ محمد غزالی نے کتاب السنة النبوية بين أهل الفقه وأهل الحديث (ص ۶۰:۶۴) میں امام ابن حزم کے موقف کی تائید کی ہے۔

یہاں ایک بات قابلِ غور ہے کہ الراکعات (رکوع کرنے والیاں) کے بجائے الراکعین (رکوع کرنے والے) کا صیغہ مریمؑ کے لیے کیوں استعمال کیا گیا ہے؟ لغوی طور پر اس کا جواب یہ ہے کہ جمع کا یہ صیغہ نسبتاً زیادہ عام ہے کیونکہ اس میں مرد وزن دونوں شامل ہوتے ہیں۔ لیکن ضمنی طور پر اس سے مریمؑ کی مدح کا پہلو نکلتا ہے۔ یہ صیغہ استعمال کر کے اللہ تعالیٰ نے مرد اور عورت کو برابر قرار دیا ہے۔

Marfat.com

فضیلت کے راستے دونوں کے لیے یکساں کھلے ہیں، یہ حدیث جو حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: مردوں میں بہت سے لوگ کامل ہوئے ہیں مگر خواتین میں صرف مریمؑ اور آسیہ زوجہ فرعون، خدیجہؓ بنت خویلد اور فاطمہؓ بنت محمد کامل ہوئی ہیں۔ اگر یہ صحیح ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے اس وقت کے حالات کو پیشِ نظر رکھ کر یہ ارشاد فرمایا: کیونکہ ان دنوں عورتوں کو مردوں کی طرح مواقع میسر نہیں تھے، اگر ہوتے تو ان کی تعداد بھی خاصی بڑی ہوتی۔ اس ارشادِ نبوی کا اطلاق ہمیشہ کے لیے ہرگز نہیں۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش کا قصہ سورۃ آلِ عمران (۳:۴۴)؛ سورۃ مریم (۱۹:۲۶)؛ سورۃ انبیاء (۲۱:۹۰) اور سورۃ مؤمنون (۲۳:۵۰) میں مذکور ہے۔ اس سلسلے میں یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیے کہ سورۃ آلِ عمران میں یا سورۃ مریم اور سورۃ انبیاء میں حضرت مریمؑ اور زکریا علیہ السلام کا قصہ ایک ساتھ بیان ہوا ہے۔ دونوں قصوں میں خارق عادت ہونے کی قدر مشترک ہے۔ حضرت زکریا علیہ السلام نے حضرت مریمؑ سے جب پوچھا یہ رزق تمھارے پاس کہاں سے آیا ہے؟ تو انھوں نے جواب دیا کہ اللہ کے ہاں سے۔ یہ بات سن کر ہی اُن کے دل میں بچے کی تمنا پیدا ہوئی تھی۔ جس کے لیے اُنھوں نے اپنے رب کو پکارا۔ دوسری اہم بات یہ ہے کہ سورۃ آلِ عمران، سورۃ مریم اور سورۃ انبیاء میں حضرت مریمؑ اور ان کے بیٹے کا ذکر انبیاء اور رُسل کے تذکرہ کے ساتھ ہوا ہے۔ سورۃ آل عمران میں حضرت آدم علیہ السلام، نوح علیہ السلام، آل ابراہیمؑ اور آلِ عمرانؑ کے انتخاب کے بعد حضرت مریمؑ کی پیدائش کا ذکر ہے۔ سورۃ مریم میں نبی کریم ﷺ کو حکم دیا گیا ہے کہ حضرت زکریا علیہ السلام کے قصہ کے بعد مریم کے قصے کا اس کتاب میں ذکر کریں۔ خطاب کا انداز بالکل وہی ہے جو اس سورۃ میں حضرت ابراہیم علیہ السلام، حضرت موسیٰ علیہ السلام، حضرت اسمٰعیل علیہ السلام اور حضرت ادریس علیہ السلام کے لیے اختیار کیا گیا ہے اور آخر میں فرمایا گیا ہے ’یہ وہ لوگ ہیں جو ان نبیوں میں سے ہیں جن پر اللہ نے انعام کیا۔ آدمؑ کی نسل میں سے اور ان کی نسل سے جنھیں ہم نے نوح علیہ السلام کے ساتھ کشتی میں سوار کیا تھا نیز ابراہیم علیہ السلام اور اسرائیل کی نسل سے اور یہ (سب حضرات) ان لوگوں میں سے ہیں جنھیں ہم نے راہِ راست دکھائی اور منتخب کر لیا (مریم ۱۹:۵۸)۔ اس سورۃ میں حضرت ابراہیم علیہ السلام، حضرت اسحاق علیہ السلام، حضرت یعقوب علیہ السلام کا ذکر کرنے کے بعد حکم دیا کہ نوح علیہ السلام، داؤد علیہ السلام، سلیمان علیہ السلام، ایوب علیہ السلام، اسماعیل علیہ السلام، ادریس علیہ السلام، ذوالکفل علیہ السلام، حضرت یونس علیہ السلام اور حضرت زکریا علیہ السلام کا تذکرہ کیجیے،

Marfat.com

پھر اس کے فوراً بعد اس بی بی (مریمؑ) کا تذکرہ کیجیے جس نے اپنی ناموس کی حفاظت کی۔ سورۃ انبیاء میں بھی یہی انداز اختیار کیا گیا ہے۔ یہ مقامات حضرت مریمؑ کے مرتبہ و مقام پر دلالت کرتے ہیں کیونکہ قرآن حکیم کی دو سورتوں بالخصوص سورۃ انبیاء میں ان کا ذکر اس مقام پر کیا گیا ہے جہاں دوسرے انبیاء کا ذکر ہے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت کا ذکر سورۃ مریم میں یوں شروع ہوتا ہے۔ ''وَاذْكُرْ فِي الْكِتَابِ مَرْيَمَ إِذِ انتَبَذَتْ مِنْ أَهْلِهَا مَكَانًا شَرْقِيًّا'' (مریم ۱۶:۱۹) 'اور اے محمد ﷺ اس کتاب میں مریم کا بھی ذکر کیجیے جبکہ وہ اپنے گھر والوں سے علیحدہ ہو کر ایک ایسے مکان میں جو مشرق کی جانب تھا، گئیں'۔ آیت نمبر ۲۹ تک پیدائش کا واقعہ پوری تفصیل کے ساتھ بیان ہوا ہے۔ یہاں موضوع سورۃ آل عمران سے مختلف ہے، یہاں اپنے گھر والوں اور اپنے ماحول کے پس منظر میں عبادت کرنے والوں کے ذاتی روحانی مشاہدوں کا بیان ہے۔ حضرت مریمؑ اپنے گھر والوں سے علیحدہ ہو کر بیت المقدس کے مشرق میں ایک مقام کی طرف چلی گئیں تا کہ خلوت میں اللہ کی عبادت میں مشغول ہو جائیں۔ ہیکل کے مشرق میں کچھ کمرے عبادت گزاروں کے لیے تھے۔ غالباً وہ اپنے گھر والوں سے ہٹ کر عبادت اور دُعا کی غرض سے ان میں سے کسی کمرے میں چلی گئیں۔ ہوسکتا ہے کہ اللہ نے ان کے لیے مشرق کا انتخاب کیا ہو، اللہ جانتا تھا کہ مریمؑ کے بطن سے عیسوی نور کے ظہور کا وقت آ گیا ہے اس نے مناسب یہی سمجھا کہ معنوی نور کا ظہور بھی اسی جانب ہو جہاں حسی نور ظاہر ہو رہا ہے۔ اسی لیے عیسائیوں نے اپنا قبلہ مشرق کی طرف بنا لیا۔ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت مریمؑ بالغ ہونے کے بعد ہیکل کے مشرق میں عبادت کی غرض سے کسی کمرے میں چلی گئی تھیں۔ پس انھوں نے اپنے اور گھر والوں کے درمیان اوٹ بنالی۔ یہ اوٹ جیسا کہ تابعی سدی کا قول ہے کہ کمرے کی دیواروں کی اوٹ تھی۔ یہاں اوٹ اس بات کا قرینہ ہے کہ انھوں نے عبادت کی غرض سے کامل خلوت اختیار کر لی تھی۔ بس یوں سمجھیے کہ وہ اعتکاف میں بیٹھ گئیں اور اسی دوران اللہ نے ان کے پاس روح الامین یعنی جبرائیل علیہ السلام کو بھیجا اور وہ ان کے سامنے کامل مرد بن کر ظاہر ہوئے۔ اکثر مفسرین نے یہاں روح سے مراد جبرائیل لیے ہیں۔ قرآن حکیم کی آیات (البقرۃ ۲: ۸۷، ۲۵۳؛ المائدہ ۵: ۱۱۰) میں بھی اسی کی تائید کی گئی ہے کیونکہ ان آیات میں واضح طور پر کہا گیا ہے کہ ہم نے ابن مریمؑ کی روح القدس سے تائید کی، سورۃ الشعراء کی آیت نمبر ۱۹۳ میں جبرائیل علیہ السلام کو الروح الامین کہا گیا ہے۔ جبرائیل علیہ السلام کو روح اس لیے کہا گیا ہے کہ ان کے ذریعہ سے دین کا احیاء ہوتا ہے یا اللہ کا مقرب اور محبوب ہونے کی وجہ سے انھیں روح کہا گیا ہے۔ جبرائیل علیہ السلام جس طرح حضرت

Marfat.com

ابراہیم علیہ السلام اور لوط علیہ السلام کے پاس انسانی شکل میں گئے اور جس طرح نبی کریم ﷺ کے سامنے دحیہ کلبی کی شکل میں ظاہر ہوئے بالکل اسی طرح مریمؑ کے سامنے انسانی شکل میں ظاہر ہوئے۔تا کہ وہ ایک غیر انسانی شکل دیکھ کر وحشت زدہ نہ ہو جائیں۔صاحب البحر المحیط اس آیت کے تحت لکھتے ہیں کہ ظاہری الفاظ اسی بات پر دلالت کرتے ہیں کہ اللہ نے ان کے پاس فرشتہ بھیجا اور وہ ان کے ساتھ ہم کلام ہوا۔اس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ نبی تھیں، مگر ایک قول ہے کہ وہ نبی تو نہ تھیں بلکہ فرشتہ نے ایک بشر کی حیثیت سے ان سے کلام کیا۔امام رازی کا قول ہے کہ مریم کو صدیقہ اس لئے کہا جاتا ہے کہ انھوں نے جبرائیل علیہ السلام کے قول کی تصدیق کی۔حضرت مریمؑ کی نبوت پر بحث اگلے صفحات پر ہوگی۔

انجیل کی روایت کے مطابق حضرت زکریا علیہ السلام کے واقعے کے چھ ماہ بعد جبرائیل علیہ السلام حضرت مریمؑ کے ہاں آئے اور ان کو بیٹے کی بشارت دی اور کہا کہ اس کا نام یسوع رکھنا (لوقا،۱:۳۶) نیز یہ کہ مریمؑ زکریا علیہ السلام کی بیوی ایشیع، جو ان کی رشتہ دار تھیں، کے پاس بشارت کے بعد ملنے گئیں (لوقا۱:۳۹)۔

سورۃ آل عمران کی آیت ۴۵ میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ 'مریمؑ کو عیسیٰ علیہ السلام کی بشارت دینے والے بہت سے فرشتے تھے'۔صاحب البحر المحیط ابوحیان کہتے ہیں کہ 'مراد جبرائیل علیہ السلام اور ان کے ساتھ نازل ہونے والی جماعت ہے کیونکہ جبرائیل علیہ السلام جب بھی کوئی حکم لے کر آتے تو اُن کے ساتھ فرشتوں کی ایک جماعت ہوتی تھی۔اس آیت میں فرشتے مریم کا نام لے کر ان سے مخاطب ہوتے ہیں تا کہ وہ مانوس ہو کر وحی کے الفاظ سُنیں اور نیز پتہ چلتا ہے کہ فرشتوں نے ان سے بالمشافہہ کلام کیا'۔فرشتہ حضرت مریمؑ کے سامنے پورے مرد کی شکل میں ظاہر ہوا، ایسی شکل میں جبرئیل علیہ السلام کا سامنے آنا ان کی عصمت وعفت کی آزمائش تھی۔فرشتے کو دیکھ کر مریمؑ کہنے لگیں اگر تو متقی ہے تو میں تجھ سے رحمان کی پناہ مانگتی ہوں۔ان کا مطلب تھا کہ اگر تجھ سے خوف خدا کی توقع کی جاسکتی ہے تو میں تجھ سے رحمان کی پناہ مانگتی ہوں۔کتنی دانشمندانہ بات ہے کیونکہ وہ جانتی تھیں کہ اللہ کی پناہ کا اثر اسی پر ہو سکتا ہے جو صاحب تقویٰ ہو، یہ نفس امارہ کے امتحان کا ایک نازک موقع تھا۔حضرت مریمؑ کے منہ سے جو الفاظ نکلے وہ صرف کنواری عفت مآب بی بی کے منہ سے نکل سکتے ہیں نہ کہ شادی شدہ عورت کی زبان سے۔ان کے نکاح کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، چنانچہ انجیل لوقا کی روایت کہ ان کی شادی یوسف سے ہو چکی تھی قطعی غلط معلوم ہوتی ہے۔

سید قطبؒ فی ظلال القرآن میں اپنے مخصوص ادیبانہ رنگ میں اس واقعہ کی منظر کشی ان الفاظ میں کرتے ہیں۔'ایک کنواری اور سہمی ہوئی لڑکی کی طرح جس کی خلوت میں ایک اجنبی اچانک نمودار ہو، مریم

Marfat.com

پر کپکپی طاری ہو جاتی ہے۔ وہ اللہ سے پناہ مانگتی ہیں اور اجنبی کے اندر تقویٰ کے جذبات اُبھارتی ہیں اور اس تنہائی میں اللہ کے وجود کا احساس دلاتی ہیں۔ ذرا تصور کیجئے ایک نیک طینت اور معصوم کنواری لڑکی جس کی تربیت حضرت زکریا علیہ السلام کی زیرِ نگرانی ایک صالح ماحول میں ہوئی۔ جو ابھی ماں کے پیٹ میں تھی کہ اللہ کے لیے وقف کر دی گئی۔ ایک صحت منداور خوبصورت آدمی کو دیکھ کر اس کے شرم وحیا کا کیا عالم ہوگا؟ ایک ایسا اجنبی جس کے بارے میں ابھی تک ان کو یقین نہ تھا کہ وہ اللہ کا بھیجا ہوا ہے۔ ہو سکتا تھا کہ وہ فریب سے ان کے بھول پن سے ناجائز فائدہ اُٹھا رہا ہو، مریم کے پناہ مانگنے پر فرشتے نے ان کی حیرانی دور کرنے کے لیے کہا! میں تمھارے رب کا بھیجا ہوا ہوں تا کہ تمھیں ایک پاکیزہ لڑکا عطا کروں'۔ یہ بات فرشتے نے مریم کے اطمینان قلب کے لیے کہی کہ میرے بارے میں بدگمانی نہ کرو، مجھے تو تیرے رب نے بھیجا ہے۔ اب اس باحیا لڑکی کے کان میں فرشتے کا واضح اعلان پڑتا ہے کہ وہ اسے لڑکا دینے آیا ہے یہاں وھب کا لفظ مجازاً استعمال ہوا ہے کیونکہ یہ عطا ان کے ذریعہ سے ہونی تھی اس لیے انھوں نے فعل کو اپنی طرف منسوب کر لیا۔ سبب کی طرف فعل کی نسبت قرآن حکیم میں معروف ہے چنانچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بتوں کے متعلق فرمایا ہے 'اِنَّھُنَّ اَضْلَلْنَ کَثِیْرًا مِّنَ النَّاسِ' (ابراھیم ۱۴: ۳۶)۔ 'اے میرے رب ان بتوں نے بہت سے لوگوں کو گمراہ کیا ہے' کیونکہ وہ گمراہی کا سبب تھے۔ فرشتے کی بات سن کر حضرت مریمؑ کہنے لگیں کہ میرے ہاں لڑکا کیسے ہوگا؟ مجھ کو کسی بشر نے چھوا تک نہیں اور نہ میں بدکار ہوں؟ یہی مضمون سورۃ آلِ عمران میں ان الفاظ میں بیان ہوا ہے (۳: ۴۷)۔ انھوں نے کہا 'اے میرے رب! میرے یہاں بچہ کیسے ہوگا حالانکہ مجھے کسی بشر نے ہاتھ نہیں لگایا'۔ اس مقام پر حیا سے زیادہ جرأت کی ضرورت تھی چنانچہ وہ اس لڑکی کی مانند جس کی عزت معرضِ خطر میں ہو، ہمت سے کام لے کر سوال کرتی ہے کہ یہ کیسے ممکن ہے؟ سوال سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اس وقت تک اس بات کا تصور بھی نہ کر سکتی تھی کہ لڑکا معمول کے خلاف مرد اور عورت کے ملاپ کے بغیر بھی پیدا ہو سکتا ہے۔ حضرت مریمؑ نے فرشتے کے قول کی طرف توجہ دینے کی نسبت اپنے دامن کی صفائی کی طرف زیادہ توجہ دی اور بہترین انداز میں بچے کی پیدائش کا انکار کیا۔ پہلے انھوں نے مسِّ بشر سے انکار کیا۔ جو قرآنی اصطلاح میں نکاح سے کنایہ ہے اور پھر بدکاری سے۔ کیونکہ دو ہی طریقے ہیں جن سے بچہ پیدا ہو سکتا ہے۔ اس لیے انھوں نے دونوں سے انکار کیا۔ یہ تعمیم کے بعد تخصیص ہے، جس کا مقصد یہ ہے کہ ان کی عصمت وعفت پر کوئی داغ نہ آئے۔ اس پہلو کی طرف مزید توجہ دلانے کے لیے دوسری نفی میں کان استعمال ہوا ہے۔ جو اس بات کا اعلان ہے کہ اس مقام پر فجور کی نفی لازمی تھی۔ وہ بتانا

Marfat.com

یہ چاہتی ہیں کہ ان موانع کے ہوتے ہوئے بچے کا وجود بعید تر ہے۔انکار کا اعادہ ان سخت حالات کے پیش نظر کیا گیا ہے جو انھیں درپیش تھے کیونکہ جس عورت کا شوہر نہ ہو اگر اس کے ہاں بچہ پیدا ہو جائے تو اسے زنا کی تہمت کے باعث سخت مشکل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔اسی لیے پہلے کلام کے بعد بغاء (بدکاری) کا ذکر علیحدہ کیا گیا ہے 'بغیا' یا تو فعول کے وزن پر مبالغہ کے لیے استعمال ہوا ہے۔تاء تانیث اس سے نہیں آئی کہ اس وزن میں تذکیر و تانیث ایک جیسے ہوتے ہیں یا یہ طالق کی مانند باب نسبت سے ہے اس میں بھی تذکیر و تانیث میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔مریم کے اس سوال پر فرشتے نے کہا !یوں ہی ہوگا (یعنی بشر کے چھوئے بغیر بچہ ہوگا یہ قول قطعی دلیل ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام بن باپ پیدا ہوئے)۔ تمھارے رب کا قول ہے کہ یہ بات میرے لیے آسان ہے۔(اس طور پر) اس لیے پیدا کریں گے تا کہ ہم اس کو لوگوں کے لیے ایک نشانی اور باعث رحمت بنا دیں۔یہ ایسی بات ہے جس کا ہونا طے پا چکا ہے۔اسی مضمون کو سورۃ آل عمران (۴۷:۳) میں ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔'اللہ نے کہا! اسی طرح اللہ جسے چاہے پیدا کر دیتا ہے۔جب کسی چیز کو پورا کرنا چاہے تو اس کو کہہ دیتا ہے کہ ہو جا بس وہ چیز ہو جاتی ہے'۔یہ خلاف معمول بات جس کا تصور مریم نہ کر سکتی تھی وہ اللہ کے لیے بہت ہی آسان تھی۔اس کے 'کُن' کہنے سے ہر چیز وجود میں آجاتی ہے۔اس عجیب تخلیق کا مقصد یہ تھا کہ خالق لوگوں کو اسے اپنے وجود، قدرت اور ارادے کے لیے بطور دلیل پیش کرے اور بنو اسرائیل (بلکہ تمام نوع انسانی) کے لیے باعث رحمت بنائے اور اس واقعے کو نمایاں کر کے ان کو اللہ کی معرفت، عبادت اور رضا کی طرف متوجہ کرے۔چنانچہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بعثت کے دو مقاصد تھے: ایک یہ کہ ان کی حیرت انگیز ولادت لوگوں کے ذہن میں اللہ کی قدرت اور اس کے ارادے کو راسخ کر کے انھیں واپس اللہ کے راستے پر ڈال دے۔دوسرے یہ کہ وہ توبہ کرنے والوں کے لیے رحمت اور تسکین کا باعث بنیں۔یہودیوں جیسی ہٹ دھرم قوم کے لیے وہ واقعی باعث رحمت تھے گویا ان کی شخصیت کی پوری تعریف ان دو لفظوں، آیت اور رحمت میں سمٹی ہوئی ہے۔اللہ کا یہ قول کہ یہ ایسی بات ہے جس کا ہونا طے پا چکا ہے اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ اس کے حکم اور نفاذ میں کوئی وقفہ نہیں ہوتا۔وقت تو اضافیت کے اس عالم میں ہمارے ذہن کی پیداوار ہے۔یہاں پہنچ کر جبرائیل امین علیہ السلام اور مریم کے درمیان گفتگو انتہا کو پہنچ جاتی ہے۔

'پھر اس ہونے والے لڑکے کا حمل ٹھہر گیا پھر اس حمل کو لے کر وہ لوگوں سے الگ ہو کر دور چلی گئیں' (۲۲:۱۹) اس آیت مبارکہ کی تشریح سے پہلے ایک درمیانی مرحلہ کا ذکر ضروری ہے جس کی طرف سورۃ انبیاء (۹۱:۲۱) اور سورۃ تحریم (۱۲:۶۶) میں اشارہ کیا گیا ہے حمل کیسے ٹھہرا؟ ان مقامات میں ابن

Marfat.com

طرف رہنمائی کی گئی ہے۔ سورۃ انبیاء میں ارشاد باری ہے: اور ان کا ذکر کیجیے جنھوں نے اپنے ناموس کو بچایا اور پھر ہم نے ان میں اپنی روح پھونک دی اور ان کو اور ان کے بیٹے کو دنیا جہاں والوں کے لیے نشانی بنایا'۔ سورۃ حشر (۱۷:٦٦) میں ارشاد ہے 'جس نے اپنی شرمگاہ کی حفاظت کی پھر ہم نے اس کے اندر اپنی روح پھونک دی'۔ سورۃ مریم میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو نشانی قرار دینے کا ذکر ہے جبکہ سورۃ انبیاء میں ہے کہ ہم نے ان دونوں کو علامت اور حجت بنادیا اور ان میں سے ہر ایک اللہ اور اس کی عظیم قدرت پر دلالت کرتا ہے۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ سورۃ مریم میں روح سے مراد روح الامین جبرائیل علیہ السلام ہیں جو مریم کی طرف اللہ کے بھیجے ہوئے تھے مگر سورۃ انبیا اور سورۃ تحریم میں روح سے مراد وہ روح ہے جو اللہ نے آدم علیہ السلام میں پھونکی تو وہ انسان بن گئے اور مریم کی شرم گاہ میں پھونکی تو وہ ایک زندہ اور قابل نمو انڈے کی شکل اختیار کر گئی، نفخہ نے تولیدی انڈے میں جان اور حرکت ڈال دی۔ یہ وہ نفخہ الٰہی ہے جو زندگی عطا کرتا ہے اور زندگی گزارنے کی صلاحیتیں عطا کرتا ہے۔ یہ صلاحیتیں انسان کا تعلق ملأ اعلیٰ سے جوڑتی ہیں اور اسے عقل وفکر اور جذبات واحساسات عطا کرتی ہیں۔ جبریل امین علیہ السلام نفخہ الٰہی کو اٹھائے ہوئے تھے اور حضرت مریمؑ تک پہنچا رہے تھے یہ سب غیبی امور ہیں۔ یہاں نہ تو اس روح کا علم ہے جس کے معنی جبریل علیہ السلام ہیں اور نہ دوسرے معنوں میں روح کے متعلق کچھ جانتے ہیں۔ دونوں سورتوں کے سیاق سے اندازہ لگایا گیا ہے کہ وہاں روح کے معنی کچھ اور ہیں اور یہاں کچھ اور ہیں۔ سید قطب نے اسی خیال کی تائید کی ہے اور یہ جو تفسیروں میں متضاد اقوال ہیں کہ گریبان میں پھونک ماری گئی یا ان کی آستین میں اور وہ وہاں سے منتقل ہو کر شرمگاہ تک پہنچی۔ صاحب کشاف نے اسے انوکھی تفسیر قرار دیا ہے اور کہا ہے کہ انوکھی تفسیر یہ ہے کہ فرج سے قمیص کا گریبان مراد لیا جائے۔

سیاق کلام میں اس بات کا ذکر نہیں کہ حمل کیسے ٹھہرا؟ کتنی مدت رہا؟ آیا یہ حمل معمول کے مطابق تھا یا خلاف؟ ممکن ہے کہ نفخہ نے مادہ منویہ کا رول ادا کیا ہو اور اپنی طبعی رفتار چل کر تمام مراحل سے گزرنے کے بعد بچے کی شکل اختیار کر گیا ہو۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ان خاص حالات میں انڈہ اپنی طبعی رفتار سے نہ چلا ہو اور سب مراحل سمٹ گئے ہوں۔ نص میں کوئی ایسی بات نہیں جو ان دونوں حالتوں پر دلالت کرتی ہو۔ اس لیے اس بارے میں زیادہ قیاس آرائیوں کی ضرورت نہیں۔ انھیں قیاس آرائیوں کے بارے میں صاحب البحر المحیط کا قول ہے کہ حمل کے بارے میں مضطرب اقوال ہیں جن کا ذکر کر کے مفسرین نے صفحات کے صفحات سیاہ کیے ہیں۔

Marfat.com

جب مریم کو حمل ٹھہرا تو وہ لوگوں کی ملامت کے خوف سے شرم وحیا کے باعث کسی دور دراز جگہ چلی گئیں۔ اس سے مراد یا تو ہیکل مقدس ہی کے پہلو میں بعید ترین جگہ ہے جو ان کے گھر والوں سے بہت دور تھی۔ مشہور تابعی سدی کی یہی رائے ہے۔ دوسرا احتمال یہ ہے کہ وہ ہیکل چھوڑ کر کہیں دور تنہا مقام میں اپنی قوم کے لوگوں سے الگ ہو گئیں۔ علامہ عبداللہ یوسف علی کا قول ہے کہ ہمارا خیال ہے کہ بشارت اور حمل گلیلی کے ناصرہ میں ہوئی جو یروشلم سے ۶۰ میل دور شمال میں ہے۔ وضع حمل بیت اللحم میں ہوا جو بیت المقدس کے جنوب میں ۶ میل پر واقع ہے۔ اس سلسلے میں مولانا آزاد ترجمان القرآن میں کہتے ہیں کہ 'مکاناً شرقیاً کا یہ مطلب معلوم ہوتا ہے کہ حضرت مریم ہیکل چھوڑ کر جہاں ان کی پرورش ہوئی تھی اپنے آبائی گاؤں ناصرہ چلی گئیں جو یروشلم کے شمال مشرق میں ہے اور باشندگان یروشلم کے لیے مشرق کا حکم رکھتا ہے۔ انجیل (لوقا ۱:۲۶) سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ ایک تو اس اعتبار سے یہ دور کا مقام تھا کیونکہ یہ یروشلم سے ۷۰ میل کے فاصلہ پر تھا دوسرے یہ واقعہ بیت اللحم کے ایک گمنام گوشے میں کھجور کے ایک درخت کے نیچے ہوا جہاں اسے انھیں اصطبل کی چرنی میں منتقل کر دیا گیا'۔ انجیل کی روایت بھی اس بات کی تائید کرتی ہے۔ جب اُنھوں نے دیکھا کہ مدت حمل ختم ہو کر ولادت کا وقت قریب سے قریب تر ہوتا جا رہا ہے تو اُنھوں نے سوچا اگر یہ واقعہ قوم کے اندر رہ کر پیش آیا تو وہ چونکہ حقیقت حال سے واقف نہیں ہے اس لیے نہ معلوم وہ کس طرح کی بہتان طرازیوں اور الزام تراشیوں کے ذریعہ کس درجہ پریشان کرے اس لیے مناسب یہی ہے کہ لوگوں سے دور کسی جگہ جانا چاہیے یہ سوچ کر وہ یروشلم سے ۹ میل دور کوہ سراۃ کے ٹیلے پر چلی گئیں جو بیت اللحم کے نام سے مشہور ہے یہاں چند روز بعد دردزہ شروع ہو گیا تو تکلیف اور اضطراب کی حالت میں کھجور کے ایک درخت کے نیچے تنے کے سہارے بیٹھ گئیں۔ مولانا امین احسن اصلاحی نے بھی یہی کہا ہے کہ 'حمل ٹھہرنے کے بعد وہ بیت اللحم چلی گئیں کیونکہ وہ شدید ذہنی کرب میں مبتلا ہو گئی تھیں۔ اس طرح کے حالات میں انسان کے لیے اپنا ماحول ہیجان انگیز ہو جایا کرتا ہے جی چاہتا ہے کہ اس سے الگ ہو کر سکون کی جگہ تلاش کی جائے'۔ پھر دردزہ مریم کو کھجور کے ایک تنے کی طرف لے آیا اور وہ گھبرا کر کہنے لگیں کاش میں اس (حالت) سے پہلے مر گئی ہوتی اور ایسی نیست و نابود ہو جاتی کہ کسی کو یاد بھی نہ رہتی' (مریم ۱۹:۲۳)۔

یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش نفخہ کے نتیجہ میں طبعی طور پر رحم مادر سے ہوئی اور یہ کہ مدت حمل بھی طبعی تھی یہاں تک کہ جب مدت ختم ہوئی اور انھوں نے دردزہ محسوس کیا تو کھجور کے تنے کے پاس آگئیں اور اس پر ٹیک لگالی تاکہ وضع حمل میں آسانی ہو اور شرم وحیا کے باعث اس کی

Marfat.com

اوٹ لے لی۔ صاحب کشاف نے کھجور کے تنے سے ایک نکتہ نکالا ہے اور کہا ہے کہ کھجور کا یہ تنہ ٹنڈ منڈ تھا۔ اللہ نے کھجور کے تنے کی طرف رہنمائی یہ بتانے کے لیے کی کہ کھجور کا درخت صرف اس وقت پھل دیتا ہے جب شگوفہ مادہ میں ڈال دیا جائے لیکن جب اس کا سر کاٹ دیا جاتا ہے تو وہ پھل نہیں دیتا۔ گویا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے جس طرح عورت نطفہ کے بغیر حاملہ نہیں ہوتی اسی طرح کھجور کا درخت اس وقت پھل دیتا ہے جب شگوفہ مادہ میں ڈالا جاتا ہے۔ اس کارروائی کے بغیر ٹنڈ منڈ تنے پر کھجوروں کا ظہور اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ بچہ بغیر باپ کے بھی پیدا ہو سکتا ہے۔ فرشتے سے گفتگو کرتے ہوئے مریمؑ اپنی عفت و عصمت کے بارے میں اپنے نفس کا سامنا کر رہی تھیں لیکن اب وہ سوسائٹی میں بدنامی کا سامنا کرنے والی تھیں۔ ذہنی کرب کے ساتھ جسمانی کرب کا بھی سامنا تھا۔ دردزہ کا سامنا۔ ایک تن تنہا کنواری لڑکی جو پہلی بار ایسے تجربے سے گزر رہی تھیں جس کے بارے میں وہ کچھ نہ جانتی تھیں۔ وہاں کوئی مونس و غمخوار نہ تھا۔ غربت کا احساس اور قوم کے سوال و جواب کا ڈر۔ چنانچہ ان کے منہ سے نکلا، کاش میں پیدا ہی نہ ہوتی۔ کاش میں گئی گزری اور بھولی بسری ہوتی اور میرا نام و نشان تک باقی نہ رہتا۔ باوجود اس بات کے، کہ ان کے اور جبرائیل علیہ السلام کے درمیان مکالمہ ہو چکا تھا۔ یہ الفاظ ان کے منہ سے کیوں نکلے؟ یہ فقرہ کہ کاش اس رسوائی سے پہلے میں مرگئی ہوتی اور لوگوں کے حافظے مین میری یاد مٹ گئی ہوتی؟ ان کے اندرونی احساسات کی صحیح تعبیر تھا۔ آخر وہ انسان تھیں اینٹ اور پتھر نہ تھیں یہ حالت ان پر شاق گزری۔ احادیث سے پتہ چلتا ہے کہ دور ابتلا میں اس قسم کے جملے صالحین کے منہ سے نکل جاتے ہیں جیسا کہ درخت پر بیٹھے ایک پرندے کو دیکھ کر حضرت ابو بکرؓ نے کہا: اے پرندے تو کتنا خوش نصیب ہے درخت پر بیٹھ کر پھل کھاتا ہے کاش میں پھل ہوتا جسے پرندے چونچیں مارتے۔ حضرت علیؓ نے جنگ جمل مین فرمایا! کاش میں اس دن سے بیس برس پہلے مر چکا ہوتا اور حضرت بلالؓ اکثر کہا کرتے تھے کاش! بلال کی ماں اسے نہ جنتی۔

اسے اس مقام کے نیچے سے ’ایک پکارنے والے نے پکارا، غم نہ کر تیرے رب نے تیرے نیچے ایک ندی (بڑی ہستی) پیدا کر دی ہے‘ (مریم ۱۹:۲۴)۔

مشہور تابعی حسن سے منقول ہے ’حضرت مریمؑ ان ٹیلوں پر چڑھ گئی تھیں جن پر کھجور کا درخت تھا چنانچہ اسی مکان کے نشیب سے جبرائیلؑ نے آواز دی۔ فرشتہ نیچے پکارتا ہے مریمؑ کو تسلی دیتا ہے ان کا رابطہ ان کے رب سے قائم کرتا ہے۔ کھانے پینے کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔ ان کو حجت و برہان کی خبر دیتا ہے اور کہتا ہے کہ غم نہ کر! ترے رب نے تیرے نیچے ندیا جاری کر دی ہے‘۔ مولانا امین احسن اصلاحی

Marfat.com

فرماتے ہیں۔ اللہ نے اپنی اس مومنہ اور فرمانبردار بندی کے لیے وہ شانیں دکھائیں جو پوری تاریخ انسانیت میں صرف ان کے لیے ظاہر ہوئیں کوئی بھی اس میں ان کا شریک نہیں۔ مجاہد حسن، وہب بن منبہ، ابن زید اور ابی بن کعب کا قول ہے 'کہ پکارنے والے حضرت عیسیٰ علیہ السلام تھے اور یہ قرأت یوں ہے کہ فَنَادَاهَا مَنْ تَحْتَهَا' (انھیں اس نے پکارا، جو ان کے نیچے تھا)۔ ان کا کہنا ہے کہ اگر وہ فرشتہ ہوتا تو اوپر سے آواز دیتا اور اگر عیسیٰ علیہ السلام نے اپنی والدہ سے پہلے کلام نہ کیا ہوتا تو ان میں قوم کا سامنا کرنے کی جرأت نہ ہوتی اور بچے کو ساتھ لے کر ان کو چیلنج کرنے کی ہمت نہ ہوتی اور وہ عیسیٰ علیہ السلام کی طرف اشارہ نہ کرتیں۔ آیت زیر نظر میں سریا کے بھی دو معنی بتائے گئے ہیں۔ ایک تو ندیا کے معنی ہیں جس کی تائید جمہور مفسرین نے کی ہے کہ یہ حضرت مریمؑ کا معجزہ تھا کہ اللہ نے ان کے نیچے ایک چشمہ جاری کر دیا ہے۔ (ممکن ہے یہ چشمہ پہلے سے موجود ہو اور اللہ نے انھیں اس کا پتہ بتایا ہو)۔ دوسرے سَرِيًّا کو سرو (یعنی بلندی) سے ماخوذ سمجھ کر بڑی ہستی یعنی عیسیٰ علیہ السلام مراد لیے گئے ہیں۔ امام راغب کا کہنا ہے کہ ایک قول یہ ہے کہ اس سے مراد بڑی شان والا لڑکا ہے۔ مولانا آزاد نے امام شوکانی کی فتح القدیر کے حوالے سے اسی معنی کو صحیح سمجھا ہے۔ وہ فرماتے ہیں 'موقع اور محل کا تقاضا یہ ہے کہ یہی معنی مراد لیے جائیں کیونکہ حضرت مریمؑ کا غم پانی نہ ملنے کی وجہ سے نہ تھا وہ تو اس حالت کی وجہ سے تھا جو ان کو در پیش تھی پس فرشتہ کا یہ کہنا کہ غم نہ کر تیرے لیے ایک نہر جاری کر دی ہے بالکل بے معنی معلوم ہوتا ہے۔ جب پانی کا فقدان غم کا سبب نہ ہو تو اس کا وجود وجہ تسکین کیسے ہو سکتا ہے؟ البتہ یہ کہنا کہ غمگین نہ ہو تیری گود میں ایک عظیم انسان پیدا کر دیا ہے وجہ تسکین بن سکتا ہے'۔

قرین قیاس یہی ہے کہ وہ نہر اس وقت کسی چشمہ سے جاری ہوئی ہوگی یا پہاڑ کے کسی سیلابی نالے سے رواں ہوئی ہوگی کیونکہ اس مقام پر خارق عادت باتوں کا ذکر ہو رہا ہے اس لیے ارشاد ہوتا ہے کہ 'تو کھجور کے درخت کا تنا پکڑ کے اپنی طرف ہلا، تجھ پر تازہ پکی کھجوریں جھڑ پڑیں گی' (مریم ۱۹:۲۵)۔ یاد رہے کہ تنا خشک تھا موسم سرد تھا پلک جھپکنے میں کھجوریں ظاہر ہوئیں اور ٹپک کر گرنے لگیں۔ گویا کہ پکارنے والا کہہ رہا تھا کہ خشک تنے کو ہلاؤ اور مردے کو زندہ کرنے کی ایک اور نشانی دیکھ لو۔ صاحب کشاف نے بڑی خوبصورت بات کہی ہے۔ کہتے ہیں: 'نہر اور کھجوریں صرف کھانے پینے کے لحاظ سے وجہ تسکین نہ تھیں بلکہ یہ دونوں معجزے یہ ثبوت دے رہے تھے کہ مریمؑ پاکباز ہیں اور ان کا کردار شک وشبہ سے بالاتر ہے۔ ان کے معاملات معمول سے ہٹ کر ہیں تاکہ لوگوں کو پتہ چل جائے کہ عیسیٰ علیہ السلام کی معجزانہ پیدائش ان کی عظمت کو بڑھا رہی ہے۔ اللہ تعالیٰ مریمؑ کو تسلی دیتا ہے کہ جس طرح وہ عناصر کی ترکیب کے بغیر پانی

Marfat.com

اور کھجور کو وجود میں لاسکتا ہے بالکل اُسی طرح وہ اس بات کی قدرت رکھتا ہے کہ وہ آپ کا دامن اِن وسوسوں سے صاف کردے جوان رسم ورواج کے اسیر لوگوں کے دل میں کھٹک رہے ہیں یہ دونوں مریمؑ کے معجزے تھے اوران کی عظمت شان پر دلالت کرتے ہیں۔ تنے کو حرکت دینے کے لیے ہاتھ بڑھانے سے پہلے حضرت مریمؑ پر حیرت اور وحشت تو طاری ہوئی ہوگی پھر جب ان کی طبیعت سنبھلی ہوگی تو انہیں اطمینان ہوا ہوگا کہ اللہ ان کا ساتھ چھوڑنے والا نہیں اوران کی دلیل تو ان کے پاس ہے وہ بچہ جو گہوارے میں بولتا ہے۔ لفظ هُـزِّي (تو حرکت دے) میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ طلب رزق کے لیے کوشش ضروری ہے۔ کسی نے کیا خواب کہا ہے:

أَلَمْ تَـرَى أَنَّ الـلّٰـهَ أَوْحـى لِـمَـرْيَـمَ
وَهُـزِّي علـيك الـجـزع يُسَـاقِـطِ الـرُّطَـب
وَلَـوْ شَـاءَ أَحْـنَـى الـجِـزْعَ مِـن غـيـر هَـزِّهٖ
إِلَيها ولٰـكـن كُـلّ شَـيْـئٍ لَـه سَـبَـب

کیا تو نے دیکھا نہیں کہ اللہ نے مریمؑ کو وحی کی
کہ تنے کو اپنے اوپر ہلاؤ تازہ کھجوریں جھڑ پڑیں گی
اگر وہ چاہیں تو بغیر چلائے تنے کو جھکا دیتا
لیکن ہر شے کا ایک سبب ہوتا ہے

حالت زچگی میں کوئی خوراک کھجور سے بڑھ کر زچہ کے لیے تقویت کا باعث نہیں ہوتی۔ اللہ نے یہی خوراک حضرت مریمؑ کو بہم پہنچائی اور پینے کے لیے چشمے کا ٹھنڈا اور توانا پانی دیا۔

سو، کھا، پی اور آنکھیں ٹھنڈی کر، پھر اگر انسانوں میں سے کسی کو دیکھو تو (اشارے سے) کہنا کہ میں نے خدائے رحمان کے لیے روزہ کی منت مان رکھی ہے اس لیے آج میں کسی انسان سے کلام نہیں کروں گی (مریم ۱۹:۲۶) مزے سے کھاؤ، پیو اور اپنے بچے کے نظارہ سے آنکھیں ٹھنڈی کرو، مطمئن ہو جاؤ اور سارا خوف بھول جاؤ۔ آنکھوں کی ٹھنڈک کا محاورہ قرآن حکیم میں اُمِ موسیٰ کے لیے بھی استعمال کیا گیا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو ممتا کے جذبات کا کس قدر پاس ہے۔ وہ بچے کو ماں کی گود میں ڈال کر اس کی آنکھیں ہمیشہ کے لیے ٹھنڈی رکھنا چاہتا ہے۔ جس خدائے برتر نے ان کو یہ بزرگی اور عظمت عطا کی وہ کب ان کو اس کرب اور بے چینی میں مبتلا رہنے دیتا۔ اس نے فرشتے کے ذریعہ سے مریمؑ کو پھر پیغام بھیجا کہ جب تو اپنی قوم میں پہنچے اور وہ اس بارے میں تجھ سے سوالات کریں تو خود

Marfat.com

جواب نہ دینا بلکہ اُن کو بتانا کہ میں روزے سے ہوں اس لیے کسی سے بات نہیں کر سکتی جو کچھ پوچھنا چاہتے ہو اس بچے سے پوچھو۔ پھر حکم ہوتا ہے کہ جب کسی کا سامنا ہو تو بغیر بات کیے اشارے سے کہو کہ میں نے اللہ کے لیے لوگوں سے بات نہ کرنے کی نذر مانی ہے اس سے انھیں پتہ چلے گا کہ وہ اپنے ساتھ معجزہ لیے جارہی ہے'۔ صوم کے معنی یہاں کھانا پینا چھوڑنا نہیں کیونکہ ابھی ابھی انھیں کھانے پینے کا حکم دیا گیا ہے بلکہ اس سے مراد عام بات چیت سے رکنا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ میں تو آج فرشتوں سے گفتگو کروں گی اور اپنے رب سے مناجات۔ اُنھوں نے یہ بات اس لیے کہی کہ ایک تو حضرت مریمؑ کے پاس اس بات کا کوئی ثبوت نہ تھا کہ اس عمل میں ان کا کوئی قصور نہیں۔ ایسا ثبوت درکار تھا کہ جس سے سوسائٹی مطمئن ہو جائے کہ وہ بے گناہ ہیں۔ اس ثبوت کے لیے عیسٰیؑ کا معجزانہ کلام ان کے اپنے کلام سے بڑھ کر قدرت رکھتا تھا اور تہمت کے رد میں وہ نص قطعی کا درجہ رکھتا تھا کیونکہ یہ ماں اور بچے دونوں کا معجزہ تھا۔ دوسرے احمقوں کے ساتھ کج بحثی کا کوئی فائدہ نہ تھا۔

پھر وہ ان کو گود میں لیے ہوئے اپنی قوم کے پاس آئیں۔ انھوں نے کہا مریم! تُو نے بڑی عجیب بات کر دکھائی ہے۔ اے ہارون کی بہن! نہ تو تیرا باپ برا آدمی تھا اور نہ ہی تیری ماں بدکار تھی۔ پس مریم نے بچے کی طرف اشارہ کیا۔ انھوں نے کہا! بھلا، ہم اس سے کیا بات کریں جو ابھی گود میں بیٹھنے والا بچہ ہے۔ (مریم۱۹: ۲۷تا۲۹)

مریمؑ نے بچے کو اُٹھایا اور لے کر اپنی قوم کے پاس آئیں۔ ذرا اس دہشت کا تصور کیجیے جو ان کی قوم پر طاری ہوئی ہوگی۔ وہ ان کے قریبی گھرانے والے تھے۔ ہارونؑ کی نسل سے اور بیت المقدس کے پیشہ ور کاہن۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ ان کی پاکباز بیٹی جو بیت المقدس کی خدمت اور اللہ کی عبادت کے لیے وقف تھی گود میں بچہ اٹھائے ہوئے ہے۔ کہنے لگے تو نے تو بری حرکت کی ہے۔ تیری نسبت تو ہارون نبی سے ہے۔ اس نسبت اور اس حرکت میں کتنا بڑا فاصلہ ہے؟ تیرے ماں باپ تو ایسے نہ تھے ایسی گھٹیا حرکت تو وہی کرتے ہیں جن کے ماں باپ ایسے ہوں۔ اس اخلاقی گراوٹ سے تو نے اپنی نسل کو بدنام کر دیا ہے۔ حضرت مریمؑ نے وحی الٰہی کے زیر اثر بچے کی طرف اشارہ کیا۔ وہ اور کر بھی کیا سکتی تھیں؟ وہ اس جرم کی کیا توجیہہ کرتیں۔ کیا وہ غیظ و غضب کے اس عالم میں ان کی توجیہہ قبول کرتے؟ پس وہ اس بچے کی طرف اشارہ کرتی ہیں جس کے بارے میں انھیں یقین ہو گیا تھا کہ یہ غیر معمولی بچہ ہے۔ یہ دیکھ کر کہ ایک کنواری لڑکی بچہ اٹھائے ان کے سامنے کھڑی ہے اور اس کی طرف اشارہ کر کے ان کا مذاق اڑا

Marfat.com

رہی ہے۔ انھوں نے کیا کیا پیچ وتاب نہ کھائے ہوں گے؟ روایت ہے کہ انھوں نے اسے سنگسار کرنے کا ارادہ کیا۔ یہاں تک کہ عیسیٰ علیہ السلام اپنی ماں کی مدد کو آئے، اور اپنی ماں کا دفاع کیا اور ان کی بے گناہی کو ثابت کیا۔ وہ بول اٹھے: میں اللہ کا بندہ ہوں، اللہ نے مجھے کتاب دی ہے اور اللہ نے مجھے تم پر نبی بنایا ہے۔ قوم نے ایک شیر خوار بچے سے جب یہ کلام سنا تو حیرت زدہ ہوگئی اور اس کو یقین ہوگیا کہ مریم کا دامن ہر قسم کی برائی سے پاک ہے اور اس بچے کی پیدائش کا معاملہ یقیناً اللہ کی جانب سے ایک نشانی ہے۔

بَرًّا بِوَالِدَتِيْ (والدہ کا فرمانبردار) اور مجھ کو اپنی والدہ کا خدمت گزار بنایا (مریم ۳۲:۱۹)۔ اس آیت میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنے آپ کو انتہائی وفاداری کے باعث سراپا وفادار قرار دیا۔ آیت کے اس ٹکڑے میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بن باپ پیدائش اور حضرت مریم سے زنا کی تہمت سے برأت کا اشارہ ہے وگرنہ ایک نبی اپنی ماں کی وفاداری کا کیسے دم بھرتا۔ اسی مضمون کا بیان سورۃ مائدۃ (۱۱:۱۵) یوں ہوا ہے 'اِذْ قَالَ يَا عِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ اذْكُرْ نِعْمَتِيْ عَلَيْكَ وَعَلٰى والدتك'۔ جب اللہ تعالیٰ ارشاد فرمائیں گے کہ اے عیسیٰ علیہ السلام ابن مریم، میرا انعام یاد کرو جو تم پر اور تمھاری والدہ پر ہوا ہے۔ یہاں اللہ تعالیٰ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو حکم دیتا ہے کہ میری نعمتیں جو تم کو عطا ہوئی ہیں ان کے ساتھ ان نعمتوں کا ذکر بھی کرو جو میں نے تمھاری والدہ کو بخشیں۔ اس میں تمام نعمتیں شامل ہیں جو مریم کی نذر کی قبولیت، ان کی تربیت اور ان کی کفالت سے شروع ہوکر براہ راست اور فرشتوں کے ذریعہ سے ان سے ہم کلامی، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بن باپ کے پیدائش اور گہوارے میں ان کی برأت کی گواہی پر ختم ہوتی ہیں۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نے ان کو ان لوگوں کے اقوال سے بچالیا جو بن باپ کے بچہ کی پیدائش پر اعتراض کرتے تھے۔

اس کے علاوہ قرآن عزیز کے بعض دوسرے مقامات پر بھی اُم عیسیٰؑ کا ذکر ملتا ہے۔ یہاں پر دو مقامات کا بطور خاص ذکر کروں گا جو حضرت مریم کے مرتبہ اور مقام کو نمایاں کرتے ہیں۔

ا۔ سورۃ مائدۃ (۵:۷۵) میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: 'وأُمّة صديقة'۔ 'اور ان کی ماں صدیقہ تھیں'۔ 'صدق' سے یہاں مراد اللہ تعالیٰ کے ساتھ ان کا اخلاص ہے۔ اس آیت میں ان لوگوں نے دلیل پکڑی ہے جو حضرت مریم کی نبوت کے قائل نہیں وہ کہتے ہیں کہ اگر وہ نبی ہوتیں تو

Marfat.com

صدیقہ کے ساتھ نبیہ کا بھی ذکر ہوتا، کیونکہ صدیقہ کا مقام نبوت کے مقام سے فروتر ہے۔ سورۃ نساء (۶۹:۴) میں قرآن عزیز نے منعم علیھم کی جو فہرست دی ہے وہ اس بارے میں نص قطعی ہے کہ صدیقہ کا درجہ نبوت کے درجہ سے کم تر ہے۔ امام ابن حزم نے الفصل فی الملل (جلد پنجم ص ۱۲) میں اس کا جواب یہ دیا ہے کہ یہ لقب حضرت مریمؑ کی نبوت کے لیے اس طرح مانع نہیں ہے جس طرح حضرت یوسفؑ کے نبی اور رسول ہونے کے لیے یہ آیت مانع نہیں۔ یُوسُفُ اَیُّھَا الصِّدِّیق' (الیوسف ۴۶:۱۲)۔ 'اے یوسف اے صدق مجسم۔ یہ ایک نا قابل انکار حقیقت ہے' جو نبی ہوتا ہے وہ صدیق ضرور ہوتا ہے'۔

۲۔ سورۃ مؤمنون (۵:۲۳) میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ وَجَعَلْنَا ابْنَ مَرْيَمَ وَأُمَّهُ آيَةً وَآوَيْنَاهُمَا إِلَى رَبْوَةٍ ذَاتِ قَرَارٍ وَمَعِينٍ ۝ 'اور ہم نے عیسیٰؑ بن مریم اور ان کی ماں کو (اپنی قدرت و عظمت) کا نشان بنایا اور ان دونوں کا ایک بلند مقام پر ٹھکانا بنایا جو سکونت کے قابل اور چشمہ والا ہے'۔ یہاں عیسیٰ علیہ السلام اور ان کی ماں کو دو الگ الگ نشانیاں نہیں کہا گیا بلکہ دونوں کو ایک نشانی قرار دیا گیا۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک دوسرے کی تکمیل کرتے ہیں یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام بن باپ کے پیدا ہوئے اور حضرت مریمؑ نے مرد کے چھوئے بغیر ایک بچہ کو جنم دے کر اللہ تعالیٰ کی عظمت اور قدرت کا ایک معجزہ بنیں۔ رہی یہ بات کہ وہ جائے قرار جہاں اللہ نے اُم عیسیٰؑ اور عیسیٰ علیہ السلام کو پناہ دی کونسی جگہ تھی؟ کیا وہ وہی جگہ تھی جہاں عیسیٰ علیہ السلام کا جنم ہوا۔ دمشق یا مصر یا کوئی اور ملک؟ زیادہ قرین قیاس یہی ہے کہ یہ جگہ بیت اللحم ہے جہاں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش ہوئی۔ تفسیر ابن کثیر میں اس آیت کی تفسیر میں عبداللہ بن عباس کا قول مذکور ہے کہ زیر نظر آیت میں لفظ معین سے مراد جاری نہر ہے اور یہ وہی نہر ہے جس کا ذکر سورۃ مریم میں سَرِیًّا کے لفظ کے ساتھ موجود ہے۔ ضحاک اور قتادہ کا بھی یہی قول ہے کہ جائے قرار سے بیت المقدس کی سرزمین مراد ہے اور یہی قول قابل ترجیح ہے کیونکہ دوسری آیت میں بیت المقدس کی نہر کا بھی ذکر ہے اور قرآن کا ایک حصہ دوسرے حصہ کی تفسیر کرتا ہے۔

Marfat.com

اَلمرءَ ۃ۔ اِمرأ ۃ (خاتون یا بیوی)

لغوی مفہوم

المرءَ یا امرؤٌ مرد یا انسان کو کہتے ہیں۔ اس کی غیر لفظی جمع رجال ہے اور اسم تصغیر مُرَیٌ ہے۔ اس کی مؤنث المرءَۃ یا امرأۃ ہے۔ اس کی غیر لفظی جمع نِساء یا نِسْوَۃٌ ہے اور اسم تصغیر مُرَیْئَۃٌ ہے۔ مصباح المنیر میں ہے کہ بسا اوقات خاتون کے لیے بھی مرد کی طرح اِمرُؤٌ کا لفظ استعمال ہوتا ہے پھر کسائی کا قول نقل کیا گیا ہے کہ اس نے ایک فصیح عرب خاتون کو یہ کہتے سنا 'أنا اِمرؤ أ رید الخیر'۔ 'میں ایسی عورت ہوں جو ہمیشہ خیر چاہتی ہوں'۔ لسان العرب میں بھی ابن الاعرابی کا قول نقل کیا گیا ہے کہ مرد کی مانند خاتون کے بارے میں بھی جملہ استعمال کیا جاتا ہے 'اِنھا لا مرأ صِدق'۔ 'صرف وہ ایک سچی عورت ہے'۔ انسان ہونے کے ناتے مرد وزن میں کوئی فرق نہیں۔ اس لیے اِمرؤ مرد کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے اور انسان ہونے کی وجہ سے خاتون کے لیے بھی۔ اِمرأۃ بیوی کے معنوں میں بھی آتا ہے۔ عربی محاورہ میں کہا جاتا ہے: 'اِمرأۃ الرجل' آدمی کی بیوی اور رجل المرأۃ خاتون کا خاوند۔ قرآن حکیم میں متعدد مقامات پر المرءُ یا امرئ کا لفظ تذکیر و تانیث کی تمیز کے بغیر استعمال ہوا ہے۔ جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ خالق کائنات کے نزدیک انسانی فطرت میں کوئی فرق نہیں۔

المرء یا اِمرئ کا استعمال (مرد وزن دونوں کے لیے)

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: 'وَاعْلَمُوْا أَنَّ اللّٰهَ يَحُوْلُ بَيْنَ الْمَرْءِ وَقَلْبِهٖ وَأَنَّهٗٓ إِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ' (الأنفال ۸:۲۴)۔ 'اور جان لو کہ اللہ تعالیٰ انسان اور اس کے دل کے درمیان حائل ہوتا ہے اور وہ سب اس کے یہاں اکٹھے کیے جائیں گے'۔ اس آیت کے آغاز میں اہل ایمان کو اللہ اور اس کے رسول اللہ ﷺ کی پکار پر لبیک کہنے کا حکم دیا گیا ہے اور ساتھ ہی ساتھ تنبیہ کر دی گئی ہے کہ اگر انسان یہ سمجھتا ہے کہ اللہ اور اس کے رسول کو نہ ماننے سے اس کے دل کی تمنائیں اور ارادے پورے ہو جائیں گے تو وہ سخت غلط فہمی میں مبتلا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اس نے دل میں کوئی اسکیم بنائی ہو جس کی خاطر اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کر رہا ہو۔ تو کیا نافرمانی کرنے سے اس کی اسکیم پوری ہو جائے گی؟ ہرگز نہیں۔ وہ اللہ کی قدرت کو کیسے نظر انداز کر سکتا ہے۔

Marfat.com

مَنۃ تدبیر کند بندہ تقدیر زند خندہ

'بندہ تدبیر کرتا رہتا ہے تقدیر ہنستی رہتی ہے

دل انسان کی خواہشات اور ارادوں کا مہمان خانہ ہے لیکن بندوں سے چھپی ہوئی بات اللہ سے تو نہیں چھپائی جا سکتی۔ یہ دل بھی تو اسی کے قبضہ قدرت میں ہے۔ پھر سب نے اس کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔ چھپانے کا کیا فائدہ؟ یہ ایک قاعدہ کلیہ ہے جو قرآن اہلِ ایمان کو سمجھانا چاہتا ہے اور اس میں نوع انسانی کا بھلا ہے۔ اس لیے قرآن نے مذکر مفرد المرء (مرد) استعمال کرنے کے باوجود اس سے مراد نفس انسانی لی ہے اور تذکیر و تانیث کی تمیز کو روا نہیں رکھا۔ عربی کا ایک شعر ہے:

یُریدالمرء أن یعطیٰ مناہ

ویأبی اللہ إلا مایشاء

انسان چاہتا ہے کہ اس کی ساری خواہشیں پوری ہو جائیں

مگر اللہ رد کر دیتا ہے اور صرف وہی خواہشیں پوری کرتا ہے جن کو وہ پسند کرتا ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: 'یَوْمَ یَنظُرُ الْمَرْءُ مَا قَدَّمَتْ یَدَاهُ' (القصص ۷۸:۴)۔ 'اس دن جب انسان ان اعمال کو دیکھے گا جو اس نے آگے بھیجے ہوں گے'۔ اس آیہ مبارکہ میں یہ بتایا گیا ہے کہ قیامت کے دن جب اعمال نامہ پیش کیا جائے گا اس وقت عمل کا مرحلہ گزر چکا ہو گا پچھتانے کا کوئی فائدہ نہ ہو گا۔ اس لیے انسان کو اس دن کے لیے ہر لحظہ تیار رہنا چاہیے۔ کیا خبر اس کی موت کب واقع ہو جائے؟ اور اس کے لیے قیامت بپا ہو جائے۔ کیونکہ ہر نفس انسانی خواہ کافر ہو یا مومن، خاتون ہو یا مرد مستقل بالذات ہے اور اپنا بوجھ خود اٹھانے کے قابل ہے اس لیے اس مقام پر بھی مذکر مفرد المرء ہونے کے باوجود اس سے نفس انسانی مراد ہے جس میں مذکر اور مؤنث کا کوئی فرق نہیں۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: 'لِکُلِّ امْرِئٍ مِّنْهُم مَّا اكْتَسَبَ مِنَ الْإِثْمِ' (النور ۱۱:۲۴)۔ 'ان میں سے ہر ایک نفس پر اس گناہ کا بوجھ ہے جو اس نے کیا'۔ یہ آیت واقعہ افک کے سلسلہ کی آیت ہے۔ بتایا جا رہا ہے کہ اس واقعہ میں جو بھی ملوث ہو خواہ وہ مرد ہو یا خاتون، وہ اپنے کیے کی سزا بھگتے گا۔ اس آیت میں بھی اِمــــرِیٔ (مرد) کا لفظ تذکیر و تانیث کے فرق کے بغیر استعمال ہوا ہے۔ نیز زیر نظر آیت اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ مرد ہو یا خاتون دونوں مستقل اور با اختیار شخصیت کے مالک ہیں اور دونوں جزا اور سزا کے سزاوار ہیں۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: 'کُلُّ امْرِئٍ بِمَا کَسَبَ رَهِینٌ' (الطور ۲۱:۵۲)۔ 'یہ انسان اپنے کیے کے

Marfat.com

ساتھ مقید (گروی) ہے۔ اس آیت کے آغاز میں ہے کہ جو لوگ ایمان لائے اور ان کی آل اولاد نے بھی ایمان میں ان کی پیروی کی۔ ہم (جزا کے طور پر) ان کو ان کے خاندان سے ملا دیں گے اور ان اعمال کی جزا میں ذرہ برابر بھی کمی نہیں کریں گے کیونکہ ہر نفس انسانی اپنے اعمال کا پابند ہے۔ یہاں بھی اِمرءٍ کا لفظ مرد کی بجائے نفس انسانی کے لیے استعمال ہوا ہے اور اس آیت میں بھی وضاحت کے ساتھ یہ قرآنی اصول بتا دیا گیا ہے کہ مرد و زن ایک آزاد اور مستقل شخصیت کے مالک ہیں۔ اس لیے اپنے کیے کے ذمہ دار ہیں۔ عورت کے اندر بھی اللہ نے وہی روح پھونکی ہے جو مرد کے اندر پھونکی گئی یعنی اصل اور انجام کے لحاظ سے دونوں میں مکمل وحدت ہے۔ عورت کی حیثیت تابع مہمل کی نہیں، بلکہ وہ صاحب رائے ہے اور صاحب فیصلہ ہے۔ اس کی رائے پر نبی کریم ﷺ نے صلح حدیبیہ میں اور حضرت عمرؓ نے مسجد نبوی کے اندر بھری مجلس میں حق مہر کے سلسلہ میں عمل کیا۔ شریعت عورت سے بھی ایسے خطاب کرتی ہے جیسے مرد سے۔ شرعی فرائض اس بات کی دلیل ہیں کہ عورت مرد کی طرح صاحب عقل و فہم ہے۔ ان فرائض کی ادائیگی کے لیے مرد اور عورت الگ الگ ذمہ دار ہیں مثلاً نماز پڑھنے کے لیے اور روزہ رکھنے کے لیے بیوی کو شوہر کی اجازت کی کوئی ضرورت نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے مردوں اور عورتوں سے مساویانہ طور پر جزا کا وعدہ کیا ہے اور سزا کی دھمکی دی ہے۔ "وَمَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ" (غافر ۴۰:۴۰)۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: "اَيَطْمَعُ كُلُّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ اَنْ يُّدْخَلَ جَنَّةَ نَعِيْمٍ" (المعارج ۷۰:۳۸)۔ "کیا ان میں سے ہر شخص خواہش کرتا ہے کہ وہ نعمتوں والی جنت میں داخل ہو جائے"۔ اگلی آیت میں ہے "ہرگز ایسا نہیں ہو سکتا کیونکہ ہم نے انھیں اس چیز (حقیر مادہ) سے پیدا کیا ہے، جسے وہ جانتے ہیں"۔ اس آیت میں بھی اِمرءٍ کے معنی مرد نہیں بلکہ نفس انسانی ہے۔ یہ نفس انسانی خواہ مرد ہو یا خاتون جب تک اپنے اندر چھپے ہوئے حیوان پر اپنی روحانیت سے غلبہ نہ پالے وہ جنت میں داخل نہیں ہوگا۔ اس آیہ مبارکہ میں بتایا گیا ہے کہ جنت میں داخل ہونے کا نسخہ کیا ہے؟ کوئی نفس انسانی صرف مرد ہونے کے ناطے جنت میں جانے کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ اس کا دارومدار تو اعمال پر ہے، اگر اعمال اچھے ہوں تو انسان جنت میں داخل ہوگا۔ مومن مرد یا خاتون ہونا کوئی معیار نہیں۔ اس کا مضمون وہی ہے جو "اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ" (۴۹:۱۳) کا ہے۔ "تم میں سے اللہ کے یہاں سب سے زیادہ مکرم وہ ہے جو تم میں سے سب سے زیادہ متقی ہے"۔ دونوں آیات مرد کی فضیلت کے نظریہ کی کلیۃً نفی کرتی ہیں۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے "بَلْ يُرِيْدُ كُلُّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ اَنْ يُّؤْتٰى صُحُفًا مُّنَشَّرَةً" (المدثر ۷۴:۵۲)۔ "بلکہ ان میں سے ہر شخص چاہتا ہے کہ اسے پھیلے ہوئے کھلے اوراق دیئے جائیں"۔ مطلب یہ ہے کہ کافروں میں سے ہر شخص

Marfat.com

ازراہ تمسخر یہ کہتا ہے کہ وہ تو اسی وقت ایمان لائے گا جب اللہ اس کی طرف اوراق میں لکھ کر اور ان سے مخاطب ہو کر کوئی پیغام بھیجے گا۔ اس آیت میں امرئ کا لفظ مرد و زن سب کے لیے استعمال ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ 'لِكُلِّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ يَوْمَئِذٍ شَأْنٌ يُغْنِيهِ' (عبس ۸۰:۳۷)۔ 'اس دن ان میں سے ہر شخص کو اپنی ایسی فکر ہوگی جو اسے دوسروں سے بے نیاز کر دے گی'۔ مطلب یہ ہے کہ انسان کے بھائی، ماں، باپ، بیوی اور بچے سب کو اپنی اپنی پڑی ہوگی۔ اسے دوسروں کا ہوش نہ ہوگا۔ یہاں لفظ امرئ بھائی، ماں، باپ، بیوی اور بچوں سب کے لیے استعمال ہوا ہے۔ مندرجہ بالا آیات اس بات کا ثبوت ہیں کہ اللہ تعالیٰ نفس انسانی کو تذکیر و تانیث کی تمیز کیے بغیر لغوی سطح پر بھی برابر سمجھتا ہے اور حکم دیتے وقت ان کے درمیان کوئی فرق روا نہیں رکھتا۔

المرءۃ بمعنی خاتون

اب میں ان آیات مبارکہ کو بیان کروں گا جن میں المرأۃ بمعنی خاتون استعمال ہوا ہے اور وہ خاتون کے مرتبہ و مقام پر بھی روشنی ڈالتی ہیں۔ 'وَاسْتَشْهِدُوا شَهِيدَيْنِ مِن رِّجَالِكُمْ فَإِن لَّمْ يَكُونَا رَجُلَيْنِ فَرَجُلٌ وَامْرَأَتَانِ مِمَّن تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَاءِ أَن تَضِلَّ إِحْدَاهُمَا فَتُذَكِّرَ إِحْدَاهُمَا الْأُخْرَىٰ' (البقرۃ ۲:۲۸۲)۔ 'اور اپنے مردوں میں سے دو گواہ طلب کرو اور اگر دو مرد نہ ہوں تو پھر ایک مرد اور دو خواتین۔ اور گواہ ان لوگوں میں سے ہوں جن کو تم پسند کرو (رضامندی کا اظہار کرو) تاکہ دوسری اسے یاد دلا دے اگر ان میں سے ایک بھول جائے'۔ یہ آیت مبارکہ اس وقت نازل ہوئی جب اکثر اہل عرب لکھنے پڑھنے سے عاری تھے اور کاغذ بھی کمیاب تھا۔ جن مسلمانوں کو ہدایت دی جا رہی تھی ان کو اپنی جان کے لالے پڑے ہوئے تھے۔ وہ ہجرت کر کے مدینہ منورہ جا رہے تھے۔ ایسی قوم کو تحریری معاملات کی یہ ہدایت بتلاتی ہے کہ مسلمان مستقبل میں ایک عظیم متمدن قوم بننے والے ہیں۔ اس لیے قوم کے لیے تمدنی ضرورتوں کا سامان پہلے سے ہی کر دیا گیا۔

جاہل معاشرے میں مرد کے مقابلے میں عورت کی کوئی قدر و منزلت نہیں تھی۔ شہادت دینا تو دور کی بات ہے اسے بحیثیت انسان بنیادی حقوق بھی حاصل نہیں تھے۔ قرآن نے اسے یہ اعزاز بخشا کہ گواہی جیسے اہم فریضہ کی ادائیگی کے لیے مرد کے شانہ بشانہ لاکھڑا کیا اور اعزاز بھی اس معاملہ میں جس میں عام طور پر مردوں کی اجارہ داری ہوتی ہے۔ حیرت کی بات ہے کہ اتنے بڑے اعزاز سے آنکھیں موندھ کر اسی آیت کو بنیاد بنا کر ثابت کیا جاتا ہے کہ خاتون مرد سے آدھی ہے۔

شہید اور اس کی جمع شہداء کا اطلاق اس شخص پر ہوتا ہے جو گواہی میں دیانت دار ہو۔ اس کا اطلاق

Marfat.com

خاتون پر بھی اسی طرح ہوتا ہے جس طرح مرد پر۔ تذکیر و تانیث میں کوئی فرق نہیں۔ قرآن نے شاہد کی جگہ شہید اور شہود کی جگہ شہداء کا لفظ استعمال کر کے گواہ کے اعلیٰ مقام کی طرف اشارہ کیا ہے کیونکہ لوگ اس پر اعتماد کرتے ہیں یا امانت اُٹھانے کا اہل سمجھتے ہیں اور وہ اپنی گواہی سے حق تلفی روکنے کا سبب بنتا ہے۔ 'استشھدوا' کے صیغہ میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ دو گواہوں کو طلب کرو۔ ان میں اچھی صفات کو تلاش کرو۔ معاہدہ کرتے وقت سب لوگ گواہی کے اہل نہیں ہوتے اور نہ سب شہادت کا بوجھ اُٹھانے کی قدرت رکھتے ہیں۔ اس سلسلہ میں چھان پھٹک سے کام لینا چاہیے جس میں یہ صفات ہوں گی خواہ مرد ہو یا خاتون وہ شہادت کا اہل ہوگا اور وہ شہادت کے لیے مکلف ہوگا۔ شہادت کی اہلیت میں مرد و زن دونوں برابر ہیں اسی طرح اس کی ذمہ داری میں بھی دونوں برابر ہیں۔ آیت مذکور میں لَا یَاْبَ الشھداء منکم (تم میں سے گواہی دینے والے گواہی سے انکار نہ کریں) کا ٹکڑا اسی حقیقت کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔ امام رازی نے تفسیر کبیر میں آیت کی تفسیر کے تحت ۲ صفات کا ذکر کیا ہے جو گواہ میں پائی جانی چاہئیں۔ یہاں ان کے ذکر کا موقع نہیں۔

من رجالکم (اپنے مردوں میں سے)

مفسرین نے مسلمان ہونے کے ساتھ آزادی کی بھی شرط رکھی ہے۔ اسی بناء پر امام ابوحنیفہ اور امام شافعی غلام کی شہادت کو جائز نہیں سمجھتے کیونکہ وہ مالک کی اجازت کے بغیر عدالت میں حاضر نہیں ہو سکتا۔ جبکہ قاضی شریح، ابن سیرین اور امام احمد غلام کی شہادت کو جائز سمجھتے ہیں۔ قاضی شریح کی دلیل یہ ہے کہ آزادی اور غلامی انسان کی عقل، دین اور عدالت پر اثر انداز نہیں ہو سکتی۔ من رجالکم کی تعبیر میں اس طرف اشارہ ہے کہ گواہ اس سوسائٹی سے تعلق رکھتے ہوں جس میں معاہدہ تحریر ہو رہا ہے۔ ان کی تم سے دشمنی نہ ہو۔ وہ معاملہ کو بخوبی سمجھتے ہوں اور اگر شہادت کی ضرورت پڑے تو بآسانی دستیاب ہوں۔

وان لم یکونا رجلین (اور اگر دو مرد گواہ نہ ہوں)

قاضی ابوبکر بن العربی احکام القرآن میں فرماتے ہیں کہ ظاہری عبارت کا تقاضا ہے کہ خواتین کی شہادت مردوں کی عدم موجودگی میں جائز ہوگی۔ مگر بات ایسے نہیں جیسے کہ لوگوں نے سمجھا ہے۔ اگر اللہ کا بھی ارادہ ہوتا تو وہ یوں فرماتا 'فان لم یوجد رجلان فرجل وامراتان' 'اگر دو مرد موجود نہ ہوں' مگر اللہ نے فرمایا 'ان لم یکونا' یہ قول وجود اور عدم وجود دونوں حالتوں کے بارے میں ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ معاہدہ کی مجلس میں کوئی مرد موجود نہ ہو ورنہ دو خواتین کے ساتھ ایک مرد کہاں سے آئے گا؟ بلکہ مطلب یہ ہے کہ ایسے دو مرد نہ ملیں جو گواہی کے قابل ہوں۔ مرد تو موجود ہیں مگر حق دار ان سے

Marfat.com

گواہی نہیں لینا چاہتا کیونکہ وہ اس کے اہل نہیں اور اسے صرف ایک آدمی ایسا ملے جو گواہی کے قابل ہو۔

فَرَجُلٌ وَّامْرَأَتَان (تو پھر ایک مرد اور دو خواتین)

ایک مرد کے ساتھ دو خواتین کیوں؟ اللہ تعالیٰ نے خود ہی اس کی حکمت آگے بیان کی ہے۔ اس لیے وہاں پر تفصیل سے بات ہوگی۔

مِمَّنْ تَرْضَوْنَ (ان گواہوں میں سے جن پر تم باہم رضامندی کا اظہار کرتے ہو)

یہ اللہ تعالیٰ کے قول 'فَرَجُلٌ وَّامْرَاَتَان' کی صفت ہے۔ لفظ 'رضیٰ' کے دو مفہوم ہیں ایک یہ کہ گواہوں کا دین، تقویٰ اور عدل لوگوں میں مقبول ہو۔ اس کا اخلاق و عمل پسندیدہ ہو اور وہ ثقہ، معتبر اور امانت دار ہوں۔ دوسرے یہ کہ ان کی شہادت پر طرفین راضی ہوں۔ اگر مذکورہ صفات کے دو مرد میسر نہ آ سکیں تو اس کے لیے ایک مرد اور دو عورتوں کا انتخاب کیا جا سکتا ہے۔ اصل مسئلہ جنس نہیں اصل مسئلہ صفات ہیں جو مرد و زن میں برابر پائی جا سکتی ہیں۔

اَنْ تَضِلَّ اِحْدٰهُمَا فَتُذَكِّرَ اِحْدٰهُمَا الْاُخْرٰى (مبادا اگر ان میں سے ایک بھول جائے تو دوسری اسے یاد کرا دے)

جمہور قراء نے أن کو ہمزہ کی زبر کے ساتھ پڑھا ہے صرف اعمش اور ہمزہ نے زیر کے ساتھ اِن شرطیہ پڑھا ہے۔ مگر اس سے آیت کی معنی میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اس آیت میں سبب یعنی ضلال کو مسبب یعنی تذکیر کے مقام پر لایا گیا ہے۔ صاحب کشاف نے عربی کے ایک جملہ کے ساتھ اس کی وضاحت کی ہے وہ جملہ یہ ہے **أعددتُ السلاحَ أن يجئی علوٌّ فأدفعهٗ** 'میں نے ہتھیار تیار کر لیے مبادا دشمن حملہ کر دے اور مجھے اسے روکنا پڑے۔' تو صحیح ترجمہ یہ ہوگا 'تاکہ دوسری اسے یاد دلا دے مبادا وہ بھول جائے'۔

جمہور قاریوں نے تَضِلَّ پڑھا ہے جبکہ جحدری اور عیسیٰ بن عمران نے اسے مبنی بر مجہول تُضَلَّ پڑھا ہے یعنی تنسیٰ (بھلا دی جائے)۔ ابن فارس نے **مقاییس اللغة** میں ضَلّ کے بنیادی معنی لکھے ہیں کسی چیز کا کھو دینا۔ امام راغب اصفہانی **المفردات** میں کہتے ہیں سیدھے راستے سے ہٹنے کا نام ضلال ہے خواہ یہ قصداً ہو یا سہواً، تھوڑا ہو یا بہت۔ چنانچہ اس کا اطلاق بھول چوک پر بھی ہوتا ہے۔ نسیان یا سہو کی وجہ سے بھی انسان حقیقت سے ہٹ جاتا ہے جیسے چلنے والا سیدھے راستے سے بھٹک جاتا ہے۔ ابن اثیر نے بھی **النہایة** میں ضلال کے معنی نسیان ہی بتائے ہیں۔ امام طبری کے مطابق اس تفسیر کی تائید قتادہ، سدی، ضحاک اور ابن زید نے کی ہے۔ **تفسیر المنار** میں سعد بن جبر کا نام بھی دیا گیا ہے۔

Marfat.com

بہرکیف خواہ اس کے بنیادی معنی کھو دینا ہو یا راہ راست سے بھٹک جانا دونوں کا مفہوم ایک ہی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آیت زیر نظر میں خود ہی بتا دیا ہے کہ خواتین کی مشروط تعداد کی حکمت کیا ہے؟ ارشاد ہے کہ یہ ہدایت اس ارادے سے جاری کی گئی ہے کہ ایک خاتون اگر بھول جائے تو دوسری اسے یاد کرا دے۔ اس آیت میں جو بات فرمائی گئی ہے وہ بطور علت نہیں بلکہ بطور حکمت ہے۔ شہادت میں ایک خاتون کا بولنا اور دوسری کا یاد کرانا عقلی طور پر ہمیشہ ضروری نہیں۔ لہٰذا اس ہدایت کو مذکور کی علت نہیں کہا جا سکتا کیونکہ علت کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ اس کے بغیر کبھی معلول کا وجود نہ پایا جائے، مگر بھولنا بھٹکنا جس طرح خاتون کی خاصیت ہے مرد کی بھی خاصیت ہے۔ اگر اس کو دو خواتین کی مشروط تعداد کی علت قرار دیا جائے تو پھر ایک مرد کی شہادت بھی جائز نہ ہوگی۔ اس میں خواتین کو خاص حالات کی بناء پر خاص رعایت دی گئی ہے جو مردوں کو نہیں دی گئی۔ دو مرد گواہوں کے بیانات میں اختلاف کی موجودگی میں جج ان کی شہادت کو معتبر نہیں سمجھتا جبکہ دو خواتین کے بیانات میں اختلافات کے باوجود جج ان کی شہادت کو معتبر سمجھے گا۔

ایک مرد کے ساتھ دو خواتین کیوں؟

سیدھی سادی اور واضح توجیہ کو چھوڑ کر ایک معاشرتی مفروضے کی بناء پر موشگافیاں کی گئیں ہیں اور اس آیت کو خاتون پر مرد کی فضیلت ثابت کرنے کے لیے پیش کیا جاتا ہے اور لفظ ضلال (نسیان) کو ایک مرد کے ساتھ دو خواتین کی علت قرار دے کر اس کے اسباب ڈھونڈنا شروع کر دیے جاتے ہیں۔ چنانچہ امام رازی نے عورت کے مزاج میں برودت اور رطوبت کو بھول چوک کا سبب سمجھ کر فرمایا: مرد کے مقابلے میں خاتون کا حافظہ کمزور ہوتا ہے۔ تفسیر المنار میں اس نقطۂ نظر کی تردید کرتے ہوئے مفتی محمد عبدہ کا قول نقل کیا گیا ہے کہ یہ بات علمی تحقیق سے ثابت نہیں۔ صحیح سبب یہ ہے کہ خواتین کو مالی معاملات کا تجربہ نہیں ہوتا اس لیے بھول کا احتمال ہوتا ہے۔ اس کے برعکس گھر گرہستی کے معاملات میں خاتون کا حافظہ مرد سے تیز ہوتا ہے۔ یہ انسان کی فطرت ہے کہ جن کاموں سے اسے واسطہ پڑتا ہے یا جن میں وہ دلچسپی لیتا ہے ان میں اس کا حافظہ تیز ہوتا ہے۔ بعض مفسرین نے یہ کہا ہے کہ اس زمانے میں لوگ خاتون کو ضعیف سمجھتے ہوئے اکیلی خاتون کی شہادت کا اعتبار نہیں کرتے تھے۔ اس بات کا امکان موجود ہے کیونکہ اس زمانے میں تو خاتون کی کوئی حیثیت نہ تھی اس کو تو شہادت کے قابل ہی نہیں سمجھا جاتا تھا لیکن یہ ایک سماجی مفروضہ تھا جس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں۔ سفیان بن عیینہ اور ابو عمرو بن علاء جیسے فضلاء نے یہ ثابت کرنے کے لیے کہ خاتون مرد سے آدھی ہے اس آیت مبارکہ کی انوکھی تفسیر کی جو تفسیر کم اور تحریف زیادہ ہے۔ انھوں نے فَتُذَكِّرَ اِحْدٰىهُمَا الْاُخْرٰى میں تُذَكِّرَ کو تُذْكِرَ (باب افعال)

Marfat.com

پڑھا اور تفسیر یہ کی۔ 'تا کہ جب ان میں سے ایک بھول جائے تو دوسری اسے مذکر بنا دے'۔ یعنی دوسری اس کے ساتھ مل کر اس گواہی کو مرد کے برابر کر دے گی۔

ع 'ببین تفاوت راہ است از کجا تا بہ کجا'۔ خدا بھلا کرے ان مفسرین کا جنھوں نے اسے باطل قرار دیا اور اس کے ابطال کے لیے دو اہم دلائل دیے۔ ایک سبب تو لغوی ہے کہ اِذ کار متعدی استعمال نہیں ہوتا۔ عربی زبان میں یہ تو کہہ سکتے ہیں۔ 'اَذکَرتْ اِمرأۃٌ' (خاتون نے نر بچہ جنا) اس خاتون کو مُذکِر (نر بچہ جننے والی) کہیں گے مگر یہ نہیں کہہ سکتے اَذکَرتُ اِمرأۃً میں نے خاتون کو مُذکّر بنا دیا۔ دوسرے اگر ضلال کے معنی نسیان ہوں گے تو اس کے مقابلہ میں تذکیر کے معنی یاد دلانے کے ہوں گے۔ آخر اس دور از کار تاویل کی کیا ضرورت ہے؟

ضلال کا اصل سبب یہ ہے کہ خواتین کو مالی معاملات کا یا تو بالکل تجربہ نہیں ہوتا یا کم تجربہ ہوتا ہے۔ جس کی وجہ سے گواہی کی تمام تفصیلات اور کوائف کے بارے میں وہ الجھاؤ کا شکار ہو جاتی ہیں۔ جب وہ کورٹ کچہری میں جج کے سامنے گواہی کے لیے پیش ہوتی ہیں تو وہ جج اور وکیل کی طرف سے جرح کے باعث گھبرا جاتی ہیں اور پریشان ہو جاتی ہیں۔ اس صورت میں دوسری خاتون موضوع کے بارے میں تمام کوائف یاد دلانے میں مددگار ثابت ہوتی ہے۔ جب ایک خاتون اس واقعہ سے بھٹک جائے جس کے بارے میں وہ گواہی دے رہی ہے تو دوسری اسے یاد دلا کر درست بات کی طرف لے آئے گی۔ مقصد صرف یہ ہے کہ ایک کے بیان میں کوئی سقم رہ جائے تو دوسری کے بیان سے اسی کمی کو پورا کر دیا جائے۔ یعنی ایک امکانی احتمال کی روک تھام مقصود ہے اور ایسا طریقہ اختیار کرنا مقصود ہے جس سے شہادت یقینی ہو جائے۔

قرآن نے زندگی کے تمام معاملات میں مرد کے ساتھ صحت مندانہ مقابلے کے لیے خواتین کو تمام مراعات عطا کی ہیں وہ تمام معاملات میں فریق بن سکتی ہے۔ ہاں منڈی اور تجارت کے معاملات جہاں مردوں کی اجارہ داری ہے ان کے ساتھ ایک مرد کے وجود کو ضروری سمجھا گیا۔ ایسے معاملات میں خاتون کی گواہی کو قبول کرنا ایک بہت بڑا اعزاز ہے۔ یہ سہولت قرض کے تمام معاملات میں دی گئی ہے، خواہ طرفین مرد ہوں یا خواتین یا دونوں۔ دو خواتین کی گواہی کسی فطری نقص کی وجہ سے نہیں بلکہ یہ سماجی ڈھانچے کا تقاضا تھا۔ تُضَلَّ مبنی بر مجہول قرأت اس خیال کی تائید کرتی ہے۔ یعنی وہ خود نہیں بھولتی بلکہ اس کے حالات و مشاغل اسے بھلا دیتے ہیں۔ خواتین کو تجارت کی دنیا میں وہ مواقع حاصل نہیں جو مرد کو حاصل ہیں۔ ان معاملات میں خاتون کو حق شہادت ملنا ایک بہت بڑی سہولت ہے جس کی وجہ سے خواتین

Marfat.com

کو پدرشاہی ماحول میں قیمتی معلومات کی سنجیدگیوں کا سامنا کرنے کا حوصلہ ملتا ہے۔ دورِ حاضر میں جبکہ خواتین مالی اور اقتصادی معاملات میں تعلیم بھی حاصل کر رہی ہیں اور عملی طور پر حصہ بھی لے رہی ہیں۔ آج بھی اگر اکیلی خاتون کو کسی عدالت کے کٹہرے میں کھڑا کر دیا جائے جہاں گرد و پیش مرد ہی مرد ہوں تو وہ گھبرا جائے گی۔ اگر اس کے ساتھ دوسری خاتون ہو تو اس کا حوصلہ بڑھ جائے گا۔ اگر گواہی دیتے وقت کوئی الجھن ہوگی تو ساتھ والی خاتون بات صاف یا پوری کر دے گی۔ ایک مصلحت یہ بھی ہو سکتی ہے کہ عدالت میں اگر جج تنہا ہے تو اس کے پاس کسی اجنبی خاتون کا اکیلے جانا جائز نہیں خواہ وہ شہادت ہی کے لیے ہو، جب ایک خاتون کے ساتھ دوسری خاتون ہوگی تو اس کا تنہا جج کے پاس جانے کا جواز پیدا ہوگا۔

کیا اکیلی خاتون گواہی دے سکتی ہے؟

شہادت کی ادائیگی کے لیے وہی مکلف ہے جو اس کا اہل ہو۔ مسلمان مردوں کی طرح مسلمان عورتیں بھی شہادت کی اہلیت رکھتی ہیں اس لیے وہ بھی شہادت کے لیے مکلف ہیں۔ قرآن حکیم میں شہادت کے احکام آٹھ مختلف مقامات پر وارد ہوئے ہیں۔ ان میں سے سات مقامات پر کوئی فرق روا نہیں رکھا گیا صرف قرض کے معاملہ میں یہ فرق نظر آتا ہے۔ وصیت، طلاق، زنا، تہمت اور لعان کے معاملات میں گواہی کا اس طور پر ذکر ہوا ہے کہ مرد و زن میں کوئی امتیاز نہیں رہتا۔ وہ تعلیمات جن کا ماننا مسلمان مرد و زن پر یکساں فرض ہے مثلاً نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ ان کے بارے میں قرآن حکیم نے جہاں جہاں مومن مردوں کو مخاطب کیا ہے ان میں بر سبیل تغلیب مومن عورتیں بھی شامل ہیں۔ شہادت کے بارے میں آیات کے الفاظ، تراکیب اور متن سب اس قسم کے ہیں کہ ان کے مفہوم سے خواتین کو الگ نہیں کیا جا سکتا۔ درج ذیل نکات غور طلب ہیں:

1۔ سب سے پہلے زیر نظر آیت (البقرۃ ۲:۲۸۲) ہی کو لیجیے۔ قرآن نے یہ بالکل نہیں کہا کہ دونوں کی شہادت مردوں کی مانند یکے بعد دیگرے لی جائے تاکہ دو خواتین کی شہادت ایک مرد کی شہادت کے برابر ہو جائے۔ کہا یہ گیا ہے کہ اگر ان میں سے گواہی دینے والی گھبراہٹ کی وجہ سے اُلجھ جائے تو اس کے ساتھ کھڑی دوسری خاتون اس کو یاد دلا دے۔ یعنی اگر یہ صورت پیش نہ آئے تو اکیلی کی شہادت کافی ہوگی۔ دورِ حاضر کے معروف قانون دان جن کو قرآن و سنت پر دسترس حاصل تھی وہ بھی اس نقطۂ نظر کی تائید کرتے ہیں۔ میری مراد بیرسٹر خالد اسحاق مرحوم سے ہے۔ جمہور مفسرین کی بھی یہی رائے ہے۔ محلّی ابن حزم میں ہے کہ امیر معاویہ سے صحیح روایت ہے کہ انھوں نے تنہا اُم سلمہ ہی کی شہادت پر ایک گھر کے بارے میں فیصلہ کر دیا۔

Marfat.com

2۔ فَاسْتَشْهِدُوا عَلَيْهِنَّ أَرْبَعَةً مِّنكُمْ (النساء ۴:۱۵) پس ان کے خلاف (جو فحش کام کریں) اپنے میں سے چار گواہ بنالو۔

3۔ لَوْلَا جَاءُوا عَلَيْهِ بِأَرْبَعَةِ شُهَدَاءَ (النور ۲۴:۱۳) وہ واقعہ افک کے بارے میں چار گواہ کیوں نہ لائے۔ ان ہر دو آیات میں شہداء مردوں کے لیے مخصوص نہیں، خواتین بھی اس میں شامل ہیں۔ ان آیات سے یہ ثابت کرنا کہ زنا کے بارے میں خواتین کی شہادت درست نہیں، کسی طرح بھی قابل اعتبار نہیں۔ اس کے برعکس وائل بن حجر سے سنن ابی داؤد، سنن نسائی اور مسند احمد میں روایت کی گئی ہے کہ ایک عورت منہ اندھیرے صبح کی نماز کے لیے مسجد کی طرف نکلی۔ راستے میں ایک شخص نے اسے پکڑ کر اس کی عصمت دری کر دی اور بھاگ گیا۔ خاتون نے شور مچایا، پاس سے گزرنے والا ایک شخص شور سن کر اس آدمی کے پیچھے بھاگا۔ اتنے میں شور سن کو کچھ اور لوگ بھی جمع ہو گئے خاتون نے ان سے فریاد کی، وہ بھی پیچھے دوڑے۔ مجرم تو نکل گیا مگر لوگوں نے اس شخص کو جالیا جو خود اس خاتون کی مدد کے لیے بھاگا تھا۔ اس نے کہا میں تو فریاد سن کر مجرم کے پیچھے بھاگا۔ جس شخص نے زیادتی کی وہ بچ نکلا ہے۔ کسی نے اس کی نہ سنی اور اسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لے آئے۔ خاتون نے عرض کی یہی وہ شخص ہے جس نے میرے ساتھ بد کاری کی ہے۔ اس شخص نے حضورؐ کے سامنے اصل واقعہ بیان کیا۔ خاتون کہنے لگی یہ جھوٹ بولتا ہے۔ آپؐ نے حکم دیا کہ اسے لے جا کر سنگسار کرو۔ یہ سن کر اصل مجرم اُٹھ کر کہنے لگا، اسے مت سنگسار کرو، مجھے سنگسار کرو، اصل مجرم میں ہوں۔ آپؐ نے اقبال جرم کرنے والے سے کہا: تجھے اللہ نے معاف کیا اور دوسرے کی تحسین فرمائی۔ 'قصاص کے بارے میں صحیح بخاری میں حضرت انس بن مالک کی مرفوع روایت ہے' کہ ایک لڑکی زیور پہنے نکلی اس کو ایک یہودی نے پتھر مار کر زخمی کر دیا اور اس کے زیور اتار لیے۔ ابھی اس میں کچھ جان باقی تھی لوگ اسے اُٹھا کر نبی کریم ﷺ کے پاس لے آئے۔ آپ نے پوچھا تجھے فلاں آدمی نے زخمی کیا ہے؟ اس نے سر کے اشارے سے انکار کیا۔ آپؐ نے پھر پوچھا تجھے فلاں آدمی نے زخمی کیا ہے؟ اس نے پھر سر کے اشارے سے انکار کیا۔ تیسری مرتبہ آپؐ نے پوچھا تجھے فلاں آدمی نے زخمی کیا ہے تو اس نے سر کی جنبش سے ہاں کا اشارہ کیا۔ جس پر اس قاتل یہودی کو لایا گیا اور اسے بھی اسی طرح قتل کر دیا گیا۔ ان دو روایات میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اکیلی خاتون کی شہادت پر جرمانہ کرنے کا حکم دیا اور قصاص کا فیصلہ فرمایا۔ حضرت عثمانؓ بن عفان کی شہادت کی تنہا گواہ ان کی بیوی نائلہ تھیں ان کی گواہی کی بناء پر اُم

Marfat.com

المومنین عائشہ صدیقہؓ اور طلحہؓ، زبیرؓ جیسے جلیل القدر صحابیوں جن کا شمار عشرہ مبشرہ میں ہوتا تھا، نے قصاص کا مطالبہ کیا۔ حیرت کی بات ہے کہ ایک خاتون جج بن جائے تو اس کا فیصلہ تسلیم کیا جاتا ہے مگر اس کی گواہی کو قبول نہیں کیا جاتا۔

4۔ سورۃ نساء کی آیت نمبر ۱۳۶ اور سورۃ مائدۃ کی آیت نمبر ۸ میں شُهَدَاءَ لِلّٰهِ اور شہداء بالقسط میں مرد و زن دونوں لفظ شہداء میں شامل ہیں۔ یہاں بھی خطاب مومنوں سے ہے جس میں بر سبیل تغلیب مومنات بھی شامل ہیں۔

5۔ سورۃ نور کی آیت ۶ تا 9 میں لعان کا ذکر ہے۔ وہ لوگ جو اپنی بیویوں پر تہمت لگاتے ہیں تو میاں بیوی چار دفعہ حلفیہ شہادت دیں گے اور پانچویں مرتبہ کہیں گے کہ اگر میں جھوٹ بولوں تو مجھ پر اللہ کی لعنت۔ اس معاملہ میں جو وزن مرد کی شہادت کو دیا گیا ہے وہی وزن خاتون کی چار مرتبہ شہادت کو دیا گیا ہے۔ دونوں کی شہادت میں ذرہ برابر بھی فرق نہیں۔

6۔ سورۃ مائدۃ کی آیت نمبر ۱۰۶ میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: 'يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا شَهَادَةُ بَيْنِكُمْ إِذَا حَضَرَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ حِينَ الْوَصِيَّةِ اثْنَانِ ذَوَا عَدْلٍ مِّنكُمْ'۔ 'اے ایمان والو! جب تم میں سے کوئی مرنے لگے تو وصیت کے وقت اپنے میں سے دو عادل گواہ بنا لیا کرو'۔ خطاب مرد و زن اہل ایمان سے ہے دو عادل گواہوں میں مرد اور خواتین دونوں شامل ہیں کیونکہ عادل ہونا صرف مرد کی خاصیت نہیں۔

7۔ سورۃ طلاق کی آیت نمبر ۲ میں حق تعالیٰ کا ارشاد ہے: 'فَإِذَا بَلَغْنَ أَجَلَهُنَّ فَأَمْسِكُوهُنَّ بِمَعْرُوفٍ أَوْ فَارِقُوهُنَّ بِمَعْرُوفٍ وَأَشْهِدُوا ذَوَيْ عَدْلٍ مِّنكُمْ'۔ 'جب ان مطلقہ عورتوں کی عدت پوری ہو جائے تو یا تو دستور کے مطابق انھیں روک لو یا دستور کے مطابق ان سے جدا ہو جاؤ اور اپنے میں دو عادل گواہ بنا لیا کرو'۔ اس آیت میں خطاب نبی کریم ﷺ سے ہے اس کا اطلاق مومن مردوں اور خواتین سب پر ہوتا ہے چنانچہ دو عادل گواہوں میں مرد و زن دونوں شامل ہیں۔

امام ابن حزمؒ اندلسی نے المحلی کی نویں جلد میں کتاب الشہادات کے عنوان کے تحت ایسے تمام اقوال و آثار کو جمع کر دیا ہے جو خواتین کی گواہی سے متعلق ہیں۔ مصنف عبدالرزاق اور مصنف ابن ابی شیبہ میں اس قسم کے اقوال و آثار بکثرت موجود ہیں۔

روایت حدیث سے زیادہ کوئی چیز اہم نہیں۔ کیونکہ قرآن کے بعد یہ دین کا دوسرا بڑا ماخذ ہے۔ محدثین نے بڑے بڑے علماء کو غیر ثقہ، غیر ثبت اور مدلس قرار دیا ہے اور بے شمار خواتین کو ثقہ اور ثبت کے

Marfat.com

خطابات سے نوازا ہے اور تنہا خاتون کی روایت کو قبول کیا ہے۔ کسی روایت پر کسی محدث نے یہ اعتراض نہیں کیا کہ ہم اکیلی خاتون کی روایت کو قبول نہیں کرتے۔ وہ اپنے ساتھ دوسری خاتون کو لائے کیونکہ اس کی گواہی مرد کی گواہی سے آدھی ہے۔ اُم المومنین عائشہ صدیقہؓ کے مرتبہ ومقام سے کون انکار کرسکتا ہے؟ نبی کریم ﷺ کا قول ہے: 'خذوا شطر دینکم من ھذہ الحمیراء'۔ 'اپنے دین کا آدھا حصہ اس حمیراء (سرخ رنگ کی وجہ سے حضرت عائشہ کا لقب) سے حاصل کرو'۔ بڑے بڑے صحابہ کرام فرائض (وارثوں کے حصے) کے مسائل انھی سے پوچھا کرتے تھے۔ جن روایات میں سیدہ عائشہؓ نے مرد راویوں کی تصحیح فرمائی ہے، ان کے بارے میں مستقل کتابیں لکھی جا چکی ہیں۔ حدیث کی کتابیں خواتین کی روایات سے بھری پڑی ہیں۔ عبدالحی کتانی نے اپنی کتاب نظام الحکومۃ النبویۃ میں خواتین کی روایت کے بارے میں بحث کرتے ہوئے ابواسحاق اسفرائینی کا قول نقل کیا ہے کہ اگر مرد اور خاتون کی روایت میں تعارض ہو تو خاتون کی روایت کو ترجیح دی جائے گی۔ وہ لکھتے ہیں کہ عراقی اور زرکشی کی بھی یہی رائے ہے البتہ علامہ 'سبکی' کی رائے اس کے برعکس ہے۔ جس طرح ایک ہی مرتبہ کلمہ شہادت پڑھنے سے مرد مسلمان ہو جاتا ہے، اسی طرح ایک مرتبہ کلمہ شہادت پڑھنے سے خاتون مسلمان ہو جاتی ہے۔ مسلمان کی شہادت تو ایک طرف رہی سورۃ یوسف میں جہاں قمیص کے آگے یا پیچھے سے پھٹنے کا ذکر ہے اللہ تعالیٰ نے واقعاتی شہادت کو بھی شرف قبولیت بخشا ہے۔

آیت کا صحیح مفہوم

امام ابن قیم نے اعلام الموقعین میں زیر نظر آیت کی تفسیر ان الفاظ میں کی ہے' اس آیت کا تعلق گواہی کی اس بھاری ذمہ داری سے ہے جس کے ذریعہ سے ایک مالدار اپنے حقوق کی حفاظت کرتا ہے۔ عدالت کے فیصلہ سے اس کا کسی قسم کا کوئی تعلق نہیں۔ دونوں صورتیں ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ آیت میں مسلمانوں کو انفرادی طور پر مخاطب کیا گیا ہے۔ اس میں قانونی اداروں سے خطاب نہیں۔ یہ ایک طرح کی معاشرتی ہدایت ہے جس کا قانون سے کوئی تعلق نہیں۔ پھر اس آیت کا تعلق دستاویزی شہادت سے ہے، واقعاتی شہادت کو اس پر قیاس کرنا درست معلوم نہیں ہوتا۔ دستاویز لکھتے وقت گواہ بنانا ہمارے اختیار میں ہوتا ہے جبکہ زنا، قتل، چوری اور ڈکیتی جیسے واقعات میں گواہوں کا اختیار ہمارے پاس نہیں ہوتا۔ وہی لوگ گواہ کی حیثیت سے پیش ہوتے ہیں جو موجود ہوں، خواہ مرد ہوں یا خواتین، خواہ ان کی تعداد کچھ بھی ہو۔ یہ کہنا تو درست ہے کہ دستاویز لکھتے وقت دو بالغ مردوں یا ایک مرد اور خواتین کی گواہی لی جائے مگر یہ کہنا ہرگز درست نہیں کہ قتل کا مقدمہ اتنے بالغ مردوں اور خواتین کی گواہی سے

Marfat.com

ثابت ہوگا۔ اگر عدالت مطمئن ہو تو موقع پر موجود بچے، بوڑھے اور مرد و زن کی شہادت کے مطابق فیصلہ ہوگا۔ اگر ایک خاتون اپنی گواہی سے عدالت کو مطمئن کر دیتی ہے تو اس کی گواہی کو محض اس لیے رد نہیں کیا جاسکتا کہ وہ ایک خاتون ہے اور اس کے ساتھ کوئی اور خاتون یا مرد گواہی کے لیے موجود نہیں۔ اس کے برعکس اگر مرد عدالت کو مطمئن نہ کرے تو ان کی گواہی کو رد کر دیا جائے گا خواہ ان کی تعداد دس یا بیس ہو۔ اور اگر عدالت مطمئن ہو تو وہ محض قرائن اور واقعاتی شہادت کی روشنی میں بھی فیصلہ کر سکتی ہے۔ جیسا کہ سورۃ یوسف میں قمیص کے آگے یا پیچھے سے پھٹنے کی روشنی میں فیصلہ کیا گیا۔ دونوں حالتوں میں فرق اس قدر واضح ہے کہ ایک کو دوسری پر قیاس نہیں کیا جاسکتا۔ پاکستان میں کتاب و سنت کے بارے میں تحقیقی کام کرنے والے ریسرچ سکالر جناب جاوید احمد غامدی اپنی کتاب 'میزان' میں فرماتے ہیں کہ اس کا کسی واقعہ کی گواہی سے کوئی تعلق نہیں اس کا تعلق سند کی توثیق سے ہے۔ 'آیت مبارکہ کا یہ مقصد ہرگز نہیں کہ عدالت میں مقدمہ صرف اسی صورت میں ثابت ہوگا جب ایک مرد اور دو خواتین کو بطور گواہ پیش کیا جائے' آیت مذکورہ میں تمام لوگوں کو ایک طرح کی تجویز دی گئی ہے اور اس پر عمل کرنے کا مشورہ دیا گیا ہے تاکہ بعد میں جھگڑا نہ اُٹھ کھڑا ہو، اس میں ان کی اپنی بہتری ہے۔ اگر آیہ مبارکہ کا یہ مفہوم ذہن میں رکھا جائے تو با آسانی نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ وہ بنیاد کس قدر کمزور ہے جس پر بھروسا کر کے خاتون کی شہادت کے بارے میں رائے قائم کی جاتی ہے۔

خاتون کی شہادت کیس بارے میں فقہا کا اختلاف

اس اختلاف کی تفصیل ابوحیان نے اپنی تفسیر البحر المحیط میں مذکورہ آیت کی تفسیر کے ضمن میں دی ہے۔ ابن رشد نے بھی بدایۃ المجتہد میں مختلف فقہاء کی آراء کا خلاصہ بیان کیا ہے۔ کم و بیش سب فقہا نے مذکورہ آیت کے حکم کو دائمی سمجھ کر تمام معاملات میں فارمولا یہی رکھا ہے ایک مرد اور دو خواتین۔ امام ابوحنیفہ کے نزدیک حدود و قصاص کے سوا سب معاملات میں خاتون کی گواہی جائز ہے۔ عطاء بن ابی رباح، امام ابن حزم اور امام جعفر صادق نے اس سے اختلاف کرتے ہوئے قصاص اور حدود میں بھی خاتون کی شہادت کو جائز قرار دیا ہے۔ امام شافعیؒ کا قول ہے کہ تمام مالی اُمور، قتل خطا اور مال کی وصیت کے سوا خاتون کی شہادت جائز نہیں۔ امام احمد بن حنبل کا مسلک بھی یہی ہے۔ امام مالکؒ کا قول ہے کہ خواتین کی گواہی، حدود، قصاص، نکاح اور طلاق میں جائز نہیں۔ فقہا کا البتہ اس بات پر اتفاق ہے کہ اکیلی عورت ولادت، رضاعت، بکارت (دوشیزگی) استہلال (بچے کے رونے) کے معاملات میں گواہی دے سکتی ہے۔ اختلاف سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ یہ ایک اجتہادی مسئلہ ہے اور فقہاء کے قول کے

Marfat.com

متعلق یہ احتمال ہوسکتا ہے کہ وہ درست یا نادرست ہو۔ انھوں نے اپنے زمانے کے سماجی ڈھانچے میں خاتون کی حیثیت کو پیش نظر رکھتے ہوئے اپنی رائے قائم کی۔ ان کے نزدیک بھی یہ مسئلہ ایسا مسئلہ نہیں جس میں وقت کے تقاضوں کے پیشِ نظر تبدیلی ناممکن ہو۔ اختلاف کا ایک سبب تو یہ ہے کہ اس سوسائٹی میں اسلامی تعلیمات سے قطع نظر یہ بات ذہنوں میں رچ بس گئی تھی کہ خاتون مرد سے ہیٹی ہے۔ اس کی ذہنی صلاحیتیں مرد کے مقابلہ میں ہیچ ہیں۔ تفاسیر کا مطالعہ کرنے سے پتا چلتا ہے کہ اس تصور کی وجہ سے انھوں نے ان آیات کی مضحکہ خیز تفسیر کی ہے جن میں خواتین کا ذکر ہے۔ جن فقہا نے مالی اُمور کے علاوہ کسی معاملہ میں عورت کو گواہی کے قابل نہیں سمجھا ان کے ذہن میں بھی یہی تصور بیٹھا ہوا ہے۔ دوسرا بڑا سبب یہ ہے کہ قرض اور لعان کی آیات کے سوا شہادت کے بارے میں باقی آیات میں مذکر کے صیغے استعمال ہوئے ہیں جن کی بناء پر دعویٰ کیا گیا کہ ان معاملات میں صرف مردوں کی گواہی جائز ہے۔ حالانکہ ان آیات میں حصر اور تخصیص کے کوئی حروف نہیں جو خاتون کی شہادت کی نفی کرتے ہوں۔ قرآن حکیم میں بے شمار ایسی آیات ہیں جن میں مفردات اور افعال مذکر استعمال ہوئے ہیں جیسے نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ کی آیات۔ علماء دین کا اس پر اجماع ہے کہ ان آیات میں خواتین بھی شامل ہیں۔ شہادت والی آیات میں بھی مومن مرد و زن دونوں شامل ہیں اور فریضہ شہادت کے دونوں مکلف ہیں، بشرطیکہ اس کے اہل ہوں۔ خاتون کی اہلیت مرد کی اہلیت سے آدھی نہیں بالکل اس کے برابر ہے۔ اگر خاتون اہل ہوگی اور مرد نااہل، تو مرد سے گواہی نہیں لی جائیگی۔ امام ابن تیمیہ کا موقف درست ترین ہے۔ وہ شہادت کے سلسلہ میں کسی نصاب کے قائل نہیں۔ ان کے نزدیک اصل بات توجہ کا اطمینان ہے خواہ وہ مرد کی گواہی سے ہو یا خاتون کی گواہی سے یا واقعاتی شہادت سے (فتاویٰ ابن تیمیہ: جلد ۱۵ ص ۳۰۷)۔

اس وقت اس بات کی ضرورت ہے کہ اس مسئلہ پر اجتہاد کیا جائے اور یہ دیکھا جائے کہ اس فریضہ کو ادا کرنے کی صلاحیت صنفی طور پر مردوں اور خواتین دونوں کے اندر ہے یا صرف مردوں کے اندر۔ اگر دونوں کے اندر پائی جاتی ہے تو پھر ایک مرد کے مقابلہ میں دو خواتین کو رکھنے کی کیا مصلحت ہے؟ یا یہ حکمت و مصلحت خاص زمان و مکان کے کسی مخصوص معاشرے سے تعلق رکھتی ہے یا ہر زمان و مکان میں ہر معاشرے کے لیے عام اور ابدی ہے؟ اگر اجتہاد کے بغیر قانونِ شہادت جوں کا توں نافذ کردیا جائے گا تو اس کا حشر وہی ہوگا جو جنرل ضیاء الحق کے دور میں بننے والے قانون شہادت کا ہوا۔ جس کے نتیجہ میں ایک مجرم تو بچ نکلتا ہے مگر خاتون کو پس زندان ڈال دیا جاتا ہے خواہ اس کے ساتھ زنا بالجبر ہی ہوا ہو، محض اس لیے کہ وہ چار مرد گواہ نہیں پیش کرسکتی۔ اجتہاد ریسرچ کا تقاضا کرتا ہے اور ریسرچ محنت طلب کام ہے

Marfat.com

اس کی بجائے نعرے لگانا بہت آسان ہے اسی لیے ہم اپنی کوتاہی اور کم کوشی کے باعث اسلامی قوانین کو تضحیک کا نشانہ بنوا رہے ہیں۔

خواتین بھی اللہ کے سامنے اسی طرح جوابدہ ہیں جس طرح مرد۔ معاشرے میں ان کے خلاف ہونے والی زیادتیوں کے تدارک کے لیے گواہی کا وہی حق ان کو ہے جو مردوں کو ہے۔ وگرنہ عدل و انصاف کے تقاضے پورے نہیں ہو سکتے۔ بعض ایسے خفیہ جرائم ہیں جو صرف خواتین کی موجودگی میں سرزد ہوتے ہیں وہاں کوئی مرد موجود نہیں ہوتا۔ اگر خواتین کو ان جرائم میں گواہی دینے سے محروم کر دیا جائے تو مجرم عناصر کی حوصلہ افزائی ہوگی اور اللہ کی حدود بھی قائم نہیں رہ سکیں گی۔ قرآن کی کسی آیت، کسی مرفوع حدیث اور اجماع سے۔ حدود میں خواتین کی شہادت کی عدم قبولیت ثابت نہیں ہوتی تو پھر خواتین کو حدود میں شہادت سے محروم رکھنا قرین انصاف نہیں۔

ملکہ بلقیس

ایک اور اہم مقام جہاں قرآن نے اِمرأة کو خاتون کے معنی میں استعمال کیا ہے۔ سورة النمل میں موجود ہے کہ اس میں ایک خاتون کی حکمرانی کا ذکر واضح طور پر موجود ہے۔ سورة النمل کی آیت نمبر ۲۳ سے لے کر آیت نمبر ۴۴ تک اسی خاتون کا ذکر ہے۔ اس خاتون کا مرتبہ و مقام کیا تھا؟ وہ کس پائے کی حکمران اور مدبر تھی؟ قبولیت حق کے لیے فطری طور پر وہ کس قدر آمادہ تھی؟ اس کی جھلک ان بائیس آیات میں صاف نظر آ رہی ہے۔

آیت نمبر ۲۳ یوں ہے۔ 'میں نے ایک خاتون کو پایا ہے جو ان پر حکمرانی کرتی ہے۔ اسے ہر چیز عطا کی گئی ہے اور اس کا عرش عظیم الشان ہے'۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کی فوج میں پرندوں کی فورس بھی تھی وہ اپنی فورس پر کڑی نظر رکھتے تھے۔ ایک دن ہدہد کو اپنی فورس میں نہ پا کر ناراضگی کا اظہار کیا اور فرمایا! یا تو وہ اپنی غیر حاضری کا واضح سبب بیان کرے وگرنہ میں اسے سخت سزا دوں گا اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ میں اسے ذبح کر دوں۔ اب ہدہد کہتا ہے کہ میں ملک سبا سے ایک پکی خبر لے کر آیا ہوں۔ وہ خبر کیا ہے آیہ مبارکہ میں اسی کا ذکر ہے۔ سبا یمن کا ایک شہر تھا جو دارالحکومت صنعاء سے ۵۰ میل کے فاصلہ پر شمال مشرق میں واقع ہے۔ اس کا زمانہ عروج ۱۱۰ ق م سے شروع ہوا۔ ۱۱۵ ق م میں یمن کی دوسری مشہور قوم حمیر نے اس کی جگہ لے لی۔ یہاں تجارت پیشہ قوم آباد تھی۔ مآرب کے مشہور بند کے بننے کی وجہ سے یہاں خوشحالی کا دور دورہ تھا۔ جس خاتون کو ہدہد نے دیکھا اس کا نام مفسرین اور مؤرخین نے متفقہ طور بلقیس بتایا ہے۔ صاحب کشاف کہتے ہیں کہ اس کے باپ کا نام شراحیل تھا جو پورے یمن کا بادشاہ تھا۔ بلقیس کے

Marfat.com

علاوہ اس کی کوئی اولاد نہ تھی چنانچہ وہی اس کے بعد حکمران بنی۔ اس وقت وہی ملک سبا پر حکومت کرتی تھی۔ اس کے پاس اللہ کا دیا سب کچھ تھا۔ اس سب کچھ میں مال و دولت، جاہ و جلال، علوم وفنون اور تہذیب وتمدن سب شامل ہے یعنی ملک کی رفاہیت، ترقی اور عظمت سے متعلق جو چیزیں ضروری ہیں وہ سب اس کو حاصل تھیں۔ اس آیت سے پہلے حضرت سلیمان ؑ نے یہی الفاظ اُوتینا مِنْ کل شئی (ہمارے پاس اللہ کا دیا سب کچھ ہے) اپنے متعلق استعمال کیے ہیں۔ مگر ان کے قول میں نبوت اور حکمت بھی شامل ہے۔ جبکہ بلقیس کے بارے میں اس قول میں دنیوی ساز وسامان شامل ہے۔ پھر ہدہد نے بتایا کہ اس میں ایک عیب ہے کہ وہ اور اس کی قوم اللہ کی بجائے سورج کے سامنے سربسجود ہوتے ہیں اور اللہ تو بہت ہی عظمت والے عرش کا مالک ہے۔ جبکہ بلقیس اپنے عظیم الشان عرش کی دائمی مالک نہیں، نہ جانے کل کو یہ عرش کس کے پاس چلا جائے۔ حضرت سلیمان ؑ نے ہدہد کے قول کی سچائی کو جانچنے کے لیے فرمایا کہ میری یہ تحریر لے جاؤ۔ ان تک پہنچاؤ اور دیکھو کہ وہ اس کا کیا جواب دیتی ہے؟ اب دیکھیے خط پا کر ملکہ بلقیس کیا کرتی ہے؟ وہ اپنے اہل حل وعقد کو جمع کر کے ان سے مخاطب ہوتی ہے کہ ایک باوقعت تحریر مجھ تک پہنچائی گئی ہے۔ تحریر کو باوقعت یا تو اس کے مضمون کی بناء پر کہا یا بھیجنے والے کی قدر ومنزلت کو سامنے رکھتے ہوئے کہا۔ یہ بات واضح ہے کہ بلقیس نے شروع ہی سے اس تحریر کو احترام کی نظر سے دیکھا۔ حالانکہ وہ نہیں جانتی تھی کہ یہ کہاں سے آئی ہے؟ لفظ کریم سے پتہ چلتا ہے کہ وہ خط کا مضمون دیکھ کر بھیجنے والے کو حق پر سمجھتی تھی۔ خط اللہ کے نام سے شروع کیا گیا اس سے پتہ چلتا تھا کہ بھیجنے والے کی غرض وغایت ممالک کی فتوحات نہیں، بلکہ دین توحید کی اشاعت تھی۔

تدبر قرآن میں ہے کہ 'ملکہ نے اس خط کا ذکر ایک معزز خط کی حیثیت سے کیا۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ صاحب خط کی عزت اس کے اور اس کے درباریوں کے دلوں میں پہلے سے موجود تھی۔ اس کے شواہد تورات اور تالمود میں بھی موجود ہیں'۔ اس نے ان الفاظ سے تمہید باندھی، پھر اہل رائے سے مشورہ طلب کیا۔ وہ درباریوں کو پہلے خط کا مضمون بتاتی ہے کہ وہ سلیمان کی طرف سے ہے اور اس کے اوپر رحمان ورحیم کا نام ہے۔ اس میں پیغام یہ ہے کہ میرے مقابلہ میں غلبے اور بلندی کا اظہار نہ کرو اور اسلام قبول کرتے ہوئے میرے پاس آجاؤ۔ اب بلقیس درباریوں سے کہتی ہے اے اہل دربار! تم مجھے اس بارے میں رائے دو اور میں کسی بات کا قطعی فیصلہ نہیں کرتی جب تک تم میرے پاس موجود نہ ہو۔ یہ ایک دانشمند حکمران کا کام ہے جس کے سامنے رعایا کی مصلحت ہو اور وہ کوئی کام صلاح مشورے کے بغیر سرانجام نہ دے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس کا انداز حکمرانی جمہوری تھا۔ اس ضمن میں قاضی ابن العربی، احکام

Marfat.com

القرآن میں کہتے ہیں۔ اس آیت میں باہمی مشاورت کی دلیل موجود ہے اور کہا جاتا ہے کہ سب سے پہلے بلقیس نے اس کی طرح ڈالی۔ اہل دربار نے جواب دیا: ہم تو طاقتور لوگ ہیں اور سخت جنگوں کے خوگر ہیں، حکم تو آپ کا چلے گا، دیکھ لیں آپ ہمیں کیا حکم دینا چاہتیں ہیں؟ یعنی ہماری رائے وہی ہوگی جو آپ کی رائے ہے، ہم آپ کے فرمانبردار ہیں، مطلب یہ ہے کہ ہم تو جنگجو لوگ ہیں اہل رائے نہیں، رائے اور حکم تو آپ کا چلے گا۔ صاحب کشاف کا قول ہے 'گویا انھوں نے جنگ کا مشورہ دیا'۔ اب ملکہ بلقیس کا جواب ملاحظہ فرمایئے۔ اس نے جواب دیا' کہ بادشاہ جب کسی بستی میں داخل ہوتے ہیں تو اسے تباہ و برباد کردیتے ہیں۔ وہاں کے باعزت لوگوں کو ذلیل کردیتے ہیں اور وہ تو ایسا ہی کرتے ہیں'۔ جب اس نے اپنی قوم کے بڑوں کے سامنے معاملہ رکھا اور انھوں نے اپنی رائے دی تو بلقیس نے جنگ کے بارے میں ان کی رائے کو غلط قرار دیتے ہوئے اپنی رائے کا اظہار کیا، اور ان کے سامنے جنگ کی تباہ کاریوں کو بیان کیا۔ یہاں ملکہ سبا کی شخصیت پوری قوت کے ساتھ اُبھر کر سامنے آتی ہے وہ ایک دانا و بینا حکمران تھی، جس کے پاس اللہ کا دیا سب کچھ تھا۔ وہ مشورے کے بغیر کوئی کام سرانجام نہیں دیتی تھی۔ اہلِ دربار سب اس کے حکم کی بجا آوری کے لیے تیار تھے، اسے اپنی رعایا پر پورا اعتماد تھا، جو دلیر بہادر اور خوشحال تھی اور وطن کے دفاع کے لیے دشمن کا مقابلہ کرنے پر آمادہ، لیکن ان کی حکمران صاحب بصیرت تھی۔ ملک کو خواہ مخواہ جنگ کی آگ میں جھونکنا نہیں چاہتی تھی۔ اس کا دل نور الٰہی سے منور ہو چکا تھا اور اس نے بھانپ لیا تھا کہ سلیمان علیہ السلام عام بادشاہوں کی مانند صرف ممالک کو سرنگوں کرنے کا ارادہ نہیں رکھتے وہ تو ایک عقیدے کی خاطر لڑنا چاہتے ہیں، اس لیے ان کا مقابلہ کرنا اس کے بس میں نہیں۔ اس لیے اس نے اہل حل وعقد کے لیے جنگ کی تصویر کھینچی۔ 'کذالك یَفْعَلُوْنَ' یعنی 'وہ (بادشاہ) تو ایسا ہی کرتے ہیں'۔ اللہ نے اس کے قول کی تصدیق کردی۔ ابن ابی حاتم نے ابن عباس سے روایت کی ہے کہ یہ قول (بادشاہ تو ایسا ہی کرتے ہیں) اللہ تعالیٰ کا قول ہے اور بلقیس کے قول کی تصدیق ہے گویا اللہ تعالیٰ نے بھی بلقیس کی رائے پر مہر تصدیق ثبت کردی۔ اپنی رعایا کو مطمئن کرنے کے لیے اور حضرت سلیمان علیہ السلام کی صحت نبوت کو جانچنے کے لیے ان کے پاس تحفے تحائف بھیجے تاکہ دیکھے کہ قاصد کیا جواب لاتے ہیں۔ وہ دیکھنا چاہتی تھی کہ آیا حضرت سلیمان علیہ السلام دُنیوی بادشاہوں کی طرح تحفے تحائف قبول کرتے ہیں یا ان کو رد کردیتے ہیں۔ وہ تحفے تحائف کے ذریعہ، جو عام طور پر دلوں کو موم کردیتے ہیں، سے حضرت سلیمان علیہ السلام کی اصل غرض وغایت جاننا چاہتی تھی۔ جب حضرت سلیمان علیہ السلام نے یہ کہتے ہوئے ہدیے واپس کردیے کہ اللہ نے مجھے تم سے بہتر نعمتوں سے نوازا ہے اور یہ تحفے تمھارے لیے خوشی

Marfat.com

کا باعث ہوں گے، میرا ان سے کیا واسطہ ہے؟ تو بلقیس کو پتہ چل گیا کہ یہ عقیدے کا معاملہ ہے اور مال و دولت عقیدے سے پھیر نہیں سکتے۔ جب حضرت سلیمان علیہ السلام نے ہدیے واپس کر دیے اور دھمکی دی تو ملکہ بلقیس نے بنفس نفیس ان کی خدمت میں حاضر ہونا مناسب سمجھا۔

مولانا ابوالکلام آزاد ترجمان القرآن (۱۰۶:۳) میں لکھتے ہیں کہ وہ اپنے خدم و حشم کے ساتھ فلسطین کی طرف روانہ ہوئی۔ سبا سے بیت المقدس کا فاصلہ کم از کم ڈیڑھ ہزار میل ہے۔ جب وہ بیت المقدس سے ایک دن کے فاصلہ پر تھی تو حضرت سلیمان علیہ السلام نے معجزاتی طور پر اس کا تخت منگوا کر اس کی شکل میں تبدیلی کر دی۔ جب وہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے دربار میں پہنچی تو اس سے پہلا سوال کیا گیا کہ یہ تمھارا تخت ہے؟' اس نے جو جواب دیا سب مفسرین کی رائے کے مطابق اس کی ذہانت اور حاضر جوابی پر دلالت کرتا ہے۔ اس نے نہ ہاں میں جواب دیا نہ ناں میں۔ بلکہ اتنا ہی کہا لگتا تو وہی ہے۔ تخت کی شکل بدل کر اس کی عقل کا امتحان لیا گیا تھا۔ اس نے کوئی قطعی بات نہ کی اور دونوں احتمالات کو قائم رکھا۔ یہ جواب دے کر ملکہ بلقیس کہتی ہے کہ اس سے پہلے ہی ہمیں حقیقت کا علم عطا کر دیا گیا تھا۔ 'اُوتینا العلم من قبلها وکنا مسلمین'۔ 'ہمیں اس کا علم اس سے پہلے ہی عطا ہو چکا تھا اور ہم مسلمان ہو چکے تھے'۔ یہ بلقیس کے کلام کا تتمہ ہے اور معنی یہ ہیں کہ مجھے اللہ اور اس کی قدرت اور سلیمان علیہ السلام کی نبوت کا اس معجزے اور ذہنی آزمائش سے پہلے ہی باوقعت تحریر کے مضمون اور تحائف کی عدم قبولیت کے ذریعہ پتہ لگ گیا تھا اور اسلام قبول کرنے کی ٹھان لی تھی۔ پھر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اس نے بلقیس کو سورج کی پوجا سے اور گمراہی کے راستے سے ہٹا دیا۔ پہلے اس کا تعلق کافر قوم سے تھا۔

اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ اس نے دل سے اسلام قبول کر لیا تھا۔ لگتا یہ ہے کہ بلقیس کے استقبال کے بعد انھیں محل سے باہر کسی عمارت میں ٹھہرایا گیا تھا۔ پھر اسے محل کے اندر داخل ہونے کے لیے کہا گیا۔ اس محل کا فرش چمکدار شیشے کی سلوں سے بنا تھا۔ چنانچہ بلقیس نے اسے پانی سمجھ کر اپنی پنڈلیوں سے کپڑا اونچا کر لیا۔ اس پر مشفق و مہربان ہادی حضرت سلیمان علیہ السلام نے ناراضگی کا اظہار کرنے کی بجائے حقیقت بتا دی اور نو وارد نے کسی قسم کی خفت کا اظہار کیے بغیر صراحت کے ساتھ اپنی غلطی کا اعتراف کیا اور کہا 'میرے رب! میں نے اپنے آپ پر ظلم کیا ہے میں سلیمان علیہ السلام کے ساتھ اس اللہ کے سامنے سرخم کرتی ہوں جو سارے جہانوں کا پالنہار ہے'۔ محل میں لے جا کر بلقیس کو بتانا مقصود تھا کہ تمدنی دنیا کی آسائشیں صرف اسے ہی حاصل نہیں ہیں بلکہ حضرت سلیمان علیہ السلام کو وہ آسائشیں عطا کی گئی ہیں جن کا وہ تصور بھی نہیں کر سکتی۔ ذرا بلقیس کے الفاظ پر غور کیجیے۔ نورِ الٰہی نے اس کے سینے کو اس قدر منور کر دیا تھا کہ وہ اعلان کر رہی

Marfat.com

ہے کہ اسلام صرف اللہ رب العالمین کے لیے قبول کر رہی ہے نہ کہ سلیمان علیہ السلام کے لیے، وہ اسی اللہ کے سامنے جھک رہی ہے جس کے سامنے سلیمان علیہ السلام جھکتے ہیں۔ اسلام قبول کرنے کے بعد حضرت سلیمان علیہ السلام ملکہ سبا بلقیس کے باہمی تعلقات کا قرآن حکیم میں کوئی ذکر نہیں۔ کم و بیش تمام مفسرین مثلاً امام طبری، زمخشری، بغوی، امام رازی، ابن کثیر، امام شوکانی، ابو حیان، محمود آلوسی اور قاضی ثنا اللہ پانی نے لکھا ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے بلقیس سے شادی کر لی اور اسے یمن کے حکومت پر برقرار رکھا اور ان کے بطن سے ان کا ایک لڑکا پیدا ہوا۔ بلقیس کے جس لڑکے کا ذکر آثار و روایات میں آیا ہے یہ وہی ہے جس کا ذکر علامہ عبداللہ یوسف علی نے The book of the glory of Islam کے حوالہ سے اپنے ترجمہ قرآن میں کیا ہے۔ جس کا نام Menyelek-1 تھا اور جس نے اپنی ماں سے مل کر حبشہ Abyssinia کی حکومت کی بنیاد رکھی۔ اس سلسلہ میں مندرجہ ذیل آثار و روایات پیش کیے گئے ہیں۔ امام طبریؒ نے عکرمہ سے روایت کی ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے بلقیس سے شادی کر لی تھی۔

معالم التنزیل میں امام بغوی لکھتے ہیں کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے بلقیس سے شادی کر لی تھی اور اسے حکمرانی پر برقرار رکھا۔ امام قرطبی نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے کہ بعض روایات میں یہ آیا ہے کہ بلقیس جنت میں حضرت سلیمان علیہ السلام کی بیوی ہو گی۔ امام شوکانی، جو یمن کے رہنے والے تھے، نے فتح القدیر میں ابن ابی شیبہ، عبد بن حمید، ابن منذر اور ابن ابی حاتم کی طویل روایت نقل کی ہے۔ جس سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے ملکہ بلقیس سے شادی کر لی تھی اور اسے حکمرانی پر برقرار رکھا۔ محمود آلوسی نے روح المعانی میں امام بیہقی کی ایک روایت نقل کی ہے جو انھوں نے زہد کے باب میں امام اوزاعی سے نقل کی ہے کہ تدمر (Palmyra) کے برجوں میں سے ایک برج ٹوٹا تو اس میں سے ایک خوبصورت خاتون کا مجسمہ نکلا جس کے سر پر عمامہ تھا۔ عمامہ کے ایک سرے پر سنہری حروف میں لکھا تھا: بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ میں سبا کی ملکہ بلقیس اور سلیمان علیہ السلام کی بیوی ہوں جس نے کافرہ اور مومنہ کی حیثیت سے ایسی حکومت کی جو نہ مجھ سے پہلے کسی کو نصیب ہوئی نہ میرے بعد کسی کو نصیب ہو گی، مگر انجام میرا بھی موت ہے۔ حافظ ابن کثیر نے جو بیک وقت مفسر، محدث اور مؤرخ ہیں نے البدایہ والنہایۃ (البقرۃ ۲:۲۴) میں لکھا ہے کہ شادی والی روایت زیادہ مشہور اور واضح ہے۔ مولانا ابوالکلام زیر نظر آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں اس کے بعد (یعنی اسلام لانے کے بعد بلقیس اپنے ملک کو روانہ ہو گئیں اور حضرت سلیمان علیہ السلام کی زیر صدارت حکومت چلاتی رہیں)۔ قاضی ثناء اللہ پانی پتی نے تفسیر مظہری میں کَشَفَتْ عَنْ سَاقَيْهَا (اس نے اپنی پنڈلیوں سے کپڑا ہٹا دیا) کی تفسیر میں لکھا ہے کہ یہ حضرت

Marfat.com

سلیمان علیہ السلام اور بلقیس کی شادی کے بعد کا واقعہ ہے۔

تورات کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے بعد ملکہ اپنی مملکت کو واپس چلی گئیں۔ سلاطین آیت نمبر (۱۳:۱) میں لکھا ہے کہ 'پھر وہ اپنے ملازموں سمیت اپنی مملکت کو لوٹ گئیں'۔ مولانا امین حسن اصلاحیؒ فرماتے ہیں ہمارے نزدیک یہ بات بالکل قرین قیاس ہے اور قرآن میں کوئی چیز اس کے خلاف نہیں جاتی۔ وہ اپنی مملکت کی بلاشرکت غیر بادشاہ اور اپنی رعایا میں مقبول تھیں۔ دین وسیاست دونوں کے نقطۂ نظر سے یہی بات صحیح تھی کہ وہ اپنے ملک میں اپنی حکومت ان اصولوں کے مطابق چلائیں جو حضرت سلیمان علیہ السلام نے ان کو بتائے، تمام آثار وروایات اور مورخین کی آراء سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام سے ملکہ بلقیس کی شادی ہوئی اور انھوں نے انھیں حکومت پر برقرار رکھا۔

خاتون کی حکمرانی

قرآن حکیم نے جس انداز سے ملکہ سبا کا ذکر کیا ہے اس کے ایک ایک لفظ سے اس کی تعریف کا کوئی نہ کوئی پہلو نکلتا ہے۔ تحریر کے نفس مضمون کو دیکھ کر اسے باوقعت تحریر کہنا۔ یہ اندازہ لگانا کہ یہ کسی دنیوی بادشاہ کی تحریر نہیں، درباریوں سے مشورہ کرنا، ان کے سامنے جنگ کی تباہ کاریاں بیان کرنا۔ اللہ تعالیٰ کا اس کے بیان کی تصدیق کرنا، یہ کہنا کہ معجزے اور عقل ودانش کی آزمائش سے پہلے ہمیں سلیمان علیہ السلام کی نبوت کی محبت کا علم عطا کر دیا گیا تھا۔ پھر شرک کی مذمت کرتے ہوئے کھلے دل ودماغ کے ساتھ دائرہ اسلام میں داخل ہونا۔ یہ سب باتیں ملکہ سبا کو ایک دانشمند اور جمہوری حکمران کے روپ میں پیش کرتی ہیں جن میں بس ایک ہی نقص اور عیب تھا کہ وہ سورج کی پرستش کرتی تھی۔ اللہ نے اسے اس راستے سے ہٹا کر سیدھے راستے پر ڈال دیا اور اس کی شخصیت کو ایک مسلمان حاکم کی حیثیت سے کامل ومکمل کر دیا۔

خاتون کی حکمرانی کے بارے میں یہ آیات نص قطعی کا درجہ رکھتی ہیں۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ قدیم مفسرین مثلاً امام طبری، بیضاوی، نسفی، زمخشری اور امام رازی میں سے کسی نے ان آیات کے ضمن میں نہ خاتون کی حکمرانی کا مسئلہ چھیڑا ہے اور نہ ہی یہ دلیل دی ہے کہ ملکہ بلقیس چونکہ کافر تھی اس لیے اس کی مثال نہیں دی جاسکتی۔ میرے مطالعے کے مطابق سب سے پہلے قاضی ابوبکر ابن العربی نے احکام القرآن میں اس مسئلہ کو چھیڑا ہے اور کہا ہے کہ خاتون کی حکمرانی کے حق میں ملکہ سبا کی حکمرانی کی دلیل نہیں دی جاسکتی کیونکہ وہ کافر تھیں۔

مزے کی بات یہ ہے کہ قاضی ابوبکر (افتونی فی امری) کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ اس آیت میں اس بات کی دلیل ہے کہ مشاورت کرنی چاہیے کیونکہ مشورہ کو حجت کا درجہ حاصل ہے۔ خواہ یہ مشورہ

Marfat.com

دوسری آراء سے استفادہ کے لیے ہو یا دوستوں کی دلجوئی کے لیے۔۔۔ اور کہا جاتا ہے ملکہ سبا نے مشاورت کی طرح ڈالی' کیا یہاں ملکہ سبا مومن ہوگئی ہے جو اس کے فعل کو حجت کے طور پر پیش کیا جا رہا ہے؟ احکام القرآن میں قاضی ابوبکر ابن العربی نے خاتون کی امارت کے بارے میں سلطان اعظم عضد الدولہ کے سامنے بغداد میں قاضی ابوبکر بن الطیب المالکی الاشعری اور شیخ الشافعیہ ابوالفرج بن طراز کے درمیان ایک مناظرے کا ذکر کیا ہے۔ ابوالفرج ابن طراز نے امام ابن جریر طبری کے قول کہ خاتون قاضی بن سکتی ہے کی تائید کی اور کہا کہ خاتون کا حاکم ہونا جائز ہے، کیونکہ احکام کی غرض وغایت یہ ہوتی ہے کہ قاضی ان کو نافذ کرے اور اس بارے تنازعات کا فیصلہ کرے۔ یہ کام خاتون بھی اس طرح کر سکتی ہے جس طرح مرد۔ اس پر قاضی ابوبکر نے ان کے کلام پر اعتراض کیا اور ان کے کلام کی مخالفت میں امانت کبریٰ کی دلیل دی کہ اس کا مقصد سرحدوں کی حفاظت انتظام سلطنت، وطن کی حفاظت اور خراج کی وصولی اور مستحقین میں ان کی تقسیم ہے اور خاتون یہ کام نہیں کر سکتی (ان کا خیال تھا کہ اس زمانے میں خاتون یہ کام نہیں کر سکتی اور شاید کبھی نہ کر سکے) ابوالفرج نے کہا مرد کی طرح خاتون بھی یہ کام کر سکتی ہے۔ پھر ابوالفرج نے یہ دلیل پیش کی کہ شریعت کا اصول ہے کہ جب تک کسی معاملہ کی ممانعت نہ ہو وہ جائز تصور ہوتا ہے۔ اس پر قاضی ابوبکر ابن الطیب نے کہا۔ ہم اس اصول کو تسلیم نہیں کرتے۔ اس مناظرے میں قاضی ابوبکر ابن العربی کا میلان خاتون کی حکمرانی کے خلاف ہے۔ اس مناظرے سے کم از کم یہ تو پتہ چلتا ہے کہ پانچویں چھٹی صدی ہجری میں یہ مسئلہ متفقہ نہیں تھا بلکہ متنازعہ تھا۔ جس زمانے میں یہ مسئلہ چھڑا، اسی زمانے میں حضرت ابوبکرہ کی روایت کو شہرت ملی اور اسے نصِ قرآنی پر حاکم قرار دیا گیا۔ کیونکہ یہ روایت قرآنی آیت (اوتیت من کل شئی) 'اُس کے پاس اللہ کا دیا سب کچھ ہے' سے ٹکراتی تھی تو دلیل یہ دی گئی کہ بلقیس ایک کافر ملکہ تھی اس لیے اس کا فعل حجت نہیں۔ اوپر میں نے ثابت کیا ہے کہ ملکہ سبا مسلمان ہو کر بھی حکومت کرتی رہی۔ بعد میں آنے والے مفسرین قاضی ابوبکر ابن العربی کی کھینچی ہوئی لکیر کے فقیر رہے۔ سورۃ النمل کی آیات نے قرطبی ابوحیان، آلوسی کے پائے کے مفسرین کو سخت اُلجھن میں ڈال دیا۔ ان مفسرین نے ان آیات کے مقابلہ میں حضرت ابوبکرہ کی روایت کو پیش کیا اور جوش مخالفت میں یہ بھی یاد نہ رہا کہ حدیث کے راوی کون ہیں؟ البحر المحیط (۷:۶۳) روح المعانی (۱۰:۱۸۸) اور الجامع لاحکام القرآن (۱۲:۱۸۳) میں اس حدیث کو ابن عباس کی طرف منسوب کیا گیا ہے۔ اتنے بڑے مفسرین اور اتنی بڑی غلطی! معلوم ہوتا ہے کہ یہ حدیث بغیر کسی تحقیق کے عام لوگوں میں مشہور ہو چکی تھی یہی وجہ ہے کہ سخاوی (متوفی ۹۰۲ھ) نے المقاصد الحسنۃ

Marfat.com

میں اور عجلونی (متوفی ۱۱۶۲ء) نے کشف الغطاء میں اس حدیث کا ذکر کیا ہے۔ ان کتابوں میں صرف وہ احادیث ہیں جو یونہی عام لوگوں کی نوک زبان پر تھیں۔ اس حدیث کی تحقیق، مَیں نے اپنے کتابچہ بعنوان 'عورت کی حکمرانی اور حضرت ابوبکرہ کی روایت کے تحقیقی مطالعہ' میں کی ہے اس کتابچہ کو مکتبہ دانشوراں، اُردو بازار لاہور نے شائع کیا ہے۔ اس کا لب لباب یہ ہے۔

۱۔ مذکورہ حدیث کے پہلے راوی حضرت ابوبکرہ ہیں جن پر حضرت عمر فاروقؓ نے قذف کی حد لگائی تھی۔ انھوں نے حدِ قذف کرنے کے بعد ابوبکرہ سے توبہ کا مطالبہ کیا مگر انھوں نے انکار کر دیا۔ نصِ قرآنی کے مطابق ان کی شہادت قابل قبول نہیں۔

۲۔ حدیث کے دوسرے راوی حسن بصری ہیں جو ناقدین حدیث کی متفقہ رائے میں مدلّس ہیں۔ ان کا سماع حضرت ابوبکرہ سے مشکوک ہے۔ ان کی اس روایت میں عنعنہ، (اخبرنا اور حدثنا کی بجائے عــــن کا استعمال) ہے۔ عصر حاضر کے عظیم محدث ناصر الدین البانی نے ان کی ہر اس روایت کو رد کر دیا ہے جس میں عنعنہ ہو۔

۳۔ حدیث کے تیسرے راوی عوف بن ابی جمیلہ بصری قدری اور رافضی ہیں۔ امام ذھبی نے المغنی فی الضعفاء میں ان کا ذکر کیا ہے۔

۴۔ چوتھے راوی عثمانؒ بن الہیثم (شیعہ ہیں)، حافظ ابوجعفر عقیلی نے الضعفاء الکبیر اور امام ذھبی نے المغنی فی الضعفاء میں انھیں ضعیف قرار دیا ہے۔

۵۔ ترمذی اور نسائی کے سلسلہ سند کے ایک راوی حمید بن ابی حمید الطویل مدلس ہیں۔ حافظ عقیلی اور ابن عدی نے انھیں ضعیف گردانا ہے۔ حدیث کے متن میں واضح اضطراب ہے۔ مرنے والے بادشاہ کو کبھی کسریٰ کہا گیا ہے کبھی عجم کا کوئی اور بادشاہ اور کبھی یمن کے ذی یزن خاندان کا بادشاہ۔

مولانا اشرف علیؒ تھانوی نے موروثی اور جمہوری حکومت میں امتیاز کر کے خاتون کی حکمرانی کو جائز قرار دیا ہے (امداد الفتاوی جلد پنجم ص ۹۱)۔ اخوان المسلمین کے رہنما مصر کے معروف عالم شیخ محمد الغزالی نے اپنی کتاب السنۃ النبویۃ بین أهل الفقه و أهل الحدیث کے صفحہ ۵۵ پر امام ابن حزمؒ اندلسی کا یہ قول نقل کیا ہے۔ 'المرأۃ بین الفقه و القانون (ص ۳۹۰) میں ہے کہ 'خاتون صرف رئیس اعلیٰ (صدر) نہیں بن سکتی لیکن اس کی مطلق ذہانت سے انکار نہیں کیا جا سکتا'۔ فقہاء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ خاتون چھوٹے بچوں اور کم عقلوں کی وصی یا وکیل بن سکتی ہے۔ اسے مالی تصرف کا حق حاصل ہے اور زراعت کے معاملات چلانے کے لیے وکالت کا حق رکھتی ہے۔ وہ گواہ بھی بن سکتی ہے

Marfat.com

اور فقہاء کی نظر میں شہادت ولایت ہی تو ہے۔ امام ابو حنیفہ عورت کو قضا کا حق دیتے ہیں اور قضا بھی ایک قسم کی ولایت ہے۔

قابل تقلید مومن خواتین

ایک بہت ہی اہم مقام جہاں اللہ تعالیٰ نے مومن اور کافروں کو خواتین کی مثال دے کر کفر اور ایمان کا فرق سمجھایا ہے اور بتا دیا ہے کہ خاتون کے ذکر میں اُمت کا ذکر مقصود ہوتا ہے اور مومنوں کو فرعون کی بیوی اور مریم بنت عمران کی مثال کی تقلید کی ہدایت کر کے بتایا گیا ہے کہ روحانی عظمت اور بلندی میں جنس کی کوئی تخصیص نہیں بلکہ مرد و زن دونوں برابر ہیں۔ اس لیے ان دونوں کو مل جل کر پوری ہم آہنگی کے ساتھ کلمہ حق کی بلندی اور روحانی عظمت کے حصول کے لیے کام کرنا چاہیے۔ سورۃ تحریم کی آیت نمبر ۱۰ میں اللہ تعالیٰ نے کافروں کے لیے حضرت نوح علیہ السلام اور حضرت لوط علیہ السلام کی بیویوں کی مثال دی ہے کہ وہ ہمارے دو نیک بندوں کی بیویاں تھیں۔ اُنھوں نے ان سے خیانت کی۔ انبیاء کے ساتھ ان کا رشتہ اُنھیں اللہ کے یہاں کچھ فائدہ نہ پہنچا سکا اور ان سے کہا گیا کہ 'دوسرے داخل ہونے والوں کے ساتھ تم بھی جہنم میں داخل ہو جاؤ'۔ مفسرین کے قول کے مطابق ان دونوں بیویوں کی خیانت دین کے بارے میں تھی۔ حضرت نوح علیہ السلام کی بیوی کی خیانت یہ تھی کہ وہ انھیں مجنوں کہتی تھی اور حضرت لوط علیہ السلام کی بیوی کی خیانت یہ تھی کہ اس نے در پردہ لوگوں کو لوط علیہ السلام کے پاس مہمانوں کے آنے کی اطلاع دی۔ ضحاک کا قول ہے کہ وہ چغلی کھا کر خیانت کرتی تھیں۔ اس آیہ مبارکہ میں تین زریں اصول سامنے آتے ہیں۔

پہلا اُصول یہ ہے کہ انسان خواہ مرد ہو یا خاتون اس کی شخصیت مستقل ہے کسی کے تابع نہیں۔ اور ہر ایک پر انفرادی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ کوئی دوسرے کا بوجھ نہیں اُٹھا سکتا کیونکہ وہ اپنی ذات کے بارے میں جوابدہ ہے کسی نبی یا کسی مرد صالح کی بیوی ہونا انھیں اس ذمہ داری سے سبکدوش نہیں کر سکتا۔ کسی کی نیکی بدکار کو کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتی اور نہ ہی کسی کی برائی نیکوکار کو نقصان پہنچا سکتی ہے۔

دوسرا اُصول یہ ہے کہ ثواب و عذاب میں مرد اور خواتین سب برابر ہیں۔ ان میں سے ہر ایک اپنے کیے کا ذمہ دار ہے۔ یہ نہیں کہ مرد زیادہ جنت میں داخل ہوں گے اور خواتین کم۔

تیسرا اُصول یہ ہے کہ خواتین مردوں کے لیے اسی طرح قابل تقلید ہیں جس طرح مرد خواتین کے لیے۔

Marfat.com

مثال دینے کا مطلب ہوتا ہے، ایک عجیب وغریب صورت حال کو بیان کرنا تا کہ اس جیسی دوسری صورت حال کا پتہ چل جائے۔ اس مثال سے کافروں کے حال کا بھی پتہ چل گیا اور انجام کا بھی۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ وَضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلاً لِّلَّذِيْنَ آمَنُوا امْرَأَةَ فِرْعَوْنَ إِذْ قَالَتْ رَبِّ ابْنِ لِي عِندَكَ بَيْتاً فِي الْجَنَّةِ وَنَجِّنِي مِن فِرْعَوْنَ وَعَمَلِهِ وَنَجِّنِي مِنَ الْقَوْمِ الظَّالِمِينَ ٥ (التحریم ۶۶:۱۱) اللہ نے مثال بیان کی ان لوگوں کے لیے جو ایمان لائے۔ فرعون کی بیوی کی، جب اس نے کہا اے میرے رب! میرے لیے اپنے یہاں جنت میں ایک گھر بنادے اور مجھے فرعون اور اس کے عمل سے نجات دلا دے اور مجھے ظالم قوم (لوگوں) سے بچالے۔

اللہ تعالیٰ نے مومنوں کے لیے فرعون کی بیوی کی مثال پیش کی ہے۔ اس کا رشتہ ایک کافر کے ساتھ جڑا ہوا تھا۔ ایک ایسا کافر جو کفر اور الحاد، غرور و تکبر اور برائی کی علامت تھا جو اللہ کا سب سے بڑا دشمن اور دنیا کا سب سے طاقتور بادشاہ تھا۔ لیکن اس تعلق سے اس کی بیوی کے ایمان کو کوئی گزند نہ پہنچی فرعون کی بیوی کا نام آسیہ بنت مزاحم تھا۔ صاحب کشاف نے ایک قول نقل کیا ہے کہ وہ موسیٰ علیہ السلام کی چچی یا پھوپھی تھیں۔ امام طبری نے ایک روایت بیان کی ہے کہ موسیٰ علیہ السلام و فرعون کی آویزش میں اس نے لوگوں سے پوچھا کون کامیاب ہوا؟ تو اسے بتایا گیا موسیٰ علیہ السلام۔ تو اس نے کہا کہ میں موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کے رب پر ایمان لائی۔ لیکن قرآن حکیم میں اس بات کا اشارہ ملتا ہے کہ جب موسیٰ علیہ السلام کے تابوت کو دریا سے نکال کر ان کے پاس لایا گیا تو وہ کہنے لگی کہ اسے قتل مت کرو، ہوسکتا ہے وہ ہمارے لیے سودمند ہو۔ غالباً انھوں نے اسی جذبہ ایمانی کے تحت دودھ پیتے موسیٰ علیہ السلام کی جان بچائی۔ صاحب کشاف نے حضرت ابوہریرہؓ کی روایت پیش کی ہے کہ فرعون اپنی بیوی کو چار میخوں میں گاڑ کر اس کا منہ سورج کی طرف کروا دیتا اور انھیں پیٹھ کے بل لٹکا کر چکی کا بڑا پتھر ان کے سینہ پر رکھ دیتا۔ اسی حالت میں انھوں نے اللہ سے دعا کی، اللہ نے ان کی روح بدن سے نکال لی اور پتھر بے روح جسم پر پڑا رہا۔ کس قدر پُر اثر دعا تھی جو دل کی گہرائیوں سے نکل کر لبوں پر آئی۔ اس دعا میں ضمنی طور پر شہادت کی خواہش کا پہلو نکلتا ہے، ہوسکتا ہے کہ ان کی موت اسی طرح واقع ہوئی ہو جس کا ذکر ابو ہریرہ کی روایت میں موجود ہے۔ اگر روایت درست ہے تو پھر شہادت کی موت تھی۔ دعا یہ تھی: مجھے فرعون سے بھی نجات دلا اور اس کے عمل سے بھی۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ فرعون کی ذات بھی ان کے لیے عذاب تھی کہ وہ سراپا فساد تھا اور 'عملہ' میں فرعون کے جسمانی عذاب اور اپنی جدوجہد کی طرف اشارہ ہے۔ صاحب کشاف نے لکھا ہے اسے جنت الماوی میں مقام ملا اور یہ جنت عرش بریں سے قریب تر ہے۔ اس دعا میں یہ دلیل بھی

Marfat.com

ہے کہ مصیبت اور سختی کے وقت اللہ سے پناہ مانگنا اور اس کی جناب میں التجا کرنا صالحین کا شیوہ ہے۔

سید قطب شہیدؒ نے اپنی تفسیر فی ظلال القرآن میں موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کی آویزش میں اس خاتون کو ادیبانہ اور معجزانہ الفاظ میں خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں ' کہ لمبی چوڑی اور طاقتور مملکت میں وہ تنہا خاتون تھی جو ظلم وستم کے سامنے سینہ سپر رہی۔ خاتون تو زیادہ حساس ہوتی ہے اور اسے معاشرے کے دباؤ کا زیادہ شعور ہوتا ہے لیکن یہ خاتون تنہا تھی، اس پر سوسائٹی کا دباؤ بھی تھا اور بادشاہ اور اس کے حاشیہ برداروں کا بھی۔ فرعون اس زمانے کا طاقتور ترین بادشاہ تھا۔ اس کے محل میں ہر وہ چیز موجود تھی جس کی خواہش کی جاسکتی ہے وہ اکیلی خاتون اس ماحول میں شاہی چمک دمک سے منہ موڑ کر آسمان کی طرف سر اُٹھا کر دعا مانگتی ہے تو فرعون کی ذات جو سراپا شر تھی، سے اور اس کی سختیوں سے نجات کی درخواست قبول ہو جاتی ہے۔ کفر کے اس طوفان بدتمیزی میں وہ اکیلی خاتون تھیں جس نے سب عوامل، سب بندھنوں اور زندگی کے تمام لوازمات سے منہ موڑ کر صرف اللہ سے لو لگانے کی قابل تقلید مثال قائم کی۔ اسی لیے وہ اس کتاب حکیم کی تعریف، توصیف کی سزاوار ٹھہری۔ جس کے الفاظ رہتی دُنیا تک کائنات کے گوشے گوشے میں گونجتے رہیں گے۔' اس کتاب نے انھیں ایسا مقام عطا کیا کہ انھیں مریم بنت عمران کے شانہ بشانہ کھڑا کر دیا۔ وہ مریم جنھوں نے روز پیدائش سے ہی اللہ سے لو لگا لی تھی۔ اسی کتاب حکیم نے ان دونوں خواتین کو تمام مومن مردوں کے لیے ایک روشن مثال کے طور پر پیش کیا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَمَرْيَمَ ابْنَتَ عِمْرَانَ الَّتِي أَحْصَنَتْ فَرْجَهَا فَنَفَخْنَا فِيهِ مِن رُّوحِنَا وَصَدَّقَتْ بِكَلِمَاتِ رَبِّهَا وَكُتُبِهِ وَكَانَتْ مِنَ الْقَانِتِينَ ' (التحریم ۶۶:۱۲)۔ اور مثال دی مریم بنت عمران کی جس نے اپنی عصمت کی حفاظت کی اور ہم نے اس میں اپنی روح پھونکی اور اس نے اللہ کے کلمات اور اس کی کتابوں کی تصدیق کی اور وہ فرماں برداروں میں سے تھیں۔ اس آیت میں مومن کی مثال مریم بنت عمران سے دی گئی ہے جبکہ پہلی آیت میں فرعون کی بیوی سے۔ فرعون کی بیوی حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تربیت کرنے والی تھیں جبکہ مریم، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی۔ پہلی مثال میں اس مومن کے مرتبہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جس کا شیطان ابھی مسلمان نہیں ہوا تھا وہ اس مقابلے میں جدوجہد کرتا رہتا ہے۔ 'من فرعون و عمله' (فرعون اور اس کے عمل سے) میں اسی جدوجہد کی طرف اشارہ ہے۔ اس مومن کی خواہش ہے کہ جنت میں جائے۔ دوسری مثال مومن کے اس اعلیٰ مرتبہ و مقام کے لیے ہے جب وہ احصنت فرجھا (اپنی شرمگاہ کو قلعہ بند کر لیا) کا مصداق ہوتا ہے

Marfat.com

یعنی شیطان کسی جگہ سے اس پر حملہ آور نہیں ہو سکتا۔ وہ نفس مطمئنہ بن جاتا ہے اور اس میں اللہ کی رُوح پھونکی جاتی ہے کیونکہ اصل میں مومن کا ذکر مقصود تھا اس لیے فیھا کی بجائے نَفَخۡتُ فِيهِ کہا حالانکہ دوسری جگہ (الأنبیاء ۲۱:۹۱) اس موقع پر جہاں مریم کا ذکر مقصود تھا وہاں فیھا (مؤنث کی ضمیر) فرمایا۔ اس سے مومن مرد اور مومن خاتون کی تفریق مٹانا مقصود ہے۔

آیت کے آخر میں قانتین (یعنی فرمانبردار مرد) کا لفظ بڑا پر مغز ہے۔ قنوت (فرمانبرداری) کی صفت مردوں میں بھی پائی جاتی ہے اور خواتین میں بھی۔ اس میں مرد و زن دونوں شامل ہیں۔ یہاں یہ بتانا مقصود ہے کہ خواتین کی اطاعت مردوں کی اطاعت سے کسی طرح بھی کم نہیں۔ اسی لیے مریم کا شمار فرمانبردار مردوں میں کیا گیا۔ یہ جملہ قانتات (فرمانبردار خواتین) سے زیادہ بلیغ ہے۔ اسی حکمت کے تحت لوط علیہ السلام کی بیوی کے لیے کانت من الغابرین (العنکبوت ۲۹:۳۷) استعمال کیا گیا۔ یعنی اس کا شمار بھی پیچھے رہ جانے والے مردوں میں کیا گیا! اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ محترمہ کے لیے لتکون من المومنین (تاکہ وہ مومن مردوں میں سے ہو جائیں) یعنی ایجابی اور سلبی صفات میں مرد و زن دونوں برابر ہیں اور یہ بتانا بھی مقصود ہے کہ دونوں بلند ترین روحانی مقامات تک پہنچنے کی صلاحیت رکھتے ہیں اور لغوی لحاظ سے بھی دونوں اللہ کی نظر میں برابر ہیں۔

ایک اور آیت بھی اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتی ہے وہ یہ ہے 'وَجَعَلۡنَاهَا وَابۡنَهَا آيَةً لِّلۡعَالَمِينَ' (الأنبیاء ۲۱:۹۱)۔ 'ہم نے مریم اور ان کے بیٹے عیسیٰ علیہ السلام کو تمام لوگوں کے لیے ایک علامت بنا دیا'۔ یہ دونوں برائی کے سامنے سینہ سپر ہونے کی علامت تھے۔ یہ نہیں کہا آیتین بلکہ کہا آیۃ اس سے اگلی آیت ہے إِنَّ هَٰذِهِ أُمَّتُكُمۡ أُمَّةً وَاحِدَةً وَأَنَا رَبُّكُمۡ فَاعۡبُدُونِ (الأنبیاء ۲۱:۹۲) 'بے شک یہ تمھاری اُمت ایک اُمت ہے اور میں تمہارا رب ہوں پس میری عبادت کرو'۔ اگر یہاں اُمت کے معنی قوم لکھا جائے تو اُمت کا صحیح مفہوم ادا نہیں ہوتا۔ دین کے معنی لیے جا سکتے ہیں مگر یہ معنی بھی یہاں مفہوم ادا نہیں کرتے۔ اس لفظ کے استعمال سے ہماری توجہ ان لوگوں کی طرف دلائی گئی ہے جن کا مزاج مختلف ہو، جن کی نسل اور زبان مختلف ہو، جن کا زمانہ اور تاریخ مختلف ہو مگر وہ اپنے آپ کو ایک اخوت کے رشتہ میں ڈھال کر، سب مرد و زن مل جل کر حق کی سربلندی کے لیے کام کریں اور اس بھائی چارے کے خد و خال نمایاں کریں جس کو آخری شکل اسلام دے گا۔ اخوت کے اس رشتہ میں مرد و زن مل جل کر شانہ بشانہ بدی کو روکیں گے اور نیکی کا پرچار کریں گے اور یہی اُمت واحدہ کا صحیح مفہوم ہے۔

طبرانی نے سعد بن جنادہ سے روایت کی ہے کہ اِنَّ اللّٰہَ یُزَوِّجُنِی فِی الۡجَنَّۃِ مریم بنت

Marfat.com

عمران و امراۃ فرعون و اُخت موسٰی "بے شک اللہ جنت میں مریم بنت عمران، فرعون کی بیوی اور موسیٰ علیہ السلام کی بہن کو میرا ساتھی بنائے گا"۔ جنت میں بیوی کی حیثیت سے جنسی تعلق ایک گھناؤنا تصور ہے۔ یہاں تزویج سے وہی مراد ہے جو قرآن حکیم کی آیت "واذا النفوس زُوِّجت" (القیامہ ۷:۷۵) "نفوس کو آپس میں ملایا جائے گا" نیک، نیکوں کے ساتھ اور بد، بدوں کے ساتھ۔ ابن فارس نے مقاییس اللغہ میں بتایا ہے کہ زوج کے بنیادی معنی ایک چیز کو دوسری سے ملانا ہے۔ اس روایت کی رو سے نبی اکرم ﷺ کی نظر میں ان تینوں خواتین کا مرتبہ و مقام ظاہر ہوتا ہے۔ قرآن حکیم نے سب سے زیادہ ذکر موسیٰ علیہ السلام و فرعون کے قصہ کا کیا ہے۔ فرعون ظلم و استبداد کی علامت تھا اور موسیٰ علیہ السلام حق گوئی و بے باکی کی۔ اس معاشرے میں فرعون کے خلاف جو رول موسیٰ علیہ السلام کی والدہ، ان کی بہن اور فرعون کی قابل احترام زوجہ نے ادا کیا وہ کسی مرد سے بھی بن نہ آیا۔ باطل سے ٹکراؤ کے لیے انھوں نے اپنی جان داؤ پر لگا دی۔ عمدہ یہ مرتبہ بلند ملا جس کو مل گیا۔

مولانا امین احسن اصلاحی نے زیر نظر آیت کی تفسیر میں بڑی خوبصورت بات کہی ہے کہ پہلی مثال کا حوالہ کفار کی عام سبق آموزی کے لیے دیا گیا ہے اس غلط خیال کی تردید کے لیے کہ اللہ کے محبوبوں اور برگزیدوں کی اولاد میں سے کسی کو دوزخ کی آگ نہیں چھوئے گی۔ دوسری مثال اللہ نے مسلمانوں (مرد و زن) کی سبق آموزی کے لیے بیان فرمائی ہے کہ برے سے برے ماحول کے اندر بھی آدمی پر اپنے ایمان کی حفاظت واجب ہے۔ حضرت مریمؑ نے، جو پیدا تو برے ماحول میں ہوئیں مگر اپنی ذاتی توجہ، محنت اور عبادت سے وہ مقام اللہ کے ہاں حاصل کیا جو انھی کا خاص حصہ ہے۔

برائی کی مثال کے لیے بھی عورتوں کا انتخاب اور بھلائی کی مثال کے لیے بھی اُن کا انتخاب اس کا مقصد اس غلط فہمی کو دور کرنا ہے کہ برائی کا سرچشمہ عورت ہے۔ اپنی خلقت کے اعتبار سے عورت بھی خیر و شر دونوں صلاحیتوں کی حامل ہے۔ اگر وہ اپنے اختیار و ارادہ کا صحیح استعمال نہ کرے تو بہتر سے بہتر ساتھی کی بدترین رفیق بن سکتی ہے اور اگر ایمان کی حلاوت سے آشنا ہو جائے تو بدترین ماحول میں بھی وہ جنت کی حور ہے۔

عورت کی نبوت

آخر میں ان آیات کے ضمن میں ایسے موضوع کے بارے میں کچھ باتیں کرنے کو جی چاہتا ہے جن کو متقدمین نے بالکل نہیں چھیڑا، بلکہ حسب معمول متاخرین نے اس کا ذکر کیا ہے۔ وہ موضوع خاتون کی نبوت کے بارے میں ہے۔ محمود آلوسی روح المعانی میں ان آیات کی تفسیر کے تحت فرماتے ہیں "مریم کی

Marfat.com

نبوت کا گمان دوسری خواتین مثلاً ھاجرہ اور سارۃ کی نبوت کی مانند درست نہیں کیونکہ نبوت کے لیے مرد کا ہونا شرط ہے۔ مگر اشعری کی رائے اس شرط کے خلاف ہے۔ اس کے بارے میں علامہ ابن قاسم نے الآیات البینات میں بحث کی ہے۔ عجیب سی بحث ہے، اللہ بہتر جانتا ہے، ان کے قول سے یہ تو معلوم ہو گیا کہ اس وقت علما دین میں یہ مسئلہ متفقہ نہیں تھا۔

میں نے پہلے بھی سورۃ النمل کی آیت نمبر ۲۳ کے تحت ذکر کیا ہے کہ عورت کی حکمرانی کا مسئلہ بھی پانچویں، چھٹی صدی ہجری میں موضوع بحث بنا۔ تاریخی طور پر یہ زمانہ مسلمانوں کے انحطاط اور افتراق کا زمانہ تھا۔ اس زمانے میں یونانی، رومانی، ایرانی اور ہندی ثقافتوں کے زیرِ اثر ان کے افکار و خیالات اِسلام پر اثر انداز ہوئے اور دورِ اوّل کی اقدار بالخصوص معاشرتی اقدار مسخ ہو گئیں۔ خاتون کو قدر و منزلت جو قرآن نے عطا کی تھی، نظروں سے اوجھل ہو گئی اور یہ تصور لوگوں کے رگ و پے میں سرایت کر گیا کہ خاتون مرد سے گھٹیا ہوتی ہے۔ قرآنی آیات کی غلط تاویل کی گئی، جن آیات میں قرآن نے وہ حقوق عطا کیے تھے جو آج تک ان کو حاصل نہ تھے۔ انھی آیات کو اس کی تنقیص کے لیے پیش کیا گیا۔ احادیث وضع کی گئیں محض یہ ثابت کرنے کے لیے کہ مرد افضل ہے اور خاتون فروتر۔

نبوت کا مسئلہ بھی اسی دور کی پیداوار ہے۔ اس لحاظ سے کہ اس مسئلہ کو خاتون کی تحقیر کے لیے بطور ثبوت پیش کیا جانے لگا ہے۔ اس مسئلہ پر تفصیلی بحث لفظِ 'بشر' کے تحت ہو گی۔

قرآن حکیم میں ایسے بے شمار مقامات ہیں جہاں امرأۃ کا لفظ بیوی کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ حضرت نوح علیہ السلام کی بیوی کے لیے (النمل ۲۷:۵۷؛ التحریم ۶۶:۱۰)، حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بیوی کے لیے (ھود ۱۱:۷۱؛ الذاریات ۵۱:۲۹)، حضرت لوط علیہ السلام کی بیوی کے لیے (ھود ۱۱:۸۱؛ العنکبوت ۲۹:۳۲،۳۳؛ التحریم ۶۶:۱۱)، عزیز مصر کی بیوی کے لیے (الیوسف ۱۲:۲۱؛ الروم ۳۰:۵۱)، فرعون کی بیوی کے لیے (القصص ۲۸:۹؛ التحریم ۶۶:۱۱)، عمران کی بیوی کے لیے (آل عمران ۳:۳۵)، زکریا علیہ السلام کی بیوی کے لیے (آل عمران ۳:۴۰؛ العنکبوت ۲۹:۵،۸)، ابولہب کی بیوی کے لیے (المسند ۱۱۱:۴) یہی لفظ استعمال ہوا ہے۔ ان مقامات میں سے (آل عمران ۳:۳۵) اور (التحریم ۶۶:۱۱) کے مقاماتِ زیادہ اہم ہیں کیونکہ پہلے مقام میں عمران کی بیوی کی شخصیت اُبھر کر سامنے آتی ہے اور مرد و زن کی فضیلت کے بارے میں خالق کائنات نے بہت ہی بصیرت افروز جملہ ارشاد فرمایا ہے: لیس الذکر کالأنثی۔ اس مقام پر تفصیل سے بحث اُنثٰی کے مادہ کے تحت کی جائے گی۔ ان کے علاوہ ایک اہم مقام وہ ہے جس میں خاوند کی سرکشی اور ظلم کا ذکر ہے (النساء ۴:۱۲۸) لیکن اس سے پہلے

Marfat.com

(نساء ۴:۳۴) میں بیوی کی نافرمانی اور غرور کا ذکر ہے۔ اس لیے اس مسئلہ پر گفتگو دونوں آیات مبارکہ کو ملا کر کی جائے گی۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ’وَاللّٰتِیْ تَخَافُوْنَ نُشُوْزَهُنَّ فَعِظُوْهُنَّ وَاهْجُرُوْهُنَّ فِی الْمَضَاجِعِ وَاضْرِبُوْهُنَّ فَاِنْ اَطَعْنَكُمْ فَلَا تَبْغُوْا عَلَیْهِنَّ سَبِیْلًا اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِیًّا كَبِیْرًا‘ (نساء ۴:۳۴) ’وہ خواتین جن کی نافرمانی کا تمھیں خوف ہو، انھیں وعظ و نصیحت کرو، ان کی بستروں پر تنہا چھوڑ دو، ان کو مارو، پھر اگر وہ فرمانبرداری کریں تو ان کے خلاف (ایذا کے) راستے طلب نہ کرو۔ بے شک اللہ تعالیٰ بلند (قوی) اور بڑا ہے۔

دوسری آیت میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ’وَاِنِ امْرَاَةٌ خَافَتْ مِنْۢ بَعْلِهَا نُشُوْزًا اَوْ اِعْرَاضًا فَلَا جُنَاحَ عَلَیْهِمَاۤ اَنْ یُّصْلِحَا بَیْنَهُمَا صُلْحًا وَالصُّلْحُ خَیْرٌ وَاُحْضِرَتِ الْاَنْفُسُ الشُّحَّ وَاِنْ تُحْسِنُوْا وَتَتَّقُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِیْرًا‘ (نساء ۴:۱۲۸) ’اور اگر بیوی اپنے شوہر کی سرکشی کا خوف محسوس کرے یا اس کی بے رخی کا خوف محسوس کرے، تو ان دونوں پر کوئی گناہ نہیں اگر وہ آپس میں صلح کر لیں، اور صلح بہتر ہے اور نفوس میں تو حرص اور بخل موجود ہوتا ہے اور اگر تم احسان کرو اور تقویٰ اختیار کرو تو بے شک اللہ تعالیٰ جو کام تم کرتے ہو ان سے باخبر ہے‘۔

دونوں آیات مبارکہ میں لفظ خوف اور نشوز کا استعمال ہوا ہے۔ خوف سے مراد ان اسباب کے پیدا ہونے اور ان علامات کے ظاہر ہونے کی توقع ہے جو ناپسندیدہ ہوتی ہیں۔ کیونکہ خوف ان اسباب اور علامتوں میں ظاہر ہوتا ہے جو توقع خوف پر دلالت کرتی ہیں۔ یہاں یہ نہیں کہا گیا کہ جو خواتین نافرمانی کرتی ہیں۔ کہا یہ گیا ہے جن سے تمھیں نافرمانی کا خوف ہو۔ ان جذبات و احساسات کو جو ایک بیوی اپنے میاں کے بارے میں رکھتی ہے، خوف سے تعبیر کر کے ان اندیشہ ہائے دور و دراز کا اظہار کیا گیا ہے، جو وہ مستقبل کی ازدواجی زندگی کے بارے میں محسوس کرتی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ میاں کی یہ زیادتی اور بے اعتنائی بڑھتے بڑھتے ایک ایسی بیماری کی صورت اختیار کر جائے جس کی کوئی دوا نہ ہو، اور جس سے شادی کا بندھن ٹوٹ جائے اور اس کا اور اس کے بچوں کا مستقبل خطرے میں پڑ جائے۔ خوف کی تعبیر اس بات کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ دراصل یہ فعل صادر ہی نہیں ہونا چاہیے۔ کیونکہ یہ اس نظام فطرت کے خلاف ہے جو ہم آہنگی پر قائم ہے، اور زوجین کی معاشرت بھی اسی نظام کے مطابق چلتی ہے۔ اس تعبیر میں میاں بیوی کے لیے ایک طرح کی وارننگ ہے کہ تمہارا یہ فعل تمہارے اصل مرتبہ و مقام کے مطابق نہیں۔ دوسرے اس تعبیر میں یہ اشارہ بھی موجود ہے کہ اس نشوز اور نافرمانی کا وہم نہیں ہونا چاہیے بلکہ تعین ہونا

Marfat.com

چاہیے۔ اسی لیے بعض مفسرین نے خوف کی تفسیر علم سے کی ہے۔ دوسرا لفظ نشوز ہے۔ ابن فارس نے مقاییس اللغۃ میں اس کے بنیادی معنی اونچے اور بلند مقام کے بتائے ہیں پھر استعارۃً کہا جاتا ہے۔ نَشَزَتِ الْمَرْاَۃُ خاتون نے نافرمانی کی اور اسی طرح کہا جاتا ہے: نَشَزَ بَعْلُھا یعنی اس کے خاوند نے ظلم کیا اور مارا پیٹا۔ نشوز کے مجازی معنی برتری اور پابندی کے ہیں یعنی اپنے آپ کو برتر سمجھ کر پہلوتہی کرنا اور ایک کو دوسرے سے الگ رکھنا۔ اس کا اطلاق میاں بیوی دونوں پر ہوتا ہے۔ احساسِ برتری کے تحت وہ ایک کو دوسرے کے حقوق کا خیال نہیں رکھتے اور باہمی تعامل کے فطری تقاضوں کو بھول جاتے ہیں اس طرح وہ اونچی اور ابھری ہوئی زمین کی طرح ہو جاتے ہیں جو اپنی ہمواری کھو چکی ہوتی ہے۔ یہ نفسیاتی حالت کی حسّی تصویر ہے جو نافرمانی اور سرکشی کی شکل میں نمایاں ہوتی ہے۔ میاں بیوی اجتماعی فریضہ ادا کرتے ہیں، دونوں کے پیش نظر خاندان، سوسائٹی اور نوع انسانی کی بھلائی ہوتی ہے۔ دونوں کے کاندھوں پر خاندان کا، وطن کا اور انسانیت کا بوجھ ہوتا ہے۔ ان کے درمیان جب تناؤ پیدا ہو جاتا ہے تو اس کی روک تھام کے لیے قرآن حکیم نے حفاظتی اقدامات پیش کیے ہیں، تاکہ میاں بیوی کے درمیان محبت اور دوستی کی فضا قائم رہے۔ یہ مرد و زن کے درمیان کوئی معرکہ نہیں کہ جب خاتون نافرمانی کرے تو اس کا سر پھوڑ دیا جائے اور اگر مرد سرکشی کرے تو کچھ دے دِلا کر اس سے صلح کر لی جائے۔ اسلامی شریعت کا بنیادی اصول مرد و زن کے درمیان مساوات ہے۔ اگر میاں بیوی کے درمیان نفرت پیدا ہو جائے تو دونوں پر واجب ہے کہ وہ عدل اور دستور کے مطابق مسائل کا حل تلاش کریں اگر انھیں ڈر ہو کہ وہ اللہ کی قائم کی ہوئی حدود برقرار نہیں رکھ سکیں گے تو ان میں سے جو بھی دوسرے سے خلاصی چاہتا ہے۔ اس پر واجب ہے کہ وہ اُسے راضی کرے۔ اللہ نے جس طرح طلاق کا حق مرد کو دیا ہے اسی طرح فسخ نکاح کا حق خاتون کو دیا ہے۔

پہلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے مرد کو ہدایت کی ہے کہ اگر وہ بیوی میں نافرمانی کی علامتیں پائے تو وہ حکمت عملی اور نرمی سے کام لے۔ پہلا قدم وعظ و نصیحت ہے۔ یہ نافرمانی کی علامتوں کے ظہور کے بعد سب سے پہلا قدم ہے۔ سلیم الفطرت اور نیک دل خواتین کی اصلاح اسی قدم سے ہو جائے گی اور اگلا قدم اُٹھانے کی نوبت نہ آئے گی۔ ہوسکتا ہے کہ کسی کی محبت کا بھوت اس پر سوار ہو، جذبات نے عقل پر پردہ ڈالا ہو، یا مال اور حسن کا غرور ہو یا خاندانی برتری کا رعب ہو، جس کی وجہ سے خاتون بھول جائے کہ وہ شریک حیات ہے مدمقابل نہیں۔ یہاں دوسرے قدم کی ضرورت پڑے گی یعنی بستر میں تنہا چھوڑنا، بستر کشش و جاذبیت کا مقام ہوتا ہے، بیوی کا غرور عروج پر ہوتا ہے اگر مرد اس کشش کا سامنا کر کے اپنے آپ پر قابو پالے تو بیوی کا غرور ٹوٹ جاتا ہے۔ لیکن اس تنہائی کے بھی کچھ آداب ہیں۔ بچوں اور غیروں

Marfat.com

کے سامنے اس تنہائی یا دوری کا اظہار نہیں ہونا چاہیے، اس سے بیوی ذلت محسوس کرے گی اور اس کی نافرمانی میں اور بھی اضافہ ہوگا۔ مقصد تو بیماری کا علاج ہے بیوی کو ذلیل کرنا اور خاندان کو برباد کرنا نہیں۔ بعض اوقات یہ قدم بھی بارآور نہیں ہوتا تو کیا نکاح کی گرہ کھول دی جائے۔ شادی کا بندھن بہت بڑا بندھن ہوتا ہے اور اس قابل ہے کہ اس کی پاس داری کی جائے۔ شادی کا معاہدہ بڑا مضبوط معاہدہ (میثاق غلیظ) ہوتا ہے اور اس لائق ہے کہ اس کے ساتھ عمر بھر کے لیے پیمان وفا باندھا جائے۔ اب تیسرا قدم اُٹھایا جائے گا اور یہ صرف اسی وقت اُٹھایا جائے گا جب پہلے دو قدم ناکام ہو جائیں گے۔ یہاں مارنے کی اجازت ہے۔ یہ ایک احتیاطی تدبیر ہے کسی خاوند کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ چھوٹی چھوٹی غلطیوں پر بیوی کو پیٹتا رہے۔ اس آیت مبارکہ میں اخلاقی تدابیر کا تدریجی ذکر بھی اسی حقیقت کو واضح کرتا ہے۔ اس حق کو استعمال کرنے کی صرف ان موقعوں پر اجازت دی گئی ہے جہاں سب تدبیریں ناکام ہو جائیں اور جہاں بیوی اپنی فطرت سے بالکل منحرف ہو گئی ہو اور انحراف معمولی نوعیت کا نہ ہو پھر یہ مارنا اصلاح کے لیے ہو نہ کہ انتقام کے لیے۔ بالکل ایسے ہی جیسے ایک مربی سرزنش کرتا ہے جس میں محبت کا پہلو ہوتا ہے نہ کہ ذلت اور حقارت کا۔ اسی لیے شارع ﷺ نے اس کا تعین کر دیا ہے کہ کن حالات میں یہ قدم اُٹھایا جائے؟ کس نیت سے اُٹھایا جائے اور کس مقصد کے لیے اٹھایا جائے؟ یہ دین کا نام لے کر جلاد بننے کے لیے نہیں ہے۔ آپؐ نے فرمایا کہ منہ پر نہ مارا جائے، ضرب ہلکی ہو، اذیت رساں نہ ہو اور اپنے پیچھے نشان چھوڑنے والی نہ ہو۔ بلکہ بعض روایات میں مسواک سے مارنے کا ذکر ہے۔ قرآن حکیم میں سورۃ احزاب اور سورۃ تحریم میں نبی کریم ﷺ اور ان کی ازواج کے مابین اختلاف کا ذکر ہے۔ آپؐ نے ناراضگی کا اظہار کیا لیکن کبھی اپنی بیویوں پر ہاتھ نہیں اُٹھایا۔

دوسری آیت میں اس سرکشی اور پہلوتہی کا ذکر ہے جو شوہر کی جانب سے ہوتی ہے جب وہ اپنی بیوی کے سامنے اونچی اور بلند زمین کی طرح سر اٹھا کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ اپنے آپ کو بلند و برتر سمجھ کر بیوی کی طرف اس نگاہ سے نہیں دیکھتا جس نگاہ سے ایک ساتھی ساتھی کی طرف دیکھتا ہے۔ علامات و آثار کو دیکھ کر بیوی کو اپنے مستقبل کے بارے میں فکر لاحق ہو جاتی ہے۔ ہوسکتا ہے کہ یہ علامات بڑھتے بڑھتے جدائی اور طلاق کی صورت اختیار کر لیں۔ اللہ تعالیٰ نے ایسی صورت کے واقع ہونے سے پہلے بیوی کے لیے ایسی اصلاحی تدابیر تجویز کی ہیں جن کو اختیار کر کے شادی کا بندھن بچ سکتا ہے۔

سیاق وسباق

اس آیت مبارکہ کا تعلق تعدد ازدواج کے مسئلہ سے معلوم ہوتا ہے۔ اس سے پہلے والی آیت تعدد

Marfat.com

ازدواج کے سلسلہ میں ان یتیم عورتوں سے نکاح کا ذکر ہے جن کا ذکر سورت کے شروع میں ہوا ہے اس کے بعد والی آیت میں اس بات کا ذکر ہے کہ تم بیویوں کے درمیان عدل نہیں کر سکتے۔ یہی وجہ ہے کہ آیت کے شان نزول کے بارے میں سب روایات میں دوسری شادی کا ذکر ہے۔ ابن عباس نے روایت کی ہے کہ یہ آیت ام المومنین سوداء رضی اللہ عنہا کے بارے میں ہے جنہوں نے طلاق کے خوف سے اپنی باری حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو دے دی تھی۔

مرد کی سرکشی اور پہلوتہی کا سب سے بڑا سبب یہ ہوتا ہے کہ وہ پہلی بیوی سے پہلوتہی کرتے ہوئے دوسری شادی کرنا چاہتا ہے اس لئے پہلی بیوی سے نفرت کرنے لگتا ہے اور بدسلوکی کرتا ہے۔ لغت کے بہت بڑے ماہر الفراء نے معانی القرآن میں کہا ہے کہ مرد کا نشوز یہ ہے کہ وہ دوسری سے شادی کرنا چاہے اور اس سے شادی کر کے پہلی سے بالکل بے رغبتی اختیار کرے۔ اس کا نشوز کسی معقول سبب کے باعث بھی ہو سکتا ہے اور بغیر سبب کے محض جنسی لذت پرستی کی وجہ سے بھی ہو سکتا ہے۔ ہو سکتا ہے اس کی بیوی سن رسیدہ ہو اور اس کی اولاد بھی نہ ہو یا وہ مسلسل بیمار ہو اور اس کی شفایابی کی امید نہ ہو۔ **لا جناح علیھما** (ان دونوں پر کوئی گناہ نہیں) میں اس مشکل کا علاج تجویز کیا گیا ہے کہ اس صورت میں میاں بیوی مل جل کر اصلاح احوال کی کوشش کریں اور اپنے مال اور جذباتی حقوق سے دستبردار ہو کر ایک دوسرے کے مطالبات کو پورا کریں۔ اس جملے میں یہ اشارہ بھی ہے کہ اپنے حقوق کے تنازل میں دونوں بالخصوص بیوی جو تنگی محسوس کرے گی اللہ اسے دور کر دے گا۔

ان یصلح بینھما صلحا (وہ آپس میں مصالحت کریں) یعنی دونوں مل جل کر اس مشکل سے نکلنے کی کوشش کریں۔ اصلاح احوال کی غرض سے مرد بیوی کو یقین دہانی کرائے کہ اس کو کوئی نقصان نہیں ہوگا اور وہ پہلے سے بڑھ کر اس کے معاشرتی حقوق کی حفاظت کرے گا اور عدل و انصاف سے کام لے گا۔ اور بیوی اسے کہہ دے کہ وہ اپنے اور بچوں کے مستقبل کی خاطر اپنے جذبات کی قربانی دینے کے لیے تیار ہے۔ اس طرح نکاح کی گرہ ٹوٹنے سے بچ جائے گی۔ شریعت الٰہی زمینی حقائق کو نظر انداز نہیں کرتی۔ ایک بڑے ضرر سے بچنے کیلئے جذبات کی قربانی دینی پڑے گی۔ اس بات کو قرآن نے **سورۃ بقرۃ** (۲۲۹:۲) میں **فلا جناح علیھما فیما افتدت بہ** "پس ان کے لیے اس میں کوئی گناہ نہیں جو عورت فدیہ میں دے" میں بیان کیا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ عورت کا موقف مرد کو موم کر لے اور وہ دوسری شادی سے رک جائے اور اگر اس نے دوسری شادی کر لی ہو تو وہ پہلی بیوی کو معلق نہ کرے اور اس کی حق تلفی سے باز رہے۔

Marfat.com

'والصلح خیر' صلح جدائی سے بہتر ہے کیونکہ شادی کا بندھن ایک مضبوط بندھن ہوتا ہے اس قول میں اس طرف اشارہ ہے کہ امکان ہے کہ صلح کے بعد میاں بیوی امن اور چین سے زندگی گزاریں۔ صلح کا اختیار اللہ نے عورت کو دیا ہے۔ یہ لازمی نہیں بلکہ اس کی اجازت ہے۔ عورت کو پورا اختیار ہے کہ وہ جو مناسب سمجھے، کرے۔ وہ اپنے حالات کا اندازہ لگا کر فیصلہ کرے۔ اگر طلاق کی بجائے شوہر کے ساتھ رہنا اس کے حق میں بہتر ہے تو وہ اس کے ساتھ رہے گی اور اگر وہ سمجھتی ہے کہ وہ خاوند کی سرکشی کو برداشت نہیں کر سکتی تو وہ اس سے علیحدہ ہونے میں آزاد ہوگی۔ اسلام نے جس طرح طلاق کا حق میاں کو دیا ہے بالکل اسی طرح فسخ نکاح کا حق عورت کو دیا ہے۔ میاں اس کو صلح کے لیے مجبور نہیں کر سکتا۔ وگرنہ ظلم تصور ہوگا۔ مقصد دونوں کا باہمی رضامندی سے رہنا ہے اگر جدا ہونا ہے تو اچھے طریقے سے۔ فامساك بمعروف او تسريح باحسان اللہ کا قول ہے۔

احضرت الا نفس الشح مطلب یہ ہے کہ حرص اور لالچ انسانی نفوس کے سامنے حاضر رہتا ہے۔ وہ کبھی ان سے غائب نہیں ہوتا یعنی انسان کی سرشت میں لالچ ہے۔ مرد اور عورت دونوں نہ مال کی قربانی دینا چاہتے ہیں اور نہ جذبات کی۔ زوجین کی زندگی میں جو تلخیاں پیدا ہو جاتی ہیں لالچ انہیں مہمیز دیتا ہے۔ یہ صلح کے راستے کی سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ صلح صفائی کے لیے اس حرص کو چھوڑنے کی ترغیب دی گئی ہے۔ تاکہ میاں بیوی چین سے زندگی گزار سکیں۔

وان تحسنو و تتقوا فان الله كان بما تعملون خبيرا 'اگر تم حسن سلوک کرو (ظلم سے) بچو تو یہ جو کچھ تم کرو گے اللہ اس سے باخبر ہے'۔ آیت کا یہ ٹکڑا قول مفصل کا درجہ رکھتا ہے۔ آیت کا مفہوم بیان کرتے وقت اس ٹکڑے کو پیش نظر نہیں رکھا جاتا۔

ماتریدی، زمخشری، ابوحیان توحیدی، اور امام رازی کا قول ہے کہ اس ٹکڑے کے مخاطب مرد ہیں یعنی اے مردو! اگر تم عورتوں سے حسن سلوک کرو ان کے حقوق کی حفاظت کرو، اپنی ناپسندیدگی کے باوجود نکاح کی گرہ باندھے رکھو۔ نشوز، اعراض اور ہر اس چیز سے بچو جس کے نتیجے میں ایذا رسانی اور جور و جفا کی نوبت پہنچے۔ بے شک جو احسان اور تقویٰ تم اختیار کرو گے اللہ اس سے باخبر ہے وہ تمہیں اس کی جزا دے گا۔ گویا دونوں کو صلح صفائی کا مشورہ دینے کے بعد بھی حسنِ سلوک کی ذمے داری صرف مردوں پر عائد کی گئی ہے۔ سرکشی چونکہ ان کی طرف سے ہے اس لئے بیوی سے حسن سلوک اور اس کے حقوق کی پاسداری بھی انہوں نے کرنی ہے۔

زمخشری نے اس سلسلہ میں بہت ہی برمحل روایت کی ہے کہ عمران بن حطان خارجی نہایت ہی

Marfat.com

بدصورت تھا اور اس کی بیوی انتہائی خوبصورت، ایک دن بیوی نے عمران کے چہرے پر نظر ڈالی اور کہا الحمدللہ۔ اس نے پوچھا تم نے ایسا کیوں کہا ہے؟ اس نے جواب دیا کیونکہ میں بھی جنتی ہوں اور تو بھی۔ وہ کہنے لگا وہ کیسے؟ اس نے جواب دیا کیونکہ تجھے مجھ جیسی بیوی ملی تو نے اللہ کا شکر ادا کیا اور مجھے تجھ جیسا شوہر ملا تو میں نے صبر کیا اور اللہ نے شکر کرنے والے اور صبر کرنے والے بندوں سے جنت کا وعدہ کیا ہے'۔

قرآن نے جو احکام دیئے ہیں ان میں انسانی فطرت اور زمینی حقائق کو سامنے رکھا ہے۔ اگر میاں بیوی کی زندگی میں خلاف معمول کوئی بات ہو جائے تو دونوں کے لیے ضروری ہے کہ وہ عدل و معروف کے تقاضے پورے کریں۔ اگر ان کو خوف ہو کہ وہ اللہ تعالیٰ کی قائم کی ہوئی حدود کو قائم نہ رکھ سکیں گے تو ان میں سے جو بھی دوسرے سے خلاصی چاہے وہ دوسرے کو راضی کر لے۔

قرآن نے عورت کے بارے میں ایک اور اہم بات یہ بتائی ہے کہ بیوی کے اچھے برے ہونے کا فیصلہ اس کی شخصیت کے صرف ایک پہلو کو دیکھ کر نہیں لگانا چاہیے۔ بالکل اسی طرح بیوی کو مرد کے اچھے برے ہونے کا اندازہ صرف ایک پہلو کو دیکھ کر نہیں لگانا چاہیے۔ ہو سکتا ہے جو عورت اور مرد صورت کے حسین نہ ہوں ان کی سیرت حسین ہو، وفاداری، فرمانبرداری امانت و دیانت شائستگی اور خوش اخلاقی حسن و جمال ہی کے مختلف انداز ہیں۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بیوی سارۃ کا تذکرہ قرآن حکیم نے دو مقامات پر کیا ہے۔ یہ تذکرہ اگرچہ انتہائی مختصر ہے مگر اس سے سیدہ سارۃ ایک پاکباز، مہمان نواز، پر اعتماد اور وفا شعار بیوی کی حیثیت سے ابھر کر سامنے آتی ہیں جن کو اللہ کے فرستادہ فرشتوں سے ہم کلامی کا شرف حاصل ہوا۔ سورۃ ھود میں ارشاد ربانی ہے: ' وَامْرَاَتُهٗ قَآئِمَةٌ فَضَحِكَتْ فَبَشَّرْنٰهَا بِاِسْحٰقَ وَمِنْ وَّرَآءِ اِسْحٰقَ يَعْقُوْبَ '، 'اور اس (ابراہیم علیہ السلام) کی بیوی کھڑی تھی۔ پھر وہ ہنس پڑی پھر ہم نے اسے اسحاق علیہ السلام اور ان کے بعد یعقوب علیہ السلام کی خوشخبری دی (ھود ۱۱:۷۱)۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام آتش نمرود کے واقعہ کے بعد عراق سے نکل کر 'اور' کے بت کدے کو چھوڑ کر کنعان چلے آئے تھے۔ ان آیات کریمہ میں جس واقعہ کا ذکر ہے وہ یہیں پیش آیا۔ یہیں پیغمبری کی بشارت لے کر اللہ کے فرشتے مہمان بن کر ان کے یہاں آئے، سلام کیا، آپ نے سلام کا جواب دیا۔ مہمان دیکھے بھالے نہ تھے۔ بہرکیف وہ جلدی سے گئے اور مہمانوں کی ضیافت کے لیے ایک موٹا تازہ بھنا ہوا بچھڑا لے آئے۔ اسے ان کے قریب کیا اور جب دیکھا کہ ان کے ہاتھ کھانے تک نہیں پہنچ رہے ہیں، تو آپ نے خوف محسوس کیا، اور پوچھا! آپ کیوں نہیں کھا رہے؟

Marfat.com

ظاہر ہے، جب مہمان کھانا نہ کھائیں، تو میزبان کو شک گزرتا ہے کہ کہیں یہ بُرے ارادے سے نہ آئے ہوں۔ وہ تو فرشتے تھے کھاتے کیسے؟ انھوں نے کہا! ڈریے مت، ہمیں لوطؑ کی قوم کی طرف بھیجا گیا ہے۔ ابراہیمؑ کی بیوی سارۃ کھڑی تھی اور یہ سب کچھ دیکھ اور سن رہی تھی، وہ ہنس پڑی۔ ہوسکتا ہے، وہ تعجب کی وجہ سے ہنسی ہو کہ وہ اور ان کے شوہر احتراماً مہمانوں کی خدمت کر رہے ہیں۔ مگر انھوں نے کھانے سے ہاتھ کھینچ رکھے ہیں اور اُن کے شوہر خوف محسوس کر رہے ہیں یا وہ خوشی سے اِس وقت ہنسی ہوں، جب فرشتوں کے یقین دلانے پر ان کا خوف دور ہو گیا۔ ہوسکتا ہے کہ وہ بیٹے کی بشارت پر خوشی سے ہنسی ہوں لیکن اس صورت میں ہمیں 'فراء' کی مانند جملے میں تقدیم وتاخیر ماننی پڑے گی۔ اللہ کا قول ہے: ہم نے ابراہیمؑ کی بیوی کو اسحاقؑ اور اس کے بعد ان کے بیٹے یعقوبؑ کی خوشخبری دی۔ عربوں کے کلام میں بیٹے کے بیٹے کو بھی بیٹا ہی کہا جاتا ہے۔

گویا کہ حضرت سارۃ کو یہ خوشخبری دی گئی کہ ان کے یہاں نہ صرف بچہ پیدا ہوگا بلکہ اس بچے کی اولاد سے پیغمبروں کا ایک سلسلہ شروع ہو جائے گا اور وہ پیغمبر دنیا کے دو بڑے سماوی مذاہب یعنی نصرانیت اور یہودیت کی بنیاد رکھیں گے۔ کتنا بڑا اعزاز ہے کہ اللہ خود انھیں خوشخبری دے رہا ہے کہ وہ انبیاء کی ماں ہوں گی۔ سورۃ ذاریات میں یہی خوشخبری فرشتوں نے حضرت ابراہیمؑ کو دی تھی۔ یہاں اللہ تعالیٰ خود بشارت دے کر سارہ کی ڈھارس بندھا رہا ہے کیونکہ ان کی کوئی اور اولاد نہ تھی، جبکہ حضرت ابراہیمؑ کے لڑکے حضرت اسماعیلؑ حضرت ہاجرہ کے بطن سے موجود تھے۔ اب حضرت سارۃ کا ردِعمل ملاحظہ ہو۔ ہائے افسوس! کہ میں ایک بانجھ بڑھیا بچہ جنوں گی؟ توریت کی روایت کے مطابق (پیدائش باب ۲۱ :۵) اس وقت حضرت ابراہیمؑ کی عمر ۱۰۰ برس تھی اور حضرت سارۃ (پیدائش ۱۷: ۷) کی عمر غالباً ۹۰ برس تھی۔ قرآن حکیم نے یٰوَیۡلَتٰۤی (ہائے میں مرگئی) کی جامع ترکیب میں ماضی کی حسرت اور مستقبل کی امید دونوں شامل ہیں۔ انھوں نے تعجب کا اظہار کیا اور تعجب سے اپنا ہاتھ اپنی پیشانی پر مارا کہ اس عمر میں بچے کی پیدائش کیسے ممکن؟ اور یہ میرے شوہر بھی موجود ہیں، وہ بھی بوڑھے ہو چکے ہیں۔ کس قدر پیار اور وفا شعاری سے اپنے قابلِ احترام شوہر کی طرف اشارہ کر رہی ہیں۔ نہ میں اس قابل نہ میرا شوہر اس قابل، پھر بچے کی پیدائش بڑی عجیب بات ہے؟ فرشتے جواب دیتے ہیں: یہ تو تمھارے رب کا حکم ہے ایسا ہی ہوگا۔ یہ بات انسانوں کی نظر میں ناممکن سہی مگر وہ جو تیرا پالنہار ہے تو اسے بہت ہی عزیز ہے، وہ تیرے احساسات جانتا ہے، تیری خواہشات سے باخبر ہے، اس کا یہ فیصلہ ہے کہ بچہ ہوگا اور اس کے فیصلے کو کوئی ٹال نہیں سکتا کیونکہ وہ دانا و بینا اور حکمت والا ہے۔ فرشتے، حضرت سارۃ سے مخاطب

Marfat.com

ہو کر کہنے لگے: کیا تم اللہ کے فیصلے پر تعجب کرتی ہو؟ اے اہلِ بیت! اللہ کی رحمتیں اور برکتیں تم پر نازل ہوں، وہ واقعی حمد کے لائق ہے، عظمت والا ہے، اس کی نگاہِ کرم جس بندے پر پڑتی ہے وہ عظمتوں کے معیار پر پہنچ جاتا ہے، اور اُم الانبیا بن جاتا ہے۔

اہلِ بیت کی ترکیب پر غور کریں، کس قدر شائستگی نے فرشتے سیدہ سارۃ سے مخاطب ہو رہے ہیں اور پھر اس ترکیب میں بھرے بھرے گھر کی خوشخبری پائی جاتی ہے۔ جب حضرت اسحاق علیہ السلام پیدا ہوں گے، ان کے بعد ان کے بیٹے یعقوبؑ اور ان کے بارہ بیٹے تو کس قدر بھرپور گھرانہ ہوگا۔ یہ سب اللہ کی رحمت و برکت کا نتیجہ ہے جو اس وقت فرشتوں نے حضرت سارۃ کے لیے اور ان کے خاندان کے لیے طلب کی تھی۔ کس قدر بلند مقام ہے خاتون کا! سیدہ سارۃ بھی تو ایک خاتون ہی تھی جس کو فرشتوں کے ذریعے اللہ سے ہم کلامی کا شرف حاصل ہوا۔ اس مقام پر ذہن میں ایک سوال ضرور اُبھرتا ہے جو خاتون پر مرد کی فضیلت ماننے والے کرتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ خاتون کو نبی بنا کر کیوں نہیں بھیجا گیا؟

اس مختصر سے قصہ میں کم و بیش ہر مفسر کی رائے ہے کہ آیہ مبارکہ میں سیدہ سارۃ کے جس قیام کا ذکر ہے وہ مہمانوں کی خدمت کی غرض سے تھا۔ چنانچہ ابن ابی حاتم نے مجاہد سے یہی روایت کی ہے: اب مفسرین کو ایک مشکل پیش آئی کہ ایک پیغمبر کی بیوی اجنبی مہمانوں کی خدمت میں مصروف ہے وہ بھی پردے کے بغیر۔ پردے سے ان کی مراد چہرے کو ڈھانپنا ہی ہے۔ مختلف تاویلیں پیش کی گئی ہیں۔ ایک روایت بیان کی گئی کہ وہ پردے کے پیچھے کھڑی تھیں۔ دوسری روایت میں کہا گیا: وہ بوڑھی تھیں اس لیے حجاب نہیں کرتی تھیں۔ پھر ان کو خیال آیا کہ اس زمانے میں حجاب کا رواج نہیں تھا اس کا حکم تو بعد میں ہوا۔ یہ مختلف روایات ذہنی پریشانی پر دلالت کرتی ہیں۔ شعیب کی بیٹیوں کے بارے میں بھی یہی مشکل پیش آئی تھی۔ اس ذہنی پریشانی کا سبب یہ ہے کہ فاسد معاشروں میں اعصاب پر ہمیشہ عورت سوار ہوتی ہے۔ صحت مند اور بھلا معاشرہ نظروں سے اوجھل رہتا ہے۔ حالانکہ اسلام کا بنیادی اصول ہے کہ انسان فطرتاً نیک ہے۔

دوسرا بڑا سبب یہ کہ سوسائٹی کے دباؤ کے تحت وہ پردے کے اصل احکام کو سمجھ ہی نہ سکے۔ زیرِ نظر آیت میں ابوحیان نے البحر المحیط میں اوپر دیے ہوئے شبہات کا جواب یوں دیا ہے۔ 'ہماری شریعت میں بھی اس مہمانداری کی مثال موجود ہے۔ ابوسعید ساعدیؓ کی بیوی نے اللہ کے رسول ﷺ اور ان کے ساتھ صحابہ کرام کی خدمت کی'۔ اس سلسلہ میں صرف اتنی سی بات کہوں گا کہ چہرے کا پردہ کتاب و سنت سے ثابت نہیں۔ بلکہ ابوداؤد نے جو حضرت اسماء بنتِ ابی بکر کی حدیث روایت کی ہے وہ اس کی نفی کرتی

Marfat.com

ہے۔ ائمہ میں سے امام ابوحنیفہ، امام مالک اور امام شافعی اور امام احمد بن حنبل کے ایک قول کے مطابق چہرہ اور ہاتھ عادۃ اور عبادۃ ستر میں داخل نہیں۔ مفسرین میں سے تقریباً تمام مفسرین امام طبریؒ، زمخشریؒ اور امام رازیؒ سے لے کر جدید مفسرین سید قطبؒ تک سب کی متفقہ رائے ہے کہ چہرے اور ہاتھ پردے میں شامل نہیں نہ رواج کے طور پر اور نہ عبادت کے طور پر۔

دورِ جدید کے فن حدیث کے معروف محقق ناصر الدین البانی نے اس سلسلہ میں دو کتابیں لکھی ہیں، ایک کا نام حجاب المرأۃ المسلمۃ ہے دوسری کا جلباب المرأۃ ہے ان کتابوں میں انھوں نے تقریباً بیس، بائیس احادیث بیان کی ہیں۔ جن سے ثابت ہوتا ہے کہ عہد نبوت میں چہرے کا پردہ نہیں تھا اور انھوں نے یہ بھی ثابت کیا ہے کہ یہ سب روایات پردے کے احکام سے بعد کی ہیں۔ اگر چہرے کو پردے سے نکال دیا جائے تو ساری مشکلات حل ہو جاتی ہیں اور اعتراضات کے جواب مل جاتے ہیں۔

میں آگے چل کر بہت سے ایسے واقعات بیان کروں گا جو فن حدیث سیکھنے اور اس کا درس دینے سے متعلق خواتین کے بارے میں ہیں جو تن تنہا حدیث کا علم سیکھنے کے لیے جاتی تھیں اور جن سے بڑے بڑے محدثین نے کسب فیض کیا۔

ایک اور اہم مقام ہے جہاں امرأۃ کا لفظ خاتون کے معنی میں آیا ہے اور جس سے واضح طور پر ثابت ہوتا ہے کہ خاتون ضرورت پڑنے پر اپنے خاندان اور معاشرے کی فلاح و بہبود کے لیے گھر سے باہر نکل کر ایسے کام کر سکتی ہے جو روایتی طور پر مردوں کے لیے مخصوص ہیں اور جس میں یہ بھی بتایا گیا ہے ایسے ماحول میں اجنبی مرد کے ساتھ بات چیت میں بھی کوئی حرج نہیں۔ شرط صرف یہ ہے کہ وہ حیا کا دامن تھامے رکھے۔ اس میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ ایسے حالات میں سلیم الفطرت مردوں کا رویہ کیسا ہونا چاہیے۔

سورۃ قصص میں حق تعالیٰ کا ارشاد ہے: ’’وَلَمَّا وَرَدَ مَاءَ مَدْيَنَ وَجَدَ عَلَيْهِ أُمَّةً مِّنَ النَّاسِ يَسْقُونَ وَوَجَدَ مِن دُونِهِمُ امْرَأَتَيْنِ تَذُودَانِ قَالَ مَا خَطْبُكُمَا قَالَتَا لَا نَسْقِي حَتَّىٰ يُصْدِرَ الرِّعَاءُ وَأَبُونَا شَيْخٌ كَبِيرٌ‘‘ (القصص ۲۸:۲۳)۔ ’’جب موسیٰ علیہ السلام مدین کے پانی (کنویں) پر پہنچے تو انھوں نے وہاں لوگوں کی ایک جماعت کو دیکھا کہ وہ اپنے مویشیوں کو پانی پلا رہی ہے اور ان سے قریب ہی دو خواتین (اپنے گلّے کو) روکے کھڑی تھیں۔ آپ نے کہا تمھاری کیا پریشانی ہے؟ انھوں نے کہا ہم پانی نہیں پلا سکتیں جب تک چرواہے پانی پلا کر چلے نہ جائیں، اور ہمارا باپ بہت ہی بوڑھا ہے‘‘۔

اس سے اگلی پانچ آیات بھی اسی موضوع کا تسلسل ہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام خوف زدہ ہو کر مصر سے نکلے اور آبنائے سویز کو عبور کر کے صحرائے سینا سے ہوتے ہوئے مدین پہنچے، جہاں عرب آباد تھے۔ انھوں

Marfat.com

نے آبنائے سویز سے اوپر فلسطین اور شام کو جانے والا عام راستہ اختیار نہ کیا، کیونکہ انھیں دشمن کے تعاقب کا ڈر تھا۔ صحراء کے مسافر کا پہلا ہدف نخلستان ہوتا ہے، جہاں وہ درخت کے سائے میں بیٹھ کر کسی چشمے یا کنویں سے اپنی پیاس بجھاتا ہے۔ مدین میں غالباً ایک گہرا کنواں تھا کیونکہ صحرا میں چشمہ کا امکان نہیں ہوتا۔

قرآن حکیم نے مختصر مگر خوبصورت الفاظ میں منظر کشی کی ہے۔ موسیٰ علیہ السلام دور دراز کا سفر طے کر کے تھکے، ہارے، بھوکے، پیاسے اور ذہنی کرب میں مبتلا مدین کے کنویں تک پہنچتے ہیں۔ کنویں پر کچھ چرواہے اپنے مویشیوں کو پانی پلا رہے تھے۔ اجنبی تھے، اس لیے ان میں گھسنا مناسب نہ سمجھا۔ درخت کے ایک سائے میں بیٹھ کر ان کے فارغ ہونے کا انتظار کرنے لگے۔ تو دیکھا کہ دو لڑکیاں اپنی بکریوں کے گلے کو روکے کھڑی ہیں۔ لفظ سے ظاہر ہوتا ہے کہ گلہ تو پانی پینے کے لیے بڑھنا چاہتا تھا، مگر وہ ان کو روکے کھڑی تھیں۔ روکنے کے کئی اسباب ہو سکتے ہیں۔ کنویں پر طاقتور چرواہے کھڑے تھے، ان کے ساتھ دھکم پیل کر کے پانی نہیں پلا سکتی تھیں یا فراء کے قول کے مطابق بکریوں کو روک رکھا تھا کہ کہیں وہ منتشر ہو کر دوسری بکریوں میں گھل مل نہ جائیں۔ زجاج نے بھی اسی قول کی تائید کی ہے لیکن یہ بات قطعی درست نہیں کہ دیکھنے والوں کی نظروں سے بچنے کے لیے انھوں نے اپنے منہ موڑے ہوئے تھے اور اپنے چہرے کو کپڑے یا قمیص کی آستین سے ڈھانپا ہوا تھا یا حجاب کے لیے اس پر ہاتھ رکھا ہوا تھا۔ 'ذود' کے لفظ کی یہ تعبیر کسی طور پر بھی درست معلوم نہیں ہوتی۔

ابن فارس نے لفظ ذود کے دو بنیادی معنے بیان کیے ہیں۔ ایک تو یہ کہ ایک چیز کو دوسری چیز سے روکنا اور دوسرے اونٹوں کے گروہ کو دھتکار کر روکنا۔ چہرے کو موڑنے کے معنی نہ لغوی طور پر درست ہیں اور نہ اس منظر میں فٹ بیٹھتے ہیں، جس کا نقشہ قرآن حکیم کھینچتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت کی اجتماعی روایات اور رسم ورواج کے دباؤ میں بعض مفسرین نے یہ معنی تراش لیے ہیں۔

چاہیے تو یہ تھا کہ خواتین اپنی بکریوں کو پہلے پانی پلاتیں اور مرد اس سلسلہ میں ان کی مدد کرتے لیکن وہ معاشرہ تو ایک بگڑا ہوا معاشرہ تھا۔ اسی معاشرے کی لڑکیوں کے باپ جو کہ جمہور مفسرین کے مطابق حضرت شعیب علیہ السلام تھے، ان لوگوں تک اللہ کی توحید کا پیغام پہنچا رہے تھے اور ناپ تول میں عدل و انصاف کی تعلیم دے رہے تھے اور وہ لوگ ان کی مخالفت پر کمربستہ تھے۔ کوئی بھی تو ایسا نہ تھا جو ان کی بیٹیوں کا ہاتھ بٹائے۔ جب موسیٰ علیہ السلام نے یہ نقشہ دیکھا تو ستانے کو ان کا جی نہ چاہا۔ ان کی غیرت اور فطرت سلیم نے جوش مارا۔ وہ اپنی تھکاوٹ اور درماندگی کی پرواہ نہ کرتے ہوئے پردیسی ہونے کے

Marfat.com

باوجود آگے بڑھے۔ انھوں نے وہی کیا جو ایک خوددار اور روشن ضمیر مرد کرتا ہے۔ خواتین سے پوچھا کیا بات ہے؟ کیوں ہٹ کر کھڑی ہو؟ انھوں نے کہا ہم اس وقت تک پانی نہیں پلاتیں جب تک چرواہے پانی پلا کر چلے نہ جائیں۔ جمہور مفسرین کا قول ہے کہ وہ شعیب ﷺ نبی تھے لیکن بعض اقوال کی رُو سے وہ شعیب ﷺ کا بھتیجا یثرون تھا جو کہ مدین کا کاہن تھا۔ تورات میں اس کا نام رعوائیل یثرو درج ہے۔

اُنھوں نے تین الفاظ میں اپنا قصہ کہہ سنایا اَبونا شیخ کبیر 'ہمارا باپ بہت ہی بوڑھا ہے'۔ گلّے کی نگہبانی نہیں کر سکتا۔ اس لیے یہ کام ہمیں کرنا پڑتا ہے، لیکن ان چرواہوں پر اپنے آپ کو ٹھونس نہیں سکتیں۔ تھکان اور پیاس کی وجہ سے موسیٰ ﷺ کا برا حال تھا۔ پردیسی تھے، بے یار و مددگار تھے، بے رحم دشمن ان کا پیچھا کر رہا تھا لیکن یہ سب رکاوٹیں انھیں انسانیت اور مردانگی کی آواز پر لبیک کہنے اور حق کی پشت پناہی سے روک نہ سکیں۔ وہ لمحہ بھر کے لیے بھی نیکی کے اس موقع کو ہاتھ سے جانے نہیں دینا چاہتے تھے۔ انھوں نے دو محنت کش لڑکیوں کی مدد کر کے ایک روشن مثال قائم کی کہ پدر شاہی معاشروں میں مردوں کا کام کارکن خواتین کے راستوں میں کانٹے بچھانا نہیں بلکہ ان کی راہ کو ہموار کرنا ہوتا ہے۔

موسیٰ ﷺ لڑکیوں کی بات سن کر چرواہوں کے درمیان گئے۔ خواتین کی بکریوں کے لیے جگہ بنائی اور ان کو پانی پلا کر واپس سائے میں آ بیٹھے۔ نہ ان پر نظریں جمائیں نہ ان کا پیچھا کیا۔ دل میں شکر کے جذبات لیے لڑکیاں چلی گئیں، اور ہو سکتا تھا وہ پھر کبھی بھی نہ لوٹیں۔ موسیٰ ﷺ نے اپنی پیاس بجھالی تھی مگر وہ ایک بے گھر مسافر تھے۔ یہ چرواہے تو ان کے ہم پلہ نہ تھے۔ ان سے کیا بات کرتے؟ تصور میں انھیں روشنی کی ایک کرن دکھائی دی۔ ہنستا بستا گھر، بکریوں کا گلہ، گھر کا بوڑھا سربراہ اور اس کی دو باحیا لڑکیاں۔ ان کی چشم تصور نے یہ سب کچھ دیکھا ہوگا۔ نیکی کی وجہ سے ان کا اپنے نفس پر اعتماد تھا، انھوں نے ایک نیک کام کیا تھا۔ اپنے رب کے سامنے دامن پھیلا دیا اور دل کی گہرائیوں سے دعا مانگی 'میرے رب میں ہر اس بھلائی کا محتاج ہوں جو تو میرے ساتھ کرے'۔ دعا دل سے نکلی تھی کیسے قبول نہ ہوتی؟ دیکھا کہ دونوں میں سے ایک لڑکی شرماتی ہوئی چلی آ رہی ہے کس قدر خوبصورت الفاظ ہیں قرآن مجید کے تمشی علی استحیاء گویا وہ زمین پر نہ چل رہی تھی، بلکہ حیا پر چل رہی تھی۔ حیا مجسم ہوگئی ہے، لگتا ہے کہ اس نے ایک قالین کی شکل اختیار کر لی ہے جو موسیٰ ﷺ کی طرف جانے والے راستہ پر بچھا ہو۔ وہ بڑے اعتماد کے ساتھ چل رہی تھی عفت اور پاکبازی کی وجہ سے پر اعتماد تھی۔ اس میں اضطراب اور بیہودگی کی وہ کیفیت نہ تھی جسے دیکھ کر کئی طرح کے برے خیالات جنم لیتے ہیں۔ اپنے کام کاج کے لیے خواتین کو باہر نکلنا پڑتا ہے اس میں کوئی ہرج نہیں بشرطیکہ وہ حیا سے اپنی آنکھیں نیچی رکھیں اور کام

Marfat.com

سے کام رکھیں۔ وہ موسیٰ علیہ السلام کو پیغام دیتی ہے کہ آپ نے بکریوں کو پانی پلا کر جو نیکی ہمارے ساتھ کی ہے ہمارا باپ اس کا بدلہ چکانا چاہتا ہے۔ وہ دعوت کو اپنے باپ کی طرف منسوب کرتی ہے اور جزا کو اس کی علت قرار دیتی ہے تاکہ مجرد دعوت سے ان کے دل میں کسی قسم کا شبہ نہ پیدا ہو جائے۔ یہ بات اس لڑکی کی عقل کے کمال پر دلالت کرتی ہے۔

موسیٰ علیہ السلام کے لیے اس پیغام سے بڑھ کر خوش آئند اور کیا چیز ہو سکتی تھی؟ وہ گئے اور شیخ سے ملے۔ پدرانہ سائے میں ایک منظم گھرانہ دیکھا۔ باپ بیٹیوں سے خوش تھا، بیٹیاں باپ سے۔ ایک گونہ باہمی اعتماد تھا۔ بیٹیوں نے باپ سے ان کا تعارف ایسے الفاظ میں کرا دیا تھا کہ انھیں خوش آمدید کہا گیا ہوگا۔ جلد ہی دونوں میں بے تکلفی ہو گئی تو موسیٰ علیہ السلام نے شیخ کو اپنا قصہ کہہ سنایا۔ گھر کے مالک نے انھیں گھر کی چھت کے نیچے امن و سکون کا یقین دلایا اور انھیں بچ نکلنے پر مبارکباد دی اور کہا! اچھا ہوا تم ظالم اور بے انصاف لوگوں سے بچ کر یہاں آ گئے ہو۔ مہمان تو مہمان ہوتے ہیں وہ ہمیشہ ٹھہرنے کے لیے نہیں آتے۔ ان میں سے ایک لڑکی نے ان کہی بات کہہ دی۔ غالباً یہ وہی لڑکی تھی جو انھیں بلانے گئی تھی۔ اس کا نام تورات میں صفورا بتایا گیا ہے۔ وہ کہنے لگی ابا جان! انھیں ملازم کیوں نہیں رکھ لیتے؟ ایک طاقتور اور ایمان دار شخص سے بہتر ملازم اور کون ہو سکتا ہے؟ اس نے محسوس کیا ہوگا، کیا ہی اچھا ہو اگر یہ مہمان ہمیشہ کے لیے ان کے یہاں ٹھہر جائے۔ اس نے موسیٰ علیہ السلام کو ایک عورت کی آنکھ سے دیکھ لیا تھا کہ وہ اس کے ساتھی بننے کے لائق ہیں۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ موقع ہاتھ سے نکل جائے۔ موسیٰ علیہ السلام کی نظر پاک تھی، احساس بھی پاکیزہ تھا۔ یہی حال لڑکی کا تھا، عفت و پاکیزگی تصنع اور بناوٹ سے پاک سیدھے سادے رویے میں خوشبو پھونک دیتی ہے۔ لڑکی نے بلا تکلف اپنے دل کی بات کہہ دی اور پسندیدگی کا سبب بھی بیان کر دیا۔ اس کا دل پاک تھا، احساس شفاف تھا۔ وہ بدگمانی اور تہمت سے خوفزدہ نہ تھی اس لیے اس نے اپنے باپ کے سامنے بغیر کسی ابہام۔ کے تجویز پیش کر دی۔

صاحب کشاف نے کس قدر خوبصورت بات کہی ہے، فرماتے ہیں کہ یہ ایک پر مغز اور جامع بیان ہے اس سے بہتر بیان نہیں ہو سکتا کیونکہ جب قوت اور امانت ایک ذمے دار شخص میں جمع ہو جائیں تو آپ مطمئن ہو جاتے ہیں اور مراد بر آتی ہے۔ یہ دو ایسی صفات ہیں جن کو خواتین مردوں میں دیکھنا پسند کرتی ہیں۔ اس نے ان کی قوت دیکھی تھی جس سے خوفزدہ ہو کر چرواہوں نے ان کے لیے راستہ بنا دیا تھا اور اس نے ان کی زبان اور نظر میں امانت کا مشاہدہ کر لیا تھا، قوت اور امانت کے جو قصے مفسرین نے بیان کیے ہیں وہ بے معنی ہیں۔ باپ اس تجویز کو کسی تردد کے بغیر قبول کر لیتا ہے۔ لگتا ہے کہ باپ ہونے

Marfat.com

کے ناتے اسے اپنی لڑکی اور موسیٰ علیہ السلام کے باہمی اعتماد اور فطری میلان کا احساس ہو گیا تھا۔ تھوڑی دیر بعد باپ نے شادی کا موضوع چھیڑ دیا اور کہا کہ میں اپنی ان دو بیٹیوں میں سے ایک کو تمھارے ساتھ بیاہنا چاہتا ہوں۔ شرط یہ ہوگی کہ تم آٹھ برس تک میری خدمت کرو۔ اگر تم آٹھ برس کی بجائے دس برس مکمل کر دو تو یہ تمہارا اختیار ہوگا۔ میں آپ پر بوجھ نہیں ڈالنا چاہتا۔ خدا نے چاہا تو آپ مجھے صالح پائیں گے۔ حیرت کی بات ہے کہ ایک باپ اپنی بیٹی کے نکاح کی پیش کش کر رہا تھا۔ ایسا معاشرہ جو فطرت سے دور ہو، رسم و رواج کا پابند ہو چکا ہو، اس کے رویوں میں تکلف اور بناوٹ کی آمیزش ہوتی ہے۔ ایسا معاشرہ والد یا سرپرست کو اجازت نہیں دیتا کہ وہ اپنی بیٹی کے لیے خوش اخلاق دیانت دار اور ہم پلہ لڑکا ڈھونڈے۔ وہاں دستور یہ ہوتا ہے کہ لڑکا یا اس کا سرپرست لڑکی کا ہاتھ مانگتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے عہد مبارک میں باپ اپنی لڑکیوں کو نکاح کے لیے پیش کرتے تھے۔ یہاں تک کہ ایک مومن خاتون نے خود اپنے آپ کو رسول اللہ ﷺ کے ساتھ نکاح کے لیے پیش کیا اور جب انھوں نے معذرت کی تو ان کو اپنا سرپرست تسلیم کیا تا کہ وہ جس سے چاہیں شادی کروا دیں (الاحزاب ۳۳: ۵۰)۔ حضرت عمرؓ نے اپنی بیٹی حفصہ کو پہلے حضرت ابوبکرؓ پھر حضرت عباسؓ اور پھر رسول اللہ ﷺ سے نکاح کے لیے پیش کیا اس میں شرم کا ہے کی؟ باپ بیٹی کا نکاح کر کے ایک خاندان کی بنیاد ہی تو رکھنا چاہتا ہے۔

شیخ مدین نے دونوں بیٹیوں میں سے ایک کا اور مدت ملازمت میں آٹھ یا دس کا اختیار موسیٰ علیہ السلام کو دیا۔ وہ موسیٰ علیہ السلام کے حالات سے فائدہ اُٹھا کر اپنی رائے اُن پر ٹھونسنا نہیں چاہتے تھے کیونکہ موسیٰ علیہ السلام کو شعیب علیہ السلام یا شیخ مدین کے گھر قیام کرنا تھا اگر وہ اپنی مرضی سے ایک کا انتخاب نہ کرتے، تو ان کی ازدواجی زندگی اضطراب کا شکار ہو جاتی اور وہ ہر وقت دو بہنوں کے درمیان موازنہ کرتے رہتے اور ان کا دل ہر لحظہ اس کی تمنا کرتا رہتا جس کا اختیار ان کے پاس نہ ہوتا اور دونوں بیٹیوں میں سے ایک کے دل میں کسک باقی رہتی۔ موسیٰ علیہ السلام کو اختیار دے کر باپ نے ایک کو دوسرے پر ترجیح نہ دی۔ ایک دوسرے کی طرف جھکاؤ کے باعث خاص لڑکی کا فیصلہ تو طرفین کی طرف سے پہلے ہو چکا تھا۔ موسیٰ علیہ السلام نے یہ تجویز خوشی خوشی منظور کر لی اور فرمایا! میرے اور آپ کے درمیان معاہدہ یہ ہوا ہے کہ دونوں مدتوں میں سے جو چاہوں پوری کر لوں۔ میرے ساتھ ناانصافی اور ظلم نہ ہوگا۔ ہم اس معاہدہ پر اللہ کو وکیل بناتے ہیں۔ یہ کہہ کر انھوں نے معاہدہ کو پکا کر لیا۔ شیخ کبیر اپنے داماد کی صلاحیت پر یقین رکھتے تھے۔ انھوں نے موسیٰ علیہ السلام کو یقین دلایا کہ وہ کسی ایسی بات پر اصرار نہ کریں گے جس سے ان کا مستقبل خطرے میں پڑ جائے۔ اس قصے سے ہمیں دو سبق ملتے ہیں ایک یہ کہ اللہ کا پیغمبر بھی ایک انسان ہوتا ہے جسے دوسرے

Marfat.com

انسانوں کی مانند زندگی کے نشیب و فراز سے گزرنا پڑتا ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ اس کا رویہ دوسرے انسانوں کی نسبت زیادہ پروقار اور شائستہ ہوتا ہے۔ دوسرا اہم سبق یہ ہے کہ محبت اور شادی کے خوبصورت روابط اللہ کے پیغمبر کو روحانی بلندیوں تک پہنچانے کا زینہ بنتے ہیں اور خاتون کو محبت کے جال میں پھنسانے والی مخلوق نہیں سمجھنا چاہیے بلکہ وہ ایک مونس و غم خوار ساتھی ہوتی ہے بالکل اسی طرح جس طرح صفورا بنت یثرون موسیٰ علیہ السلام کی ساتھی بنی اور بالکل اسی طرح جیسے اُم المومنین خدیجہ بنت خویلد خاتم النبین ﷺ کی ساتھی بنی۔ یہاں پر ان سوالات یا اعتراضات کا ذکر کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے جو اس قصہ کے بیان کے سلسلہ میں اپنے زمانے کے معاشرتی دباؤ کے تحت کیے گئے ہیں۔ یہ اعتراضات اس ذہن کی غمازی کرتے ہیں جو اجتماعی روایات کو شرعی قوانین کے ساتھ گڈمڈ کر کے ان کو بھی تقدس کا درجہ دیتے ہیں اور جو یہ سمجھتے ہیں کہ خاتون گھر کی چار دیواری سے نکل کر نہ کوئی کام کر سکتی ہے اور نہ کسی اجنبی سے بات کر سکتی ہے اور کسی اجنبی کے لیے جائز نہیں کہ وہ اس کی بات پر یقین کر کے اور بغیر سوچے سمجھے اس کے ساتھ کہیں جائے۔ ایک اعتراض یہ ہے کہ شعیب علیہ السلام یا مدین کا ایک صالح شخص اپنی بیٹیوں کو پانی پلانے کے لیے بھیجنے پر کیسے رضامند ہو گیا؟ پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اجنبی خواتین سے بات کیونکر کی؟ پھر ان میں سے ایک کی بات پر یقین کر کے ان کے ساتھ کیوں چل دیے؟ پانچویں چھٹی صدی ہجری کے مفسر زمخشری نے اپنی تفسیر کشاف میں آیات زیر نظر کی تفسیر کے تحت ایسا خوبصورت جواب دیا ہے جو آج کل کے مذہبی رہنماؤں کی آنکھیں کھولنے کے لیے کافی ہے۔ فرماتے ہیں: 'بیٹیوں کو پانی پلانے کے لیے بھیجنا کوئی ممنوع کام نہیں اور دین بھی اس سے منع نہیں کرتا۔ جہاں تک مردانگی اور انسانیت کا تعلق ہے، لوگوں کے رسم و رواج اور عادات مختلف ہیں۔ عربوں کی عادات عجمیوں سے مختلف ہیں۔ صحرا اور دیہات میں رہنے والوں کی عادات، شہر والوں سے الگ ہیں'۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اس مسئلے کا تعلق تمدنی اور ثقافتی ضروریات سے ہے اگر ان کو روک دیا جائے تو زندگی کی گاڑی رک جائے گی۔ فتویٰ صادر کرتے وقت صرف شہر کے باسیوں کو مدنظر نہیں رکھنا چاہیے بلکہ صحرا نشینوں اور دیہاتیوں کے طرز زندگی کو بھی پیشِ نظر رکھنا چاہیے، جہاں خواتین کا باہر نکل کر کام کرنا کوئی اچنبھے کی بات نہیں۔ ہر دور میں یہاں تک کہ عہد نبوت میں بھی ایسا ہی ہوتا رہا ہے۔ جہاں تک اس اعتراض کا تعلق ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے محض ایک خاتون کے قول پر عمل کرتے ہوئے، اس کے ساتھ چلنے کو روا سمجھا، اس کا جواب زمخشری یہ دیتے ہیں 'ایک خاتون کی خبر پر بالکل اسی طرح عمل کیا جاتا ہے جس طرح ایک مرد کی خبر پر خواہ وہ آزاد ہو یا غلام، مذکر ہو یا مؤنث۔ جہاں تک اجنبی خاتون کے ساتھ چلنے کا سوال ہے تو ایسے حالات میں احتیاط اور عفت کے ساتھ چلنے میں کوئی برائی نہیں'۔ قاضی ابن العربی نے

Marfat.com

احکام القرآن میں کہا ہے کہ 'گھر گرہستی کے کام، کھلائی، پکائی، سلائی، کڑھائی اور رقص و سرود کو خواتین کی طرف منسوب کیا جاتا ہے لیکن مردان فنون میں، اُن سے بڑھ گئے ہیں اور خواتین اِن فنون میں بازی لے گئی ہیں جو مردوں کے ساتھ مخصوص سمجھے جاتے ہیں مثلاً حکمرانی، عسکری قیادت، تقریر و تحریر اور زہد و تقویٰ۔ وہ مزید لکھتے ہیں کہ اِن مثالوں کو استثناء کہنے سے کام نہیں چلتا۔ استثناء کے اندر بھی وہی دلائل موجود ہوتے ہیں جو کہ عام قاعدے کے اندر ہوتے ہیں۔ یہ عام قاعدے کی تائید کرتا ہے، ہمیشہ مخالفت نہیں کرتا'۔

اسلامی تعلیمات کے مطابق انسان کو پیدائشی اور فطری جو حقوق حاصل ہیں ان میں سے ایک حق قدرتی وسائل رزق سے استفادہ اور کسب معاش کے سلسلہ میں جدوجہد کرنا ہے۔ قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: 'هُوَ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ ذَلُوْلًا فَامْشُوْا فِيْ مَنَاكِبِهَا وَكُلُوْا مِنْ رِّزْقِهٖ وَاِلَيْهِ النُّشُوْرُ (النمل ۶۷:۱۵) 'اور وہ ذات ہے جس نے تمہارے لیے زمین کو نرم (تابع) بنایا۔ سو اس کے راستوں میں چلو اور اس کا رزق کماؤ اور اسی کی طرف تم اٹھائے جاؤ گے۔ اس آیہ مبارکہ میں خطاب تمام نوع انسانی بشمول مرد و زن سے ہے۔ اس کی رو سے ہر شخص کا حق ہے کہ اسے قدرتی وسائل رزق سے رزق حاصل کرنے کے مساویانہ مواقع فراہم کیے جائیں۔ جہاں تک اسلامی تعلیمات کا تعلق ہے، وہ گھریلو فرائض کے بعد مرد و زن کے کام پر کوئی پابندی عائد نہیں کرتیں، بلکہ اس کے برعکس قرآن عالم خارجی میں خاتون کی شرکت کے لیے تمام رکاوٹیں دور کرتا ہے۔ بہتان تراشی ایک ایسی رکاوٹ ہے جو کارکن خواتین کے عرصۂ حیات کو تنگ کر دیتی ہے۔ قرآن نے خاتون پر بہتان باندھنے کی سزا ۸۰ کوڑے رکھی ہے اور بعد میں توبہ نہ کرنے کی صورت میں تاحیات ہر معاملے میں بہتان تراش کی گواہی قابل قبول نہیں ہوتی (النور ۲۴:۴ تا ۵)۔

اسلامی شریعت نے تمدنی تغیرات اور اجتماعی معاشرتی ضروریات کو دائرہ کار کے بارے میں موثر عامل تسلیم کیا ہے۔ اس شریعت نے ایسے احکام دیے ہیں جو خاتون کو گھر سے نکلنے پر مجبور کرتے ہیں۔ سورۃ توبہ کی آیت نمبر ۷۱ میں مومن مردوں کے ساتھ مومن خواتین کی ولایت مطلقہ کو تسلیم کیا گیا ہے۔ اس میں مالی اور اجتماعی تعاون، جنگی اور سیاسی امور کی ولایت سب شامل ہے۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے کام کے لیے مردوں کی مانند باہر نکلنا پڑے گا۔

حصول تعلیم خاتون پر فرض ہے اس کے لیے بھی نکلنا پڑے گا۔ اس تعلیم میں سائنس، ادب، طب، انجینئرنگ، سیاسیات، بین الاقوامی حالات، قانون یہاں تک کہ بچوں کی تربیت کے لیے علم النفس بھی شامل ہے۔ کوئی ایسی دلیل شرعی موجود نہیں جس سے ثابت ہو کہ خاتون کا دائرہ کار، اس کے گھر تک محدود ہے

Marfat.com

۔نہ ہی اس بارے میں کتاب وسنت کی کوئی نص قطعی موجود ہے۔ عہد نبوت اور خلافت راشدہ کے دور میں خواتین تمام سرگرمیوں میں شریک ہوتی تھیں، خواہ ان کا تعلق اجتماعی کاموں سے ہو یا زراعت وکاشت سے ہو یا تجارت سے ہو یا تعلیم وتبلیغ سے ہو یا جہاد سے ہو۔ احادیث کی کتابوں میں ڈھیر ساری روایات موجود ہیں، میں کاشت کاری کے سلسلہ میں صرف دو روایات پر اکتفا کرتا ہوں، حضرت اسماء، ابو بکرؓ کی بیٹی اور زبیرؓ بن العوام کی بیوی تھیں۔ مدینہ سے تین کوس باہر جا کر حضرت زبیرؓ کے گھوڑے کے لیے چارہ بنا کر لاتی تھیں (البخاری، کتاب النکاح، باب الغیرۃ)۔ حضرت جابر بن عبداللہ کی مطلقہ خالہ کو عدت کے دوران اپنے کھجور کے چند پیڑ کاٹ کر فروخت کرنے کی ضرورت پڑی۔ لوگوں نے منع کیا، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا! کھیت میں جاؤ، کھجور کے پیڑ کاٹو۔ ممکن ہے اس رقم سے تم صدقہ وخیرات یا کوئی اور بھلا کام کرسکو (ابو دائود، کتاب الطلاق، باب فی المبتوتہ، تخرج بالنھار)۔ اس حدیث کا مطلب ہے کہ اسلامی معاشرے میں خاتون صرف مظلوم بن کر زندگی نہ گزارے بلکہ اپنی اور معاشرے کی فلاح وبہبود کے لیے کام بھی کرے۔ تجارت کے سلسلہ کی ایک روایت عبداللہ بن مسعود کی بیوی کی ہے۔ جو اپنے ہاتھ سے چیزیں بنایا کرتی تھیں اور وہ چیزیں بیچ کر اپنے، اپنے خاوند کے اور بچوں کے اخراجات پورے کیا کرتی تھیں (مسند امام احمد، ج ۶ ص ۳۶۴؛ طبقات ابن سعد ج ۸ ص: ۲۹۰)۔ نبی کریم ﷺ کی صاحبزادی خاتون جنت سیدہ فاطمۃ الزھراء مشکیزے میں پانی بھر کر باہر سے لاتی تھیں۔ ان کے کندھے پر نشان پڑ گئے تھے۔ اس سلسلہ میں خادم کی درخواست بھی حضورؐ نے قبول نہ کی۔

عہد نبوت میں خواتین پنجگانہ نمازوں، نماز استسقاء، کسوف، وخسوف کی نمازوں اور عیدین میں برابر شریک ہوتی رہیں۔ یہاں تک کہ جو خواتین شرعی عذر کی وجہ سے نماز نہ پڑھ سکتی تھیں ان کو بھی نبی پاک ﷺ نے ہدایت کی تھی کہ وہ اجتماع میں شریک ہوں۔ مردوں کو ہدایت تھی کہ وہ اپنی بیویوں کو مسجد میں جانے سے منع نہ کریں۔ ابوحیان نے البحر المحیط میں زمخشری کی رائے کی تائید کی ہے۔ قاضی ابو بکر ابن العربی نے یہ کہا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کے سوال میں اس بات کا جواز ہے کہ بوقت ضرورت اجنبی خاتون سے بات کی جاسکتی ہے اور ابوحیان نے تو یہ بھی کہا ہے۔ اس میں دلیل ہے کہ خاتون کی خبر پر اعتماد کیا جاسکتا ہے کیونکہ موسیٰ علیہ السلام نے اس کی خبر پر اعتماد کیا، جیسا کہ حدیث کی روایت میں خاتون کی خبر پر اعتماد کیا جاتا ہے۔

ایک اہم نکتہ یہ ہے کہ وہ بیٹیاں حیادار تھیں لیکن مردوں کے درمیان کام کرنے کو آئیں تھیں۔ بلقیس بھی حضرت سلیمان علیہ السلام سے ملاقات کے لیے آئی تھی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بیوی بھی مہمانوں کی

Marfat.com

خدمت کے لیے موجود تھیں۔ موسیٰ علیہ السلام کی بہن بھی فرعون کے محل میں گئی تھی۔ حضرت مریم بیت المقدس کی خدمت کرتی تھیں اور نمازیوں کے ساتھ نماز پڑھتی تھیں۔ ان تمام موقعوں پر ان سربرآوردہ خواتین کا چہرہ ڈھانپا ہوا تو نہیں ہوتا تھا۔ احکام القرآن میں ابن العرابی نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ اس زمانہ میں اور اس شریعت میں پردہ نہیں تھا؟ کس قدر کمزور جواب ہے، کیا پردے کی حکمت کے بارے میں جو دلائل آج دیے جاتے ہیں وہ اس شریعت پر لاگو نہیں ہوتے۔

خاتون کا دائرہ کار

مسلمان عورت کے دائرہ کار کے بارے میں کسی خاص دور کی سماجی روایات کو شریعت کا حصہ نہیں قرار دیا جا سکتا۔ شریعت کے قوانین فطرت کی مانند نہ فرسودہ ہوتے ہیں نہ بدلتے ہیں۔ کیونکہ ان کا سرچشمہ وحی الٰہی ہوتی ہے جبکہ سماجی روایات کو شریعت کا حصہ نہیں قرار دیا جا سکتا۔ شریعت کے قوانین کے ساتھ ساتھ ان کے عوامل مثلاً آمدن، خرچ، ثقافت اور تاریخ بدلتے رہتے ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ یہ روایات فرسودہ ہوتی جاتی ہیں۔ کسی مفید کام کا انتخاب کرنے کے لیے انسان پر کوئی فطری پابندی نہیں۔ صرف سوسائٹی کے خارجی حالات، لوگوں کے طور طریقے، رسم و رواج، عمودی ترقی کے ذرائع، افقی تحریک، سوجھ بوجھ اور انفرادی صلاحیتیں وہ اہم عوامل ہیں جو دائرہ کار کی حد بندی کرتی ہیں۔ جوں جوں لوگوں کے اقتصادی اور اجتماعی معیار میں تبدیلی پیدا ہوتی جاتی ہے توں توں معاشرے میں مرد و زن کا دائرہ کار بھی بدلتا جاتا ہے۔ نئے حالات نئی روایات کا تقاضا کرتے ہیں۔

دوسری جنگ عظیم میں جب نوجوان فوج میں بھرتی ہو گئے تو خواتین بہت سے ایسے کام کرنے لگ گئیں جو روایتی طور پر مردوں کے ساتھ مخصوص تھے۔ خواتین دیہات میں تو ہمیشہ سے کام کرتی ہیں اور کرتی رہیں گی۔ اب وہ کم و بیش تمام اداروں میں کام کرنے لگی ہیں۔ وہ سائنس دان ہیں مختلف چیزوں کی موجد ہیں اور چاند کی تسخیر میں بھی حصہ لے چکی ہیں۔ ماضی میں خواتین کے کام کرنے پر معاشرہ اعتراض کرتا تھا۔ اب ہر خاندان اپنے بیٹیوں کی حوصلہ افزائی کرتا ہے کہ وہ تعلیم حاصل کر کے نوکری کریں۔ نوجوان کارکن خاتون سے شادی کرنا پسند کرتے ہیں، اجتماعی روایات بدل چکی ہیں۔ کچھ خواتین ایسی ہوتی ہیں جن کے پاس نوکری کے علاوہ کوئی چارہ نہیں ہوتا جیسے بیوہ، مطلقہ یا وہ خواتین جن کے شوہر کی آمدنی خاندان کی ضروریات پوری نہیں کر سکتی، ایسی خواتین روزی کمانے کے لیے گھر سے باہر نکلتی ہیں اور ماں کی حیثیت سے اپنے فرائض بھی سرانجام دیتی ہیں۔

اس بات میں بحث کی کوئی گنجائش نہیں کہ مرد گھر گرہستی کے وہ تمام کام کر سکتا ہے، جو خاتون

Marfat.com

سرانجام دیتی ہے مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ عام زندگی سے ہٹ کر وہ ہر کام کرنے لگے اور اس بات میں بھی کوئی شک نہیں کہ خاتون زندگی کے وہ تمام کام کر سکتی ہے جو مرد کرتا ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ گھر گرہستی کا کام چھوڑ دے۔ مرد و زن میں جو حیاتیاتی امتیاز پایا جاتا ہے اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ایک، دوسرے کے کام کی صلاحیت نہیں رکھتا اور اس کا دائرہ کار الگ ہے۔ حیاتیاتی اختلاف فرد کے رویوں کو متعین نہیں کرتا۔ جب کسی معاشرے میں حالات بدلتے ہیں تو رویے بھی بدل جاتے ہیں۔ ہر صنف کے وجود میں مردانہ اور زنانہ دونوں خصوصیتیں پائی جاتی ہیں سرجری کے ذریعہ مرد خاتون بن جاتا ہے اور خاتون مرد۔ افراد یوں محسوس کرتے ہیں کہ وہ ایک ایسے جسم میں قید ہیں جو ان کا نہیں۔ حیاتیاتی طور پر وہ محسوس کرتے ہیں کہ ان کا تعلق ایک صنف سے ہے جبکہ نفسیاتی طور پر وہ دوسری صنف سے تعلق رکھتے ہیں۔

اس سلسلہ میں مصر کے ایک معروف فلسفی ادیب عباس محمود العقاد نے اپنی کتاب المرأۃ فی القرآن میں ایک حقیقت پسندانہ بات لکھی ہے، فرماتے ہیں: جن کاموں کو خواتین کی طرف منسوب کیا جاتا ہے مرد ان سے بڑھ گئے ہیں اور جن کاموں کو مردوں کے ساتھ مخصوص سمجھا جاتا ہے خواتین ان سے بڑھ گئی ہیں مثلاً جہاد میں خواتین کی شرکت تو تواتر سے ثابت ہے۔ جنگ حنین کے موقع پر رسول اکرم ﷺ اپنے قافلہ کے ساتھ دس، پندرہ خواتین کا ایک گروہ لے کر گئے تھے تاکہ وہ مرہم پٹی کر سکیں۔ یہ مہم کئی ماہ تک جاری رہی اور یہ خواتین اس عرصہ میں اسلامی لشکر کے ساتھ رہیں۔ خواتین کا کام صرف پانی پلانا، مرہم پٹی کرنا اور تیمارداری تک محدود نہ تھا بلکہ وہ عملی طور پر بھی جہاد میں حصہ لیتی تھیں۔

غزوہ حنین میں رسول اللہ ﷺ کے اردگرد جو مسلمان جمے رہے ان میں اُم سلیمؓ، اُم عمارہؓ، اُم سلیطؓ، اور اُم حارثؓ چار خواتین شامل تھیں۔ جہاد مسلمان خواتین پر واجب نہیں مگر ان کو شرکت کی ممانعت بھی نہیں۔ صاحب ہدایہ کا قول ہے اگر مسلم آبادی پر حملہ ہو جائے اور مردوں کی تعداد ناکافی ہو تو اس صورت میں خاتون خاوند کی اجازت کے بغیر جنگ کے لیے نکلے گی۔ اس بستی کے ہر مرد و زن پر جہاد واجب ہو گا۔ فقہ کا اصول ہے کہ کسی واجب کا موقوف علیہ بھی واجب ہوتا ہے۔ اگر جہاد واجب ہے تو اس

Marfat.com

کی تربیت بھی واجب ہوگی۔ ملٹری سائنس کے اس دور میں مسلمان خواتین کو اپنی حفاظت کے لیے تربیت نہ دینا ایک بہت بڑی غلطی ہے۔

خلافتِ راشدہ کے دور میں بھی خواتین ان کاموں میں حصہ لیتی رہیں جن کاموں میں وہ عہد نبوت میں شریک ہوتی تھیں۔ شفّا بنت عبداللہ عدویہ ایک دانشمند مہاجر خاتون تھیں، جنھوں نے رسول اللہ ﷺ کے ہاتھ پر بیعت کی ہوئی تھی۔ حضرت عمرؓ ان سے مشورہ لیتے تھے۔ حضرت عمرؓ نے ان کو بازار کے امور کا حاکم بنایا ہوا تھا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ امور جو عموماً مردوں کے سپرد ہوتے ہیں ان میں خواتین کو بھی مامور کیا جاسکتا ہے۔ اُم المومنین عائشہ صدیقہؓ نے جنگ جمل میں ایسے لشکر کی قیادت کی جس میں طلحہؓ اور زبیر جیسے عشرہ مبشرہ بھی شامل تھے۔ مقصد یہ ہے کہ جلیل القدر صحابہؓ نے ان کی قیادت کو تسلیم کیا۔ یہ سب روایات خاتون کے مخصوص دائرہ کار کی نفی کرتی ہیں۔ گھر سے باہر دائرہ کار کی تقسیم دیہات میں تو کبھی تھی ہی نہیں، اب شہروں میں بھی ختم ہو چکی ہے۔

ماضی میں خاتون کی صرف ایک ہی حیثیت تھی گھریلو ذمہ داری، اب اس کی دوسری حیثیت یعنی کارکن کی بھی پیدا ہوگئی ہے۔ اب شادی شدہ خواتین اپنے شوہروں کی رضامندی سے ملازمت کی طرف مائل ہو رہی ہیں۔ اگر والدین یا سرپرست اور شوہر، خواتین کو گھر سے باہر کام کرنے کی اجازت دیتے ہیں تو ہمیں اعتراض کا کیا حق حاصل ہے؟ وقت کے دباؤ کے تحت کٹر سے کٹر روایتی گھرانوں اور ملکوں میں دائرۂ کار کی تخصیص ختم ہو چکی ہے۔ دنیا کی موجودہ اقتصادی صورت حال میں کسی ملک کی نصف آبادی کو زندگی کے تمام میدانوں میں شریک ہونے سے روک دیا جائے تو ترقی کیسے ہوگی؟ دونوں کے مل کر کام کرنے سے ترقی ہوگی۔

Marfat.com

الإنس (انسان)

اِنس کے معنی انسان کی مانند بشر کے ہیں۔اس کے ایک بنیادی معنی ظہور کے ہیں اور یہ جن کی ضد ہے،جن کے بنیادی معنی چھپنے کے ہیں۔محاورے میں کہا جاتا ہے کہ آنست الشیئی یعنی میں نے اس چیز کو دیکھا۔اللہ کا قول ہے فَاِنْ آنَسْتُم مِّنْھُمْ رُشْداً ' (الانفال ۶:۴) یا اِنِّی آنَسْتُ نَاراً ' دوسرے بنیادی معنی وحشت کے برعکس اُنس کے ہیں۔ اُنس (محبت) نُفُوْر کی ضد ہے۔ اِنسی اِنس کی طرف منسوب ہے اور اِنسی اُسے کہا جاتا ہے جو بہت زیادہ مانوس ہو اور ہر وہ چیز جس سے اُنس کیا جائے اسے بھی اِنسی کہہ دیتے ہیں۔عرب جب نفس کے بارے میں سوال کرتے ہیں تو پوچھتے ہیں۔ کَیْفَ اِبنُ اِنْسِكَ؟ تمھارا نفس کیسا ہے؟ اِنس کی جمع اناسی قرآن مجید میں ہے وَاَنَاسِیَّ کَثِیْراً ' (۴۹:۲۵) (بہت سے آدمی)۔

الناس

بعض کے نزدیک الناس بھی اس کی جمع ہے۔جبکہ بعض کے خیال میں الناس اسم جمع ہے۔ قرآن حکیم میں اُناس (الیوسف ۶:۱۲) بھی نوع انسانی کے معنوں میں آیا ہے۔ بعض کے نزدیک الناس دراصل اُناس تھا جو اِنس کی جمع ہے۔کچھ لوگوں کا خیال ہے یہ دراصل اُناسی تھا۔کثرت استعمال سے آخری یا گر گئی پھر الاناس کا درمیانی حمزہ بھی تخفیفاً حذف کر دیا گیا اور الناس باقی رہ گیا۔

الانسان

یہ الناس سے اسم جنس ہے جس کا اطلاق مذکر و مؤنث اور واحد و جمع پر ہوتا ہے۔قرآن نے مرد اور عورت کے لیے انسان استعمال کیا ہے اور یہی لغت فصحی ہے۔آج کل عامیانہ زبان میں عورت کو انسانۃ کہا جاتا ہے۔بصرہ کے نحویوں کا قول ہے کہ یہ الانس سے مشتق ہے۔جن چیز سے اسے محبت ہوتی ہے وہ اسی سے مانوس ہو جاتا ہے اس لیے اسے انسان کہا جاتا ہے۔جبکہ کوفہ کے نحوی اِسے النسیان (بھول جانا) سے مشتق مانتے ہیں۔چونکہ وہ اپنے عہد کو بھول گیا تھا اس لیے اسے انسان کہا گیا ہے۔

امام راغب نے الانسان کی وجہ تسمیہ یوں بیان کی ہے 'انسان چونکہ فطرۃً ہی کچھ اس قسم کا واقع

Marfat.com

ہوا ہے کہ اس کی زندگی کا مزاج باہم اُنس اور میل جول کے بغیر نہیں بن سکتا۔ اس لیے اسے انسان کے نام سے موسوم کیا گیا ہے اور اسی بناء پر کہا گیا ہے کہ انسان مرد ہو یا عورت طبعی طور پر متمدن واقع ہوا ہے۔ کیونکہ وہ آپس میں میل جول کے بغیر نہیں رہ سکتا اور نہ ہی اکیلا ضروریات زندگی کا انتظام کر سکتا ہے۔ یہ تعریف جس طرح مرد پر لاگو ہوتی ہے بالکل اسی طرح عورت پر لاگو ہوتی ہے کیونکہ دونوں انسان ہیں۔

قرآن مجید میں انسان (مرد اور عورت) کی مشترکہ خوبیاں اور خامیاں

قرآن حکیم نے انسان کی کچھ فطری خامیاں اور خوبیاں بیان کی ہیں وہ ہر مرد اور عورت میں مساویانہ پائی جاتی ہیں مثلاً انسان کے بارے میں کہا گیا ہے' وہ کمزور پیدا کیا گیا ہے، وہ بڑا ہی ناشکر گزار ہے، وہ بے حد جھگڑالو ہے' انسان بڑا جلد باز واقع ہوا ہے، انسان بڑا خود غرض اور بخیل ہے' یہ بے صبرا بھی ہے اور ایسا لالچی بھی کہ اس کا پیٹ ہی نہیں بھرتا، وہ بڑا سرکش واقع ہوا ہے اور اللہ کی نعمتوں کا ناقدر شناس ہے، وہ ظالم اور جاہل ہے۔ ان خامیوں کا اطلاق مرد اور عورت دونوں پر ہوتا ہے۔ یہ وہ خصوصیات ہیں جو دونوں میں پائی جاتی ہیں۔ ان خامیوں کے ساتھ ساتھ قرآن کریم نے انسان کی خوبیاں بھی گنوائی ہیں' وہ صاحب عقل و دانش ہے، وہ اپنے نفس پر آپ دلیل ہے، وہ سخت کوشش کر کے اپنے رب کی طرف پہنچنے والا ہے، انسان کو بہترین صورت میں پیدا کیا گیا ہے، اور انسان کے لیے وہی کچھ ہے جس کی وہ کوشش کرتا ہے۔ یہ خوبیاں جس طرح مردوں میں پائی جاتی ہیں بالکل اسی طرح عورتوں میں بھی پائی جاتی ہیں۔ انھی خوبیوں کی بناء پر اللہ نے انسان کو اشرف المخلوقات کا اعزاز بخشا ہے۔ ان خوبیوں کو مرد کی طرف منسوب کرنا اور خامیوں کو عورتوں کی طرف منسوب کرنا فکر قرآنی کے منافی ہے۔ بدقسمتی سے ہمارے مفسر اور مذہبی پیشوا جب بھی عورت پر مرد کی فضیلت کا قصہ چھیڑتے ہیں تو عورت کو ناقص، کم عقل ناشکر گزار اور ناصبور ثابت کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگاتے ہیں اور اس بات کو قطعی نظر انداز کر دیتے ہیں کہ قرآن نے انسان کی کن خصوصیات اور صلاحیتوں کو بیان کیا ہے۔ دلیل کے طور پر وہ ایسی ضعیف اور جھوٹی حدیثوں کو پیش کرتے ہیں جن کے متعلق تصور بھی نہیں کیا جا سکتا ہے کہ وہ نبی کریم ﷺ جیسی انسان شناس ہستی کی زبان سے صادر ہوئی ہونگی۔

انسانی فطرت کے سلسلہ میں ایک بات ذہن میں رکھنی چاہیے کہ حق و باطل میں تمیز کرنے کی قوت جسے قرآنی اصطلاح میں نفس لوامہ (ضمیر کی آواز) کہا گیا ہے وہ ان اثرات سے متاثر ہوتی ہے جو انسان غیر شعوری طور پر وراثت، ماحول، تربیت اور تعلیم سے اخذ کرتا ہے۔ اقبالؒ کے الفاظ میں ضمیر Internalised Society کا نام ہے۔ انسانی بچہ جس قسم کی سوسائٹی میں آنکھ کھولتا اور پرورش پاتا

Marfat.com

ہے، وہ ویسا بن جاتا ہے۔ اس میں جس قسم کی عادات پیدا کر دی جائیں، وہی اس کے اعمال کی محرک بن جاتی ہیں۔ لیکن یہ عادات ایسی انمٹ نہیں ہوتیں کہ انھیں بدلا بھی نہ جاسکے۔ بچپن کے بعد اگر مثبت محرکات اچھی طرح پیدا کر دیے جائیں، تو ان سے ابتدائی ماحول کا تمام اثر زائل کیا جاسکتا ہے۔ اس طریقہ سے انسان کے اندر سیرت و کردار پیدا ہوتا ہے۔

اب ہم قرآن حکیم میں دیکھتے ہیں کہ اللہ نے انسان کے متعلق کیا کچھ کہا ہے؟ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: 'يُرِيدُ اللّٰهُ أَن يُخَفِّفَ عَنكُمْ وَخُلِقَ الْإِنسَانُ ضَعِيفًا' (النساء ۴:۲۸) 'اللہ تعالیٰ کو تمھارے ساتھ تخفیف منظور ہے اور انسان کمزور پیدا کیا گیا ہے'۔ اسلام نے مرد اور عورت کے جنسی تعلقات کو منظم کر کے خاندانی نظام کی بنیاد ڈالی ہے۔ سابقہ آیات میں ان احکام کو بیان کرنے کے بعد قرآن نے ان پر تنقیدی نظر ڈالی ہے اور اسلامی طریق کار کا موازنہ ان لوگوں کے طریق کار سے کیا ہے، جو جنسی معاملات میں قطعی آزادی کے قائل ہیں۔ انسان کے اندر کچھ جذبات اور احساسات پیدا کیے گئے ہیں، جن کے تقاضوں کو پورا کرنے سے اس کی زندگی برقرار رہتی ہے، لہٰذا ان جذبات کی تسکین انسانی زندگی کا تقاضا ہے۔ جذبات ہی وہ قوت ہیں جو انسانی عمل کے محرک بنتے ہیں انھیں اگر فنا کر دیا جائے تو انسان، انسان نہیں رہتا، پتھر بن جاتا ہے اور اگر انھیں دبا دیا جائے تو وہ اپنی تسکین کے لیے صحیح فطری راستہ بند پا کر غیر فطری راستوں سے سر نکالنا شروع کر دیتے ہیں۔ جسے علم النفس کی اصطلاح میں Perversion (کجروی) کہا جاتا ہے۔ مادی تصور حیات کی رو سے ان تقاضوں کو حیوانات کی طرح، جس طرح بھی چاہے، پورا کیا جاسکتا ہے۔ لیکن قرآنی تصور حیات کی رو سے ان تقاضوں کو ان پابندیوں کے دائرے کے اندر رہ کر پورا کیا جاتا ہے، جو وحی نے عائد کی ہیں مثلاً افزائش نسل کے لیے جنسی جذبات کی تسکین ضروری ہے۔ ایک شخص ان کی تسکین اپنی بیوی کے ساتھ جنسی ملاپ سے کرتا ہے، دوسرا ان کی تسکین کسی پاکدامن کی عصمت دری سے۔ ایک رویہ اپنے اندر خیر کا پہلو لیے ہوئے ہے اور دوسرا شر کا پہلو۔ اللہ نے جو پابندیاں عائد کی ہیں وہ فرد اور معاشرے کو پاکیزہ بنانے کے لیے ہیں۔ اللہ انسانوں کا ہاتھ پکڑ کر ان کو لغزشوں سے محفوظ رکھ کر زندگی کی راہیں ان کے لیے آسان بناتا ہے۔ جبکہ حرص و ہوا کے بندے فرد اور معاشرے کو تباہی کی دلدل میں دھکیلتے ہیں۔ بہت سے لوگ سمجھتے ہیں کہ اللہ کی عائد کی ہوئی پابندیاں تکلیف کا باعث ہیں اور مادہ پرستانہ نقطۂ نظر آسان اور لذت انگیز ہے۔ حالانکہ اس کا انجام فرد اور معاشرے کے لیے تباہ کن ہوتا ہے جبکہ اللہ کا بنایا ہوا راستہ آسان اور قابل عمل ہے۔ قرآنی تصور فطری جذبات کو دباتا نہیں بلکہ اس کے گرد وہ حفاظتی بند باندھ کر انسان کو بے راہ روی سے روکتا ہے۔ جو قومیں اپنے مردوں اور عورتوں کو آزاد چھوڑ دیں کہ وہ جنسی خواہشات کی تسکین جس طرح چاہے کریں، ان

Marfat.com

میں فکر و عمل کی قوت مفقود ہو جاتی ہے چنانچہ رومیوں کے ساتھ یہی ہوا۔ جو قوم جنسی جذبات کو بے محابا چھوڑ دیتی ہے وہ علم و بصیرت کی قوت سے محروم ہو جاتی ہے اور واقعات کے اسباب و علل کے متعلق کبھی تحقیق نہیں کرتی'۔ [J. D. Unwin (sex & culture)]

اس بات سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ جنسی جذبہ کی تسکین کا کسی قوم کی موت و حیات سے کس قدر گہرا تعلق ہے اور قرآن حکیم نے جو اس پر پابندیاں عائد کی ہیں، ان کی غرض و غایت کیا ہے؟

اس آیت میں نزول شریعت کی وجہ یہ بتائی گئی ہے کہ انسان کمزور پیدا کیا گیا ہے اور اپنی ہدایت کی مخفی راہوں پر خود اطلاع نہیں پا سکتا اس لیے اللہ تعالیٰ اپنے کلام کے ذریعہ سے اس کو ہدایات دیتا ہے۔ انسان اپنی خواہشات پر صبر نہیں کر سکتا اور نہ ہی اطاعت کے راستے کی مشقتوں کو برداشت کر سکتا ہے۔ اس میں اتنی طاقت نہیں کہ وہ خود بخود اپنے لیے حقیقی فلاح کے راستے بنا سکے بلکہ وہ ایک طاقتور ہستی کا محتاج ہے جو ہر شے کا عالم ہے اور ہر حکمت سے آگاہ ہے۔ انسان کا علم اور اس کی حکمت چونکہ بہت کمزور ہیں اس لیے اسے امداد کی ضرورت ہے۔ اس لیے اللہ نے خود احکام نازل کر کے اس کا بوجھ ہلکا کر دیا ہے۔

آیت زیر بحث میں ضعف سے مراد جسمانی ضعف نہیں بلکہ اس سے مراد وہ محرکات ہیں جو شہوت اور لذت پرستی پر آمادہ کرتے ہیں۔ کمزور آدمی اگر اللہ کی توفیق سے ان محرکات پر قابو پالے تو وہ قوی شمار ہوگا اور جسمانی طور پر قوی آدمی پر اگر یہ محرکات سوار ہو جائیں تو وہ کمزور شمار ہوگا۔ یہاں محرکات کی قوت اور ضعف مؤثر ہوگی نہ کہ جسمانی قوت اور ضعف۔ خلق الانسان ضعیفاً کے یہ معنی نہیں کہ اس میں شریعت پر عمل کرنے کی قوت نہیں۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ وہ شریعت کو اپنے لیے تجویز کرنے سے عاجز ہے یہی وہ بوجھ ہے جو اللہ تعالیٰ نے انسان کے اوپر سے ہلکا کیا ہے۔ آیت کے سیاق و سباق کے لحاظ سے یہی سادہ سا مفہوم درست معلوم ہوتا ہے لیکن مفسرین کے ذہن میں چونکہ مرد کی فضیلت صرف مرد ہونے کی وجہ سے بیٹھی ہوئی ہے اس لیے انھوں نے اس آیت کا عجیب مفہوم بیان کیا ہے۔ ان کی رائے میں یہاں انسان سے مراد مرد ہیں۔ ان کو ضعیف اس لیے کہا گیا ہے کیونکہ وہ عورتوں سے جماع کو ترک کرنے سے عاجز ہیں اور اس پر بے صبری کا اظہار کرتے ہیں۔ اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا گیا ہے کہ دنیا میں مرد کے لیے سب سے بڑا فتنہ عورت ہے۔ انھوں نے اس بیہودہ قول کو سعید بن مسیب جیسے جلیل القدر تابعی کی طرف منسوب کیا ہے۔ گویا کہ مرد کی بس ایک ہی برائی ہے اور وہ عورت کی وجہ سے ہے۔ اگر یہ خامی اس میں نہ ہوتی تو اللہ تعالیٰ شادی بیاہ کے احکام نازل ہی نہ کرتا۔ حالانکہ اگر بنظر غائر دیکھا جائے تو جنسی معاملات میں ہمیشہ مرد ہی زیادتی کے مرتکب ہوتے ہیں۔ وہ عورتوں کو خراب کرتے ہیں

Marfat.com

پھر ان پر تہمت لگاتے ہیں کہ وہ پیچھا نہیں چھوڑتیں۔ معاشرہ میں زنا بالجبر کے اور اغوا کے جتنے واقعات ہوتے ہیں ان کی ابتداء عام طور پر مردوں ہی کی جانب سے ہوتی ہے۔ حال ہی میں بلوچستان میں سوئی کے مقام پر ڈاکٹر شازیہ خالد کو اپنی ہوس کا نشانہ بنانے والے مرد تھے فتنہ تو وہ تھے نہ کہ ڈاکٹر شازیہ خالد۔ مرد اپنی بیویوں کو گھر میں بند کر کے پس پردہ رکھتے ہیں جبکہ دوسرے کی بیوی کو باہر نکال کر اس کی عصمت دری کرتے ہیں ایک فاسق و فاجر مرد ہی اپنے گھر والوں کو فسق و فجور سکھانے کا استاد ہوتا ہے۔

طبرانی نے حضرت جابرؓ سے روایت کی ہے: عِفّوا تعِفّ نساء کم و برّوا آباء کم تبرّ کم ابنائکم 'پاکباز بنو تمھاری عورتیں خود بخود پاک باز ہو جائیں گی۔ اپنے ماں باپ کے فرمانبردار بنو تمھاری اولاد خود بخود فرمانبردار بن جائے گی۔

اللہ تعالیٰ نے ان آیات میں مرد اور عورت کے جنسی تعلقات کے سلسلہ میں جو احکام بیان کیے ہیں ان کا اندازہ آپ اس روایت سے لگائیں جو بیہقی نے شعب الایمان میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت کی ہے کہ سورۃ نساء کی آٹھ آیات ان تمام چیزوں سے بہتر ہیں جن پر سورج طلوع اور غروب ہوتا ہے۔ ان آٹھ آیات میں انھوں نے یُرِیدُ اللّٰہُ لِیُبَیِّنَ لَکُمْ سے لیکر ضعیفاً تک آیت نمبر ۲۶، ۲۷ اور ۲۸ کی تین آیات کو شمار کیا ہے۔ آیت زیر بحث کا مفہوم اگرچہ وہی ہے جیسا کہ شیخ سعدی نے فرمایا:

ع۔ توانا بود ہر کہ دانا بود۔

لیکن یہ آیات ان لوگوں کی واضح تردید کرتی ہیں۔ جو مرد کی جسمانی قوت اور عورت کے جسمانی ضعف کے دعویدار ہیں۔ آیت بتاتی ہے کہ انسان خواہ مرد ہو یا عورت کمزور پیدا کیا گیا ہے۔ جسمانی قوت کوئی فضیلت کا معیار نہیں۔ کتنے جانور ہیں جو جسمانی طور پر مرد سے کئی گنا طاقتور ہیں کیا اس وجہ سے وہ فضیلت کا دعویٰ کر سکتے ہیں؟ پھر جسمانی قوت اور ضعف کوئی قدرِ مطلق نہیں ہے بلکہ ایک اضافی قدر ہے جس پر ماحول اور تربیت اثر انداز ہوتی ہے۔ کھیت میں مرد کے شانہ بشانہ کام کرنے والی، میلوں چل کر سر پر توازن کے ساتھ تین تین گھڑے اُٹھانے والی، سر پر چارے اور گھاس کی گٹھ اُٹھانے والی۔ سڑکوں پر روڑی کوٹنے والی اور سر پر نو، نو، دس، دس اینٹیں اُٹھا کر دوسری تیسری منزل پر چڑھنے والی عورت کو کون کمزور کہہ سکتا ہے؟ ہمارے مفسرین جب بھی مرد کی فضیلت کے گن گاتے ہیں تو جسمانی طاقت کا تذکرہ سرفہرست ہوتا ہے اور جو بات عورت کی صحت کی علامت ہے اور افزائش نسل کے لیے از بس ضروری ہے۔ اسے عورت کی کمزوری اور خامی تصور کیا جاتا ہے۔ میری مراد ماہواری اور حیض سے ہے۔

Marfat.com

ع بریں عقل و دانش بباید گریست۔

انسان کی خوبیوں اور خامیوں پر قرآنی نقطہ نظر بیان کرنے سے پہلے میں دو باتوں کی طرف توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں۔ پہلی بات یہ ہے کہ قرآن کریم میں جہاں جہاں لفظ انسان بیان ہوا ہے اس سے عموماً انسانوں کا ایک غالب حصہ مراد ہوتا ہے اور پوری نوع انسانی پر ایک حکم لگایا جاتا ہے۔ اس لفظ میں مرد بھی شامل ہوتے ہیں اور عورتیں بھی، مومن بھی اور کافر بھی۔ بعض اوقات سیاق و سباق میں اس بات کا قرینہ موجود ہوتا ہے کہ اس سے مراد ایک خاص انسان ہے۔ دوسری اہم بات یہ ہے کہ ان خصوصیتوں کو فطرت کا نام نہیں دیا جاسکتا کیونکہ فطرت اس بنیادی خصوصیت کو کہا جاتا ہے جو ناقابل تبدیل ہو۔ اگر اس خصوصیت کو فطرت کا نام دیا جائے تو رشد و ہدایت کا تمام سلسلہ بیکار ہو کر رہ جاتا ہے۔ جب فطرت کو بدلا ہی نہیں جاسکتا تو پھر انبیاء کی بعثت چہ معنی دارد؟ پھر فطرت ایک جبری کیفیت کا نام ہے جو انسان کی بنیادی خصوصیت اختیار و ارادہ سے متصادم ہے۔ یہ انسانی بچہ صاف اور سادہ لوح لے کر پیدا ہوتا ہے وہ جس قسم کے نقوش چاہے اس پر مرتسم کرسکتا ہے۔ علامہ اقبال کہتے ہیں:

ع تو اپنی سرنوشت خود اپنے قلم سے لکھ
خالی رکھی ہے خامۂ حق نے تیری جبیں

بچہ اپنے اندر کوئی خصوصیات لے کر نہیں آتا۔ اس میں جس قسم کی عادات پیدا کردی جائیں وہی اس کے اعمال کو تحریک دیتی ہیں لیکن یہ عادات انمٹ نہیں ہوتیں۔ بچپن کے بعد سیرت سازی کے ذریعہ اگر مثبت محرکات پیدا کر دیے جائیں تو ابتدائی ماحول کا اثر زائل ہو جاتا ہے۔ اب آیئے ان دوسری خصوصیات کی طرف جن کو قرآن نے انسان کی طرف منسوب کیا ہے۔

عجلت پسندی اور بے صبری

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: 'خُلِقَ الْاِنسَانُ مِنْ عَجَلٍ سَأُرِيكُمْ آيَاتِي فَلَا تَسْتَعْجِلُونِ' (الانبیاء ۲۱: ۳۷) 'انسان جلدی کا پتلا بنایا گیا ہے، میں عنقریب تمھیں اپنی نشانیاں دکھاؤں گا سو تم مجھ سے جلدی نہ کرو۔'

اس آیت مبارکہ میں الانسان سے مراد جنس انسان ہے۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو عجلت میں پیدا کیا ہے یا ایسے وقت پیدا کیا جب دن تھوڑا رہ گیا تھا۔ مراد صرف یہ ہے کہ انسان میں عجلت اس قدر ہے کہ گویا اسی سے پیدا ہوا ہے۔ لغت کی کتاب لسان العرب میں ہے کہ

Marfat.com

جب انسان میں ایک چیز بہت پائی جائے تو اہل عرب یوں کہتے ہیں خُلِقَتْ مِنهُ یعنی تو اسی سے پید اہوا ہے مثلاً خُلِقَتْ مِن لَعَب اسے کہیں گے جو کھیلتا بہت ہو۔سیاق بتا رہا ہے کہ یہی معنی مراد ہیں کیونکہ اللہ نے انسانوں کو جلد بازی سے منع فرمایا۔ اگر اس سے مراد اس کی سرشت ہوتی تو وہ اس سے رکنے پر کیسے قدرت رکھتا؟ پھر یہ مقام مذمت ہے اگر یہ فعل اللہ کا ہوتا تو اللہ اپنے ہی فعل کی مذمت کیسے کر سکتا ہے؟ پھر تو وہ قدر مطلق (Absolute Value) ہوتا جو غیر مبدل ہوتی ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ انسان اس قدر جلد باز ہے کہ وہ اللہ کا عذاب طلب کرنے میں بھی جلد بازی کرتا ہے پھر ان انسانوں سے خطاب ہے جو معجزات کی طلب میں جلد بازی کر رہے تھے اور پیغمبر سے مطالبہ کر رہے تھے کہ وہ دوسرے پیغمبروں کی مانند کوئی نشانی دکھائیں۔ اللہ ان کو کہہ رہا ہے جلدی نہ مچاؤ میں تمھیں اپنی نشانیاں دکھادوں گا۔

اسی مضمون کو اللہ تعالیٰ نے ایک اور مقام پر یوں بیان کیا ہے اِنَّ الْاِنسَانَ خُلِقَ هَلُوعًا o اِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ جَزُوعًا o وَاِذَا مَسَّهُ الْخَيْرُ مَنُوعًا o (المعارج ۷۰:۱۹تا۲۱) بیشک انسان بے صبر پیدا ہوا ہے جب اسے تکلیف پہنچتی ہے وہ واویلا کرتا ہے اور جب اسے بھلائی پہنچتی ہے تو (ہاتھ) روک لیتا ہے۔

هلع سے مراد تکلیف پہنچنے پر جلدی سے واویلا کرنا اور خوشحالی کے موقع پر جلدی سے ہاتھ روک لینا ہے۔ عرب نَاقَةٌ هِلْوَاع (تیز رفتار اونٹنی) کہتے ہیں۔ هلع کا اطلاق دو باتوں پر ہوتا ہے: ایک اس نفسیاتی کیفیت پر، جس کی وجہ سے انسان بے صبری اور گھبراہٹ کا اظہار کرتا ہے اور دوسرے اس ظاہری قول و فعل پر جو اس نفسیاتی حالت کا پتہ دیتے ہیں۔ نفسیاتی حالت بلاشبہ اللہ کی تخلیق ہے اسے ترک کرنا انسان کے بس میں نہیں مگر ظاہری قول و فعل چونکہ اختیاری امور ہیں اس لیے انسان انھیں ترک کرنے پر قدرت رکھتا ہے۔ جبکہ نفسیاتی حالت اضطراری طور پر اللہ کی پیدا کردہ ہے اسے چھوڑا نہیں جا سکتا۔ خُلِقَ هَلُوعًا سے مراد یہ نہیں کہ وہ اس وصف کے ساتھ پیدا ہوا ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ اللہ نے یہاں انسان کی مذمت کی ہے وہ اپنے فعل کی مذمت نہیں کر رہا۔ اس لیے اللہ نے اہل ایمان کو اس سے مستثنیٰ کر دیا ہے۔ آیت نمبر (الأنبيــاء ۲۱:۳۷) میں بتایا جا چکا ہے کہ یہاں خُلِقَ سے کیا مراد ہے چونکہ بے صبری اور بخل انسانوں میں کثرت سے پائے جاتے ہیں اور یہ خامیاں ان کے دل و دماغ میں اس طرح راسخ ہو گئی ہیں گویا کہ ایک پیدائشی اور غیر اختیاری بات ہو۔ دراصل اس آیت میں اس انسان کی تصویر کشی کی گئی ہے جس کا دل ایمان سے خالی ہو۔ جب انسان کا دل ایمان سے خالی ہوتا ہے تو حالات و واقعات اسے اس طرح اُڑائے پھرتے ہیں جس

Marfat.com

طرح ہوائیں خس و خاشاک کو اُڑائے پھرتی ہیں۔ ایک دائمی خوف اور پریشانی اس پر طاری رہتی ہے۔ ہاں مومن اس عیب پر قابو پا سکتے ہیں بشرطیکہ پابندی سے نماز پڑھتے رہیں، سائل و محروم کا حق نکالتے رہیں۔ اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرتے رہیں، اپنی امانتوں اور وعدوں کا پاس کرتے رہیں اور اپنی گواہیوں پر قائم رہیں۔ اگر وہ اس پروگرام پر عمل پیرا ہوں گے تو وہ بے صبری اور گھبراہٹ سے نجات پالیں گے۔

قرآن حکیم نے کئی ایک مقامات پر اس عیب اور اس سے پیدا ہونے والے نتائج کا ذکر کیا ہے کہ اس سلسلہ کی وہ آیت جس میں جلد بازی اور بے صبری کے نتیجہ میں پیدا ہونے والی حالت کا تفصیل سے ذکر کیا گیا وہ سورۃ سجدہ (۴۱) کی آیت ۴۹ تا ۵۱ میں حق تعالیٰ کا ارشاد ہے: 'انسان بھلائی کی دعا سے کبھی تھکتا نہیں اور اگر اسے تکلیف پہنچ جاتی ہے تو نا امید ہو کر آس توڑ بیٹھتا ہے۔ مگر جونہی ہم اس کو تکلیف کا وقت گزر جانے کے بعد اپنی رحمت کا مزہ چکھاتے ہیں تو کہنے لگتا ہے کہ میں اس کا مستحق ہوں اور میں نہیں خیال کرتا کہ قیامت کبھی قائم ہوگی لیکن اگر میں اپنے رب کی طرف لوٹایا بھی گیا تو میرے لیے اس کے ہاں یقینی بھلائی ہے۔ سو ہم کفر کرنے والوں کو ضرور بتا دیں گے کہ وہ کیا عمل کرتے رہے ہیں اور ہم انھیں سخت ترین عذاب کا مزہ چکھائیں گے اور جب ہم انسان کو کوئی نعمت عطا کرتے ہیں تو منہ موڑ لیتا اور اکڑ جاتا ہے اور جب کسی مصیبت اور شر میں مبتلا ہوتا ہے تو لمبی چوڑی دعائیں مانگنے لگتا ہے (السجدۃ ۴۱: ۴۹ تا ۵۱)۔

اس آیت میں الخیر سے مراد مال و دولت اور صحت و تندرستی ہے اور شر سے مراد فقر و فاقہ، خرابی صحت اور مرض ہے۔ انسان مایوس اور نا امید ہو جاتا ہے۔ دو طریقوں سے مبالغہ کے معنی پیدا کیے گئے ہیں ایک فَعُول کا وزن استعمال کر کے دوسرے مومن کے بعد قَنُوط کا تکرار لا کر۔ قَنُوط سے مراد یہ ہے کہ اس پر مایوسی کا اثر ظاہر ہو جاتا ہے۔ پہلے پر امید ہوتا ہے پھر شکستہ خاطر یعنی اللہ کے فضل اور اس کی رحمت سے مایوس ہو جاتا ہے۔ 'نای بجانبہ' یعنی پہلو پھیر لیا۔ اس شخص کے متعلق کہا جاتا ہے جو غرور کی وجہ سے اپنا منہ پھیر لیتا ہے یعنی وہ اپنے خالق کی عبادت اور دعا سے اعراض کرتا ہے۔ عریض کا لفظ اصل میں اجسام پر بولا جاتا ہے لیکن غیر اجسام کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔ یہ استعارہ ہے کثرت دعا اور اس کے دوام کے لیے عجلت پسندی کی وجہ سے انسان میں جو دوسری خامیاں پیدا ہو جاتی ہیں یہ ان کا تفصیلی بیان ہے۔

انسان اپنے لیے مال و دولت کی طلب سے کبھی تھکتا ہی نہیں لیکن بے صبری کا یہ عالم ہے کہ ذرا

Marfat.com

سے نقصان اور تکلیف کی وجہ سے اللہ کی رحمت سے مایوس ہو جاتا ہے۔ اگر نقصان کے بعد پھر فراوانی رزق عطا ہو تو سمجھتا ہے کہ یہ سب کچھ اس کی اپنی تدبیر اور علم و ہنر کا نتیجہ ہے۔ اس لیے یہ میرا حق ہے کسی دوسرے کا اس میں کوئی حصہ نہیں۔ وہ قانون مکافات کو تسلیم ہی نہیں کرتا اور کہتا ہے کہ اگر بفرض محال مجھے اللہ کے سامنے جانا ہی پڑا تو میرے لیے اس کے یہاں یقینی بھلائی ہے۔ اس لیے کہ اگر میں خدا کی نگاہوں میں اتنا ہی برا ہوتا تو مجھے دنیا میں کچھ نہ ملتا۔ اللہ تعالیٰ دھمکی دیتا ہے کہ جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں لاتے انھیں ہم سخت عذاب کا مزہ چکھائیں گے۔ جو انسان بھی وحی سے رہنمائی نہیں لیتا اس کا سینہ ایمان کے نور سے منور نہیں ہوتا۔ جب اسے زندگی کی آسائشیں نصیب ہوتی ہیں تو وہ اللہ سے منہ موڑ لیتا ہے اور جب کوئی تکلیف پہنچتی ہے لمبی چوڑی دعائیں مانگنے لگ جاتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح انعام کے وقت اعراض فعل مذموم ہے بالکل اسی طرح تکلیف کے وقت مایوسی فعل مذموم ہے۔ خواہ کتنی ہی مشکلات پیش آئیں انسان کو رحمت الٰہی سے مایوس نہیں ہونا چاہیے۔ اسی مضمون کو کم وبیش انھی الفاظ کے ساتھ قرآن حکیم کی آیات نمبر یونس ۱۰:۱۲؛ ھود ۱۱:۹؛ بنی اسرائیل ۱۷:۶۷، ۸۲؛ الزمر ۳۹:۸؛ الشوری ۴۲:۴۸ اور الزخرف ۴۳:۱۵ میں پیش کیا گیا ہے۔

عجلت پسندی انسان کو ایک اور غلط روش کا خوگر بنا دیتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ وَيَدْعُ الْإِنْسَانُ بِالشَّرِّ دُعَاءَهُ بِالْخَيْرِ ۖ وَكَانَ الْإِنْسَانُ عَجُولًا (بنی اسرائیل ۱۷:۱۱) 'انسان برائی کے لیے ایسے دعا کرتا ہے جس طرح بھلائی کے لیے کرتا ہے اور انسان جلد باز ہے'۔

اس کا ایک مطلب تو یہ ہے کہ انسان جس طرح اپنے لیے، اپنے مال اور اولاد کے لیے دعا میں جلدی کرتا ہے اسی طرح ان کے لیے بددعا میں بھی جلدی کرتا ہے۔ آج مسلمانوں کی یہ حالت ہے کہ ذرا، ذرا سی بات پر اپنے ہی عزیزوں کے لیے عذاب کی بددعا کرتے ہیں اور غصہ کی حالت میں اپنے بچوں کے لیے موت مانگتے ہیں۔ کسی کو اپنے بھائی سے ذرا سا اختلاف ہوتا ہے تو اس کے لیے بددعاؤں پر اتر آتا ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ ان کی دعا کی طرح بددعا کو قبول کر لے تو وہ سب برباد ہو جائیں۔ اللہ تعالیٰ چاہتا ہے اس کی رحمت کے طلب گار ہوں، اپنے لیے اور غیروں کے لیے دکھ اور تکلیف نہ چاہیں۔ اس سے یہ مراد بھی ہو سکتی ہے کہ انسان کسی چیز کے مانگنے میں مبالغہ آرائی کرتا ہے جو اس کے جی میں آتا ہے اسے مانگنے میں سرعت سے کام لیتا ہے اور سمجھتا ہے کہ یہ چیز اس کے حق میں بہتر ہے حالانکہ وہ چیز برائی کا سرچشمہ ہوتی ہے۔ وہ اپنی جہالت اور عجلت پسندی کی وجہ سے ایسا کرتا ہے اور صاحب بصیرت کی طرح غور وفکر نہیں کرتا۔ وہ معاملات کی ظاہری حالت سے دھوکا کھا

Marfat.com

جاتا ہے، معاملہ کی تہہ تک نہیں پہنچتا وہ یہ سب کچھ اس لیے کرتا ہے کیونکہ وہ پریشان ہو کر تنگی اور فراخی پر صبر سے کام نہیں لیتا۔

ایک اور مقام پر قرآن نے اس عجلت پسندی کے نتیجہ میں پیدا ہونے والی غلط سوچ کی تردید کی ہے ارشاد ربانی ہے۔ ' فَأَمَّا الْإِنسَانُ إِذَا مَا ابْتَلَاهُ رَبُّهُ فَأَكْرَمَهُ وَنَعَّمَهُ فَيَقُولُ رَبِّي أَكْرَمَنِ ٥ وَأَمَّا إِذَا مَا ابْتَلَاهُ فَقَدَرَ عَلَيْهِ رِزْقَهُ فَيَقُولُ رَبِّي أَهَانَنِ ٥ ' (الفجر ۸۹: ۱۵ تا ۱۶)۔ 'سو آدمی کو، جب اس کا رب آزماتا ہے یعنی اس کو انعام و اکرام دیتا ہے تو وہ (بطور فخر) کہتا ہے کہ میرے رب نے میری قدر بڑھادی اور جب اس کو (دوسری طرح) آزماتا ہے یعنی اس کی روزی اس پر تنگ کر دیتا ہے تو وہ (شکایتاً) کہتا ہے کہ میرے رب نے میری قدر گھٹادی'۔ اللہ تعالیٰ دونوں حالتوں میں انسان کی آزمائش کرتا ہے۔ جب اسے فراخی عطا ہوتی ہے تو اس کی آزمائش یہ ہوتی ہے آیا وہ شکر کرتا ہے یا کفران نعمت اور جب اس کا رزق تنگ کرتا ہے تو اس کی آزمائش یہ ہوتی ہے کہ آیا وہ صبر کرتا ہے یا گھبرا کر واویلا کرتا ہے؟ جبکہ انسان کا وتیرہ ہے کہ جب انعام ملے تو کہتا ہے میرے رب نے میری قدر افزائی کی ہے مجھے بڑا بنایا ہے چنانچہ غرباء کے ساتھ مل کر بیٹھنا یا ان کے ساتھ شامل ہونا اسے ناگوار معلوم ہوتا ہے اور جب رزق کم ملتا ہے تو اسے ذلت سمجھتا ہے حالانکہ اللہ کے یہاں نہ رزق کی کشائش عزت کی دلیل ہے اور نہ رزق کی تنگی ذلت کی۔ بلکہ یہ دونوں حالتیں اس کی آزمائش ہیں۔ اس کے شکر یا کفران نعمت، صبر و استقامت اور بے صبری کی آزمائش کے امتحان ہیں۔ انسان صرف دنیوی یا تونع کو اہمیت دیتا ہے اگر دنیا میں اسے راحت نصیب ہو تو وہ سمجھتا ہے کہ اللہ نے میری قدر بڑھادی اور اگر دنیا میں آرام نہ ملے تو سمجھتا ہے اللہ نے میری قدر گھٹادی، یعنی باوجود مستحق ہونے کے مجھے نظروں سے گرادیا ہے۔ مراد یہ ہے کہ وہ دنیوی نعمتوں کو مقصود بالذات سمجھتا ہے۔ اس کی فراخی کو مقبولیت کی دلیل اور اپنے آپ کو اس کا مستحق اور تنگی کو عدم مقبولیت کی دلیل اور اپنے آپ کو اس کا غیر مستحق سمجھتا ہے۔ یہ بات انسان کو آخرت کے انکار، کفران نعمت اور ترک صبر کی طرف لے جاتی ہے۔

انسان کی ایک اور خصوصیت، جس کی طرف قرآن مجید نے اشارہ کیا ہے وہ اس کا بخل اور تنگ دلی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: 'قُل لَّوْ أَنتُمْ تَمْلِكُونَ خَزَائِنَ رَحْمَةِ رَبِّي إِذًا لَّأَمْسَكْتُمْ خَشْيَةَ الْإِنفَاقِ ۚ وَكَانَ الْإِنسَانُ قَتُورًا' (بنی اسرائیل ۱۷: ۱۰۰)۔ 'آپ فرمادیجئے! اگر تم میرے رب کی رحمتوں کے خزانے کے مالک ہوتے تو تب تم ان کے خرچ ہو جانے کے ڈر سے انھیں

Marfat.com

روک رکھتے اور انسان ہے بڑا تنگ دل اور بخیل'۔ انسان کی طرح اللہ تعالیٰ بخیل نہیں وہ مال و دولت دنیا جہاں میں بانٹتا ہے پھر بھی اسے اپنے خزانوں کی کمی کا ڈر نہیں ہوتا۔ نہ اس خزانے میں کمی پیدا ہوتی ہے اور نہ اس کے ختم ہو جانے کا احتمال ہوتا ہے۔ اس کے برعکس انسان اس رحمت کو بانٹنے میں بخل سے کام لیتا ہے خواہ ڈھیروں مال و دولت کا مالک ہو۔ دوسروں کی شرکت کو گوارا نہیں کرتا بلکہ اس سے بھی بڑھ کر دوسروں کے لیے فقر و فاقہ کی تمنا کرتا ہے۔ یہ روش ان لوگوں کی ہوتی ہے جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتے۔ یہ لوگ مال و دولت کو حبِ ذات کی وجہ سے اپنے لیے سمیٹ رکھتے ہیں۔ دوسرے ضرورت مندوں کو دینا گوارا نہیں کرتے اور سمجھتے ہیں کہ اگر دوسروں کو شریک کر لیا تو ان کے لیے کیا بچے گا؟ نبی کریم ﷺ سے خطاب ہے کہ ان سے کہہ دو کہ یہ صرف ذہنیت کا فرق ہے تم دنیاوی زندگی کو پیش نظر رکھتے ہو اس لیے تمہاری یہ حالت ہے کہ اگر تمھارے پاس اللہ کی نعمتوں کے لامحدود خزانے بھی ہوتے تو تم پھر بھی ان کو خرچ نہ کرتے۔ دنیوی زندگی بخل اور تنگدستی پیدا کرتی ہے جبکہ آخرت کی حیاتِ ماوراِ قلب و نظر میں وسعت پیدا کرتی ہے۔

الاِقتار جیسا کہ قرآن مجید (الفرقان ۲۵:۶۷) میں ہے اسراف کی ضد ہے۔ اکثر لوگوں کی عادت ہے خواہ ان کے پاس دُنیا جہاں کی دولت ہو وہ اسے خرچ کرنے سے گریز کرتے ہیں جیسا کہ اللہ کے رسول کا فرمان ہے 'لَوْ كَانَ لِابْنِ آدَمَ وَادِيَانِ مِنْ ذَهَبٍ لَتَمَنّٰى ثَالِثًا' آدمی کے پاس سونے کی دو وادیاں ہوں تو وہ تیسری کی تمنا کرے گا' حالانکہ تیسری کی اسے ضرورت نہ تھی۔ انسان طماع ہے یہ خامی مردوں اور عورتوں میں یکساں موجود ہے لیکن یہ کوئی قدر مطلق نہیں (Absolute Value) جو انمٹ ہو۔ آخرت پر ایمان لانے سے اس پر قابو پایا جا سکتا ہے۔ یہ جو ہمارے ہاں مشہور ہے کہ مرد کا ہاتھ کھلا ہوتا ہے اور عورت تنگدل۔ یہ ایک سماجی مفروضہ ہے جو حکمت قرآن سے متصادم ہے۔

انسان کی ایک مشہور خامی جس کا وہ عملی زندگی میں مظاہرہ کرتا رہتا ہے اس کی جھگڑالو طبیعت ہے قرآن مجید میں اللہ کا ارشاد ہے: 'وَلَقَدْ صَرَّفْنَا فِي هٰذَا الْقُرْآنِ لِلنَّاسِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ وَكَانَ الْإِنْسَانُ أَكْثَرَ شَيْءٍ جَدَلًا' (الکہف ۱۸:۵۴)۔ 'ہم نے اس قرآن میں لوگوں کی ہدایت کے لیے ہر طرح کی مثالیں لوٹا لوٹا کر بیان کر دیں مگر انسان بڑا ہی جھگڑالو ہے'۔

اس مقام پر مرد اور عورت سمیت ایک انسان کو ایک شے سے تعبیر کیا گیا ہے محض اس لیے کہ اس کا غرور ٹوٹ جائے اور اس کے دماغ سے بڑائی کا تصور نکل جائے اور وہ محسوس کرے کہ وہ اللہ کی

Marfat.com

بے شمار مخلوق میں سے ایک مخلوق ہے اور ان تمام مخلوقات سے بڑھ کر جھگڑالو ہے۔ یہ جھگڑا اور یہ تکرار ایک رکاوٹ ہے، جو انسان کی عقل پر بند باندھ دیتی ہے جس کی وجہ سے وہ خیر و شر اور ظلمت و نور میں تمیز نہیں کر سکتا۔ اسی مقام پر گمراہوں کو ٹھوکر لگتی ہے اور ہلاک ہونے والے ہلاک ہو جاتے ہیں۔ اللہ فرماتا ہے کہ ہم نے حق کو طرح طرح کے پیرایوں میں بار بار بیان کیا ہے مگر اس کے باوجود انسان سے زیادہ تر جھگڑا ہی سرزد ہوتا ہے اور وہ اسے قبول کرنے کی بجائے کج بحثی کرتا چلا جاتا ہے۔

یہاں اس مفروضے کی طرف توجہ دلانا بے محل نہ ہوگا جس کو مرد کی فضیلت کے گن گانے والوں نے عام طور اور اور اپنے مفسرین کرام نے خاص طور پر بیان کیا ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ عورت بے زبان ہے اور اپنا مافی الضمیر بیان کرنے پر قدرت نہیں رکھتی۔ زیر نظر آیت اس مفروضے کی نفی کرتی ہے اور بتاتی ہے کہ انسان بشمول مرد و عورت بحث مباحثہ بہت کرتا ہے۔ مرد کے ثناخواں دلیل کے طور پر مندرجہ ذیل آیت پیش کرتے ہیں 'کیا اللہ کے حصہ میں وہ آیا ہے) جس کی نشوونما زیورات میں کی جاتی ہے اور بحث وجدال میں کھل کر بات نہیں کر سکتی' (الزخرف ۴۳:۱۸)۔ جیسا کہ مولانا امین احسن اصلاحی نے فرمایا ہے 'یہ اس احساس کی تعبیر ہے جو لڑکی کی ولادت کی خبر سن کر مشرکین کے دل میں پیدا ہوتا ہے یعنی وہ اس سوچ میں پڑ جاتے ہیں کیا وہ وجود میں آئی ہے جو زیور میں پلتی بڑھتی ہے اور بحث مباحثہ میں بے زبان ہے چنانچہ عورت پر یہ تبصرہ اللہ کی طرف سے نہیں، بلکہ اہل عرب کی طرف سے ہے'۔ دوسری اہم بات یہ ہے کہ یُنَشَّؤُا مجہول کے صیغے کے ساتھ استعمال ہوا ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ اس کی نشوونما اور تربیت اس طرح سے کی جاتی ہے۔ نشوونما کرنے والے اور تربیت دینے والے زمانۂ جاہلیت کے عرب ہیں۔ مراد یہ ہے، یہ اس کی فطرت نہیں بلکہ زمانۂ جاہلیت کی تربیت کا اثر ہے۔

سورۃ واقعہ میں صحیح تربیت یافتہ جنتی عورت کے متعلق اللہ کا ارشاد ہے: 'عُرُبًا اَتْرَابًا' (۵۶:۳۷) 'ہم سن اور صاف صاف بیان کرنے والیاں'۔ امام راغب کا قول ہے: 'اِمراۃ عروبۃ' ایسی عورت کو کہتے ہیں جو اپنی عفت اور خاوند کی محبت کے بارے میں اپنے حال کو وضاحت سے بیان کرنے والی ہو۔ زیر نظر آیہ کریمہ بھی اسی بات کی تائید کرتی ہے۔ اس کے علاوہ سورۃ رحمان کی آیت نمبر ۳ اس بارے میں قول فیصل ہے۔ اللہ کا ارشاد ہے: 'خلق الانسان عَلَّمَهُ البیان' (الرحمان ۵۵:۳ تا ۴) 'اللہ نے انسان کو پیدا کیا اور اسے بیان سکھایا' انسان یہاں پر عام ہے اس کا اطلاق مرد اور عورت دونوں پر ہوگا۔ صاحب کشاف کے قول کے مطابق، بیان اس فصیح و بلیغ گویائی کو کہتے ہیں جو مافی الضمیر کا اظہار

Marfat.com

کرے۔ مراد یہ ہے کہ اسے اظہار خیالات کا طریقہ سکھایا نطق کی بجائے بیان کا لفظ اس لیے اختیار کیا گیا کہ نطق صرف گویائی ہے۔ مگر بیان میں نطق، تحریر اور اشارے کنائے سب آجاتے ہیں۔ یہ اللہ کی نعمت ہے انسان کے کسی عمل کا نتیجہ نہیں۔ اللہ نے بیان کی قوت جس طرح مرد کو عطا کی ہے بعینہٖ اسی طرح یہ قوت عورت کو بھی عطا کی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو بااختیار بنایا ہے۔ اس کی شخصیت مستقل شخصیت ہے وہ کسی کا تابع مہمل نہیں۔ انسان خواہ مرد ہو یا عورت اللہ نے ان دونوں کو دل ودماغ کی صلاحیتیں مساویانہ عطا کی ہیں۔ ان میں سے ہر ایک اپنے عمل کا ذمہ دار ہے اور ان میں سے ہر ایک مساویانہ طور پر حقوق وفرائض کا مکلف ہے۔ اللہ کا قانون مکافات دونوں پر یکساں طور پر لاگو ہوتا ہے۔ مرد کی اپنی مستقل شخصیت ہے اور عورت کی اپنی۔ کوئی کسی کا تابع نہیں۔

ہر انسان (مرد ہو یا عورت) اپنے کیے کا ذمہ دار ہے

قرآن حکیم نے متعدد مقامات پر نیک وبد اعمال اور اس کے نتائج کا فلسفہ بیان کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: 'وَكُلَّ إِنسَانٍ أَلْزَمْنَاهُ طَائِرَهُ فِي عُنُقِهِ وَنُخْرِجُ لَهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ كِتَابًا يَلْقَاهُ مَنشُورًا' (بنی اسرائیل ۱۷:۱۳)۔ 'اور ہم نے ہر انسان کے عمل کو اس کی گردن میں ڈالا۔ قیامت کے دن ہم اس کے لیے (نامۂ اعمال کی) ایک کتاب نکال کر پیش کردیں گے۔ وہ اس کو اپنے سامنے کھلا ہوا پائے گا۔ اس حقیقت کو 'كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ رَهِينَةٌ' (المدثر ۷۴:۳۸) میں بیان کیا گیا ہے یعنی 'ہر شخص اپنے اعمال کے شکنجے میں جکڑا ہوا ہے'۔ عرب چونکہ دائیں سے بائیں جانب یا بائیں سے دائیں جانب گزرنے والے پرندوں سے شگون لیتے تھے تو اللہ نے ان کو بتا دیا کہ اللہ نے ہر انسان کے پرندے کو اس کے گلے میں ڈال دیا ہے خواہ وہ پرندہ منحوس ہو، اور مصیبت کا باعث بنے یا مبارک ہو اور سعادت کا باعث بنے۔ انسان کا اچھا یا برا عمل جو اڑ جاتا ہے یعنی اس کے ہاتھ سے نکل جاتا ہے اسے طائر (پرندے) سے تعبیر کیا گیا ہے کیونکہ جو کچھ انسان کرتا ہے وہ اس کے ہاتھ سے نکل جاتا ہے پھر اس کا اختیار اس پر نہیں رہتا۔ اس کا نتیجہ اس کے گلے کا ہار بنا دیا جاتا ہے جو اس سے الگ نہیں ہوسکتا۔ وہ نتیجہ کھلم کھلا بے شک یہاں نظر نہیں آتا مگر جب نتائج کے ظاہر ہونے کا وقت یعنی قیامت آئے گی تو اس کے لپٹے ہوئے عمل ایک کھلی کتاب کی شکل میں سامنے آجائیں گے۔

ایک اور مقام پر اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: 'وَأَن لَّيْسَ لِلْإِنسَانِ إِلَّا مَا سَعَىٰ' (النجم ۵۳:۳۹)۔ انسان، خواہ وہ مرد ہو یا عورت کو اس کے عمل کی جزا یا سزا ملے گی خواہ وہ عمل اچھا ہے یا برا۔ یہ ایک زریں اصول ہے جس پر دنیا وآخرت کی سعادت کا انحصار ہے۔ جو شخص چاہتا ہے کہ اسے دنیا یا آخرت میں کچھ نتائج ملیں وہ

Marfat.com

اس دنیا میں تگ ودو کرے۔ قوموں کی موت وحیات اور افراد کا عروج وزوال سب اس کی اپنی کاوش کا نتیجہ ہے۔ مقصد یہ ہے کہ جو زندگی میں آگے بڑھنا چاہے، آگے بڑھ سکتا ہے اور جو پیچھے رہنا چاہے، وہ پیچھے رہ سکتا ہے۔ مسلمان اس اصول سعی سے یکسر غافل ہیں۔ نہ دنیا میں اس اصول کو برتتے ہیں نہ دین میں۔ انسان کی زندگی میں خیر وشر کی کشمکش جاری رہتی ہے دیکھنا یہ ہے کہ اس میں اس کی روش کیا ہے؟

اللہ تعالیٰ نے مذکورہ آیات میں انسان کے لیے کچھ اصول اور پیمانے وضع کیے ہیں:

۱۔ کوئی بوجھ اُٹھانے والا انسان خواہ مرد ہو یا عورت کسی کا بوجھ نہیں اُٹھائے گا۔ ہر ایک کی اپنی اپنی ذمہ داری ہے۔

۲۔ انسان کو وہی نتائج ملیں گے جن کے لیے اس نے کوشش کی ہوگی جیسی جدوجہد ویسے نتائج۔

۳۔ کسی کی محنت رائیگاں نہیں جائے گی اس کا نتیجہ یقیناً سامنے آکر رہے گا۔

ہر انسان خواہ وہ مرد ہو یا عورت، کی زندگی میں خیر وشر کی کشمکش جاری ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ وہ اس کشمکش میں کیسے سرخرو ہوتا ہے؟ اس کشمکش میں مرد اور عورت برابر کے شریک ہیں۔ ان کے درمیان اعمال کے علاوہ کوئی وجہ فضیلت نہیں۔ ان میں سے ہر ایک برابر کا مکلف ہے۔ ہر ایک کو برابر کی جزا یا سزا ملے گی۔

قرآن نے انسان کی جن منفی خصوصیات کی طرف اشارہ کیا ہے ان میں چند نمایاں خصوصیات کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔ کچھ مثبت خصوصیات بھی ہیں جن کو قرآن حکیم نے انسان کی طرف منسوب کیا ہے۔ یہ خصوصیات بھی منفی خصوصیات کی طرح انسان، خواہ مرد ہو یا عورت، میں یکساں پائی جاتی ہیں۔ ان میں سے بعض خصوصیات کو مرد کی طرف منسوب کرنا اور بعض کو عورت کی طرف منسوب کرنا حکمت قرآنی کے منافی ہے۔ مثلاً مرد کی فضیلت ثابت کرنے کے لیے ہمارے بعض مفسر اور مذہبی پیشوا یہ کہتے تھکتے نہیں کہ عورت کم عقل، عجلت پسند اور ناقدر شناس ہوتی ہے۔ اس سوچ کو نہ عقل تسلیم کرتی ہے اور نہ اللہ کی کتاب۔ خالق کائنات انسان کی فطرت کو مرد کے ان ثنا خوانوں سے بہتر سمجھتا ہے پھر یہ اقدار مطلق اقدار نہیں جو غیر مبدل ہوتی ہیں بلکہ یہ اضافی اقدار ہیں جن میں خارجی عوامل مثلاً ماحول اور تعلیم وتربیت کے زیر اثر ان میں کمی بیشی ہوتی رہتی ہے۔

انسان کی عظمت وتکریم ایک ایسی خصوصیت ہے جس کو قرآن حکیم نے کئی ایک مقامات پر بیان کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: یٰٓاَیُّهَا الْاِنْسَانُ مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الْكَرِیْمِ ٥ الَّذِیْ خَلَقَكَ

Marfat.com

فَسَوّٰكَ فَعَدَلَكَ o فِیْٓ اَیِّ صُوْرَةٍ مَّا شَاۗءَ رَكَّبَكَ o' (الطارق ۸۲:۶-۸) 'اے انسان! تجھے اپنے رب کریم کے بارے میں کس چیز نے دھوکا دیا۔ جس نے تجھے پیدا کیا پھر ٹھیک ٹھیک درست کر دیا پھر (تمھارے ظاہری اور باطنی قویٰ میں) اعتدال تناسب ملحوظ رکھ کر جس صورت میں چاہا، تجھے ترکیب دے دیا'۔ اس آیہ مبارکہ میں عدل کا اشارہ اعتدال کی طرف ہے اور تسویہ کا اشارہ کمال کی طرف۔ غَرَّكَ میں اس بات کی طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ جس انسان کو ایسے کمال کی حالت پر پیدا کیا وہ اللہ کے احکام کی اطاعت نہیں کرتا اور اپنی غرض صرف کھانے پینے تک محدود سمجھتا ہے۔ ما کا حرف تفخیم (تعظیم) کے لیے ہے اور اس صانع کی قدرت کی طرف اشارہ کرتا ہے جس نے انسان کے چھوٹے سے جسم میں ظاہری اور باطنی صلاحیتیں رکھ دی ہیں اور ربك الكريم میں اس بات کا اشارہ ہے کہ تمھارے رب نے تمھیں شرف وعظمت عطا کی ہے۔

اس مضمون کو قرآن مجید میں یوں بیان کیا گیا ہے: 'لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْٓ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ' (التین ۹۵:۴) 'بے شک ہم نے انسان کو بہترین حالت عدل پر پیدا کیا'۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کی ساخت ایک بہترین مقصد کے لیے بالکل مناسب بنائی ہے اس کا تسویہ (ہمواری) ایسے موزوں اور مناسب سانچے پر فرمایا ہے کہ وہ اس قابل ہوا کہ اس میں اپنی روح پھونک دے۔ تقویم کی تفسیر میں قاضی بیضاوی فرماتے ہیں: 'تقویم کے معنی تعدیل کے ہیں اور اس سے مراد یہ ہے کہ کیا بلحاظ حسن صورت اور کیا بلحاظ بلندی قامت انسان تمام ممکنات کی تمثیل اور کل کائنات کے خواص کا مجموعہ ہے'۔ جو اوصاف فرداً فرداً دوسری مخلوقات میں موجود ہیں وہ سب وجود انسانی میں پائے جاتے ہیں مثلاً حیوان کی حرکت، ارادہ اور انتقام، نباتات کی نشوونما اور ملائکہ کی اطاعت، عقل وادراک ان سب پر مستزاد ہے۔ امام رازی فرماتے ہیں 'تقویم کے معنی کسی شے کو ایسی حالت پر پیدا کرنا ہے جیسے تالیف وتعدیل میں اسے ہونا چاہیے۔ جب کوئی چیز چند چیزوں سے ترتیب دے کر بنائی گئی ہو اور وہ ٹھیک ٹھاک ہو تو ایسے موقع پر عرب کہتے ہیں۔ 'قَوَّمْتُه تَقْوِیماً فَاسْتَقَامَ وَ تَقَوَّمَ'۔ 'میں نے اسے سیدھا کیا اور وہ سیدھا ہو گیا'۔ انھوں نے اصم کا قول نقل کیا ہے کہ 'وہ عقل وفہم اور علم وادب میں کامل ترین ہے'۔ تقویم کا اطلاق صورت پر بھی ہوتا ہے اور سیرت پر بھی۔ احسن تقویم میں فطرت اور استعداد شامل ہیں۔ جسمانی ساخت کے لحاظ سے بھی کامل اور عقلی وروحانی لحاظ سے بھی کامل۔

ایک آیہ کریمہ میں ارشاد ربانی ہے: 'وَصَوَّرَكُمْ فَاَحْسَنَ صُوَرَكُمْ' (غافر ۴۰:۶۴؛ التغابن ۶۴:۳) 'اس نے تمھاری صورتیں بنائیں سو بہترین صورتیں بنائیں'۔ راغب اصفہانی کا قول ہے 'صورت

Marfat.com

سے انسان کی وہ شکل اور ہیئت مراد ہے جس کا بصر اور بصیرت دونوں سے ادراک ہو سکتا ہے'۔
صورت سے مراد صرف جسمانی خدوخال نہیں بلکہ عقل وادراک کی صورت بھی ہے۔

انسان کی صورت وسیرت کی انھی خوبیوں کی وجہ سے اللہ نے بنی آدم کو عزت عطا کی ہے۔ ارشادِ ربانی ہے: 'وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْ آدَمَ ' (بنی اسرائیل ۱۷: ۷) 'ہم نے اولادِ آدم کو عزت عطا کی'۔ اور یہاں سب بنی آدم کو عزت و بزرگی دینے کا ذکر ہے اور یہ بحیثیت مخلوق کے بمقابلہ دوسری مخلوق کے ہے۔ اس عزت و بزرگی پر مردوں کی تخصیص نہیں بلکہ عورتوں کو بھی وہ عزت وتکریم ملی ہے جو مردوں کو ملی ہے۔ اللہ نے ان کو بھی ظاہری اور باطنی خوبیوں کے ساتھ پیدا کیا ہے۔ ان کو بھی عقل وادراک کی وہی خوبیاں خالق نے عطا کی ہیں جو مرد کو عطا کی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ہر انسان خواہ وہ مرد ہو یا عورت کے اندر ایک ایسی صلاحیت رکھی ہے جو اس کو نیکی اور بدی کا راستہ بتاتی رہتی ہے۔ اسے قرآنی تعبیر میں نفس لوامہ کہا گیا ہے اور سورۃ قیامہ میں اللہ نے اسی نفس لوامہ کی قسم کھائی ہے گویا کہ اللہ نے انسان کے اندر ایک نگران رکھا ہے۔ جو اس کے اعمال کے ذریعہ سے اس کی نگرانی کرتا رہتا ہے اور یہی اعمال انسان کے خلاف گواہی دیں گے۔ خواہ اس کی عقل حیلہ ساز کتنے عذر بہانے تلاش کرے، ان بہانوں کا کچھ اعتبار نہ ہوگا۔ بلکہ اعتبار ہوگا تو اس کے اعمال کا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: 'بَلِ الْإِنْسَانُ عَلٰى نَفْسِهٖ بَصِيْرَةٌ ' (القیامۃ ۷۵: ۱۴) 'بلکہ انسان اپنے نفس پر آپ دلیل ہے گو وہ اپنے عذر پیش کرے'۔ بالکل یہی مضمون دوسرے مقام پر یوں بیان ہوا ہے: 'اِقْرَاْ كِتٰبَكَ كَفٰى بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيْبًا ' (بنی اسرائیل ۱۷: ۱۴) 'اپنا نامہء اعمال پڑھ لے آج تو خود ہی اپنا حساب لینے کے لیے کافی ہے'۔ اس میں اس حقیقت کو آشکار کر دیا گیا ہے کہ نفس کی حالت ہی سب کچھ ظاہر کر دے گی۔ اس نفس کے ہوتے ہوئے اسے کچھ بتانے کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔ کیونکہ اس کے اعمال اس کے خلاف گواہی دیں گے اور اس کے اعضاء سب کچھ کہہ دیں گے جیسا کہ ارشاد ربانی ہے: 'يَوْمَ تَشْهَدُ عَلَيْهِمْ اَلْسِنَتُهُمْ وَاَيْدِيْهِمْ وَاَرْجُلُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ' (النور ۲۴: ۲۴) 'جس دن ان کی زبانیں اور ان کے ہاتھ اور ان کے پاؤں اس کی گواہی دیں گے جو وہ کرتے تھے'۔

ہر انسان نفسِ لوامہ کی رہنمائی میں اپنی عقل کے ذریعہ سمجھ لیتا ہے کہ وہ اعمال، جو قرب الٰہی اور اطاعت الٰہی میں مشغول رکھتے ہیں، عین سعادت ہیں اور وہ کام جو اسے اللہ سے دور لے جا کر صرف دنیا کی لذتوں میں مشغول رکھتے ہیں عین شقاوت ہیں۔ اس کے لیے نہ کسی خارجی گواہی کی ضرورت ہوگی اور نہ بیرونی ثبوت کی ضرورت۔ انسان اپنے خلاف آپ دلیل ہوگا۔ اس کی ذات اس کا اعمال

Marfat.com

نامہ ہوگی۔ خواہ وہ زبانی کلامی اپنے گناہوں کا عذر پیش کرے اور حقیقت پر پردہ ڈالنے کی کاوش کرے۔ اس کے خلاف اس کے نفس کی شہادت اعمال کی شکل میں زیادہ قابل قبول ہوگی اور اس کا عذر قبول نہیں ہوگا۔ اس وقت اس کے تمام اعمال بے نقاب ہوکر سامنے آجائیں گے اور کسی قسم کا کوئی بہانہ کام نہیں آئے گا۔

مرد اور عورت دونوں کا نفس لوامہ ان کا نگران ہے۔ دونوں پر واجب ہے کہ وہ اس نفس کو خیر کی طرف راغب کریں۔ دونوں میں سے جو کوئی اسے شر کی طرف لے جائے گا وہ اس کے خلاف واضح حجت بن جائے گا۔ اس بات سے اس مفروضے کی تردید ہوتی ہے کہ سب سے بڑا فتنہ عورت کا فتنہ ہے۔ مرد اور عورت کے فتنہ ہونے کے برابر کے امکانات ہیں۔

انسان کی ایک بہت بڑی خوبی یہ ہے کہ اللہ نے انسان کے نفس کو علم حاصل کرنے کی استعداد عطا کی۔ جو اُسے دوسرے حیوانوں سے ممتاز کرتی ہے اور یہ بھی اللہ کا فضل و کرم ہے کہ قلم جیسی جامد چیز کو علم و عرفان کا آلہ بنایا۔ ارشاد ربانی ہے: 'الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ○ عَلَّمَ الْاِنسَانَ مَا لَمْ یَعْلَمْ ○' (العلق ۹۶:۴ تا ۵) 'جس نے قلم سے تعلیم دی اور انسان کو ان باتوں کی تعلیم دی جن کو وہ جانتا نہ تھا'۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو جہالت کی تاریکیوں سے نکال کر علم کی روشنی عطا کی اور قلم کو علم و معرفت کا ذریعہ بنا کر انسان پر علوم و معارف کے خزانے کھول دیے۔ اگر قلم نہ ہوتا تو علوم محفوظ نہ رہتے اور بعد میں آنے والے پہلے لوگوں کے علوم و فنون سے محروم رہتے۔ کتابیں جو قلم کا ثمرہ ہیں علم کا ایک ایسا ورثہ چھوڑتی ہیں جو نسل در نسل منتقل ہوتا رہتا ہے۔ ان کے ذریعے سے انسان کو ایسی چیزوں کا علم ہوتا ہے جن کو وہ جانتا تک نہیں۔ عام انسان کی اصل ترقی اسی وقت سے شروع ہوتی ہے جب سے اس نے قلم کا استعمال شروع کیا۔ گویا انسان کی ساری ترقیوں کی جڑ پڑھنا اور لکھنا ہے اس طرح علم و معرفت میں وسعت ہوتی رہتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان ترقی پذیر ہے اور آگے کی طرف رواں دواں ہے۔ بعد میں آنے والے پہلے لوگوں کے علم کی رہنمائی میں نئی راہیں تلاش کرتے ہیں لوگوں کے جسم تو فنا ہوجاتے ہیں مگر افکار زندہ رہتے ہیں۔ تحریر کے ذریعے اپنے خیالات و افکار دور دور تک پہنچا کر انسان ایک دوسرے کے قریب ہوجاتے ہیں اور اس طرح وحدت انسانی کی راہ ہموار ہوجاتی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے علم کی جو استعداد انسان کو عطا کی ہے اس میں مرد اور عورت دونوں برابر ہیں۔ علم میں جنسی تمیز فطرت کے منافی ہے۔ ہر وہ علم جو مرد حاصل کرسکتا ہے عورت بھی حاصل کرسکتی ہے بلکہ دورِ حاضر میں یہ ثابت ہوگیا ہے کہ وہ اپنی محنت اور لگن سے مرد سے آگے نکل سکتی ہے۔ علم کو مرد اور

Marfat.com

عورت کے خانوں میں بانٹنا مناسب نہیں۔ علم خواہ دینی، سماجی اور فنی ہو حقیقت تک پہنچنے کا ایک ذریعہ ہے عورت کو بھی حقیقت تک پہنچنے کی اتنی ہی ضرورت ہے جتنی مرد کو، کیونکہ دونوں انسان ہیں دونوں کے پاس عقل، جذبات اور احساسات ہیں۔

انسان کیا مرد اور کیا عورت اپنی جسمانی ساخت کے لحاظ سے اجرام فلکی کے مقابلے میں بہت کمزور واقع ہوا ہے لیکن وہ صاحب اختیار و ارادہ ہے اور اللہ نے اسے ایسی صلاحیتیں عطا کی ہیں جو کائنات میں کسی مخلوق کو حاصل نہیں۔ اسی صلاحیت کے پیشِ نظر اس نے اس بار امانت کو اپنے کندھوں پر اُٹھانا قبول کیا۔ جو اللہ نے اس کے سپرد کیا ہے۔ تاکہ وہ اپنی جدوجہد اور قوت بازو سے اس امانت کی حفاظت کرے۔ جو انسان امانت کی پوری طرح حفاظت کریں اللہ ان کو انعام و اکرام سے نوازتا ہے اور جو غفلت یا شرارت سے اسے ضائع کر دیں، ان کو سزا دیتا ہے۔ اسی مضمون کو قرآن حکیم نے بلیغ انداز میں یوں پیش کیا ہے: 'إِنَّا عَرَضْنَا الْأَمَانَةَ عَلَى السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَالْجِبَالِ فَأَبَيْنَ أَن يَحْمِلْنَهَا وَأَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْإِنسَانُ إِنَّهُ كَانَ ظَلُومًا جَهُولًا' (الأحزاب ۳۳:۷۲) 'ہم نے امانت کو آسمانوں اور زمین اور پہاڑوں پر پیش کیا تو انھوں نے انکار کیا کہ اس کا بوجھ اُٹھائیں اور اس سے ڈرے اور انسان نے اس کا بوجھ اُٹھایا۔ وہ بڑا ظالم بڑا جاہل ہے'۔ آیۂ مبارکہ میں امانت سے مراد وہ فرائض و واجبات ہیں جو اللہ نے اپنے بندوں پر عائد کیے ہیں۔ امانت کیا ہے؟ اپنی خواہش کو روک کر پرائی چیز رکھنا۔ اس پرائی چیز یعنی احکام کو اپنے من کی خواہش کے خلاف تھامنا بڑی ہمت کا کام ہے۔ اس کا انجام یہ ہے کہ امانت کی حفاظت میں کوتاہی کرنے والوں کو سزا دی جاتی ہے اور اس کی حفاظت کرنے والوں کو نوازا جاتا ہے۔ انسانی ذمہ داریوں کا اصل سبب احساس، ادراک اور ارادہ ہے اسلام میں ان ذمہ داریوں کا شرعی نام تکلیف ہے۔ یہ تکلیف انسان کے اندرونی اور بیرونی قوتوں کے مطابق عائد ہوتی ہے۔ یہی تکلیف آیۂ مذکورہ میں امانت کے لفظ سے وارد ہوئی ہے۔ حضرت حذیفہ سے مروی حدیث اسی مفہوم کی تائید کرتی ہے۔ الفاظ یہ ہیں: 'إِنَّ الْأَمَانَةَ نَزَلَتْ مِنَ السَّمَاءِ فِي جِذْرِ قُلُوبِ الرِّجَالِ ثُمَّ عَلِمُوا مِنَ الْقُرآنِ' 'بیشک اس امانت کو اللہ کی طرف سے لوگوں کے دلوں میں تہ نشین کیا گیا ہے پھر ان کو اس کا علم قرآن سے حاصل ہوا'۔ انسان زمین و آسمان اور پہاڑوں جیسی بھاری بھرکم مخلوق کے درمیان زندگی گزار رہا ہے۔ یہ مخلوق بغیر شعور اور اختیار کے اپنے فرائض سرانجام دے رہی ہے۔ وہ احساس، ادراک اور ارادہ سے محروم ہونے کی وجہ سے ہر قسم کی ذمہ داریوں سے آزاد ہے۔ یہ مخلوق فطری عدم صلاحیت کی بنیاد پر یہ

Marfat.com

ذمہ داریاں اُٹھا نہیں سکتی۔ زبانِ حال سے یہی اس کا انکار ہے۔

؎ آسمان بارِ امانت نتوانست کشید
قرعہ فال بنام من دیوانہ زدند

نہ زمین کو اوپر چڑھنے کے لیے کہا جا سکتا ہے اور نہ آسمان کو نیچے اُترنے کے لیے اور نہ ہی پہاڑوں سے چلنے کا مطالبہ کیا جا سکتا ہے کیونکہ وہ ایسے ہی ہیں جیسے فطرت نے ان کو پیدا کیا ہے وہ ناموس فطرت سے سرِ مو انحراف نہیں کر سکتے۔ مگر انسان نے اپنے ادراک اور شعور سے اللہ کی معرفت حاصل کی ہے۔ وہ اپنے ارادہ سے اللہ کے احکام کی اطاعت کر رہا ہے۔ وہ خواہشات، شہوات، جذبات و احساسات کے طوفان میں گھرا ہوا ہے۔ اس طوفان کا مقابلہ کر کے اسے بارِ امانت کو اُٹھانا ہے۔ اس نے جو راہ اختیار کی ہے وہ اچھی طرح جانتا ہے کہ یہ راہ اسے کہاں لے جائے گی۔ یہ بہت بڑی امانت ہے جس کا بوجھ انسان جیسی ناتواں مخلوق نے اپنے کندھوں پر اُٹھانے کا خطرہ مول لیا ہے۔ لیکن جب وہ اپنی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہوتا ہے اور اپنے رب کی مکمل اطاعت کرنے لگتا ہے اور اس کی خواہشات اس کے راستے میں حائل نہیں ہوتیں تو وہ آسمانوں سے بلند، زمین سے وسیع اور پہاڑوں سے زیادہ مضبوط ہو جاتا ہے اور وہ تمام مخلوقات سے ممتاز ہو کر وہ مقام بلند حاصل کر لیتا ہے جس کی خاطر اللہ نے فرشتوں کو آدم کے سامنے سجدہ ریز ہونے کا حکم دیا تھا اور اعلان کیا تھا 'ولقد کرمنا بنی آدم'۔ امام رازی تفسیر کبیر میں فرماتے ہیں کہ انسان نے اس بارِ امانت کو قبول کرتے وقت دیکھا کہ جو ذات یہ امانت اس کے حوالے کر رہی ہے وہ عالم بھی ہے اور قادر بھی۔ وہ امانت اس کے سپرد کر رہی ہے جو اُسے اُٹھانے کا اہل ہے اور امانت سپرد کرتے وقت وہ اس کی حفاظت بھی کرے گا اور اس کی مدد بھی۔ اسی امید پر انسان نے اس امانت کو قبول کیا'۔ اسے ظلوم اس لیے کہا کہ جو بوجھ وہ قبول کر رہا ہے وہ بہت ہی بڑا بوجھ ہے۔ شاہ ولی اللہ کے الفاظ میں 'اس نے اپنی جان پر ترس نہ کھایا اور جہول اس لیے کہا گیا ہے کہ وہ نافرمانی کی صورت میں اس کی سزا سے ناآشنا ہے۔ اللہ نے انسان کی بھی دو صفات کا ذکر کیا ہے یعنی ظلوم وجہول۔ اور اپنی بھی دو صفات کا یعنی کان اللہ غفوراً رحیما یعنی ظلوم کو بخشنے والا اور جہول پر رحم کھانے والا۔

ظلوم وجہول کی تفسیر میں مولانا آزاد نے اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے: 'ظلوم کا مقابل عادل ہے اور جہول کا مقابل عالم۔ انسان ہی ایک ایسی مخلوق ہے جو بالفعل عدل اور علم کے اوصاف سے متصف ہی نہیں بلکہ اس میں عدل وعلم کے ساتھ متصف ہونے کی صلاحیت بدرجہ اتم موجود ہے۔ ظلم انسان کی عملی

Marfat.com

قوت کی بے اعتدالی اور جہالت اس کی عقلی قوت کی بے اعتدالی کا نام ہے۔ قرآن کی اصطلاح میں عدل کا دوسرا نام عمل صالح اور علم کا دوسرا نام ایمان ہے۔ انسان کے بننے اور بگڑنے کی ساری حکایتیں ظلم و جہل یعنی عمل صالح اور ایمان کی دو رنگیوں سے بھری پڑی ہیں۔ ایک طرف ظلم و جہل شر اور تاریکی، اور دوسری طرف عدل و عمل صالح، خیر اور نور کی حکایت ہے۔ جن افراد نے ان انسانی ذمہ داریوں کو قبول کیا، ان کی تعریف کی گئی ہے اور جنھوں نے اس سے انکار کیا، ان کی برائی بیان کی گئی ہے۔ تاکہ ہر انسان نفاق و بغاوت کی صورت میں اللہ کے غضب اور اطاعت و فرمانبرداری کی صورت میں اللہ کے انعام کا مظہر بن سکے اور تاکہ ہر قوم ظلم، شر اور کفر کے برے نتیجوں سے بچ کر عدل، خیر اور ایمان کی مثالوں سے فائدہ اُٹھا سکے۔ اگلی آیت میں 'لِيُعَذِّبَ اللہ المنافقین' میں بھی اسی بات کی طرف اشارہ ہے کہ انسان اپنے اختیار کے انجام کا بوجھ اُٹھائے اور اپنے عمل کی سزا بھگتے۔ یہاں اس بات کی طرف بھی واضح اشارہ کر دیا گیا ہے کہ مرد اور عورت دونوں یہ بوجھ اُٹھانے کے اہل ہیں اور دونوں نے مل جل کر یہ بوجھ اُٹھانا ہے اور دونوں ہی نے مل جل کر شر کی سزا بھگتنی ہے اور مل جل کر خیر کی جزا حاصل کرنی ہے۔ آیۂ مبارکہ میں امانت اُٹھانے اور خلافت ارض کا حق ادا کرنے میں مرد اور عورت کے درمیان کلی مساوات ہے۔ ہر کوئی اپنے اعمال کا ذمہ دار ہے اور یہی وہ ذمہ داری ہے جس کی بناء پر منافق اور مشرک مردوں اور عورتوں کو ان کے غلط اعمال کی سزا ملتی ہے اور مومن مردوں اور عورتوں پر اللہ کے انعامات کی بارش ہوتی ہے اور اگر ان میں سے کسی سے لغزش ہو جائے تو اس کے مضر اثرات سے انھیں بچا لیا جاتا ہے۔

انسان کی خوبیاں اور خامیاں بیان کرنے کے بعد قرآن حکیم نے ان خوبیوں کو حاصل کرنے کا اور ان خامیوں سے نکلنے کا ایک طریقہ بتا دیا اور واضح کر دیا کہ یہی منہج کامیابیوں اور کامرانیوں کا منہج ہے جو اس پر چلے گا کامیابی اس کے قدم چومے گی اور جو اس کی مخالفت کرے گا وہ رہتی دنیا تک خسارے میں رہے گا اور کبھی بھی اپنی منزل کو پا نہیں سکے گا۔ منہج الٰہی پر چلنے کے لیے کن کن اوصاف کی ضرورت ہے، قرآن نے اس کی وضاحت کر دی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: 'وَالْعَصْرِ ○ إِنَّ الْإِنسَانَ لَفِي خُسْرٍ ○ إِلَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ ○' (العصر ۱۰۳: ۱ تا ۳) ''قسم ہے زمانے کی کہ انسان نقصان میں ہے۔ سوائے ان لوگوں کے جو ایمان لاتے اور اعمال صالحہ کرتے ہیں اور ایک دوسرے کو حق کی نصیحت کرتے ہیں اور ایک دوسرے کو صبر کی نصیحت کرتے ہیں۔''

Marfat.com

عصر (زمانہ) کی قسم اس لیے کھائی کہ لوگوں کو معلوم ہو کہ نیکیوں کا انجام عروج و کمال ہے اور برائیوں کا انجام تباہی و بربادی۔ تاریخ میں یہی قانون جاری و ساری ہے۔ قسم یہاں پر گواہی کے لیے اور عبرت کے لیے کھائی گئی ہے یعنی زمانہ اور اس کے واقعات شاہد ہیں کہ انسان کی قوتیں اور اس کے اعمال گھاٹے میں رہتے ہیں۔ الانسان پر جو ال داخل ہوا ہے وہ جنس کے لیے ہے اور اس میں مرد اور عورت دونوں شامل ہیں یعنی سب انسان بشمول مرد اور عورت خسارے میں ہیں۔ خُسر کا لفظ نکرہ استعمال ہوا ہے اور اسم نکرہ تہویل (ہولناک بنانے) کے لیے استعمال ہوتا ہے یعنی وہ خسارہ بڑا ہولناک ہے۔ لَفِي خُسر کی ترکیب بتا رہی ہے کہ انسان ہمیشہ خوفناک خسارے میں رہے گا اور وہ کبھی اس سے الگ نہیں ہوگا۔ خُسر (خسارہ) سے مراد راس المال کا ضیاع ہے اور انسان کا راس المال اس کی عمر ہے۔ اگر وہ اس عمر فانی میں وہ راستہ اختیار نہ کرے جس کی طرف وحی اور عقل رہنمائی کرتی ہے اور اپنے آپ کو اس مقام کا اہل ثابت نہ کرے جو اسے اللہ نے عطا کیا ہے۔ تو گویا انسان نے اپنے آپ کو اور اپنی عمر کو برباد کر دیا۔ جو لوگ آخرت کے بدلے دنیا کا سودا کرتے ہیں وہ گھاٹے میں رہتے ہیں۔ کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو انسانیت کے مقام کو جانتے اور پہچانتے ہیں اور ان صلاحیتوں کا صحیح استعمال کرتے ہیں۔ جو اللہ نے ان کو ودیعت کی ہیں۔ ایسے لوگ کامیاب و کامران ہیں۔ یہ لوگ حالت نقصان سے مستثنیٰ ہیں۔ ایسے لوگوں میں چار صفات کا پایا جانا ضروری ہے: پہلے ایمان، دوسرے اعمال صالحہ، تیسرے ایک دوسرے کے حق کو پہنچانا اور چوتھے ایک دوسرے کو صبر کی تلقین کرنا۔ حق ایمان کے مقابل ہے اور صبر اعمال صالحہ کے مقابل۔ انسان کا اپنا عقیدہ درست ہونا چاہیے اور اسے دوسروں کا عقیدہ درست کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ وہ خود اعمال صالحہ کرے اور دوسروں کو اعمال صالحہ پر قائم رکھنے کی کوشش کرے۔ ہر انسان جب تک حق دوسروں تک نہیں پہنچاتا اور دوسروں کو اس حق پر قائم کرنے کی کوشش نہیں کرتا اس وقت تک وہ نقصان میں ہے۔ ایمان کے معنی عربی میں زوال شک کے ہیں۔ جب تک اللہ کے وجود پر، اس کی صداقت پر اور اس کے اصولوں پر مکمل یقین دلوں کے اندر پیدا نہ ہوگا، کامیابی کا کوئی دروازہ نہیں کھلے گا۔ ایمان نام ہے انسانی وجود کے اللہ سے ربط و تعلق کا۔ پھر اس ربط کے نتیجے میں ایمان نام ہے کائنات سے ربط کا اور ان قوانین سے ربط کا، جن کی اس کائنات پر حکمرانی ہے۔ یہ ربط و تعلق انسانی وجود کو غیر معمولی قوت اور وسیع ترین دائرہ کار سے ہم کنار کرتا ہے۔ ایمان کا ایک اہم نتیجہ یہ ہے کہ انسان دنیوی زندگی کے ساز و سامان کی حرص و ہوس سے بلند ہو جاتا ہے اور اللہ کے یہاں جو نعمتیں

Marfat.com

ہیں وہ اپنے لیے پسند کرنے لگتا ہے۔ ایمان نہ ہو تو نیکی اس شاخ کی مانند ہے جو کٹ گئی ہو۔ چنانچہ ارشاد ربانی ہے: 'مَثَلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ اَعْمَالُهُمْ كَرَمَادِ اشْتَدَّتْ بِهِ الرِّيْحُ فِيْ يَوْمٍ عَاصِفٍ لَا يَقْدِرُوْنَ مِمَّا كَسَبُوْا عَلٰى شَيْءٍ ' (ابراهیم ۱۴:۱۸) 'ان لوگوں کی مثال جو اپنے رب کا انکار کرتے ہیں (یہ ہے کہ) ان کے اعمال راکھ کی طرح ہیں جس کو آندھی کے دن ہوا تیزی کے ساتھ اُڑا لے جائے۔ ان لوگوں نے جو کچھ عمل کیے تھے ان میں سے کچھ ان کو حاصل نہ ہوگا'۔

یہ آیۂ مبارکہ اس معاملہ میں صاف ہے کہ عمل کا تعلق ایمان سے نہ ہو تو وہ بالکل بے قیمت اور بے وزن ہوتا ہے۔ آپ کے دل کے اندر ایمان، اطمینان اور یقین پیدا ہو گیا۔ کیا دل کا یہ کام آپ کو کامیاب بنا دے گا؟ بالکل نہیں۔ محض یقین اور ایمان تو کوئی نتیجہ پیدا نہیں کر سکتا جب تک اس کے مطابق عمل نہ ہو۔ ایسا عمل جو صحیح طریقے سے انجام دیا جائے اور جو فرد اور معاشرے کو سنوار دے۔

عمل صالح ایمان کا فطری ثمر ہے۔ ایمان ایک ایجابی متحرک حقیقت ہے جونہی یہ دل میں پیوست ہو جاتی ہے تو وہ عمل صالح کی صورت میں خارج میں نمودار ہوتی ہے۔ اس کی مثال پھول کی سی ہے جو اپنی خوشبو کو روک نہیں سکتا۔ ایمان اور عمل صالح زنجیر کی دو کڑیاں ہیں جب تک باقی کی دو کڑیاں مضبوط نہ ہوں گی زنجیر مضبوط نہیں ہو سکتی۔ تیسری کڑی یہ ہے کہ دنیا میں اللہ کی سچائی کا پیغام پہنچاؤ۔ حق کی راہ میں کوئی قدم اُٹھ نہیں سکتا جب تک اس راہ میں پیش آنے والی رکاوٹوں کو صبر و تحمل سے برداشت نہ کیا جائے۔ نفسیاتی خواہشات، ذاتی مصلحت، سماج کے تصورات، حاکموں کا جبر و استبداد، ظالموں کا ظلم یہ سب راہ حق کی رکاوٹیں ہیں جس کے لیے صبر، عزم اور استقلال کی بے حد ضرورت ہے۔ اسی لیے اسلام نے حق وصبر کو لازم و ملزوم قرار دیا ہے اور یہی زنجیر کی چوتھی اور آخری کڑی ہے جو انسان کو کامیاب و کامران بناتی ہے اور اسے سعادت سے نوازتی ہے۔ یہ فریضہ صرف اجتماعی طور پر سرانجام دیا جا سکتا ہے۔ اجتماعی زندگی میں ہر فرد صرف نیک کام ہی نہیں کرتا بلکہ اپنے ساتھیوں سے بھی کہتا ہے کہ وہ ایمان لائیں، عمل صالح کریں، حق کو آگے پہنچائیں اور جس قدر مشکلات اس راستہ میں انھیں پیش آئیں ان کا مقابلہ ڈٹ کر کریں۔ حق و استقامت کی تلقین خود ان میں باہمی ربط و ضبط کا ذریعہ بن جاتی ہے اور یہی وہ جماعت ہے جو کامیاب زندگی بسر کرتی ہے۔

تاریخ اس پر شاہد ہے۔ تواصی بالحق، تواصی بالصبر (ایک دوسرے کو حق اور صبر کی تلقین) کے الفاظ سے ایک ایسی امت مسلمہ کی تصویر اُبھرتی ہے جو باہم مربوط اور یک جان اور ایک دوسرے کی کفیل ہوگی اور زمین میں حق و عدل قائم کرنے والی ہوگی اور ایک دوسرے سے محبت اور

Marfat.com

تعاون کرنے والی اور بھائی چارے سے ایک دوسرے کو حق اور صبر کی تلقین کرنے والی۔ یہ کام سب انسان خواہ مرد ہوں یا عورت، مل جل کر شانہ بشانہ کریں گے تو کامیابی حاصل ہوگی وگرنہ بالکل نہیں۔ تواصی سے مراد یاد دہانی، ہمت افزائی اور دینی امانت اور حق کے بارگراں کو اُٹھانے میں باہمی تعاون ہے۔ حق کے علمبردار کو احساس ہوتا ہے کہ وہ اس معرکہ میں تنہا نہیں بلکہ اس کے ساتھ دوسرے بہت سے لوگ ہیں جو اسے تاکید و تلقین کرتے ہیں، اس کا حوصلہ بڑھاتے ہیں، حق کی مہم میں اس کا ساتھ دیتے ہیں اور اس سے محبت کرتے ہیں، اس احساس سے اس کی قوت کئی گنا بڑھ جاتی ہے۔ دین حق اس کے بغیر قائم نہیں ہو سکتا کہ بشمول مرد اور عورت ایک ایسی جماعت اس کی علمبردار ہو جس کے افراد کو احساس ہو کہ سب کی منزل ایک ہے، سمت ایک ہے۔ سب ایک دوسرے پر اعتماد اور بھروسہ کرتے ہوں اور سب ایک دوسرے کو محبت، عزم اور حق پر استقامت کی زادِ راہ فراہم کرتے ہوں۔ یہ سب باتیں جماعت کے مفہوم میں داخل ہیں جس کے بغیر اسلام زندہ نہیں رہ سکتا اور نہ ہی اجتماعیت کی فضا کے بغیر وہ پروان چڑھ سکتا ہے۔ یہ نہ ہو تو پھر خسران ہی خسران ہے اور ضیاع ہی ضیاع ہے۔

اس جماعت کے افراد انسان ہیں جس کا ذکر بطور خاص اس سورۃ کریمہ میں ہوا ہے۔ انسانوں میں مرد اور عورت دونوں شامل ہیں۔ ان دونوں کو مل جل کر امانت کبریٰ کا بارگراں اُٹھانا ہوگا۔ یہ کام نہ تنہا مرد کر سکتا ہے نہ تنہا عورت۔ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا فریضہ دونوں نے ایک دوسرے کے شانہ بشانہ ادا کرنا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: 'وَالْمُؤْمِنُونَ وَالْمُؤْمِنَاتُ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ يَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ' (التوبۃ ۹:۷۱)۔ 'مومن مرد اور مومن عورتیں ایک دوسرے کے دوست ہیں نیکی کا حکم دیتے ہیں اور برائی سے روکتے ہیں'۔ یہ آیت اس بارے میں نص قطعی ہے کہ امت مسلمہ کے اس فریضے کو مل جل کر ادا کرنا ہے۔ ہماری روش قرآن حکیم کے منافی ہے۔ عورت کو سوسائٹی سے باہر نکال کر اور گھر میں مقید کر کے اگر یہ فریضہ تنہا مرد سرانجام دیں گے تو اس کا نتیجہ گھاٹے اور ٹوٹے کے سوا کچھ نہ ہوگا۔ سورۂ عصر میں بھی اس فریضے کو انسان یعنی مرد اور عورت کو اجتماعی طور پر سپرد کیا گیا ہے۔

بحث کا خلاصہ

۱۔ قرآن حکیم میں جہاں جہاں لفظ الانسان بغیر کسی قرینے کے استعمال ہوا ہے اس میں مرد اور عورت دونوں شامل ہیں۔

Marfat.com

۲۔ اللہ نے اس انسان کو بہترین جسمانی اور دماغی ساخت کے ساتھ پیدا کیا اور اسے عزت و تکریم عطا کی اور اسے ان باتوں کا علم سکھایا جن کو وہ جانتا نہ تھا۔

۳۔ قرآن حکیم نے انسان کی جو خوبیاں اور خامیاں بیان کی ہیں وہ مرد اور عورت میں برابر پائی جاتی ہیں۔ وہ کمزوریاں جو شاونزم کے حامی صرف عورت کی طرف منسوب کرتے ہیں وہ قرآنی نقطۂ نظر سے درست نہیں۔ مثلاً یہ کہ عورت کمزور ہوتی ہے، بیوقوف ہوتی ہے، مشکلات پر بے صبری کا اظہار کرتی ہے، بے وفا ہوتی ہے، دغا دیتی ہے۔ یہ سب خرافات ہے جس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ سب خامیاں قرآنی نقطۂ نظر سے مرد میں بھی موجود ہیں۔

۴۔ ان خامیوں کو فطرت نہیں کہا جا سکتا ہے کیونکہ فطرت انمٹ ہوتی ہے جبکہ عمل صالح ماحول اور تعلیم و تربیت کے ذریعے ان خامیوں کو خوبیوں میں بدلا جا سکتا ہے۔

۵۔ امانت کبریٰ کی بھاری ذمہ واری اُٹھانے میں مرد اور عورت برابر کے شریک ہیں ان میں سے کوئی بھی اس امانت کو تنہا اُٹھانے کے قابل نہیں۔

۶۔ مرد اور عورت ایک ہی سوسائٹی کا حصہ ہیں ان کو ایک دوسرے سے الگ کرنا فطرت کے خلاف ہے۔ دونوں ایک دوسرے کے دوست اور رفیق ہیں دونوں شانہ بشانہ نیکی کا حکم دیں گے اور برائی سے منع کریں گے۔ ہم نے عورت کو سوسائٹی سے عام طور پر اور مسجد سے خاص طور پر نکال کر ظلم کیا ہے اور معاشرے کی اصلاح کا سارا کام مردوں کے سپرد کر دیا ہے۔ یہ بات قرآنی احکام کے بھی خلاف ہے اور سنت نبوی کے بھی۔

۷۔ انسان کی چار صفات ایمان، عمل صالح، حق کی تلقین اور صبر کی تاکید، اگر مرد میں ہوں تو وہ کامیاب ترین ہے اور اگر عورت میں ہوں تو وہ کامیاب ترین ہے۔ مرد کو محض مرد ہونے کے ناتے عورت پر قطعی کوئی فضیلت نہیں۔

Marfat.com

الأنثى (مؤنث)

لغوی مفہوم

لغوی لحاظ سے أنثی (مادہ) ذَکَر (نر) کی ضد ہے اس کی جمع إِناث اور جمع الجمع اُناثی ہے۔ قرآن حکیم میں بھی ذکر کے مقابلہ میں انثی استعمال ہوا ہے۔ جیسا کہ سورۃ نساء میں ہے: 'وَمَن يَعْمَلْ مِنَ الصَّالِحَاتِ مِن ذَكَرٍ أَوْ أُنثَىٰ' (النساء ۴:۱۲۴) 'جو شخص نیک کام کرے گا خواہ وہ نر (مرد) ہو یا مادہ (عورت)۔ سورۃ بنی اسرائیل میں بَنِین (بیٹوں) کے مقابلہ میں اِناث (بیٹیاں) آیا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے: 'أَفَأَصْفَاكُمْ رَبُّكُم بِالْبَنِينَ وَاتَّخَذَ مِنَ الْمَلَائِكَةِ إِنَاثًا' (بنی اسرائیل ۱۷:۴۰) تو کیا تمھارے رب نے تم کو تو بیٹوں کے ساتھ خاص کیا ہے اور فرشتوں کو اپنی بیٹیاں بنالیا ہے؟

أنثی کے بنیادی معنی

لسان العرب میں ہے کہ مَکَان أنیث اس مقام کو کہتے ہیں جہاں نباتات جلدی سے اور کثرت سے ہو۔ ابن منظور کہتے ہیں کہ ابن الأعرابی کا خیال ہے کہ عورت کو أنثی بالکل ایسے ہی کہا جاتا ہے جیسے خوب سرسبز و شاداب جگہ کو البلد الانیث کہا جاتا ہے، گویا کہ بالیدگی اور روئیدگی انث کے مادہ کے بنیادی معنی ہیں۔ امام راغب مفردات میں فرماتے ہیں کہ أنثی کے ساتھ تشبیہ دے کر زرخیز زمین کو أرض أنیث کہا جاتا ہے۔ یہ تشبیہ یا تو نرمی کے اعتبار سے ہے یا عمدہ پیداوار دینے کے اعتبار سے۔ اسی وجہ سے زمین کو ارض حُرَّۃٌ وَوَلُودَۃ (بغیر ریت کے عمدہ پیداوار والی زمین) کہا جاتا ہے۔ امام رازی تفسیر کبیر میں آیت (۵۳:۴۵) کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ الذکر اور الأنثی کا تعلق ان اسماء سے ہے جو بطور صفت بھی استعمال ہوتے ہیں کیونکہ صفت کا اطلاق اس چیز پر ہوتا ہے جس کی خصوصیت مسلمہ ہو مثلاً عالم اسے کہتے ہیں جس کے پاس علم ہو۔ ذکر ایک اسم ہے اس چیز کا جس کی ایک خصوصیت ہے اور أنثی ایک اسم ہے اس چیز کا جس کی ایک خصوصیت ہے مثلاً کہا جاتا ہے: جاء نی 'شخص ذکر' اِو انسان ذکر'۔ الذکر من النخل- پھل نہ دینے والے کھجور کے درخت کو کہتے ہیں و الأنثی من النخل پھلدار کھجور کے درخت کو کہا جاتا ہے۔ ذکور البقل ان ترکاریوں کو کہتے ہیں جو سخت ہوگئی ہوں۔ اسی سے عضو تناسل کو ذکر کہا گیا ہے۔ انھوں نے مزید یہ کہا ہے کہ اصل میں أنثی اور ذکر عورت اور مرد کی شرمگاہوں کے نام ہیں یعنی اس شرمگاہ میں پیداواری صلاحیت ہوتی ہے اس لیے اسے أنثی کہا جاتا

Marfat.com

ہے اس سلسلہ میں انھوں نے ایک پہیلی کا بھی ذکر کیا ہے: 'وَمَا ذَکَرٌ وإن یسمن فانثی؟' وہ کونسا مذکر ہے کہ اگر وہ موٹا ہو جائے تو مؤنث بن جاتا ہے؟ اس سے مراد قُراد یعنی چیچڑ ہے کہ جب وہ بڑھ کر موٹا ہو جاتا ہے تو اسے حَلَمَة (سرپستان) بہ لفظ مؤنث کہا جاتا ہے۔ مقاییس اللغة میں ابن فارس نے اور القاموس المحیط میں مجد الدین فیروز آبادی نے أرض أنیثة کا محاورہ بیان کر کے سرسبزی و شادابی کے معنوں کی تائید کی ہے۔ دونوں خصیوں کو بھی أنثیان اس لیے کہا جاتا ہے کیونکہ وہ مادہ منویہ میں نطفے اور کئی دوسرے مائع عناصر کو بناتے اور خارج کرتے ہیں۔ اسی مادہ سے ایک لفظ مِئناث کے وزن پر آتا ہے اس کے معنی وہ عورت ہے جس کی عادت لڑکیاں جننے کی ہو۔ اس لفظ کا اطلاق مرد پر بھی ہوتا ہے کیونکہ مِفعال کا وزن مرد اور عورت دونوں کے لیے یکساں ہے۔

اس تجزیہ کی بناء پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ أنثی کا لفظ عورت کی تخلیقی خصوصیت پر دلالت کرتا ہے۔ خالق کائنات کے بعد یہ صلاحیت صرف عورت میں موجود ہے۔

تخلیقی اعتبار سے مذکر اور مؤنث میں مساوات

ارشاد ربانی ہے: 'أَلَمْ يَكُ نُطْفَةً مِّن مَّنِيٍّ يُمْنَىٰ ۝ ثُمَّ كَانَ عَلَقَةً فَخَلَقَ فَسَوَّىٰ ۝ فَجَعَلَ مِنْهُ الزَّوْجَيْنِ الذَّكَرَ وَالْأُنثَىٰ ۝' (القیامة ۷۵: ۳۷ تا ۳۹)۔ 'کیا وہ (انسان) منی کا ایک نطفہ نہ تھا جو ٹپکائی جاتی ہے پھر وہ ایک لوتھڑا تھا۔ پھر اللہ نے اسے (انسان) بنایا اور اسے ٹھیک ٹھیک درست کیا۔ تب اس سے دو زوج بنائے یعنی نر اور مادہ۔

اس آیہ مبارکہ میں انسان کی پیدائش اور اس کے مختلف مراحل کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کیا انسان اصل میں پانی سے بنا ہوا ایک چھوٹا سا نطفہ نہ تھا؟ اس منی سے بنا ہوا جو ٹپکائی جاتی ہے۔ کیا یہ نطفہ ایک چھوٹے سے خلیے سے تبدیل ہو کر جونک کی شکل کا ایک لوتھڑا نہیں بنا، جو رحم میں ایک خاص وضع اختیار کر لیتا ہے؟ وہ اس کی دیواروں سے چپک جاتا ہے تاکہ غذا حاصل کرے۔ کس نے اسے حرکت الہام کی؟ کس نے اسے یہ قدرت عطا کی؟ کس نے اسے موزوں اعضاء والا انسان بنایا؟ جس کا جسم کئی ملین خلیوں سے مل کر بنا حالانکہ وہ انڈے کے ساتھ ایک ہی خلیہ تھا۔ اس سارے سفر کی قیادت کس کے ہاتھ میں تھی؟ وہ تو چھوٹی سی کمزور سی مخلوق تھا۔ آیہ مبارکہ میں یُمْنَىٰ مجہول کا صیغہ عدم اعتنا کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ ٹپکانے والے مرد اور عورت ایک بوند ٹپکا کر الگ ہو جاتے ہیں پھر انھیں کچھ خبر نہیں ہوتی کہ وہ بوند کہاں ہے؟ کس حال میں ہے؟ بعد کے سارے تصرفات قدرت کے ہاتھ میں ہوتے ہیں۔ تہ بہ تہ تاریکیوں کے اندر وہ اپنی صنعت گری سے مختلف مراحل

Marfat.com

سے گزارتی ہے۔ پانی کی بوند خون کے لوتھڑے کی شکل اختیار کرتی ہے پھر اس کا خاکہ تیار ہوتا ہے اس کی نوک پلک سنواری جاتی ہے۔ پایان کار قدرت ایک خلیے سے مرد اور عورت بنا کر وجود بخشتی ہے۔

آیۂ کریمہ میں خــلــق سے مراد اس صورت میں ایجاد ہے جس صورت میں اللہ چاہتا ہے یعنی ابداع اور جعل سے مراد مخلوق کو وظائفی صفت عطا کرنا ہے یعنی تسخیر۔ جب انسان کی تخلیق مکمل ہو چکی تو اس کو مرد اور عورت کے دو زوج میں تقسیم کر دیا، بالکل اسی طرح جیسے انسان کے دو ہاتھ ہوتے ہیں، ایک دایاں اور دوسرا بایاں۔ اور انسان دونوں ہاتھوں کو ملا کر اپنا فرض ادا کرنے کے قابل ہوتا ہے۔ لفظ زوج اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ اس پر تفصیلی بحث لفظ زوج کے تحت کی جائے گی۔

تفہیم القرآن میں اس آیت کے تحت مولانا مودودیؒ نے بڑے پتے کی بات کہی ہے فرماتے ہیں 'آغاز آفرینش سے آج تک دنیا کے ہر حصے اور ہر قوم میں کس طرح ایک ہی نوعیت کے تخلیقی فعل کے نتیجے میں لڑکوں اور لڑکیوں کی پیدائش مسلسل اسی تناسب سے ہوتی چلی آ رہی ہے کہ کہیں کسی زمانے میں بھی ایسا نہیں ہوا کہ کسی انسانی آبادی میں صرف لڑکے یا صرف لڑکیاں ہی پیدا ہوتی چلی جائیں اور آئندہ اس نسل کے چلنے کا کوئی امکان باقی نہ رہے۔ کیا یہ بھی اتفاقاً ہی ہوئے چلا جا رہا ہے؟'

آیت کے آخر میں اللہ نے ایک نطفہ سے نرینہ اور مادینہ اولاد کی پیدائش کو اپنی قدرت پر بطور دلیل پیش کیا ہے۔ کیا وہ عظیم قدرت والا جس نے انسان کو پانی کی ایک بوند سے بغیر کسی نمونے کے پیدا کیا پھر اس کو ٹھیک ٹھاک انسان کی شکل دی اور اسی سے مرد اور عورت کا جوڑا بنایا اس بات پر قادر نہیں کہ وہ مرنے کے بعد مردے کو زندہ کر سکے اور پھر ان کو ایسا ہی وجود بخشے جیسے وہ مرنے سے پہلے تھے؟ کیوں نہیں پاک ہے وہ ذات جو اس پر قادر ہے۔

مذکر اور مؤنث ایک ہی نطفہ سے پیدا ہوئے اس لیے وہ ایک دوسرے کے زوج ٹھہرے۔ اس مضمون کی تائید قرآن ایک اور مقام پر بھی کرتا ہے۔ ارشادِ ربانی ہے: 'وَأَنَّهُ خَلَقَ الزَّوْجَيْنِ الذَّكَرَ وَالْأُنثَىٰ ۝ مِن نُّطْفَةٍ إِذَا تُمْنَىٰ ۝' (النجم ۵۳: ۴۵-۴۶) 'اور یہ کہ وہی دو جوڑے پیدا کرتا ہے، نر اور مادہ، نطفہ سے جب وہ ٹپکایا جاتا ہے۔ اس آیت میں اللہ نے اپنی قدرت کے کمال کی طرف توجہ دلائی ہے۔ مرد اور عورت کو اس نطفہ سے پیدا کیا گیا ہے جسے مرد اور عورت ٹپکاتے ہیں۔

سورۃ الدھر میں اس نطفہ کو اَمشاج (ملے ہوئے) سے موصوف کیا گیا ہے جس کے معنی مرد اور عورت کے پانی کا ملنا ہے۔ زندہ بیج پھلتا پھولتا ہے لیکن اس کے اندر وہ تمام عوامل موجود ہوتے ہیں جو زندگی کے آنے والے مراحل میں نمایاں ہوتے ہیں۔ نطفہ ایک موزوں اعضاء والا جسم ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ

Marfat.com

اس سے مختلف اعضاء اور مختلف مزاج بناتا ہے۔ نطفہ سے کبھی مذکر کا اور کبھی مونث کا پیدا ہونا تو عجیب تر ہے۔ کوئی نہیں جانتا کہ نطفہ مذکر ہو گا یا مونث۔ وہ تو ایک ہی شکل وصورت والا پانی ہوتا ہے۔ اللہ کی تدبیر اور تقدیر کے مطابق کوئی پانی مذکر کی صورت اختیار کر لیتا ہے اور کوئی مؤنث کی۔ یہ ساری باتیں صرف وہ ذات جانتی ہے جو مختلف تاریکیوں کے اندر پانی کی اس بوند کی پرورش کرتی ہے اور ایک مقررہ مدت کے بعد اس کو ظہور میں لاتی، اس کو ایک مرد یا عورت کی حیثیت سے پروان چڑھاتی ہے۔ اس نے نر اور مادہ کے جوڑے کی تخلیق کو ایجاد کیا ہے۔ یہ نہیں کہ مرد کو تو کسی نے پیدا کیا ہو اور عورت کو کسی اور نے۔ بیٹے کوئی بخشتا ہو اور بیٹیاں کوئی اور۔ اس طرح کی کسی تقسیم کا امکان عورت اور مرد کی تقسیم میں نہیں۔ جس مادۂ تولید سے نر کی پیدائش ہوتی ہے اسی سے مادہ کی پیدائش ہوتی ہے۔ نر مادہ کا جوڑا ہے اور مادہ نر کا۔ دونوں ایک دوسرے کے جوڑے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ مرد اور عورت کے باہمی رشتے پر جس وضاحت سے لفظ زوج روشنی ڈالتا ہے کوئی اور لفظ نہیں ڈالتا۔ یہ لفظ مرد اور عورت کی باہمی ہم آہنگی، یگانگت اور مساوات پر دلالت کرتا ہے اور ان کے درمیان کسی قسم کے امتیاز پر کاری ضرب لگاتا ہے۔ قرآن حکیم نے زوجیت کا فلسفہ پیش کیا ہے جس پر نظام کائنات کا مدار ہے۔ اس کی تفصیل انشاء اللہ لفظ زوج کے تحت بیان ہو گی۔

وہ نطفہ جس سے انسان بنتا ہے وہ مرد اور عورت کے ملاپ سے پیدا ہوتا ہے اور وہی نسل انسانی کی بقا کا وسیلہ ہے۔ سارے انسان کیا مرد اور کیا عورت، ایک ہی ماں باپ کی اولاد ہیں۔ قوموں اور قبیلوں کی تقسیم ایک فطرتی عمل ہے یہ باہمی تعارف کا ذریعہ ہے نہ کہ باہمی تفاخر کا۔ جنس اور رنگ و نسل فضیلت کا معیار نہیں۔ وجہ فضیلت یہ ہے کہ ایک انسان دوسرے انسان سے بڑھ کر اللہ سے ڈرنے والا اور برائیوں سے بچنے والا ہو۔ اس حقیقت کو قرآن حکیم نے ان الفاظ میں آشکار کیا ہے:

يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُم مِّن ذَكَرٍ وَأُنثَىٰ وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوبًا وَقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِندَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ خَبِيرٌ (الحجرات ۴۹:۱۳) ۔ "اے لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور تم کو مختلف نسلیں اور قبیلے بنایا تاکہ ایک دوسرے کو شناخت کرسکو۔ اللہ کے نزدیک تم سب میں سے بڑا عزت والا وہی ہے جو تم سب میں سے زیادہ متقی ہو، بے شک اللہ خوب جاننے والا پورا خبردار ہے"۔ امام ابن جریر طبری نے اپنی تفسیر میں اس آیت کے ضمن میں عقبہ بن عامر کی روایت نقل کی ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا: اے لوگو! تم آدم کی اولاد صاع (پیمانہ) کے کنارے کی طرح ہو تم اسے بھر نہیں سکتے۔ ایک کو دوسرے پر فضیلت صرف دین اور

Marfat.com

عمل صالح کی بنیاد پر ہے۔ صاحب کشاف نے ایک اور روایت نقل کی ہے کہ فتح مکہ کے دن نبی پاک ﷺ نے طواف کیا اور حمد وثنا کے بعد فرمایا! تعریف ہے اس ذات کی جس نے تم سے جاہلیت کا تکبر دور کیا۔ لوگو انسان صرف دو (مرد اور عورت) قسم کے ہیں۔ ایک متقی مومن جو اللہ کے ہاں باعزت ہے اور دوسرا بدبخت فاسق و فاجر جو اللہ کے ہاں ذلیل و رسوا ہے اور پھر آپ نے مذکورہ بالا آیت تلاوت فرمائی۔

مِّن ذَكَرٍ وَأُنثَىٰ (ایک مرد اور ایک عورت سے) میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ دونوں کا تعلق ایک ہی جنس سے ہے کیونکہ ان میں سے ہر ایک کا خالق ایک ہے، مادۂ تخلیق ایک ہے۔ ایک ماں باپ کی اولاد ہیں جس کے معنی یہ ہیں کہ ہر انسانی بچے میں خواہ وہ لڑکا ہو یا لڑکی کچھ حصہ مرد کا ہوتا ہے اور کچھ عورت کا، دونوں بالکل ایک دوسرے کے مانند اپنے فرائض ادا کر سکتے ہیں۔ اس لیے یہ سمجھنا غلط ہے کہ مرد عورتوں سے افضل ہیں یا عورتیں مردوں سے آگے۔ امام رازی کا قول ہے کہ انسانی تفاوت حسی تفاوت ہے نہ کہ جنسی تفاوت، کیونکہ وہ سب کے سب مرد اور عورت کی اولاد ہیں۔ جب یہ بات ہے تو پھر حسب ونسب پر فخر چہ معنی دارد؟

عربی شاعر کا کیا ہی اچھا شعر ہے:

الناس في عالم التمثيل أكفاء	أبوهم آدم و الأم حواء
فان يكن لهم في اصلهم شرف	يفاخرون به فالطين والماء
عالم مثال میں سب لوگ برابر ہیں	ان کا باپ آدمؑ اور ماں حواؑ ہے
اگر ان کے اصل میں کوئی ایسی بات ہے جو باعث شرف ہو،	اور جس پر وہ فخر کر سکیں تو وہ مٹی اور پانی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو قوموں اور قبیلوں میں اس لیے تقسیم کیا تاکہ وہ ایک دوسرے کو پہچان سکیں۔ فطری اختلاف کا تقاضا یہ ہرگز نہ تھا کہ اسے انسان اور انسان کے درمیان برتری کا ذریعہ بنا لیا جائے۔ اس آیت سے پہلے جن معاشرتی برائیوں کا ذکر کیا گیا ہے ان کا محرک یہ ہے کہ ایک انسان اپنے آپ کو بڑا سمجھے اور دوسرے کو حقیر جانے یا ایک خاندان نسبی طور پر اپنے آپ کو دوسروں سے معزز گردانے۔ قرآن نے اس سلسلہ میں ایک ایسا اصول بنایا ہے جس کا مقابلہ دنیا کا کوئی قانون نہیں کر سکتا۔ اس کے ذریعہ سے تمام قومی امتیازات کو یکسر مٹا دیا گیا۔ ان امتیازات کو جن کی بناء پر لوگ ایک دوسرے پر فخر ہی نہیں کرتے بلکہ ظلم و زیادتی بھی روا رکھتے ہیں۔ اللہ کی

Marfat.com

میزان میں عزت کا صرف ایک معیار ہے وہ یہ کہ جو سب سے بڑھ کر اللہ سے ڈرنے والا، فرائض کو ادا کرنے والا اور گناہوں سے بچنے والا ہے، اللہ کے یہاں سب سے بڑھ کر عزت والا ہے۔ جو زیادہ سے زیادہ اس معیار پر پورا اترنے والا ہے وہ سب سے زیادہ باعزت ہے خواہ وہ مرد ہو یا عورت معیار فضیلت سیرت و کردار ہے نہ کہ جنس۔

اللہ کے یہاں تم میں سے قدر و منزلت میں زیادہ اونچا دنیا و آخرت میں وہ ہے جو تم میں سے متقی ہے اگر فخر بھی کرنا ہے تو تقویٰ پر فخر کرو کیونکہ تمام نفوس کے کمال اور لوگوں میں درجہ بندی کا مدار تقویٰ پر ہے۔ اس سلسلہ میں یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیے کہ لوگوں کے درمیان جو کفر و ایمان کا فرق ہے وہ ایسے ہی ہے جیسے دو جنسوں کے درمیان ہوتا ہے۔ مومن صحیح معنوں میں انسان ہوتا ہے اور کافر حیوان، بلکہ حیوان سے بھی بدتر۔ ایمان و کفر کے سوا مومن و کافر قابل فخر باتوں میں مشترک ہیں۔ اگر فخر تونگری کی وجہ سے ہو، تو ہو سکتا ہے کہ کافر تونگر ہو اور مومن فقیر یا بالعکس۔ اور اگر یہ فخر نسب کی بناء پر ہو، تو ہو سکتا ہے کہ کافر صاحب نسب ہو اور مومن حبشی غلام۔ دین و تقویٰ کے سوا سب لوگ برابر ہیں اور تقویٰ کی عدم موجودگی میں فخر کے سب موجبات بے اثر ہیں کیونکہ ہر دین کا ماننے والا اچھی طرح جانتا ہے کہ اس کا ہم مذہب مخالف سے افضل ہے خواہ وہ حسب و نسب میں اس سے اونچا کیوں نہ ہو۔ پھر دین حق کے ماننے والے کی بات ہی کچھ اور ہے وہ دوسرے کو اپنے اوپر کیونکر ترجیح دے سکتا ہے۔ روایت ہے کہ فتح مکہ کے دن جب بلال حبشی نے کعبے کی چھت پر اذان دی تو حارث بن حشام اور عتاب بن اسید جیسے رئیس غصے سے پیچ و تاب کھانے لگے۔

آیت کے آخر میں ہے کہ اللہ تعالیٰ علیم ہے وہ خوب جانتا ہے کہ اس کے نزدیک زیادہ متقی اور باعزت کون ہے وہ تمھاری مصلحتوں سے باخبر ہے۔

زندہ مخلوق کئی جنسوں میں منقسم ہے ان میں سے ہر جنس کی ایک صنف ہے جس کے افراد کے درمیان کوئی تفاوت نہیں۔ حالانکہ حقیقت میں وہ دو مختلف اصناف ہیں۔ مذکر و مؤنث سے زندگی کی گردش اور نسلوں کا تسلسل اس طرح تکمیل پذیر ہوتا ہے جیسے لیل و نہار کی گردش سے زمانہ جنم لیتا ہے۔ رات اور دن، نر اور مادہ میں زوجین کی نسبت ہے اور یہ دونوں مل کر اس مقصد کو پورا کرتے ہیں جس کے لیے اللہ نے انھیں پیدا کیا ہے۔ ان میں سے ہر ایک کے اندر خلا ہے جو جوڑے کے ساتھ مل کر ہی پورا ہوتا ہے۔ اس کے بغیر ان کے وجود کی نہ کوئی افادیت باقی رہتی ہے اور نہ ان کی صلاحیتوں کی کوئی توجیہہ ہو سکتی ہے۔ ہر ایک دوسرے کے لیے ناگزیر ہے۔ نظام کائنات کا دارومدار زوجیت کے اس

Marfat.com

عالمگیر اصول پر ہے۔ سب مخلوقات میں یہی نظام جاری و ساری ہے۔ یہ نظام حیوانات، نباتات اور جمادات پر حاوی ہے۔ اسی نظام کی وجہ سے ساری مخلوق میں یک رنگی اور ہم آہنگی پائی جاتی مثلاً سورۃ ذاریات میں ارشاد ربانی ہے: 'وَمِن كُلِّ شَيْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَيْنِ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ' (الذاریات ۵۱:۴۹)۔ 'ہم نے ہر چیز کے دو جوڑے پیدا کیے تا کہ تم یاد دہانی حاصل کرو'۔ یعنی اس بات کی یاد دہانی کہ اس دنیا کی ہر چیز جوڑا ہے اور یہ اپنی غایت کو اپنے جوڑے کے ساتھ مل کر پہنچے گی۔ قرآن حکیم نے اس حقیقت پر یوں روشنی ڈالی ہے: 'وَمَا خَلَقَ الذَّكَرَ وَالْأُنثَىٰ' (اللیل ۹۲:۳)۔ امام ابن جریر طبری نے اس کا ترجمہ یوں کیا ہے 'قسم ہے نر اور مادہ کی پیدائش کی' کیونکہ اس میں مَا اپنے مابعد سے مل کر مصدر کے معنی دے رہا ہے۔ چنانچہ اللہ نے یہاں نر اور مادہ کی تخلیق کی قسم کھائی ہے۔ اس قسم میں سب جاندار شامل ہیں۔ مولانا امین احسن اصلاحی اس آیہ مبارکہ کی تفسیر میں فرماتے ہیں 'اس طرح کی قسمیں جو قرآن میں آئی ہیں کسی دعویٰ پر شہادت کے لیے آئی ہیں۔ قرآن نے نر اور مادہ کے اندر توافق کے پہلو سے توحید پر بھی دلیل پیش کی ہے اور قیامت پر بھی'۔

انسان اور پستانی جانوروں میں ایک جیسا نطفہ ہوتا ہے جو رحم میں قرار پکڑتا ہے اور ایک خلیہ ہوتا ہے جو بیضہ (انڈے) سے متحد ہو جاتا ہے پھر یہ اختلاف کیوں؟ کون اسے کہتا ہے کہ تو مؤنث ہو جا اور تو مذکر۔ وہ عوامل تو معلوم ہو چکے ہیں جو اس نطفے کو مؤنث یا مذکر بناتے ہیں مگر کچھ عوامل مذکر میں بھی پائے جاتے ہیں اور مؤنث میں بھی۔ پھر یہ کیسے ممکن ہو جاتا ہے کہ ایک انجام کار مذکر بن جائے اور دوسرا مؤنث؟ یہ ناممکن ہے کہ عوامل اتفاقیہ طور پر ایک جگہ اکٹھے ہو جائیں۔ کوئی صاحب تدبیر تو ہے جو ایک خاص حکمت اور ایک خاص مقصد کے تحت مذکر اور مؤنث کی تخلیق کرتا ہے۔ اللہ کی تدبیر و تقدیر کے تحت کوئی نطفہ مذکر کی صورت اختیار کر لیتا ہے اور کوئی مؤنث کی صورت۔

آیہ مبارکہ کا ترجمہ جمہور کی قرأت کے مطابق کیا گیا ہے جبکہ عبداللہؓ بن مسعود اور ابوالدرداء کی قرأت کی مطابق آیت یوں ہے: 'وَالذَّكَرِ وَالْأُنثَىٰ' 'قسم ہے نر کی اور مادہ کی' یہ قرأت ہے تو شاذ، مگر اسی سلسلہ میں ایک روایت ہے جسے بخاری، مسلم، ترمذی اور نسائی نے علقمہؒ سے روایت کیا ہے کہ وہ شام گئے تو ابوالدرداء کی مجلس میں حاضر ہوئے۔ ابوالدرداء نے پوچھا کون ہو؟ تو انھوں نے جواب دیا کہ میں اہل کوفہ میں سے ہوں۔ آپ نے پوچھا تو نے اللہ کے رسول کو سورۃ اللیل کیسے پڑھتے ہوئے سنا ہے؟ علقمہؒ نے کہا: 'وَالذَّكَرِ وَالْأُنثَىٰ' انھوں نے کہا کہ میں گواہی دیتا ہوں کہ میں نے اللہ کے رسول ﷺ کو ایسے ہی پڑھتے ہوئے سنا ہے۔ بخدا میں ان کے قول کو (یعنی جمہور کی قرأت)

Marfat.com

نہیں مانوں گا اور تو جانتا ہے کہ یہ قرأت شاذ ہے اور خبر واحد ہے۔ اس کے ساتھ پڑھنا جائز نہیں لیکن جس نے اسے اللہ کے رسول ﷺ سے سنا ہے اس کے لیے یہ متواتر کا حکم رکھتی ہے۔ محمود آلوسی نے روح المعانی میں لکھا ہے کہ ابن عباسؓ نے بھی اس قرأت کی تصدیق کی ہے۔ ابن نجار نے تاریخ بغداد میں اس کی تخریج ضحاک کی سند سے کی ہے اور اسے علی کرم اللہ وجہہ کی طرف منسوب کیا ہے۔
اس قرأت کے مطابق اللہ نے مذکر اور مؤنث کی بلاواسطہ قسم کھا کر ان دونوں کی عظمت اور وقار کو بڑھا دیا ہے۔ یہ قسم دونوں کے درمیان مساوات پر دلالت کرتی ہے اور بتاتی ہے کہ نظام کائنات کو رواں دواں رکھنے کے لیے نر اور مادہ کا وجود از بس ضروری ہے اور دونوں ایک دوسرے کی تکمیل کرتے ہیں۔ اُن میں سے کوئی بھی افضل اور مفضول نہیں۔

خلاصہ

مذکورہ بالا چاروں آیات مبارکہ کا خلاصہ یہ ہے کہ نر اور مادہ کا خالق ایک ہے۔ مادۂ تولید ایک ہے اور طریق تولید ایک ہے۔ اس لیے ان کے درمیان کوئی امتیاز نہیں اور دونوں ایک دوسرے کے زوج ہیں۔ نر، مادہ کا زوج ہے اور مادہ، نر کا۔ زوجیت کا حتمی تقاضا یک رنگی اور ہم آہنگی ہے۔ نر اور مادہ میں یک رنگی اللہ کی قدرت کے کمال پر دلالت کرتی ہے یعنی وہ ایک ہی مادۂ تولید سے وجود پانے والی دو اصناف میں کس طرح ہم آہنگی پیدا کرتا ہے؟ ان اصناف کے درمیان سیرت کی پاکیزگی کے سوا کوئی وجہ فضیلت نہیں؟ رنگ و نسل کا امتیاز اور جنس کا امتیاز قرآنی فلسفہ سے متصادم ہے زمانہ جاہلیت میں اور موجودہ زمانے میں مرد اور عورت کے درمیان جو درجہ بندی کی جاتی ہے اور جو امتیاز روا رکھا جاتا ہے اس کا ابطال ایک اور انداز میں قرآن حکیم نے کیا ہے اور یہ بتایا ہے کہ ایسا سمجھنا اللہ کی مشیت میں دخل اندازی کے مترادف ہے۔ سورۃ شوریٰ میں ارشاد ربانی ہے: 'لِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ يَخْلُقُ مَا يَشَاۗءُ يَهَبُ لِمَنْ يَّشَاۗءُ اِنَاثًا وَّيَهَبُ لِمَنْ يَّشَاۗءُ الذُّكُوْرَ ۝ اَوْ يُزَوِّجُهُمْ ذُكْرَانًا وَّاِنَاثًا وَيَجْعَلُ مَنْ يَّشَاۗءُ عَقِيْمًا اِنَّهٗ عَلِيْمٌ قَدِيْرٌ ۝' (الشوریٰ ۴۲: ۴۹ تا ۵۰)۔ 'آسمانوں اور زمین کی سلطنت اللہ ہی کی ہے وہ جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے۔ جس کو چاہتا ہے بیٹیاں عطا کرتا ہے اور جسے چاہتا ہے بیٹے دیتا ہے یا لڑکے اور لڑکیاں ایک ساتھ جمع کر کے دے دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے بے اولاد رکھتا ہے بے شک وہ بڑے علم اور بڑی قدرت والا ہے۔'
اس آیہ مبارکہ میں پہلے زمین و آسمان کی ملکیت کا ذکر ہے اس کے بعد ان تمام جزئیات کی

Marfat.com

ملکیت کا ذکر ہے جو اس عام ملکیت کے تابع ہیں گویا کہ پہلے اللہ تعالیٰ کے عام تصرف کو بیان کیا پھر اس تصرف کی مختلف اقسام کا ذکر ہے۔ سب حالات اللہ کی مشیت کے تابع ہیں کسی کو اس میں کوئی دخل حاصل نہیں۔ وہ اپنے علم کے مطابق ان کا اندازہ لگاتا ہے اور اپنی قدرت سے انھیں نافذ کرتا ہے۔ ایسے مقام پر پسندیدہ طرزِ عمل یہ ہے کہ انسان اللہ پر بھروسہ کرے راضی برضا ہو خواہ وہ چیز خوشی عطا کرے یا غمزدہ بنائے۔ اس آیت میں جنس کے باہمی رشتے پر نئے انداز سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ آبادی کی افزائش اور اس میں مرد اور عورت کے تناسب میں بہت سی اجتماعی اور نفسیاتی معنویت پائی جاتی ہے۔ اس بارے میں گہرائی اور گیرائی والے مسائل انسان کی پہنچ سے باہر ہیں۔ مردوں اور عورتوں کا تناسب محض اتفاقات کا نتیجہ نہیں بلکہ یہ سب اللہ تعالیٰ کی مشیت اور حکمت کے تحت ہے۔ اس کی مشیت میں دخل دینے کا کسی کا اختیار نہیں۔ اللہ تعالیٰ اپنی مشیت کے مطابق کام کرتا ہے نہ کہ انسان کی مشیت کے مطابق۔ جسے چاہتا ہے پیدا کرتا ہے اور جسے چاہتا ہے اسے وہ عطا کرتا ہے، جسے وہ پسند نہیں کرتا اور جسے چاہتا ہے اسے وہ عطا کرتا ہے جسے وہ پسند کرتا ہے۔ اور جسے چاہتا ہے بیٹے اور جسے چاہتا ہے بیٹیاں اور بیٹے دونوں عطا کرتا ہے اور جسے چاہتا ہے اسے اولاد سے محروم رکھتا ہے۔ جیسے اس نے حضرت لوط علیہ السلام اور حضرت شعیب علیہ السلام کو بیٹیاں عطا کیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بیٹے اور محمد ﷺ کو بیٹے اور بیٹیاں دونوں اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت یحییٰ علیہ السلام کو اولاد سے محروم رکھا۔ یہ سب اللہ کی مشیت اور حکمت کے ماتحت ہے اس میں انسانی مزاج جیسا کہ قدیم اطباء کا خیال ہے۔ ستاروں کا اور فلک کا قطعی کوئی دخل نہیں۔

آیہ مبارکہ میں مردوں سے پہلے عورتوں کا ذکر اس لیے ہوا ہے کہ عورتوں کی جو تحقیر عربوں کے یہاں اور پوری دنیا میں ہوتی تھی اس کا ازالہ کرنے کے لیے اللہ نے عورتوں کا ذکر پہلے کیا ہے اور مردوں کا بعد میں۔ گویا عورت کی عظمت اور اس کے مقام بلند کی طرف توجہ دلائی گئی ہے اور عربوں کو تنبیہ کی گئی ہے کہ عورت کی پیدائش پر ناپسندیدگی کا اظہار اور ان کو زندہ درگور کرنا حکمت خداوندی کے منافی ہے۔ انسان تو نہیں چاہتا کہ عورت کا ذکر پہلے ہو۔ مگر اللہ تو اس کی مرضی کے مطابق کام نہیں کرتا وہ اپنی مرضی سے کام کرتا ہے اگر ذکور (لڑکوں) کو مقدم کر دیا جاتا تو نظم قرآنی میں خلل پڑ جاتا۔ ابوحیان اندلسی نے البحر المحیط میں واثلہ بن اسقع کا قول نقل کیا ہے کہ عورت کے یہاں سب سے پہلے بچی کی پیدائش، خوش قسمتی کی علامت ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے بھی آیت زیر بحث میں بچیوں کو بچوں پر مقدم رکھا ہے۔ ثعالبی کا قول ہے کہ اس آیت میں اشارہ ہے کہ ان کی پیدائش برکت کا باعث ہے۔ اسی

Marfat.com

لیے پہلے نر بچے کو منحوس سمجھا جاتا تھا۔ روح المعانی میں ایک قول نقل کیا گیا ہے کہ اناث (لڑکیوں) کو پہلے اس لیے رکھا گیا ہے کیونکہ وہ کثرت نسل کا ذریعہ ہیں۔ پہلے تخلیق کا بیان ہے اس لیے یہی مناسب تھا کہ ان کا ذکر پہلے ہو۔ مولانا محمد علی نے اس سلسلہ میں بڑی خوبصورت بات کی ہے۔ وہ کہتے ہیں:

"اگر غور کیا جائے تو اولاد کی پرورش ایک بھاری انسانی فرض ہے جس سے انسان نسلِ انسانی کی خدمت کا سبق سیکھتا ہے اور اس کے اندر اپنے آرام کو دوسروں کے آرام پر قربان کرنے کی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ یہ غرض لڑکیوں کی پرورش سے بہ نسبت لڑکوں کے زیادہ حاصل ہوتی ہے۔ اس لیے کہ لڑکوں کی پرورش میں انسان کو کچھ اپنے نام کا اور کچھ اپنے آرام کا خیال ہوتا ہے لیکن لڑکیوں کی پرورش بے غرض ربوبیت کا ایک نمونہ ہے۔ ایک انسان ان کی پرورش کر کے جب وہ کام کاج کے قابل ہوتیں ہیں تو انھیں دوسروں کے سپرد کر دیتا ہے اور وہ پالنے والے کے لیے نام کی بقا و آرام کا موجب نہیں ہوتیں" (یہی وجہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے حدیث قدسی میں فرمایا: "مَا مِنْ رَجُلٍ تُدْرِكُ لَهُ ابنتان فيحسن الا أدخلناه الجنة" (ابن ماجہ کتاب الادب)۔ "جس آدمی کی دو لڑکیاں بالغ ہو جائیں اور وہ ان کی اچھی تربیت یا حسن سلوک کرتا ہے تو ہم اسے جنت میں داخل کر دیں گے"۔ سنن ابی داؤد کتاب الادب میں حضرت ابو سعید خدری سے مروی ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا! اگر کوئی تین بیٹیوں کی پرورش کرتا ہے ان کو ادب آداب سکھاتا ہے ان کی شادی کرتا ہے اور ان سے حسن سلوک کرتا ہے وہ جنت میں جائے گا۔

مرد اور عورت میں امتیاز

ہمارے مفسرین اپنے معاشرتی ماحول کے زیر اثر جہاں کہیں انھیں موقع ملے وہ عورت کے مقابلے میں مرد کی فضیلت کا قصہ چھیڑ دیتے ہیں۔ قرآن حکیم کی ایک آیۂ مبارکہ ان کی جولان گاہ فکر کا شکار ہوئی ہے۔ وہ آیت یوں ہے: "يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلَى الْحُرُّ بِالْحُرِّ وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ وَالْأُنثَىٰ بِالْأُنثَىٰ" (البقرۃ ۲:۱۷۸) "اے ایمان والو تم پر قصاص فرض کیا گیا ہے آزاد آدمی، آزاد کے عوض میں اور غلام، غلام کے عوض میں اور عورت، عورت کے عوض میں"۔ بعض فقہاء کی رائے ہے کہ اس آیت میں حریت اور عبدیت میں مساوات کو پیش نظر رکھا گیا ہے۔ اسی طرح قصاص دو ہمسروں کے درمیان ہوگا آزاد کے بدلے آزاد، غلام کے بدلے غلام، عورت کے بدلے عورت چنانچہ آزاد کو غلام کے بدلے اور مرد کو عورت کے بدلے قتل نہیں کیا جا

Marfat.com

سکتا۔ اگر اس برابری کو نظر انداز کر دیا جائے تو قصاص شرعاً ممنوع ہوگا۔ ان فقہاء کے نزدیک آیت کے ظاہری معنی کا تقاضا ہے کہ غلام کو غلام کے بدلے قتل کیا جائے، عورت کو عورت کے بدلے۔ غلام کے بدلے آزاد کو قتل نہیں کیا سکتا کیونکہ وہ اس سے کم تر ہے اور یہی بات مؤنث کے بدلے میں مذکر کے قتل پر بھی صادق آتی ہے۔ اس اعتبار سے نہ غلام کا خون آزاد کے خون کی تلافی کر سکتا ہے اور نہ ہی عورت کا خون مرد کے خون کی۔ کیونکہ ان میں برابری موجود نہیں۔ اُن کی رائے میں 'وَكَتَبْنَا عَلَيْهِمْ فِيهَا أَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ' (المائدہ ۵:۴۵)۔ 'اور ہم نے اس پر اس (تورات) میں یہ بات فرض کی ہے کہ جان کے بدلے جان' ۔ ان کے موقف کی تردید نہیں کرتی کیونکہ جان کے بدلے جان کا قصاص پہلی شریعتوں میں تھا۔ جبکہ ہماری شریعت میں قصاص کے لیے ہمسری کا اصول ہے۔ اس آیت میں مخاطب اہل کتاب ہیں جبکہ آیت زیر بحث میں مسلمان مخاطب ہیں اور ان پر وہ فرض کیا گیا ہے جو اس آیت میں موجود ہے۔ دوسرے جان کا بدلہ جان ایک عام حکم ہے اور زیر بحث آیت میں ایک خاص حکم ہے۔ اور خاص، عام پر مقدم ہوتا ہے۔ صاحب کشاف نے اس مسلک کو حسن بصری، عطا، عکرمہ، عمر بن عبدالعزیز، امام مالک اور امام شافعی کی طرف منسوب کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ آیت النَّفْسَ بِالنَّفْسِ کے ابہام کی تفسیر ہے۔

دوسرا نقطۂ نظر

زمانۂ جاہلیت میں جب قتل کی واردات دو ایسے قبیلوں کے درمیان ہوتیں جن میں سے ایک کو زیادہ باعزت سمجھا جاتا تو اونچے قبیلے والے کہتے کہ ہم اپنے غلام کے بدلے میں آزاد کو، عورت کے بدلے میں مرد کو اور ایک آزاد مرد کے مقابلے میں دو مردوں کو قتل کریں گے۔ صاحب کشاف نے سدی کی روایت نقل کی ہے کہ عرب کے دو قبیلوں (ایک روایت کے مطابق بنو نضیر اور بنو قریظہ) کے درمیان زمانہ جاہلیت سے انتقام چلا آ رہا تھا ان میں سے ایک کو دوسرے سے افضل سمجھا جاتا تھا۔ انھوں نے قسم کھا رکھی تھی کہ ہم اپنے غلام کے بدلے میں ان کا آزاد، عورت کے بدلے میں مرد اور ایک آزاد کے بدلے میں دو کو قتل کریں گے۔ ظہور اسلام کے بعد وہ اللہ کے رسول ﷺ کے پاس گئے تو یہ آیت نازل ہوئی۔ چنانچہ آپ نے ان کو حکم دیا کہ مساوات قائم رکھی جائے اس طرح کہ مرد کے بدلے میں اسی مرد کو قتل کیا جائے جو قاتل ہو اور عورت کے بدلے اسی عورت کو قتل کیا جائے جو قاتلہ ہو اور کسی کو نہیں۔ الواحدی نے اپنی کتاب اسباب النزول میں اس روایت کو شعبی کی طرف منسوب کیا ہے۔ جیسا کہ سبب نزول سے واضح ہے کہ اس آیت کی رو سے اہل عرب کے رسم و رواج کو باطل قرار دیا گیا ہے جو

Marfat.com

اپنے غلام کے بدلے آزاد کو قتل کر دیتے تھے۔ اس تخصیص سے ان کو اس بات سے روکا گیا ہے۔ قصاص تو قاتل کی ذات سے لیا جائیگا خواہ کوئی بھی ہو نہ کہ اس کے قبیلے کے کسی اور شخص سے یہ نہیں ہوگا کہ مقتول کے ورثاء اپنی شرافت اور برتری کے بل بوتے پر یہ مطالبہ کریں کہ غلام کے بدلے آزاد یا عورت کے بدلے مرد کو قتل کریں گے۔ اگر غلام قاتل ہے تو غلام ہی قتل ہوگا۔ عورت نے قتل کیا ہے تو عورت ہی قتل کی جائے گی۔ اسلام نے قصاص کا حکم دے کر تمام قومی اور مقام و مرتبہ کے امتیازات کو مٹا دیا۔ اصل سوال تقاضائے عدل کا ہے سوال قاتل و مقتول کی پوزیشن کا نہیں۔ اس آیہ مبارکہ میں نوعی تقسیم ایک نوع کی دوسری نوع پر فضیلت کو لازمی قرار نہیں دیتی۔ اگر ایسا ہوتا تو مرد کے بدلے عورت اور غلام کے بدلے آزاد کو قتل کرنا قصاص نہ کہلاتا۔ کیونکہ اس اعتبار سے عورت کا خون مرد کے خون کی تلافی نہ کرسکتا اور نہ غلام کا خون آزاد کے خون کی۔ اس تنوع کا سب سے پہلا مقصد تو یہ ہے کہ ایک ہی نوع کے افراد میں کوئی باہمی فضیلت نہیں۔ آزاد کو آزاد پر خواہ وہ قریشی ہو یا غیر قریشی کوئی فضیلت نہیں۔ یہی حال تمام انواع کا ہے جب لوگوں کے درمیان حسب و نسب، جنس و نسل اور جاہ و سلطان کے سب امتیاز مٹ جائیں گے تو ان سب کو خواہ وہ آزاد ہو یا غلام، مرد ہو یا عورت ایک ہی نسب یکجا کرے گا اور وہ ہے اسلام کا نسب۔ پھر ان کے خون برابر ہو جائیں گے خواہ وہ آزاد کا خون ہو یا غلام کا، مرد کا ہو یا عورت کا جیسے کہ حدیث نبوی ہے: "اَلْمُسْلِمُوْنَ تتکافأ دِمَاءُ ھم" یعنی "مسلمانوں کے خون ایک دوسرے کے برابر ہیں"۔ جانوں کے سلسلہ میں باہمی فضیلت معتبر نہیں ہوتی کیونکہ اگر ایک جماعت مل کر ایک آدمی کو قتل کر دے تو اس کے بدلے سب قتل کر دئے جائیں گے۔ یہی جمہور کا قول ہے۔ البتہ بعض مفسرین نے یہاں خواہ مخواہ مرد اور عورت کی باہمی فضیلت کا قصہ چھیڑ دیا ہے۔

آیہ مبارکہ میں لفظ قِصَاص مساوات کے معنیٰ پر دلالت کرتا ہے یعنی انسان کے ساتھ وہی سلوک کیا جائے جو اس نے کیا ہے اور مِقَصّ (قینچی) کو مقص اس لیے کہا جاتا ہے کیونکہ اس کے دونوں بازو برابر ہوتے ہیں اور وہ بالوں کو برابر کاٹتی ہے۔ آزاد اور آزاد کے درمیان، غلام اور غلام کے درمیان اور عورت اور عورت کے درمیان زیادتی اور ظلم کو روکا گیا ہے اور مردوں کے درمیان مساوات کو ثابت کیا گیا ہے۔ امام طبری نے مجاھد کا قول نقل کیا ہے کہ الحرّ بالحرّ (آزاد کے بدلے آزاد) میں عورت کے بدلے مرد اور مرد کے بدلے عورت دونوں شامل ہیں۔ امام مالکؒ کا قول ہے کہ "اس آیت کے بارے میں سب سے خوبصورت بات جو میں نے سنی ہے وہ یہ ہے کہ الحرّ بالحرّ میں مرد اور عورت دونوں کی جنس شامل ہے یعنی اس میں الذکر بالذکر مرد کے بدلے مرد والانثی

Marfat.com

با لانثی عورت کے بدلے عورت الانثی با لذکر مرد کے بدلے عورت الذکر با لانثی عورت کے بدلے مرد بھی شامل ہیں اور بعد میں الانثی با لانثی کا تکرار تاکید مزید کے لیے ہے۔ امام رازی نے ایک اور لطیف لغوی نکتہ بیان کیا ہے وہ فرماتے ہیں کہ 'الانثی با لانثی (عورت کے بدلے عورت) غلام عورت کے بدلے آزاد عورت کا متقاضی ہے اگر الحرّ بالحرّ آزاد کے بدلے آزاد اور العبد بالعبد میں اس صورت کو منع کر دیا جائے تو آیت میں تعارض واقع ہو جائے گا جو ناممکن ہے'۔

سورۃ مائدۃ کی آیت (۵:۴۵) آیت مذکورہ کے بعد میں نازل ہوئی اس آیت میں النفس بالنفس (جان کے بدلے جان) کا مطلق حکم ہوا۔ اس آیت کے بارے میں دو اقوال میں سے ایک قول یہ ہے کہ سورۃ مائدہ کی آیت نے سورۃ بقرۃ کی آیت کو منسوخ کر دیا ہے اس لیے اس آیت پر عمل نہیں ہوگا۔ یہ مذہب سعید ابن المسیب، الشعبی، نخعی، قتادہ اور ثوری کا ہے اور یہی امام ابوحنیفہؒ اور ان کے ساتھیوں کا مذہب ہے۔ چنانچہ امام ابوحنیفہ عورت کے بدلے مرد اور ذمی کے بدلے مسلمان کا قتل جائز گردانتے ہیں اور یہی مذہب درست معلوم ہوتا ہے۔ صاحب کشاف کا قول ہے کہ امام مالک اور امام شافعی نے اس مذہب کی مخالفت کی ہے مگر ابو حیان توحیدی نے البحر المحیط میں اسے صاحب کشاف کا وہم قرار دیا ہے اور کہا ہے کہ جو مذہب امام ابوحنیفہ نے اختیار کیا ہے وہی باقی کے تین اماموں نے اختیار کیا ہے کیونکہ رسول کریم ﷺ کے زمانہ سے لیکر آج تک اس بات پر عمل ہو رہا ہے کہ مرد کو عورت کے بدلے قتل کیا جائے گا۔ یہاں اختلاف ہے تو اس بات میں آیا غلام کے بدلے آزاد قتل کیا جائے یا نہیں۔ امام ابوحنیفہ کے سوا باقی ائمہ کا قول ہے کہ غلام کے بدلے آزاد مطلقاً قتل نہیں کیا جائے گا۔ اسی اختلاف کے پیش نظر آیت زیر بحث کو منسوخ سمجھا گیا ہے اور اس قول کو ابن عباس کی طرف منسوب کیا گیا ہے۔

دوسرا قول یہ ہے کہ آیت زیر بحث محکم آیت ہے لیکن مجمل ہے اور اس کی تفصیل سورۃ مائدہ کی آیت میں بیان ہوئی ہے۔ جمہور کا یہی قول ہے حافظ ابن کثیر کہتے ہیں کہ ان دو آیتوں میں سے ہر ایک کا اپنا مقام ہے نفس کے بدلے نفس والی آیت اس زیادتی اور تجاوز سے بحث کرتی ہے جو ایک خاص فرد ایک خاص فرد پر کرتا ہے جبکہ زیر نظر آیت میں اجتماعی زیادتی زیر بحث ہے جیسا کہ عرب کے ان دو قبیلوں کا حال تھا جہاں ایک قبیلہ دوسرے قبیلے پر زیادتی کرتا تھا۔ جب قصاص کا میزان قائم ہوگا تو ایک قبیلے کا آزاد دوسرے قبیلے کے آزاد اور اس کا غلام دوسرے قبیلے کے غلام اور اس کی عورت دوسرے قبیلے کی عورت کے برابر ہوگی ورنہ قصاص کا مقصد ہی فوت ہو جائے گا چنانچہ دونوں

Marfat.com

آیات میں کوئی تعارض نہیں۔

رہا یہ اعتراض کہ سورۃ مائدہ والی آیت اہل کتاب کے بارے میں ہے اس کے مخاطب مسلمان نہیں ہیں۔ تو ایک اصول ہے کہ اگر پہلے لوگوں کی شریعت کے منسوخ ہونے کی کوئی دلیل نہ ہو تو وہ شریعت ہم پر بھی جاری ہوگی اور اس پر عمل بالکل ایسے ہی واجب ہوگا جس طرح اپنی شریعت پر۔

مذکورہ بالا آیت مبارکہ کی روشنی میں یہ کہنا بجا ہے کہ تخلیقی اعتبار سے مرد اور عورت کے درمیان مکمل مساوات ہے اور دونوں کے خون کی ایک جیسی قدر و قیمت ہے اور اللہ کے میزان میں ان کے درمیان فضیلت کا پیمانہ صرف تقویٰ ہے اگر مرد متقی ہے تو وہ افضل ہے اور اگر عورت متقی ہے تو وہ افضل ہے۔ رنگ و نسل اور جنس کی بناء پر فضیلت کے معیار کو اسلام قبول نہیں کرتا۔

اعمال کی جزاء و سزا۔ مرد و زن میں مکمل مساوات

قرآن دونوں اصناف کی مساوات کا نہ صرف اقرار کرتا ہے بلکہ اس پر اصرار کرتا ہے۔ مرد اور عورت دونوں کی اصل ایک ہے۔ مادہ تولید دونوں کے اجزاء سے ترکیب پاتا ہے۔ مرد سے عورت اور عورت سے مرد پیدا ہوتا ہے۔ اصل میں مساوات اجر میں مساوات کی متقاضی ہے۔ مرد اور عورت میں باہمی فضیلت اعمال کی وجہ سے ہے عاملین کی دیگر صفات کے باعث نہیں، تذکیر و تانیث، حسب و نسب، شرافت اور حسن کا اس میں قطعی کوئی دخل نہیں۔ اس بات کو قرآن حکیم میں متعدد مقامات پر بیان کیا گیا ہے۔

سورۃ آل عمران میں ارشاد ربانی ہے: "فَاسْتَجَابَ لَهُمْ رَبُّهُمْ أَنِّي لَا أُضِيعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنكُم مِّن ذَكَرٍ أَوْ أُنثَىٰ بَعْضُكُم مِّن بَعْضٍ"۔ "بس ان کے رب نے ان کی دعا قبول کی (اس وجہ سے کہ) میں بلاشبہ تم میں سے کسی عمل کرنے والے کے عمل کو ضائع نہیں کرتا۔ مرد ہو خواہ عورت، تم سب ایک دوسرے کے جزو ہو (آل عمران ۳:۱۹۵)۔

امام طبری نے مجاہدؒ سے روایت کی ہے کہ ام سلمہؓ نے رسول ﷺ سے پوچھا! اے اللہ کے رسول کیا وجہ ہے کہ ہجرت کے سلسلہ میں مردوں کا ذکر کیا جاتا ہے عورتوں کا نہیں؟ تو یہ آیت نازل ہوئی۔ وہ ارباب دانش جو کسی حال میں اللہ کی یاد سے غافل نہیں ہوتے جو زمین و آسمان کی تخلیق پر غور و فکر کرتے ہیں پکار پکار کر کہہ رہے تھے کہ خدایا! اس میں وہ سب کچھ عطا فرما جس کا تو نے اپنے رسولوں کی زبانی، وعدہ فرمایا ہے: اللہ نے ان کی صداؤں کو سن لیا اور ان کی دعائیں قبول کرلیں کیونکہ وہ کسی عمل کرنے والے کے عمل کو خواہ وہ مرد ہو یا عورت ضائع نہیں کرتا۔ اس بناء پر کہ وہ ایک دوسرے کا جزو ہیں۔ دعا کرنے والوں نے جو اللہ کے حضور میں دعائیں مانگی تھیں اللہ نے انھیں شرف قبولیت

Marfat.com

بخشا اور فرمایا میں کسی عمل کرنے والے کے عمل کو اکارت نہیں کرتا۔ گویا یہ دعاؤں کی قبولیت کی ایک صورت ہے اور اسی کا نام دعاؤں کا قبول ہونا ہے۔ یہ قبولیت دعا ہے کہ کام کرو گے تو اجر پاؤ گے صرف دعا کوئی چیز نہیں جب تک اس کے ساتھ عمل نہ ہو۔ کائنات میں غور وفکر، توبہ استغفار اور اللہ کے ساتھ بیم ورجا کا رشتہ یہ سب باتیں عبادت میں شمار ہوتی ہیں۔ اس عبادت کا ثمرہ وہ عمل ہے جسے اللہ تعالیٰ مرد اور عورت کی تمیز کے بغیر سب انسانوں کی طرف سے قبول فرماتا ہے کیونکہ سب انسانیت میں بھی برابر ہیں اور میزان میں بھی۔

مِّنكُم (تم میں سے) میں مرد اور عورت شامل ہیں مگر نص قرآنی میں ذَكَرٍ اَوْ اُنثٰى کے ساتھ اس کی وضاحت ان کی باہمی مساوات کی حقیقت کو اُبھارنے کے لیے کی گئی ہے تاکہ عورت کے بارے میں جاہلیت کی حماقت اور معاشرے کی تنگ نظری کا پردہ چاک کر دیا جائے۔

بَعۡضُكُم مِّنۢ بَعۡضٍ (تم ایک دوسرے کا جزو ہو) اعمال کی قبولیت میں اللہ تعالیٰ نے مرد اور عورت میں مساوات قائم کی ہے۔ اس مساوات کی علت بَعۡضُكُم مِّنۢ بَعۡضٍ کے قول سے بیان کی ہے کیونکہ مرد کی پیدائش عورت سے اور عورت کی پیدائش مرد سے ہوئی۔ ہر فرد خواہ وہ مرد ہو یا عورت دونوں کے مادۂ تولید سے مرکب ہوتا ہے یعنی دونوں کی اصل ایک ہے۔ اصل میں اشتراک اجر میں اشتراک کا تقاضا کرتا ہے۔ یہ ایک جملہ معترضہ ہے جس میں اللہ کے اس وعدے میں جو اس نے عمل کرنے والے مردوں سے کیا ہے، عورتوں کی مردوں کے ساتھ شرکت کو بیان کرنا ہے اور اس حقیقت پر روشنی ڈالنا ہے کہ مرد اور عورت اللہ کے یہاں مساوی ہیں بشرطیکہ وہ عمل میں مساوی ہوں تاکہ مرد یہ نہ سمجھنے لگے کہ وہ اپنے زور بازو اور معاشرے میں مرتبہ و مقام کی وجہ سے عورت کی نسبت اللہ سے قریب تر ہے اور عورت اس وہم میں نہ رہے کہ مرد اپنی مردانگی کی وجہ سے اللہ کے نزدیک اُس سے بلند تر ہے۔ چنانچہ دونوں میں کوئی فرق نہیں اور دونوں کے درمیان باہمی فضیلت اعمال کی وجہ سے ہے۔

علامہ رشید رضا بَعۡضُكُم مِّنۢ بَعۡضٍ کی تفسیر میں فرماتے ہیں۔ "کہ ان میں سے ہر ایک دوسرے کا جوڑا (زوج) اور جزو ہے اسی مضمون کی ایک حدیث ہے: "النساء شقائق الرجال" "عورتیں مردوں کا آدھا حصہ ہیں" یعنی فطرت میں اور اخلاق میں ان جیسی ہیں اس توجیہ سے بھی یہی مراد ہے کہ دونوں کا اصل ایک ہی ہے۔ امام رازی نے قفال کا قول نقل کیا ہے کہ یہ ترکیب ایسے ہے جیسے کہا جائے فلان منی یعنی اس کی سیرت اور اخلاق وہی ہیں جو میرے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا قول ہے:

Marfat.com

فَمَنْ شَرِبَ مِنْهُ فَلَيْسَ مِنِّي ' پس جس شخص نے اس نہر سے پانی پیا وہ مجھ سے نہیں، یعنی تم اطاعت کے ثواب اور معصیت کے عذاب میں ایک جیسے ہو تو پھر تفاوت چہ معنی دارد؟ بَعْضُكُم مِّن بَعْضٍ کی ترکیب اس جانب واضح اشارہ کرتی ہے کہ عورت اللہ کے نزدیک جزاء وسزا میں مرد کے مساوی ہے اور اس کا مقام ومرتبہ کسی صورت میں مرد سے فروتر نہیں بلکہ جہاں تک قابلیت، احساس ذمہ داری اور بار امانت کو اُٹھانے کا تعلق ہے ان دونوں کا درجہ ایک جیسا ہے اور یہ کیسے نہ ہو؟ کیونکہ مرد اور عورت ایک اصل سے ہیں۔ عورت نر اور مادہ کو جنم دیتی ہے اور مرد نر اور مادہ کی پیدائش کا سبب ہے۔ نر مادہ کی اولاد ہے اور مادہ نر کی۔ تو ایک کو دوسرے پر فضیلت کیسے دی جاسکتی ہے؟ اگر کوئی فضیلت ہوسکتی ہے تو وہ خیر واحسان کے میدان میں عمل سے ہوسکتی ہے۔

یہ آیۂ مبارکہ مسلمان عورتوں کی قدر وقیمت اُن کی اپنی نظروں میں اور مسلمان مردوں کی نظروں میں بلند کرتی ہے۔ تمام اقوام اسلام سے پہلے عورتوں کے حقوق پر ڈاکا ڈالتی تھیں اور اسے صرف مرد کی شہوت کی تسکین کا ذریعہ سمجھتی تھیں۔ بعض اقوام تو یہ سمجھتی تھیں کہ عورت بے روح ہے اس لیے دینی فرائض کی ادائیگی کے قابل نہیں۔ ہم بھی اپنے دین کی تعلیمات کو پس پشت ڈال کر عورتوں کے حق میں کوتاہی کے مرتکب ہوئے ہیں۔ ہمارے اس دور کے دینی پیشوا بھی مرد کو عورت پر فضیلت محض مرد ہونے کی وجہ سے دیتے ہیں اور دلیل یہ پیش کرتے ہیں کہ عورت کی گواہی آدھی ہے میراث میں اس کا حصہ آدھا ہے۔ مرد نان ونفقہ کا بوجھ اُٹھاتا ہے۔ ان سب باتوں کا تعلق سماجی اور اجتماعی اسباب سے ہے۔ اللہ کے یہاں ثواب وعذاب اور عزت وکرامت میں باہمی فضیلت سے کوئی تعلق نہیں بلکہ اللہ نے زوجین کے درمیان اجتماعی حقوق میں بھی مساوات قائم کی ہے۔ اسی مضمون کو قرآن حکیم سورۂ نساء میں یوں بیان کرتا ہے: "وَمَن يَعْمَلْ مِنَ الصَّالِحَاتِ مِن ذَكَرٍ أَوْ أُنثَىٰ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَأُولَٰئِكَ يَدْخُلُونَ الْجَنَّةَ وَلَا يُظْلَمُونَ نَقِيرًا" (۴:۱۲۴)۔ "اور جو شخص کوئی نیک کام کرے گا خواہ وہ مرد ہو یا عورت بشرطیکہ مومن ہو۔ سو ایسے لوگ جنت میں داخل ہوں گے اور ان پر ذرا بھی ظلم نہ ہوگا"۔ صاحب کشاف نے ایک لطیف لغوی نقطہ بیان کیا ہے کہ لفظ مَن (جو کوئی) میں نر اور مادہ شامل ہے پھر مِن بیانیہ کے ساتھ یہ وضاحت کرنے کا کیا مطلب کہ وہ مرد ہوں یا عورت؟ ان کا قول ہے کہ اگر مَن مبہم ہو تو اس کا اطلاق دونوں اصناف پر ہوتا ہے لیکن اگر یہ ظاہر ہو جیسا کہ اس آیت میں ہے تو اس کا اطلاق مردوں پر ہوتا ہے اسی لیے وضاحت کی گئی تاکہ دونوں اصناف وعدے میں شامل ہو جائیں اور مشرکین کو تنبیہ ہو کہ عورتوں کو زندہ درگور کرنا اور ان کو وراثت

Marfat.com

سے محروم کرنا قطعی طور پر ناجائز ہے، کیونکہ اللہ کے یہاں ان کا مقام ومرتبہ مردوں کے برابر ہے، شرط صرف یہ ہے کہ وہ مومن ہوں۔ ایمان عمل کے مفید ہونے کی اسی طرح شرط ہے جس طرح عمل صحت ایمان کی شرط ہے یعنی ان کے درمیان وجہ فضیلت ایمان اور اس کے نتیجہ میں کیا جانے والا عمل ہے۔ عمل بھی ایسا جس سے فرد اور معاشرے کی اخلاقی اور اجتماعی اصلاح ہو۔ مرد اور عورت میں نتائج اعمال کے لحاظ سے کامل مساوات ہے۔ جس طرح مرد کے لیے جنت کی نعمتیں ہیں اسی طرح وہ عورت کے لیے بھی ہیں۔ قرآن کریم نے مرد اور عورت میں کوئی فرق نہیں رکھا۔ نہ کہیں یہ فرمایا کہ مرد کے لیے عورت کی نسبت زیادہ انعامات ہیں۔ مسلمان بھی اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ جنت کے جو انعامات مرد کے لیے ہیں وہ عورت کے لیے نہیں۔ اس سلسلہ میں پیش کی جانی والی احادیث قرآنی مفہوم سے واضح طور پر متصادم ہیں۔

بخاری کتاب الایمان میں ایک حدیث ہے: 'أریت النار اکثر أھلھا النساء'۔ 'واقعہ معراج میں مجھے جہنم دکھائی گئی تو اس کی مکین زیادہ تر عورتیں تھیں'۔ اسی طرح مسلم کتاب الذکر کی روایت ہے: 'أقلّ ساکنی الجنة النساء'۔ 'جنت کے مکینوں میں سے سب سے تھوڑی تعداد عورتوں کی ہے'۔ آیت زیر بحث کے ترجمہ پر نظر ڈالیے وہاں عورت کے متعلق کن خیالات کا اظہار کیا گیا ہے اور ان احادیث میں عورت کے بارے میں کیا تصور پیش کیا گیا ہے؟ عمل کرنے والا خواہ مرد ہو یا عورت اس کی محنت کے ماحصل میں اتنی کمی بھی نہیں کی جائے گی جتنا کہ کھجور کی گٹھلی کا گڑھا ہوتا ہے ایسا کرنا ظلم ہوگا اور اللہ کسی پر ظلم نہیں کرتا۔ یہ ایک فطرتی کلیہ ہے جو مسلمانوں اور اہل کتاب پر یکساں لاگو ہے۔ 'According to his substance shall restitution be'. (Job 30:17) قرآن حکیم نے اسی مضمون کو ایک اور مقام پر کسی قدر اضافے کے ساتھ ایک نئے رنگ میں پیش کیا ہے۔ سورۃ نحل میں ارشاد ربانی ہے: 'مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ أَوْ أُنثَىٰ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهُ حَيَاةً طَيِّبَةً وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ أَجْرَهُم بِأَحْسَنِ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ' (النحل ۱۶:۹۷) 'جو آدمی نیک کام کرے گا خواہ وہ مرد ہو یا عورت بشرطیکہ صاحب ایمان ہو تو ہم اس شخص کو خوشگوار زندگی دینگے اور ان کے اچھے کاموں کے عوض میں ان کا اجر دینگے'۔ مرد اور عورت اللہ کے ساتھ رشتہ جوڑنے اور اللہ کے یہاں جزا پانے میں برابر ہیں۔ مَن کا لفظ مطلقاً مرد اور عورت دونوں کے لیے استعمال ہوتا ہے مگر نص قرآنی میں ذکر اور انثی کے ساتھ اس کی وضاحت ان کے درمیان باہمی مساوات کی حقیقت کو ابھارنے کے لیے کی گئی ہے اور عورت کے بارے میں جاہلیت اور معاشرے کی تنگ نظری کو بیان کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ ایک ایسی لڑکی، جو اعمال صالحہ کی جزا و سزا میں

Marfat.com

لڑکے کے شانہ بشانہ ہے، کی پیدائش پر اس معاشرے میں ناک بھوں چڑھانا اس کی حماقت اور کم عقلی کی دلیل ہے۔

اس آیت میں اور گزشتہ آیۂ مبارکہ میں ایک نئی بات کہی گئی ہے یعنی جو مرد یا عورت اللہ کے قانون کی صداقت پر یقین رکھ کر ایسے کام کرے گا جو اس کی ذات اور معاشرے کو سنوار دیں تو اللہ اس دنیا میں اسے بالطف زندگی عطا فرمائیں گے اور آخرت میں ان کے اچھے کاموں کے عوض میں ان کا اجر دیں گے۔ حیاتِ طیبہ کیا ہے؟ ابن عباسؓ کے قول کے مطابق اس سے مراد رزق حلال اور حسن قناعت ہے۔ روح المعانی کے مصنف اس سے وظیفہ اور تنخواہ مراد لیتے ہیں۔ قتادہؒ کا قول ہے کہ اس سے مراد یومیہ رزق ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ رزق حلال کمانے میں کیا مرد اور کیا عورت سب بااختیار ہیں۔ کسی پر کوئی قدغن نہیں کیونکہ یہ تو اللہ کا عطیہ ہے۔ صالحین کو خوشگوار زندگی نفوس کی شگفتگی اور امید کی قوت سے حاصل ہوتی ہے اگر اس کے ساتھ مال حلال، صحت اور قناعت کو شامل کر لیا جائے تو یہ منتہائے کمال ہے۔ صاحب ایمان دل میں اطاعتِ خداوندی کی حلاوت محسوس کرتا ہے اور اس کی برکت سے اس کے اندر ایسا نور پیدا ہو جاتا ہے کہ وہ ہر حال میں صابر و شاکر اور راضی بر رضا رہتا ہے۔ عمل صالحہ کے ساتھ مومن مرد یا عورت خواہ خوشحال ہو یا تنگدست اچھی زندگی گزارتا ہے۔ خوشحال تو اچھی زندگی گزارتا ہی ہے مگر تنگدست بھی قناعت اور رضا کی بدولت اچھی زندگی گزارنے کے قابل ہو جاتا ہے۔ جمہور کا قول ہے کہ اچھی زندگی سے مراد دُنیوی زندگی ہے جو آلائشوں سے پاک ہو۔ بعض نے اس سے برزخ کی زندگی اور بعض نے جنت کی زندگی مراد لی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ تینوں زندگیاں ایک ہی سلسلہ کی مختلف کڑیاں ہیں۔ جنتی زندگی اس دنیا سے شروع ہوتی ہے اور یقیناً وہ قبر میں بھی رہتی ہے اور پھر قیامت کے روز اپنی پوری آب و تاب سے ظاہر ہوتی ہے۔ یہاں اسی پاک زندگی کا ذکر ہے جو یہاں سے شروع ہو کر ترقی کرتی چلی جائیگی اور کبھی ختم نہ ہوگی۔ ظہور قیامت کے بعد اس کے اور کمالات ظاہر ہوں گے۔

سورۃ مومن میں اللہ تعالیٰ نے مرد و زن کی اس مساوات کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے: "مَنْ عَمِلَ سَيِّئَةً فَلَا يُجْزَىٰ إِلَّا مِثْلَهَا وَمَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّن ذَكَرٍ أَوْ أُنثَىٰ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَأُولَٰئِكَ يَدْخُلُونَ الْجَنَّةَ يُرْزَقُونَ فِيهَا بِغَيْرِ حِسَابٍ" جو نیک کام کرتا ہے خواہ مرد ہو یا عورت بشرطیکہ مومن ہو ایسے لوگ جنت میں جائیں گے وہاں ان کو بے حساب رزق ملے گا" (۴۰:۴۰)

اپنے بندوں کے ضعف اور نیکی کے راستے میں پیش آنے والی مشکلات کے پیش نظر اللہ تعالیٰ کا خاص

Marfat.com

کرم اور احسان ہے کہ وہ نیکیوں کا بدلہ تو کئی گنا زیادہ دیتا ہے مگر برائیوں کی سزا دگنی نہیں دیتا۔ آیت زیر بحث میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ نیز اس آیت میں قانونِ مکافات کا بیان ہے کہ جو کوئی اللہ کی ہدایت کے مطابق نیک اور صلاحیت بخش کام کرتا ہے وہ مرد ہو یا عورت اس کا ٹھکانہ جنت ہے وہاں اسے بے حد و حساب نعمتیں اور آسائشیں حاصل ہوں گی۔

خلاصہ

مرد اور عورت اپنے اعمال کی جزا اور سزا میں بالکل مساوی ہیں کیونکہ وہ ایک دوسرے کا جزو ہیں۔ شرط صرف یہ ہے کہ وہ صاحب ایمان ہوں۔ اس بارے میں ان میں امتیاز کرنا ظلم ہے اور اللہ ظلم روا نہیں رکھتا۔ نیک اعمال کے بدلے اللہ تعالیٰ دونوں کو اس دنیا میں پر لطف اور خوشگوار زندگی عطا کرتا ہے اور آخرت میں ان کا مقام جنت ہے۔ جنت میں مردوں کی تعداد زیادہ ہونے اور عورتوں کی تعداد کم ہونے کا فلسفہ قرآن حکیم کے قانونِ مکافات کے منافی ہے۔

فرشتے اور اللہ کی بیٹیاں؟

مشرکین قریش، فرشتوں کو اللہ کی بیٹیاں سمجھتے تھے۔ قرآن حکیم نے ان کے اس باطل عقیدے کو مختلف مقامات پر بیان کیا ہے۔ اس کے ابطال کے لیے مختلف انداز اختیار کر کے ان کی جہالت، خیانت اور بہتان تراشی کا پردہ چاک کیا ہے۔ عقیدے میں انحراف کا اثر صرف عقیدے تک محدود نہیں رہتا بلکہ یہ اجتماعی زندگی کے مختلف پہلوؤں اور رسوم و رواج میں بھی سرایت کر جاتا ہے کیونکہ عقیدہ خواہ ظاہر ہو یا پوشیدہ زندگی کا محرک اول ہوتا ہے۔ جب بھی سوسائٹی صحیح عقیدے سے منحرف ہوتی ہے جاہلیت کے تصورات سر نکالنا شروع کر دیتے ہیں۔ مشرکین کا عقیدہ تھا کہ بچے دو قسم کے ہوتے ہیں۔ بیٹے اعلیٰ قسم سے تعلق رکھتے ہیں اور بیٹیاں گھٹیا قسم سے۔ اس کے باوجود انھوں نے اپنی طرف اس چیز کو منسوب کر دیا جسے وہ پسند کرتے تھے اور اللہ کی طرف اس چیز کو منسوب کر دیا جسے وہ اپنے لیے ناپسند سمجھتے تھے یعنی بیٹیاں۔ عالم یہ تھا کہ جب ان کو بیٹی کی پیدائش کی خوشخبری دی جاتی تھی تو کراہت کی وجہ سے انکا چہرہ سیاہ پڑ جاتا تھا۔ اور وہ فقر اور عار کے خوف سے اپنی قوم سے منہ چھپاتے پھرتے تھے اور اُن کو زندہ در گور کر دیتے تھے۔ اللہ نے قرآن میں مشرکین کی انتہائی جہالت اور غلط سوچ سے آگاہ کیا ہے ان کی خطا کا مدار یہ نہیں کہ وہ اپنی طرف بیٹیوں کو کیوں نہیں منسوب کرتے انہیں اللہ کی طرف کیوں منسوب کرتے ہیں؟ اللہ کی طرف تو نہ بیٹا منسوب کرنا روا ہے اور نہ بیٹی۔ بلکہ غلطی کا مدار یہ ہے کہ اللہ کی طرف اولاد کو منسوب کیا جائے اور ستم بالائے ستم اس اولاد کو منسوب کیا جائے جو ان کے یہاں قابل نفرت

Marfat.com

ہے۔ اللہ کی ذات اُن تمام صفات سے بالاتر ہے جو انسان میں پائی جاتی ہیں۔ یہ بات تو اُن کی اپنی عقل و دانش اور رسم و رواج کے بھی منافی ہے پھر فرشتوں کو بیٹیاں کہنا بھی غلط ہے کیونکہ ان کے پاس اس کے لیے کوئی عقلی اور نقلی دلیل نہیں ہے۔ علم کے تین طریقے ہیں حس، خبر اور نظر۔ کسی طریقے سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ فرشتے اللہ کی بیٹیاں ہیں۔ قرآن حکیم نے بتایا ہے کہ کس طرح اسلامی عقیدہ تصورات کو درست کرتا ہے اور معاشرے کے اندر عورت کے بارے میں صاف ستھرا نقطۂ نظر پیش کرتا ہے۔

سورۃ نساء میں حق تعالیٰ فرماتا ہے: اِن یَّدعُونَ مِن دُونِہٖ اِلَّآ اِنٰثًا وَاِن یَّدعُونَ اِلَّا شَیطٰنًا مَّرِیدًا (النساء ۴: ۱۱۷)۔ 'اسے چھوڑ کر وہ سوائے دیویوں (زنانی چیزوں) کے اور کسی کو نہیں پکارتے اور وہ سرکش شیطان کے سوا اور کسی کو نہیں پکارتے'۔ اس آیت کے بارے میں دو اقوال ہیں۔ حسن سے مروی ہے کہ عرب کے ہر قبیلے کا بت ہوتا تھا جس کی وہ پرستش کرتے تھے اور کہتے تھے کہ یہ فلاں قبیلے کی دیوی ہے۔ اسے وہ زیور اور طرح طرح کی زینت سے سنوارتے تھے بالکل ایسے جیسے عورتوں کو سنوارا جاتا ہے۔ وہ ان بتوں کو عورتوں کی شکل میں پتھر، لکڑی اور دھات سے بناتے تھے۔ اس لحاظ سے ان کے اکثر بتوں کے نام مؤنث تھے جیسے لات، عزیٰ، منات اور نائلہ۔ اسی طرح ہندوستان میں کالی دیوی، درگا دیوی اور لکشمی کی پوجا کی جاتی تھی اور یونان میں Hecat انتقام اور نفرت کی دیوی تھی۔ ان کا موقف منطقی اور عقلی لحاظ سے درست نہ تھا کیونکہ جنس کے قاعدے کا اطلاق روحانی معاملات پر کرنا جنسی بے راہ روی کی دلیل ہے۔ امام طبری نے اسی قول کو آیت زیر بحث کی بہترین تفسیر قرار دیا ہے اور مجاہد کا یہ قول کہ اس مقام پر اناث (عورتیں) اُوثان (بتوں) کے معنوں میں ہے اس بات کی تائید کرتا ہے۔ حضرت عائشہؓ کی قرأت کے مطابق یہاں اناثا کی بجائے اُوثانا ہے چونکہ یہ آیت مشرکین کی دیویوں اور دیوتاؤں کے سیاق میں ہے اس وجہ سے اس سے مراد دیویاں ہیں۔ چین، ہندوستان، عرب، مصر اور بابل و نینوا کے مشرکانہ مذاہب کی تاریخ میں دیویوں کو بہت اہمیت حاصل ہے کیونکہ زندگی کی اصل ضرورتیں زیادہ تر انھی دیویوں سے متعلق سمجھی جاتی تھیں۔

دوسرا قول ضحاکؒ کی طرف منسوب ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ مشرکین کہا کرتے تھے کہ فرشتے اللہ کی بیٹیاں ہیں۔ عرب زمانہ جاہلیت میں سمجھتے تھے کہ فرشتے اللہ کی بیٹیاں ہیں پھر وہ ان فرشتوں کے مجسمے بناتے اور اُن کے زنانہ نام مثلاً، لات اور منات رکھتے۔ پھر ان بتوں کی پرستش کرتے اور انھیں اللہ کے قرب کا ذریعہ سمجھتے۔ کم از کم شروع شروع میں ایسا ہی ہوتا اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ

Marfat.com

اصل قصے کو بھول کر صرف بے جان پتھروں کی پوجا کرتے۔ یہ قول پہلے سے قریب تر ہے کیونکہ مشرکین بتوں کو فرشتوں کا مظہر سمجھتے تھے اور ان کا عقیدہ تھا کہ یہ خدا کی چہیتی بیٹیاں ہیں جن کی بات خدا کبھی نہیں ٹالتا۔ اس اعتبار سے مذکورہ بالا دونوں اقوال کا مفہوم ایک ہی ہے۔

کیا مؤنث گھٹیا ہوتی ہے؟

حسن سے روایت ہے کہ جن چیزوں میں روح نہ ہو اُن کو انـــاث کہا جاتا تھا امام راغب نے بھی اناث سے مراد جمادات ہی لیے ہیں۔ کیونکہ ان میں صرف قوت منفعلہ (یعنی دوسرے کا اثر قبول کرنا) ہوتی ہے اور وہ قوت فاعلہ سے محروم ہوتے ہیں جیسا کہ اللہ کا قول ہے: 'أَلَهُمْ أَرْجُلٌ يَمْشُونَ بِهَا أَمْ لَهُمْ أَيْدٍ يَبْطِشُونَ بِهَا أَمْ لَهُمْ أَعْيُنٌ يُبْصِرُونَ بِهَا أَمْ لَهُمْ آذَانٌ يَسْمَعُونَ بِهَا' (۷:۱۹۵)۔ 'کیا ان کے پاؤں ہیں جن سے وہ چلتے ہیں یا ان کے ہاتھ ہیں جن سے وہ پکڑتے ہیں یا ان کی آنکھیں ہیں جن سے وہ دیکھتے ہیں یا ان کے کان ہیں جن سے وہ سنتے ہیں'۔ یہ آیت مبارکہ ان بتوں کے بارے میں ہے جن کی پوجا مشرکین کرتے تھے۔ اس کا اطلاق نوع انسانی پر خواہ مرد ہو یا عورت کیسے ہوسکتا ہے؟

لغتِ قرآن کے بارے میں امام راغب کا مرتبہ اور مقام مسلم ہے مگر مؤنث کو جمادات قرار دینا قرآنی فکر کے منافی ہے۔ اپنے سماجی رویوں کے زیر اثر بعض مفسرین نے اس آیت کی غلط تفسیر کی ہے۔ امام طبری فرماتے ہیں: 'مشرکین کی گواہی اور کفر کے ثبوت کے لیے یہی حجت کافی ہے کہ وہ مؤنث کی عبادت کرتے ہیں اور ان کو معبود تصور کرتے ہیں حالانکہ ہر چیز کا مادہ بہت زیادہ گھٹیا ہوتا ہے اور مشرکین گھٹیا چیزوں کی معبودیت کا اقرار کرتے ہیں۔ حالانکہ وہ ان کی خست سے واقف ہیں۔ اللہ نے جسے اشرف المخلوق کے لقب سے نوازا ہے کیا وہی اللہ اس کو خسیس قرار دے سکتا ہے؟ ظاہر ہے کہ عورت کے گھٹیا پن کا جاہلی تصور خلافت راشدہ کے دور کے بعد پھر لوٹ آیا۔ امام رازی نے تفسیر کبیر میں عورت کے بارے میں بہت ہی گھناؤنا تصور پیش کیا ہے وہ فرماتے ہیں اِناثًا کے معنی مواتًا (مردہ) ہیں اور مُردوں کو اناث کہنے کے دو سبب ہیں ایک یہ کہ مردوں کی خبریں اسی صیغہ سے دی جاتی ہیں جس میں مؤنث کی خبریں دی جاتی ہیں مثلاً کہا جاتا ہے: 'ھذہ الاحجار تعجبنی' 'یہ پتھر مجھے اچھے لگتے ہیں'۔ بالکل اسی طرح کہا جاتا ہے: 'ھذہ المرأۃ تعجبنی' 'یہ عورت مجھے اچھی لگتی ہے'۔ دوسرے یہ کہ عورت مرد سے گھٹیا ہوتی ہے۔ مرد زندہ ہوتے ہیں اور عورت مردہ۔ اسی لیے جمادات اور مُردوں کے لیے زنانہ نام استعمال ہوتے ہیں۔ یہ ہے عورت کے بارے میں ہمارے بعض مفسرین کا

Marfat.com

نقطۂ نظر۔ اگر وہ اس تصور کو مشرکین کی طرف منسوب کر کے کہتے کہ اللہ نے عورت کے بارے میں ان کے تصور کو بیان کیا ہے تو بات بن جاتی مگر انھوں نے تو اسی تصور کو براہ راست اللہ سے منسوب کیا ہے اور یہ بہت بڑی زیادتی ہے۔ یہ ممکن ہے کہ اللہ نے عرب مشرکین کو ان کی جہالت پر متنبہ کیا ہو کہ وہ اپنے معبودوں کے لیے ایسا لفظ استعمال کرتے ہیں جو ان کے اپنے تصور کے مطابق بے بس اور حقیر مخلوق کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ مگر اپنے مفسر اپنے سماجی تصورات کے زیر اثر غلط معنی پہنا کر قرآن کو پاژند بنا دیتے ہیں۔

پریشان فکری جو عقیدے میں انحراف کی وجہ سے مشرکین کے دل و دماغ پر چھائی ہوئی تھی قرآن نے اسے بڑے ہی منطقی انداز میں پیش کیا ہے۔ فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں کہنے والے لوگوں کا یہ عالم تھا کہ جب ان میں سے کسی کو خوشخبری دی جاتی کہ ان کے یہاں لڑکی پیدا ہوئی ہے تو یہ خبر اس پر بجلی بن کر گرتی وہ جس چیز کو خود ناپسند سمجھتے تھے اسے اللہ کے لیے پسند کرتے تھے۔ وہ اپنے اس فعل کی وجہ سے خود مجرم قرار پا رہے تھے گویا کہ خود فطرت ان کو مجرم ٹھہرا رہی تھی۔

سورۃ نحل میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "وَيَجْعَلُونَ لِلَّهِ الْبَنَاتِ سُبْحَانَهُ وَلَهُم مَّا يَشْتَهُونَ ۝ وَإِذَا بُشِّرَ أَحَدُهُم بِالْأُنثَىٰ ظَلَّ وَجْهُهُ مُسْوَدًّا وَهُوَ كَظِيمٌ ۝ يَتَوَارَىٰ مِنَ الْقَوْمِ مِن سُوءِ مَا بُشِّرَ بِهِ أَيُمْسِكُهُ عَلَىٰ هُونٍ أَمْ يَدُسُّهُ فِي التُّرَابِ أَلَا سَاءَ مَا يَحْكُمُونَ ۝ لِلَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِالْآخِرَةِ مَثَلُ السَّوْءِ وَلِلَّهِ الْمَثَلُ الْأَعْلَىٰ وَهُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ۝" (النحل ۱۶: ۵۷ تا ۶۰) "اور اللہ کے بیٹیاں ٹھہراتے ہیں۔ سبحان اللہ اور خود ان کے لیے وہ جس کے وہ بڑے خواہشمند ہیں اور جب ان لوگوں میں سے کسی کو بیٹی پیدا ہونے کی خوشخبری دی جاتی ہے تو اس کا چہرہ کالا پڑ جاتا ہے اور وہ (غم سے) گھٹا گھٹا رہتا ہے۔ جس بات کی اسے خوشخبری دی جاتی ہے (گویا کہ) وہ ایک برائی ہے (جس کی وجہ سے شرم کے مارے) وہ لوگوں سے چھپتا پھرتا ہے۔ آیا اسے بحالت ذلت لیے رہے یا اسے مٹی میں گاڑ دے۔ سنو! کیا ہی برا فیصلہ ہے جو وہ کرتے ہیں۔ جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں لاتے ان کی بری مثال ہے اور اللہ کی صفت نہایت بلند ہے۔ اور وہ غالب ہے، حکمت والا ہے۔"

خزاعہ اور کنانہ کے قبیلے کہا کرتے تھے کی فرشتے اللہ کی بیٹیاں ہیں گویا وہ اپنی جہالت کے باعث پہلے فرشتوں کو مؤنث ٹھہراتے اور پھر انھیں اللہ کی بیٹیاں قرار دیتے۔ اللہ کی ذات اس بات سے پاک ہے کہ بچے یا بچی کی نسبت اس کی طرف کی جائے۔ اس کے لیے نہ بیٹا روا ہے نہ بیٹی اور یہ بھی مناسب

Marfat.com

نہیں کہ وہ اپنی طرف تو اس چیز کو منسوب کریں جسے وہ پسند کرتے ہیں یعنی بیٹے اور اللہ کی طرف اس چیز کو منسوب کریں جس کو وہ اپنے لیے ناپسند کرتے ہیں یعنی بیٹیاں وہ خود اپنے فعل کی وجہ سے مورد الزام ٹھہرے۔ خطا کا مدار یہ نہیں کہ وہ اپنی طرف بیٹوں کو کیوں منسوب کرتے ہیں انھیں اللہ کی طرف کیوں منسوب نہیں کرتے بلکہ خطا کا مدار یہ ہے کہ بیٹیوں کو خود ناپسند کرنے کے باوجود ان کو اللہ کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ یہ تھے مشرکین عرب کے کرتوت۔ اللہ نے ان کو ان کے کرتوتوں سے اس لیے آگاہ کیا ہے تا کہ وہ ان سے اجتناب کریں۔ پھر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ یہ مشرک بیٹیوں کو تو اپنی طرف منسوب کرنے پر راضی نہیں ہوتے اور ان کی حالت یہ ہے کہ جب ان میں سے کسی کو بیٹی کی پیدائش کی خوشخبری دی جاتی ہے تو اس کا چہرہ سیاہ پڑ جاتا ہے۔ اللہ کے اس قول 'اذا بشّر احدھم' میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ بچہ خواہ نر ہو یا مادہ اللہ کی ایک نعمت ہے۔ زندگی ایک مرحلے سے دوسرے مرحلہ تک ارتقائی سفر طے کرتی ہے اور اللہ کے حکم سے ایک نطفہ جاندار کی شکل اختیار کرتا ہے انسان کے بس میں نہ تو یہ ہے کہ رحم مادر میں نر اور مادہ کی تصویر بنائے اور نہ یہ اس کے بس میں ہے کہ اس میں زندگی پھونکے اور نہ یہ کہ وہ ایک معمولی سے قطرے سے ٹھیک ٹھاک انسان بنا دے۔ کیا یہ چیز اس بات کا تقاضا نہیں کرتی کہ پیدا ہونے والے بچے کا جنس کی تمیز کے بغیر خوشی خوشی استقبال کیا جائے اور اللہ کے اس معجزے کو خوش آمدید کہا جائے جو بار بار رونما ہوتا ہے۔ اس بشارت کی شان یہ ہے کہ وہ والد کا دل فرحت و سرور سے بھر دے۔ زندہ وجود کی فطرت ہے کہ جب اس کے یہاں بچہ پیدا ہوتا ہے تو یہ جاننے سے پیشتر کہ وہ لڑکا ہے یا لڑکی، محض اس کے چہرے پر نظر پڑنے پر وہ ہشاش بشاش ہو جاتا ہے بچے کو دیکھ کر حیوان بھی خوش ہونے سے گریز نہیں کرتا حالانکہ اسے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ بچہ نر ہے یا مادہ۔ سب بچے اس کے نزدیک ایک جیسے ہوتے ہیں۔ یہ اُس کے جگر کے ٹکڑے ہوتے ہیں۔ وہ انسان جو اپنے بچوں کے درمیان امتیاز کرتا ہے وہ فطرت کا باغی اور زندگی کی اصل راہ سے بھٹکا ہوا ہوتا ہے۔ اگر بچے کی حالت کو پیش نظر رکھا جائے تو بیٹی کی ولادت بھی حقیقی بشارت ہے۔

ان مشرکین اور بتوں کے پجاریوں کی بیٹی سے نفرت اس حد تک تجاوز کر جاتی ہے کہ جب انھیں بیٹیوں کی پیدائش کی خوشخبری دی جاتی ہے تو مارے غم کے ان کا چہرہ سیاہ پڑ جاتا ہے۔ روح اور چہرے میں ایک گہرا تعلق ہے۔ خوشی کی حالت میں جب روح چہرے تک پہنچتی ہے تو وہ چمک اٹھتا ہے اور روشن ہو جاتا ہے۔ لیکن جب انسان بہت زیادہ غمزدہ ہو جاتا ہے تو روح اندر ہی اندر گھٹی رہتی ہے اور چہرے کی رنگت ماند پڑ جاتی ہے وہ زرد پڑ جاتا ہے یا سیاہ ہو جاتا ہے۔ اسی لیے چہرے کی چمک

Marfat.com

خوشی کا کنایہ اور رنگت کی تبدیلی اور سیاہی رنج وغم کا کنایہ ہے غم سے اس مشرک کا چہرے سیاہ پڑ جاتا ہے وہ گھٹا گھٹا رہتا ہے۔ بیٹی کو اپنے لیے باعث ننگ سمجھ کر لوگوں سے چھپتا پھرتا ہے اور اس مخمصے میں رہتا ہے یا تو ذلت گوارا کر کے بیٹی کو زندہ رکھے یا اسے زمین میں دفن کر کے ننگ و عار سے چھٹکارا حاصل کر لے۔

ظل وجهه مسودًا کے لفظی معنی ہیں کہ سارا دن اس کا چہرہ سیاہ رہتا۔ وضع حمل زیادہ تر رات کے وقت ہوتا۔ ولادت کی خبر کو خاص طور پر لڑکیوں کی ولادت کی خبر کو دن تک متاخر کر دیا جاتا۔ اس لیے ظلّ کے معنی یہ ہیں کہ وہ دن بھر اسی حالت میں رہتا اور اس کی حالت اس مشکیزے کی سی ہوتی جو بھرا ہوا ہو اور اس کا منہ بند ہو۔

لڑکیوں کو زندہ درگور کرنے کی رسم

زمانہ جاہلیت میں جب بیوی پر دردزہ کے آثار نمایاں ہوتے تو میاں، قوم اور قبیلے کی نظروں سے چھپ جاتا تھا یہاں تک کہ اسے خبر ملتی بچہ یا بچی پیدا ہوئی ہے۔ اگر لڑکا ہوتا خوش ہو جاتا اور اگر لڑکی ہوتی تو رنجیدہ ہو جاتا اور کئی دنوں تک لوگوں کے سامنے نہ آتا اور سوچتا رہتا کہ لڑکی کا کیا کرے۔ اسے ذلت کے باوجود اٹھائے رکھے یا اسے مٹی میں دفن کر دے جب لڑکی پانچ چھ سال کی عمر کو پہنچ جاتی تو اسے مختلف طریقوں سے زندہ درگور کر دیا جاتا یا تو گڑھا کھود کر اسے زندہ دھکیل کر اوپر سے مٹی ڈال دیتے یا پہاڑ سے نیچے گرا دیتے یا ان کو غرق کر دیتے، یہ کام کبھی تو غیرت کی وجہ سے کرتے اور کبھی فقر و فاقہ کے خوف سے۔ امام رازی نے ایک روایت بیان کی ہے کہ ایک آدمی اللہ کے رسول ﷺ کے پاس آیا اور عرض کی: اے اللہ کے رسولؐ جب سے میں مسلمان ہوا ہوں میں اسلام کی حلاوت محسوس نہیں کرتا کیونکہ زمانہ جاہلیت میں میری ایک بیٹی تھی۔ میں نے اپنی بیوی سے کہا کہ اسے بنا سنوار کر میرے ساتھ روانہ کرو۔ میں اسے لے کر ایک گہری وادی میں پہنچ گیا۔ میں نے اسے اس میں دھکا دیا۔ وہ مجھ سے کہتی رہی ابا جان آپ مجھے مار ڈالیں گے؟ یہ بات سن کر رسول کریم ﷺ کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ اس رسم کی اصلاح قرآن کریم نے ابتداء ہی سے مدنظر رکھی چنانچہ قرآن میں اللہ کا ارشاد ہے: "وَإِذَا الْمَوْءُودَةُ سُئِلَتْ ۝ بِأَيِّ ذَنبٍ قُتِلَتْ ۝" "جب زندہ درگور لڑکی سے پوچھا جائے گا کہ اسے کس گناہ کی وجہ سے قتل کیا گیا" (التکویر ۸۱:۸ تا ۹) اس سنگدلی پر رحمۃ العالمین ﷺ کا دل پسیجا اور آپ کی آواز نے وہ اثر پیدا کیا جو نہ قانون کر سکتا ہے اور نہ کوئی عبرت ناک سزا، بدی کو دور کرنے کی جو طاقت آپ کو دی گئی تھی اس کی نظیر دنیا میں

Marfat.com

کہیں اور نظر نہیں آتی۔

آیت زیر بحث میں ہر طرح کی موت کو مٹی میں دفن کرنے سے تعبیر کیا گیا ہے۔ صاحب روح المعانی نے کہا ہے کہ ایک قول کے مطابق اس سے مراد بیٹیوں کو لوگوں کی نظروں سے چھپانا ہے۔ یہ بھی تو مٹی میں دفن کرنے کے مترادف ہے۔ جو لوگ خواہ مخواہ عورت کے چہرے کو چھپانے پر زور دیتے ہیں ان کو 'ام یدسّہ فی التراب' (یا اس کو مٹی میں گاڑ دے) کی اس تعبیر پر غور کرنا چاہیے۔ معاشرے سے الگ کر کے عورت کو ایک جگہ محبوس کر دینا بھی تو مٹی میں دفن کرنے کے برابر ہے۔

'الا سآء ما یحکمون'' سن لو! بہت ہی برا ہے جو فیصلہ وہ کرتے ہیں'۔ یعنی بیٹیوں کے بارے میں ان کا فیصلہ بہت برا ہے۔ صاحب روح المعانی نے ابن عطیہ کا قول نقل کیا ہے کہ 'یہ اللہ کی طرف سے ناپسندیدگی کا اظہار ہے کہ وہ اپنی بیٹیوں کو یا تو ذلت کی حالت میں زندہ رکھتے ہیں یا ان کو زندہ درگور کر دیتے ہیں حالانکہ ان کا رزق تو اللہ کے ذمے ہے'۔ آیت کا یہ ٹکڑا ظاہری طور پر اس آدمی کی مذمت کرتا ہے جو بچی کی بشارت پر غمزدہ ہوتا ہے کیونکہ آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مشرکین کا فعل ہے۔ ابن جریر نے قتادہ سے روایت کی ہے کہ (اذا بشر) میں اللہ کا فرمان ہے کہ یہ مشرکین عرب کا فعل تھا۔ جہاں تک اہل ایمان کا تعلق ہے وہ تو راضی برضاء ہوتے ہیں اور اللہ کے فیصلے کو انسان کے فیصلہ سے بہتر سمجھتے ہیں کیونکہ صرف اللہ ہی جانتا ہے کہ لڑکا بہتر ہے یا لڑکی۔ بہت سی لڑکیاں اپنے گھر والوں کے لیے لڑکوں سے بہتر ہوتی ہیں۔ اللہ نے مشرکین کے کرتوتوں سے آگاہ کیا ہے تاکہ ہم اس سے اجتناب کریں۔

آیت زیر بحث سے پتہ چلتا ہے کہ جسے لڑکی کی خوشخبری دی جاتی ہے وہ کبیدہ خاطر کیوں ہوتا ہے؟ اور قوم سے کیوں چھپتا پھرتا ہے؟ وہ نہ تو خالق ہے نہ مصور۔ وہ قدرت کے ہاتھ میں ایک آلہ ہے اگر اس میں رتی بھر عقل ہوتی تو اسے پتہ چل جاتا کہ یہ اس کے بس کی بات نہیں اور نہ کسی اور کے بس میں ہے کہ وہ لڑکی یا لڑکے کی تخلیق کرے یہ صرف اللہ کا کام ہے۔ اسے بچی کی پیدائش پر شرمسار ہونے اور لوگوں کے درمیان سر جھکا کر چلنے کی کیا ضرورت ہے؟ کیا کوئی عقل مند اس پر یہ تہمت باندھ سکتا ہے کہ اس نے لڑکی کو کیوں پیدا کیا لڑکے کو کیوں نہیں پیدا کیا؟ ایسی بات تو احمقوں کی سوسائٹی میں کہی جا سکتی ہے۔ اللہ کی حکمت اور قانون زندگی کا تقاضا ہے کہ زندگی مرد اور عورت سے جنم لے۔ دستور حیات میں عورت مرد کی طرح اصل اصیل ہے بلکہ مرد سے بڑھ کر کیونکہ وہ زندگی کی

Marfat.com

قرارگاہ ہے۔ پس جسے لڑکی کی خوشخبری دی جاتی ہے اسے غمزدہ ہونے اور لوگوں کی نظروں سے چھپنے کی کیا ضرورت ہے؟ عورت انسانیت کا جزو ہے اس کی توہین پوری انسانیت کی توہین ہے اسے زندہ گاڑنا نفسِ بشریت کے قتل اور زندگی کے ضیاع کے مترادف ہے۔ یہ حکمت تخلیق کے منافی ہے کیونکہ اس کا تقاضا ہے کہ نہ صرف انسان بلکہ ساری مخلوق نر اور مادہ سے پیدا ہو۔

آیت کی تفسیر کے سلسلہ میں صاحب کشاف صاحب البحر المحیط اور صاحب روح المعانی نے اَصمعی کی روایت سے شعر نقل کیے ہیں جو اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ بیٹیوں سے مشرک عربوں کی نفرت کس حد کو چھو رہی تھی۔ اَصمعی نے روایت کی ہے کہ ایک عورت کے ہاں بچی پیدا ہوئی جس کا نام اس نے الذلفاء رکھا اس کا شوہر گھر چھوڑ کر چلا گیا محض اسی وجہ سے کہ اس کے ہاں بچی کیوں پیدا ہوئی ہے؟ تو عورت نے یہ شعر کہے:

مَا لِأَبِی الذلفاء لا یاتینا
یَظَلّ فِی البَیْتِ الذی یَلینا
یحرد أن لا نلد بنینا
وانما ناخذ ما یُعْطِینَا
کانما ذلک فی ایدینا
ونحن کالارض لزارعینا
نخرج ما قد بذروا فینا

ذلفاء کے باپ کو کیا ہو گیا ہے کہ وہ ہمارے یہاں نہیں آتا
بلکہ برابر کے گھر میں رہتا ہے
وہ اس بات پر غضبناک ہے کہ ہم بیٹوں کو جنم نہیں دیتیں
ہم تو صرف وہی لیتی ہیں جو وہ ہمیں دیتے ہیں
گویا کہ یہ بات ہمارے ہاتھ میں ہے
ہم تو اپنے کاشتکاروں کے لیے زمین کی مانند ہیں
جو بیج وہ ہم میں ڈالتے ہیں ہم اُسے ہی نکالتی ہیں۔

دیکھا ایک جاہل اور گنوار عورت نے کیا پتے کی بات کہہ دی؟ سائنسی تحقیق نے بھی اس بات کو ثابت کر دیا ہے کہ بچے اور بچی کی ولادت کا تعلق مرد کے جرثومۂ حیات سے ہے۔ آیۂ مبارکہ

Marfat.com

کے آخر میں مومن اور کافر کی سوچ کا فرق بتایا گیا ہے۔امام راغب نے اس آیت میں دونوں جگہ مثل کے معنی وصف ہی کیے ہیں یعنی ان مشرکین کی صفات بری ہیں اور اللہ کی صفات بلند تر ہیں یعنی وہ لوگ جو آخرت پر یقین نہیں رکھتے ان کی بری صفت ہے، ان کی بری صفت کیا ہے؟ نر بچے کی رغبت تا کہ ان کی موت کے بعد ان کا جانشین ہو اور ان کے نام کو زندہ رکھے اور تا کہ بوقت ضرورت اس سے مدد مانگی جائے اور لڑکی سے نفرت، غیرت وخوف کی وجہ سے اسے مار ڈالنا، یہ سب بری صفات ہیں کیونکہ یہ عجز، بے بسی اور انتہائی طمع اور لالچ پر دلالت کرتی ہیں۔ برائی میں ہر برائی شامل ہے شعور کی برائی، رویے کی برائی، عقیدے، عمل اور تصور کی برائی۔ اللہ کی صفات بلند تر ہیں وہ اولاد سے بے نیاز ہے اور مخلوق کی صفات سے مبرا۔ جاہلیت کے نظریہ اور اسلام کے نظریہ میں وہی فرق ہے جو آخرت کے منکرین کی صفاتَ اور اللہ کی صفات میں فرق ہے۔ آخرت کا منکر اللہ تعالیٰ کی مشیت اور فیصلے پر اعتراض کرتا ہے۔ جہاں تک مومن کا تعلق ہے وہ راضی برضا ہوتا ہے اور اللہ کے فیصلے کو انسان کے فیصلے سے بہتر سمجھتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہمیں منکرین آخرت کی سوچ سے آگاہ کیا ہے تا کہ ہم اس سوچ سے گریز کریں۔ جب بھی معاشرہ، درست عقیدے سے منحرف ہو جائے گا جاہلیت کے تصورات سر نکالنا شروع کر دیں گے۔ آج بھی بہت سے معاشروں میں یہ تصورات دوبارہ رونما ہو گئے ہیں۔ بہت سے لوگ لڑکیوں کی پیدائش کا خیر مقدم نہیں کرتے۔ لڑکوں کی طرح نہ ان کا احترام کرتے ہیں اور نہ ان کا خیال رکھتے ہیں۔ اس کا سبب اس اسلامی عقیدے سے انحراف ہے جس نے انسان کو عزت بخشی۔ جنس بشری کی تکریم کا لازمہ عورت کی تکریم ہے کیونکہ وہ نفس بشری کا جزو ہے۔ اللہ کے یہاں دونوں اجزاء میں نہ کوئی افضل ہے نہ کوئی مفضول۔

کیا بیٹیوں کو زمانہ جاہلیت ہی میں زندہ درگور کر دیا جاتا تھا یا اب بھی وہ زندہ درگور ہوتی ہیں؟ اوپر میں نے تفسیر روح المعانی کا ایک قول نقل کیا ہے کہ بیٹیوں کو لوگوں کی نظروں سے چھپانا ان کو مٹی میں دفن کرنے کے مترادف ہے۔ اس سلسلہ میں آنکھوں دیکھا واقعہ پیش کرتا ہوں۔ سعودی عرب میں وزارۃ البرید والبرق والہاتف کے ترجمہ سیکشن کا انچارج تھا۔ ایک سعودی ہمارے سیکشن میں آیا اور ایک سعودی ملازم سے کہنے لگا کہ میری ایک جوان بیٹی ہے۔ نو دس برس کی عمر کے بعد میں نے اُسے گھر سے نکلنے نہیں دیا۔ اس پر سورج کی نظر بھی نہیں پڑی۔ میں اس کی شادی کرنا چاہتا ہوں کوئی رشتہ نہیں مل رہا۔ ظاہر ہے گھر کی چار دیواری میں محبوس ایک اجڈ اور ان پڑھ انسانی رویوں سے نا آشنا سے کون شادی کرتا۔ باپ نے اسے زندہ درگور کر دیا تھا اور سمجھ رہا تھا کہ یہ بہت بڑی خوبی ہے کہ بیٹی

Marfat.com

کو گھر سے باہر نہ نکلنے دیا جائے۔ اسے اپنے عزیز و اقارب سے بھی نہ ملنے دیا جائے اور اسے تعلیم سے محروم رکھا جائے۔ حالانکہ گھر میں مقید رکھنا ایک سزا ہے جو ایسی عورتوں کے لیے تجویز کی گئی ہے جو بدکاری کی مرتکب ہوتی ہیں اور ان کے اس فعل پر چار گواہ گواہی دے چکے ہوتے ہیں (النساء ۴:۱۵)۔
یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہے کہ عورت کو گھر میں مقید رکھنا ایک سزا ہے۔ اس کے علاوہ درگور کرنے کی کئی صورتیں آج کل کے معاشرے میں زمانہ جاہلیت کی طرح مروج ہیں۔ مثلاً الٹرا ساؤنڈ کے ذریعہ پیدائش سے پہلے بچے کی صنف کا پتہ لگایا جاتا ہے اور اگر ماں کے پیٹ میں بچی ہو تو حمل گرا دیا جاتا ہے اور اگر بچہ ہو تو زچہ کا پورا خیال رکھا جاتا ہے اس کا محرک وہی ہے جو زمانہ جاہلیت میں تھا یعنی ننگ، عار اور فقر و فاقہ۔

اکیسویں صدی میں پاکستانی معاشرے کا یہ عالم ہے کہ پنچایت فیصلہ کرتی ہے کہ ملزم کی بہن مختار مائی کے ساتھ اجتماعی زیادتی کی جائے۔ ضلع میانوالی میں ایک مقتول کے خون بہا کا فیصلہ یوں کیا جاتا ہے کہ مقتول کے ورثا کو آٹھ ملین روپیہ ادا کیا جائے اور ساتھ ہی ۱۲ برس سے لیکر ۱۷ برس تک کی آٹھ لڑکیاں ان کے سپرد کی جائیں۔ ان میں سے دو لڑکیوں جن کی عمر ۱۷ اور ۱۴ برس تھی ۸۷ اور ۵۵ برس کے بوڑھوں کے ساتھ بیاہ دیا جاتا ہے۔ کیا یہ قرآنی اصطلاح میں مٹی میں دفن کرنے کے مترادف نہیں؟ انسانی حقوق کے پاکستانی کمیشن کی رپورٹ کے مطابق ۱۹۹۶ء اور ۱۹۹۸ء کے درمیان ۸۵۰ عورتوں کو ان کے شوہروں، والدوں اور بھائیوں نے قتل کیا۔ ۱۹۹۷ء میں تین سو عورتوں کو عزت اور غیرت کی خاطر قتل کیا گیا۔ ایک ایسا قتل جس کی اجازت دنیا کا کوئی قانون نہیں دیتا۔ آج کل کی سوسائٹی میں عورتوں کے قتل کی بڑی وجوہات یہ ہیں:

۱۔ پسند کی شادی۔

۲۔ جدی پشتی انتقام جس میں عورت کا قطعی کوئی قصور نہیں ہوتا۔

۳۔ جہیز میں کمی۔

۴۔ نر بچہ کا نہ پیدا ہونا۔

۵۔ عزت اور غیرت

کارو کاری کی رسم سندھ کے علاقے میں عام ہے۔ پنچایت اکثر عورت کو موردِ الزام ٹھہرا کر قتل کروا دیتی ہے جبکہ مرد کے عیوب پر پردہ ڈال دیا جاتا ہے۔ بیوی کو آگ لگا دی جاتی ہے اور کہہ دیا جاتا ہے کہ گیس کا چولہا پھٹ گیا۔ یہ سب زندہ درگور کرنے کی مختلف شکلیں ہیں۔ یہ مائیں، بہنیں

Marfat.com

اور بیٹیاں جو آئے دن مردوں کی خواہشات کی بھینٹ چڑھتی ہیں کیا قیامت کے روز خالق کائنات ہم سے پوچھے گا نہیں کہ انکو کس گناہ کی پاداش میں قتل کیا گیا؟ 'بِاَیِّ ذَنْبٍ قُتِلَتْ' (التکویر ۸۱:۹) کیا ان کا قتل انسانیت کا قتل نہیں؟

سورة بنی اسرائیل میں مشرکین عرب کے ایک موٹے قسم کے شرک کا ذکر کیا ہے اور ان کی حماقت کی طرف توجہ دلائی ہے کہ اول تو خدا کا شریک ٹھہرانا ہی حماقت ہے پھر ستم بالائے ستم اللہ تعالیٰ کی طرف ایسی مخلوق کو منسوب کرتے ہیں جسے وہ خود اپنے لیے بھی پسند نہیں کرتے یعنی یہ کہ فرشتے اللہ کی بیٹیاں ہیں۔ گویا کہ ان کے عقیدے کو انھی کی منطق سے باطل قرار دیا گیا ہے۔ ارشاد ربانی ہے: 'اَفَاَصْفٰکُمْ رَبُّکُمْ بِالْبَنِیْنَ وَاتَّخَذَ مِنَ الْمَلٰٓئِکَةِ اِنَاثًا' (بنی اسرائیل ۱۷:۴۰) 'کیا تمھارے رب نے تمھیں بیٹوں کے لیے چن لیا اور خود فرشتوں کو بیٹیاں بنایا؟ تم بڑا بول بولتے ہو'۔ اس آیہ مبارکہ میں ہمزہ استفہام (أ) انکار اور تھکم (مذاق اُڑانا) کے لیے آیا ہے۔ انکار اس بات کا کہ فرشتے اللہ کی بیٹیاں ہیں کیونکہ اللہ میاں بچے اور بیوی سے، شبیہ اور شریک سے بلند تر ہے اور مذاق اس بات کا کہ اللہ کی طرف بیٹیوں کو منسوب کرتے ہیں، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: 'اَمِ اتَّخَذَ مِمَّا یَخْلُقُ بَنٰتٍ وَّاَصْفٰکُمْ بِالْبَنِیْنَ' (الزخرف ۴۳:۱۶) 'آیا اُس نے اپنی مخلوق میں سے بیٹیوں کو اپنایا ہے اور تمھیں بیٹوں کے لیے چن لیا ہے'۔ 'اَمْ لَهُ الْبَنٰتُ وَلَکُمُ الْبَنُوْنَ' (طور ۵۲:۳۹) 'کیا تمھارے لیے بیٹے ہیں اور اس کے لیے بیٹیاں؟' اور اللہ کے قول 'الکم الذکر ولہ الأنثی' یعنی 'کیا تمھارے لیے مذکر ہے اور اس کے لیے مؤنث' (النجم ۵۳:۲۱) میں ہمزہ انکار اور تھکم کے لیے استعمال ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں مشرکین کی حماقت اور جہالت سے آگاہ کیا ہے۔ وہ یوں کہ ان کا عقیدہ تھا کہ بچے دو قسم کے ہوتے ہیں: بیٹے اعلیٰ قسم سے تعلق رکھتے ہیں اور بیٹیاں ادنیٰ قسم سے۔ طرفہ تماشا یہ کہ وہ بیٹوں کو اپنی طرف منسوب کرتے تھے اور بیٹیوں کو اللہ کی طرف۔ حالانکہ وہ خود بیٹیوں کو بیٹوں سے کمتر سمجھتے تھے اور فقر اور عار کے خوف سے ان کو قتل کر دیتے تھے۔ اللہ تو خود خالق ہے جو بیٹے اور بیٹیاں پیدا کرتا ہے کیا وہ بڑھیا بیٹوں کو ان کے لیے چن لیتا ہے اور گھٹیا بیٹیوں کو اپنے لیے۔ وہ مشرک اپنی بے بسی اور عاجزی سے اور اللہ کے کمال وقدرت سے واقف تھے۔ اس کے باوجود فرشتوں کو بیٹیاں قرار دے کر اللہ کی طرف منسوب کرتے تھے۔ ان سے کہا گیا ہے ہوش کے ناخن لو۔ تم یہ کہہ کر کہ فرشتے اللہ کی بیٹیاں ہیں اللہ پر بہتان باندھتے ہو اور سخت گستاخی کر رہے ہو۔ بڑا بول، بول رہے ہو برائی کے اعتبار سے، جرأت وقباحت کے اعتبار سے، افترا و بہتان کے اعتبار

Marfat.com

سے اور تصور و عقیدہ کے اعتبار سے۔ یہ آیت اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ اس قول کا قائل انتہائی درجہ کا احمق اور جاہل ہے۔ یہ حکمت کے بھی خلاف ہے اور ان لوگوں کی عقل و دانش اور رسم و رواج کے بھی خلاف ہے۔ یہ صرف حماقت نہیں بلکہ حماقت در حماقت ہے کہ اپنے رب کے لیے اس چیز کا انتخاب کرتے ہیں جس کو اپنے لیے بھی گوارا نہیں کرتے۔ گویا تم اپنے آپ کو اپنے رب پر فضیلت دیتے ہو۔

اللہ تعالیٰ نے ان کے بیہودہ عقیدے کا ہر پہلو سے احاطہ کیا ہے۔ ان کو اور ان کے معاشرے کو پیش نظر رکھتے ہوئے ان سے حجت بازی کی گئی ہے۔ ان سے ان کی منطق کے مطابق بحث کی گئی ہے تاکہ ان کو پتہ چل جائے کہ ان کا عقیدہ تو ان کے مروجہ معیارات سے بھی لگا نہیں کھاتا۔ اللہ کا ارشاد ہے: 'فَاسْتَفْتِهِمْ أَلِرَبِّكَ الْبَنَاتُ وَلَهُمُ الْبَنُونَ ٥ أَمْ خَلَقْنَا الْمَلَائِكَةَ إِنَاثًا وَهُمْ شَاهِدُونَ ٥ أَلَا إِنَّهُم مِّنْ إِفْكِهِمْ لَيَقُولُونَ ٥ وَلَدَ اللَّهُ وَإِنَّهُمْ لَكَاذِبُونَ ٥ أَصْطَفَى الْبَنَاتِ عَلَى الْبَنِينَ ٥ مَا لَكُمْ كَيْفَ تَحْكُمُونَ ٥ أَفَلَا تَذَكَّرُونَ ٥ أَمْ لَكُمْ سُلْطَانٌ مُّبِينٌ ٥ فَأْتُوا بِكِتَابِكُمْ إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ ٥' (الصافات ۳۷: ۱۴۹ تا ۱۵۷) '(اے نبی) ان سے پوچھ کیا تیرے رب کے لیے تو بیٹیاں ہیں اور ان کے لیے بیٹے؟ کیا ہم نے فرشتوں کو عورتیں بنایا اور وہ موجود تھے؟ خوب سن لو یہ لوگ اپنی بہتان طرازی سے یہ بات کہتے ہیں کہ اللہ کی اولاد ہے اور بلاشبہ یہ لوگ جھوٹے ہیں۔ کیا اللہ نے بیٹوں کے مقابلہ میں بیٹیوں کو پسند کیا ہے تمھیں کیا ہو گیا ہے کیسا فیصلہ کرتے ہو، کیا تم غور و فکر سے کام نہیں لیتے؟ یا تمھارے پاس کوئی واضح دلیل ہے؟ اگر سچے ہو تو اپنی کتاب لا کر پیش کرو'۔ نبی کریم ﷺ سے کہا گیا ہے کہ ان سے فتویٰ مانگو یہ فتویٰ تو صاحبان علم و عقل سے مانگا جاتا ہے۔ یہ لفظ استعمال کر کے ان پر پھبتی کسی گئی ہے کہ کیا وہ اس مقام کے اہل ہیں کہ وہ اس مسئلے کا جواب دے سکیں جس کے بارے میں ان سے پوچھا جا رہا ہے۔ اس سورۃ کی آیت نمبر ۱۱ میں مشرکین سے پوچھا گیا تھا کہ کیا ان کی پیدائش زیادہ مشکل ہے یا اُن چیزوں کی پیدائش مشکل ہے جن کو ہم پیدا کر چکے ہیں۔ اس میں قریش کے لیے مزید تہدید ہے اور نبی کریم ﷺ کے لیے تسلی بھی اور وہی مضمون پورے تسلسل کے ساتھ جاری رہا۔ اس کے ختم ہونے کے بعد اسی استفتھم پر عطف کر کے اصل مسئلہ کو پھر سے لیا۔ اس طرح سورت کے مضمون میں ربط پیدا ہو گیا۔ اس سوال سے مقصود اہل مکہ کو ان کی جہالت پر متنبہ کرنا ہے۔

قریش اور جُہینہ، بنی سلمی، خزاعہ اور بنی ملیح کے قبیلے کہتے تھے کہ فرشتے اللہ کی بیٹیاں ہیں۔ زیر نظر آیات میں مشرکین کے اس عقیدے کی قباحت سے بڑے مدلل انداز میں پردہ اٹھایا گیا ہے۔ انھوں نے ایک کفر تو یہ کیا کہ اللہ کے لیے اولاد تجویز کی حالانکہ پیدائش اجسام کا خاصہ ہے اور اللہ تعالیٰ تجسیم سے

Marfat.com

پاک ہے۔ دوسرا کفر یہ کہ انھوں نے اپنے آپ کو اللہ پر فضیلت دی کیونکہ انھوں نے بیٹوں کو اپنی طرف منسوب کیا اور بیٹیوں کو اللہ کی طرف۔ حالانکہ وہ مؤنث کو قدر و منزلت کے اعتبار سے مذکر سے کمتر سمجھتے تھے۔ عقل و فطرت کا تقاضا تھا کہ اللہ کی طرف اس کی شایان شان صفات منسوب کرتے۔ انھوں نے تو اللہ کی طرف ایک ایسی صفت منسوب کی جس کو وہ اپنے لیے بھی گوارا نہیں کرتے تھے۔ تیسرے انھوں نے فرشتوں کو جو اللہ کی اشرف ترین مخلوق ہیں بیٹیاں کہہ کر ان کی توہین کی کیونکہ وہ بیٹیوں کو مصیبت گردانتے تھے۔ اس طرح ان سے تین طرح کے کفر کا ارتکاب ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں مشاہدہ کے علم کا بطور خاص ذکر کر کے ان کے قول کے بیہودہ پن کو بیان کیا ہے اور ان کا مذاق اُڑایا ہے۔ بالکل یہی بات سورۃ زخرف میں کہی گئی ہے: 'أَشَهِدُوا خَلْقَهُمْ سَتُكْتَبُ شَهَادَتُهُمْ' (الزخرف ۴۳:۱۹) 'کیا انھوں نے فرشتوں کی پیدائش کا مشاہدہ کیا ہے ان کا یہ دعویٰ لکھ لیا جائے گا' مطلب یہ کہ یہ بات ان کو نہ تو مشاہدہ سے معلوم ہوئی ہے نہ کسی سچی خبر اور نہ ہی کسی عقلی دلیل سے۔ علم حاصل کرنے کے تین طریقے ہیں۔

۱۔ حس ۲۔ خبر ۳۔ نظر

حس یہاں پر مفقود ہے کیونکہ انھوں نے اللہ کو فرشتے پیدا کرتے ہوئے نہیں دیکھا اور یہی مراد ہے اللہ کے اس قول سے (وَهُم شاهدون)۔ رہی خبر تو وہ بھی مفقود ہے۔ خبر بھی علم کے حصول کا ذریعہ ہے مگر شرط یہ ہے کہ خبر سچی ہو یہاں خبر دینے والے جھوٹے ہیں اور ان کے صدق کی نہ کوئی دلیل ہے نہ کوئی نشانی اور اللہ کے قول (مِن افكهم ليقولون) سے یہی مراد ہے نظر بھی مفقود ہے کیونکہ عقل و دلیل اس عقیدے کو باطل قرار دیتی ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کامل ترین ہے اس کے شایان شان نہ تھا کہ وہ ایسی مخلوق کو پسند کرے جو ان کی اپنی نظر میں گھٹیا ہو، اور یہی مراد ہے اللہ کے قول (اصطفى البنات عَلَى البنين) سے۔ غرضیکہ ان کے پاس مشاہدہ کا علم ہے اور نہ ہی کوئی عقلی اور نقلی دلیل اور وہ اپنے جی سے گھڑ کر یہ دعویٰ کر رہے ہیں کہ اللہ کی اولاد ہے۔ پھر انھیں کہا گیا کہ تمھاری عقل کو کیا ہو گیا ہے؟ کیسا اُلٹا فیصلہ کرتے ہو؟ تم سوچ اور سمجھ سے کیوں کام نہیں لیتے؟ اگر تمھارے پاس عقل نہیں تو کیا تمھارے پاس کوئی واضح حجت ہے؟ واضح حجت کی وضاحت کتاب کے لفظ سے فرما دی یعنی اگر اللہ کی طرف سے کوئی تحریر ہو جو اس مسئلہ پر روشنی ڈالتی ہو تو پیش کرو۔

یہ آیات اللہ کے غضب، شدید انکار اور ان کے اقوال کی رکاکت پر دلالت کرتی ہیں۔ ان کا اسلوب بیان قریش کی کم عقلی اور کج فہمی کی دلیل ہے۔ ان آیات میں اس قسم کے گھٹیا خیالات کے دل

Marfat.com

میں گزرنے کا بھی مذاق اُڑایا گیا ہے چہ جائیکہ انھیں عقیدے اور مذہب کی شکل دے دی جائے۔

قرآن حکیم نے فرشتوں کو اللہ کی بیٹیاں قرار دینے والے مفروضے (Myth) کے مختلف پہلوؤں پر بحث کی ہے اور کسی پہلو کو تشنہ نہیں چھوڑا۔ مشرکین کی منطق اور مسلمات کی روشنی میں ان کا سامنا کر کے ان گزرے ہوئے لوگوں کے انجام کو بیان کیا ہے، جنھوں نے ان جیسا موقف اختیار کیا اور ان جیسی باتیں کہیں۔ سورۂ زخرف میں اللہ تعالیٰ نے اس مناظرے کو بڑے اچھے طریقے سے ترتیب دیا ہے ارشاد ربانی ہے: "وَجَعَلُوا لَهُ مِنْ عِبَادِهِ جُزْءًا إِنَّ الْإِنسَانَ لَكَفُورٌ مُّبِينٌ o أَمِ اتَّخَذَ مِمَّا يَخْلُقُ بَنَاتٍ وَأَصْفَاكُم بِالْبَنِينَ o وَإِذَا بُشِّرَ أَحَدُهُم بِمَا ضَرَبَ لِلرَّحْمَٰنِ مَثَلًا ظَلَّ وَجْهُهُ مُسْوَدًّا وَهُوَ كَظِيمٌ o أَوَمَن يُنَشَّأُ فِي الْحِلْيَةِ وَهُوَ فِي الْخِصَامِ غَيْرُ مُبِينٍ o وَجَعَلُوا الْمَلَائِكَةَ الَّذِينَ هُمْ عِبَادُ الرَّحْمَٰنِ إِنَاثًا أَشَهِدُوا خَلْقَهُمْ سَتُكْتَبُ شَهَادَتُهُمْ وَيُسْأَلُونَ o" (الزخرف ۴۳: ۱۰ تا ۱۹) 'ان لوگوں نے اس کے بندوں میں سے بعض کو اس کا جزء بنا ڈالا ہے۔ واقعی انسان کھلا ناشکرا ہے۔ کیا اس نے اپنی مخلوق سے اپنے لیے بیٹیاں پسند کی ہیں اور تمھیں بیٹوں کے لیے چن لیا؟ حالانکہ جب ان میں سے کسی کو اس کی خوشخبری دی جاتی ہے جس کو وہ خدائے رحمان کی مثال بیان کرتا ہے تو اس کا چہرہ کالا پڑ جاتا ہے اور وہ دل ہی دل میں گھٹتا رہتا ہے۔ کیا (اللہ کے حصے میں وہ آیا ہے) جو زیور میں نشوونما پاتا ہے اور بحث وجدال میں کھل کر بات نہ کر سکے۔ اور انھوں نے فرشتوں کو جو اللہ کے بندے ہیں دیویاں بنایا۔ کیا وہ ان کی پیدائش کے وقت حاضر تھے۔ ان کی گواہی لکھ لی جائے گی اور ان سے باز پرس ہوگی'۔ ان آیات کا اصل مقصد مشرکین کی جہالت کو ثابت کرنا اور ان کے تضاد کو واضح کرنا ہے یعنی یہ بتانا کہ وہ ایسے لوگ ہیں کہ متضاد باتیں کرتے ہیں۔ اور بغیر علم کے الکل پچو سے کام لینا ان کی عادت ہے۔

قرآن حکیم نے بڑی ترتیب کے ساتھ اس مسئلہ پر بحث کی ہے سب سے پہلے بیان کیا کہ اس سے بڑی گستاخی اور ناشکری کیا ہوگی کہ اللہ کے لیے اولاد تجویز کی جائے اور وہ بھی اس کے بندوں میں سے۔ اللہ کے لیے اولاد تجویز کرنے کے معنی تو یہ ہوئے کہ وہ اس کی ہم جنس ہے اور اس کی ہم سر ہے۔ بندے اور رب میں عبودیت کے رشتے کے علاوہ اور کوئی رشتہ نہیں۔ اس کو عبودیت کی صفت سے خارج کرنے کا تقاضا یہ ہے کہ خالق و مخلوق میں مجانست ہے۔ اس بات کے ماننے کے بعد اللہ کی یکتائی کہاں باقی رہتی ہے؟ ایسی نسبت کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ دوسرے صرف یہی ستم نہیں کہ خدا کی مخلوق کو اس کا جزء بنا رہے ہیں بلکہ ستم بالائے ستم یہ ہے کہ وہ مخلوق میں سے بیٹیوں

Marfat.com

کو اس کی طرف منسوب کر رہے ہیں حالانکہ بیٹیاں ان کے اپنے زعم میں اس قدر ذلیل وحقیر ہیں کہ اگر خود انھیں ان کی پیدائش کی خوشخبری سنائی جاتی ہے تو رنج اور غصہ کے مارے ان کے تیور بدل جاتے ہیں اور دل ہی دل میں پیچ و تاب کھاتے رہتے ہیں۔ ایسی مخلوق کو وہ اللہ کی شبیہہ قرار دے رہے ہیں۔ اس سے یہ لازم آتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو اللہ پر ترجیح دے رہے ہیں یہ بات عقلاً محال ہے۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ مرد اور عورت اللہ کی مخلوق ہوں اور اختیار ان کے پاس ہو کہ وہ جسے چاہیں اپنے لیے پسند کر لیں اور جسے چاہیں اللہ کی طرف منسوب کر دیں۔ ادب کا تقاضا یہ تھا کہ وہ اللہ کی طرف ایسی چیز منسوب نہ کرتے جس کو وہ اپنے لیے برا سمجھتے ہیں۔ وہ آدمی جو اللہ کے وجود کا معترف ہے یہ بات نہیں کہہ سکتا۔ اگر وہ اللہ کے وجود سے انکار کرتے تو ان کی یہ بات منطقی ہوتی مگر اس کے وجود کا اعتراف کر کے اُس کی طرف ایسی باتیں منسوب کرنا جو اُس کے شایانِ شان نہیں اور جسے وہ اپنے لیے بھی پسند نہیں کرتے واضح گمراہی ہے بلکہ یہ گمراہوں کی منطق کے بھی منافی ہے۔ یہ عقیدہ ایجاد کر کے مشرکین نے صرف عقل ہی کی تذلیل نہیں کی بلکہ احساس عدل سے اپنی محرومی کا ثبوت بھی دیا ہے۔ زیر نظر آیت میں غائب کے صیغے سے مخاطب کے صیغے کی طرف گریز ہے تاکہ ان کی بات سے انکار کی شدت واضح ہو جائے۔ اس کے بعد اس احساس کی تعبیر کی گئی ہے جو لڑکی کی ولادت کی خبر سن کر مشرکین کے دل میں پیدا ہوتا ہے اور ان کی گھٹن کا باعث بنتا ہے۔ فرمایا کہ وہ اس سوچ میں پڑ جاتے ہیں کہ کیا وہ وجود میں آئی ہے جو زیور میں پلتی بڑھتی ہے اور بحث وجدال میں بالکل بے زبان ہوتی ہے۔ مولانا امین احسن اصلاحی اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں: 'یہ امر اچھی طرح ملحوظ رہے کہ عورت پر یہ تبصرہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نہیں ہے بلکہ اہل عرب کی طرف سے ہے جو فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں قرار دیتے تھے'۔ عام طور پر مفسرین نے خیال کیا ہے کہ یہ تبصرہ اللہ کی طرف سے ہے۔ یہ غلط فہمی لوگوں کو سیاق پر غور نہ کرنے کی وجہ سے ہوئی' حقیقت یہ ہے کہ مفسرین نے اس حصہ کو بنیاد بنا کر مرد کے مقابلے میں عورت کی قدر و منزلت کو کمتر ثابت کیا ہے۔ بقول ان کے عورت آرائش و زیبائش میں نشوونما پاتی ہے اور زیورات کے شوق میں مگن رہتی ہے۔ وہ صاف طور پر اپنا مدعا بھی بیان نہیں کر سکتی۔ حالانکہ آیت زیر نظر میں عورت کی فطرت کا ذکر نہیں بلکہ تربیت اور پرورش کا ذکر ہے۔ تربیت انسان کرتے ہیں اللہ نہیں کرتا۔ مطلب یہ ہے کہ لوگ ان کی پرورش اس طریقے سے کرتے ہیں۔ اگر اس طریقے سے ان کی پرورش نہ ہو تو یہ خامیاں بھی نہیں ہوں گی۔ قرآن نے یہ بات زمانۂ جاہلیت میں تربیت پانے والی

Marfat.com

عورت کے بارے میں کہی ہے۔ یہ نہیں کہ اس کے نزدیک عورت کی فطرت ہی ایسی ہوتی ہے۔ سورۃ واقعہ میں صحیح تربیت یافتہ جنتی عورت کے بارے میں کہا گیا ہے: 'عُرُبًا أَتْرَابًا' (الواقعہ ۵۶:۳۷) 'ہم سن اور صاف صاف بیان کرنے والیاں'۔

امام راغب کا قول ہے: 'امراۃ عَرُوبَۃٌ' اپنی عفت اور خاوند کی محبت کے بارے میں اپنے حال کو فصاحت سے بیان کرنے والی۔ عورت فطرتاً بے زبان نہیں ہوتی جیسا کہ مفسرین نے ثابت کرنے کے لیے پورا زور لگایا ہے کیا کوئی حضرت خنساء؄ اور زینب؄ بنت علی کو بے زبان کہہ سکتا ہے؟ ابن زید کا قول ہے کہ 'اس آیت میں عورتیں مراد نہیں بلکہ بت مراد ہیں' جن کے مجسمے وہ سونے چاندی سے بناتے تھے یا ان کو زیور سے ڈھانپ دیتے تھے اور پھر انکی پوجا کرتے تھے۔ وہ بات بھی نہیں کرسکتے تھے۔ یہ قول بھی معقول معلوم ہوتا ہے کیونکہ اس سے اگلی آیت میں اِنَـاث سے مراد ان کی دیویاں یا ان کے بت ہیں۔ اس لیے یہاں بھی بتوں کا ذکر اصل منشا معلوم ہوتا ہے اور بتوں کو زیورات یعنی سونے، چاندی اور جواہرات سے مرصع کرنا بت پرستوں میں عام ہے۔ اور فِی الْخِصَامِ غَیْرُ مُبِیْنٍ (اور بحث وجدال میں کھل کر بات نہ کرنے والے) بھی بتوں پر صادق آتا ہے اور قرآن مجید میں ایک اور مقام پر بتوں کے نہ بولنے اور نہ دلیل دینے کا ذکر ہے۔ ارشاد ہے: 'فَاسْأَلُوهُمْ إِن كَانُوا يَنطِقُونَ' (الأنبیاء ۲۱:۶۳) 'سوان سے پوچھ لو اگر یہ بولتے ہیں'۔ اگلی آیت سے ظاہر ہے کہ وہ بتوں کو فرشتوں کا مظہر قرار دیکر ان کی پرستش کرتے تھے پس اِنَـاث سے مراد دیویاں ہی ہے چونکہ ان بتوں کے نام جن کی وہ عبادت کرتے تھے عورتوں جیسے تھے اور کسی رنگ میں ان کا فرشتوں کی عبادت کرنا معلوم نہیں۔ اس لیے بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ ان بتوں کو یا اپنی دیویوں کو فرشتوں کا مظہر قرار دیتے تھے۔

پھر قرآن حکیم نے مشرکین کے مفروضے کا ایک اور پہلو سے احاطہ کیا ہے ان کا دعویٰ ہے کہ فرشتے عورتیں ہیں۔ اس بات کی ان کے پاس نہ کوئی عقلی دلیل ہے نہ نقلی۔ تو پھر کیا اللہ نے جب فرشتوں کو بنایا تھا تو یہ کھڑے دیکھ رہے تھے کہ انھیں مرد نہیں عورت بنایا ہے کیونکہ آنکھوں سے دیکھنا بمنزلہ حجت ہوتا ہے۔ اور ایک ایسی دلیل ہے کہ صاحب دعویٰ اس کا سہارا لے سکتا ہے۔ ان کے بس میں نہیں کہ وہ یہ دعویٰ کریں کہ انھوں نے فرشتوں کی تخلیق کا مشاہدہ کیا ہے لیکن پھر بھی ان کی یہ گواہی دفتر اعمال میں لکھ لی جاتی ہے جب وہ خدا کی عدالت میں پیش ہوں گے تو ان سے باز پرس ہوگی کہ تم نے ایسا کیوں کیا؟ یہ ایک شدید قسم کی دھمکی ہے کہ ان کو اس شہادت کے انجام کو بھی بھگتنا پڑے گا۔

Marfat.com

قرآن حکیم میں (ایک اور مقام پر اللہ تعالیٰ مشرکین کے تصورات اور اوہام کی وجہ سے ان کا مؤاخذہ کرتا ہے۔ ان کا اور ان کے خیالات کا مذاق اُڑاتا ہے۔ یہ سارا مسئلہ کسی علمی اور واقعاتی بناء پر قائم نہیں نہ اس کی کوئی حجت ہے نہ دلیل اور نہ کوئی حقیقت۔ حقیقت کا وزن ہوتا ہے۔ مگر اوہام بے وزن ہوتے ہیں۔ پتھر کے بنے ہوئے بتوں کو بیٹیاں کہہ لو یا بیٹے یا کچھ اور سب کہنے کی باتیں ہیں حقیقت کچھ بھی نہیں۔ ان مشرکین کو آخرت کا یقین نہیں اس لیے سزا سے بے پرواہ ہو کر ایسی گستاخیاں کر رہے ہیں۔ سورۃ النجم میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: 'أَلَكُمُ الذَّكَرُ وَلَهُ الْأُنثَىٰ o تِلْكَ إِذًا قِسْمَةٌ ضِيزَىٰ o إِنْ هِيَ إِلَّا أَسْمَاءٌ سَمَّيْتُمُوهَا أَنتُمْ وَآبَاؤُكُم مَّا أَنزَلَ اللَّهُ بِهَا مِن سُلْطَانٍ إِن يَتَّبِعُونَ إِلَّا الظَّنَّ وَمَا تَهْوَى الْأَنفُسُ وَلَقَدْ جَاءَهُم مِّن رَّبِّهِمُ الْهُدَىٰ o (...) o إِنَّ الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِالْآخِرَةِ لَيُسَمُّونَ الْمَلَائِكَةَ تَسْمِيَةَ الْأُنثَىٰ o' (النجم ۵۳: ۲۱ تا ۲۳، ۲۷) 'کیا تمھارے لیے بیٹے ہیں اور اس کے لیے بیٹیاں ہیں یہ تو بہت بھونڈی تقسیم ہے۔ دراصل یہ کچھ نہیں مگر چند نام ہیں جو تم نے اور تمھارے باپ دادا نے رکھ لیے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے ثبوت میں کوئی دلیل نازل نہیں فرمائی یہ لوگ محض وہم و گماں اور نفسانی خواہشات کی پیروی کر رہے ہیں حالانکہ ان کے رب کی جانب سے ان کے پاس صحیح ہدایت آ چکی ہے۔' 'جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے وہ فرشتوں کے نام عورتوں کے سے رکھتے ہیں اور انھیں اس کا کچھ علم نہیں وہ صرف اپنے گمان پر چل رہے ہیں اور ظن حق کے مقابل کچھ کام نہیں دیتا'۔

پہلی آیات میں جبریلؑ کی صفات کو بیان کیا گیا ہے وہ زبردست قوت والے، خوش منظر اور صاحب عرش کے نزدیک رہنے والے ہیں۔ سوال یہاں تعجب اور تحقیر کے لیے ہے کہاں جبریلؑ کی یہ صفات اور کہاں تمھاری دیویاں لات، عزیٰ اور منات۔ جن کی نسبت تمھارا گمان ہے کہ اللہ کی بیٹیاں ہیں اور جن کے نام تم نے عورتوں جیسے رکھ چھوڑے ہیں؟ ان تینوں دیویوں کے پجاریوں کی تعداد چونکہ سارے عرب میں سب سے زیادہ تھی اسی وجہ سے قریش بھی ان کی سب سے بڑھ کر تعظیم کرتے تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ فرشتے اللہ کی بیٹیاں ہیں اس لیے وہ ان کے مجسمے عورتوں کی شکل میں بناتے اور ان کے نام عورتوں جیسے رکھتے۔ اللہ نے ان تین معبودوں کا ذکر کرنے کے بعد ان کے اس دعوئ کو رد کیا ہے کہ اللہ کے لیے لڑکیاں ہیں اور ان کے لیے لڑکے۔ اللہ نے ان سے یہ سوال کیا ہے کہ تمھارے لیے تو بیٹے ہیں اور اس کے لیے بیٹیاں سوال کرنے کے بعد جواب نہیں دیا گیا یہ

Marfat.com

اسلوب ان کی فضیحت اور رسوائی پر دلالت کرتا ہے۔ اول تو اللہ کی طرف اولاد کی نسبت محال ہے۔ بفرض محال اگر اولاد کا نظریہ تسلیم کرلیا جائے تب بھی یہ تقسیم کس قدر بھونڈی اور مہمل ہے کہ تم خود تو بیٹے لے جاؤ اور اللہ کے حصہ میں بیٹیاں لگا دو۔ تمھارا یہ خیال ہے کہ بیٹیاں ناقص ہوتی ہیں اور بیٹے کامل (یہ مشرکین کا تصور تھا نہ کہ قرآن حکیم کا) اللہ تو کامل ہے تم اس کی طرف ناقص اور اپنی طرف کامل کو کیسے منسوب کرتے ہو؟ یہ تقسیم تمھارے اپنے نظریے کے مطابق بھونڈی ہے کیونکہ تمھارے رواج کے مطابق عظیم کی طرف عظیم اور حقیر کی طرف حقیر کی نسبت ہونی چاہیے چنانچہ تم نہ صرف عقل وفکر بلکہ اپنے رسم و رواج کی بھی مخالفت کر رہے ہو۔ لات، عزیٰ اور منات وغیرہ کو بطور معبود نامزد کرنا پھر ان کو فرشتے قرار دینا فرشتوں کو مؤنث سمجھنا اور مؤنث کو اللہ کی بیٹیاں کہنا یہ سب نام ہی نام ہیں جن کی نہ کوئی دلیل ہے اور نہ کوئی حقیقت۔ وہ محض اٹکل پر چلتے ہیں اور اٹکل کی حق کے مقابلے میں کوئی حیثیت نہیں۔ ایسی باتیں صرف وہی لوگ کرتے ہیں جن کو آخرت کا یقین نہیں اور جن کو سزا کی کچھ پرواہ نہیں۔ آیت کے درمیان اللہ ان کو اور ان کے اوہام کو چھوڑ دیتا ہے۔ ان سے خطاب ترک کر دیتا ہے اور ان کے بارے میں غائب کے صیغے سے بات کرتا ہے گویا کہ ان کا کوئی وجود ہی نہیں وہ اپنا عقیدہ نہ حجت پر، نہ علم پر اور نہ یقین پر قائم کرتے ہیں بلکہ ان کے عقیدے کا قیام صرف اور صرف ظن پر ہے۔ بھلا فرشتوں کو مرد اور عورت ہونے سے کیا واسطہ؟ اور خدا کے لیے اولاد کیسی؟ کیا تخمینے اور اٹکلیں حقائق ثابتہ کے قائم مقام ہو سکتے ہیں؟

ان آیات مبارکہ سے بعض مفسرین نے یہ سمجھا ہے کہ لڑکے لڑکیوں سے بڑھیا ہوتے ہیں اس لیے اگر ان کو اللہ کی طرف منسوب کیا جاتا تو بات بنتی کیونکہ افضل چیز کو کامل و مکمل کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔ بنیادی مسئلہ یہ ہے کہ اللہ خالق کائنات ہے وہ لڑکوں اور لڑکیوں کو پیدا کرتا ہے اس کی طرف اولاد کو منسوب کرنا بہت برا ستم ہے پھر ستم بالائے ستم یہ ہے کہ فرشتوں کو لڑکیاں قرار دے کر ان کو اللہ کی چہیتی بیٹیاں کہنا حالانکہ مشرکین لڑکیوں کو حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے، ان کو زندہ دفن کر دیتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے بنیادی نقطہ نظر کی تردید کے ساتھ ضمناً ان کے اس عقیدے کی بھی تردید کی ہے کہ لڑکے لڑکیوں سے افضل ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ لڑکیوں کی پیدائش کو بشارت سے تعبیر کیا گیا ہے اور لڑکے اور لڑکیوں کے بارے میں ان کے فیصلہ کو بہت ہی برا فیصلہ قرار دیا گیا ہے۔

Marfat.com

أهل (بیوی)

لغوی مفہوم

مقاییس اللغۃ حصہ اول میں احمد بن فارس بن زکریا (متوفی ۳۹۵ھ) نے لفظ اہل کے دو بنیادی معنی بتائے ہیں ایک تو اھل بقول خلیل آدمی کی بیوی کو کہا جاتا ہے۔ اِہل اور تـاھّل کے معنی شادی شدہ ہونے کے ہیں۔ عرب کہتے ہیں: "آھلك اللّٰہ فی الجنۃ ایھالا" یعنی اللہ تمہیں جنت میں بیوی عطا کرے تم اس کے ساتھ رہو۔ دوسرے بنیادی معنی اھالۃ کے دُنبے کی چکنی یا پگھلی ہوئی چربی ہے۔

القاموس المحیط، المصباح المنیر، مغنی اللبیب اور محیط المحیط میں لفظ أھل سے بالخصوص بیوی مراد ہے۔ صاحب تاج العروس نے بیوی کے ساتھ بچوں کو بھی شامل کیا ہے۔ امام راغب کا قول ہے۔ اصل میں اھل تو وہ ہیں جو کسی کے ساتھ ایک مسکن میں رہتے ہوں۔ مجازاً اھل کا لفظ ان لوگوں کے لیے بولا جاتا ہے جو ہم نسب یا ہم دین یا ہم صنعت یا ہم مکان ہوں۔

قرآن حکیم میں متعدد مقامات پر اھل کا لفظ بیوی کے معنی میں استعمال ہوا ہے آیات نمبر (آل عمران ۳:۱۲۱؛ الیوسف ۱۲:۲۵؛ طٰہٰ ۲۰:۱۰؛ النمل ۲۷:۷) میں یہ لفظ بیوی کے معنوں میں استعمال ہوا ہے اہل بیت کا لفظ تین مرتبہ (ھود ۱۱:۷۳؛ القصص ۲۸:۱۲؛ الأحزاب ۳۳:۳۳) صرف زوجہ کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ لین (Lane) نے اپنی ڈکشنری Lexicon میں لکھا ہے کہ امام محمد کے نزدیک اھل سب سے پہلے آدمی کی بیوی پھر اس کے بچوں اور پھر اس پر بولا جاتا ہے یعنی وہ لوگ جن پر ان کا نان ونفقہ واجب ہے۔ لسان العرب میں ہے کہ آھل (شادی شدہ) عزب (غیر شادی شدہ کے) مقابل ہے۔

القاموس المحیط اور لسان العرب میں ہے کہ لفظ آل کا اصل بھی اھل ہے۔ ھا، ہمزہ میں بدل گئی۔ دو ہمزوں کی وجہ سے دوسرے کو الف میں بدل دیا گیا چنانچہ اسم تصغیر اُھیل اور اُویل ہے۔ آل اسی مقام میں استعمال ہوتا ہے جہاں أھل استعمال ہوتا ہے۔ آل الرجل آدمی کے گھر والوں کو اس لیے کہا جاتا ہے کہ وہ انجام کار ان ہی کی طرف لوٹ کر آتا ہے۔ آل کے معنی لوٹنا اور مآل کے معنی انجام کے ہیں۔ اھل کی جمع اُھلون، اَھلات اور اُھالی آتی ہے۔

قرآن حکیم کے جن مقامات میں اَھل اپنے اصلی یعنی بیوی کے معنوں میں استعمال ہوا ہے ان

Marfat.com

کا بغور مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کے یہاں بیوی کا مرتبہ اور مقام کس قدر بلند ہے۔

بیوی کا مرتبہ اور مقام

قرآن شریف میں حضرت موسیٰ ؑ کی اہلیہ کا ذکر تین مقامات پر ہوا ہے اور تینوں مقامات پر کم و بیش ایک ہی مضمون بیان کیا گیا ہے۔ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے: 'اِذْ رَاٰ نَارًا فَقَالَ لِاَهْلِهِ امْكُثُوْا اِنِّیْ آنَسْتُ نَارًا لَّعَلِّیْ اٰتِیْكُمْ مِّنْهَا بِقَبَسٍ' (طٰہٰ ۲۰:۱۰) 'جب اس نے آگ دیکھی تو اس نے گھر والی سے کہا ٹھہریئے میں نے آگ دیکھی ہے ممکن ہے آپ کے لیے اس میں سے ایک شعلہ لے آؤں'۔

دوسری جگہ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے: 'اِذْ قَالَ مُوْسٰى لِاَهْلِهٖۤ اِنِّیْۤ اٰنَسْتُ نَارًا سَاٰتِیْكُمْ مِّنْهَا بِخَبَرٍ اَوْ اٰتِیْكُمْ بِشِهَابٍ قَبَسٍ لَّعَلَّكُمْ تَصْطَلُوْنَ' 'جب موسیٰ ؑ نے اپنی گھر والی سے کہا میں نے ایک آگ دیکھی ہے میں آپ کے پاس یا تو (راستے کی) کوئی خبر لے کر آتا ہوں یا آپ کے پاس جلتا ہوا شعلہ لاتا ہوں، تاکہ آپ تاپیں (النمل ۲۷:۷)۔

تیسری جگہ پر حق تعالیٰ کا ارشاد ہے: 'فَلَمَّا قَضٰى مُوْسَى الْاَجَلَ وَسَارَ بِاَهْلِهٖۤ اٰنَسَ مِنْ جَانِبِ الطُّوْرِ نَارًا قَالَ لِاَهْلِهِ امْكُثُوْۤا اِنِّیْۤ اٰنَسْتُ نَارًا لَّعَلِّیْۤ اٰتِیْكُمْ مِّنْهَا بِخَبَرٍ اَوْ جَذْوَةٍ مِّنَ النَّارِ لَعَلَّكُمْ تَصْطَلُوْنَ' 'پس جب موسیٰ ؑ نے مدت پوری کر لی اور اپنی اہلیہ کو لے کر چلے تو اپنی اہلیہ سے کہا ٹھہریئے میں نے ایک آگ سی دیکھی ہے میں اس سے آپ کے پاس یا تو کوئی خبر لے کر آتا ہوں یا آگ کا انگارا لاتا ہوں تاکہ آپ تاپیں' (القصص ۲۸:۲۹)۔

تینوں مذکورہ آیات میں اس واقعہ کا بیان ہے جب حضرت موسیٰ ؑ سفر میں تھے اور وہ مدین سے مصر کی طرف واپس جا رہے تھے۔ کم و بیش سب مفسرین نے یہی کہا ہے کہ اس وقت ان کی بیوی کے علاوہ اور کوئی ہمراہ نہ تھا۔ اس لیے مذکورہ آیات مبارکہ میں اہل کا لفظ بیوی ہی کے لیے استعمال ہوا ہے۔

ظاہری طور پر اہل کی مناسبت سے (امْكُثُوْا) آپ ٹھہریں۔ اٰتِیْكُمْ: میں آپ کے پاس لاؤں گا، اور تَصْطَلُوْنَ: آپ تاپیں گے) جمع کے صیغے استعمال ہوئے ہیں اور ان کا مقصد تعظیم و تکریم ہے۔ موسیٰ ؑ کا خطاب صرف ایک بیوی سے ہے لیکن افعال اور ضمیروں میں جمع کے صیغے استعمال کیے گئے ہیں تاکہ بیوی کے عزت و احترام کا تصور اُبھر کر سامنے آجائے۔ اسی مقصد کے پیش نظر اللہ تعالیٰ نے موسیٰ ؑ کی بیوی کے لیے أہل کا لفظ استعمال کیا ہے۔ ایک کے لیے جمع کے صیغے کی مثال عربی شاعر کا یہ مصرعہ ہے: ع وان شئتِ حُرِّمَتِ النساء سواکم (اگر تو چاہتی تو آپ کے علاوہ سب عورتیں

Marfat.com

حرام قرار دی جاتیں)۔ اس مصرعہ میں تثنیت واحد کا صیغہ ہے۔ مگر اس کے لیے جمع کی ضمیر سوا کم استعمال ہوئی ہے۔ آپ نے دیکھا کہ سیدنا موسیٰ علیہ السلام اپنی بیوی سے کس قدر عزت و احترام سے مخاطب ہوتے ہیں۔

قرآن میں اہل البیت کے معنی

قرآن حکیم میں اہل البیت کی ترکیب تین مقامات پر استعمال ہوئی ہے اور تینوں مقامات پر اس کے معنی زوجہ کے ہیں۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے: 'قَالُوْا اَتَعْجَبِیْنَ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ رَحْمَتُ اللّٰهِ وَبَرَكَاتُهٗ عَلَیْكُمْ اَهْلَ الْبَیْتِ اِنَّهٗ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ' (ہود ۱۱:۷۳) 'انھوں نے کہا! کیا تو اللہ کے کاموں پر تعجب کرتی ہے؟ اللہ کی رحمت اور اس کی برکتیں آپ پر ہوں۔ اے اہل بیت! بے شک اس اللہ کی ستائش کی جاتی ہے اور وہ بڑائیوں والا ہے'۔

جب فرشتوں نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بیوی سیدہ سارۃ کو حضرت اسحاق علیہ السلام اور ان کے بعد حضرت یعقوب علیہ السلام کی پیدائش کی خوشخبری دی تو انھوں نے تعجب کا اظہار کیا کہ میں بھی بوڑھی، میرا شوہر بھی بوڑھا، اولاد کیسے پیدا ہوگی؟ تو فرشتوں نے ان کو اھل البیت کہہ کر مخاطب کیا۔ صاحب کشاف کے الفاظ میں اھل البیت کہہ کر بیوی کی تعریف کی گئی ہے گویا کہ ان کو بتایا گیا کہ وہ اللہ کے خلیل کی بیوی ہیں۔ قابل غور بات ہے کہ فرشتوں نے ان کو واحد مؤنث کے صیغے سے مخاطب کیا پھر علیکم میں جمع مذکر کی ضمیر استعمال کی تاکہ ان کے احترام کا تصور نگاہوں کے سامنے آجائے اور پتہ چل جائے کہ مذکر ضمائر میں مؤنث ضمائر کا مفہوم بھی پایا جاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: 'وَحَرَّمْنَا عَلَیْهِ الْمَرَاضِعَ مِنْ قَبْلُ فَقَالَتْ هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰۤى اَهْلِ بَیْتٍ یَّكْفُلُوْنَهٗ لَكُمْ وَهُمْ لَهٗ نٰصِحُوْنَ' (القصص ۲۸:۱۲) 'پس موسیٰ علیہ السلام کی بہن نے کہا کیا میں تمھیں ایسے اہلِ بیت کا پتہ بتاؤں جو تمھارے لیے اس بچے کی پرورش کریں اور اس کے خیر خواہ ہوں'؟

اس آیت میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بہن نے لفظ امراۃ (عورت) کی جگہ اہل بیت کی ترکیب استعمال کی، تاکہ ان کو پتہ چل جائے کہ وہ عورت اہل شرف میں سے ہے اور بادشاہ کی خدمت کے لیے موزوں ہے۔ موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کی عظمت کو بیان کرنے کے لیے آیت میں فعل (یکفلون) اور ضمائر (لَكُمْ وَهُمْ) سب جمع کے صیغوں کے ساتھ مذکر استعمال ہوئے ہیں۔ اس سے ایک تو یہ بتانا مقصود

Marfat.com

ہے کہ وہ قابلِ احترام ہیں اور دوسرے یہ کہ مرد اور عورت میں کوئی فرق نہیں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "إِنَّمَا يُرِيدُ اللَّهُ لِيُذْهِبَ عَنكُمُ الرِّجْسَ أَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيرًا" (الأحزاب ۳۳:۳۳) 'اللہ یہی چاہتا ہے اے اہل بیت! آپ سے ناپاکی کو دور کرے اور آپ کو بالکل پاک صاف کرے'۔ صاحب البحر المحیط نے اس آیت کی تفسیر میں بیان کیا ہے کہ عکرمہؒ، مقاتلؒ اور ابن السائب کے قول کے مطابق اس آیت میں اہل بیت کی ترکیب نبی کریم ﷺ کی ازواج مطہرات سے خاص ہے۔ صاحب روح المعانی نے اس کی تفصیل بیان کرتے ہوئے کہا ہے! ابن ابی حاتم اور ابن عساکر نے عکرمہ سے اور انھوں نے ابن عباس سے روایت کی ہے کہ یہ آیت خاص طور پر نبی کریم ﷺ کی ازواج کے بارے میں ہے۔ پھر انھوں نے ابن جریر اور ابن مردویہ کی عکرمہ سے روایت کا ذکر کیا ہے کہ انھوں نے اس آیت میں فرمایا 'اُس سے مراد وہ نہیں جو تم لے رہے ہو یہ تو صرف نبی ﷺ کی ازواج کے بارے میں ہے'۔

صاحب روح المعانی نے آیت نمبر ۱۱:۷۳ کی تفسیر میں ابن عباس سے روایت کی ہے کہ وہ حضرت میمونہؓ کے یہاں تھے ایک سائل دروازے پر کھڑا ہو کر کہنے لگا! السلام علیکم اهل البیت ورحمة الله وبرکاته و صلواته ومغفرته۔ انھوں نے سائل سے کہا! اتنا ہی سلام کرو جتنا اللہ نے کیا ہے۔ یہ خیال کہ لیذهب عنکم اور لیطهّرکم میں ضمیر مذکر ہے اس لیے بیبیاں مراد نہیں نہایت ہی غیر معقول ہے کیونکہ یہ ضمیر بلحاظ لفظ (اهل) مذکر ہے بالکل ایسے ہی جیسے سیدہ سارۃ کے بارے میں برکته علیکم (هود ۱۱:۷۳) اور موسیٰ علیہ السلام کی اہلیہ کے بارے میں امکثوا (طٰہٰ ۲۰:۱۰، النمل ۲۷:۷) مذکر کی ضمیر اور صیغہ استعمال ہوا ہے اور جمع کی ضمیر اور صیغہ اہلیہ کی عظمت بیان کرنے کے لیے استعمال ہوا ہے۔ اس آیت کی تفسیر میں مولانا ابوالکلام آزاد نے جو تبصرہ کیا ہے وہ لغوی لحاظ سے بہت اہم ہے۔ فرماتے ہیں: 'ازواج مطہرات کو اهل البیت کہہ کر پکارا گیا ہے۔ ہماری زبان میں اس کے معنی گھر والوں کے ہیں مگر قرآن میں متعدد مقامات پر کسی مرد کی زوجہ کو اهل البیت کہا گیا ہے (جیسا کہ اوپر کی آیات سے واضح ہے کہ بیت کے بغیر صرف اهل بھی کہا گیا ہے) یوں آنحضرت ﷺ نے اپنی ایک دعا میں علیؓ، فاطمہؓ، حسنؓ اور حسینؓ کو بھی اپنے اهل بیت میں شامل کیا ہے مگر قرآن میں یہ لفظ صرف زوجہ کے معنوں میں استعمال ہوا ہے'۔

خلاصہ

قرآن حکیم نے بیوی کے لیے اہل کا لفظ اس کے شرف وعظمت کو ظاہر کرنے کے لیے استعمال کیا ہے۔

Marfat.com

البشر (انسان)

لغوی مفہوم

احمد بن فارس بن زکریا مقاییس اللغۃ میں کہتے ہیں کہ باء، شین اور راء کے بنیادی معنی کسی چیز کے حسن و جمال کے ساتھ ظاہر ہونے کے ہیں کیونکہ بَشَرَۃ انسان کی ظاہری جلد کو کہا جاتا ہے اور اسی سے ہے باشر الرجل المرأۃ 'آدمی نے اپنی ظاہری جلد کو عورت کی ظاہری جلد سے ملایا۔ صاحب لسان العرب نے معنی میں وسعت پیدا کرتے ہوئے کہا ہے کہ بَشَرَۃ سے مراد سر، چہرے اور بدن کی ظاہری جلد ہے جس پر بال نہیں ہوتے انھوں نے ابن سیدہ صاحب المخصص کا قول نقل کیا ہے کہ بَشَر بشرۃ کی جمع ہے اور اَبشار اس کی جمع الجمع ہے جیسا کہ حدیث میں آتا ہے: لَمْ اُبعث عمالی لیضربوا ابشَارَکم 'میں نے اپنے کارندے اس لیے نہیں بھیجے کہ تمھاری جلدوں پر کوڑے ماریں'۔ چنانچہ بَشَارۃ حسن و جمال کو کہا جاتا ہے، محاورہ ہے: ھُوَ اَبشَرَ منہ 'وہ اس سے زیادہ خوبصورت ہے'۔ خوبصورت چہرے والے مرد اور عورت کو بشیر اور بشیرہ کہا جاتا ہے جیسا کہ اعشیٰ کا شعر ہے:

ورأت بأن الشیب جا
نبۃ البشاشۃ والبَشارۃ

'اور اس (محبوبہ) نے دیکھا کہ بڑھاپے کے ایک جانب
بشاشت اور حسن و جمال جھانک رہا تھا'

زمین اور چمڑے کی اوپر والی سطح کو بھی بشرۃ کہا جاتا ہے۔ محاورہ ہے: ما أحسن بشرۃ الأرض 'زمین کی اوپر والی سطح کس قدر خوبصورت ہے' یا پھر یہ محاورہ کہ الأرض اخرجَتْ بشرتھا 'زمین نے اپنی نباتات نکال لی' یا پھر بَشَرَ الجراد الأرض 'ٹڈی نے زمین کی روئیدگی کو چٹ کر لیا' یا چمڑے کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ بَشَرْتُ الأدیم 'میں نے کھال کی ظاہری سطح کو چھیل دیا'۔ صاحب المفردات نے لکھا ہے: بَشَرَۃ انسان کی ظاہری جلد اور اَدمۃ اس کی اندرونی جلد کو کہتے ہیں جس سے یہ محاورہ استعمال ہوتا ہے: فلان مؤدم مُبْشَر 'فلاں باطنی اور ظاہری لحاظ سے نرم اور سخت ہے' یعنی اس میں باطنی نرمی اور چہرے کی سختی ایک ساتھ پائی جاتی ہے'۔ المبشرۃ 'وہ عورت جو ہر لحاظ سے خوبصورت اور کامل ہو'۔ Lane نے Lexicon میں تاج العروس کے حوالہ سے ایک اور محاورہ نقل کیا ہے وہ یوں ہے کہ مَنْ احَبَّ القرآن فَلْیَبْشُرْ اس کا ترجمہ انھوں نے یوں کیا ہے:

Marfat.com

Whoso loveth KORAN let him make himself light of flesh (by not eating more than that will be sufficient and so prepare himself for reading).

'جو قرآن سے محبت کرتا ہے وہ اپنے اوپر والا گوشت چھیل کر کم کر دے (تا کہ قرآن سے لطف اندوز ہو سکے)'۔

انسان کو بشر ظہور کی وجہ سے کہا جاتا ہے کیونکہ اس کی جلد بالوں سے صاف ہوتی ہے۔ اس کے برعکس دیگر حیوانات کی کھال پر اون، بال یا پشم ہوتی ہے۔ قرآن حکیم میں جہاں کہیں انسان کی جسمانی بناوٹ اور ظاہری جسم کا لحاظ کیا گیا ہے۔ ایسے موقع پر اسے خاص کر بشر کہا گیا ہے جیسے 'وَهُوَ الَّذِي خَلَقَ مِنَ الْمَاءِ بَشَرًا' (الفرقان ۲۵:۵۴) 'وہی ہے جس نے بشر کو پانی سے پیدا کیا' یا پھر 'إِنِّي خَالِقٌ بَشَرًا مِّن طِينٍ' (ص ۳۸:۷۱) 'بیشک میں بشر کو مٹی سے پیدا کرنے والا ہوں'۔ عام طور پر قرآن میں انسان اور بشر مترادف الفاظ ہیں۔ سورۃ حجر میں ایک جگہ اسے انسان کہا گیا ہے جیسا کہ 'وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنسَانَ مِن صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَإٍ مَّسْنُونٍ' (الحجر ۱۵:۲۶) 'ہم نے انسان کو بجتی ہوئی مٹی سے جو کہ سڑے ہوئے گارے کی بنی تھی پیدا کیا'۔ پھر ارشاد ہے: 'وَإِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلَائِكَةِ إِنِّي خَالِقٌ بَشَرًا مِّن صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَإٍ مَّسْنُونٍ' (الحجر ۱۵:۲۸) 'اور یاد کرو جب آپ کے رب نے فرشتوں سے کہا کہ میں ایک بشر کو بجتی ہوئی مٹی سے جو سڑے ہوئے گارے سے بنی ہوگی پیدا کرنے والا ہوں'۔

صاحب لسان العرب کا قول ہے کہ بشر سے مراد مخلوق ہے اس کا اطلاق مذکر و مؤنث، واحد، تثنیہ اور جمع پر یکساں ہوتا ہے نہ اس سے تثنیہ کا صیغہ آتا ہے نہ جمع کا۔ چنانچہ کہا یوں جاتا ہے: 'هِيَ بَشَرٌ' 'وہ عورت بشر ہے' 'هُوَ بَشَرٌ' 'وہ مرد بشر ہے' 'وهما بشر' 'وہ دونوں بشر ہیں' 'وهُم بَشَرٌ' 'وہ سب بشر ہیں'۔ ابن سیدہ کا قول ہے کہ کبھی کبھی تثنیہ استعمال ہوتا ہے جیسا کہ قرآن میں ہے: 'أَنُؤْمِنُ لِبَشَرَيْنِ مِثْلِنَا' (۲۳:۴۷) 'کیا ہم اپنے جیسے دو انسانوں پر ایمان لائیں'۔ اور اس کی جمع ابشار بھی آتی ہے لیکن المصباح المنیر کے مصنف کا قول ہے کہ عرب اس سے تثنیہ تو لاتے ہیں مگر جمع نہیں لاتے۔

تخلیق بشر یا انسان

مٹی تخلیق کا سرچشمہ ہے۔ اللہ نے انسان کو خواہ مرد ہو یا عورت مٹی سے پیدا کیا جیسا کہ اس نے روئے زمین پر ہر جاندار کو مٹی سے پیدا کیا۔ انسانی جسم کے تمام عناصر مٹی سے مرکب ہیں۔ مٹی کے اس انسان کو حیوانات غذا مہیا کرتے ہیں اور حیوانات کی غذا نباتات ہے اور نباتات مٹی سے پیدا ہوتی ہے۔

Marfat.com

ایک بیج مٹی کی تاثیر سے درخت بنتا ہے، انسان یا بشر اسی مٹی میں ایک عالم سے دوسرے عالم کی طرف منتقل ہوتا رہا۔ اس طرح سفر میں کئی ملین سالوں کا عرصہ لگا یہاں تک کہ انسانی زندگی کے ابتدائی آثار انسان اول میں ظاہر ہوئے، جس اللہ نے آدم یا انسان اول کو مٹی سے بنایا۔ اسی نے حوا کی تخلیق بھی مٹی سے کی۔ انسان کو زوج کی شکل میں مٹی سے پیدا کرنا، موت وحیات پر اللہ کی قدرت کی ایک نشانی ہے۔ مٹی کی جامد صورت سے انسان کی متحرک صورت کی طرف انتقال اللہ کی صنعت خلاقی پر غور وفکر کی دعوت دیتا ہے اور دل میں خالق کی حمد وثنا کے جذبات پیدا کرتا ہے۔ اعتدال طبائع سے انسانی بدن کا تسویہ کرنے کے بعد انسان، بشمول مرد وعورت، کی فطرت میں اپنی روح پھونک دی۔ اس طرح اس مٹی نے حیوانی زندگی سے انسانی زندگی کی طرف ارتقا کیا۔ یہی وہ نفخہ ربانی یا نور الٰہی ہے جو ہاتھ پاؤں رکھنے والے اس وجود کو اوج کمال تک پہنچاتا ہے۔ ہم اس نفخہ کی کنہ سے تو واقف نہیں البتہ اس کے آثار سے واقف ہیں۔ یہی آثار اس زندہ وجود کو تمام مخلوقات کی نسبت امتیاز بخشتے ہیں اور اس کی عقلی اور روحانی ترقی کا سبب بنتے ہیں۔ یہی نور الٰہی انسان کی عقل کو ماضی کے تجربات سے استفادہ کرنے اور مستقبل کی تدبیر کرنے کے قابل بناتا ہے اور اس کا رشتہ اپنے خالق سے جوڑتا ہے۔ روئے زمین پر بسنے والی کوئی مخلوق اس عقلی اور روحانی ارتقاء میں انسان کی شریک نہیں۔ جوں جوں انسان اس نفخہ کے سرچشمے سے جڑتا جاتا ہے توں توں وہ ترقی کرتا جاتا ہے۔ اور زمین کے پانی، ہوا، معدنیات، نباتات اور حیوانات کو اپنے استعمال میں لاتا جاتا ہے۔ سورۃ بقرۃ، اعراف اور سورۃ حجر میں آدم وابلیس کے قصے کے مقدمات ملتے جلتے ہیں یعنی انسان کے قدم روئے زمین پر جمانا اور خلافت ارضی کو اس کے حوالے کرنا۔ اس لیے اللہ نے انسان کو علم ومعرفت کی قوت عطا کی اور اسے مسجودِ ملائک ٹھہرایا۔ فرشتوں کو اس کے سامنے یوں لا کھڑا کیا جیسے استاد کے سامنے شاگرد اور انھیں وہ کچھ سکھایا جو وہ جانتے بھی نہ تھے۔

آدم وابلیس کے اس قصے میں انسان، فرشتوں اور شیطان کی فطرت کا بیان ہے۔ نفوس بشریہ ملکوتی اور شیطانی قوتوں کے درمیان بمنزلہ ایک پل کے ہیں۔ ملکوتی نفوس اللہ کی اطاعت بجالاتے ہیں اور شیطانی نفوس نافرمانی اور سرکشی کے عادی ہیں۔ اسی لیے ابلیس نے خالق کے سامنے حجت بازی کی اور اطاعت کو اپنی پسند اور ناپسند پر موقوف کیا۔ نادان نے مادی فضیلت کو معیار بنایا ہے۔ خاکی اور ناری کے چکر میں پڑ گیا اور آدم کی علمی اور عملی صلاحیتوں کو نظر انداز کر بیٹھا اس لیے راندہ درگاہ ہو گیا۔ جب انسان سے نفخہ ربانی الگ ہوتا ہے تو وہ مٹی کی طرف لوٹ جاتا ہے۔

اسی نفخہ الٰہی کا اثر تھا کہ اللہ نے بعض انسانوں کو وحی کے لیے منتخب کیا جو دنیا میں بشیر ونذیر

Marfat.com

بن کر آئے۔

اللہ کی قدرت کی ایک اور نشانی یہ ہے کہ اس نے ایک قطرۂ آب سے بشر کی دو اصناف نر اور مادہ کو پیدا کر دیا۔ یہ تخلیق اس حیات سے عجب تر ہے جو بارش کے پانی سے وجود میں آتی ہے۔ نطفہ ایک جرثومۂ حیات (Life cell) کی شکل میں ہوتا ہے پھر وہ جوش نمو سے پھٹ کر دو حصوں میں تقسیم ہو جاتا ہے۔ اس کا ایک حصہ نر بن جاتا ہے اور دوسرا مادہ۔ اس طرح مرد اور عورت ایک دوسرے کے زوج بن جاتے ہیں مقصد یہ تھا کہ وہ ایک دوسرے کی رفاقت سے سکون قلب حاصل کریں۔

تخلیق کا پہلا مرحلہ

قرآن حکیم نے انسان کی تخلیق کے مختلف مراحل بیان کیے ہیں پہلا مرحلہ یہ ہے کہ اسے بھر بھری مٹی سے پیدا کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ: "وَمِنْ آيَاتِهِ أَنْ خَلَقَكُم مِّن تُرَابٍ ثُمَّ إِذَا أَنتُم بَشَرٌ تَنتَشِرُونَ" (الروم ۳۰:۲۰) یعنی اور اسی کی نشانیوں میں سے ایک یہ ہے کہ تم کو مٹی سے پیدا کیا پھر دیکھتے ہی دیکھتے تم انسان بن کر پھیلے پھرتے ہو۔

آیت اور نشان وہی چیز ہو سکتی ہے جو سامنے موجود ہو۔ پس مٹی سے پیدا کرنے سے یہ معنی لینا کہ حضرت آدم علیہ السلام کو مٹی سے پیدا کیا گیا صحیح نہیں بلکہ مراد یہ ہے کہ ہر ایک انسان کو مٹی سے پیدا کیا گیا جس طرح انسان اول کو مٹی سے پیدا کیا گیا۔ نشان یہی ہے کہ کس طرح مٹی کے اجزاء کا خلاصہ در خلاصہ نکل کر ایک انسان بن جاتا ہے۔ امام رازی نے آیت نمبر (۱۵:۲۶) کی تفسیر میں امام محمد بن باقر کے قول کا حوالہ دیا ہے کہ آدم علیہ السلام سے پہلے ہزارہا بلکہ اس سے بھی زیادہ آدم ہو گزرے ہیں۔ پھر وہ فرماتے ہیں کہ سوائے سنی سنائی باتوں کے، اس کا کوئی ثبوت نہیں کہ انسان سے مراد ہمارے باپ آدم ہیں بلکہ صحیح تو یہ ہے کہ اللہ نے انسان اول کو پہلے خشک مٹی سے پھر گیلی مٹی سے پھر سیاہ متغیر کیچڑ سے پھر خشک ٹھیکرے کی طرح بجنے والی مٹی سے پیدا کیا۔

جب اللہ نے موت و حیات پر اپنی قدرت کا ذکر کیا تو اس کی واضح دلیل دی کہ تمھیں مٹی سے پیدا کیا۔ مٹی جس سے انسان پیدا ہوتا ہے مردہ اور جامد ہوتی ہے۔ مٹی، جو زندگی سے بعید ترین چیز ہے، کا ذکر کرنے کے فوراً بعد چلتے پھرتے پھیلے ہوئے انسانوں کی تصویر پیش کی تاکہ ساکن مٹی اور متحرک انسانوں کا موازنہ ہو جائے کہ کس طرح جامد چیز دیکھتے ہی دیکھتے متحرک ہو گئی۔ یہ معجزہ اللہ کی قدرت کی ایک نشانی ہے جو اس مٹی کو گردش دیتا ہوا اس مقام تک لے آیا جہاں انسان پیکر بشریت اختیار کر کے ساری دنیا میں پھیل گئے۔ لفظ بشر میں قوت مدرکہ کی طرف اشارہ ہے کیونکہ بشر صرف حرکت کی وجہ سے

Marfat.com

بشرنہیں کہلاتا یہ تو سب حیوانات کی صفت ہے اور تنتشرون (تم منتشر ہورہے ہو) میں قوت مدرکہ سے قوت محرکہ کے انتقال کی جانب اشارہ ہے۔ دونوں قوتیں مٹی ہی سے بنی ہیں۔ اس آیت میں اس مضبوط تعلق کا بھی بیان ہے جو انسان اور اس زمین کے درمیان ہے جس پر وہ اپنی زندگی بسر کرتا ہے۔ یہ بات ذہن میں رہنی چاہئے کہ انسانِ اول میں مرد اور عورت دونوں شامل ہیں اگر آدم کی تخلیق مٹی سے ہوئی ہے تو حواء کی تخلیق بھی مٹی سے ہی ہوئی ہے۔ لفظ انسان اور بشر کا اطلاق دونوں پر یکساں ہوتا ہے۔

تخلیق کا دوسرا مرحلہ

اس مرحلہ میں خشک اور بھربھری مٹی نے تر مٹی کی شکل اختیار کر لی چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: 'إِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلَائِكَةِ إِنِّي خَالِقٌ بَشَرًا مِّن طِينٍ ' (ص ۷۱:۳۸) 'جب تیرے رب نے فرشتوں سے کہا کہ میں تر مٹی سے انسان کو بنانے والا ہوں پھر یہ تر مٹی لیس دار چپکنے والی مٹی میں تبدیل ہوگئی'۔ سورۃ الصافات میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: 'إِنَّا خَلَقْنَاهُم مِّن طِينٍ لَّازِبٍ ' (الصافات ۱۱:۳۷) 'بے شک ہم نے ان کو چپکنے والی مٹی سے پیدا کیا مٹی کو پانی میں گوندھا گیا وہ لیس دار بن گئی'۔ لَّازِبٍ سے مراد وہ جھاگ ہے جو سمندروں اور دریاؤں کے کنارے پر ہوتی ہے۔ لَّازِبٍ سے زندگی کا اولین جرثومہ وجود میں آیا اس مرحلہ کو سورۃ مومنون میں زیادہ وضاحت سے بیان کیا گیا ہے، ارشاد ہے: وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنسَانَ مِن سُلَالَةٍ مِّن طِينٍ ' (المؤمنون ۱۲:۲۳) 'اور ہم نے انسان کو مٹی کے خلاصہ سے بنایا'۔ سُلَالَةٍ سے فعل سَلَّ ہے جس کا مطلب ہے ایک چیز کو دوسری چیز سے کھینچ کر نکالنا۔ امام راغب کے قول کے مطابق سُلَالَةٍ وہ صاف جوہر ہے جو زمین سے کھینچ کر نکال لیا جاتا ہے جیسے کہا جائے کہ مکھن دودھ کا خلاصہ ہے۔ مٹی اور انسان کے درمیان کئی مراحل ہیں جن کی طرف سُلَالَةٍ کا لفظ اشارہ کرتا ہے، خشک سے تر مٹی سے لیس دار مٹی اور لیس دار مٹی سے سیاہ بدبودار کیچڑ اور سیاہ کیچڑ سے ٹھیکرے کی طرح بجنے والی خشک مٹی۔ پھر اس مٹی سے نباتات اور نباتات سے حیوانات اور جرثومہ سے انسان۔ انسان کو مٹی سے پیدا کیا تو حیوانات کے گوشت، دودھ اور گھی سے اسے غذا مہیا کی۔ حیوانات کو غذا نباتات مہیا کرتی ہے اور نباتات مٹی سے پیدا ہوتی ہیں۔ ایک بیج مٹی کی تاثیر سے درخت بنتا ہے وہ انھی اجزاء سے مل کر غذا کے قابل بنتا ہے۔ اس مٹی نے کس طرح مادی اور جسمانی زندگی سے روحانی زندگی کی طرف ارتقا کیا؟ مٹی کا خلاصہ کہاں سے کہاں پہنچا؟ یہ اللہ تعالیٰ کی قدرت پر دلیل ہے کہ مٹی جیسے کثیف جوہر سے انسانی زندگی کا جوہر نکالا گیا۔ یہ تماشہ شب و روز ہماری آنکھوں کے سامنے ہوتا رہتا ہے۔ اگر یہ حقیقت ہے تو پھر اعمال صالحہ سے اس سے بھی لطیف جوہر کیوں نہیں بن سکتا جو انسان کی دوسری زندگی

Marfat.com

کے لیے بنیاد کا کام دے۔ تخلیقی مدارج میں طین پہلا مرحلہ ہے اور انسان آخری مرحلہ۔ قرآن عملی نظریات کے مطابق تفصیل پیش نہیں کرتا بلکہ اس کا مقصد ہے کہ اللہ کی صنعت گری پر غور کیا جائے۔

تخلیق کا تیسرا مرحلہ

تیسرے مرحلے کا بیان سورۃ الحجر کی آیت ۲۶ اور ۲۸ میں ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: 'وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنسَانَ مِن صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَإٍ مَّسْنُونٍ' (الحجر ۱۵:۲۶) 'بے شک ہم نے انسان کو سڑے ہوئے (خمیر اُٹھے ہوئے) گارے سے بنایا جو سوکھ کر بجنے لگتا ہے' یعنی 'گوندھنے کے بعد مٹی کو چھوڑ دیا یہاں تک کہ وہ بودار سیاہ رنگ کی ہوگئی پھر اسے ایسے سانچے میں ڈھالا جیسے جواہرات اور معدنیات کو ڈھالا جاتا ہے'۔

صَلْصَال سے مراد وہ خشک مٹی ہے جسے آگ نے نہ چھوا ہو اور جب آپ اسے بجائیں تو وہ بجنے لگے اور آپ اس کی کھنکھناہٹ سن لیں۔ جس مٹی کو آگ چھولے اسے فخار (ٹھیکرا) کہا جاتا ہے۔

حَمَا کے معنی ہیں: 'کیچڑ' جس کا رنگ پانی کے قریب ہونے کی وجہ سے سیاہ پڑ گیا ہو۔ عربی زبان میں کہا جاتا ہے: 'حمئت البئر حماً' یعنی 'کنویں سے اچھی طرح کیچڑ نکالا گیا'۔ اس سے مراد وہ کیچڑ ہے جس کا خمیر خاص حالات میں تیار کیا گیا ہو اس خمیر کی وجہ سے وہ مختلف صورتیں اور شکلیں اختیار کر سکتا ہو۔

حَمَا، حماۃ کی جمع ہے قرآن حکیم میں عین حمئۃ (الکہف ۱۸:۸۶) کی ترکیب استعمال ہوئی ہے جس کا مطلب ہے سیاہ کیچڑ والا چشمہ۔ مَسْنُون حما کی صفت ہے۔ اہل لغت نے اس کے متعدد معانی بیان کیے ہیں۔ مثلاً سُنَّۃ الوجہ چہرے کی صفائی کی وجہ سے اس کی تصویر کو کہا جاتا ہے اور سَن کے معنی ایک چیز کو شکل وصورت دینا ہے اس اعتبار سے مَسْنُون کے معنی ہوں گے تصور بنایا گیا۔ اہل کوفہ کہتے ہیں: 'سننتُ الحجر علی الحجر' 'میں نے پتھر کو پتھر پر رگڑا'، اس سے مَسْنُون کے معنی متغیر کے ہیں۔ امام راغب نے یہی معنی لکھے ہیں۔ رگڑنے سے دونوں پتھروں کے درمیان سے جو نکلتا ہے اسے سنین کہتے ہیں اور وہ بودار ہوتا ہے اس وجہ سے اس کے معنی بودار بھی ہیں، عربی میں کہا جاتا ہے: سننت الماء علی الوجہ وغیرہ میں نے پانی، چہرے وغیرہ پر انڈیلا۔ گویا کہ حما (کیچڑ) کو انڈیلا گیا یہاں تک کہ انسان کی صورت ایسے ڈھل گئی جیسے جواہرات اور معدنیات کو ڈھالا جاتا ہے۔

اس طرح انسان کا کھوکھلا مجسمہ تیار ہو گیا۔ پھر وہ خشک ہو گیا اور بجانے پر بجنے لگا۔ امام قرطبی کا قول ہے کہ جمہور کی یہی رائے ہے۔ اس اعتبار سے مَسْنُون کے معنی ہیں: جو مختلف سانچوں میں تیار ہو۔

Marfat.com

تخلیق کا چوتھا مرحلہ

سب سے پہلے خشک مٹی نے تر مٹی کی شکل اختیار کی، پھر یہ تر مٹی لیس دار چپکنے والی مٹی میں تبدیل ہوگئی پھر اس لیس دار مٹی نے سیاہ کیچڑ کی شکل اختیار کی۔ یہ کیچڑ مختلف سانچوں میں ڈھل گیا اور چوتھے مرحلے میں بجنے والی مٹی میں بدل گیا۔ اس مرحلہ کا ذکر سورۃ رحمان میں یوں ہے: 'خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ كَالْفَخَّارِ' (۵۵:۱۴) 'اُس نے انسان کو ٹھیکرے کی طرح بجنے والی مٹی سے پیدا کیا'۔

ان تمام آیات میں الانسان کا لفظ نوع انسانی کے لیے استعمال ہوا ہے جس میں مرد اور عورت شامل ہیں۔ ان آیات میں لفظ بشر فرشتوں اور جنوں کے مقابلے میں استعمال ہوا ہے۔ بشر سے مراد جسم کثیف ہے جس سے اتصال بھی ہوسکتا ہے اور اسے چھوا بھی جاسکتا ہے جبکہ فرشتوں اور جنوں کے اجسام لطیف ہوتے ہیں جن سے نہ اتصال ہوسکتا ہے اور نہ ان کو چھوا جاسکتا ہے۔

مولانا محمد علی کہتے ہیں کہ کوئی سے بھی مدارج ہوں جن میں سے ہو کر انسان بنا اور کتنی بھی مدت اس کے بننے میں یا بنانے پر گزر گئی ہو زندگی کی ابتداء کا جو کچھ پتہ آج سائنس سے ملتا ہے وہ وہی ہے جس کا ذکر چند لفظوں میں قرآن نے کر دیا ہے یعنی سب سے پہلی حالت جو انسانی زندگی کی معاون ہوئی وہ سوکھی ہوئی مٹی تھی۔ صَلْصَالٍ كَالْفَخَّارِ (الرحمن ۵۵:۱۴) 'کہہ کر بتا دیا کہ گویا وہ آگ سے پک کر نکلی ہے'۔ اس میں یہ توجہ دلانا مقصود ہے کہ زمین کی موجودہ سطح گویا آگ سے پک کر تیار ہوئی ہے اور اس کی شہادت آج سائنس سے ملتی ہے کہ ابتداء میں یہ زمین گویا آگ کا ٹکڑا تھی بتدریج ٹھنڈا ہوتے ہوتے اس کی اوپر کی سطح سخت ہوگئی۔ اس سے اگلی آیت میں اس کی ناری حالت کی طرف یہ کہہ کر توجہ دلائی ہے کہ جنوں کو اس سے پہلے نار سے پیدا کیا گیا گویا اس سے پہلے زمین کی پہلی حالت نار کی تھی۔ انسانی تخلیق سے پہلے کرہ ارض میں بے پناہ حرارت تھی اس لیے ابتداء میں یہاں ایسی مخلوق کی نموہوئی جس میں حرارت، برداشت کرنے کی بڑی صلاحیت تھی'۔

ابتدائے زندگی کی تاریخ پر جو روشنی سائنس نے ڈالی ہے وہ یہی ہے کہ زندگی کی ابتداء ایسی مٹی سے ہوتی ہے جس میں پانی مل کر اس میں تغیر پیدا کر دے۔ ایک نبی ﷺ کے منہ سے یہ الفاظ کہلوا کر اللہ تعالیٰ نے اپنے اس کامل علم کا ثبوت دیا ہے جس کے مقابلہ میں انسانی علوم ہیچ ہیں۔ ابتداء میں نوع انسانی کی تخلیق مٹی سے ہوئی، یہی مٹی غذا کے ذریعے سے نطفہ بنی اور اس نطفے سے جوڑے جوڑے پیدا ہوئے۔ اس حقیقت کی طرف سورۃ فاطر میں اشارہ کیا گیا ہے۔ ارشاد ربانی ہے: 'وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ جَعَلَكُمْ اَزْوَاجًا' (فاطر ۳۵:۱۱) 'اللہ نے تمہیں مٹی سے پیدا کیا پھر نطفہ

Marfat.com

سے پھر تمھیں جوڑا جوڑا بنایا'۔ یہاں سب لوگ مخاطب ہیں۔ ساری نوع انسانی مٹی سے بنی پھر یہی مٹی غذا کے ذریعہ نطفہ بنی اور اس نطفے سے جوڑے جوڑے بنے۔ اس طرح بشریت کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ یہ جوڑے تعداد میں تقریباً برابر برابر ہیں اگر ایسا نہ ہوتا تو انسان اور حیوان فنا ہو جاتے۔ حفظ نوع کا تقاضا ہے کہ یہ مساوات قائم رہے۔ یہ مساوات اللہ کے علم اور تدبیر کا مظہر ہے۔ جس اللہ نے مٹی کو مختلف مرحلوں سے گزار کر نطفے میں بدلا، وہ اللہ اس بات پر بھی قادر ہے کہ وہ ایک ہی نطفے سے نر بھی پیدا کرے اور مادہ بھی۔ اس طرح مٹی ارتقائی منازل طے کرتی ہوئی اس منزل پر پہنچی جہاں پیدائش بذریعہ توالد و تناسل ہوتی ہے۔ اس مقصد کے لیے ایک ہی نوع دو حصوں (نر اور مادہ) میں تقسیم ہو جاتی ہے۔

سورۃ فرقان میں بھی اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: 'وَهُوَ الَّذِي خَلَقَ مِنَ الْمَاءِ بَشَرًا فَجَعَلَهُ نَسَبًا وَصِهْرًا ۗ وَكَانَ رَبُّكَ قَدِيرًا' (الفرقان ۲۵:۵۴) 'اور وہی ہے جس نے پانی سے انسان کو پیدا کیا پھر اسے نسب اور سسرال (والا) بنایا اور تیرا رب قدرت والا ہے'۔

اسی مَاء کو ایک جگہ مَاءٍ مَّهِينٍ 'حقیر پانی' (السجدۃ ۳۲:۸) اور دوسری جگہ ماء دافق 'ٹپکنے والا پانی' کہا گیا ہے۔ سورۃ السجدہ میں اس حقیر پانی کی حکمت بھی بتائی گئی ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: 'اس نے انسان کی پیدائش مٹی سے شروع کی پھر اس کے توالد و تناسل کا سلسلہ خون کے خلاصے سے جو پانی کا حقیر سا قطرہ ہے، قائم کر دیا۔ گویا یہ قطرۂ آب نسل انسانی کی بقاء کا ذریعہ بنا۔

سورۃ فرقان کی مذکورہ بالا آیت میں بشر کی تکوین اس کی عظمت پر دلالت کرتی ہے۔ نسباً سے مراد نر ہے جس کی طرف نسبت کی جاتی ہے اور کہا جاتا ہے کہ فلاں کا بیٹا فلاں اور فلاں کی بیٹی فلاں اور صہراً سے مراد مادہ ہے جس سے رشتہ قائم کیا جاتا ہے۔ اور یہ آیت اللہ تعالیٰ کے اس قول کی مانند ہے: 'فَجَعَلَ مِنْهُ الزَّوْجَيْنِ الذَّكَرَ وَالْأُنثَىٰ' (القیامۃ ۷۵:۳۹) 'پھر اس سے دو زوج بنائے مرد اور عورت'۔ ذکر و انثی کی بجائے نسباً و صہراً کے الفاظ اس لیے استعمال ہوئے ہیں کیونکہ یہ نر اور مادہ کے پھیلاؤ کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ کس طرح معاشرتی ضروریات کے تحت ہر بشر کے الگ الگ رشتے قائم ہو گئے۔ ادھر ددھیال کی طرف سے اور ادھر ننھیال کی طرف سے۔

انسان کے نطفے میں پوشیدہ ہزاروں لاکھوں خلیے (Spermatozoa) مادہ کی بیضہ دانی میں داخل ہوتے ہیں ان میں سے ایک خلیہ اس بیضہ میں پیوست ہو جاتا ہے جو ماہواری آنے کے بعد نلوں سے رحم مادر میں پہنچ کر اپنے جوڑے کا متلاشی ہوتا ہے اور اسے بارآور کرتا ہے اگر اس بیضہ میں دو سپرم جم جائیں تو جوڑا پیدا ہوتا ہے۔ ایک بارآور کیے ہوئے خلیے سے اس کا جوڑا یعنی دوسرا خلیہ بنتا ہے، پھر دو سے چار،

Marfat.com

چار سے آٹھ اور آٹھ سے سولہ خلیے بنتے ہیں اس سارے خلیوں کی بستی سے بشر نمودار ہوتا ہے۔ اگر انسان اس قطرہ آب پر غور کرے تو وہ چکرا جاتا ہے اور سمجھ جاتا ہے کہ اس سے حیات بشر کا آغاز اس حیات سے عجیب تر ہے جو آسمان سے نازل ہونے والے پانی سے وجود میں آتی ہے۔ ہر نر اور مادہ خلیہ کروموزوم (Chromosome) اور جین (Gene) پر مشتمل ہوتا ہے کروموزوم میں وہ گٹھلی ہے جس کے اندر جینز ہوتے ہیں جو کسی موروثی خصوصیت کو والدین سے اولاد تک منتقل کرتے ہیں اور اولاد میں کسی مخصوص خصوصیت کی نمو کو متعین کرتے ہیں۔ ایک خوردبینی ذرات سے بھی چھوٹی اکائیاں ہیں جو انسان، حیوان اور نباتات کی خاصیتوں کی کلید ہیں۔ اگر ان کو ایک جگہ پر اکٹھا کیا جائے تو ان کا حجم انگشتانے سے بھی چھوٹا ہوتا ہے یہ سب جانداروں کی خصوصیات کا ریکارڈ ہیں۔ نباتات کی جڑوں میں، تنوں میں، پتوں میں، پھولوں اور پھلوں میں انھی کا حکم چلتا ہے، جیسا کہ انسان اور حیوان کی شکل وصورت ظاہری جلد اور بالوں کی رنگت میں انھی کا حکم چلتا ہے۔ اس لحاظ سے نطفہ قدرت الٰہی کا مظہر ہے'و کان ربك قدیرا'۔ جو ایک نطفے سے بشر کی صورت گری کر سکتا ہے اس کے لیے مردے کے منتشر اجزائے خاکی کو دور دراز مقامات سے اکٹھا کر کے اسے دوبارہ زندہ کرنا ممکن ہے۔ اس سے بھی بڑھ کر حیرت انگیز بات یہ ہے کہ ایک جیسے خلیوں اور ایک جیسے بیضوں سے نر اور مادہ، مرد اور عورت کے جوڑے بنائے۔ یہ بات ذہن میں رکھنی ضروری ہے کہ سورۃ نساء میں نفس واحدہ سے مراد یہی نطفہ یا Embaryo ہے جو رحم مادر میں پرورش پا کر بشر خواہ وہ مرد ہو یا عورت بنتا ہے۔ قرآن کے جو الفاظ ہیں ان کی صداقت موجودہ علم الحیاۃ (Bilology) کی تحقیقات سے ثابت ہو رہی ہے۔ بشر کی تخلیق میں قرآن حکیم نے جو مراحل بیان کیے ہیں ان میں پسلی سے پیدا ہونے کا قطعی طور پر کوئی ذکر نہیں یہ سب اسرائیلی روایات ہیں۔ اس مقام پر قرآن کی فوقیت عہد نامہ قدیم (Old Testament) پر عیاں ہو جاتی ہے۔

تسویہ اور نفخہ ربانی

جب بشر کی تخلیق مکمل ہو چکی اور اللہ نے اعتدال طبائع سے اس کے جسمانی اجزاء کو ٹھیک ٹھاک کر دیا اور اسے حالت اعتدال پر لے آیا تو اللہ نے اس میں اپنی روح پھونک دی۔ اس بات کا تذکرہ سورۃ حجر (۲۸:۱۵)، سورۃ سجدہ (۸:۳۲) اور سورۃ صافات (۷۱:۳۸) میں کم وبیش ایک جیسے الفاظ سے ہوا ہے۔ یہ تسویہ جسمانی تسویہ ہے یعنی بشر کے اعضاء میں اعتدال پیدا کیا یا اس کے مزاج میں اعتدال پیدا کر کے اسے نفخہ الٰہی کے لیے تیار کیا۔ چنانچہ امام رازی نے بعض لوگوں کا قول نقل کیا ہے کہ نطفے میں ملے جلے مزاج ایسے ہوتے ہیں جیسے انسانوں میں ہوتے ہیں مثلاً حرارت، برودت، رطوبت اور

Marfat.com

یبوست۔ اسی لیے قرآن نے نُّطْفَةٍ أَمْشَاجٍ (الأنسان ۷۶:۲) 'مخلوط نطفے' کی ترکیب استعمال کی ہے اور یہاں اس میں اعتدال مراد ہے۔ اس جسمانی اعتدال کا اگلا مرحلہ یہ ہے کہ اللہ نے اس میں اپنی روح پھونکی۔ صاحب کشاف نے نفخہ الٰہی کو تمثیلی انداز قرار دے کر کہا ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ اللہ نے اسے زندہ کر دیا کیونکہ یہاں نہ کوئی نفخ ہے اور نہ منفوخ'۔ گویا انھوں نے روح کے معنی نفس بمعنی جان لیے ہیں۔ مگر سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر اس سے مراد جان لی جائے تو یہ جان انسان اور حیوان میں مشترک ہے پھر فرشتوں کو انسان کے سامنے سجدہ ریز ہونے کا حکم کس خصوصیت کی وجہ سے ہوا؟ سورۃ بقرہ میں پہلے انسان کو علم دیا جاتا ہے پھر فرشتوں کو سجدہ کا حکم ہوتا ہے اس سے معلوم ہوا کہ یہاں نفخ روح سے مراد اس نور الٰہی یا قوت ممیزہ کا نفخ ہے۔ جس کے ذریعے انسان علم حاصل کرتا ہے۔ یہ وہ روح ہے جو نوع بشر خواہ وہ مرد ہو یا عورت، میں پھونکی جاتی ہے۔ جیسا کہ سورۃ سجدہ (۸:۳۲) میں ارشاد ہے: 'پھر اس کی نسل کو حقیر نطفے کے خلاصہ سے بنایا پھر اسے ٹھیک ٹھاک کیا اور اس میں اپنی روح پھونکی۔

نفخہ الٰہی کی حکمت

اللہ نے روح کو اپنی طرف نسبت دی جس طرح اس نے کعبہ کو بیتی (میرا گھر) کہہ کر اپنی طرف نسبت دی۔ اس نسبت میں روح کی عظمت کی طرف اشارہ ہے۔ یاد رہے کہ یہاں روح سے مراد نفس ناطقہ یا وہ چیز ہے جس سے انسان تمیز کرتا ہے۔ یہ نفخہ ربانی انسان کو ملاء اعلیٰ سے جوڑتا اور اسے اتصال باللہ کا اہل بناتا ہے اور اسے اس قابل بناتا ہے کہ وہ اس مادی دائرے سے نکلے جس میں اعضاء اور خواص ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتے ہیں اور اس تجریدی دائرے میں داخل ہو جہاں دل و دماغ باہم اثر انداز ہوتے ہیں۔ ہم اس نفخہ کی کنہ سے تو واقف نہیں البتہ اس کے آثار سے واقف ہیں۔ یہی آثار اس زندہ وجود کو تمام مخلوق سے تمیز کرتے ہیں اور یہی اس کی عقل اور روحانی ترقی کا باعث بنتے ہیں اور یہی نور الٰہی بشر کی عقل کو ماضی کے تجربات سے استفادہ کرنے اور مستقبل کی تعمیر کے قابل بناتے ہیں۔ عقلی اور روحانی ارتقاء صرف انسانی خصوصیت ہے۔ روئے زمین پر بسنے والے جاندار اس میں اس کے شریک نہیں۔ اللہ نے یہ نور الٰہی اس لیے پھونکا کیونکہ اس کی مشیت کا تقاضا تھا کہ خلافت ارضی بشر کے سپرد ہو۔ انسان جوں جوں اس نفخہ کے سرچشمہ سے جڑتا جاتا ہے وہ ترقی کرتا جاتا ہے اور جب وہ اس راہ سے ہٹ جاتا ہے تو وہ منحرف ہو جاتا ہے۔ جب وہ نور الٰہی سے جدا ہو جاتا ہے تو پھر وہ مٹی بن جاتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ نفخہ ربانی کے وہ آثار جو اس کی زندگی کی قسمت متعین کرتے ہیں، ختم ہو جاتے ہیں۔ یہ چھوٹی سی حقیر سی مخلوق جس کی زندگی بھی محدود ہے اور اس کا علم بھی محدود، اس نور الٰہی اور خداوندی توانائی کے بغیر کبھی رفعت و بلندی کے مقام تک نہیں پہنچ سکتی۔ اسی کے طفیل وہ مسجود ملائک ٹھہری۔ اگر وہ اس نفخہ ربانی سے

Marfat.com

علیحدہ ہوگا تو اپنی اصل مٹی کی طرف لوٹ جائے گا۔

ملکوتی اور حیوانی صفات یا ارضی وسماوی عناصر میں اعتدال

نفخہ ربانی کے باوجود مٹی کی کثافت انسان کے وجود میں باقی رہتی ہے۔ کھانے پینے کی ضرورت اور جذبات وخواہشات کے سامنے اسے جھکنا پڑتا ہے۔ ارضی وسماوی خصوصیات انسان کے مزاج کا حصہ ہیں۔ وہ لحہ بھر کے لیے نہ خالص مٹی بن سکتا ہے اور نہ خالص روح۔ اس کے تمام تصرفات اسی ارضی وسماوی ترکیب کے تابع ہیں۔ ارضی وسماوی عناصر میں اعتدال وہ نقطۂ کمال ہے جس تک پہنچنے کی انسان آرزو کرتا ہے۔ مقصد یہ نہیں کہ وہ محض فرشتہ بن جائے یا محض حیوان۔ ان دونوں خصوصیات میں سے کسی ایک میں کمال بشر کی منزل مراد نہیں۔ ایسی بلندی جس میں اعتدال نہ ہو وہ نوع بشر اور اس کی صلاحیتوں کے بارے میں نقص شمار ہوگی۔ جو انسان اپنی جسمانی طاقت کو بیکار کر دیتا ہے وہ اپنی روحانی طاقت کو بھی بیکار کر دیتا ہے وہ ایسی چیز کی تمنا کرتا ہے جو خالق کی منشا کے خلاف ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام میں رہبانیت کی ممانعت ہے۔ اسلام نے شرعی نظام کی بنیاد اسی اعتدال پر رکھی ہے۔ اس نظام کا مقصد انسانی طاقتوں کے درمیان توازن ہے تاکہ تمام طاقتیں ضعف اور نقص کے بغیر اپنا اپنا کام کرتی رہیں اور ایک دوسرے پر تجاوز نہ کریں۔ جو بھی فطرتی حیوانی جذبات کو دبانے کی کوشش کرے گا۔ وہ انسانی وجود کی بربادی کا سبب ہوگا بالکل یہی حال اُس کا ہوگا جو اللہ پر ایمان کے جذبات کو دبانے کی کوشش کرے گا دونوں انسان کے دشمن ہیں، اور ان دونوں کو اس طرح دھتکارنا چاہیے، جس طرح شیطان کو دھتکارا جاتا ہے۔

نور الٰہی فانی مٹی کے ساتھ کیسے متصل ہو گیا؟ خالد فانی کے ساتھ اور ازلی حادث کے ساتھ کیسے مل گیا؟ عقل انسانی ان سوالوں کا جواب دینے سے قاصر ہے۔ اللہ بتاتا ہے کہ یہ ہو گیا یہ نہیں بتاتا کہ کیسے ہوا؟ گویا معاملہ حقیقت مسلمہ ہے عقل انسانی اس سے انکار نہیں کر سکتی۔ خالق کے عمل کو بشر کے ادراک پر قیاس نہیں کرنا چاہیے۔

بشر مسجودِ ملائک

جب بشری استعدادات کی تکمیل ہو چکی اور اللہ نے اس میں اپنی روح پھونک دی تو فرشتوں کو حکم دیا کہ اس کے سامنے سجدہ ریز ہو جائیں۔ قرآن کہتا ہے کہ آدم کی پیدائش سے پہلے اللہ نے فرشتوں میں اعلان کر دیا کہ وہ وجود انسانی کا انتظار کریں اور پیدائش کے وقت اس کے وجود کے سامنے سجدۂ تعظیم بجا لائیں۔ یہ تعظیم دراصل اللہ کی قدرت اور حکمت کی تھی فرشتوں نے مشاہدہ کیا تھا کہ کس طرح زمانے کے

Marfat.com

پیٹ میں مٹی حرکت کرتی رہی اور عجیب وغریب مخلوقات کا ظہور ہوتا رہا پھر سب سے عجیب تر مخلوق انسان پیدا ہوا۔ صاحب عقل وشعور، اور بولنے والا انسان اور زمین پر اللہ کا خلیفہ اس کے سامنے فرشتے ایسے کھڑے تھے جیسے استاد کے سامنے شاگرد اور اس سے وہ کچھ سیکھ رہے تھے جو وہ جانتے نہ تھے۔

آدم کے سامنے سجدہ دراصل اللہ کے سامنے سجدہ ہے جس کی قدرت کا ظہور فرشتوں پر ایک ایک نشانی کی صورت میں ہو رہا تھا۔ ساری توجہ آدم کے وجود کے راز پر تھی اور مقصد روئے زمین پر اس کے قدم جمانا اور خلافت ارضی کو اس کے سپرد کرنا تھا۔ آدم کے وجود کا راز ہدایت وگمراہی، اطاعت ونافرمانی کا راز ہے۔ آدم ابلیس کے قصے میں انسان، شیطان اور ملائکہ کی فطرت کا بیان ہے۔ نفوس بشریہ ملکوتی اور شیطانی نفوس کے درمیان ایک رابطہ ہیں۔ ملکوتی نفوس اللہ کی اطاعت بجالاتے ہیں جبکہ شیطانی نفوس نافرمانی کرتے ہیں۔ جب اللہ نے فرشتوں کو آدم کے سامنے سجدہ کرنے کا حکم دیا تو سوائے ابلیس کے سب نے یہ حکم تسلیم کر لیا۔ جن، ابلیس اور شیطان سے مراد ایک ہی مخلوق ہے جسے آدم کے سامنے سجدہ کرنے کا حکم ہوا۔ زمین کی پہلی حالت نار (آگ) تھی اور یہ کوئی بعید بات نہیں کہ جس قسم کے حالات ہوں اس قسم کی مخلوق ہو۔ اسی لیے جنوں (جان) کو آدم سے پہلے نار سے پیدا کیا کیونکہ آگ مٹی کو کھا جاتی ہے اور اسے جلا ڈالتی ہے اس لیے ابلیس جو کہ جن تھا اسے وجہ فضیلت سمجھ بیٹھا۔ اس نے اللہ سے دلیل بازی شروع کی اور مقام عبودیت سے تجاوز کیا، اس لیے زندہ درگور ہوا وہ یہ نہ سمجھ سکا کہ مادہ کا بہتر ہونا فضیلت کی دلیل نہیں بن سکتا۔ اس منطق کے اعتبار سے فرشتے اس سے بہتر تھے کیونکہ وہ نوری مخلوق تھے لیکن انھوں نے اپنے رب کا حکم مان لیا۔ ابلیس بھول گیا کہ انسان کی فطرت میں مٹی کے ساتھ ایک نیا عنصر روح الٰہی کا نفخہ ہے جبکہ اس کی فطرت ناری ہے اس میں کوئی اور عنصر شامل نہیں۔ وہ بشر کی علمی اور عملی صلاحیتوں سے بے بہرہ تھا۔ آدم کی اس خصوصیت کی طرف آیت نمبر (۳۸:۷۵) میں یہ کہہ کر یہ اشارہ کیا گیا ہے: "مَا مَنَعَكَ أَنْ تَسْجُدَ لِمَا خَلَقْتُ بِيَدَيَّ"۔ "جسے میں نے اپنے ہاتھوں سے بنایا اسے سجدہ کرنے سے تجھے کونسی چیز روک رہی ہے"۔ اللہ ہر چیز کا خالق ہے لیکن اس مخلوق میں کوئی امتیاز تو ہے جس کی وجہ سے اسے یہ شرف بخشا جا رہا ہے۔ وہ خصوصیت اللہ کی خاص عنایت ہے کہ اپنی روح اس کے اندر پھونک دی۔

اس قصے میں مشرکین مکہ کے لیے ایک تنبیہ ہے کیونکہ وہ بھی محمد ﷺ کو اپنے جیسا بشر سمجھ کر ان کے مقابلہ میں باشرف ہونے کا دعویٰ کرتے تھے اور ان کو جھلاتے تھے۔ اللہ نے ان کو آدم وابلیس کا قصہ سنا کر بتا دیا کہ وہ بھی اسی سلوک کے سزاوار ہیں جس کا سزاوار شیطان ہوا۔

Marfat.com

بشریت اور رسالت

لفظ بشر پر قرآن حکیم نے نبوت و رسالت جیسے اہم موضوع کے ضمن میں بحث کی ہے۔ اس سلسلہ میں ہم سب سے پہلے ان اعتراضات کا ذکر کریں گے جو منکرین نبوت ایک بشر کے رسول ہونے پر کرتے تھے پھر ان جوابات کا ذکر کریں گے جو اللہ تعالیٰ نے ان اعتراضات کے رد میں دیئے ہیں۔

اعتراضات

منکرین نبوت و رسالت اس بات سے انکار کرتے تھے کہ ایک بشر اللہ کا رسول ہو، وحی کے ذریعہ سے اس کا تعلق اللہ سے جڑا ہوا ہو، اور اللہ اسے لوگوں کی ہدایت کے لیے بھیجے۔ وہ برہمنوں کی طرح بشر کی نبوت کا انکار کرتے تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ جنس بشر اتنی کمزور ہے کہ وہ اللہ کے پیغام کا بوجھ نہیں اُٹھا سکتی۔ اس پیغام کو یا تو فرشتے اُٹھا سکتے ہیں یا کوئی اور مخلوق۔ وہ اس مخلوق پر اعتماد نہیں کرتے تھے جسے اللہ نے زمین پر اپنی خلافت سونپی۔ جب بھی کوئی پیغمبر آیا یہ شبہ منکرین کے ذہن میں آتا رہا کیونکہ وہ اس کے سامنے آسمان کی غیب کی خبریں پیش کرتا۔ اس لیے وہ کہتے یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک بشر زمین پر ہوتے ہوئے، کھاتے پیتے اور بازاروں میں گھومتے ہوئے ملأ اعلیٰ سے رشتہ استوار کرلے؟ ان کے ذہن میں پیغمبر کا غیر انسانی تصور تھا۔ انسانوں کا محدود تصور ہمیشہ حیرت انگیز رہا۔ چنانچہ قرآن حکیم میں ہے: ' أَكَانَ لِلنَّاسِ عَجَباً أَنْ أَوْحَيْنَا إِلَى رَجُلٍ مِّنْهُمْ ' (الیونس ۱۰:۲۱) 'کیا لوگوں کو تعجب ہے کہ انھی میں سے ایک آدمی (شخص) پر ہم نے وحی بھیجی'۔ ہر زمان و مکان کے منکرین نبوت اس شبہ میں مبتلا تھے بھی تو وہ بشریت کو اس انکار کی علت سمجھتے تھے جیسا کہ آپ سورۃ ھود، ابراھیم، استراء مومنیں، یٰسین، قمر اور تغابن میں دیکھیں گے جیسا کہ نوح علیہ السلام کی قوم رؤساء نے کہا: ' مَا هَٰذَا إِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُرِيدُ أَن يَتَفَضَّلَ عَلَيْكُمْ ' (المومنون ۲۳:۲۴) 'یہ آدمی تو صرف تمھاری طرح کا ایک آدمی ہے وہ چاہتا ہے کہ تم سے برتر ہو کر رہے' یعنی 'اسے جاہ و ریاست مقصود ہے'۔ اس طرح عاد و ثمود کے رؤساء نے اپنے پیغمبروں کے بارے میں کہا: ' مَا هَٰذَا إِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يَأْكُلُ مِمَّا تَأْكُلُونَ مِنْهُ وَيَشْرَبُ مِمَّا تَشْرَبُونَ ۝ وَلَئِنْ أَطَعْتُم بَشَراً مِّثْلَكُمْ إِنَّكُمْ إِذاً لَّخَاسِرُونَ ' (المومنون ۲۳:۳۳،۳۴) 'یہ تو صرف تمھاری طرح کا آدمی ہے یہ وہی کھاتا ہے جو تم کھاتے ہو اور وہی پیتا ہے جو تم پیتے ہو'۔ حضرت شعیب علیہ السلام کی قوم کے لوگوں نے بھی یہی کہا: ' وَمَا أَنتَ إِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا وَإِن نَّظُنُّكَ لَمِنَ الْكَاذِبِينَ ' (الشعراء ۲۶:۱۸۶) 'تم تو محض ہماری طرح کے آدمی ہو اور ہم تمھیں جھوٹے لوگوں میں شمار کرتے ہیں'۔ فرعون کے درباریوں نے بھی حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کے بھائی ہارون علیہ السلام کے بارے

Marfat.com

میں یہی کہا: 'فَقَالُوٓا اَنُؤْمِنُ لِبَشَرَیْنِ مِثْلِنَا وَقَوْمُهُمَا لَنَا عٰبِدُوْنَ ' (المؤمنون ۲۳: ۴۷) 'انھوں نے کہا! کیا ہم ایسے دو شخصوں پر ایمان لائیں جو ہماری طرح کے آدمی ہیں حالانکہ ان کی قوم کے لوگ ہمارے زیرِ حکم ہیں' ۔ غرضیکہ حضرت نوح ؑ، حضرت ہود ؑ، حضرت صالح ؑ، حضرت شعیب ؑ، موسیٰ ؑ اور عیسیٰ ؑ کے علاوہ بھی جتنے پیغمبر آئے ان کی قوم نے یہی کہا: 'قَالُوٓا اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا تُرِیْدُوْنَ اَنْ تَصُدُّوْنَا عَمَّا كَانَ یَعْبُدُ اٰبَآؤُنَا فَاْتُوْنَا بِسُلْطٰنٍ مُّبِیْنٍ ' (ابراھیم ۱۴: ۱۰) 'انھوں نے کہا! تم محض ایک آدمی ہو جیسے ہم ہیں تم چاہتے ہو کہ ہمارے آباؤ اجداد جس چیز کی عبادت کرتے تھے اس سے ہم کو روک دو ہمارے سامنے کوئی کھلی سند لاؤ' ۔

اگلے پچھلے لوگ سب اسی شبہ میں مبتلا تھے ۔ مذکورہ بالا آیات پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بشریت کو انکار کی علت سمجھنے کے ساتھ ساتھ فخر و تعلّی کا اظہار کرتے تھے ۔ رسول بشر ہے اور اپنے جیسے بشر کی اطاعت ان کو ناگوار گزرتی تھی ۔ حضرت نوح ؑ پر تو انھوں نے واضح الزام لگایا تھا کہ تمھیں ماننے والے تو رذیل لوگ ہیں اور تم ہم پر برتری کا دعویٰ کرتے ہو اور عاد و ثمود نے اپنے پیغمبروں کے بارے میں کہا کہ اگر تم اپنے جیسے انسان کی اطاعت کرو گے تو تم یقیناً نقصان اُٹھاؤ گے ۔ قومِ ثمود نے تو واضح طور پر کہا! کیا ہم اپنے میں سے ایک انسان کی پیروی کریں تو اس صورت میں ہم گمراہی اور جنون میں بڑھ جائیں گے؟ کیا ہم سب میں سے اس پر وحی اُتری ہے؟ بلکہ وہ جھوٹا خود پسند ہے ۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ منکرین کو قوت پر مبنی مقاصد یہ رویہ اختیار کرنے پر مجبور کر رہے تھے ۔ ان کے اندر حسد، تکبر اور کمزوروں سے نفرت کے جذبات موجزن تھے ۔ پھر منکرین عقل سے سوچنے کی بجائے اپنے رسم و رواج کی طرف رجوع کرتے تھے وہ سمجھتے تھے کہ رسول اصلاح کے جذبے سے ان کو دعوت نہیں دے رہے بلکہ ان کا مقصد ہے کہ وہ ان کو آباؤ اجداد کے طریقے سے ہٹا دیں: 'مَّا سَمِعْنَا بِهٰذَا فِیْٓ اٰبَآئِنَا الْاَوَّلِیْنَ ' (المؤمنون ۲۳: ۲۴) 'ہم نے یہ بات اپنے پہلے باپ دادوں سے نہیں سنی' ۔

مشرکین مکہ نے ان دونوں اعتراضات کو یکجا کر دیا اور تجویز پیش کی کہ ان پر فرشتے نازل ہوں اور نبی پر بھی فرشتہ نازل ہو جسے وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گویا وہ یہ سمجھتے تھے کہ رسول بھی بشر ہے اور ہم بھی بشر ۔ جس طرح اس میں فرشتوں کے دیکھنے اور ان سے علم حاصل کرنے کی صلاحیت ہے بالکل اسی طرح ہم میں بھی یہ صلاحیت موجود ہے ۔ فخر و تعلّی کی وجہ سے وہ ہر اس چیز سے انکار کرتے تھے جو ان کی پہنچ سے باہر ہو ۔ وہ اس بات کی دلیل طلب کرتے تھے کہ رسول ﷺ واقعی اللہ کے فرستادہ ہیں اور یہ کتاب واقعی اللہ کی طرف سے نازل ہوئی ہے ۔ ان کی تجویز یہ تھی کہ اللہ ان پر فرشتہ نازل کرے جو اس کے دعویٰ کی

Marfat.com

تصدیق کرے اور دعوت کے کام میں ان کا ہاتھ بٹائے۔ سورۃ فرقان میں ہے: "لَوْلَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مَلَكٌ فَيَكُوْنَ مَعَهٗ نَذِيْرًا" (۲۵:۷) 'اس کے پاس کوئی فرشتہ کیوں نہیں بھیجا گیا جو اس کے ساتھ رہ کر ڈراتا'۔
نبی کریم ﷺ پر ان کا ایک اور اعتراض یہ تھا کہ اگر بشر ہی کو رسول بنا کر بھیجنا تھا تو پھر محمدؐ ہی کیوں؟ دو بستیوں کے سردار کو کیوں نہیں بھیجا گیا جس کی قدر و منزلت مال و جاہ کی وجہ سے زیادہ ہو: "وَقَالُوْا لَوْلَا نُزِّلَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ عَلٰى رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيْمٍ" (الزخرف ۴۳:۳۱) یعنی 'اور کہنے لگے کیوں نہ یہ قرآن دو بستیوں (مکہ اور طائف) کے کسی بڑے آدمی پر نہ اُتارا گیا۔ یعنی رسول کے لیے مال و جاہ والا آدمی ہونا ضروری ہے اور چونکہ رسول ﷺ مال اور ریاست نہیں رکھتے اس لیے پیغمبر نہیں ہو سکتے۔

اعتراضات کا جواب

یہ اعتراضات کسی دلیل کی بناء پر نہ تھے بلکہ منکرین کی ہٹ دھرمی اور عناد کا نتیجہ تھے۔ اللہ تعالیٰ نے سب اعتراضات کا ایک ایک کر کے مدلل طریقے سے جواب یوں دیا ہے:

حکمت الٰہی کا تقاضا تھا کہ رسول بشر ہوں جو وحی قبول کر کے اس کے ذریعہ سے لوگوں کو دعوت دیں ور جو بشر کی مانند زندگی بسر کریں اور ان کی عملی طرز حیات ان کی دعوت کا جیتا جاگتا ثبوت ہوتا کہ لوگ اس پر عمل پیرا ہو سکیں۔ اگر رسول بشر نہ ہوتے، نہ کھانا کھاتے، نہ بازاروں میں گھومتے نہ وہ انسانی جذبات و احساسات کے مراحل سے گزرتے، تو ان کے انسانوں کے ساتھ تعلقات استوار نہ ہو پاتے اور نہ بشر اُن کے نقش قدم پر چل سکتے۔ وہ داعی جس کا فعل اس کے قول کی تائید نہیں کرتا اس کی بات کانوں سے نکل کر دل میں نہیں اُترتی۔ ابتدائے آفرینش سے یہی سنت الٰہی ہے۔ اسی سنت کا تقاضا ہے کہ وہ انسانوں کو رسول بنائے، ہم جنس اپنے ہم جنس کی طرف مائل ہوتے ہیں اور اس سے مانوس ہوتے ہیں۔ انسان میں وہ مجہول صلاحیتیں ہیں جسے وہی خدا جانتا ہے جس نے انسان میں اپنی روح پھونکی ہے۔ یہ صلاحیتیں لوگوں کی نظر سے اوجھل ہیں لیکن اللہ کی نظر سے اوجھل نہیں۔ وہ اس کی صلاحیت کو خوب جانتا ہے اور اس بات پر قادر ہے کہ وہ اس ارضی مخلوق کو ملأ اعلیٰ کے ساتھ اتصال کے قابل بنائے: "اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ" (الانعام ۶:۱۲۴) 'اللہ ہی اس بات کی تہہ جاننے والا ہے کہ کہاں اپنی رسالت کو رکھے'۔ انسان میں نیکی اور بدی کے میلانات ہوتے ہیں وہ عقل کے ذریعہ ان میں تمیز کر سکتا ہے لیکن اس عقل کو ایک ایسی میزان کی ضرورت ہے جس کی طرف وہ اسی وقت رجوع کرے جب شک وشبہ کا گھیرا تنگ ہو جائے اور معاملہ الجھ جائے۔ جب شہوات و جذبات اسے اپنی طرف کھینچنے لگیں اور جب بیرونی عوامل اس کے جسم اور اعصاب پر اثر انداز ہو جائیں۔ یہ میزان اللہ کی ہدایت اور شریعت ہے جو وحی

Marfat.com

کے ذریعہ اس تک پہنچی ہے۔ جو لوگ یہ کہتے تھے کہ رسول فرشتوں میں سے ہونا چاہیے وہ اس مخلوق کے مزاج کو نہیں سمجھتے تھے۔ وہ اس مخلوق کے بارے میں اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مار رہے تھے۔ نہ وہ رب کے ساتھ ان کے تعلق کو سمجھتے تھے اور نہ زمین والوں کے ساتھ۔ وہ نہ تو جسم کے تقاضوں کو محسوس کر سکتے تھے اور نہ انسانی جذبات واحساسات کو سمجھ سکتے تھے جبکہ رسول کے لیے لازمی ہے کہ وہ ان احساسات کو سمجھے اور ان کو عملی جامہ پہنا کر لوگوں کے لیے دستور حیات تشکیل دے۔ اگر لوگوں کو پتہ چل جائے کہ رسول فرشتہ ہے تو ان کے اندر پیروی کی رغبت پیدا نہیں ہوگی کیونکہ وہ دوسری جنس سے تعلق رکھتا ہوگا۔ روزمرہ کی زندگی میں ان کے دل میں اس کی تقلید کی کوئی خواہش نہ ہوگی جبکہ رسول بشر کی زندگی دوسرے لوگوں کی زندگی کے لیے ایک زبردست محرک ثابت ہوتی ہے۔

چنانچہ اللہ نے اس اعتراض کا جواب دیتے ہوئے فرمایا: 'قُلْ لَّوْ كَانَ فِي الْأَرْضِ مَلَآئِكَةٌ يَّمْشُونَ مُطْمَئِنِّيْنَ لَنَزَّلْنَا عَلَيْهِم مِّنَ السَّمَاءِ مَلَكًا رَّسُوْلًا' (بنی اسرائیل ۱۷:95) 'کہہ دیجیے اگر زمین پر فرشتے اطمینان سے چلتے پھرتے تو ضرور ہم ان پر آسمان سے فرشتہ رسول بنا کر بھیجتے'۔ پھر ارشاد باری تعالیٰ ہے: 'وَلَوْ نَشَاءُ لَجَعَلْنَا مِنْكُم مَّلَآئِكَةً فِي الْأَرْضِ يَخْلُفُوْنَ' (الزخرف ۴۳:۶۰) 'اور اگر ہم چاہتے تو ہم تم میں سے فرشتے پیدا کر دیتے جو (زمین میں) تمہارے قائم مقام ہوتے'۔ یہی وہ حکمت تھی جس کے مطابق انسانوں کی طرف ایک انسان کو رسول بنا کر بھیجا جاتا رہا، سنت الٰہی یہی ہے اور ہمیشہ سے ایسا ہوتا چلا آیا ہے اس حقیقت کو قرآن نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے: 'وَمَا أَرْسَلْنَا قَبْلَكَ إِلَّا رِجَالًا نُّوْحِيْ إِلَيْهِمْ فَاسْأَلُوْا أَهْلَ الذِّكْرِ إِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ٥ وَمَا جَعَلْنَاهُمْ جَسَدًا لَّا يَأْكُلُوْنَ الطَّعَامَ وَمَا كَانُوْا خَالِدِيْنَ' (الأنبياء ۲۱:۷تا۸) 'اور ہم نے آپ سے پہلے صرف آدمیوں کو پیغمبر بنایا ہے جن کے پاس ہم وحی بھیجا کرتے تھے پس اگر تم کو یہ بات معلوم نہ ہو تو اہل علم (اہل کتاب) سے دریافت کر لو اور ہم نے ان رسولوں کو بھی ایسے جسم کا نہیں بنایا کہ کھانا نہ کھاتے ہوں اور نہ ہی وہ ہمیشہ زندہ رہنے والے تھے'۔ اگر وہ اپنے قدموں سے پرے دیکھتے اور اپنے ماحول پر توجہ دیتے تو وہ دیکھ لیتے کہ اللہ کے سب رسول بشر تھے اور انہی کی قوم سے تعلق رکھتے تھے اور انہی کی زبان میں بات کرتے تھے (ابراهیم ۱۴:۴) قدرت کو یہی منظور تھا کہ یہ سنت الٰہی کسی تغیر وتبدل کے بغیر یونہی چلتی رہے تاکہ کون ومکان میں اس کی حکمت کے تقاضے پورے ہوں لیکن منکرین نبوت کو اس بات کا ادراک ہی نہیں تھا۔

اگر بفرض محال اللہ انسانوں کی طرف فرشتے کو رسول بنا کر بھیجتا تو حکمت کا تقاضا تھا کہ اسے بشر کی

Marfat.com

صورت میں بھیجے تاکہ لوگ اس سے مانوس ہوں اور اس کے وجود پر مطمئن ہوں۔ اگر ایسا ہو جاتا تو انسان تو ان کی نظر میں انسان ہوتا خواہ وہ انسانی شکل میں فرشتہ ہی کیوں نہ ہو یا اصل انسان ہو۔ چنانچہ ان کا شبہ تو باقی رہتا اور ان کی مشکل حل نہ ہوتی اور اعتراض ویسے کا ویسا ہی رہتا چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: "وَلَوْ جَعَلْنَاهُ مَلَكًا لَّجَعَلْنَاهُ رَجُلًا وَلَلَبَسْنَا عَلَيْهِم مَّا يَلْبِسُونَ" (الانعام ۶:۹) "اور اگر ہم اسے (رسول کو) فرشتہ بناتے تو اسے بھی ہم ضرور انسان بناتے اور جیسے کچھ شبہات میں وہ اب پڑے ہوئے ہیں ویسے ہی شبہات میں ہم انھیں ڈال دیتے" یعنی اگر فرشتہ بھی انسانوں کی طرف رسول بن کر آتا تو انسان کی صورت میں آتا کیونکہ رسول کا بڑا کام یہ ہے کہ نمونہ بن کر دکھائے۔ انسان کے لیے تو انسان ہی نمونہ بن سکتا ہے اس کے علاوہ قانونِ الٰہی کے خلاف ہے کہ فرشتے جیسی غیر مرئی مخلوق اپنی اصل حالت میں انسان کے سامنے آئے جب تک وہ تجسیم اختیار نہ کرلے اور اگر فرشتہ مجسم ہو کر آتا تو پھر اعتراض ویسے کا ویسا رہتا یعنی وہ کہہ دیتے یہ تو دیکھنے میں ہماری ہی طرح کا انسان ہے۔

اس اعتراض کا جواب کہ فرشتوں کو ہم پر نازل کیوں نہیں کیا یا وہ رسول کے ساتھ ہوتے اور ہمیں نظر آتے؟ اللہ نے یہ دیا ہے کہ یہ لوگ اس سنت الٰہی سے ناواقف ہیں کہ وہ فرشتے اس وقت نازل کرتا ہے جب معجزہ دیکھنے کے بعد کوئی قوم اپنے رسول کو جھٹلاتی ہے تو وہ ان کو تباہ و برباد کرنے کے لیے فرشتے بھیجتا ہے اگر مشرکین کی فرمائش پر وہ فرشتہ بھیج دے تو ان کا کام تمام ہو جائے۔ یہ تو اللہ کی رحمت اور بردباری ہے کہ وہ ان کے مطالبے پر اپنی سنت پوری نہیں کر رہا۔ وہ حسی معجزات جو رسول اپنی قوموں کے سامنے پیش کرتے تھے ان میں ضمنی طور پر یہ وارننگ ہوتی تھی کہ معجزے کے آنے کے بعد جھٹلانے کی صورت میں انہیں تباہ و برباد کر دیا جائے گا۔ صالحؑ کی اونٹنی قوم ثمود کی ہلاکت کا باعث بنی اور عصائے موسیٰ علیہ السلام کے منکر پانی میں ڈوب مرے۔ فرشتوں کے آنے کے بعد آزمائش کی کوئی گنجائش نہیں رہتی اور ان کو مزید مہلت نہیں ملتی کہ وہ اپنی روش کو بدل کرتا ہی سے بچ جائیں۔ بدکار اور شرارتی لوگوں کے لیے فرشتے کا ظہور عذاب کا سبب بنتا ہے جیسا کہ قوم لوط اور اہل مائدہ کے ساتھ ہوا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "وَقَالُوا لَوْلَا أُنزِلَ عَلَيْهِ مَلَكٌ وَلَوْ أَنزَلْنَا مَلَكًا لَّقُضِيَ الْأَمْرُ ثُمَّ لَا يُنظَرُونَ" (الانعام ۶:۸) "وہ کہتے ہیں کہ اس (رسول) کے پاس کوئی فرشتہ کیوں نہیں بھیجا گیا اور اگر ہم کوئی فرشتہ بھیج دیتے تو سارا قصہ ہی ختم ہو جاتا پھر ان کو مہلت نہ دی جاتی"۔ فرشتے حیات بشر کے بارے میں یہ فریضے سرانجام دیتے ہیں:

۱۔ وحی کو پہنچانا۔

Marfat.com

۲۔ قتال میں مومنوں کی دلجمعی کرنا۔
۳۔ نبی اور رسول کے جھٹلانے والوں کو تباہ و برباد کرنا۔

مشرکین مکہ سیر و سیاحت کے دوران عاد و ثمود کی بستیوں سے گزرتے تھے۔ ان کو اہل کتاب کے ذریعے پتہ چل چکا تھا کہ جو پیغمبران بستیوں میں بھیجے گئے وہ بشر ہی تھے۔ اس لیے انھوں نے نبی کریم ﷺ کی نبوت پر ایک اعتراض جڑ دیا چلو مان لیا کہ رسول بشر ہوتا ہے لیکن کیا یہ ضروری ہے کہ ہم سب کو چھوڑ کر نبوت انھیں ملے۔ اگر نبی کا انتخاب کرنا تھا تو ایسے لوگوں میں سے کیا جاتا جن کو سیادت حاصل ہے جبکہ محمد ﷺ کے پاس نہ مال ہے نہ جاہ۔

اس اعتراض کا جواب اللہ نے یہ دیا ہے: 'أَهُمْ يَقْسِمُونَ رَحْمَةَ رَبِّكَ' (الزخرف ۴۳:۳۲) 'کیا وہ تیرے رب کی رحمت کو تقسیم کرتے ہیں'۔

یہ لوگ چاہتے ہیں کہ نبوت جیسی چیز جو صرف اللہ کی رحمت ہے ان کی مرضی سے بانٹی جائے۔ باطنی تقسیم تو ایک طرف ظاہری نعمتوں کی تقسیم بھی اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے۔ جس طرح سامان روزی کے لحاظ سے ایک کو دوسرے پر فضیلت ہے یہی حالت روحانی اختلاف کی ہے کہ کون دوسروں پر فضیلت رکھتا ہے؟ اور کس کی روحانی استعداد دوسروں کو نیکی کی راہ پر لاسکتی ہے؟ یہ علم اللہ تعالیٰ کو ہے۔ نبوت جیسی بڑی نعمت جو دنیوی مال و متاع سے کہیں زیادہ بلند ہے لوگوں کی مرضی کے مطابق کیسے مل سکتی ہے؟ رسالت عطائی ہے اور احسانات میں ترجیحی سلوک اللہ کی مشیت پر موقوف ہے۔ اللہ جس پر چاہتا ہے احسان کرتا ہے اور اُسے ان کمالات اور استعدادات سے نوازتا ہے جن پر برگزیدگی کا دارومدار ہے۔ جس کے اندر جسمانی اور روحانی کمالات نہ ہوں نبوت کا حصول اس کے لیے عقلاً بھی ممنوع ہے۔ اللہ تعالیٰ ان خاص بندوں کو رسول بنا کر بھیجتا ہے جن کو وہ نفوس قدسیہ عطا کرتا ہے اور قدسی قوتوں سے ان کی تائید کرتا ہے ان کو دو رُخ عطا کیے جاتے ہیں ملکوتی اور بشری، تاکہ وہ فرشتوں سے پیغام وصول کر کے بشر تک پہنچائیں۔ مشرکین مکہ یہ سمجھتے تھے کہ عظیم وہ ہوتا ہے جس کے پاس مال و جاہ ہو، ان کو اتنی سی بات بھی سمجھ نہ آئی کہ عظیم وہ ہوتا ہے جو اللہ کے نزدیک عظیم ہو۔

انسان اپنی بے عملی کے جواز کے لیے بہانے تراش لیتا ہے۔ مشرکین مکہ رسول اللہ ﷺ کے صدق و امانت کو مانتے تھے۔ وہ اپنے جھگڑے فیصلے کے لیے ان کے پاس لاتے تھے اور بڑے بڑے واقعات کی ان کو خبر دیتے تھے۔ اپنے لغوی، فنی اور ادبی ذوق کی وجہ سے جانتے تھے کہ قرآن حکیم کلام بشر نہیں۔ پھر بھی وہ کہتے تھے کہ اللہ تعالیٰ کو ابو طالب کے یتیم کے سوا کوئی رسول نہیں ملا۔ اس قسم کے اعتراضات ان

Marfat.com

کی ہٹ دھرمی اور تکوینی حقائق سے جہالت پر دلالت کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: 'قَالَتْ لَهُمْ رُسُلُهُمْ إِن نَّحْنُ إِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ يَمُنُّ عَلَىٰ مَن يَشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ' (ابراھیم ۱۴:۱۱) 'ان کے رسولوں نے ان سے کہا ہم بھی تمھارے جیسے آدمی ہیں لیکن اللہ اپنے بندوں میں سے جس پر چاہے احسان فرمادے'۔ انھوں نے یہ نہیں کہا کہ صرف ان پر احسان کیا ہے بلکہ یہ کہا ہے کہ بندوں میں سے جس پر چاہے احسان فرمادے کیونکہ اس بات کا تعلق مشیتِ الٰہی سے ہے۔

منکرین نبوت کو دیکھنا یہ چاہیے تھا کہ رسول ان کو کس چیز کی طرف بُلا رہے ہیں۔ وہ ان کو شرک کی اس بیماری سے ڈراتے تھے جو ان کے دماغ میں رچ بس گئی تھی اور اس بیماری سے نجات کی صورت میں انھیں اللہ کی رضا کی خوشخبری سناتے۔ انھیں دعوت دینے والے سے کیا لینا دینا تھا خواہ وہ بشر ہو یا غیر بشر؟ اس سے انھیں کیا فرق پڑتا تھا؟ اگر سمجھ دار ہوتے تو صرف دعوت کی طرف دھیان دیتے۔ بجائے اس کے کہ وہ اس بات پر فخر کرتے کہ اللہ نے اپنے پیغام کو پہنچانے کے لیے انھیں میں سے جس فرد کو چنا، وہ اُس پر اعتراض کرتے ہیں۔ یہ احسان صرف پیغمبروں کی ذات پر نہیں بلکہ پوری نوع انسانی پر ہے کہ اس کے افراد کو اس عظیم مشن کے لیے منتخب کیا اور ان کا رشتہ ملأ اعلیٰ سے جوڑا، ہم اس شرف و عظمت کو کیسے نظر انداز کر سکتے ہیں۔ اس نکتہ کو اقبال نے خوب بیان کیا ہے۔

سبق ملا ہے یہ معراج مصطفیٰ سے مجھے
کہ عالم بشریت کی زد میں ہے گردوں

اس اعزاز پر نکتہ چینی کرنا انسان کی بہت بڑی بدنصیبی ہے۔

رسول بشر یا رجل (انسان)

نبوت اور رسالت کے لیے بشر کی بجائے فرشتوں کو کیوں نہیں بھیجا گیا؟ یہ قرآن حکیم کا ایک اہم موضوع ہے۔ مذکورہ تمام آیت مبارکہ میں بشر اور ملائکہ کو مقابل الفاظ کے طور پر استعمال کیا گیا ہے لیکن بعض آیات مبارکہ ایسی ہیں جہاں بشر کی بجائے رجل کا لفظ استعمال کر کے معنی بشر ہی کے لیے گئے ہیں۔ ان آیات کو بیان کرنے سے پہلے لغوی طور پر دیکھنا ہوگا کہ آیا اس لفظ میں بشر کے معنی کی گنجائش ہے یا قرآن حکیم نے اس موضوع سے ہٹ کر اس لفظ کو بشر کے معنوں میں بھی استعمال کیا ہے یا نہیں؟

رجل

رجل کے معنی عام طور پر جیسا کہ امام راغب نے المفردات میں کہا ہے، مرد کے ہیں مگر احمد بن فارس بن زکریا (متوفی ۳۹۵ھ) مقاییس اللغہ میں لکھتے ہیں کہ بنیادی طور پر الراء، جیم اور لام کا مادہ

Marfat.com

اس عضو پر دلالت کرتا ہے جسے پاؤں کہتے ہیں۔ یہ انسان کا پاؤں بھی ہو سکتا ہے اور کسی اور کا بھی ان کو رَجل اس لیے کہا جاتا ہے کیونکہ وہ پاؤں پر چلتے ہیں۔ (بنیادی معنوں سے ہٹ کر عورت کے مقابلہ میں مرد کو رجل کہا جاتا ہے)۔ لسان العرب میں بھی اس معنی کی تائید کی گئی ہے۔ اس میں ابن السعرابی کی روایت سے بیان ہوا ہے کہ ابن زیاد کلابی اپنی بیوی کے ساتھ گفتگو کے بارے میں کہتا ہے: 'فتھایج الرجلان' یعنی دونوں شخص (وہ اور اس کی بیوی) جوش میں آ گئے۔ عمدۃ الالفاظ میں احمد بن یوسف الحلبی (متوفی ۷۵۶ھ) نے غریب ابن الجوزی (۳۸۴ھ) کے حوالہ سے ثوری کا قول نقل کیا ہے: 'یکرہ للرجل ان یجمع بین امرأتین اذا کانت احداھما رجُلا لم تحل له الأخری' یعنی مرد کے لیے مکروہ ہے کہ وہ ایسی دو عورتوں کو ایک ساتھ اپنے عقد میں جمع کرے جن میں سے اگر ایک رجل ہو تو دوسری کے ساتھ اس کا نکاح جائز نہ ہو۔ Lane کی Lexicon میں ہے کہ رجلان سے مراد کبھی کبھی مرد اور اس کی بیوی ہوتی ہے۔ اب دیکھنا ہے کہ قرآن حکیم نے بھی رجل کا لفظ انسان، آدمی اور شخص کے معنوں میں استعمال کیا ہے یا نہیں؟

ارشاد ربانی ہے: 'وَعَلَى الْأَعْرَافِ رِجَالٌ يَعْرِفُونَ كُلًّا بِسِيمَاهُمْ' (الأعراف ۷:۴۶) اور آیت نمبر ۴۸ میں ہے: 'وَنَادَىٰ أَصْحَابُ الْأَعْرَافِ رِجَالًا يَعْرِفُونَهُمْ بِسِيمَاهُمْ' اس کا ترجمہ مولانا تھانویؒ نے یوں کیا ہے: 'الْأَعْرَافِ کے اوپر بہت سے آدمی ہوں گے وہ لوگ ہر ایک کو ان کے قیافہ سے پہنچانیں گے'۔ مولانا آزاد اور امین احسن اصلاحی نے رجال کا ترجمہ کچھ لوگ کیا ہے جس میں مرد اور عورتیں سب شامل ہیں۔ صاحب کشاف نے اس کی تفسیر یہ کی ہے کہ بنو آدم کے کچھ لوگ جن کی نیکیاں اور بدیاں برابر ہیں۔

اسی طرح اللہ کا ارشاد ہے: 'فِيهِ رِجَالٌ يُحِبُّونَ أَنْ يَتَطَهَّرُوا' (التوبۃ ۹:۱۰۸)۔ مولانا تھانوی نے اس کا ترجمہ کیا ہے: 'اس میں ایسے آدمی ہیں کہ وہ خوب پاک ہونے کو پسند کرتے ہیں'۔ مولانا آزاد اور امین احسن اصلاحی نے اس کا ترجمہ کچھ لوگ کیا ہے۔ امام طبری نے اس کی تفسیر میں لکھا ہے کہ یہاں خطاب انصار سے اور اہل قبا سے ہے۔ اس سے پہلے اصحاب مسجد ضرار کا بیان ہے اور یہاں اصحاب مسجد قبا کا بیان ہے جس میں مرد اور عورتیں سب شامل ہیں۔ ابن ماجہ نے ابو ایوب انصاریؓ، جابرؓ اور انسؓ سے روایت کی ہے جب اس آیت کا نزول ہوا تو اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا: اے انصار! اللہ نے تمہاری پاکیزگی کی تعریف کی ہے۔ تفسیر المنار میں ہے کہ اہل مسجد قباء کا موازنہ اہل مسجد ضرار سے کیا گیا ہے۔ 'يُحِبُّونَ أَنْ يَتَطَهَّرُوا' میں مرد اور عورت دونوں شامل ہیں۔ ارشاد ربانی ہے: 'رِجَالٌ

Marfat.com

لَا تُلْهِيهِمْ تِجَارَةٌ وَلَا بَيْعٌ عَن ذِكْرِ اللَّهِ ' (النور ۲۴:۳۷)۔ مولانا تھانوی نے ترجمہ کیا ہے کہ ان مسجدوں میں ایسے لوگ ہیں جن کو اللہ کی یاد سے تجارت اور خرید و فروخت، غفلت میں نہیں ڈالتی۔ تفسیر مراغی میں ہے کہ اس جیسا اللہ کا یہ قول ہے: 'يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تُلْهِكُمْ أَمْوَالُكُمْ وَلَا أَوْلَادُكُمْ عَن ذِكْرِ اللَّهِ ' (المنافقون ۶۳:۹) یعنی 'اے ایمان والو! تم کو تمھارا مال اور اولاد اللہ کی یاد سے غافل نہ کرنے پائیں'۔ اس کا مطلب ہے کہ رجال میں مرد اور عورتیں سب شامل ہیں کیونکہ اقامت نماز اور ادائیگی زکوۃ میں بھی سب شامل ہیں۔ بعض مفسرین نے یہاں رجال کو مردوں کے ساتھ مخصوص کرنے کی اس وجہ سے کوشش کی ہے کہ عورتیں نہ تو اہل تجارت ہیں اور نہ اہل جماعت، تجارت اور مساجد کو مردوں کے ساتھ مخصوص کرنے کا نقطہ نظر درست نہیں کیونکہ عورتیں تجارت بھی کرتی رہی ہیں جیسا کہ سیدہ خدیجہ اور ابن حزم کے قول کے مطابق عہد رسالت اور عہد خلافت راشدہ میں مسجدوں میں با جماعت نماز بھی پڑھتی رہی ہیں۔ باجماعت نماز پڑھنے کی واضح ترین دلیل چاروں مکاتب فکر کے حامل فقہ کی کتابوں میں صف بندی کی ترتیب میں عورتوں کی صف کا لازمی ذکر ہوتا ہے۔

عبدالکریم الخطیب التفسیر القرآنی للقرآن میں کہتے ہیں: 'یہ ان مساجد اور اللہ کے ان بندوں کا وضاحتی بیان ہے جو ان مساجد میں آتے جاتے ہیں ان کو یہاں آنے سے نہ تجارت روکتی ہے نہ خرید و فروخت۔ مولانا امین احسن اصلاحی نے بھی رجال کا ترجمہ لوگ کیا ہے نہ کہ مرد۔

ایک اور مقام پر اللہ تعالیٰ کا ارشاد یوں ہے: 'وَأَنَّهُ كَانَ رِجَالٌ مِّنَ الْإِنسِ يَعُوذُونَ بِرِجَالٍ مِّنَ الْجِنِّ ' (جن ۷۲:۶)۔ مولانا تھانوی نے اس کا ترجمہ یوں کیا ہے: 'اور بہت سے لوگ آدمیوں میں ایسے تھے کہ وہ جنات میں سے بعض لوگوں کی پناہ لیا کرتے تھے'۔ مولانا آزاد نے بھی اس کا ترجمہ انسانوں میں سے کچھ لوگ کیا ہے اور مولانا اصلاحی نے بھی یہی ترجمہ کیا۔ سید قطب نے فی ظلال القرآن میں اس کی تعبیر یوں کی ہے۔ 'شیطان بنی آدم کے دلوں پر مسلط ہے۔ انسانی دل جب غیر اللہ کی پناہ لیتا ہے تو پریشان ہوتا ہے'۔ عبدالکریم الخطیب کہتے ہیں: 'اس مدد کا بیان ہے جو انسانی شیطان جناتی شیطانوں سے مانگتے ہیں۔ تفسیر صابونی میں ہے: 'رجال سے مراد انسانی مخلوق اور جناتی مخلوق ہے'۔ Lane اپنی Lexicon میں اس آیت کا حوالہ دینے کے بعد کہتا ہے کہ یہاں رجال، اناس اور ناس (لوگ) کے معنوں میں ہے۔

معروف معنوں میں رجل نوع انسان میں مرد (بمقابلہ عورت) کو کہا جاتا ہے مگر مندرجہ بالا پانچویں آیات قرآنیہ میں اس کی جمع رجال انسانوں، آدمیوں اور لوگوں کے معنوں میں استعمال ہوئی

Marfat.com

ہے اس لحاظ سے اس میں مرد اور عورت دونوں شامل ہیں۔

رجل بمعنی بشر

جن آیات مبارکہ میں فرشتے کے مقابلہ میں بشر کی جگہ رجل کا استعمال ہوا ہے وہاں رجل کے معنی مرد کی بجائے بشر ہی مراد لیے جائیں گے کیونکہ اعتراض کرنے والوں کا اعتراض یہ نہیں تھا کہ مرد کو نبی بنا کر کیوں بھیجا عورت کو کیوں نہیں بھیجا؟ بلکہ اعتراض یہ تھا کہ بشر کو یہ اعزاز کیوں دیا فرشتوں کو کیوں نہیں دیا۔

۱۔ ارشاد ربانی ہے: 'وَلَوْ جَعَلْنَاهُ مَلَكًا لَّجَعَلْنَاهُ رَجُلًا وَّلَلَبَسْنَا عَلَيْهِم مَّا يَلْبِسُونَ' (الانعام ۹:۶)۔ مولانا تھانویؒ نے اس کا ترجمہ یوں کیا ہے: 'اور اگر ہم اس کو فرشتہ تجویز کرتے تو ہم اس کو آدمی ہی بناتے اور ہمارے اس فعل سے پھر ان کو وہی اشکال ہوتا جواب ہو رہا ہے۔ مولانا آزادؒ نے یہاں رجل کا ترجمہ انسان کیا ہے۔ مولانا امین احسن اصلاحیؒ فرماتے ہیں کہ یہ آیت اس مطالبہ کا جواب ہے جو یوں ہے: 'أَبَعَثَ اللَّهُ بَشَرًا رَّسُولًا' (بنی اسرائیل ۹۴:۱۷) 'کیا اللہ تعالیٰ نے بشر کو رسول بنا کر بھیجا ہے؟ یا یوں ہے: 'فَقَالُوا أَبَشَرٌ يَهْدُونَنَا' (التغابن ۶:۶۴) 'تو ان لوگوں نے کہا! کیا انسان ہم کو ہدایت کریں گے'۔ اس آیت مبارکہ میں جواب یہ دیا گیا ہے کہ اگر فرشتے کو رسول بناتے تو اسے بشر کی شکل میں بھیجتے تاکہ وہ اسے دیکھ سکتے اور اللہ کے پیغام کو سن سکتے۔ پھر جب وہ فرشتہ بشر کی شکل میں کہتا کہ میں فرشتہ ہوں تو وہ اس کی بات نہ مانتے کیونکہ وہ ان کی نظر میں آدمی ہوتا اس طرح ان کا شبہ قائم رہتا۔ یہ آیت بشری مزاج (نہ کہ مردانہ مزاج) اور ملکوتی مزاج کے اختلاف کی طرف اشارہ کرتی ہے۔

جن لوگوں نے طے کر رکھا ہے کہ کسی نہ کسی طرح عورتوں کو مردوں کے مقابلے میں کمتر ثابت کرنا ہے انھوں نے رَجُل کے لفظ سے دھوکا کھا کر یہاں عورت کی نبوت کا مسئلہ خواہ مخواہ چھیڑ دیا ہے حالانکہ یہاں اس مسئلہ کا کوئی موقع و محل نہیں بلکہ پورے قرآن میں یہ مسئلہ زیر بحث نہیں۔ صاحب روح المعانی نے اس آیت کی تفسیر کے تحت یہ جملہ لکھا ہے: 'عورت رسول نہیں ہو سکتی'۔ یہ بات متفق علیہ ہے البتہ اختلاف اس بات میں ہے کہ وہ نبی ہو سکتی ہے یا نہیں۔ اس مسئلہ پر تو ہم لفظ بشر کی بحث کے آخر میں تفصیلی بحث کریں گے۔

۲۔ ارشاد ربانی ہے: 'أَوَعَجِبْتُمْ أَن جَاءَكُمْ ذِكْرٌ مِّن رَّبِّكُمْ عَلَىٰ رَجُلٍ مِّنكُمْ لِيُنذِرَكُمْ

Marfat.com

وَلِتَتَّقُوا وَلَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ '(الأعراف ۷:۶۳) اس کا ترجمہ مولانا تھانویؒ نے یوں کیا ہے: 'کیا اس بات سے تعجب کرتے ہو کہ تمھارے پروردگار کی طرف سے تمھارے پاس ایک ایسے شخص کی معرفت جو تمھاری جنس کا ہے کوئی نصیحت کی بات آ گئی تا کہ وہ شخص تم کو ڈرائے اور تا کہ تم ڈر جاؤ اور تا کہ تم پر رحم کیا جائے' مولانا اصلاحیؒ نے رجل کا ترجمہ شخص کیا اور مولانا آزادؒ نے آدمی۔ یہی الفاظ سورہ اعراف کی آیت نمبر ۶۹ میں بھی دہرائے گئے ہیں۔ وہ لوگ حضرت نوح علیہ السلام اور حضرت ہود علیہ السلام کی رسالت پر تعجب کرتے تھے۔ اللہ نے یہ بات بتادی کہ فرشتوں میں سے رسول نہیں ہوسکتا۔ اس لیے ایک احتمال باقی تھا کہ احکام کو ایک انسان کے واسطے سے مخلوق تک پہنچایا جائے۔ رسالت پر منکرین کو یہ اعتراض تھا کہ رسول انھی کی مانند ایک بشر ہے اور بشریت میں اشتراک کا تقاضا ہے کہ ان کی صلاحیتیں بھی ایک جیسی ہوں مگر مشاہدہ اس بات کو باطل قرار دیتا ہے۔ نوع بشر کے درمیان اختلاف ہے۔ ایک فرد دوسرے فرد سے نہیں ملتا۔ اگر بفرضِ محال ان میں برابری تسلیم بھی کر لی جائے تو کیا خالق کائنات کے لیے ناممکن ہے کہ وہ ایک فرد کو بعض خاصیتوں سے نوازے۔ اللہ تعالیٰ قادر مطلق ہے اور اُس کی حکمت اور مشیت کا تقاضا بھی یہی ہے۔ سید قطب نے أَوَعَجِبْتُمْ کی تفسیر میں لکھا ہے: اس انسانی وجود کے تمام حالات عجیب ہیں۔ چنانچہ آیت زیرنظر میں رجل کا لفظ بشر کا بدل ہے اس لیے اس کے معنی بشر آدمی شخص اور انسان کے ہیں نہ کہ مرد کے۔

۳۔ ارشاد ربانی ہے: 'أَكَانَ لِلنَّاسِ عَجَبًا أَنْ أَوْحَيْنَا إِلَى رَجُلٍ مِّنْهُمْ أَنْ أَنذِرِ النَّاسَ '(۱۰:۲)۔ مولانا تھانوی نے اس کا ترجمہ یوں کیا ہے: 'کیا ان (مکہ کے) لوگوں کو اس بات سے تعجب ہوا کہ ہم نے ان میں سے ایک شخص کے پاس وحی بھیج دی کہ سب آدمیوں کو احکامِ خداوندی کی مخالفت کرنے سے ڈرائے۔ اس تعجب کا اظہار اہلِ مکہ سے پہلے حضرت نوح علیہ السلام اور حضرت ہود علیہ السلام کی رسالت کے بارے میں بھی کیا گیا تھا۔

امام طبری نے ابن عباس سے روایت کی ہے کہ جب اللہ نے محمد ﷺ کو رسول بنا کر بھیجا تو اہلِ عرب نے یہ کہتے ہوئے انکار کیا کہ اللہ کی ذات اس سے بلند و برتر ہے کہ وہ محمدؐ جیسے بشر کو رسول بنا کر بھیجے۔ امام طبری کہتے ہیں کہ اس سے ملتا جلتا اللہ کا قول ہے: 'وما ارسلنك من قبلك الا رجال' (۱۲:۱۰۹) 'اور ہم نے آپ سے پہلے جتنے رسول بھیجے سب آدمی ہی

Marfat.com

تھے۔ ان کو اس بات پر تعجب تھا کہ بشر کی طرف وحی کی جا رہی ہے اور بشر بھی ایسا جو صاحب مال و جاہ نہیں ہے چنانچہ مشرکین مکہ کہتے تھے کہ اللہ کو یتیم کے علاوہ کوئی اور شخص نہیں ملا۔ بنیادی طور پر وہ اس بات سے انکار کرتے تھے کہ بشر اللہ کا رسول ہو اور وحی کے ذریعہ اس سے جڑا ہوا ہو۔ ان کا خیال تھا کہ رسول بشر سے بلند و برتر مخلوق مثلاً فرشتے ہونے چاہئیں۔ اس بات کی طرف ان کا دھیان نہ گیا کہ یہ تو انسان کے لیے باعث شرف ہے کہ اللہ اسے اپنا پیغام پہچانے کے لیے چن لے۔ نبی کریم ﷺ کے عہد میں بھی یہ اعتراض موجود تھا اور قرونِ اولیٰ میں اور دورِ حاضر میں بھی لوگ شبہ کرتے ہیں کہ مادی مزاج والے بشر کا تعلق اس خالق کے ساتھ کیسے ہو سکتا ہے جس کی کوئی مثال نہیں؟ ان کو دراصل دعوت کی طرف دیکھنا چاہیے تھا نہ کہ داعی کی طرف۔ اگر داعی غیر بشر ہوتا تو ان کو کیا فرق پڑتا۔ اگر وہ اپنے گرد و پیش پر نظر ڈالتے تو انھیں پتہ چل جاتا کہ اللہ نے جتنے پیغمبر بھیجے وہ سب بشر تھے اور اپنی قوم کی زبان میں گفتگو کرتے تھے۔ مذکورہ بالا آیات کے بعد بالترتیب تین ایسی آیات کا مجموعہ ملتا ہے جس میں رجل بمعنی بشر زیادہ وضاحت کے ساتھ وارد ہوا ہے۔ اور اس بشر کی مادی صفات کا بھی ذکر کیا گیا ہے جس کے بعد اس بات کی کوئی گنجائش نہیں رہتی کہ رجل کو مرد کے معنوں میں استعمال کیا جائے۔

۴۔ ارشاد ربانی ہے: 'وَمَا أَرْسَلْنَا مِن قَبْلِكَ إِلَّا رِجَالًا نُّوحِي إِلَيْهِم مِّنْ أَهْلِ الْقُرَىٰ أَفَلَمْ يَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَيَنظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ' (الیوسف ۱۲:۱۰۹)۔ مولانا تھانویؒ نے اس کا ترجمہ یوں کیا ہے: 'اور ہم نے آپ سے پہلے مختلف بستی والوں میں سے جتنے رسول بھیجے سب آدمی ہی تھے (کوئی فرشتہ نہ تھا) تو کیا یہ لوگ ملک میں (کہیں) چلتے پھرتے نہیں کہ (اپنی آنکھوں سے) دیکھ لیتے کہ ان لوگوں کا کیسا (برا) انجام ہوا، جو ان سے پہلے (کافر) ہو گزرے ہیں۔ صاحب کشاف کا قول ہے کہ مراد ہے کہ رجالا لا ملائکۃ انسان نہ کہ فرشتے۔ یہ ان کے اس قول کا جواب ہے: 'قَالُوا لَوْ شَاءَ رَبُّنَا لَأَنزَلَ مَلَائِكَةً' (فصلت ۴۱:۱۴) 'انھوں نے کہا! اگر ہمارے رب کو منظور ہوتا تو فرشتوں کو بھیجتا'۔

مولانا امین احسن اصلاحی فرماتے ہیں ان کا اعتراض یہ تھا کہ 'کس طرح ممکن ہے کہ ہم اپنے ہی اندر کے ایک آدمی کو جو ہمارے اندر پیدا ہوا۔ ہمارے اندر رہا بسا اور جوان ہوا، اللہ کا رسول

Marfat.com

مان لیں۔ اللہ نے رسول ہی بھیجنا ہوتا تو کسی برتر مخلوق یعنی کسی فرشتے کو رسول بنا کر بھیجتے۔ اس کا جواب یہ دیا گیا کہ تم سے پہلے بھی جو رسول بھیجے گئے وہ بلا استثنا سب آدمیوں میں سے تھے اور اسی بستی والوں کو بھیجے، جن کی طرف وہ دعوت دینے پر مامور تھے اور باہر والوں میں سے نہ تھے'۔ کم وبیش سب مفسرین نے اس رائے کی تائید کہ ہے کہ منکرین رسالت کو وہم تھا کہ رسول بشر کے علاوہ کسی اور شکل مثلاً فرشتہ کی شکل میں ہونا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ نے سیر وسیاحت سے دلیل پیش کی ہے یعنی وہ گھوم پھر کر دیکھیں کہ آیا سب پیغمبر انسان کی شکل میں تھے یا کسی اور شکل میں؟ اس آیۂ مبارکہ کا واضح مفہوم یہی ہے مقام حیرت ہے کہ امام طبری، زمخشری، امام رازی، ابوحیان اندلسی کے پائے کے مفسرین نے اس آیت کے ضمن میں ابن عباس کے قول کی سند کے ساتھ عورت کی نبوت یا رسالت کی تردید کی بے محل بحث چھیڑ دی ہے اور اس کے ساتھ اہل بادیہ کی نبوت یا رسالت سے بھی انکار کیا ہے۔ البتہ صاحب البحر المحیط، ابوحیان اندلسی نے ایک پتہ کی بات کہی ہے وہ فرماتے ہیں: 'کیا عورتوں میں کوئی نبی ہوئی ہے اس میں اختلاف ہے'؟ نبی کا لفظ رسول سے زیادہ عام ہے کیونکہ اس کا اطلاق ہر اس شخص پر ہوتا ہے جس کے پاس وحی آتی ہے خواہ وہ رسول ہو یا نہ ہو'۔

متاخرین نے اس آیت کو عورت کی نبوت یا رسالت کے خلاف بطور نص قطعی پیش کیا ہے حالانکہ قدیم مفسرین نے یہ دعویٰ نہیں کیا، ان سب نے شروع میں یہی کہا ہے کہ اُنھوں نے کہا ہے کہ رجل بشر کے معنوں میں ہے نہ کہ مرد کے معنوں میں۔ اُنھوں نے عبداللہ بن عباس کا قول نقل کر کے صرف یہ بات کہی ہے کہ لفظ رجل اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ رسول مرد تھے حالانکہ یہاں پر اس بات کا بھی کوئی موقع محل نہیں۔ جن لوگوں کے دل و دماغ میں یہ بات بیٹھ چکی تھی کہ عورت مرد سے گھٹیا ہے وہ قرآنی آیات کو کھینچ تان کر اپنی رائے کی تائید میں پیش کرتے ہیں۔ اس کی مثال وہ لایعنی بحث ہے جس کی طرف محمود آلوسیؒ نے روح المعانی میں توجہ دلائی ہے وہ فرماتے ہیں 'کہا گیا ہے کہ اس آیت کا مقصد عورتوں کی نبوت کی نفی ہے اور اس بات کو ابن عباس کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہ عورت کی نبوت کی دعویدار سجاح بنت منذر تمیمیہ کے بارے میں نازل ہوئی۔ مگر یہ بات درست نہیں کیونکہ اس نے تو نبی ﷺ کی وفات کے بعد دعویٰ کیا۔ اسے غیبیات میں شمار کرنے کا کوئی قرینہ نہیں۔ دیکھیے عورت کی دشمنی میں آیت مبارکہ کی

Marfat.com

شانِ نزول کے بارے میں کیسی مضحکہ خیز روایت گھڑی گئی۔

اس آیت کے ضمن میں ایک اور عجیب وغریب رائے امام طبری، امام رازی اور صاحب روح المعانی نے یہ پیش کی ہے کہ اللہ نے بادیہ نشینوں میں سے کوئی پیغمبر نہیں بھیجا کیونکہ بستیوں والے علم اور حلم میں بادیہ نشینوں سے بڑھ کر ہوتے ہیں۔ اسی لیے بادیہ نشینوں کو اہل جفا کہا جاتا ہے۔ اس سلسلہ میں قتادہ اور حسن کے اقوال کا سہارا لیا گیا ہے۔ یہ رائے واضح طور پر 'وَجَاءَ بِكُم مِّنَ الْبَدْوِ' (الیوسف ۱۲:۱۰۰) 'تم سب کو بادیہ سے یہاں لایا ہے' ٹکراتی ہے اس اعتراض کو دور کرنے کے لیے غلط تاویلات کا سہارا لیا گیا۔ کبھی کہا گیا کہ حضرت یعقوب علیہ السلام نبوت ملنے کے بعد جنگل میں آئے تھے اور کبھی کہا گیا کہ بدو ایک مقام اور بستی کا نام ہے۔ کس قدر احمقانہ تاویل ہے! اپنے خیالات کو ثابت کرنے کے لیے کس طرح تفسیر سے قرآن کو پاژند بنایا جارہا ہے۔ اس آیت میں اہل القری سے مراد عاد وثمود کی وہ بستیاں ہیں جن کے پاس سے قریش مکہ گرمیوں کے سفر میں شام کی طرف جاتے ہوئے گزرتے تھے۔ مشرکین کی توجہ ان بستیوں اور ان کے رہنے والوں کی طرف اس لیے مبذول کی گئی ہے تا کہ وہ ان کھنڈرات کے قریب پل بھر کے لیے رک کر دیکھیں کہ ان لوگوں کا کیا حشر ہوا جو مال، اولاد اور جاہ وجلال میں ان سے کہیں بڑھ کر تھے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: 'وَلَقَدْ أَهْلَكْنَا مَا حَوْلَكُم مِّنَ الْقُرَىٰ وَصَرَّفْنَا الْآيَاتِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ' (الأحقاف ۴۶:۲۷) 'اور ہم نے تمہارے آس پاس کی اور بستیاں بھی غارت کی ہیں اور ہم نے بار بار اپنی نشانیاں بتلادی تھیں تا کہ وہ باز آئیں' ساتھ ساتھ یہ بھی بتادیا کہ تم سے پہلے جو رسول بھیجے گئے وہ سب آدمیوں میں سے تھے اور ایسی بستی والوں میں سے تھے جن کو دعوت دینا مقصود تھا باہر والوں میں سے نہ تھے۔ اس سیدھی سادھی بات کو موڑ توڑ کر بستی اور بادیہ کا مسئلہ کھڑا کردیا گیا اور اللہ کو بھی صنفی اور عنصری تمیز میں شامل کرلیا گیا۔

۵۔ قرآن مجید میں اسی مضمون کو ایک اور مقام پر یوں بیان کیا گیا ہے: 'وَمَا أَرْسَلْنَا مِن قَبْلِكَ إِلَّا رِجَالًا نُّوحِي إِلَيْهِمْ فَاسْأَلُوا أَهْلَ الذِّكْرِ إِن كُنتُمْ لَا تَعْلَمُونَ' (النحل ۱۶:۴۳)۔ مولانا تھانویؒ نے اس کا ترجمہ یوں کیا ہے: 'اور ہم نے آپ کے قبل (بھی) صرف آدمی ہی رسول بنا کر بھیجے ان پر وحی بھیجا کرتے تھے سو اگر تم کو علم نہیں تو (دوسرے) اہل علم سے پوچھو' مولانا آزاد اور مولانا اصلاحی نے بھی رجل کا ترجمہ آدمی کیا

Marfat.com

ہے نہ کہ مرد۔ ضحاک نے ابن عباس سے روایت کی ہے کہ مشرکین عرب اس بات سے انکار کرتے کہ بشر رسول ہوسکتا ہے۔ قرآن نے منکرین نبوت کے اس اعتراض کا بار بار ذکر کیا ہے کہیں یہ اعتراض ہے: 'أَنُؤْمِنُ لِبَشَرَيْنِ مِثْلِنَا' (المؤمنون ۲۳: ۴۷) 'کیا ہم اپنے جیسے دو انسانوں پر ایمان لائیں'۔ کہیں کہا گیا: 'وَلَئِنْ أَطَعْتُمْ بَشَرًا مِثْلَكُمْ إِنَّكُمْ إِذًا لَخَاسِرُونَ' (المؤمنون ۲۳: ۳۴) یعنی اگر تم اپنے جیسے ایک (معمولی) آدمی کے کہنے پر چلنے لگو تو بیشک تم (عقل کے) گھاٹے میں ہو'۔ آیت زیر نظر میں اللہ نے ان اعتراضات کا جواب دیا ہے۔ آخر میں ان سے کہا گیا ہے کہ اہلِ کتاب کے عالم لوگوں سے پوچھو کہ آیا وہ پیغمبر بشر تھے یا فرشتے؟ اس آیت کے ضمن میں بھی امام رازی نے عورت کی نبوت کے قصے کو چھیڑا ہے۔ کہیں یہ کہا گیا: 'فَقَالُوا أَبَشَرًا مِنَّا وَاحِدًا نَتَّبِعُهُ إِنَّا إِذًا لَفِي ضَلَالٍ وَسُعُرٍ' (القمر ۵۴: ۲۴) 'اور کہنے لگے کیا ہم ایسے شخص کا اتباع کریں گے جو ہماری جنس کا آدمی ہے اور اکیلا ہے تو اس صورت میں ہم گمراہی اور جنون میں ہوں گے۔

۶۔ اس مضمون کو ایک اور مقام پر یوں بیان کیا گیا ہے: 'وَمَا أَرْسَلْنَا قَبْلَكَ إِلَّا رِجَالًا نُوحِي إِلَيْهِمْ فَاسْأَلُوا أَهْلَ الذِّكْرِ إِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُونَ ۝ وَمَا جَعَلْنَاهُمْ جَسَدًا لَا يَأْكُلُونَ الطَّعَامَ وَمَا كَانُوا خَالِدِينَ' (الأنبياء ۲۱: ۷ تا ۸)۔ اس آیت میں رجالا کی صفت بھی بیان کی گئی ہے کہ 'ہم نے ان آدمیوں کے ایسے جسم نہیں بنائے تھے جو کھانا نہ کھاتے ہوں اور وہ حضرات ہمیشہ رہنے والے نہیں تھے'۔ یہ وصف صاف صاف بتا رہا ہے کہ رجل کے معنی آدمی نہیں بلکہ بشر ہے۔ اس آیت میں بھی اللہ نے ان کے سوال کا جواب دیا کہ 'ما هذا الا بشر مثلكم'۔ اس لیے اُن کے بشر ہونے میں کوئی کلام نہیں جبکہ سارے کے سارے رسول بشر تھے۔ تو وہ اتنی سی بات کیوں نہیں سمجھتے کہ آپ کوئی انوکھے رسول نہیں۔ آخر میں بیان کیا گیا کہ رسول سب انسانوں کی مانند بشری مزاج کے تقاضے سے کھانا کھاتے تھے اور انھیں زمین پر دوام حاصل نہ تھا بلکہ تمام لوگوں کی طرح وفات پاتے تھے۔ اگر رسول کا تعلق دوسری جنس سے ہوتا تو لوگوں کے دلوں میں ان کی پیروی کی تحریک پیدا نہ ہوتی اور ان کے دوسرے لوگوں کے ساتھ تعلقات قائم نہ ہوسکتے۔

★ کیا عورت نبی ہوسکتی ہے؟

قرآن کریم میں موضوع زیر بحث یہ ہے کہ کیا نبی بشر ہوتا ہے یا فرشتہ؟ مگر اس موضوع پر قرآن

Marfat.com

کریم میں قطعی طور پر کوئی بحث موجود نہیں۔ اوپر تفصیل سے بتایا جا چکا ہے کہ قرآن حکیم میں نبوت کے سلسلہ میں جہاں جہاں رجــل کا لفظ مفرد یا جمع استعمال ہوا ہے اس کا ترجمہ کسی مفسر اور کسی مترجم نے (سوائے شاہ رفیع الدین کے) مرد نہیں کیا بلکہ انسان، آدمی، شخص اور لوگ کیا ہے۔ بعض مفسرین نے رجل کے لفظ سے دھوکہ کھا کر صرف اتنا کہا ہے کہ اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ نبی صرف مرد ہو سکتے ہیں۔ انھوں نے اس سے مرد کی فضیلت اور عورت کی تحقیر کا پہلو نکالنے کی کوشش کی ہے۔

جہاں تک صلاحیت کا تعلق ہے تو خالق کائنات نے مرد اور عورت کو مساویانہ روحانی صلاحیت عطا کی ہے۔ مرد ہو یا عورت ان میں سے ہر ایک اسی روحانی صلاحیت کی وجہ سے کمال تک پہنچ سکتا ہے۔ ایک حدیث جس کا ذکر آگے آئے گا اس دعویٰ پر دلالت کرتی ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ اس بارے میں علماء اور فقہا کی کیا رائے ہے؟

ابوحیان اندلسی کا قول ہے: "کیا عورتوں میں کوئی نبی ہوئی ہے اس بارے میں اختلاف ہے۔ نبی کا لفظ رسول سے زیادہ عام ہے کیونکہ اس کا اطلاق ہر اس شخص پر ہوتا ہے جس کے پاس وحی آتی ہے خواہ وہ رسول ہو یا نہ ہو (البحر المحیط آیت نمبر ۱۲: ۱۰۹)۔ محمود آلوسی نے بھی اس بات کی تائید کی ہے (روح المعانی آیت نمبر ۳: ۴۲)۔

مولانا حفظ الرحمان سیوہاروی کا کہنا ہے کہ محمد بن اسحاق (المتوفی ۱۵۳ھ) کا قول ہے کہ اکثر فقہا اس کے قائل ہیں (قصص الانبیاء ۴: ۱۶)۔ امام ابوالحسن علی بن اسماعیل الاشعری (المتوفی ۳۳۰ھ) نبوت کے لیے مرد ہونے کی شرط تسلیم نہیں کرتے (روح المعانی آیت نمبر ۶۶: ۱۲) محمود آلوسی اس سلسلہ میں علامہ ابن قاسم کی الآیات البینات کا حوالہ دیتے ہیں۔ امام اشعریؒ کا قول ہے کہ عورتوں میں کئی انبیاء ہوئی ہیں مگر امام ابن حزم نے ان کی تعداد کو چھ تک محدود کر دیا ہے یعنی

۱۔ حوا　۲۔ سارۃ　۳۔ حاجر　۴۔ ام موسیٰ

۵۔ آسیہ (فرعون کی بیوی) اور ۶ مریم۔ (فتح الباری ۶: ۴۷)

ابن حجر عسقلانی فتح الباری میں کہتے ہیں کہ امام قرطبی (المتوفی ۶۷۱ھ) نے سارۃ اور حاجرہ کا نام حذف کر دیا ہے اور کہا ہے کہ صحیح یہ ہے کہ مریم نبی تھیں۔ التمہید میں یہ قول اکثر فقہاء سے منقول ہے (فتح الباری ۶: ۴۷)۔ دوسری عورتوں کے مقابلہ میں حضرت مریم کی نبوت سے متعلق قرآنی نصوص زیادہ واضح ہیں یہی وجہ ہے کہ ان کی نبوت کے بارے میں محمد بن اسحاق، امام اشعری، ابن حزم، امام قرطبی، ابن حجر عسقلانی کے درمیان اتفاق ہے۔ صاحب روح المعانی کا قول ہے کہ مریم کی نبوتؑ کے

Marfat.com

بارے میں قول مشہور ہے بلکہ الحلیات میں شیخ تقی الدین سبکی نے اور ابن السید نے اسی قول کو ترجیح دی ہے (روح المعانی ۲:۵۴ آیت نمبر ۳:۴۲)

دلائل

اللہ نے عورت کو مرد کی طرح روحانی صلاحیتیں عطا کی ہیں یہی وجہ ہے کہ دونوں کے لیے اعمال کی جزا و سزا ایک ہے۔ مرد کی طرح عورت بھی وحی الٰہی کو قبول کرنے کی پوری صلاحیت رکھتی ہے۔ قرآن حکیم نے حضرت سارۃ، ام موسیٰ علیہ السلام اور حضرت مریم کے بارے میں جن واقعات کا ذکر کیا ہے ان میں صاف طور پر موجود ہے کہ ان پر اللہ کے فرشتے وحی لے کر نازل ہوئے۔ ان کو اللہ کی طرف سے بشارتوں سے نوازا گیا۔ ان تک اللہ کی عبادت کا حکم پہنچایا گیا اور انھیں آنے والے واقعات کی خبر دی گئی۔ چنانچہ حضرت سارۃ کے لیے سورہ ھود، سورۃ ذاریات، ام موسیٰ کے لیے سورۃ طٰہٰ، سورۃ قصص اور حضرت مریم کے لیے سورۃ آل عمران اور سورۃ مریم میں بلا واسطہ اور بالواسطہ خطاب الٰہی موجود ہے۔ ان آیات میں وحی کے لغوی معنی نہیں لیے گئے۔ سورۃ شوریٰ میں ارشاد ربانی ہے: وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ أَن يُكَلِّمَهُ اللَّهُ إِلَّا وَحْيًا أَوْ مِن وَرَاءِ حِجَابٍ أَوْ يُرْسِلَ رَسُولًا فَيُوحِيَ بِإِذْنِهِ مَا يَشَاءُ ۚ إِنَّهُ عَلِيٌّ حَكِيمٌ ' (۴۲:۵۱) 'اور کسی بشر کے لیے یہ ممکن نہیں کہ اللہ تعالیٰ اس سے کلام کرے مگر وحی سے یا پس پردہ یا کسی فرشتے کو پیغام بنا کر بھیجے اور وہ اللہ کے حکم سے جس کو وہ چاہے وحی پہنچا دے بیشک وہ بڑا بلند اور حکمت والا ہے۔ قرآن نے وحی کی دوسری قسم کا اطلاق صریح نص کے مطابق حضرت مریم، حضرت سارۃ، حضرت ام موسیٰ اور حضرت آسیہ پر کیا ہے۔ ان سب مقامات پر وحی سے مراد وجدانی ہدایت اور مخفی اشارہ نہیں ہے۔ مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی کا قول ہے کہ ان مقدس عورتوں پر نبی کا اطلاق قطعاً صحیح ہے اور اس کو بدعت کہنا سراسر غلط ہے۔

سورۃ ھود میں اللہ تعالیٰ خود بشارت دے کر حضرت سارۃ کی ڈھارس بندھا رہا ہے۔ وہ فرشتوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہی ہیں اور ان سے ہم کلام ہو رہی ہیں۔ جب اللہ نے اُن کو فرشتوں کے ذریعے حضرت اسحاق علیہ السلام کی خوشخبری دی تو وہ تعجب سے ماتھے پر ہاتھ مارتی ہیں اور فرشتوں سے سوال کرتی ہیں کہ میرے جیسی بانجھ بڑھیا، بچہ جنے گی؟ تو وہ جواب دیتے ہیں کہ یہ تو تمھارے رب کا حکم ہے ایسا ہی ہوگا۔ کس قدر شائستگی سے فرشتے سیدہ سارۃ سے خطاب کر رہے ہیں۔ ان کو فرشتوں کے ذریعے اللہ تعالیٰ کی ہم کلامی کا شرف حاصل ہوا، اور کس قدر بے ساختگی اور فطری طریقے سے وہ فرشتوں سے ہم کلام ہو رہی ہیں۔ یہ اگر مقام نبوت نہیں تو اور کیا ہے؟

Marfat.com

اُم موسیٰ کے دل میں یوں ہی یہ بات نہیں آسکتی کہ آؤ اپنے لختِ جگر کو سمندر میں پھینک کر دیکھیں۔ اس میں خوف یا غم کی تو کوئی بات ہی نہیں یہ تو دشمن کی گود میں پہنچ کر پلنا شروع ہو جائے گا اور خود بخود میرے پاس آجائے گا اور پیغمبر بھی ہو جائے گا۔ اس قسم کی باتیں یوں ہی بیٹھے بیٹھے جی میں نہیں آجایا کرتیں۔ اس آیت سے ذرا آگے ایک خاص اہتمام کے بعد سیدنا موسیٰ علیہ السلام کو لوٹائے جانے کا حال یوں بیان ہوا ہے: 'ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو ان کی والدہ کے پاس واپس پہنچا دیا تا کہ ان کی آنکھیں ٹھنڈی ہوں اور تا کہ غمزدہ نہ ہوں اور تا کہ اس بات کو جان لیں کہ اللہ کا وعدہ سچا ہوتا ہے لیکن اکثر لوگ اس بات کا یقین نہیں رکھتے (۲۸:۱۳)۔ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک وعدۂ الٰہی تھا جو ام موسیٰ سے کیا گیا تھا اور وہ پورا ہوا۔ وعدۂ الٰہی کی دو ہی صورتیں ہو سکتی ہیں یا تو براہ راست ہو یا پیغام کے ذریعے سے۔ ام موسیٰ کو کسی پیغمبر کے ذریعے سے یہ وعدہ نہیں پہنچا، براہ راست پہنچا۔ براہ راست پہنچنے کے باوجود اگر وہ نبی نہ تھیں پھر اس کی کیا شکل تھی؟ اللہ کا وعدہ جو ام موسیٰ سے کیا گیا تھا وہ ملفوظ تھا یا غیر ملفوظ۔ اگر ملفوظ تھا تو ان میں اور نبی میں کیا فرق ہوا؟ حافظ ابن حجر اسقلانی (فتح الباری ۶:۴۷) میں فرماتے ہیں: 'مریم کی نبوت کی تائید اس بات سے ہوتی ہے کہ سورۃ مریم میں ان کا ذکر انبیاء کے ساتھ ہوا ہے۔ حقیقت یہی ہے کہ ان کا ذکر اسی اسلوب کے ساتھ کیا گیا ہے جس اسلوب سے انبیاء اور رسولوں کا ذکر کیا گیا ہے مثلاً واذکر فی الکتٰب مریم (اے محمد ﷺ) اس کتاب میں مریم کا ذکر کیجئے۔ 'واذکر فی الکتٰب ابراھیم، واذکر فی الکتٰب موسیٰ، واذکر فی الکتٰب اسمٰعیل یا مثلاً وارسلنا الیھا روحنا 'ہم نے مریم کی طرف اپنے فرشتے جبریل کو بھیجا یا 'انما انا رسول ربك' میں بلاشبہ تیرے پروردگار کی طرف سے پیغمبر ہوں۔ سورۃ آل عمران میں حضرت مریم کو جس طرح اللہ کے فرشتوں نے اللہ کی جانب سے پیغامبر بن کر خطاب کیا ہے یہ بھی اس دعویٰ کی روشن دلیل ہے۔'

مخالف رائے

ان علماء کے برعکس حسن بصری، امام الحرمین شیخ عبدالعزیز اور قاضی عیاض کی رائے یہ ہے کہ عورت نبی نہیں ہو سکتی۔ فتح الباری میں ہے کہ قاضی عیاض کا قول ہے کہ جمہور نے اس کی مخالفت کی ہے۔ امام النووی نے الاذکار میں امام الحرمین کا قول نقل کیا ہے کہ اس بارے میں اجماع ہے۔ حسن سے روایت ہے کہ نہ عورتوں میں کوئی نبی ہوئی ہے اور نہ جنوں میں۔

دلائل

دلیل کے طور آیت نمبر (۱۲:۱۰۹)، آیت نمبر (۱۶:۴۳) اور آیت نمبر (۲۱:۷) کو پیش کیا جاتا

Marfat.com

ہے۔ان تینوں آیات کریمہ کے الفاظ اور مضمون کم وبیش ایک ہے۔ وہ اِن آیات کے اس جزء سے دلیل دیتے ہیں: 'وما ارسلنا من قبلك الا رجالا نوحی الیھم "ہم نے آپ سے پہلے جتنے رسول بھیجے وہ سب آدمی تھے ہم ان کی طرف وحی بھیجتے تھے'۔ وہ رجال کے معنی مرد لیتے ہیں حالانکہ اُوپر تفصیل سے بحث کی جا چکی ہے کہ رجال سے مراد بشر، آدمی اور انسان ہے نہ کہ مرد۔ اس لحاظ سے ان آیات کا مردیا عورت کی نبوت کے ساتھ کوئی تعلق نہیں بنتا۔ اس دلیل کا جواب محمود آلوسی نے روح المعانی (۲:۴۵۴؛ ۳:۴۲) میں یہ دیا ہے کہ 'اس آیت سے یہ استدلال صحیح نہیں کیونکہ آیت میں رسالت کا ذکر ہے نہ کہ نبوت کا، اور رسالت نبوت کی نسبت، صحیح اور مشہور قول کے مطابق، زیادہ خاص ہے اور خاص کی نفی سے عام کی نفی لازم نہیں آتی'۔ عورت کی نبوت کے حامی علماء نے یہی جواب دیا ہے۔ اس جواب میں اس ضمنی اعتراض کا جواب بھی مضمر ہے کہ جس طرح قرآن حکیم میں مرد انبیاء کو نبی اور رسول کہا گیا ہے اس طرح عورتوں میں سے کسی کے بارے میں صاف طور پر نہیں کہا گیا ہے۔ جواب یہ ہے کہ چونکہ نبوت مع رسالت صرف مردوں کے ساتھ مخصوص ہے اور تعلیم و تبلیغ، نوع انسانی سے متعلق ہوتی ہے اس لیے اللہ نے جس شخص کو اس شرف سے ممتاز کیا ہے۔ اس کے بارے میں صاف صاف اعلان کر دیا جاتا ہے کہ وہ خدا کا بھیجا ہوا نبی اور رسول ہے تاکہ امت پر واجب ہو جائے کہ وہ اس کی دعوت کو قبول کرے، تاکہ اللہ کی حجت پوری ہو جائے۔ جبکہ نبوت کی وہ قسم جس کا اطلاق عورتوں پر ہوتا ہے وہ صرف اسی ہستی سے وابستہ ہوتی ہے جس کو یہ شرف ملا ہے تو اس کے متعلق اتنا اظہار کر دینا کافی ہے کہ اللہ کی وحی سے ان چند عورتوں کو بھی مشرف کیا گیا ہے۔

رہا یہ اعتراض کہ حضرت مریم کو صرف صدیقہ کہا گیا ہے نہ کہ نبیہ۔ اس کے بارے میں حافظ ابن حجر اسقلانی فتح الباری میں یہ فرماتے ہیں کہ 'ان کی صفت صدیقہ نبوت کے منافی نہیں کیونکہ حضرت یوسفؑ کی بھی یہی صفت بیان ہوئی ہے قرآن میں ہے: 'یوسف ایھا الصدیق'، 'یوسف اے صدیق'۔

رہا امام الحرمین کا یہ دعویٰ کہ اس پر اجماع ہے کہ عورت نبی نہیں ہو سکتی تو محمود آلوسی نے روح المعانی میں کہا ہے کہ یہ عجیب و غریب دعویٰ ہے کیونکہ عورت کی نبوت کے بارے میں اختلاف مشہور ہے جن آئمہ نے اختلاف کیا ہے ان کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔

ان دو آراء کے علاوہ ایک تیسری رائے شیخ تقی الدین سبکی کی ہے۔ فتح الباری میں ان کا یہ قول موجود ہے، اس مسئلہ میں علماء کی آراء مختلف ہیں اور میرے نزدیک اس بارے میں اثبات یا نفی میں کوئی

Marfat.com

بات ثابت نہیں۔

حضرت مریم کے بارے میں امام قرطبی کی رائے

امام قرطبی (المتوفی ۶۷۱ھ) اپنی تفسیر الجامع لاحکام القرآن (مطبوعہ دار احیاء التراث العربی ۴۲،۸۲:۲ ۷) میں آیت نمبر (۴۲:۳) کی تفسیر میں فرماتے ہیں "مسلم نے ابوعیسیٰ سے روایت کی ہے کہ رسول ﷺ نے فرمایا: مردوں میں بہت سے کامل ہوئے ہیں مگر عورتوں میں مریم بنت عمران اور آسیہ زوجہ فرعون کامل ہوئی ہیں اور عائشہ کی فضیلت دوسری عورتوں پر ایسے ہے جیسی ثرید کی (Porridge) فضیلت دوسرے کھانوں پر"ہمارے علماء کا قول ہے کہ کمال سے مرد کسی چیز کی انتہا تک پہنچنا اور تکمیل تام ہے۔۔۔ ہر چیز کا کمال اس کی شان کے مطابق ہوتا ہے۔ کمال مطلق صرف اللہ کے ساتھ خاص ہے۔ اس میں شک نہیں کہ انسانوں میں سے کامل ترین انبیاء ہوتے ہیں اور ان کے بعد اولیاء، صدیقین، شہداء اور صالحین۔ جب یہ طے ہوگیا تو علماء نے کہا کہ حدیث میں جس کمال کا ذکر ہے اس سے مراد نبوت ہے۔ پس اس سے مریم اور آسیہ کی نبوت لازم آتی ہے۔ چنانچہ ایک قول یہی ہے مگر صحیح یہ ہے کہ مریم نبی تھیں کیونکہ جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے کہ اللہ نے ان کی طرف فرشتے کے ذریعہ وحی بھیجی جیسا کہ اس نے سب پیغمبروں کی طرف وحی بھیجی ہے۔ رہی بات آسیہ کی، تو ان کی نبوت کی کوئی واضح دلیل نہیں بلکہ ان کی صدیقیت اور فضیلت کا تذکرہ ہے۔ اس سلسلہ میں ابوہریرہ اور ابن عباس کی احادیث کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ قرآن و حدیث کی ظاہری نصوص سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ مریم، حوا سے لے کر قیام قیامت تک کی آخری عورت سے افضل ہے کیونکہ فرشتوں نے ان کی طرف اللہ کی وحی از قسم تکلیف، اخبار اور بشارت پہنچائی جیسا کہ انھوں نے سب پیغمبروں تک پہنچائی تھی۔ نتیجۃً وہ نبی ٹھہریں اور نبی ولی سے افضل ہوتا ہے وہ گزری ہوئی اور آنے والی عورتوں میں افضل ترین ہیں۔۔۔ جو حدیث موسیٰ بن عقبہ نے کریب سے اور انھوں نے ابن عباس سے روایت کی ہے وہ یوں ہے "دنیا جہان کی عورتوں کی سردار مریم ہیں پھر فاطمہ، پھر خدیجہ پھر آسیہ۔ اس حدیث حسن نے مسئلہ حل کر دیا ہے اللہ نے مریم کو ان باتوں میں خصوصیت عطا کی جو کسی اور عورت کو عطا نہیں کی گئی۔ روح القدس ان کے سامنے آئے اور ان سے ہم کلام ہوئے، نفخہ کے لیے ان سے قریب ہوئے اور ان کی قمیص میں پھونک ماری۔ یہ مرتبہ بلند کسی اور عورت کو نہیں ملا۔ انھوں نے اپنے رب کے کلمات کی تصدیق کی اور جب انھیں بشارت دی گئی تو انھوں نے زکریاؑ کی طرح نشانی کا مطالبہ نہیں کیا اس لیے انھیں صدیقہ کا لقب عطا ہوا اور کہا گیا کہ اُمُّهٗ صِدِّيقَةٌ (۷۵:۵) یعنی عیسیٰ کی والدہ صدیقہ ہیں" اور یہ بھی کہا گیا: "وَصَدَّقَتْ بِكَلِمَاتِ

Marfat.com

رَبِّهَا وَكُتُبِهِ وَكَانَتْ مِنَ الْقَانِتِيْنَ '(الشوریٰ ۶۶:۱۲)' اس نے اپنے رب کی باتوں کی اور کتابوں کی تصدیق کی اور وہ فرمانبرداروں میں سے تھیں'۔ اس طرح اللہ نے ان کی صدیقیت یعنی ان کی خوئے تصدیق اور فرمانبرداری کی خود شہادت دی ہے۔

امام ابن حزم اور عورت کی نبوت

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ بحث کو سمیٹتے ہوئے امام ابن حزم اندلسی کا اس مسئلہ کے بارے میں نقطہ نظر پیش کیا جائے۔ انھوں نے اپنی مشہور کتاب 'الفصل فی الملل والأهواء والنحل' (۱۷:۵) میں نبوۃ النساء کے عنوان سے ایک فصل باندھی ہے جو اس سلسلہ میں قول فیصل کا درجہ رکھتی ہے، میں اس فصل کا لفظ بلفظ وہ اردو ترجمہ لکھ رہا ہوں جو مولانا حفظ الرحمان سیوہارویؒ نے اپنی کتاب قصص القرآن (۱۸:۴) میں کیا ہے:

'یہ فصل ایسے مسئلہ کے متعلق ہے جس پر ہمارے زمانے میں قرطبہ (اندلس) میں شدید اختلاف بپا ہوا۔ علماء کی ایک جماعت کا کہنا ہے کہ عورت نبی نہیں ہوسکتی اور جو ایسا کہتا ہے وہ ایک نئی بدعت ایجاد کرتا ہے اور دوسری جماعت کا قول ہے کہ عورت نبی ہوسکتی ہے اور نبی ہوئی ہے، ان دونوں سے الگ تیسری جماعت کا مسلک توقف ہے اور وہ اثبات ونفی دونوں باتوں میں سکوت کو پسند کرتے ہیں مگر جو حضرات عورت سے متعلق منصب نبوت کا انکار کرتے ہیں ان کے پاس اس انکار کی اصلاً کوئی دلیل نظر نہیں آتی بلکہ بعض حضرات نے اپنے اختلاف کی بنیاد اس آیت کو بنایا ہے: 'وما ارسلنا من قبلك الاّ رجالا نوحی الیهم' یعنی 'ہم نے آپ سے پہلے جتنے پیغمبر بھیجے انسان ہی تھے جن کی طرف ہم وحی بھیجتے تھے'۔

میں کہتا ہوں کہ اس بارے میں کس کو اختلاف ہے اور کس نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ عورت کو ہدایت خلق کے لیے رسول بنا کر بھیجتا ہے یا اس نے کسی عورت کو رسول بنایا ہے۔ بحث رسالت کے مسئلہ میں نہیں ہے بلکہ نبوت میں ہے۔ پس طلب حق کے لیے ضروری ہے کہ اول غور کیا جائے کہ لغت عرب میں لفظ 'نبوت' کے کیا معنی ہیں؟ ہم اس لفظ کو انباء سے ماخوذ پاتے ہیں جس کے معنی اطلاع دینا ہیں۔

وحی کا مطلب

پس نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ جس شخص کو اللہ تعالیٰ کسی معاملہ کے ہونے سے قبل بذریعہ وحی اطلاع دے یا کسی بھی بات کے لیے اس کی جانب وحی نازل فرمائے وہ شخص مذہبی اصطلاح میں بلاشبہ نبی ہے۔ آپ اس مقام پر یہ نہیں کہہ سکتے کہ وحی کے معنی اس الہام کے ہیں جو اللہ تعالیٰ نے کسی مخلوق کی سرشت میں

Marfat.com

ودیعت کر دیا ہے جیسا کہ شہد کی مکھی کے متعلق خدائے برحق کا ارشاد ہے: "وَأَوْحَىٰ رَبُّكَ إِلَى النَّحْلِ" (النحل ۱۶:۶۸) "اور تیرے رب نے شہد کی مکھی کے حق میں یہ بات ڈالی" اور نہ وحی کے معنی ظن اور وہم کے لے سکتے ہیں اس لیے کہ ان دونوں کو علم یقین سمجھنا (جو وحی کا قدرتی نتیجہ ہے) مجنوں کے سوا اور کسی کا کام نہیں ہے اور نہ یہاں وہ معنی مراد ہو سکتے ہیں جو باب کہانت سے تعلق رکھتے ہیں یعنی یہ کہ شیاطین آسمانی باتوں کو سننے اور چرانے کی کوشش کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی جانب سے شہاب ثاقب کے ذریعہ ان پر رجم کیا جاتا ہے) اور جس کے متعلق قرآن یہ کہتا ہے: "شَيَاطِينَ الْإِنسِ وَالْجِنِّ يُوحِي بَعْضُهُمْ إِلَىٰ بَعْضٍ زُخْرُفَ الْقَوْلِ غُرُورًا" (الأنعام ۶:۱۱۲) "انسانوں اور جنوں میں سے (ہر ایک نبی کے لیے دشمن بنایا) وہ دھوکا دینے کے لیے ایک دوسرے کی دل میں چکنی چپڑی باتیں ڈالتے رہتے ہیں"۔ کیونکہ یہ باب رسول اللہ ﷺ کی ولادت باسعادت کے وقت سے بند ہو گیا ہے اور نہ اس جگہ وحی کے معنی نجوم کے تجربات علمیہ سے تعلق رکھتے ہیں جو خود انسانوں کے باہم سیکھنے اور سکھانے سے حاصل ہو جایا کرتے ہیں اور نہ اس کے معنی رؤیا (خواب) ہو سکتے ہیں جن کے سچ یا جھوٹ ہونے کا کوئی علم نہیں ہے بلکہ ان تمام معانی سے جدا وحی بمعنی نبوت یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنے قصد اور ارادہ سے ایک شخص کو ایسے امور کی اطلاع دے جن کو وہ پہلے سے نہیں جانتا اور مذکورہ بالا ذرائع علم سے الگ یہ امور حقیقت ثابتہ بن کر اس شخص پر اس طرح منکشف ہو جائیں گویا وہ آنکھوں سے دیکھ رہا ہے اور اللہ تعالیٰ اس علم خاص کے ذریعہ اس شخص کو بغیر کسی محنت وکسب بداہتہً ایسا صحیح یقین عطا کر دے کہ وہ ان امور کو اس طرح معلوم کر لے جس طرح وہ حواس اور ہدایت عقل کے ذریعہ حاصل کر لیا کرتا ہے اور اس کو کسی قسم کے شک وشبہ کی گنجائش باقی نہیں رہتی اور خدا کی یہ وحی یا تو اس طرح ہوتی ہے کہ فرشتہ آ کر اس شخص کو خدا کا پیغام سناتا ہے یا اس طرح کہ اللہ براہ راست اس سے خطاب کرتا ہے۔

پس اگر ان حضرات کے نزدیک جو عورت کے نبی ہونے کا انکار کرتے ہیں۔ نبوت کے معنی یہ نہیں ہیں تو وہ ہم کو سمجھائیں کہ آخر نبوت کے معنی ہیں کیا؟ حقیقت یہ ہے کہ وہ اس کے ماسوا اور کوئی معنی بیان ہی نہیں کر سکتے۔

عورت کی نبوت

جبکہ نبوت کے معنی وہی ہیں جو ہم نے بیان کیے تو اب قرآن کے ان مقامات کا بغور مطالعہ کیجیے جہاں یہ مذکور ہے کہ اللہ عزوجل نے عورتوں کے پاس فرشتوں کو بھیجا اور فرشتوں نے اللہ تعالیٰ کی جانب سے ان عورتوں کو وحی حق سے مطلع کیا چنانچہ فرشتوں نے ام اسحاق (سارہ) کو اسحاق علیہ السلام کی ولادت کی بشارت

Marfat.com

سنائی۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: ' وَامْرَأَتُهُ قَائِمَةٌ فَضَحِكَتْ فَبَشَّرْنَاهَا بِإِسْحَاقَ وَمِن وَرَاءِ إِسْحَاقَ يَعْقُوبَ ○ قَالَتْ يَا وَيْلَتَى أَأَلِدُ وَأَنَا عَجُوزٌ وَهَـٰذَا بَعْلِي شَيْخًا إِنَّ هَـٰذَا لَشَيْءٌ عَجِيبٌ ○ قَالُوا أَتَعْجَبِينَ مِنْ أَمْرِ اللَّهِ رَحْمَتُ اللَّهِ وَبَرَكَاتُهُ عَلَيْكُمْ أَهْلَ الْبَيْتِ ' (ھود ۱۱: ۷۱ تا ۷۳) 'اور اس کی عورت جو پاس کھڑی تھی سو وہ ہنس پڑی تو ہم نے اسے اسحاقؑ کی اور اسحاقؑ کے پیچھے یعقوبؑ کی خوشخبری دی۔ اس نے کہا مجھ پر افسوس! اب میں بڑھیا ہو کر بچہ جنوں گی اور یہ میرا شوہر بھی بوڑھا ہو چکا ہے۔ یہ تو بڑی ہی عجیب بات ہے۔ فرشتوں نے کہا: کیا تم اللہ کے کاموں پر تعجب کرتی ہو؟ اے اہل بیت! اللہ کی رحمت اور برکتیں تم پر ہیں۔ بے شک وہ تعریف کے لائق اور بڑی شان والا ہے'۔

ان آیات میں فرشتوں نے ام اسحاق کو اللہ تعالیٰ کی جانب سے اسحاقؑ اور ان کے بعد یعقوبؑ کی بشارت سنائی ہے اور سارہ کے تعجب پر یہ کہہ کر دوبارہ خطاب کیا ہے' کیا تم اللہ کے کاموں پر تعجب کرتی ہو؟ یہ کیسے ممکن ہے کہ والدۂ اسحاق نبی تو نہ ہوں اور اللہ تعالیٰ فرشتوں کے ذریعہ اس طرح ان سے خطاب کرے۔

✱ مریم

اسی طرح ہم دیکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ جبرئیل فرشتہ کو مریم (ام عیسیٰ) کے پاس بھیجتا ہے اور ان کو مخاطب کر کے یہ کہتا ہے: ' إِنَّمَا أَنَا رَسُولُ رَبِّكِ لِأَهَبَ لَكِ غُلَامًا زَكِيًّا ' (المریم ۱۹:۱۹) 'اس نے کہا! میں صرف تیرے رب کا فرستادہ ہوں تا کہ تجھے ایک پاکیزہ لڑکا بخشوں'۔ تو یہ حقیقی وحی اور اللہ کی طرف سے ان کی طرف پیغام کے ذریعے حقیقی نبوت نہیں تو اور کیا ہے؟ کیا اس آیت میں صاف طور پر نہیں کہا گیا ہے کہ مریمؑ کے پاس جبرئیلؑ اللہ تعالیٰ کی طرف سے پیغامبر بن کر آئے؟ نیز زکریاؑ جب مریمؑ کے حجرے میں آتے تو ان کے پاس اللہ کا غیب سے دیا ہوا رزق پاتے تو انھوں نے اسی رزق کو دیکھ کر بارگاہ الٰہی میں صاحب فضیلت لڑکا پیدا ہونے کی دعا کی۔ اسی طرح ہم ام موسیٰؑ کے معاملہ میں دیکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر وحی نازل فرمائی کہ تم اپنے اس بچے کو دریا میں ڈال دو اور ساتھ ہی ان کو اطلاع دی کہ میں اس کو تمھاری جانب واپس کروں گا اور اس کو نبی مرسل بناؤں گا پس کون شک کر سکتا ہے کہ یہ نبوت کا معاملہ نہیں ہے۔ معمولی عقل و شعور رکھنے والا آدمی بھی با آسانی یہ سمجھ سکتا ہے کہ اگر موسیٰؑ کی والدہ کا یہ عمل اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ شرف نبوت سے وابستہ نہ ہوتا اور محض خواب کی بناء پر یا دل میں پیدا شدہ وسوسہ کی وجہ سے وہ ایسا کرتیں تو ان کا یہ عمل نہایت ہی مجنونانہ اور متہورانہ ہوتا اور اگر آج ہم میں

Marfat.com

سے کوئی ایسا کر بیٹھے تو ہمارا یہ عمل یا گناہ قرار پائے گا یا ہم کو مجنون اور پاگل کہا جائے گا اور علاج کے لیے پاگل خانہ بھیج دیا جائے گا۔ یہ ایک ایسی صاف اور واضح بات ہے جس میں شک وشبہ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تب یہ کہنا قطعاً درست ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کا موسیٰ علیہ السلام کو دریا میں ڈال دینا اسی طرح وحی الٰہی کی بناء پر تھا جس طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام نے رؤیا (خواب) میں اپنے بیٹے اسماعیل علیہ السلام کا ذبح کرنا بذریعہ وحی معلوم کر لیا تھا۔ اس لیے اگر ابراہیم علیہ السلام نبی نہ ہوتے اور ان کے ساتھ وحی الٰہی کا سلسلہ وابستہ نہ ہوتا اور پھر وہ یہ عمل محض ایک خواب یا نفس میں پیدا شدہ ظن کی وجہ سے کر گزرتے تو ہر شخص ان کے اس عمل کو یا گناہ سمجھتا یا انتہائی جنون یقین کرتا تو اب بغیر کسی تردد کے یہ کہا جا سکتا ہے کہ ام موسیٰ نبی تھیں۔

علاوہ ازیں حضرت مریم کی نبوت پر ایک دلیل یہ بھی پیش کی جا سکتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سورۃ کھیعص میں ان کا ذکر انبیاء علیہم کے زمرہ میں کیا ہے اس کے بعد ارشاد فرمایا ہے: 'أُولَٰئِكَ الَّذِينَ أَنْعَمَ اللَّهُ عَلَيْهِم مِّنَ النَّبِيِّينَ مِن ذُرِّيَّةِ آدَمَ وَمِمَّنْ حَمَلْنَا مَعَ نُوحٍ'، یہی ہیں وہ انبیا جن پر اللہ نے انعام کیا آدم کی نسل سے اور ان سے جنھیں ہم نے نوح کے ساتھ سوار کیا (اور ابراہیم اور اسرائیل کی نسل سے اور ان میں سے جنھیں ہم نے ہدایت دی اور چن لیا (مریم ۱۹:۵۸) آیت کے اس عموم میں مریم کی تخصیص کر کے ان کو انبیاء کی فہرست میں سے الگ کر لینا کسی طرح صحیح نہیں ہو سکتا۔

رہی یہ بات کہ قرآن نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ذکر کرتے ہوئے حضرت مریم کے لیے یہ کہا ہے: 'وامہ صدیقۃ' یعنی ان کی ماں صدیقہ ہے۔ تو یہ لقب ان کی نبوت کے لیے اسی طرح مانع نہیں جس طرح حضرت یوسف علیہ السلام کے نبی اور رسول ہونے کے لیے یہ آیت مانع نہیں 'يُوسُفُ أَيُّهَا الصِّدِّيقُ (۱۲:۴۶)' یوسف اے صدیق' اور یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے (و باللہ التوفیق)۔

اب حضرت سارہ، حضرت مریم اور حضرت ام موسیٰ کے مسئلہ نبوت کیساتھ فرعون کی بیوی (آسیہ) کو بھی شامل کر لیجیے اس لیے کہ نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: 'کمل من الرجال کثیر ولم یکمل من النساء الا مریم بنت عمران و آسیۃ بنت مزاحم امراۃ فرعون' یعنی مردوں میں سے بہت سے کامل ہوئے ہیں مگر عورتوں میں سے صرف مریم اور آسیہ زوجہ فرعون کامل ہوئی ہیں'۔

اور واضح رہے کہ مردوں میں یہ درجۂ کمال بعض رسولوں ہی کو حاصل ہوا ہے اور اگرچہ ان کے علاوہ انبیاء اور رسل بھی درجۂ نبوت و رسالت پر مامور ہیں لیکن وہ ان مرسلین کاملین کے درجہ سے نازل ہیں۔ اس لیے حدیث کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جن عورتوں کو منصب نبوت سے سرفراز فرمایا ہے ان میں

Marfat.com

صرف ان دو عورتوں کو ہی درجۂ کمال تک پہنچنے کی فضیلت حاصل ہے کیونکہ حدیث میں جس درجہ کمال کا ذکر ہو رہا ہے جو ہستی بھی اس درجہ سے نازل ہے وہ کامل نہیں ہے۔ بہرحال اس حدیث سے ثابت ہوا کہ اگرچہ بعض عورتیں بنص قرآن نبی ہیں لیکن ان میں سے ان دو عورتوں کو ہی درجہ کمال حاصل ہوا۔ درجات کے اس فرق کو خود قرآن نے اس طرح بیان کیا ہے: تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلَى بَعْضٍ '(البقرۃ ۲:۲۵۳)'یہ حضرات مرسلین ایسے ہیں کہ ہم نے ان میں سے بعض کو بعض پر فوقیت بخشی ہے'۔ حقیقت یہ ہے کہ کامل اس کو کہا جاتا ہے جس کی نوع میں سے کوئی دوسرا اس کا ہمسر نہ ہو بس مردوں میں سے ایسے کامل چند ہی رسول ہوئے ہیں جن کی ہمسری دوسرے انبیاء و رسل کو عطا نہیں ہوئی اور بلاشبہ انھی کاملین میں سے ہمارے پیغمبر محمد ﷺ اور ابراہیمؑ ہیں جن کے متعلق نصوص (قرآن و حدیث) نے ان فضائل کمال کا اظہار کیا ہے جو دوسرے انبیاء و رسل کو حاصل نہیں ہیں اسی طرح عورتوں میں سے وہی درجہ کمال کو پہنچی ہیں جن کا ذکر نبی کریم ﷺ نے اس حدیث میں کیا ہے'۔

☆ خلاصہ بحث

علامہ ابن حزم کے مضمون کا خلاصہ یہ ہے کہ عورت کو بھی مرد کی طرح روحانی کمال تک پہنچنے کی صلاحیت حاصل ہے۔ اس بارے میں خالق کائنات نے کوئی تمیز روا نہیں رکھی۔ چنانچہ وحی مردوں کی طرف بھی بھیجی گئی اور عورتوں کی طرف بھی۔ وحی اپنے اصطلاحی معنوں میں دو قسم کی ہے۔ ایک وہ وحی جس کا مقصد لوگوں کی رشد و ہدایت ہے اور دنیا کی سرکش طاقتوں کا مقابلہ کر کے انقلاب عظیم بپا کرنا ہے۔ یہ وحی نبوت کے ساتھ رسالت کی ایک شکل ہے یہ متفقہ طور پر مردوں کے ساتھ مخصوص ہے اس لیے نہیں کہ ان کو صنف مخالف پر برتری حاصل ہے بلکہ اس لیے کہ جن سرکش معاشروں کی اصلاح مقصود تھی وہ عورت کو انسان نہیں بلکہ ایک گری پڑی چیز سمجھتے تھے۔ سماجی اور معاشرتی حالات کا تقاضا تھا کہ اس کام کے لیے مردوں کو بھیجا جائے۔ جن بد معاشوں نے مردوں کے ساتھ ناروا سلوک کیا اور اُن کی مخالفت میں ایڑی چوٹی کا زور لگایا وہ مظلوم عورت کے ساتھ کیا کچھ نہ کرتے۔ اللہ کی حکمت اور مشیت کے تحت یہ فریضہ مردوں سے مخصوص کیا گیا۔

وحی کی دوسری قسم یہ ہے کہ اللہ کسی شخص سے براہ راست یا فرشتہ کے واسطے سے اس قسم کا خطاب کرے کہ جس سے بشارت دینا یا کسی ہونے والے واقعہ کے ہونے سے پہلے اطلاع دینا یا خاص اس شخص کی ذات کی بارے میں امر و نہی مقصود ہو یہ بھی نبوت ہی کی ایک قسم ہے کیونکہ قرآن حکیم نے آیت نمبر (۴۲:۵۱) میں نزول وحی کے جو طریقے بیان کیے ہیں وہ اس وحی پر بھی صادق

Marfat.com

آتے ہیں۔ اس دوسری قسم کا اطلاق قرآن میں واضح طور پر حضرت سارۃ، حضرت ام موسیٰ، حضرت آسیہ اور حضرت مریم پر کیا گیا ہے۔ دوسری عورتوں کی نبوت کے بارے میں امام قرطبی جیسے علماء نے اختلاف کیا ہے مگر حضرت مریم کی نبوت پر تو یہ سب علماء متفق ہیں۔

جن لوگوں نے اس بات پر اُدھار کھا رکھا ہے کہ کسی نہ کسی طرح عورتوں کو مردوں کے مقابلے میں کمتر ثابت کیا جائے وہ یہ دلیل بھی لاتے ہیں کہ کوئی عورت نبی نہ تھی اس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ مرد سے کمتر ہے۔ تصریحات بالا کی روشنی میں یہ دعویٰ کیا جاسکتا ہے کہ ان کا خیال قطعاً غلط ہے۔

☆ عورتوں کو رسول کیوں نہیں بنایا گیا؟

منکرین نبوت حضرت نوح علیہ السلام سے لے کر خاتم الانبیاء محمد ﷺ تک ایک ہی اعتراض کر رہے تھے کہ یہ کس طرح ممکن ہے کہ ہم اپنے ہی اندر کے ایک آدمی کو جو ہمارے یہاں پیدا ہوا ہو، ہمارے ہی اندر وہ رہا سہا اور جوان ہوا، اور ہماری ہی طرح کھاتا پیتا اور بازاروں میں گھومتا ہوا سے اللہ کا رسول مان لیں۔ اگر اللہ کو رسول ہی بھیجنا تھا تو کسی برتر مخلوق یعنی کسی فرشتے کو رسول بنا کر بھیجتا کیونکہ ان کا علم بھی زیادہ ہے قدرت بھی اور ہیبت بھی۔ وہ سمجھتے کہ اللہ ایک عظیم ہستی ہے وہ بھلا پیغام ہم جیسے انسان کی طرف کیسے بھیج سکتا ہے؟ ان کے اعتراض کا جواب یوں دیا گیا کہ ”اگر زمین پر فرشتے ہوتے، اس میں چلتے پھرتے اور سکونت پذیر ہوتے تو ہم ان کے لیے آسمان سے فرشتوں کو رسول بنا کر بھیجتے“۔ زمین پر چونکہ انسان بستے ہیں جن کی فطرت فرشتوں کی فطرت سے مختلف ہوتی ہے۔ اس لیے انسانوں کی ہدایت کے لیے انسان ہی رسول بنا کر بھیجے جاتے ہیں جو ان کے جذبات و احساسات کو سمجھتے ہیں اور اپنی زندگی کا عملی نمونہ ان کے سامنے پیش کر دیتے ہیں۔ اور بفرض محال اگر فرشتوں کو رسول بنا کر بھیجا جاتا تو اسے بھی انسان ہی کی شکل میں بھیجا جاتا تو پھر منکرین کا اعتراض وہیں کا وہیں رہتا کہ یہ تو انسان ہے فرشتہ نہیں۔ ان آیات مبارکہ سے یہ تو ثابت ہو گیا رسول بشر اور انسان ہو گا۔ لفظ بشر کا اطلاق جس طرح مرد پر ہوتا ہے بالکل اسی طرح عورت پر ہوتا ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ عورت کا رسول ہونا محال یا ناممکن نہیں۔ ان میں بھی دل و دماغ کی وہ صلاحیتیں بدرجہ اتم موجود ہیں جو ایک مرد میں پائی جاتی ہیں۔ جہاں تک طہارت، تقویٰ، علم و تربیت اور لطافت طبع کا تعلق ہے عورتیں بھی مردوں کی مانند ان ملکوتی صفات سے متصف ہوتی ہیں۔ جو لوگ عورت کی نبوت کے قائل نہیں وہ بھی یہ مانتے ہیں کہ حواؑ، سارۃ، حاجرہ، اُم موسیٰؑ اور مریم اعلیٰ روحانی مقام پر فائز تھیں جبھی تو انہیں اللہ سے ہم کلام ہونے کا شرف حاصل ہوا۔

Marfat.com

عورتوں کو اس لیے رسول بنا کر نہیں بھیجا گیا کہ ان میں صلاحیتوں کی کمی ہے اس اعتبار سے وہ مردوں کی ہم پلہ ہیں جبھی تو انھیں جزا و سزا کا سزاوار سمجھا گیا۔ ان کے رسول نہ بنانے کا سبب خالصتاً سماجی اور معاشرتی ہے۔ ایک ایسا معاشرہ جہاں مال و دولت کو فضیلت کا معیار سمجھا جاتا تھا اور مال و دولت سے محرومی کو حقارت کی نظر سے دیکھا جاتا، ان کا اعتراض یہ تھا کہ یہ قرآن ہماری دو بستیوں (مکہ، طائف) کے کسی بڑے آدمی کی طرف کیوں نازل نہیں کیا گیا۔ یہ کیسے باور کیا جا سکتا ہے کہ ہمارے بڑے بڑے سرداروں اور دولتمندوں کو چھوڑ کر منصب رسالت کے لیے ایک غریب اور یتیم کو چن لیا گیا ہو۔ ہم ایسے شخص کی اطاعت کیسے کر سکتے ہیں؟ وہ تو یہ بھی برداشت نہیں کرتے تھے کہ ان جیسا ایک شخص اس منصب پر فائز ہو کر ان سے افضل ہو جائے۔ چنانچہ نوحؑ کی قوم نے ان کی بات ماننے سے انکار کر دیا۔ انھوں نے دوسرے لوگوں سے کہا! یہ نوح تمھارے ہی جیسا ایک انسان ہے لیکن تم پر بڑائی حاصل کرنا چاہتا ہے۔

جس معاشرے کا یہ حال ہو کہ جب ان میں سے کسی کو یہ خوشخبری ملتی ہے کہ اس کے ہاں بیٹی پیدا ہوتی ہے تو اس کے چہرے کی رنگت سیاہ پڑ جاتی ہے اور جب وہ غم میں ڈوب جاتا ہے تو وہ بیٹی کی پیدائش کی خبر کو اس قدر معیوب سمجھتا ہے کہ لوگوں سے منہ چھپائے پھرتا ہے اور سوچتا ہے کیا بیٹی کو زندہ رکھ کر ہمیشہ کی ذلت برداشت کرے یا اسے زندہ دفن کر کے (ذلت سے نجات حاصل کر لے)۔ کیا ایسی سوسائٹی میں عورت کو رسول بنا کر بھیجنا مناسب ہوتا؟ کیا وہ منکرین جو اپنے جیسے مرد کی رسالت کا انکار کرتے تھے۔ عورت جس کو وہ ہیٹا تسلیم کرتے تھے رسول مان لیتے؟ کبھی بھی نہیں۔ یہ وہ معاشی اور معاشرتی سبب ہے جس کی وجہ سے عورت کو رسول بنا کر نہیں بھیجا گیا۔ رسول بناتے وقت اللہ تعالیٰ وقت اور سماج کے تقاضوں کو پیش نظر رکھتا ہے۔

چنانچہ سورۃ انعام (۱۲۴:۶) میں اللہ کا ارشاد ہے: 'اور جب ان کے پاس کوئی نشانی آتی ہے تو کہتے ہیں ہم کبھی یقین کرنے والے نہیں جب تک ہمیں ویسی بات نہ ملے جیسا اللہ کے رسولوں کو مل چکی ہے۔ حالانکہ اللہ خوب جانتا ہے کہ وہ کونسا فرد ہے جسے منصب رسالت کے لیے منتخب کرنا ہے یعنی کہاں اور کس کو پیغمبر بنانا ہے'۔ یہی وہ حکمت ہے جس کے پیش نظر اللہ نے عورت کو نبی بنایا ہے مگر رسول نہیں بنایا۔

Marfat.com

بعضکم من بعض

لغوی مفہوم

بـعـض الشـئ ہر چیز کا کچھ حصہ (Portion) ٹکڑا (Part) یا جزو ہے خواہ وہ کم ہو یا زیادہ۔
مقاییس اللغۃ کے مطابق با، عین اور ضاد کے بنیادی معنی کسی چیز کو اجزاء میں تقسیم کرنا ہے اس کے ہر ٹکڑے کو بعض کہا جاتا ہے۔ خلیلؒ کا قول ہے کہ ہر چیز کا ٹکڑا اس کا بعض کہلاتا ہے مثلاً آپ کہتے ہیں: 'جاریۃ تشبہ بعضہا بعضا'، 'لڑکی جس کے اعضاء ایک دوسرے سے مشابہت رکھتے ہیں'۔
المصباح المنیر نے ثعلب کا قول نقل کیا ہے کہ اہل نحو کا اس بات پر اتفاق ہے کہ بعض ایک چیز یا بہت سی اشیاء کا جزو ہوتا ہے اور اس کا اطلاق نصف سے اوپر یعنی دس میں سے آٹھ پر ہوتا ہے، بـعـض کل کی ضد ہے۔ بعض کی جمع ابعاض ہے۔ اصمعی کے قول کے مطابق اس پر معرفہ کا ال داخل نہیں ہوتا کیونکہ اس کا استعمال اضافت کے ساتھ ہوتا ہے یہ ہمیشہ مذکر استعمال ہوتا ہے جیسا کہ آپ کہتے ہیں: ھـذہ الدار متصل بعضا ببعض یعنی 'اس گھر کا ایک حصہ دوسرے سے متصل ہے' اور اللہ کا قول 'یَلْتَقِطْهُ بَعْضُ السَّيَّارَةِ' (یوسف ۱۲:۱۰) 'اسے کوئی قافلہ اچک لے گا'۔
بـعّض الشـئ تبعیضا فتبعّض 'اس نے چیز کے ٹکڑے کیے اور وہ ٹکڑے ٹکڑے ہوگئی'۔
Lane کہتا ہے کہ اس کے معنی کسی چیز کو ٹکڑوں یا حصوں میں تقسیم کرنا ہے۔

'Divided into parts & portions'

ایک بدو نے یہ جملہ کہا: 'رایت غر بانا یتبعضن'، 'میں نے کوؤں کو دیکھا کہ وہ ٹکڑیوں میں تقسیم ہو چکے تھے'۔

بعضھم بعضا کے معنی ایک دوسرے اور ہر ایک (One another, each other) ہیں۔ قرآن حکیم کے کئی ایک مقامات پر یہ محاورہ یوں بھی استعمال ہوا ہے اور حروف جار با (بـعـضـھـم ببعض) لام (بعضھم لبعض) اور علی (بعضھم علی بعض) الی (بعضھم الی بعض) اور من کے ساتھ (بعضھم من بعض) بھی استعمال ہوا ہے۔

میں اس مضمون میں قرآن میں وارد بعضھا من بعض، بعضکم من بعض اور بعضھم من بعض کی تراکیب پر بحث کروں گا جو اس بات پر نص قطعی کا درجہ رکھتی ہیں کہ مرد اور عورت ایک دوسرے کا جزو ہیں اسی لیے اللہ نے ان کو اعمال اور اس کی جزا میں مساویانہ درجہ عطا کیا ہے۔ وہ شرف نسبت میں برابر ہیں۔ صلاحیتوں اور استعداد میں برابر ہیں۔ ان کے درمیان وجہ فضیلت ایمان اور اعمال صالح

Marfat.com

ہیں۔ محض مرد ہونا کوئی وجہ فضیلت نہیں۔

سورۃ آل عمران میں اللہ کا ارشاد ہے: "اِنَّ اللّٰہَ اصْطَفٰی آدَمَ وَنُوحاً وَآلَ اِبْرَاهِیْمَ وَآلَ عِمْرَانَ عَلَی الْعَالَمِیْنَ ○ ذُرِّیَّۃً بَعْضُهَا مِنْ بَعْضٍ" (۳:۳۳ تا ۳۴) "بلاشبہ اللہ نے آدم اور نوح کو اور ابراہیم اور عمران کے گھرانوں کو تمام دنیا میں برگزیدگی عطا کی۔ یہ ایک نسل تھی جس میں سے بعض بعض سے پیدا ہوئے تھے۔

امام راغب کا قول ہے کہ ذُرِّیَّۃ کے اصل معنی چھوٹی اولاد کے ہیں لیکن باہمی تعارف میں اس کا اطلاق چھوٹے بڑے دونوں پر ہوتا ہے۔ یہ واحد اور جمع دونوں کے لیے مستعمل ہے مگر اصلاً یہ جمع ہے۔ اس کا مادہ ذرأ ہے جس کے معنی تخلیق کرنا ہے۔ اس اعتبار سے اس کا اطلاق والدین پر بھی ہوتا ہے اور اولاد پر بھی۔ باپ سے بیٹا پیدا ہوتا ہے اور بیٹے سے باپ۔ یہ استعمال بہت کم ہے اور فقہاء کی تعبیر کے خلاف ہے۔ صاحب البحر المحیط کے قول کے مطابق بعضھا من بعض کا جملہ ذُرِّیَّۃ کی صفت ہے اور مِن حرف جار تبعیض (Splitting) حقیقی کے لیے ہے یعنی یہ نسل ایک دوسرے سے پھوٹی ہے۔ آل ابراہیم یعنی اسماعیل علیہ السلام اور اسحاق علیہ السلام اور ان کی اولاد اور آل عمران یعنی موسیٰ علیہ السلام، ہارون علیہ السلام اور عیسیٰ علیہ السلام دونوں آل ابراہیم کی نسل سے ہیں اور ابراہیم علیہ السلام اور نوح علیہ السلام، آدم علیہ السلام کی نسل سے ہیں۔ بعضھم من بعض میں نسل کے اتحاد اور یگانگت کی طرف اشارہ ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ یہودیت، عیسائیت اور مسلمان ایک ہی خاندان کے افراد ہیں۔ مولانا امین احسن اصلاحی فرماتے ہیں "آدم علیہ السلام، نوح علیہ السلام اور ابراہیم علیہ السلام سلسلہ نبوت کے اساطین اور عمائدین ہیں ان کا ذکر ہو گیا تو گویا نبوت کے سارے مبارک سلسلہ کا ذکر ہو گیا۔ اس سارے شجرے سے یہ دکھانا مقصد ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام بھی اس مبارک سلسلہ کی کڑی ہیں۔ یہ سارے خاندان ایک دوسرے سے پیوستہ و وابستہ اور ایک دوسرے کی ذریت (نسل) ہیں۔

یہ آیت بنیادی طور پر اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ بعضھا من بعض کی ترکیب باہمی پیوستگی اور یگانگت پر دلالت کرتی ہے ایک ہی شاخ سے پھوٹنے والے ایک دوسرے کا جزو ہوتے ہیں۔ اس لیے وہ ایک دوسرے کے مشابہ ہوتے ہیں ذات میں بھی صفات میں بھی۔ یہ اجزاء حسن و کمال میں، فضل و کرم میں اور پاکیزگی و نفاست میں ایک دوسرے کے مشابہ ہوتے ہیں۔

سورۃ آل عمران میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "فَاسْتَجَابَ لَهُمْ رَبُّهُمْ اَنِّیْ لَا اُضِیْعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰی بَعْضُكُمْ مِّنْ بَعْضٍ" (۳:۱۹۵) "تو ان کے پروردگار نے ان کی دعا

Marfat.com

قبول کی اس وجہ سے کہ میں تم میں سے کسی عمل کرنے والے کے عمل کو ضائع نہیں کرتا مرد ہو خواہ عورت۔ تم سب ایک دوسرے کا جزو ہو'۔

من ذکر و انثی

اس جملہ میں من (حرف جار) تفسیر اور بیان کے لیے ہے جیسا کہ قول 'فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْأَوْثَانِ' (الحج ۲۲:۳۰) یعنی 'تم لوگ گندگی سے یعنی بتوں سے کنارہ کش رہو'۔ اس جملے کا مطلب ہے کہ اجابت اور جزا میں مرد اور عورت کے درمیان کوئی فرق نہیں بشرطیکہ وہ اطاعت گزار ہوں۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ دین میں فضیلت کا معیار عمل ہے۔ کسی کا مرد اور کسی کا عورت ہونا اس سلسلہ میں اثر انداز نہیں ہوتا۔ روایت ہے کہ اُم سلمہ نے کہا! اے رسول اللہ ﷺ ہجرت کے بارے میں اللہ مردوں کا تو ذکر کرتا ہے عورتوں کا نہیں تو یہ آیت نازل ہوئی۔ حاکم نے صحیح میں ام سلمہ کی اس روایت کی تخریج کی ہے۔

بعضکم من بعض

یہ جملہ مبتدا اور خبر سے مل کر بنا ہے اور معترضہ ہے۔ اس جملہ میں حرف جار من حقیقی تبعیض کا فائدہ دیتا ہے اور بتاتا ہے کہ مرد اور عورت کی جامع ایک اصل ہے چنانچہ ہر ایک دوسرے کا جزو ہے۔ یہ جملہ اس سبب کو بیان کر رہا ہے جس کی وجہ سے اللہ کے وعدہ میں عورتیں مردوں کے ساتھ برابر کی شریک ہیں۔ اصل کا اشتراک مساویانہ طور پر اجر کے اشتراک کو واضح کر رہا ہے۔ جس طرح تم ایک دوسرے کا جزو ہو بالکل اسی طرح اجر اور ثواب میں بھی شریک ہو۔ عورت اور مرد انسانیت میں برابر ہیں اور میزان میں بھی برابر ہیں۔

بعضکم من بعض کی ایک سیدھی سی تفسیر تو وہ ہے جس کو ہمارے مفسرین کرام نے اختیار کیا ہے کہ مرد عورتوں سے ہیں اور عورتیں مردوں سے یعنی عورتیں مردوں سے پیدا ہوتی ہیں اور مردوں کو جنتی ہیں۔ اس کی ایک سائنٹفک تعبیر یہ ہے جس کی طرف اللہ کے اس قول میں اشارہ موجود ہے: 'إِنَّا خَلَقْنَا الْإِنسَانَ مِن نُّطْفَةٍ أَمْشَاجٍ' (الانسان ۷۶:۲) 'بیشک ہم نے انسان کو (مرد اور عورت) کے مخلوط نطفہ سے پیدا کیا'۔ ہر فرد خواہ مرد ہو یا عورت مرد اور عورت دونوں کے مادہ تولید سے مرکب ہوتا ہے۔ سائنس نے یہ ثابت کیا ہے کہ ہر مرد میں کچھ نسوانیت کے اجزا ہوتے ہیں اور ہر عورت میں کچھ مردانگی کے اجزا، جبھی تو جنسی تبدیلی کے نتیجہ میں مرد عورت بن جاتا ہے اور عورت مرد۔ حرف جار من مجازی معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے جیسے عربوں کا محاورہ ہے فلان منی یعنی فلاں آدمی میرے خلق اور سیرت پر ہے جیسا کہ اللہ کا قول ہے: 'فَمَن شَرِبَ مِنْهُ فَلَيْسَ مِنِّي' (البقرۃ ۲:۲۴۹) 'جو اس ندی سے پانی پی لے گا وہ مجھ سے نہیں'۔ اسی طرح رسول ﷺ کا قول ہے 'من غشنا فلیس منا' 'جس نے بھی دھوکہ دیا وہ ہم

Marfat.com

میں سے نہیں'۔ اس کا مطلب بھی یہی ہے کہ تم میں سے ہر ایک اطاعت میں ثواب کے لیے اور نافرمانی میں عذاب کے لیے بالکل دوسرے کی مانند ہے دونوں میں کوئی فرق نہیں۔

حاصل بحث یہ ہے کہ بعضکم من بعض کا جملہ اس لیے استعمال کیا گیا ہے تا کہ واضح ہو جائے کہ اللہ نے اپنے بندوں کے لیے جس اجر کا وعدہ کیا ہے اس میں عورتیں مردوں کے ساتھ برابر کی شریک ہیں کیونکہ ان کی اصل ایک ہے ان کی جنس ایک ہے اور وہ ایک جیسے سیرت و کردار کے حامل ہیں۔ یہ آیت مبارکہ اس بات پر نص قطعی کا درجہ رکھتی ہے کہ اللہ کے یہاں عورت اور مرد برابر ہیں۔ عورت کا مرتبہ مرد سے پست نہیں اہلیت، ذمہ داری اور امانت کی ادائیگی میں دونوں برابر ہیں۔ یہ کیسے نہ ہو مرد اور عورت ایک طرح سے تخلیق ہوئے ہیں۔ عورت نر بھی جنتی ہے اور مادہ بھی اور مرد نر کو بھی پیدا کرتا ہے اور مادہ کو بھی۔ مرد عورت کی اولاد ہے اور عورت مرد کی۔ اصل تخلیق کی بنیاد پر ایک کو دوسرے پر کیونکر فضیلت ہو سکتی ہے؟ اس فضیلت کا مدار صرف اور صرف ایمان اور عمل صالح پر ہے۔

اسلام نے مرد اور عورت کے مساویانہ مرتبہ کا نہ صرف اعتراف کیا ہے بلکہ اس پر زور دیا ہے اگر روحانی معاملات میں عورت اور مرد میں کوئی امتیاز نہیں تو رنگ و نسل اور مقام و مرتبہ میں کیسے امتیاز کیا جا سکتا ہے؟ مرد اور عورت ایک دوسرے کا جزو ہیں ان کا انسانی مرتبہ ایک جیسا ہے۔ اس سچائی کا اقرار اسلام نے چھٹی صدی عیسوی میں کر دیا تھا۔

مولانا امین احسن اصلاحی بعضکم من بعض کی تفسیر میں فرماتے ہیں: 'اثنائے کلام میں بالکل ضمنی طور پر اس بات کی دلیل بیان کی گئی ہے کہ کیوں اللہ کی میزان میں مرد اور عورت دونوں کا عمل یکساں وزن رکھتا ہے؟ اس لیے کہ عورت و مرد دونوں ایک جنس سے ہیں۔ دونوں آدم و حوا کی اولاد ہیں۔ دونوں ایک قسم کے گوشت پوست سے بنے ہوئے ہیں۔ ان دو لفظوں سے قرآن نے ان تمام جاہلانہ نظریات اور غلط مذہبی تصورات کی تردید کر دی جو عورت کو مرد کے مقابلہ میں فروتر مخلوق قرار دیتے تھے'۔ اسی ترکیب کا استعمال سورۃ نساء میں وسیع معنوں میں کیا گیا ہے۔ آزاد مرد اور آزاد عورت تو ایک دوسرے کا جزو ہو سکتے ہیں مگر حسب و نسب پر اترانے والی قوم یہ کیسے گوارا کر سکتی تھی کہ لونڈی کو بھی ان کا جزو قرار دیا جائے؟ اللہ نے یہ بات کہہ کر ان کا غرور توڑ دیا۔ ارشاد ربانی ہے: 'وَمَن لَّمْ يَسْتَطِعْ مِنكُمْ طَوْلًا أَن يَنكِحَ الْمُحْصَنَاتِ الْمُؤْمِنَاتِ فَمِن مَّا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُم مِّن فَتَيَاتِكُمُ الْمُؤْمِنَاتِ وَاللَّهُ أَعْلَمُ بِإِيمَانِكُم بَعْضُكُم مِّن بَعْضٍ' (النساء ۴:۲۵) 'جو شخص تم میں سے یہ مقدور نہیں رکھتا ہے کہ آزاد مومن عورتوں سے نکاح کرے تو ان عورتوں سے نکاح کرے جو (لڑائی کے قیدیوں میں سے)

Marfat.com

تمھارے قبضے میں آئی ہیں اور مومن ہیں اللہ تمھارے ایمان کو خوب جانتا ہے اور تم سب ایک دوسرے کا جزو ہو۔ مولانا آزاد فرماتے ہیں: "اس بات میں کوئی عیب نہ سمجھو کہ تم نے ایک ایسی عورت سے شادی کر لی جو لڑائی میں قید ہو کر آئی تھی اور لونڈی بنائی گئی تھی۔ اصل چیز ایمان ہے ہو سکتا ہے کہ ایک مومن لونڈی ایمان کے لحاظ سے بہتر درجہ رکھتی ہو اور ایک شریف زادی ایمانی فضائل سے محروم ہو اور تم انسان ہونے کے لحاظ سے ایک دوسرے کا جزو ہو"۔

بعضکم من بعض تبعیض حقیقی کی صورت میں مراد یہ ہے کہ اللہ کے ہاں نہ کوئی آزاد ہے نہ کوئی غلام۔ اس نے سب کو نفس واحدہ سے پیدا کیا اور پھر ان کو ایک دوسرے میں سے پیدا کیا۔ اس لیے لونڈیوں سے نکاح کرنے میں کوئی عار محسوس نہیں کرنی چاہیے کیونکہ وہ بھی تمھارا جزو ہیں۔ تم اور غلام ایک دوسرے سے پیوستہ ہو اور ایک دوسرے سے منسوب ہو کیونکہ تمھاری اصل ایک ہے۔ حضرت علیؓ کا شعر ہے:

الناس من جهة التمثيل اكفاء ابوهم آدم والأم حواء

تمثیلاً لوگ آپس میں برابر ہیں ان کا باپ آدم اور ماں حوا ہے

غلام اور لونڈیاں آزاد مرد اور آزاد عورتیں سب ایک ہی نسل انسانی کے افراد ہیں۔ ان کی اصل ایک ہے۔ رسول کریم ﷺ اور صحابہؓ کرام کا اسوہ بتاتا ہے کہ غلاموں اور لونڈیوں سے کھانے، پینے، لباس اور کام لینے میں ایسا سلوک کیا جاتا تھا جیسا کہ عام انسانوں سے کیا جاتا ہے۔ ایک مسلمان ہونے کی حیثیت سے ہمارا تعلق ایک امت سے ہے اور انسان ہونے کی حیثیت سے ہماری نسل ایک ہے۔ پھر آزاد یا لونڈی سے شادی کے وقت عزت اور توہین کا احساس کیونکر؟ ابن العربی نے احکام القرآن میں لکھا ہے کہ یہ آیت اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ غلام آزاد کے برابر ہے شرف میں اور عزت میں۔ اور عربوں کے اس قول کی تردید ہے کہ لونڈی کا بیٹا ھجین (کمینہ) ہوتا ہے کیونکہ اس کی ماں کا مقام گھٹیا ہے۔ یہ تصور یمنیوں نے مصریوں کے خلاف عربوں کی جہالت کی وجہ سے پیدا کیا کیونکہ حضرت اسماعیلؑ ہاجرہ کے بیٹے تھے۔ جن کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ باندی ہے۔ اگر عرب صاحب بصیرت ہوتے تو وہ اس تعبیر کو قبول نہ کرتے' اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا تین باتیں جاہلیت کی ہیں: "الطعن في الأنساب، والفخر بالأحساب، والاستسقاء بالأنواء" یعنی نسب پر طعنہ زنی کرنا، حسب پر فخر کرنا اور ستاروں سے بارش طلب کرنا"۔

واللہ أعلم بإيمانكم

Marfat.com

اللہ تمھارے ایمان کو خوب جاننے والا ہے اور اس ایمان کے باعث ایک کو دوسرے پر فضیلت دیتا ہے وہ آزاد اور لونڈی کی حالت اجتماعی کو خاطر میں نہیں لاتا۔ اس کے بعد بعضکم من بعض کا جملہ اس حقیقت کی تاکید کرتا ہے۔ اس ایمان کے تقاضوں کے مطابق عمل اللہ کے یہاں بندوں کے درجات کی حد بندی کرتا ہے اور ان کے مقام کو بلند کرتا ہے۔ انسان ہونے کے لحاظ سے سب انسان برابر ہیں۔ فضیلت کا معیار ایمان اور عمل ہے۔ کتنی ہی لونڈیاں ہیں جو آزاد عورتوں پر فوقیت لے جاتی ہیں اور کتنی ہی عورتیں ہیں جو مردوں پر فوقیت لے جاتی ہیں؟ دراصل فضیلت ایمان کی فضیلت ہے نہ کہ حسب ونسب کی۔

اس آیہ مبارکہ نے یہ ثابت کر دیا کہ انسان ہونے کے ناطے سے ہر انسان دوسرے کا جزو ہے نہ صرف آزاد عورت مرد کا جزو ہے بلکہ لونڈی بھی مرد کا جزو ہے۔ انسانی برادری کا رشتہ سب رشتوں سے زیادہ قابل لحاظ ہے۔ ایمان اور عمل اس رشتے کی نوک پلک درست کرتے ہیں۔

سورۃ توبہ کی دو آیات میں بعضکم من بعض کی ترکیب میں لفظی اور مجازی دونوں معانی کو یکجا کر دیا گیا ہے۔ اللہ کا ارشاد ہے: 'اَلْمُنَافِقُوْنَ وَالْمُنَافِقَاتُ بَعْضُهُم مِّن بَعْضٍ يَأْمُرُوْنَ بِالْمُنكَرِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمَعْرُوْف' (التوبۃ ۹:۶۷) 'منافق مرد اور منافق عورتیں ایک دوسرے کا جزو ہیں وہ برے کام کرنے کو کہتے ہیں اور اچھے کاموں سے روکتے ہیں'۔ پھر ارشاد ہوتا ہے: 'وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنَاتُ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ يَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ' (التوبۃ ۹:۷۱) 'اور مومن مرد اور مومن عورتیں ایک دوسرے کے دوست ہیں وہ اچھے کام کرنے کو کہتے ہیں اور برے کاموں سے روکتے ہیں'۔

پہلی آیت میں بعضھم من بعض سے مراد لفظی معنی ہیں یعنی نسلی اور جنسی طور پر وہ ایک دوسرے کا حصہ ہیں مگر مراد ان کا تشابہ ہے جس طرح ایک ہی چیز کے مختلف اجزاء میں تشابہ ہوتا ہے، گویا وہ سب ایک ہی ہیں۔ کیا مرد اور کیا عورتیں یعنی ظاہری ایمان اور باطنی کفر، بدی کا حکم دیتے ہیں اور نیکی سے روکتے ہیں۔ گویا کہ بعضھم من بعض کی تفسیر امر بالمنکر اور نہی عن المنکر ہے۔ حقیقت میں بھی اتحاد ہے اور صورت میں بھی جیسا کہ پانی اور مٹی میں ہوتا ہے۔

منافق مرد اور عورتوں کی سرشت ایک ہے۔ فطرت ایک ہے۔ بدنیتی، دھوکہ، فریب، بخل، بزدلی ان کی اصل صفات ہیں۔ منافق مرد اور عورتیں ایک دوسرے کے دوست نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ دوستی بہادری اور تعاون کی محتاج ہوتی ہے اور نفاق کی طبیعت ان صفات کے منافی ہے منافقین بکھرے ہوئے افراد ہیں نہ کہ ایک مضبوط پیوستہ جماعت۔ وہ خیانت کا ایک مجموعہ ہیں اور ان کیڑے مکوڑوں کی طرح ہوتے ہیں جن میں احساسات کا تبادلہ نہیں ہوتا اور نہ ان کی کوئی اجتماعی سوچ ہوتی ہے۔ نفاق ان کی

Marfat.com

انسانیت کو کریدڑالتا ہے۔

دوسری آیت میں **بعضھم من بعض** کے مقابلہ میں **بعضھم اُولیاء بعض** کی ترکیب ہے یعنی حقیقی تبعیض ان میں بھی پائی جاتی ہے اس کے ساتھ ساتھ ایمان کی بدولت وہ ایک دوسرے کے دوست ہوتے ہیں۔ نیکی کا حکم کرتے ہیں اور برائی سے روکتے ہیں۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ نفاق کا سبب آباؤ اجداد کی تقلید ہے۔ اس کا مدار رسم ورواج اور نفسانی خواہشات پر ہے جبکہ مومن مردوں اور عورتوں کی رفاقت، توفیق اور ہدایت کا نتیجہ ہے۔ اسی لیے منافقوں کے لیے صرف **بعضھم من بعض** اور مومنوں کے بارے میں اس سے بڑھ کر **بعضھم اُولیاء بعض** کہا گیا ہے۔ اسلوب بیان میں تغیر منافقوں کے برعکس باہمی مدد اور تعاون کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ اسی وجہ سے کم وبیش سب مفسرین نے کہا ہے کہ **بعضھم اُولیاء بعض، بعضھم من بعض** کے مقابلہ میں ہے ابن عطیہ کا قول ہے کہ منافقوں کے درمیان نہ ولایت ہے نہ شفاعت اور نہ وہ ایک دوسرے کو دعوت دیتے ہیں'۔

مومن مردوں اور عورتوں کے درمیان انسانیت تو مسلمہ طور پر موجود ہوتی ہے لیکن یہ وہ انسانیت ہے جو انسان کو ایک مستقل شخصیت عطا کرتی ہے عقل رسا اور قلب سلیم اس کی رہنمائی کرتا ہے تو صاحبان عقل رشید اور قلب سلیم کا باہمی اجتماع ہوتا ہے۔ بھلائی کے جھنڈے تلے مومن مرد اور مومن عورتیں فعال قوت بن کر اُبھرتے ہیں اور حق اور خیر کے لیے کوشاں ہوتے ہیں۔ باہمی دوستی اور اخوت کا تبادلہ ہوتا ہے۔ عورت کا مرد سے صرف ماں، بیٹی اور بہن کا رشتہ نہیں ہوتا بلکہ قرآن ان نسبی رشتوں کے علاوہ دونوں کے درمیان دوستی اور دینی اخوت کے رشتہ کو تسلیم کرتا ہے۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ ادا کرنے اور معاشرے کو سنوارنے کے لیے دوستی اور تعاون کے اس رشتہ کی بنیاد پر ان کو ایک دوسرے کے شانہ بشانہ کام کرنا ہے۔ قرآن حکیم نے دوستی کے اس رشتے کو اسی لیے نمایاں کیا ہے۔ دوستی کا رشتہ اہل ایمان میں موجود ہوتا ہے اور اہل نفاق میں مفقود۔

دوستی اور دینی اخوت کے اس رشتہ کو نبھانے کے لیے اسلام نے مردوں اور عورتوں کے لباس کی تراش خراش، چال ڈھال اور انداز گفتگو کے بنیادی اصول مقرر کیے ہیں تاکہ وہ معاشرے میں رہتے ہوئے مل جل کر یہ کار خیر انجام دے سکیں۔ اسلام کسی صنف کو چھپا ڈھانپ کر معاشرے سے باہر نہیں پھینکنا چاہتا۔

خلاصہ بحث یہ ہے کہ **بعضھم من بعض** کی قرآنی تعبیر مرد اور عورت کو انسانیت، صلاحیت، فطرت اور فرائض وحقوق میں مساوی قرار دیتی ہے اور اس بات کی سب سے اہم دلیل ہے کہ دونوں کے درمیان وجہ فضیلت ایمان اور عمل (تقویٰ) ہے مرد کو محض مرد ہونے کی وجہ سے قطعی کوئی فضیلت حاصل نہیں۔

Marfat.com

بنت۔ اِبنۃ (بیٹی)

لغوی مفہوم

یہ ابن (بیٹا) کی مؤنث ہے جو امام راغب کے قول کے مطابق اصل میں بَنَوٌ ہے کیونکہ اس کی جمع سالم بَنُون اور جمع مکسر اَبْنَاء آتی ہے۔لسان العرب میں ابوحنیفہ کا قول اور سیبویہ کی رائے نقل کی گئی ہے کہ یہ اصل میں بِنْوٌ فِعْلٌ کے وزن پر ہے۔اسی لیے ہم بنت کہتے ہیں کیونکہ اس کی واو کو تا میں بدل دیا گیا ہے۔چنانچہ بنت کے آخر میں تا، تائے تانیث نہیں ہے کیونکہ اس سے پہلے کا حرف ساکن ہے یہ ایک مستقل صیغہ ہے۔ابن کی مونث بنت بھی استعمال ہوتی ہے اور **اِبنۃ** بھی۔ان کی جمع **بنات** ہے۔یہ دونوں لغات ثعلب کے قول کے مطابق فصیح ہیں۔ ابن اور بنت دونوں کی نسبت بَنَوِیّ ہے۔

اس سلسلہ میں اہم بات یہ ہے کہ جب مرد اور عورت اکٹھے ہوں تو عربی زبان میں بنو (ابن کی جمع سالم) کا لفظ استعمال ہوتا ہے جیسے بنوتمیم یا قرآن حکیم میں بنواسرائیل اور بنوآدم۔اگر صرف ایک عورت کو کسی قبیلہ کی طرف منسوب کرنا ہو تو آپ کہیں گے اِمراۃ تمیم لیکن جمع کی صورت میں بنات تمیم نہیں کہیں گے بلکہ بنو تمیم کی ترکیب استعمال کریں گے۔اس کے برعکس غیر عاقل اسماء کی طرف نسبت کی صورت میں آپ کہیں گے ابن مخاض (اونٹنی کا ایک سالہ بچہ جو دوسرے سال میں داخل ہو گیا ہو) اور ابن لبون (اونٹنی کا دو سالہ بچہ جو تیسرے سال میں داخل ہو چکا ہو) ابن عِرس (نیولا) لیکن جمع کی صورت میں ہم مذکر مونث کے لیے بنو نہیں بلکہ بنات مخاض، بنات لبون اور بنات عِرس استعمال کریں گے۔آپ نے دیکھا کہ لغت میں بھی مذکر اور مؤنث میں زبردست اشتراک پایا جاتا ہے اور مؤنث کے لیے مذکر اور مذکر کے لیے مؤنث کے الفاظ استعمال ہوتے ہیں۔قرآن حکیم میں جہاں بنو کا لفظ استعمال ہوا ہے جیسے بنواسرائیل اور بنوآدم اس میں مرد اور عورت دونوں شامل ہیں۔اس طرح اَبْنَاء (بیٹے) کا لفظ بیٹے اور بیٹیوں دونوں کے لیے قرآن میں استعمال ہوا ہے۔معجم مقاییس اللغۃ نے بنو کے اصل معنی ایک چیز کے دوسری چیز سے پیدا ہونے کے دیئے ہیں۔امام راغب کا قول ہے چونکہ ابن (یا بنت) اپنے باپ کی عمارت ہوتا ہے اسی لیے اسے اِبن (یا بنت) کہا جاتا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے باپ کو ان کا بانی بنایا ہے اور بیٹے بیٹی کی تخلیق میں باپ بمنزلہ معمار ہوتا ہے اور ہر وہ چیز جو دوسری کے سبب اس کی تربیت، دیکھ بھال اور نگرانی سے حاصل ہو، اسے ابن (بنت) کہا جاتا ہے نیز جسے کسی چیز سے لگاؤ ہو، اسے اس کا ابن (بنت) کہا جاتا ہے جیسے

Marfat.com

بِنتُ الشفۃ (ہونٹ کی بیٹی) کلمہ کو، بِنتُ الأرض (زمین کی بیٹی) کنکری کو، بِنتُ العین (آنکھ کی بیٹی) آنسو کو، بِنتُ الکرم (انگور کی بیٹی) شراب کو، بَنَاتُ الدھر (زمانے کی بیٹیاں) سختیوں کو، بَنَاتُ الصدر (سینے کی بیٹیاں) افکار کو، بَنَاتُ اللیل (رات کی بیٹیاں) خوابوں کو اور بَنتُ الأرض (زمین کی بیٹیاں) چھوٹی چھوٹی ندیوں کو ابنۃ الجبل (پہاڑ کی بیٹی) گونج کو کہا جاتا ہے۔

قرآن حکیم نے جہاں جہاں المال والبنون کی ترکیب استعمال کی ہے وہاں بنون کے لفظ میں بنات (بیٹیاں) بھی شامل ہیں اور اس سے مراد مال اور اولاد ہے۔ صرف ایک آیت مبارکہ میں أنعام (مویشی) اور بَنِیْن (۱۳۳:۲۶) کی ترکیب استعمال ہوئی ہے وہاں بھی لفظ بنین میں بیٹے اور بیٹیاں دونوں شامل ہیں جن آیات میں المال والبنون کی ترکیب استعمال ہوئی۔ ہے اُن کی ترتیب یہ ہے: (۷۲:۱۶)؛ (۶:۱۷)؛ (۴۶:۱۸)؛ (۵۵:۲۳)؛ (۸۸:۲۶)؛ (۱۴:۶۸)؛ (۱۲:۷۱)؛ (۱۳:۷۴)۔ اسی طرح قرآن حکیم کی آیات (۱۳۲:۲ تا ۱۳۳)؛ (۶:۳۶)؛ (۱۱:۷۰)؛ (۳۶:۱۸) میں بنی کا لفظ بیٹے اور بیٹی دونوں کے لیے استعمال ہوا ہے اور آیت نمبر (۲۴۱:۲) میں ابناء کا اطلاق بیٹے اور بیٹیوں دونوں پر ہوا ہے۔

بنو آدم

قرآن حکیم میں متعدد مقامات پر عورت اور مرد سمیت نسل انسانی کو بنی آدم کہہ کر مخاطب کیا گیا ہے۔ آدم کی طرف نسبت میں یہ بلاغت ہے کہ اس سے آدم و ابلیس کی سرگزشت کی یاددہانی ہوتی ہے جو تمام نسلِ آدم کی مشترک سرگزشت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان آیات میں بنی آدم کو ایسے مخاطب کیا ہے جیسا کہ دُور کسی آدمی کو مخاطب کیا جاتا ہے کیونکہ نزولِ قرآن کے وقت عرب و عجم فطرت سلیم سے دور ہو چکے تھے۔ اللہ نے اس خطاب سے ان کے اذہان کو جھنجوڑا ہے یہ بتانے کے لیے کہ آدم اور حوا سے پہلی غلطی ابلیس کے بہکانے پر سرزد ہوئی۔ مرد اور عورت دونوں شیطانی وسوسوں کی زد میں ہیں اور اگر وہ قوانینِ خداوندی کی نگہداشت کریں گے تو ان وسوسوں سے بچے رہیں گے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: 'یَا بَنِیْ آدَمَ قَدْ أَنزَلْنَا عَلَیْكُمْ لِبَاساً یُوَارِیْ سَوْءَاتِكُمْ وَرِیْشاً وَلِبَاسُ التَّقْوَىَ ذَلِكَ خَیْرٌ ذَلِكَ مِنْ آیَاتِ اللّهِ لَعَلَّهُمْ یَذَّكَّرُونَ' (الأعراف ۲۶:۷) 'اولاد آدم بیشک ہم نے تم پر لباس اُتارا جو تمھاری ستر پوشی کرتا ہے اور زینت کا ذریعہ بھی اور تقویٰ کا لباس یہی بہتر ہے۔ یہ اللہ کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے تاکہ لوگ نصیحت حاصل کریں'۔ جب اللہ نے آدم اور حوا کو زمین پر اترنے کا حکم دیا اور ان کے لیے ٹھکانا بنایا تو اللہ نے ہر وہ چیز پیدا کی جس کی ان کو

Marfat.com

ضرورت تھی ان میں سے لباس بھی ہے۔ اس طرح اللہ نے مخلوق کے لیے اپنے عظیم انعام سے آگاہ کیا۔ ان کے لیے لباس پیدا کیا جو ان کی پردہ پوشی بھی کرتا ہے اور انھیں زینت بخشتا ہے تاکہ وہ زمین پر چین سے رہ کر اپنے ماحول سے لطف اندوز ہو سکیں۔ لباس کے لیے اُتارنے کا فعل اسی لیے استعمال ہوا کیونکہ لباس کا مواد مثلاً روئی، اون اور ریشم اس بارش سے پیدا ہوا جو آسمان سے اُترتی ہے۔ اور اس میں لباس بنانے کا طریقہ بھی شامل ہے گویا زراعت، بافت اور سینے سے آگہی بھی اس نعمت میں شامل ہے۔ ستر کی عریانی کے ذکر کے بعد یہ آیات بطور تسلسل وارد ہوئی ہیں تاکہ اس احسان کا اظہار ہو جو اللہ نے بنی آدم پر لباس کی صورت میں کیا ہے۔ برہنگی اور عریانی تو انسانیت کی رسوائی اور توہین ہے اور ستر پوشی انسانیت کی تکریم اور عزت کا باعث ہے۔

جو چیز پہنی جائے اس کے پورے جسم یا اس کے کچھ حصے کو ڈھانپنے اور لپیٹنے کو لباس کہا جاتا ہے۔ اس چیز پر لباس کا لفظ بولا جاتا ہے جو انسان کے عیوب پر پردہ ڈال سکے چنانچہ میاں بیوی میں سے ایک کو دوسرے کا لباس قرار دیا گیا ہے (۲:۸۷)۔ کیونکہ وہ ایک دوسرے کو برائیوں کے ارتکاب سے روکتے ہیں۔ اور رات کو اپنے بندوں کے لیے بمنزلہ لباس ٹھہرایا ہے (۷۸:۱۰)۔ یہاں لباس کا ذکر اس لیے کیا گیا ہے کہ اس میں انسان کی عقلی زندگی کا سب سے پہلا مظاہرہ ہے جب وہ لباس پہننے لگا تو گویا اس بات کا اعلان کر رہا تھا کہ اس کا اخلاقی شعور اُبھر آیا ہے وہ صنعت و اختراع کی راہوں سے آشنا ہو گیا ہے۔ آیہ مبارکہ میں تین قسم کے لباسوں کا ذکر ہے۔ ایک وہ ادنیٰ لباس جو انسان کی شرمگاہوں کو لوگوں کی نگاہوں سے بچاتا ہے۔ اس ادنیٰ لباس سے محروم انسان ذلیل و خوار ہوتا ہے کیونکہ یہ لباس محض معاشرے کا دستور نہیں یہ وہ فطرت ہے جس پر اللہ نے انسان کو پیدا کیا ہے۔ سوأۃ شرم گاہ کا کنایہ ہے کیونکہ جسم کے اس حصے کو ننگا کرنا انسان کو فطرتاً برا لگتا ہے۔ ابن عباس سے روایت ہے کہ مشرک حج کے وقت ننگے ہو کر خانہ کعبہ کا طواف کرتے اور سیٹیاں اور تالیاں بجاتے تھے۔ اسی غیر فطرتی کام کو اللہ کفر کی طرف منسوب کرتا ہے اور ان کو عذاب کی دھمکی دیتا ہے (۸:۳۵)۔

دوسری قسم کا لباس زینت کا لباس ہے اس لباس کو استعارۃً ریش کہا گیا۔ یہ لفظ لباس پر معطوف ہے جس کا مطلب ہے کہ یہ اس لباس کے علاوہ ہے جو ستر پوشی کرتا ہے۔ ریش کے معنی پرندے کے پر ہیں، جس طرح وہ ہر پرندے کو حسن عطا کرتے ہیں اسی طرح یہ لباس انسان کو زینت عطا کرتا ہے کیونکہ زینت کو بھی اللہ نے ایک صحیح مقصد ٹھہرایا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور گھوڑے، خچریں اور گدھے پیدا کیے تاکہ تم ان پر سوار ہو اور وہ زینت کا سامان بنیں (۱۶:۸)۔ زینت کا سامان مرد اور

Marfat.com

عورت کو زینت و جمال بخشتا ہے اور وہ اس سے اپنی مساجد اور مجالس میں زینت حاصل کرتے ہیں اور انھیں کوئی حرام قرار نہیں دے سکتا (۳۲:۷)۔ اللہ نے ان چیزوں کو کشش کا باعث بنایا ہے۔ یہ تصور کہ یہ دنیاوی چیزیں ہیں ان سے قطع تعلق کر لینا چاہیے قطعی غلط ہے۔ اگر ان کے استعمال میں حدود سے تجاوز نہ کیا جائے تو یہ سب خیر ہی خیر ہیں۔ دُنیا کا سامان زیب و زینت اللہ کی نعمت ہے بس دینداری کا تقاضا یہ ہے کہ اسے کام میں لایا جائے نہ کہ اس سے گریز کیا جائے۔ اللہ کی عبادت سامان زینت سے آراستہ ہو کر کرنی چاہیے۔ لباس زینت ادنیٰ اور اعلیٰ لباس کے درمیان کا لباس ہے۔

تیسری قسم کا لباس تقویٰ کا لباس ہے۔ امام طبری کا قول ہے کہ اس سلسلہ میں سب سے بہترین قول ابن عباس کا ہے جو لباس التقویٰ کو عین تقویٰ سمجھتے ہیں یعنی برائی سے رکنے اور بھلائی کو کرتے وقت اللہ کے خوف کا احساس۔ اس طرح اس میں ایمان، عمل صالح، شرم و حیا اور حسن سمت کا مفہوم شامل ہے۔ جس اللہ نے ہمارے جسموں کی حفاظت اور زینت کے لیے ظاہری لباس بہم پہنچایا اس نے انسان کی روحانی کمزوری اور اخلاقی عیوب پر پردہ پوشی اور اس کی روحانی زینت کے لیے باطنی اور معنوی لباس بھی اُتارا جس کو تقویٰ کے لباس سے تعبیر کیا گیا ہے۔ یہ دونوں لباس لازم و ملزوم ہیں۔ اللہ کے خوف اور اس سے حیا کے شعور کی وجہ سے جسم کی عریانی بری محسوس ہوتی ہے۔ جو اللہ سے ڈرتا نہیں اور اس سے شرم نہیں کھاتا اس کے یہاں عریانی کوئی برائی نہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ آدمی ظاہری لباس کو اس باطنی لباس کی تحریک سے اختیار کرتا ہے اگر یہ نہ ہو تو انسان کپڑے پہن کر بھی ننگا رہتا ہے۔ شیطان اپنے وسوسوں سے پہلے لوگوں کو اس باطنی لباس سے محروم کرتا ہے۔ اس لباس کے اُترنے سے وہ حیا ختم ہو جاتی ہے جو اس کے ظاہری لباس کی محرک ہوتی ہے۔ بے حیائی صنفی اعضاء میں، جن کا چھپانا فطرت ہے، عریاں ہونے کی تڑپ پیدا کرتی ہے اس لیے اللہ کا فرمان ہے کہ یہی لباس بڑھیا لباس ہے۔

ان آیات میں ایک اور قابل غور نکتہ یہ ہے کہ بار بار یا بنی آدم کہا گیا ہے۔ مقام وعظ و نصیحت میں خدا کا تکرار تنبیہ اور تاثیر کا ایک زبردست انداز ہے جس سے انسان اس تنبیہ اور تاثیر کو خود بخود اپنے دل میں محسوس کرنے لگتا ہے۔ سورۃ احقاف میں بار بار یاقومنا، یاقومنا کہہ کر وعظ و نصیحت کی گئی ہے۔ عربی اسلوب بیان میں انسان کو اس جدامجد کی طرف منسوب کیا جاتا ہے جو قبیلے کا سردار ہو۔ یہ ضروری نہیں کہ وہ اس کا براہ راست باپ ہو۔ یہاں نوع انسانی کو آدم کی طرف منسوب کر کے اس بات کی طرف توجہ دلائی گئی کہ نوع انسانی مرد اور عورت سمیت ایک نسل سے تعلق رکھتے ہیں ان میں کوئی اونچ نیچ نہیں۔

Marfat.com

اولادِ آدم یعنی مردوں اور عورتوں کو تعلیم دی گئی کہ وہ زیب و زینت سے آراستہ ہوکر اللہ کی عبادت کریں۔ پیروانِ مذاہب سمجھتے تھے کہ روحانی سعادت جبھی مل سکتی ہے کہ دنیا کو تیاگ دیا جائے اور خدا پرستی کا تقاضا ہے کہ زینتوں اور زیبائشوں سے کنارہ کشی اختیار کی جائے۔ ترکِ زینت کا یہ مسلک خلافِ قرآن ہے۔ اللہ نے زمین پر جو کچھ پیدا کیا ہے سب انسانوں کے لیے ہے۔ اس لیے انھیں حکم ہے کھاؤ پیو۔ زینت زیبائش کی تمام نعمتیں کام میں لاؤ مگر حد سے تجاوز نہ کرو۔ دنیا نہیں بلکہ دنیا کا بے اعتدالانہ استعمال روحانی سعادت کے خلاف ہے۔ یہ تصور غلط ہے کہ اطاعت خداوندی کے لیے ترکِ دنیا اور ترکِ زینت ضروری ہے۔ یہی نہیں کہا گیا کہ زندگی کے تمام کاموں میں حسن و جمال کو ملحوظ رکھو بلکہ یہاں تک کہہ دیا گیا ہے کہ اطاعت خداوندی نہایت ہی حسین طریقے سے بجالاؤ۔ اگر زینت کا یہ حکم نہ ہوتا جو اللہ نے اپنے بندوں پر واجب قرار دیا ہے تو بہت سی اقوام بربریت سے تمدن کی طرف منتقل نہ ہوتیں۔ زینت کا یہ حکم دینی اور مدنی اصلاح کے لیے اصل اصول کا درجہ رکھتا ہے۔ بہت سے بت پرست وحشی افریقی قبائل، کیا مرد اور کیا عورت برہنہ رہتے تھے۔ جہاں جہاں اسلام پہنچا اس نے کپڑے پہننے کا تمدن سکھایا۔ اگر یہ متمدن دین زیب و زینت کو شریعت قرار نہ دیتا تو بہت سے قبائل اور بہت سی اقوام وحشت سے بلند و بالا تمدن کی طرف کبھی منتقل نہ ہوتیں۔ جہاں جہاں اسلام جڑ پکڑتا گیا۔ وہاں وہاں انسانیت کے شایانِ شان ستر اور زینت رواج پذیر ہوگئی اور جہاں جہاں اسلام جڑ پکڑ نہ سکا وہاں ابھی تک صرف شرم گاہ کو ڈھانپا جاتا ہے جیسے آسام کی مسلمان عورتیں ڈھانپتی ہیں۔

ارشادِ ربانی ہے: ’’يَا بَنِيْٓ آدَمَ خُذُوْا زِيْنَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ وَّكُلُوْا وَاشْرَبُوْا وَلَا تُسْرِفُوْا إِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِيْنَ ۝ قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْٓ أَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّيِّبَاتِ مِنَ الرِّزْقِ قُلْ هِيَ لِلَّذِيْنَ آمَنُوْا فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا خَالِصَةً يَّوْمَ الْقِيَامَةِ كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْآيَاتِ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ۝‘‘ (الأحزاب ۷: ۳۱ تا ۳۲) ’’اے اولادِ آدم! عبادت کے ہر موقع پر اپنی زینت کو لے لیا کرو۔ اور کھاؤ پیو مگر حد سے نہ گزر جاؤ۔ وہ حد سے گزرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ کہہ دیجیے کس نے اللہ کی زینت جسے اس نے اپنے بندوں کے لیے پیدا کیا ہے اور کھانے کی ستھری چیزوں کو حرام کیا ہے۔ کہہ دیجیے وہ دنیا کی زندگی میں ان لوگوں کے لیے ہیں جو ایمان لائے، قیامت کے دن خالص (ان کے لیے) اس طرح ہم تمام آیات کو ان لوگوں کے لیے کھول کھول کر بیان کرتے ہیں جو جاننے والے ہیں۔

شانِ نزول

مسلم نے صحیح میں، نسائی اور بیہقی نے ابن عباس سے روایت کی ہے کہ عورتیں رات کے وقت برہنگی کی

Marfat.com

حالت میں بیت اللہ کا طواف کرتی تھیں۔ صرف اپنی شرم گاہ پر ایک خرقہ رکھ لیتی تھیں اور یہ شعر پڑھتی جاتی تھیں:

الیوم یبدو کلہ أو بعضہ
وما بدا منہ لا أحلہ

"آج سارے کا سارا جسم یا اس کا کچھ حصہ نمایاں ہوگا
اور جو حصہ نمایاں ہوگا اُسے مباح نہیں کروں گی"۔

اس پر ان آیات کا نزول ہوا۔ سعید بن جبیر سے روایت ہے: "کہ لوگ بیت اللہ کا طواف ننگے ہو کر اس لیے کرتے تھے کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ ان کپڑوں میں طواف کرنا درست نہیں جنھیں پہن کر اُن سے گناہ سرزد ہوئے ہیں۔ زہری سے روایت ہے کہ حمس (قریش کا لقب) اور ان کے حلیفوں کے علاوہ سب لوگ عریانی کی حالت میں بیت اللہ کا طواف کرتے تھے۔ اگر قریش میں سے کوئی انھیں عاریۃً لباس دینے کے لیے تیار ہوتا تو وہ ان کے کپڑے پہن کر طواف کر لیتے تھے وگرنہ ننگے ہو کر طواف کرتے تھے۔ گویا وہ کپڑے اتارنے کو گناہ اتارنے کے برابر سمجھتے تھے۔ اگر کوئی کپڑے پہن کر طواف کرتا تو اسے پیٹا جاتا اور اس سے کپڑے چھین لیے جاتے تھے۔ چنانچہ جب مسلمان کپڑے پہن کر طواف کرنے لگے تو مشرکین ان کو طعنہ دیتے تھے۔ حرم پر اپنی اجارہ داری کی وجہ سے قریش عام لوگوں کا استحصال کرتے تھے۔ ان حالات میں زینت اختیار کرنے کا حکم ہوا۔ یہ آیات مبارکہ زمانۂ جاہلیت کو باطل اور کپڑے پہننے کو زینت کے لیے واجب قرار دیتی ہیں۔ قریش کہتے ہیں کہ ہم اہل حرم ہیں اس لیے کوئی ہمارے کپڑے پہنے بغیر طواف نہیں کر سکتا اور جو ہماری سرزمین میں داخل ہو صرف ہمارا کھانا کھائے جس کا کوئی دوست مکہ میں نہ ہوتا جو اسے عاریۃً کپڑے دے اور نہ وہ اتنا مالدار ہوتا کہ اجرت پر کپڑے لے تو برہنہ طواف کرنے پر مجبور ہوتا یا طواف کر کے اپنے کپڑوں کو اتار پھینکتا۔ زینت سے مراد وہ چیز ہے جس سے زیب و زیبائش حاصل ہو خواہ وہ لباس ہو یا اور کوئی چیز۔ یہ زینت عبادت کے ساتھ مخصوص ہے۔ اس لیے اس میں ستر پوشی کا مفہوم شامل نہیں کیونکہ وہ حکم مطلق ہے اور عبادت کے ساتھ خاص نہیں۔ نماز پڑھتے وقت اور طواف کرتے وقت یہ زینت استعمال کی جائے گی۔ حضرت حسنؓ سے روایت ہے کہ جب وہ نماز کے لیے کھڑے ہوتے تو بہترین کپڑے پہنتے۔ ان سے پوچھا گیا: کہ آپ اتنے بہترین کپڑے کیوں پہنتے ہیں تو آپ نے جواب دیا کہ اللہ صاحب جمال ہے اور جمیل چیزوں کو پسند کرتا ہے۔ اس لیے میں اپنے رب کے لیے خوبصورت بنتا ہوں۔ اس کا فرمان ہے: "خذوا زینتکم

Marfat.com

عند کل مسجد۔اس زینت میں بقول امام جعفر صادق کنگھی کرنا بھی شامل ہے۔زینت میں عدم اسراف شرط ہے۔زینت سے محبت تہذیب وتمدن کا لازمہ ہے۔یہ فی نفسہ مذموم نہیں لیکن اس میں اسراف مذموم ہے۔زیب وزینت میں طویل وقت صرف کرنا اسراف میں داخل ہے کیونکہ اس کی وجہ سے انسان دین ودنیا کے اہم معاملات سے غافل ہو جاتا ہے۔مشرکین عرب ایام حج میں تری سے پرہیز کرتے تھے اور اتنے کھانے پر اکتفا کرتے تھے جس سے جسم وجان کا رشتہ قائم رہے۔ایسا وہ حج کی تعظیم کی وجہ سے کرتے تھے۔ان کو حکم ہوا کھاؤ پیو مگر حد سے نہ بڑھو یعنی اس چیز کو حرام کرنے میں جو اللہ نے حرام نہیں کی اسراف نہ کرو۔جس طرح اللہ نے اخلاق حسنہ کی طرف توجہ دلائی ہے اسی طرح کھانے پینے کے متعلق بھی ہدایت فرمائی اور چار پانچ لفظوں میں علم طب کا اصول بتا دیا یعنی کھانے پینے میں افراط وتفریط سے بچو مثلاً خاص قسم کی چیزیں کھانا اور خاص قسم کی چیزوں کو چھوڑ دینا اسراف میں داخل ہے۔گوشت کھاتا ہے تو سبزی نہیں کھاتا۔ضرورت سے زیادہ کھانا یا جس قدر ضرورت ہو اس سے کم کھانا سب افراط وتفریط میں داخل ہے۔کھانے پینے میں اعتدال نہ صرف جسمانی صحت کو قائم رکھنے والی چیز ہے بلکہ اس سے انسانی حیوانی خواہشات حالت اعتدال پر آجاتی ہیں۔میانہ روی بہترین عادت ہے۔ابونعیم نے حضرت عمر بن الخطاب سے روایت کی ہے کہ بسیار خوری سے بچو کیونکہ وہ محبت کو تباہ کرتی ہے بیماری کا باعث بنتی ہے اور نماز میں سستی پیدا کرتی ہے۔تم پر میانہ روی لازم ہے کیونکہ یہ جسم کے لیے موزوں تر ہے اور اسراف سے دور کرتی ہے۔اللہ تعالیٰ موٹے پروہت اور پنڈت سے نفرت کرتا ہے اور آدمی اس وقت تک ہلاک نہیں ہوتا جب تک وہ اپنی شہوت کو دین پر ترجیح نہیں دیتا۔

اللہ تعالیٰ نے محض زینت اختیار کرنے کے حکم پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ اس زینت کو جو اللہ کی ایک نعمت ہے، حرام قرار دینے کی مذمت فرمائی۔قرآن حکیم نے زینت کو زینۃ اللّٰہ (اللہ کی زینت) کہہ کر اس کی اہمیت اور اللہ کے احسان کو واضح کیا ہے۔یہاں زینت سے مراد وہ تمام چیزیں ہیں جو ضروریات سے زائد ہوں مثلاً اچھا لباس، اچھا کھانا اور معیشت کی تمام بے ضرر آسائشیں اور لذتیں۔اس آیہ مبارکہ میں ان لوگوں کو جو زینت کو حرام قرار دیتے ہیں اللہ نے چیلنج کیا ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ اس قسم کی ذہنیت رکھنے والے اللہ کے غیض وغضب کا موجب ہیں۔یہ آیہ مبارکہ قرآن کا ایک انقلاب انگیز بیان ہے جس نے انسان کی دینی ذہنیت کی بنیادیں الٹ دیں۔اس سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ قرآن حکیم نے انسانی زندگی کے جمالیاتی پہلو کو کس قدر اہمیت دی ہے۔اچھی چیزوں کا استعمال خلاف شریعت نہیں۔رسول کریم ﷺ انتہائی سادگی سے رہتے تھے ان کی غذا بھی سادہ تھی، لباس بھی سادہ اور رہائش بھی

Marfat.com

سادہ۔ لیکن اگر کھانے کے لیے کوئی اچھی چیز آ جائے تو اسے رد نہ کرتے تھے۔ پہننے کے لیے اچھا کپڑا مل جائے تو اسے پھینک نہ دیتے تھے۔ مسلمان افراط وتفریط کا شکار ہیں۔ ایک گروہ تو دنیا کی آسائش میں اتنا منہمک ہے کہ اس سے اوپر نظر نہیں اٹھتی اور ایک گروہ ایسا بھی ہے جو صاف کپڑا پہننا، صاف جسم رکھنا اور اچھا کھانا کھانا حرام سمجھتا ہے۔ اللہ کا ارشاد ہے کہ دنیا میں یہ نعمتیں سب کے لیے ہیں مگر قیامت میں وہ خالصتاً مومنوں کے لیے ہوں گی یعنی دنیا کی نعمتوں میں رنج وحزن کی آمیزش ہوتی ہے جبکہ قیامت کی نعمتیں رنج وحزن سے پاک ہوں گی۔ مولانا امین احسن اصلاحی اپنی تفسیر تدبر قرآن میں فرماتے ہیں کہ 'قرآن کا سارا فلسفہ درحقیقت انسان کی فطرت پر مبنی ہے۔ اس کا دعویٰ ہے کہ وہ جن عقائد واعمال اور جن اچھائیوں اور نیکیوں کی تعلیم دیتا ہے اور جن برائیوں سے روکتا ہے ان میں سے کوئی چیز بھی اس کے خارج سے اس پر لادی نہیں جا رہی ہے بلکہ اسے انہی باتوں کی یاددہانی کرائی جا رہی ہے جو اس کی اپنی فطرت کے اندر ودیعت ہیں۔۔۔ قرآن نے اسی وجہ سے اپنے آپ کو ذکر اور ذکریٰ کہا ہے، جس کے معنی یاددہانی کے ہیں اور اپنی تعلیم ودعوت کو تذکیر کے لفظ سے تعبیر کیا ہے جس کے معنی فراموش کرنا یا نظرانداز کردہ حقائق کے یاد دلانے کے ہیں، گویا کہ ایک اللہ کی ربوبیت کا اعتراف انسان کی فطرت ہے۔ وہ فطرت جو اللہ نے اس کے وجود میں رکھ دی ہے اور اسی وجود کے باعث اور اس وجود کے اعماق میں اس حقیقت کے شعور کے باعث وہ اپنا گواہ آپ ہے یہ قانون فطرت ہی وہ پیمان وفا ہے جو فطرت اور خالق فطرت کے درمیان بندھا ہوا ہے۔ یہی پیمان ابتدائے آفرینش سے ہر زندہ خلیے کے اندر ودیعت کیا گیا ہے۔ یہ پیمان رسولوں اور رسالت سے قدیم تر ہے۔ اس لیے ہر زندہ خلیہ (Living Cell) اللہ کی ربوبیت کا گواہ ہے۔ وحی الٰہی اس نور فطرت کی معاون بن کر اس کی تکمیل کرتی ہے۔ فطرت انسانی کی اصل آواز 'بلیٰ' یعنی تصدیق ہے انکار نہیں۔ اسی لیے کوئی انسان اپنی غفلت کے لیے معذور نہیں سمجھا جا سکتا کیونکہ اس کے وجود سے باہر گمراہی کے کتنے ہی موثرات جمع ہو جائیں لیکن اس کی فطرت کی اندرونی آواز کو دبایا نہیں جا سکتا بشرطیکہ وہ خود اس کے دبانے کے درپے نہ ہو جائے اور اس کی طرف سے کان بند کر لے۔ مختصر یہ کہ اللہ کے رب مطلق ہونے پر ہر کوئی خود برہان ہے'۔

یہاں اس بات کی طرف اشارہ کرنا ضروری ہے کہ الذریۃ سے مراد انسان کی نر اور مادہ نسل ہے گویا کہ فطرت اور اس فطرت کا شعور، اوراک اور احساس مردوں اور عورتوں کے اندر یکساں ودیعت کیا گیا ہے۔ اس سے دو حتمی نتائج نکلتے ہیں۔ ایک تو یہ کہنا غلط ہے کہ عورت مرد کی نسبت بدی سے قریب اور نیکی سے دور ہوتی ہے یا مرد اس سے بڑھ کر اللہ کی ربوبیت کا اقرار کرتا ہے کیونکہ وہ توہم پرست ہوتی ہے

Marfat.com

دوسرے یہ کہ بنی آدم یعنی عورتوں اور مردوں نے مل جل کر اس فطرت کا اظہار کرنا ہے اور اللہ کی ربوبیت کی گواہی دینی ہے۔ اگر دونوں کو الگ الگ خانوں میں بند کر دیا جائے تو انسانی فطرت کا اظہار اور اللہ کی ربوبیت کی گواہی کا فریضہ کیسے ادا ہوگا؟ قرآن حکیم نے مرد اور عورت کے امتیاز کے بغیر بنی آدم کو مخاطب کیا ہے جس کا واضح مطلب یہ ہے کہ انھوں نے ان احکام کی پابندی بھی مل جل کر کرنی ہے۔

چونکہ اس آیہ مبارکہ سے پہلے اس عہد کا ذکر ہے جو دین کے اتباع کا بنی اسرائیل سے لیا گیا تھا اس لیے یہاں واضح کر دیا کہ پیغمبروں کی ہدایت کوئی نیا پیغام انسان کو نہیں دیتی وہ اس اعتقاد کی تجدید کرتی ہے جو روز اول سے فطرت انسانی میں ودیعت کر دیا گیا۔ اس کا دائرہ سب انسانوں پر محیط ہے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: وَإِذْ أَخَذَ رَبُّكَ مِن بَنِي آدَمَ مِن ظُهُورِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَأَشْهَدَهُمْ عَلَىٰ أَنفُسِهِمْ أَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ قَالُوا بَلَىٰ شَهِدْنَا أَن تَقُولُوا يَوْمَ الْقِيَامَةِ إِنَّا كُنَّا عَنْ هَٰذَا غَافِلِينَ ○ أَوْ تَقُولُوا إِنَّمَا أَشْرَكَ آبَاؤُنَا مِن قَبْلُ وَكُنَّا ذُرِّيَّةً مِّن بَعْدِهِمْ أَفَتُهْلِكُنَا بِمَا فَعَلَ الْمُبْطِلُونَ ○ ' (الاعراب ۷:۱۷۲ تا ۱۷۳) 'اور جب تیرے رب نے بنی آدم (یعنی) ان کی پیٹھوں سے ان کی اولاد نکالی اور ان کو اپنے اوپر گواہ ٹھہرایا (پوچھا) کیا میں تمھارا رب نہیں؟ انھوں نے کہا ہاں! ہم گواہ ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ قیامت کے دن کہو ہم تو اس سے بے خبر تھے۔ یا کہو صرف ہمارے باپ دادا نے پہلے شرک کیا۔ ہم ان کے پیچھے (ان کی) اولاد تھے۔ تو کیا تو ہم کو اس کی وجہ سے ہلاک کرتا ہے جو غلط کاروں نے کیا؟

مولانا اصلاحیؒ نے بڑے پتے کی بات کہی کہ حرف إِذْ (جب) کے ذریعہ سے ایسے امر واقعی کی یاد دہانی کی جاتی ہے جو متکلم کے نزدیک ایک حقیقت ہو اور مخاطب اسے فراموش کیے ہوئے ہوں یا اس سے منحرف ہو گئے ہوں'۔

بنو آدم سے مراد وہ اولاد ہے جو پشت ہائے پشت سے مرد یا عورت، مومن یا کافر پیدا ہوتے رہے گویا کہ یہ نوع بشری کا اسم ذات ہے مراد اصل سے فرع کا اخراج ہے۔

من ظھورھم (ان کی پیٹھوں سے)

بنی آدم سے بدل ہے اور تقدیر کلام یوں ہے جب تیرے رب نے بنی آدم کی اولاد کی پیٹھوں (نسلوں) سے اپنی ربوبیت کا عہد لیا۔ بدل لانے کا مقصد اس حقیقت کا اظہار ہے کہ بنی آدم کے بارے میں جو حقیقت بیان ہو رہی ہے وہ کسی خاص دور ہی کے بنی آدم سے متعلق نہیں بلکہ روز آفرینش سے جتنے بھی انسان پیدا ہو چکے ہیں اور قیام قیامت تک جتنے انسان پیدا ہوں گے سب سے متعلق ہے۔ من ظھور

Marfat.com

ھم (ان کی پیٹھوں سے) کے لفظ سے صاف بتادیا کہ ہر فعل کا لازمی طور پر کوئی فاعل ہوتا ہے اور وہی عبودیت اور الوہیت کا سزاوار ہوتا ہے۔

أشهد هم على انفسهم

میں اپنے آپ پر گواہ ٹھہرانے سے مراد یہ ہے کہ دلائل ربوبیت ان کی فطرت میں رکھ دیے اور عقل انسانی میں ان کو مرکوز کر دیا۔ اسی فطری استعداد کی وجہ سے نسلاً بعد نسل پیدا ہونے والی اولاد میں سے ہر مرد اور ہر عورت اپنے بارے میں گواہ بن گئے۔

اس کے بعد تمثیلی انداز میں اس عہد کا ذکر ہے جو اللہ نے نسل انسانی سے لیا اور پھر ان کو اس پر گواہ بنایا۔ صاحب کشاف اور امام بیضاوی کا نقطۂ نظر یہی ہے کہ سوال کیا کہ میں تمھارا رب نہیں؟ ارادی اور تکوینی قول ہے وحی اور تلقین کا قول نہیں۔ انھوں نے بھی استعداد کی لغت اور زبانِ حال سے نہ کہ زبانِ قال سے جواب دیا کیوں نہیں آپ ہمارے رب ہیں۔ اس کی مثال اللہ کا یہ قول ہے: ثُمَّ اسْتَوَىٰ إِلَى السَّمَاءِ وَهِيَ دُخَانٌ فَقَالَ لَهَا وَلِلْأَرْضِ ائْتِيَا طَوْعًا أَوْ كَرْهًا قَالَتَا أَتَيْنَا طَائِعِينَ (فصلت ۴۱:۱۱) یعنی پھر آسمان کے بنانے کی طرف توجہ فرمائی وہ دھواں سا تھا پھر اس سے اور زمین سے کہا کہ تم دونوں خوشی سے آؤ یا زبردستی۔ دونوں نے کہا ہم خوشی سے حاضر ہیں۔ اس آیہ مبارکہ میں بھی یہ قول تکوینی اور ارادی ہے حقیقی نہیں۔ سوال و جواب کا مطلب یہ ہے کہ اللہ نے ان کے سامنے اپنی ربوبیت اور وحدانیت کی دلیلیں دیں۔ ان کی عقل و بصیرت نے ان کی گواہی دی وہ عقل و بصیرت جو اللہ نے ان کو ودیعت کی تھی اور جو ہدایت و گمراہی کے درمیان تمیز کرنے والی تھی۔ گویا انھوں نے اپنے بارے میں گواہی دی اور ربوبیت کا اقرار کیا۔ کتاب و سنت میں اس تمثیلی انداز بیان کی بہت سی مثالیں ہیں۔ ہمارے خانقاہی نظام میں 'یوم الست' 'مست الست' یا 'قالوبلیٰ' کو طلسماتی الفاظ کے طور پر استعمال کیا گیا ہے اور ان کی بنیاد پر زیب داستان کے لیے بہت سے افسانے تراش رکھے ہیں۔ نسل انسانی کا تسلسل اور انسانی فطرت اللہ کی ربوبیت کے لیے سب سے بڑی دلیل ہے۔ اللہ نے یہ اقرار صرف اس بات کا نہیں لیا کہ وہ اللہ ہے بلکہ اس بات کا لیا ہے کہ وہ رب بھی ہے کیونکہ اہل عرب کو اللہ کے اللہ ہونے سے انکار نہیں تھا لیکن رب انھوں نے اللہ کے سوا اور بھی بنائے ہوئے تھے۔ آیت مبارکہ کے آخر میں اس اقرار اور گواہی کا سبب بتایا گیا ہے کہ کل کوئی اپنی بے خبری کا بہانہ نہ بنا لے اور اپنے آباؤ اجداد کی تقلید کی اوٹ میں پناہ نہ لے۔ اس کا جواب اسی فطرت انسانی کے عہد میں ہے یعنی وہ عقل و فطرت جس میں ربوبیت الٰہی مرکوز ہے وہ تو سب انسانوں کو اللہ نے یکساں دی ہے۔ اس لیے بے خبری

Marfat.com

اور تقلید غلط کاری کے لیے حجت نہیں۔

انسان کی عظمت

طبعی قوتیں جو کائنات میں کارفرما ہیں انسان بشمول مرد اور عورت ان کے مقابلے میں بہت کمزور واقع ہوا ہے لیکن دل و دماغ کی ان صلاحیتوں کے باعث جو اُس کی فطرت میں ودیعت کی گئی ہیں انسان کو ان قوتوں پر برتری حاصل ہے۔ انسان کو ان قوتوں کے درمیان زندہ رہنے کی قدرت حاصل ہے اور اس میں یہ صلاحیت ہے کہ قوانین طبعی کے علم کی وجہ سے وہ ان قوتوں کو اپنی خدمت کے لیے استعمال کر سکے۔ یہی نہیں بلکہ اللہ نے نوامیس فطرت کو طبع انسانی کے ساتھ ہم آہنگ کیا ہے اگر یہ نوامیس انسانی استعداد کے ساتھ ہم آہنگ نہ ہوتے تو تسخیر فطرت ممکن نہ ہوتی اور نہ حیات انسانی قائم رہ سکتی۔ انھی استعدادات کی وجہ سے انسان خلافت ارضی کا اہل ہوا ہے اور اسے روئے زمین پر تغیر و تبدل، تحلیل و ترکیب اور انتاج و انشا کا اختیار حاصل ہے اور انھی صلاحیتوں کی وجہ سے وہ اس اوج کمال تک پہنچ سکتا ہے جو کائنات کا مقدر ہے اور جس کا سلسلہ لامتناہی ہے۔ یہ کمال عورتوں کی دسترس میں ایسا ہی ہے جیسا کہ مردوں کی۔ اللہ نے تمام فرزندان آدم کیا مرد اور کیا عورت سب کو واجب التکریم بنایا اور قرآن مجید میں ان کی تکریم کا ذکر کر کے اُسے زندہ جاوید بنا دیا۔ ارشاد ربانی ہے: ’’وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِىْ آدَمَ وَحَمَلْنَاهُمْ فِى الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنَاهُم مِّنَ الطَّيِّبَاتِ وَفَضَّلْنَاهُمْ عَلَىٰ كَثِيرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيلًا‘‘ (بنی اسرائیل ۱۷: ۷۰) ’یقیناً ہم نے بنی آدم کو عزت دی اور ہم نے ان کو خشکی اور تری میں سوار کیا۔ اور ان کو اچھی چیزوں سے رزق دیا اور ہم نے ان کو بہتوں پر جنھیں ہم نے پیدا کیا ہے بڑی فضیلت دی ہے‘۔

آیت میں خطاب بنی آدم سے ہے جس میں نیک و بد، مرد اور عورت سب شامل ہیں۔ آیت کا مقصد انسان پر اللہ تعالیٰ کی بلند و برتر ان نعمتوں کا ذکر ہے جن کی وجہ سے انسان کو دوسری مخلوق پر فضیلت حاصل ہے۔ انسان کو اس ساخت اور فطرت کے ساتھ پیدا کیا گیا ہے جو طین (مٹی) اور نفخہ (روح) کی جامع ہے۔ انسانی وجود میں ارضی اور سماوی تمام صفات یکجا جمع ہیں۔ جس طرح انسان کا بدن تمام مخلوق سے اعلیٰ و ارفع ہے بالکل اسی طرح نفس انسانی تمام نفوس سے اعلیٰ و ارفع ہے۔ نطق، حسن، صورت اور دراز قامتی میں وہ سب مخلوق سے افضل ہے۔ وہ دونوں ٹانگوں پر جم کر کھڑا ہو سکتا ہے جس کی وجہ سے اس کے ہاتھ کام کاج کے لیے آزاد ہیں۔ پانچ قوتیں یعنی کھانا پینا، نشو و نما، تولید، حس اور حرکت سب حیوانو ں اور انسانوں میں برابر موجود ہیں مگر نفس انسانی میں ایک اور خصوصیت ہے یعنی عقل و بصیرت جس کے ذریعے سے وہ چیزوں کی حقیقت کا ادراک کرتا ہے اور یہی وہ قوت ہے جس میں اللہ کی معرفت کا نور جلوہ

Marfat.com

افروز ہے جس کے باعث وہ عالم خلق وامر کے اسرار سے آشنا ہوتا ہے۔ اس انسانی قوت کو نفحۂ الٰہی نے بار آور کیا ہے مندرجہ بالا پانچ قوتیں اس قوت کے مقابلہ میں ہیچ ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ابن عطیہ نے انسانی شرف و کرامت کو صرف عقل میں محصور کیا ہے۔ عالم سفلی میں کوئی اور مخلوق ایسی نہیں جسے عالم علوی کا حصہ ملا ہو۔ اس دنیا کی موجودات میں انسان اللہ سے قریب تر ہے۔ اس کا دل اس کی معرفت کے نور سے منور ہے اور اس کے اعضاء کو اللہ کی اطاعت کا شرف حاصل ہے۔ اسی عقل و تدبر سے انسان ترقی کے نئے راستے اختیار کرسکتا ہے۔ تجربات کر کے علمی تحقیقات اور ایجادات کرسکتا ہے۔ چاند اور مریخ پر کمندیں ڈال سکتا ہے۔ خشکی اور تری کی قوتوں کو مسخر کرسکتا ہے اور اس طرح اپنے لیے نہایت ہی خوشگوار سامان زیست مہیا کرسکتا ہے۔ یہ چھپی ہوئی صلاحیت انسان کے اندر اس بیج کی طرح ہوتی ہے جس کے اندر شاندار درخت بننے کی صلاحیت موجود ہوتی ہے۔ دیکھنے میں بیج ایک کمزور اور مردہ چیز ہوتی ہے مگر مٹی میں مل کر بڑی جدوجہد کے بعد اس کی مخفی صلاحیتوں کا اندازہ ہوتا ہے۔ وہ انسان جو اللہ کی دی ہوئی قوتوں سے فائدہ نہیں اُٹھاتے وہ گوشت اور خون کا ایک جامد لوتھڑا ہوتے ہیں۔ وہ حیوانات کی ادنیٰ سے ادنیٰ سطح سے بھی بلند نہیں ہوسکتے۔ وہ صرف ایمان اور عمل صالح سے اپنی مخفی صلاحیتوں کا اظہار کر کے بلند سے بلند تر مقام پر پہنچ سکتے ہیں۔

آیت مبارکہ میں اللہ تعالیٰ نے انسانی شرف و کرامت کو تکرار کے ساتھ بیان کیا ہے۔ تکریم سے مراد وہ خلقی اور طبعی صفات ہیں جو فرض کی ادائیگی میں انسان کی دست گیری کرتی ہیں اور اسے صحیح عقائد اور اخلاق فاضلہ اختیار کرنے کی صلاحیت بخشتی ہیں۔ تفضیل سے مراد ان ذمہ داریوں کا احساس ہے جو اس کے کاندھے پر ڈالی گئی ہیں۔ اس امتیاز کی وجہ سے وہ انسان کہلاتا ہے۔ عمل کی آزادی اور جوابدہی کا احساس ہی اس کی تکریم و فضیلت کا باعث ہے اور اسی وجہ سے اسے خلافت ارضی کا سزاوار سمجھا گیا ہے۔

ایک اور قابل توجہ نکتہ یہ ہے کہ یہاں سب بنی آدم کے لیے بشمول مرد و عورت، عزت و بزرگی دینے کا ذکر ہے اور یہ بحیثیت مخلوق کے بمقابلہ دوسری مخلوق کے ہے اور کثیر سے مراد یہ نہیں کہ بہت سی قسم کی مخلوق پر تو بنی آدم کو فضیلت دی ہے بعض پر نہیں دی، یعنی لفظ کثیر کسی کے مقابلے پر نہیں بلکہ مراد یہ ہے کہ تمہیں ایک دو قسم کی مخلوق پر فضیلت نہیں دی بلکہ بہت سی قسموں کی مخلوق پر فضیلت دی ہے کیونکہ دوسری جگہ صاف فرمایا: 'وَهُوَ فَضَّلَكُمْ عَلَى الْعَالَمِينَ' (الأحزاب ۷: ۱۴۰) 'اس نے تم کو سب جہانوں پر فضیلت دی ہے'۔ علاوہ ازیں اس تکریم کا ذکر بمقابلہ شیطان کے انکار تکریم سے ہے۔ اس نے کہا تھا: 'أَهَـٰذَا الَّذِي كَرَّمْتَ عَلَيَّ' (بنی اسرائیل ۱۷: ۶۲) 'اس نے کہا تھا، جسے تو نے مجھ پر بزرگی دی ہے اگر تو مجھ

Marfat.com

کو قیامت کے دن تک مہلت دے تو میں چند ایک کے سوا اس کی نسل کو قابو کرلوں گا'۔ انسان کی فرمانبردای کا اسے حکم تھا اور انسان کی فرمانبرداری کا فرشتوں کو بھی حکم تھا پس جس دلیل سے انسان کی مکرمت شیطان پر ثابت ہے اس دلیل سے فرشتوں پر بھی اس کی مکرمت ثابت ہے یہ شرف اس لیے ہے کہ انسان کی ترقیاں لامتناہی ہیں اس کے لیے بڑی کاوش کرنی پڑتی ہے جیسا کہ حالی کا شعر ہے:

فرشتے سے بہتر ہے انسان بننا
مگر اس میں لگتی ہے محنت زیادہ

بنی آدم کی عزت و شرف میں یہ اشارہ ہے کہ ہم نے اُن کو سب مخلوق پر فضیلت دی ہے وہ کیوں کمال نفس کو حاصل کرنے کی کوشش نہیں کرتے بلکہ اپنی کرتوتوں سے اسے ذلیل کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ یہ عزت اور یہ فضیلت انسان کو اس لیے بخشی گئی ہے تا کہ وہ اللہ کا شکر ادا کرے اور سب کو اپنے سے فروتر سمجھتے ہوئے اللہ کے سوا کسی کے آگے نہ جھکے۔ یہ بات اچھی طرح ذہن نشین ہونی چاہیے کہ خلقی اور طبعی صفات میں فضیلت، اور دل و دماغ کی صلاحیت مردوں اور عورتوں کو یکساں عطا ہوئی ہیں۔ وہ دونوں اپنی مخفی صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر اور ایمان اور عمل صالح کے ہتھیار سے لیس ہو کر اعلیٰ علیین تک پہنچ سکتے ہیں۔ دونوں قوانین طبعی کے علم کے ذریعہ خشکی اور تری کی تمام قوتوں کو مسخر کر سکتے ہیں۔ دونوں خلافت ارضی کے اہل ہیں۔ یہ فریضہ دونوں نے مل جل کر ادا کرنا ہے انسانی تہذیب میں زنانہ اور مردانہ ڈبے الگ الگ نہیں ہوتے۔ پوری دُنیا انسانوں کا گھر ہے جہاں انسان دوست بن کر رہتے ہیں دشمن اور مخالف بن کر نہیں (۹:۷۱)۔

اسلام دین فطرت ہے۔ جنسی تسکین ایک فطری جذبہ ہے۔ اسلام اس جذبے کو دباتا نہیں بلکہ اس کا رخ صحیح سمت میں موڑتا ہے۔ مرد کی جنسی آسودگی کا ذریعہ عورت ہے نہ کہ مرد۔ حیات انسانی کی یہی فطری ضرورت ہے۔ بیٹی مرد کی عفت کی محافظ بھی ہے اور افزائش نسل کی صلاحیت بھی رکھتی ہے۔ اسی لیے نبی کریم ﷺ نے فرمایا: 'اِنَّ فی بُضع احدکم صدقة' (مسلم، کتاب الزکاۃ) اس میں کوئی شک نہیں کہ تم میں سے ہر کسی کی شرمگاہ میں نیکی ہے۔ کیونکہ جائز طریقے سے جنسی آسودگی حرام کاری اور فطرت سے انحراف سے بچاتی ہے۔ اس سے نظیف فطرت کے مطالبات بھی پورے ہوتے ہیں اور نظیف جذبات بھی پیدا ہوتے ہیں۔ لیکن مریض فطرت، مردہ دل اور بیمار ذہن جنسی انحراف کو بڑھاتی چلی جاتی ہے جس سے معاشرے میں بگاڑ پیدا ہوتا ہے اور ایڈز جیسی موذی مرض جنم لیتی ہے۔ اس کے برعکس فطری جذبات اور ان کی فطری تسکین حسی اور نفسی طہارت کا سبب بنتی ہے اس حقیقت کی طرف قرآن

Marfat.com

نے ان الفاظ میں اشارہ کیا ہے: ﴿وَجَاءَهُ قَوْمُهُ يُهْرَعُونَ إِلَيْهِ وَمِن قَبْلُ كَانُوا يَعْمَلُونَ السَّيِّئَاتِ قَالَ يَا قَوْمِ هَٰؤُلَاءِ بَنَاتِي هُنَّ أَطْهَرُ لَكُمْ فَاتَّقُوا اللَّهَ وَلَا تُخْزُونِ فِي ضَيْفِي أَلَيْسَ مِنكُمْ رَجُلٌ رَّشِيدٌ﴾ (ھود ۱۱:۷۸) 'اور اس کے پاس اس کی قوم دوڑتی آئی اور وہ پہلے سے برے کام کیے تے تھے۔ اس نے کہا اے میری قوم یہ میری بیٹیاں ہیں یہ تمھارے لیے سب سے بڑھ کر پاک ہیں سو اللہ سے ڈرو، اور میرے مہمانوں کے معاملہ میں مجھے رسوا نہ کرو۔ کیا تم میں کوئی بھلا آدمی نہیں؟'

قتادہ کا قول ہے کہ اس آیت میں بنات سے مراد حقیقی اور نسلی بیٹیاں ہیں جبکہ مجاہد اور سعید بن جبیر کا قول ہے کہ بنات سے مراد امت کی عورتیں ہیں کیونکہ نبی اپنی امت کے لیے بمنزلہ باپ ہوتا ہے۔ پیروی اور قبول دعوت کی وجہ سے انھیں حضرت لوط علیہ السلام کی طرف منسوب کیا گیا ہے۔ جن مفسرین نے بنات سے مراد حقیقی بیٹیاں لی ہیں ان کی رائے یہ ہے کہ یہ نکاح کی پیشکش نہ تھی بلکہ ان کے نفس کی خواہش پر سخت ناپسندیدگی کا اظہار اور ان کے باز رکھنے کی اور شرم دلانے کی ایک کاوش تھی تاکہ وہ سوچیں کہ اللہ کا ایک بندہ یہ ہے جو اپنے مہمانوں کی عزت بچانے کے لیے اپنی عزیز سے عزیز چیز قربان کرنے کے لیے تیار ہے اور ایک وہ جو شہوت میں اندھے ہو کر اس کے مہمانوں پر ٹوٹ پڑے ہیں۔ اکثر مفسرین نے یہاں بنات (بیٹیوں) کو مجازی معنوں میں لیا ہے کیونکہ نبی اپنی امت کے لیے بمنزلہ باپ ہوتا ہے اور اس کی بیوی ماں کا درجہ رکھتی ہے جیسا کہ ارشاد ہے: 'وازواجہ امھاتھم' (الاحزاب ۳۳:۶) 'اس لیے ساری قوم کی عورتیں اس کی بیٹیاں کہلاتی ہیں۔ دوسرے یہ کہ حضرت لوط علیہ السلام کی صرف دو بیٹیاں تھیں رثا اور زعورا۔ اور دو کے لیے جمع کا صیغہ بنات استعمال نہیں ہوتا۔ دو بیٹیاں تو قوم کے انبوہ کثیر کے لیے کافی نہ تھیں۔ جب بستی کے اوباش شہوت میں اندھے ہو کر خوش شکل لڑکوں کی خبر پا کر حضرت لوط علیہ السلام کے گھر کی طرف دوڑے آ رہے تھے تو حضرت لوط علیہ السلام نے ان کا رخ اس صنف لطیف کی طرف موڑنے کی کوشش کی جسے اللہ نے جنسی تسکین کے لیے پیدا کیا ہے اور انھیں بتایا کہ ان کے گھروں میں بیویاں ہیں اور قوم کی بیٹیاں ہیں جن سے جائز طریقے سے رشتہ جوڑ کر تم اپنے جذبات کی تسکین کر سکتے ہو۔ وہ دن سخت مشکل دن تھا جب حضرت لوط علیہ السلام کی قوم کے اعصاب پر لونڈے سوار تھے اور ان کی اپنی بیوی بھی مخالفت کر رہی تھی۔ قوم کی حماقت اس انتہا تک پہنچ چکی تھی کہ وہ بدفعلی کی طرف بے دریغ علانیہ اور اجتماعی طور پر لپک رہے تھے۔ وہ تو حیوانوں کی سطح سے بھی گرے ہوئے تھے کیونکہ حیوان بھی اپنی جنس کے سامنے جنسی ملاپ سے شرم کھاتا ہے۔ کائنات میں یہ کام صرف خسیس انسان ہی کر سکتے ہیں۔ مہمانوں کی حفاظت کا احساس لوط کے لیے کرب کا باعث تھا چنانچہ انھوں نے فطرت سلیم کو پیدا کرنے کی کوشش

Marfat.com

کی۔قرآن نے لواطت کا نام لیے بغیر اس کا ذکر کیا کیونکہ فطرت سلیم کے خلاف ہے کہ اس کا نام منہ سے نکلے اور کانوں میں پڑے۔صرف بدفطرت اور جنسی طور پر منحرف انسان ہی یہ حرکت کرسکتا ہے۔حضرت لوط ؑ کا قول اس بات کا اظہار ہے کہ صرف عورت ہی مرد کی عفت کی محافظ ہے وہ حیات انسانی کی فطری ضرورت ہے اور اس کا اصل سرچشمہ ہے۔

ارشاد ربانی ہے کہ یہ بیٹیاں تمھارے لیے زیادہ پاکیزگی کا باعث ہیں جنسی طور پر بھی اور معنوی طور پر بھی۔کیونکہ وہ صاف ستھرے جذبات پیدا کر کے لطیف فطرت کے مطالبات کو پورا کرسکتی ہیں۔وہ جنسی طور پر پاکیزہ ہیں کیونکہ ان میں افزائش نسل کی صلاحیت پائی جاتی ہے اور معنوی طور پر بھی پاکیزہ ہیں کیونکہ وہ اخلاقی اور دینی نظافت کا ذریعہ ہیں۔قرآن حکیم نے دو مقامات پر اس غیر فطری حرکت کو روکنے کے لیے لوگوں کی توجہ اس نصفِ بہتر کی طرف مبذول کی ہے جسے اللہ نے مرد کے سکون کے لیے پیدا کیا ہے۔ارشاد ربانی ہے' کیا تم ساری خدائی میں سے مردوں کے پاس جاتے ہو اور تمھارے رب نے جو بیویاں تمھارے لیے پیدا کی ہیں انھیں چھوڑتے ہو بلکہ تم حد سے گزر جانے والے لوگ ہو (۲۶:۱۶۵تا۱۶۶)۔دوسری جگہ ارشاد ہے' ہم نے لوط کو پیغمبر بنا کر بھیجا جبکہ انھوں نے اپنی قوم سے کہا یقیناً تم وہ فحش کام کرتے ہو کہ تم سے پہلے دنیا جہان میں کسی نے بھی نہیں کیا۔تم مردوں کے پاس جاتے ہو اور راستے کو منقطع کرتے ہو جسے فطرت نے افزائش نسل کے لیے تجویز کیا ہے اور اپنی مجلس میں برے کام کرتے ہو' (۲۹:۲۸تا۲۹)۔ایسے کام صرف وہی کرسکتا ہے جس نے فطرت سلیم کو مسخ کرلیا ہو۔یہی حال قوم لوط کا تھا۔قرآن کہتا ہے کہ جائز اور فطری طریقے سے جنسی لذت لونڈے بازی جیسی نجاست کی نسبت زیادہ پاکیزہ ہے قرآن کریم کا قول ہے کہ قوم لوط ایک برائی کا ارتکاب نہیں کرتی تھی بلکہ کئی برائیوں کی مرتکب تھی یعنی لواطت کئی برائیوں کا مجموعہ ہے،سائنسی تحقیق نے ایڈز جیسے موذی مرض کو بھی اس غیر فطری فعل کا نتیجہ قرار دیا ہے۔

مولانا اصلاحی کا فرمان ہے: 'انھیں اللہ سے خوف دلایا گیا تاکہ انھیں اللہ کی قوت سے آگاہ کیا جائے اور الیس منکم رجل رشید (کیا تم میں کوئی بھلا آدمی نہیں) کہہ کر ان پر حجت تمام کی اس لیے کہ کسی کے اندر اگر ذرہ برابر بھی حق کی حمایت کا احساس ہوتا تو اس قول کے بعد ضرور حرکت میں آجاتا لیکن اس کے بعد بھی جب کوئی ضمیر بیدار نہ ہوا تو اس کے معنی یہ ہیں کہ کسی کے اندر حس انسانیت اور شرافت سرے سے موجود ہی نہ تھی'۔

اس قول سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ اصل مسئلہ ہدایت و گمراہی کا مسئلہ ہے،فطرت،مروت،اور دین کا

Marfat.com

مسئلہ ہے لیکن مریض فطرت، مردہ دل اور بیمار ذہن ہدایت کا طلبگار نہیں ہوتا جس کی وجہ سے جنسی انحراف بڑھتا چلا جاتا ہے۔

قوم لوط نے فطری طور پر جنسی تسکین کو رد کر دیا۔ اور کہا کہ بیٹیوں کے ساتھ شادی کا معاملہ تو طے شدہ ہے اس پر سب لوگوں کا اتفاق ہے۔ مگر ان خوش شکل مہمانوں کے بارے میں کیا خیال ہے جن کی ہمیں خواہش ہے؟ حضرت لوط علیہ السلام کے پاس اس بے حیائی کا کوئی جواب نہ تھا۔ وہ ایسی قوم کا کیا کرتے جن کے سر پر لونڈے بازی کا بھوت سوار تھا اور جن کی نگاہوں کے سامنے تمام اشیاء کی وضع الٹ ہو گئی تھی۔ اگر ان کے پاس قوت ہوتی تو وہ انھیں روکتے اور ان کے ساتھ وہی سلوک کرتے جو پاگل کتوں کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ ساری قوم یہاں تک کہ اپنی بیوی بھی مخالفت کر رہی تھی کوئی بھی تو نہ تھا جس سے مدد مانگتے۔ اس مقام پر آسمان سے مدد نازل ہوتی ہے اور اچانک قوم پر ہلاکت کی بجلی گرتی ہے اور آسمان سے پتھر برستے ہیں۔ عجیب اتفاق ہے وہی مہمان طاقت کا سرچشمہ ثابت ہوئے جن کے بارے میں وہ قوم سے خوف زدہ تھے۔

فطرت نے وجود زن سے تصویر کائنات میں جو رنگ بھرا ہے آج بھی اگر کوئی غیر فطری طریقوں سے اس رنگ کو پھیکا کرنے کی کوشش کرے گا اس کا انجام قوم لوط سے مختلف نہ ہوگا۔

باپ اور بیٹی کا رشتہ

مدائن کے صالح بزرگ یا شعیب علیہ السلام اور ان کی بیٹیاں مصر کی غلامانہ زندگی کی جگہ آزادی کی آب و ہوا میں آزادانہ زندگی بسر کر رہی تھیں۔ وہ ایک ایسے معاشرے میں رہ رہی تھیں جو فطرت سے قریب تر تھا جس میں غلط رسم و رواج رائج نہ تھے اور جس میں تکلف و تصنع کو کوئی دخل نہ تھا۔ جو معاشرہ فطرت سے دور ہو چکا ہو وہ لڑکی کے والد یا سرپرست کو اس بات سے روکتا ہے کہ وہ خوش خلق اور دیندار اور ہم پلہ لڑکے کے لیے اپنی بیٹی بہن یا کسی اور عزیز کو پیش کرے۔ رسم و رواج اس بات کو ضروری سمجھتے ہیں کہ پہل لڑکے یا اس کے سرپرست کی طرف سے ہو اور اسے مناسب نہیں سمجھا جاتا کہ پہل لڑکی والے کریں۔ اس منحرف سماج میں لڑکے اور لڑکیاں منگنی یا نکاح کے بغیر گپ شپ لگاتے ہیں اور جب شادی کی پیشکش کی جائے تو جھوٹ موٹ کی شرم و حیا ظاہر کی جاتی ہے اور صراحت اور سادگی سے گریز کیا جاتا ہے۔

ارشاد ربانی ہے: قَالَ إِنِّي أُرِيدُ أَنْ أُنكِحَكَ إِحْدَى ابْنَتَيَّ هَاتَيْنِ عَلَىٰ أَن تَأْجُرَنِي ثَمَانِيَ حِجَجٍ ۖ فَإِنْ أَتْمَمْتَ عَشْرًا فَمِنْ عِندِكَ ۖ وَمَا أُرِيدُ أَنْ أَشُقَّ عَلَيْكَ ۚ سَتَجِدُنِي إِن شَاءَ اللَّهُ مِنَ الصَّالِحِينَ ۝ قَالَ ذَٰلِكَ بَيْنِي وَبَيْنَكَ ۖ أَيَّمَا الْأَجَلَيْنِ قَضَيْتُ فَلَا عُدْوَانَ عَلَيَّ ۖ وَاللَّهُ

Marfat.com

عَلٰی مَا نَقُوْلُ وَکِیْلٌ o' (القصص ۲۸: ۲۷ تا ۲۸) 'اس نے کہا میں چاہتا ہوں کہ اپنی ان دو بیٹیوں میں سے ایک کا نکاح تجھ سے کر دوں اس شرط پر کہ تو آٹھ سال میری ملازمت کرے، اور اگر تو دس سال پورے کرے تو تیری مرضی ہے اور میں تجھ پر کوئی مشقت نہیں ڈالنا چاہتا اور تم انشاء اللہ مجھے بھلے لوگوں میں سے پاؤ گے۔ (موسیٰ علیہ السلام نے) کہا میرے اور تمھارے درمیان یہ طے ہو گیا کہ ان دونوں مدتوں میں سے جو میں پوری کر دوں مجھ پر کوئی زیادتی نہ ہو گی اور جو کچھ ہم کہہ رہے ہیں اللہ اس کا نگہبان (گواہ) ہے۔

کس قدر سادگی اور صراحت کے ساتھ بزرگ صالح یا شعیب علیہ السلام نے اپنی دونوں بیٹیوں میں سے ایک کو نکاح کے لیے پیش کیا۔ وہ اپنی بیٹی کے لیے ایسے شوہر کے انتخاب میں ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرتے جس کی وہ خود بھی تمنا کرتے تھے اور جس کی پسند کا اظہار ان کی بیٹی شرم وحیا کے باعث نہیں کر رہی تھی۔ وہ دونوں لڑکیوں میں سے کسی ایک کو حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ٹھونس کر ان کی آزادی رائے پر قدغن لگانا نہیں چاہتے تھے۔ باوجود اس بات کے کہ موسیٰ علیہ السلام ان میں کسی ایک کو پسند کر چکے تھے اور وہ بھی انھیں پسند کر چکی تھیں اگر کسی ایک کو ان پر ٹھونسا جاتا تو یہ قرین مصلحت نہ ہوتا۔ پھر موسیٰ علیہ السلام نے حضرت شعیب علیہ السلام یا مرد صالح کے گھر بھی رہنا تھا، اگر لڑکی کو وہ خود پسند نہ کرتے تو ان کی گھریلو زندگی مکدر ہو جاتی۔ وہ ہر وقت دونوں بہنوں کے درمیان موازنہ کرتے رہتے اور ان کا ارادہ اسی میں اٹکا رہتا جس کے انتخاب کا اختیار ان کو نہ دیا ہوتا۔ وہ ایک انسان ہی تو تھے۔ پھر دونوں بیٹیوں میں سے ایک کا انتخاب ان کے سپرد کر کے مرد صالح یا شعیب علیہ السلام نے دونوں بیٹیوں کے ساتھ عدل کیا۔ موسیٰ علیہ السلام ایک نادر الوجود انسان تھے۔ باپ اس نعمت کو بڑی یا چھوٹی لڑکی کے لیے محدود نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اگر وہ کسی ایک کا انتخاب خود کرتے تو دوسری دل ہی دل میں کڑھتی رہتی۔ موسیٰ علیہ السلام کو انتخاب کا حق دے کر انھوں نے اس الجھن کو حل کر لیا۔ موسیٰ علیہ السلام کو کسی ایک کے ساتھ نکاح کرنے پر مجبور نہیں کیا بلکہ معاملہ موسیٰ علیہ السلام اور اپنی بیٹی کے سپرد کر دیا تاکہ دونوں ایک دوسرے کو دیکھ بھال لیں۔ وہ محسوس کر رہے تھے کہ تخصیص تو پہلے سے ہو چکی ہے، جس لڑکی نے موسیٰ علیہ السلام کی سفارش کی اس کا دل نوجوان کے دل سے مل چکا ہے اور دونوں کے درمیان باہمی اعتماد قائم ہو چکا ہے۔ اس صورت میں وہ انتخاب کی ذمہ داری خود کیوں لیتے۔ عہد نبوت میں باپ اپنی بیٹیوں کو شادی کے لیے پیش کرتے تھے بلکہ عورت خود اپنے آپ کو شادی کے لیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر اور ان لوگوں پر، جو شادی کے خواہش مند ہوتے تھے، پیش کرتی تھیں۔ بڑے سادہ اور صاف الفاظ میں اسلامی معاشرہ بغیر کسی رکاوٹ اور ہچکچاہٹ کے اور بغیر کسی

Marfat.com

تکلف اور تصنع کے اپنے گھروں کو آباد کرتا تھا۔ حضرت عمرؓ نے سیدہ حفصہؓ کو ابوبکرؓ اور عثمانؓ کے لیے پیش کیا۔ حضرت عبداللہ بن عمر راوی ہیں کہ حضرت حفصہؓ خنیس بن حذافہ کی بیوہ تھیں جو غزوہ بدر میں شریک تھے اور مدینہ منورہ میں ان کی وفات ہوئی۔ حضرت عمر نے حضرت عثمانؓ سے کہا اگر آپ پسند کریں تو حفصہ کا نکاح آپ سے کر دوں۔ انھوں نے کہا میں سوچوں گا۔ اُنھوں نے کچھ انتظار کیا پھر میری ملاقات ان سے ہوئی تو کہنے لگے میں ان دِنوں شادی نہیں کرنا چاہتا۔ حضرت عمرؓ کہتے ہیں کہ میں نے ابوبکرؓ سے ملاقات کی اور اُن کو پیش کش کی، آپ خاموش ہو گئے اور مجھے کوئی جواب نہ دیا۔ مجھے حضرت عثمانؓ سے بڑھ کر ان پر غصہ تھا۔ پھر میں نے کئی روز انتظار کیا یہاں تک کہ نبی ﷺ نے ان کا ہاتھ مانگ لیا۔ میں نے ان کا نکاح ان سے کر دیا۔

مومن عورت خود اپنے آپ کو نکاح کے لیے پیش کرتی تھی چنانچہ سورۃ احزاب میں ہے:
"وَامْرَأَةً مُّؤْمِنَةً إِن وَهَبَتْ نَفْسَهَا لِلنَّبِيِّ" یعنی اور کوئی مومن عورت اگر اپنے آپ کو نبی ﷺ کے لیے ہبہ کرے (۳۳:۵۰)۔ صحیح مسلم میں سہل بن سعد الساعدی کی روایت ہے کہ "میں کچھ لوگوں کے ساتھ رسول اللہ ﷺ کے پاس بیٹھا ہوا تھا کہ ایک عورت آئی اور کہنے لگی۔ اے اللہ کے رسول! میں اپنے آپ کو آپ کے لیے ہبہ کرنے آئی ہوں۔ آپ کا کیا خیال ہے؟ رسول اللہ ﷺ نے نظر اوپر اُٹھائی اور اسے نظر بھر کر دیکھا۔ پھر آپؐ نے اپنا سر جھکا لیا۔ جب عورت نے دیکھا کہ آپؐ نے اس کے بارے میں کوئی فیصلہ نہیں کیا تو وہ بیٹھ گئی۔ صحابہ میں سے ایک نے کہا! اے اللہ کے رسول! اگر آپ نہیں چاہتے تو اس کا نکاح مجھ سے کر دیجیے۔ آپؐ نے فرمایا کچھ حق مہر ہے؟ اس نے کہا: واللہ کچھ نہیں۔ آپؐ نے فرمایا گھر جاؤ شاید کچھ مل جائے وہ گیا اور لوٹ آیا کہنے لگا واللہ مجھے کچھ نہیں ملا۔ پھر آپؐ نے فرمایا: دیکھو وہ پھر گیا اور لوٹ آیا، کہنے لگا اللہ کے رسول ﷺ! بخدا کچھ نہیں۔ آپؐ نے پوچھا لوہے کا چھلا بھی نہیں؟ اس نے کہا کہ یہ میرا تہبند ہے (راوی کہتا ہے کہ اس کے پاس چادر نہ تھی) نصف اس کے لیے حاضر ہے۔ اللہ کے رسول ﷺ نے کہا کہ وہ تمھارا تہبند لے کر کیا کرے گی۔ اگر تو اسے پہنے گا تو اُس کے اوپر کچھ نہ رہے گا اور اگر وہ پہنے گی تو تمھارے اوپر کچھ نہ رہے گا۔ پھر آدمی بیٹھ گیا اور دیر تک بیٹھا رہا۔ پھر وہ اُٹھ کھڑا ہوا۔ اللہ کے رسول ﷺ نے اسے جاتے دیکھا تو بلا لیا۔ جب وہ آیا تو آپؐ نے پوچھا کتنا قرآن یاد ہے؟ اس نے جواب دیا فلاں فلاں سورت اور سورتوں کو گننے لگا۔۔ آپؐ نے فرمایا کہ جاؤ جو قرآن تمھیں یاد ہے اس کے بدلے اسے تمھارے نکاح میں دے دیا"۔ ایک روایت میں ہے کہ بیس سورتیں سکھانے کی شرط پر اس کا نکاح کر دیا۔ روایت یہ بھی ہے کہ اُس عورت نے شادی کے لیے آپ کو اپنا سرپرست بنا لیا کہ وہ جس سے چاہیں شادی کر دیں۔ ان احادیث سے ثابت ہوتا ہے کہ عہد نبوت میں

Marfat.com

سرپرست زیرِ تولیت لڑکی کو نکاح کے لیے پیش کیا کرتے تھے۔

موسیٰ علیہ السلام بھی شعیب علیہ السلام سے کم دانا نہ تھے، ایک ایسا جواب دیا جو شیخ کبیر یا شعیب علیہ السلام کو تو مطمئن کر دے مگر ان کی آزادی رائے پر بھی حرف نہ آئے۔ فرمایا: ذالک بینی و بینک یعنی 'جو آپ نے کہا ہے اس سے مجھے اتفاق ہے'۔ دونوں بیٹیوں میں سے کسی ایک کا انتخاب اس سے مجھے اتفاق ہے اور آٹھ یا دس برس میں کسی ایک مدت کا انتخاب اس پر بھی مجھے اتفاق ہے اس طرح دونوں کے درمیان معاہدہ طے پا گیا۔ حضرت شعیب علیہ السلام یا شیخ کبیر کو ایک طاقتور اور ایماندار داماد مل گیا جو پوری قوت اور امانت سے ان کی خدمت کی صلاحیت رکھتا تھا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جو فرعون کے مظالم سے بھاگے ہوئے پردیسی تھے ایک صاحب فہم وذکا بیوی اور ٹھکانہ مل گیا تاکہ ایک آزاد اور خود مختار سرزمین میں رہ کر اپنے آپ کو آنے والے وقت کے لیے تیار کر لیں۔ شعیب علیہ السلام، موسیٰ علیہ السلام کی قدر و منزلت پہچانتے تھے اس لیے انھوں نے یقین دہانی کرائی کہ وہ کام میں ان پر بوجھ نہیں ڈالیں گے اور فراعنہ کی طرح ان کو سخت محنت اور مشقت میں مبتلا نہیں کریں گے۔ وہ اپنی صفائی نہیں پیش کرتے اور نہ ہی یہ کہتے ہیں کہ وہ صالح ہیں بلکہ امید کرتے ہیں کہ اللہ کرے کہ وہ ایسے ہی رہیں۔ وہ امید کرتے ہیں کہ تم مجھے خوش معاملہ اور نیکوکار پاؤ گے نہ کہ سخت گیر (Hard task master)۔ حضرت شعیب علیہ السلام، موسیٰ علیہ السلام کی کمزور پوزیشن سے غلط فائدہ اٹھانا نہیں چاہتے تھے۔ یہ الگ بات ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے اس مدت کو یعنی دس سال کو پورا کیا کیونکہ مروت کا یہی تقاضا تھا اس معاہدے پر کوئی گواہ نہ تھا انھوں نے اپنا معاملہ اللہ کے سپرد کیا۔ احکام القرآن میں ابن العرابی نے اس آیت سے ۳۰ فقہی مسائل کا استنباط کیا ہے۔ مگر اس میں سے صرف دو مسئلے زیادہ اہم ہیں ایک یہ کہ آیا محنت حق مہر کا بدل ہو سکتی ہے؟ دوسرا یہ کہ آیا گواہوں کے بغیر نکاح ہو جاتا ہے؟ پہلے سوال کا جواب مولانا امین احسن اصلاحی نے مختصراً یہ دیا ہے کہ اگر باپ لڑکی کا نکاح کسی ایسی شرط پر کر دے جو جائز ہو اور لڑکی اس پر راضی ہو تو اس میں کوئی شرعی قباحت نہیں کیونکہ مہر کا تعلق کلیتاً لڑکی کی مرضی سے ہے۔ امام شافعیؒ بھی اس کے جواز مطلق کے قائل ہیں۔ دوسرے واللہ علی مانقول وکیل کا جملہ بتا رہا ہے کہ صرف اللہ کو گواہ بنایا گیا۔ امام ابوحنیفہؒ اور امام شافعیؒ کا مذہب ہے کہ دو گواہوں کے بغیر نکاح نہیں ہوتا جبکہ امام مالک کے نزدیک صرف اعلان نکاح شرط ہے نہ کہ گواہ۔ ان کی رائے میں یہ نکاح ہو جاتا ہے۔

جہاں تک سورۃ تحریم کی آیت کا تعلق ہے وہاں لفظ بنت حقیقی معنوں میں بھی استعمال ہوا ہے اور مجازی معنوں میں بھی۔ مریم عمران کی حقیقی بیٹی ہے یا آل عمران کی ایک فرد، اس بات کا تفصیل سے ذکر لفظ امراۃ کے تحت ہو چکا ہے۔

Marfat.com

حلیلۃ (بیوی)

لغوی مفہوم

عربی میں حلیل میاں کو کہتے ہیں اور اس کی جمع احِلّاء ہے اور حلیلۃ بروزن فعیلۃ بیوی کو کہتے ہیں اور اس کی جمع حلائل ہے جو قرآن حکیم (۴:۲۳) میں وارد ہے۔ صاحب القاموس المحیط کا قول ہے کہ حلیل کا لفظ مذکر اور مؤنث دونوں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ المعجم الوسیط میں ہے: 'حلیل الرجل' مرد کی بیوی اور 'حلیل المرأۃ' عورت کے میاں کو کہا جاتا ہے۔ ابوحیان نے البحر المحیط (۲۰۳:۳) میں عنترہ کا شعر نقل کیا ہے:

واغشی فتاۃ الحی عند حلیلها
واذا غزا فی الجیش لا أغشاها

'میں قبیلے کی نوجوان لڑکی کے پاس اس وقت جاتا ہوں جب اس کا شوہر موجود ہوتا ہے
لیکن جب وہ لشکر کے ساتھ کہیں چڑھائی کرے تو میں اس کے پاس نہیں جاتا'۔

اہل لغت اور مفسرین نے اس لفظ کے مادہ کے بارے میں تین امکانات کا ذکر کیا ہے یا تو یہ لفظ حِلٌّ سے ماخوذ ہے جس کے معنی ہیں حلال ہونا چونکہ میاں بیوی ایک دوسرے کے حلال ہوتے ہیں اس لیے انہیں حلیل اور حلیلۃ کہا جاتا ہے۔ یہ قول زجاج کا قول ہے اس صورت میں فعیل کا وزن مفعول کے معنوں میں ہوگا۔ یعنی حلیلۃ بمعنی مُحَلّلۃ، یا یہ لفظ حَلٌّ سے ماخوذ ہے جس کے معنی کھولنا ہے چونکہ میاں بیوی ایک دوسرے کے لیے اپنا تہہ بند کھول دیتے ہیں اس لیے ان کو حلیل کہا جاتا ہے یا پھر حلول سے ماخوذ ہے جس کے معنی ہیں نازل ہونا یا قیام کرنا چونکہ میاں بیوی ایک ہی جگہ پر ایک ہی بستر اور لحاف میں رہتے ہیں اس لیے اُن کو حلیل یا حلیلۃ کہا جاتا ہے۔ معجم مقاییس اللغۃ میں احمد بن فارس کا قول بھی یہی ہے کہ حل کے معنی نازل ہونا ہے۔ کہا جاتا ہے حَلَلت بالقوم یعنی میں ایک قبیلے کے پاس اترا۔ مرد کو حلیل اور عورت کو حلیلۃ بھی اسی وجہ سے کہا جاتا ہے۔ ابوعبیدہ کا قول ہے کہ ہر وہ آدمی جو آپ کے یہاں نازل ہو یا ساتھ رہتا ہو اسے حلیل کہا جاتا ہے۔ ابوعبیدہ نے یہ شعر نقل کیا ہے:

ولست باطلس الثوبین یُصبی
حلیلۃ اذا ھدأ النیام

Marfat.com

'میں بدصورت نہیں ہوں جو اپنی پڑوسن کا اُس وقت مشتاق ہوتا ہے
جب سونے والے سو جائیں'

اس شعر میں حلیلۃ سے مراد پڑوسن ہے اور اطلس الثوبین بدصورتی کا کنایہ ہے۔ ان دونوں صورتوں میں فعیل فاعل کے معنوں میں ہے۔ حلول کے مادہ کی سب سے خوبصورت توجیہ امام رازی نے اپنے تفسیر (۱۰:۳۴) میں یہ بیان کی ہے کہ چونکہ شدت الفت و محبت کے باعث میاں بیوی میں سے ہر ایک اپنے ساتھی کے قلب و روح میں اتر جاتا ہے اس لیے ایک دوسرے کے لیے حلیل ہوتا ہے۔

صاحب المصباح المنیر نے اسی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے لکھا ہے چونکہ ان میں سے ہر ایک اپنے ساتھی کے یہاں ایسا مقام بنا لیتا ہے جو اور کسی کو حاصل نہیں ہوتا، اس لیے اُن کو حلیل کے اسم سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اسی لیے مجاور (ساتھ رہنے والا) اور نزیل (نازل ہونے والا) کو بھی حلیل کہا جاتا ہے۔ ان لغوی تصریحات سے عورت اور مرد یا میاں بیوی کے درمیان اشتراک کا پہلو ابھر کر سامنے آتا ہے اور اس لفظ سے وہی مفہوم نکلتا ہے جو لفظ زوج (جوڑا) اور صاحب یا صاحبہ (ساتھی) سے نکلتا ہے۔ میاں بیوی کا تعلق ایک ساتھی اور شریک حیات کا تعلق ہے نہ کہ آمر و مامور یا حاکم اور محکوم کا۔

قرآن حکیم میں صرف ایک مرتبہ یہ لفظ جمع کے صیغے کے ساتھ سورۃ نساء میں وارد ہوا ہے آیت یوں ہے: 'حرمت علیکم (...) وَحَلَائِلُ أَبْنَائِكُمُ الَّذِينَ مِنْ أَصْلَابِكُمْ' (۴: ۲۳) یعنی 'اور تم پر حرام کی گئی ہیں (...) تمہارے ان بیٹوں کی بیبیاں جو کہ تمہاری نسل سے ہوں'۔

مولانا امین احسن اصلاحی فرماتے ہیں: 'اس آیت میں جو حرمتیں بیان ہوئی ہیں وہ انسانی فطرت کے اس تقاضے پر مبنی ہیں کہ جہاں رحمی رشتے کی قربت قریب موجود ہو یا اس سے مشابہت پائی جائے۔ وہاں باہمی ارتباط کی بنیاد صرف رحم، محبت، راحت اور شفقت کے اعلیٰ جذبات پر ہونی چاہیے۔ اس میں نہ تو نفس کی شہوت اور رغبت کی آمیزش ہونی چاہیے نہ رشک و رقابت کو اس میں خلل انداز ہونے کا موقع دینا چاہیے۔ یہ چیز اُس فطرت و اصلیہ کے خلاف ہے جس پر فاطر کائنات نے انسان کو پیدا کیا۔ اس وجہ سے ان تمام عورتوں سے ازدواجی تعلق کو اللہ نے حرام قرار دیا ہے جن کو بالواسطہ یا بلاواسطہ رحمی قربت حاصل ہے'۔

محرمات کا ذکر کر کے قرآن نے خاندان کی شیرازہ بندی کی طرف اہم قدم اٹھایا ہے۔ یہ محرمات تمام اقوام عالم کے نزدیک خواہ وہ پس ماندہ ہوں یا ترقی یافتہ مسلمہ ہیں۔ آیت میں حرمت کا صیغہ اس بات پر

Marfat.com

دلالت کرتا ہے کہ یہ تحریم ماضی میں بھی تسلیم شدہ تھی۔ اسلام چاہتا ہے کہ ماں، بہن، بیٹی، بہو، پھوپھی، خالہ، بھتیجی اور بھانجی اور گود کی اولاد کی طرف انسان شفقت اور احترام کی نگاہ سے دیکھے اور ازدواجی زندگی میں جو تلخیاں پیدا ہوتی ہیں یہ رشتے ان سے محفوظ رہیں۔ بیٹوں اور بھائیوں کے احساسات مخدوش نہ ہوں۔ ایک ماں اگر اپنی بیٹی کے ساتھ اس رشتے میں شامل ہو جائے تو شفقت اور راحت کے احساسات کیسے باقی رہیں گے؟ ایک باپ اگر یہ محسوس کرے کہ اس کا بیٹا اس کے بعد اس کی بیوی سے شادی کرے گا یا بیٹا محسوس کرے کہ اس کا باپ اس کی بیوی سے شادی کرے گا تو بیٹے اور باپ کا مقدس رشتہ ختم ہو جائے گا۔ یہ محرمات زمانہ جاہلیت میں بھی محرمات تھیں سوائے باپ کی بیویوں اور دو بہنوں کے ایک ساتھ نکاح کے جو جاہلانہ معاشرے میں کراہت کے ساتھ جائز تھا۔ اسلام قرار دیتا ہے کہ حلال حرام کا تعین صرف اور صرف اللہ کا کام ہے کسی دوسرے کو اس کام میں کوئی اختیار نہیں یہ الوہیت کی خصوصیت ہے۔

آیہ مبارکہ میں من اصلابکم (تمہاری پشت سے) کی قید سے متبنٰی بیٹوں کی بیویوں کو اس حکم سے خارج کر دیا ہے۔ زمانہ جاہلیت میں نسب میں جو بدنظمی تھی اسلام نے اسے روک دیا کیونکہ اس طرح انسان کسی کو متبنٰی بنا کر غیر کی اولاد کو اپنی اولاد سے خلط ملط کر دیتا تھا محض اس لیے کہ کثرت اور قوت کا اظہار ہو۔

امام طبری نے مشہور تابعی عطاء کا قول نقل کیا ہے کہ ”خدا جانتا ہے کہ ہم گفتگو کیا کرتے تھے کہ یہ آیت حضرت محمد ﷺ کے بارے میں نازل ہوئی جب آپؐ نے زید کی بیوی سے نکاح کیا تو مشرکین نے اعتراض کیا“۔

رسول اکرم ﷺ نے زینب بنت جحش اسدیہ سے جو آپ کی پھوپھی اُمیمہ بنت عبدالمطلب کی بیٹی تھیں زید بن حارثہ سے علیحدگی کے بعد نکاح کیا تو اللہ نے فرمایا: ”لِكَيْ لَا يَكُونَ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ حَرَجٌ فِي أَزْوَاجِ أَدْعِيَائِهِمْ“ (۳۳:۳۷) ”تاکہ مومنوں پر اپنے منہ بولے بیٹوں کی بیویوں کے (نکاح کے) بارے میں کچھ تنگی نہ ہو۔“

اس سلسلہ میں ائمہ اربعہ نے نسبی بیٹے کی طرح رضاعی بیٹے کی بیوی کو بھی حرام قرار دیا ہے صرف امام شافعی کا ایک قول اس مسلک کے خلاف ہے کیونکہ نبی کریم ﷺ کا فرمان ہے کہ ”یحرم من الرضاع ما یحرم من النسب“ یعنی جو نسبت سے حرام ہے وہ رضاعت سے حرام ہے۔

Marfat.com

تفسیر المنار میں بعض علماء کا قول نقل کیا گیا ہے کہ ابناء میں نسبی بیٹے، پوتے اور نواسے تو شامل ہیں مگر رضاعی بیٹے شامل نہیں کیونکہ وہ اس کی نسل سے نہیں نہ ہی بالذات اور نہ ہی بالواسطہ۔ انھوں نے نبی کریم ﷺ کے فرمان کا یہ جواب دیا ہے کہ بیٹے کی بیوی نسب کی وجہ سے نہیں بلکہ مصاہرت کی وجہ سے حرام ہے۔ منہ بولا بیٹا تو بیٹا ہوتا ہی نہیں، نہ شرعاً اور نہ عرفاً، کہ اس کے استثناء کی ضرورت پڑے کیونکہ اللہ نے جب یہ آیت وَمَا جَعَلَ أَدْعِيَاءَكُمْ أَبْنَاءَكُمْ (الأحزاب ۳۳:۴) یعنی اس نے تمھارے منہ بولے بیٹوں کو تمھارے (حقیقی) بیٹے نہیں بنائے۔ نازل ہوئی تو یہ دستور اسلام میں باطل ہو گیا۔

آیہ مبارکہ میں ایک اہم مسئلہ یہ ہے کہ کیا حلیلہ کا اطلاق لونڈی پر بھی ہوتا ہے اور کیا باپ کے لیے جائز ہے کہ وہ بیٹے کی لونڈی سے نکاح کر لے۔ امام رازی تفسیر کبیر میں اس مسئلے کو لغوی طور پر نسبتاً تفصیل سے بیان کرتے ہیں وہ فرماتے ہیں (۱۰:۳۴)' امام شافعیؒ کا قول ہے کہ باپ کے لیے جائز نہیں کہ وہ اپنے بیٹے کی لونڈی سے نکاح کرے۔ جبکہ امام ابوحنیفہ کا قول ہے کہ باپ کے لیے جائز ہے۔ حلیلہ فعیلہ کے وزن پر فاعل اور مفعول دونوں معنوں میں ہے۔ اس کی دو صورتیں ہیں جن میں ایک تو یہ ہے کہ اسے حل سے ماخوذ سمجھا جائے جس کا مطلب حلال ہونا ہے۔ لہٰذا حلیلۃ کے معنی ہوں گے محللۃ، حلال ہونے والی۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ لونڈی کی پوزیشن بھی بیوی کی طرح ہی ہوتی ہے چنانچہ اس سے لازم آتا ہے کہ اسے بھی حلیلۃ سمجھا جائے۔

دوسرے یہ کہ انہیں اسے حلول (نزول) سے مشتق سمجھا جائے تو اس صورت میں حلیلۃ کے معنی ہیں جو حلول کی جگہ پر ہو اور بلاشبہ لونڈی اپنے مالک کے حلول کی جگہ ہے اگر ہم حلیلۃ کو فاعل کے معنوں میں لیں تو اس کی بھی دو صورتیں ہیں۔ ایک تو یہ کہ ایک دوسرے کے گہرے تعلق کی وجہ سے یوں لگتا ہے کہ وہ ایک ہی کپڑے ایک ہی لحاف اور ایک ہی گھر میں رہتے ہیں بلاشبہ لونڈی کی بھی یہی پوزیشن ہے۔ دوسرے یہ کہ ایک دوسرے سے شدت محبت کے باعث اپنے ساتھی کے روح وقلب میں مقام بنا لیا ہے۔ ان تمام باتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ لونڈی پر بھی بیوی کی طرح لفظ حلیلۃ کا اطلاق ہوتا ہے۔ چنانچہ بیٹے کی لونڈی بھی باپ کے لیے حرام ہو گی۔

Marfat.com

حُور

مقاییس اللغة میں ہے کہ الحاء، الواو اور الراء کے مادے کے تین بنیادی معنی ہیں:

ا۔ رنگ ۲۔ رجوع ۳۔ کسی چیز کا خوب گھومنا

پہلا بنیادی معنی حَوَر سے مشتق ہے جس سے مراد ہے: "آنکھ کی سفیدی کا بہت زیادہ سفید اور سیاہی کا بہت زیادہ سیاہ ہونا"۔ لسان العرب میں ازہری کا قول منقول ہے کہ عورت کو اس صفت سے اس وقت متصف کیا جائے گا جب آنکھوں کی سفیدی کے ساتھ ساتھ جسم بھی سفید ہو۔ مختصر العین میں ہے کہ صرف سفید عورت کو حوراء کہا جاتا ہے۔ اسی حَور کو آنکھوں کا انتہائی حسن سمجھا جاتا ہے چنانچہ جریر کا شعر ہے:

ان العیون التی فی طرفها حور

قتلننا ثم لم یحیین قتلانا

بے شک جن آنکھوں میں شدت سے سفیدی اور شدت سے سیاہی پائی جاتی ہے

انھوں نے ہمیں ایسے بے جان کر دیا کہ پھر ہم جی ہی نہ سکے۔

مقاییس اللغة میں اصمعی کا قول نقل ہوا ہے کہ مجھے معلوم نہیں حَوَر فی العین کی صفت کیا ہوتی ہے؟ مگر عربوں کا محاورہ ہے حوّرت الثیاب "میں نے کپڑوں کو سفید کر دیا"۔ حضرت عیسٰی علیہ السلام کے ساتھیوں کو حواری اس لیے کہا جاتا تھا کہ وہ کپڑوں کو سفید کرتے تھے یعنی دھوبی تھے اور یہی اس لفظ کی اصل ہے، چنانچہ میدے کی روٹی کو الخبز الحوار کہا جاتا ہے۔ اسی وجہ سے بادیہ نشین لوگ شہر کی عورتوں کو حواریات کہتے تھے کیونکہ ان کے رنگ دیہاتیوں کے مقابلے میں زیادہ سفید ہوتے تھے۔

واحدی ابن اثیر اور راغب نے بھی اس معنی کی تائید کی ہے۔ اُم سلمہؓ اور ابن عباسؓ کی روایات سے بھی اسی معنی کی تائید ہوتی ہے اگر اُم سلمہ سے مروی حدیث صحیح ہے تو رسول اللہ ﷺ کی تفسیر سے بڑھ کر اور کون سی تفسیر ہو سکتی ہے؟

ابو عمرو کا قول ہے کہ حَوَر کے معنی یہ ہیں کہ ساری کی ساری آنکھ چشم آہو کی طرح سرمئی ہو، یہ صفت عام طور پر انسانوں میں نہیں پائی جاتی، صرف عورتوں کو ہرن سے تشبیہ دے کر اس صفت سے متصف کیا جاتا ہے۔ ان مجازی معنوں کے پیش نظر خاص اور خالص انسانوں کو حواری کہا جاتا ہے کیونکہ ان کے دل شک اور نفاق سے پاک تھے اس لیے ان کو حواری کہا جاتا تھا۔ ان کے دل سفید کپڑے کی طرح اجلے تھے۔ تفسیر المنار میں ہے لفظ حواری خالص آٹے اور میدے کے لیے بولا جاتا ہے۔ ممکن ہے حواری

Marfat.com

اسی سے ماخوذ ہو کیونکہ اس کا اطلاق قوم کے بہترین برگزیدہ انسانوں پر ہوتا ہے۔ لسان العرب میں زجاج کا قول منقول ہے کہ انبیاء کے خالص اور برگزیدہ پیروکار حواری کہلاتے ہیں۔ بعض کا قول ہے کہ ان کو حواری اس لیے کہتے ہیں کہ وہ دلوں کے میل کو صاف کرتے تھے۔ حور سے مراد سفیدی ہے۔ اس کی تائید عبداللہ بن مسعود کی قراءت کرتی ہے جنھوں نے حَوَر کی جگہ عیس عین پڑھا ہے کیونکہ عیس سفید کو کہتے ہیں۔ جس مرد میں یہ صفت پائی جائے اسے اَحْوَر اور جس عورت میں یہ صفت پائی جائے اسے حوراء کہا جاتا ہے اور دونوں کی جمع حُوْر ہے۔

سید قطب نے آیت نمبر ۵۶:۲۲ کی تفسیر کے تحت لکھا ہے کہ لفظ حور میں حسی اور نفسیاتی معنوں کا کنایہ ہے۔ اہل لغت اور مفسرین نے بھی اس کے مجازی معنوں کی طرف اشارہ کیا ہے۔ امام طبری نے اپنی تفسیر میں آیت نمبر ۵۵:۷۲ کے ضمن میں مجاہد کا قول نقل کیا ہے کہ حور سے مراد وہ لوگ ہیں جن کے دل، نفس اور آنکھوں میں سفیدی ہو۔ پھر انہوں نے آیت نمبر ۵۶:۲۲ کی تفسیر میں عطاء خراسانی کی روایت پیش کی ہے کہ انھوں نے حسن بصری کو کہتے سنا کہ حور سے مراد بنی آدم کی صالح عورتیں ہیں، احور کے معنی عقل و دانش کے ہیں۔ صحاح نے ابن السکیت سے روایت کی ہے کہ عربی کا محاورہ ہے ما یعیش باحور 'وہ عقل سے زندگی نہیں گزارتا ہے'۔ Lane نے Lexicon میں مختلف حوالوں سے اُحور کے معنی Pure or clean intellect یعنی پاکیزہ اور صاف عقل لکھے ہیں۔ انھوں نے بھی مذکورہ محاورہ کو بیان کیا ہے چنانچہ حور سے مراد وہ لوگ ہیں جن کی عقل پاکیزہ اور شفاف ہو نہ کہ فریب کار اور حیلہ جو۔ ترتیب القاموس المحیط میں ایک اور محاورہ مذکور ہے ھو بعید الحور یعنی وہ بڑا عقلمند ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ جنت میں رہنے والے رفقاء ظاہری اور باطنی حسن و جمال سے مزین ہوں گے۔

قرآن میں حور کے اوصاف

اللہ تعالیٰ نے جنس کا نام لیے بغیر صرف ان کی صفات کا ذکر کیا ہے کیونکہ اسم جنس سے وہ حقیقت ظاہر ہو جاتی ہے جو صفات سے ظاہر نہیں ہوتی، مثلاً جب ہم متحرک، صاحب ارادہ اور کھانے پینے والے کا ذکر کرتے ہیں تو ان اوصاف سے متصف کے بارے میں وضاحت نہیں ملتی، مگر جب آپ انسان اور حیوان کہتے ہیں تو بات بالکل واضح ہو جاتی ہے یہاں بھی مقصد یہ ہے کہ ان کی ماہیت پس پردہ رہے۔ دوسرے اس سے عورت کی عظمت ظاہر ہوتی ہے کیونکہ آپ بڑے لوگوں کی بیٹیوں کا نام نہیں لیتے صرف ان کی صفات کا ذکر کرتے ہیں۔ مقصد یہ ہے کہ ان کی قدر و قیمت ان لوگوں کی نظر میں بڑھ جائے جن سے جنت کا وعدہ کیا گیا ہے۔ حور کی جن صفات کا ذکر قرآن حکیم میں کیا گیا ہے وہ درج

Marfat.com

ذیل ہیں:

حُورعین

حــور کی پہلی صفت عِیــن (بڑی بڑی آنکھوں والے یا والیاں) ہے جس کا ذکر آیت ۳۷:۴۸؛ ۴۴:۵۴؛ ۵۲:۲۰ اور ۵۶:۲۳ میں کیا گیا ہے۔ یہ اعیــن کی جمع ہے جس کا اطلاق مرد پر ہوتا ہے اور عینــاء کی بھی جمع ہے جس کا اطلاق عورتوں پر ہوتا ہے۔ امام رازی نے آیت نمبر ۴۴:۵۴ کی تفسیر کے ضمن میں جبائی کا قول نقل کیا ہے کہ جب مرد کی آنکھیں بڑی بڑی ہوں تو اسے اعیــن کہا جاتا ہے اور جب عورت کی آنکھیں بڑی بڑی ہوں تو اسے عیناء کہا جاتا ہے۔ جمع دونوں کی عِین ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو نہ صرف حسن سے متصف کیا ہے بلکہ خوب سے خوب تر کو بیان کیا ہے۔ انسان کی شکل میں خوبصورت ترین چیز چہرہ ہوتا ہے اور چہرے میں خوبصورت ترین چیز آنکھیں ہوتی ہیں۔ حور کی صفت اعضا میں حسین امتزاج پر دلالت کرتی ہے جبکہ عیــن کی صفت روح میں حسن کو بیان کرتی ہے۔ حسنِ امتزاج کی علامت حور یعنی ظاہری حسن ہے اور روحانی حسن کی علامت عین یعنی آنکھوں کا بڑا ہونا ہے۔ یہ اس بات کی علامت ہے کہ انھیں روح کا ایک خزانہ عطا کیا گیا ہے۔ عربی ادب میں عورت کی یہ صفت اُس کے کمالِ حسن کی جامع تفسیر ہے۔

قاصرات الطرف

حور کی ایک اور صفت قرآن حکیم نے آیت نمبر ۳۷:۴۸ اور ۵۵:۵۶ میں بیان کی ہے۔ لفظ قاصرات یا تو قصر سے مشتق ہے جس کے معنی روکنے کے ہیں۔ مطلب یہ ہوا کہ انہیں اپنی نگاہوں پر اتنا اختیار ہے کہ وہ اُن کو دوسروں کی طرف اُٹھنے سے روک لیتی ہیں یا یہ قصور سے مشتق ہے کہ ان کی نگاہیں اتنی کوتاہ ہیں کہ دوسروں کی طرف اُٹھتی ہی نہیں، مگر پہلا مادہ مقامِ مدح میں ہے اور دوسرا مقام ذَمّ میں ہے اس لیے ظاہری طور پر یہ لفظ قصر ہی سے مشتق ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ ان کے اندر ایک مانع موجود ہے جو ان کو دائیں بائیں دیکھنے سے روکتا ہے اس سے مراد یہ ہے کہ ان کی نظر پاکیزہ ہے یعنی فطرتی حسن کے ساتھ وہ عفت و پاکیزگی اور شرم و حیا کی پیکر ہیں، اس ترکیب کے بہت ہی خوبصورت معنی صاحب روح المعانی نے کیے ہیں وہ یہ کہ دیکھنے والے ان کی طرف دیکھتے رہ جاتے ہیں۔ ان کی نگاہیں ان پر ٹک جاتی ہیں اور دوسروں کی طرف نہیں بڑھتیں۔ دلیل کے طور پر انہوں نے متنبّی کا یہ شعر نقل کیا ہے۔

وخصر تثبت الأبصار فيه
كأنّ عليه من حدق نطاقاً

Marfat.com

'اور کمر ایسی کہ نگاہیں اس میں گڑ جاتی ہیں
یوں لگتا ہے کہ آنکھ کی پتلی نے ان کے گرد گھیرا ڈال لیا ہے

لم یطمثھن حور کی ایک اور صفت قرآن حکیم نے سورۂ رحمان میں دو مرتبہ (۵۵:۵۶،۷۴) بیان کی ہے چنانچہ ارشاد ہے: 'لم یطمثھن انس قبلھم ولا جان' یعنی انہیں ان سے پہلے نہ انسان نے چھوا، نہ جن نے۔ امام ابن جریر طبری نے کوفی اہل لغت کا قول نقل کیا ہے کہ طمث کے معنی نکاح کے ذریعہ سے خون نکالنا ہے کیونکہ طمث خون کو کہتے ہیں مگر یہاں مراد صرف یہ ہے کہ جن وانس میں سے کسی نے بھی ان سے مجامعت نہیں کی ہوگی۔ امام رازی کا قول ہے کہ حوروں کے حالات کے مدنظر قریب ترین معنی یہ ہیں کہ ان کو ہاتھ تک نہ لگایا گیا ہوگا۔ مفسرین نے یہاں پر ایک بے محل بحث چھیڑ دی کہ آیا جن عورتوں سے جماع کر سکتے ہیں یا نہیں؟ اس سلسلہ میں ابو عثمان سعید بن داؤد الزبیدی سے روایت ہے کہ اہل یمن نے امام مالک سے فتویٰ پوچھا کہ یہاں ایک جن انسان عورت سے نکاح کرنا چاہتا ہے کیا وہ جائز ہے؟ امام مالک نے لکھا اس میں کوئی برائی تو نہیں لیکن مجھے یہ ناپسند ہے کہ ایک عورت حاملہ ہو جائے اور کہہ دے کہ یہ جن کی طرف سے ہے اور اسلام میں فتنہ پیدا ہو جائے۔ یہ روایت اس لحاظ سے عجیب ہے کہ جن اس زمانہ میں ایسی ہستیاں تھیں جن کو اہل یمن دیکھ سکتے تھے۔ بہرکیف امام مالک کا جواب بتاتا ہے کہ یہ خیال صحیح نہیں کہ جنوں کے انسانوں سے اس قسم کے تعلقات قائم ہو سکتے ہیں ورنہ زنا کار عورتوں کو بنا بنایا عذر مل جاتا۔ یہاں یہ بحث طمث کے لغوی معنوں کی وجہ سے چھڑی ہے حالانکہ اس کے عام معنی چھونا ہی ہیں اور یہاں مراد صرف اسی قدر ہے کہ کوئی مخلوق خواہ جن ہو یا انس، ان کے پاس پھٹکی نہ ہوگی۔ صاحب روح المعانی میں حسن کا قول ہے کہ جنوں کے بارے میں طمث کی نفی دراصل اس کے امکان کی نفی ہے۔ یہ ان کے شوہر نا آشنا ہونے اور کنوار پن کی دلیل ہے۔

فیھن خیرات حسان (۵۵:۷۰) قرآن حکیم نے حوروں کی ایک اور صفت یہ بیان کی ہے کہ ان جنتوں میں خوب سیرت اور خوبصورت عورتیں ہوں گی۔ ہر قسم کی فضیلت والی چیز کو خیرۃ کہا جاتا ہے اور اچھی عورت کو بھی امراۃ خیرۃ کہا جاتا ہے۔ حسان احسن کی جمع بھی ہے اور حسناء کی بھی۔ اس طرح اس کا اطلاق مرد اور عورت دونوں پر ہوتا ہے۔ امام طبری نے اس کی تفسیر یہ لکھی ہے۔ 'فاضل اخلاق والی اور اچھی شکل والی'۔ امام رازی نے لکھا ہے کہ ان کے باطن میں خیر اور ظاہر میں حسن ہے۔ فراء نے عربوں کا محاورہ پیش کیا ہے کہ اعطنی الخیرۃ منھن ان عورتوں میں سے بہترین کو مجھے عطا کر دو (یعنی مجھ سے بیاہ دو) اسے خَیْرَۃ بھی کہا جاتا ہے اور خِیَرَۃ بھی۔ چنانچہ وہ حسن سیرت اور حسن

Marfat.com

صورت سے مزین ہوں گی۔ جنتی معاشرے میں بھی ایسی عورتیں ہوں گی اور اس دنیا کے صحیح اسلامی معاشرے کی عورتیں بھی انہیں خصوصیات کی حامل ہوں گی۔

حور مقصورات فی الخیام (۵۵:۷۲) 'حوریں جو خیموں میں ٹھہرائی ہوئی ہیں'۔ قصرتُہ کے معنی ہیں میں نے اسے محل میں داخل کیا اور راغب کے قول کے مطابق یہ ارشادِ الٰہی اسی سے ہے۔ خیام خیمة کی جمع ہے یہ دیہاتیوں کا گھر ہے جسے وہ درختوں کی ٹہنیوں سے بناتے ہیں یہاں تک کہ عرب اونٹ کے بنے ہوئے گھر کو بھی خیمہ کہتے ہیں کیونکہ وہ بھی قیام کے لیے تیار کیا جاتا ہے۔ عربوں کے نزدیک وہ بیت اور منزل کی طرح ہوتا ہے۔ مولانا اصلاحی کے قول کے مطابق اس آیت میں خالص عربی ذوق نمایاں ہے کیونکہ خیمہ کی رہائش اہل عرب کی پسندیدہ رہائش رہی ہے۔ امرائے عرب کے خیمے شاندار محلوں کے لئے بھی قابلِ رشک ہوتے ہیں اور یہاں جنت کے خیموں کا ذکر ہے۔ یہ آیت بادیہ نشینوں کے اغراض ومقاصد کی تمثیلی انداز میں ترجمانی کرتی ہے۔

یہ بھی ممکن ہے کہ یہاں لفظ خیمہ بطور استعارہ استعمال ہوا ہو یا یہ جیسا کہ حدیث میں ہے الشهید فی خیمة الله یہاں خیمہ سایہ کا استعارہ ہے یعنی شہید اللہ کے زیر سایہ ہوگا۔ مقصورات فی الخیام خیرات حسان سے بدل ہے یعنی خوب سیرت اور خوبصورت عورتیں وہی ہیں جو خیموں میں ٹھہرائی گئی ہیں۔ یہاں ایک نکتہ قابل غور ہے کہ اوپر کی دو جنتوں میں قاصرات یعنی اپنی نظروں کو حیا کی وجہ سے سمٹا کر رکھنے والیوں کا ذکر ہے اور یہاں ان مقصورات کا تذکرہ ہے جن کو بہ حفاظت خیموں میں رکھا گیا ہے۔ خیموں میں انہیں بطور سزا زبردستی نہیں رکھا گیا ہے بلکہ ان کی عظمت کے پیش نظر ان کے لئے خیمے لگائے گئے ہیں۔ اوپر کی جنت میں حوروں کی عفت اور پاکیزگی کی طرف اشارہ ہے جب کہ یہاں ان کی عزت وعظمت کی طرف اشارہ ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی عنایت ہے کہ اس نے عفت کو عظمت سے پہلے بیان کیا ہے۔ پس حوریں قاصرات بھی ہیں اور مقصورات بھی۔ اوپر والی جنتوں میں وہ قاصرات ہیں اور نچلی جنتوں میں وہ مقصورات ہیں۔ دونوں جگہ صفات کا جو فرق ہے اسے پیش نظر رکھنا چاہیے۔ اوپر والی جنت کی حوریں تجربہ وآزمائش سے گزر چکی ہیں اور ثابت قدم ہو چکی ہیں جبکہ نچلی جنت والی حوریں ابھی اس آزمائش سے نہیں گزریں۔ پس یہی فرق ہے ورنہ دونوں عفت وعصمت کا پیکر ہیں۔

إِنَّآ أَنشَأْنَاهُنَّ إِنشَاءًo فَجَعَلْنَاهُنَّ أَبْكَارًاo عُرُبًا أَتْرَابًاo (الواقعة ۵۶: ۳۵ تا ۳۷) ہم نے ان کو خاص طور پر پیدا کیا ہے۔ پس انہیں کنوارایاں (پاکیزہ) بنایا ہے۔ محبت والیاں (خوش بیان) اور ہم عمر۔

Marfat.com

ابوحیان صاحب البحر المحیط کا قول ہے کہ أنشأ سے مراد ایسی اختراع و ایجاد ہے جس سے پہلے کوئی تخلیق نہ ہوئی ہو اور یہ بات حورعین کے ساتھ خاص ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ ہم حوران جنت جو بنی آدم سے نہیں ہیں، کو بغیر کسی ولادت اور تخلیق کے وجود میں لائے ہیں۔ اس لئے ان کی خصوصیات اور صفات اس دنیا کی عورتوں سے مختلف ہیں۔ انہوں نے بالکل مختلف ساخت پر نشو و نما پائی ہے۔ امام رازی نے آیت نمبر (۵۴:۴۴) کی تفسیر کے تحت حضرت ابو ہریرہؓ کا قول نقل کیا ہے کہ وہ دنیا کی عورتیں نہیں ہیں۔ روح المعانی میں محمود آلوسی نے اسی آیت کی تفسیر کے تحت لکھا ہے کہ زیادہ تر روایات اسی بات پر دلالت کرتی ہیں کہ حوریں اس دنیا کی عورتیں نہیں ہیں۔

آگے اس أنشأ (ایجاد) کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا پس ان کو کنواریاں بنایا ہے۔ اور ان کے کنوار پن پر خزاں نہیں آئے گی، نہ حیض آئے گا، نہ بچے جنیں گی بلکہ ہمیشہ جوان رہیں گی۔ جبکہ دنیا کی عورتوں کا کنوار پن اور جوانی ایک وقتی اور فانی چیز ہے۔

پھر ان کی دو اور صفات کا ذکر ہوا ہے۔ عربا اترابا، عُرب عروب کی جمع ہے جیسے صُبُرُ صبور کی جمع ہے اس کے ایک معنی تو یہ ہیں محبت کرنے والیاں، امام ابن جریر نے حضرت ام سلمہؓ سے روایت نقل کی ہے کہ میں نے اللہ کے رسول سے عربا اترابا کا مطلب پوچھا تو آپ نے فرمایا عشق کرنے والیاں، محبت کرنے والیاں اور ہم عمر۔ اس کے دوسرے معنی روح المعانی میں زید بن اسلم کی روایت سے 'خوش کلام' نقل ہوئے ہیں۔

اترابا، تِرب کی جمع ہے جس کے اصل معنی ہم عمر کے ہیں لیکن مجازی طور پر اس کا اطلاق ان پر بھی ہوتا ہے جو حسن و جمال اور شباب میں مماثل ہوں۔ یہ لفظ سورۃ نبا میں بھی وارد ہوا ہے۔ چنانچہ ارشاد ربانی ہے: وکواعب اترابا (۳۳:۷۸) اور نوجوان ہم عمر کواعب کا واحد کاعب ہے۔ جس کا اطلاق اس لڑکی پر ہوتا ہے جس پر جوانی کا ابھار آ گیا ہو۔

قرآن حکیم میں جو حوروں کی صفات بیان ہوئی ہیں وہ یوں ہیں۔

گوری گوری رنگت، موٹی موٹی آنکھیں، باحیا اور نگاہیں نیچی رکھنے والیاں، رنگ سنہری، دوشیزائیں، ہم عمر ہجولیاں، خوبصورت و خوب سیرت، پاکباز و پارسا، زیرک اور عقلمند۔

زوجناھم بحور عین (۵۴:۴۴؛ ۲۰:۵۲) اور ہم انہیں گوری رنگت اور موٹی آنکھوں والی حوروں کا ساتھی بنادیں گے۔

صاحب کشاف امام زمخشری سورۃ طور کی آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ والذین آمنوا کا عطف

Marfat.com

حور عین پر ہے یعنی ہم ان کو حور عین کا اور ایمان والوں کا ساتھی بنائیں گے۔ یہ ایسے ہی ہے جیسا کہ ارشاد ربانی ہے: اِخْوَانًا عَلٰی سُرُرٍ مُّتَقٰبِلِیْنَ (۱۵:۴۷) وہ (متقی) بھائی بھائی تختوں پر آمنے سامنے ہوں گے۔ (یعنی وہ تعلقات اس اعلیٰ درجہ کی محبت کے ہیں جو اخوت کے نام سے موسوم ہے) کبھی وہ حوروں سے ہنسی مذاق کی باتیں کریں گے اور کبھی اہل ایمان سے لطف وانس کی باتیں'۔ صاحب کشاف کے بیان سے ایک بات صاف طور پر ظاہر ہوتی ہے کہ متقیوں کا رشتہ حوروں سے ایسے ہی ہوگا جیسا کہ دوسرے اہل ایمان سے، ان کے درمیان کسی قسم کا جنسی تعلق نہ ہوگا، یہ رشتہ اخوت کا پاکیزہ رشتہ ہوگا۔

زوج کی بحث میں امام راغب اصفہانی نے مفردات القرآن میں اس بات کو اور بھی صاف کر دیا ہے فرماتے ہیں: 'یہاں زوجنا کے معنی باہم ساتھی اور رفیق بنا دینا ہیں یہی وجہ ہے کہ قرآن نے جہاں حور کے ساتھ زوّج کے فعل کا ذکر کیا ہے وہاں اس کے بعد باء لائی گئی ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ حوروں کے ساتھ محض رفاقت ہوگی جنسی میل جول اور ازدواجی تعلقات نہیں ہوں گے کیونکہ اگر یہ مفہوم مراد ہوتا تو قرآن میں زوجنا بحور کی بجائے زوجناھم حورا کہا جاتا، جیسا کہ زوجته امراۃ یعنی میں نے اس عورت سے اس کا نکاح کر دیا۔

قرآن حکیم نے سورۃ احزاب (۲۲:۳۳) کی آیت میں کہا ہے۔ وزوجنکھا (۳۷:۳۳) 'ہم نے آپ سے (رسول اللہ) اس کا (زینب کا) نکاح کر دیا' محمود آلوسی تفسیر روح المعانی (۲۲:۱۴) سورۃ طور کی آیت نمبر ۲ کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ زوجنا کے معنی ہیں ہم نے ملا دیا، ہم نے ساتھی بنا دیا۔ اور انہوں نے اس تفسیر کو زیادہ تر مفسروں کی طرف منسوب کیا ہے اور کہا ہے کہ مشہور یہ ہے کہ فعل تزوج متعدی بنفسہ ہے اور اس کے بعد ایک مفعول بغیر کسی حرف کے استعمال ہوتا ہے اور فعل زوج بھی متعدی بنفسہ ہے اور اس کے بعد دو مفعول بغیر کسی حرف تعدیہ کے آتے ہیں اور یہ قول بھی ہے کہ یہاں باء ساتھ ملانے اور چپکانے کے معنوں میں ہے۔ انہوں نے اس اعتراض کا ذکر کیا ہے کہ تزویج کے معنی عقد نکاح کے اس مقام پر غیر مناسب ہیں کیونکہ جنت تو دار تکلیف نہیں ہے جہاں پر نکاح وغیرہ کی ضرورت پڑے اور نہ جنت میں بقائے نوع کی ضرورت ہے اور نہ ان امور کی جو بقائے نوع سے تعلق رکھتے ہیں۔

ایک اور توجیہہ یہ ہے کہ یہاں باء سبب بیان کرنے کے لیے ہے اس لیے یہاں تزویجِ نکاح کے معنوں میں نہیں بلکہ جوڑا جوڑا بنانے کے معنوں میں ہے۔

محض لفظ تزویج سے ہمارا ذہن جنسی تعلقات کی طرف منتقل نہیں ہونا چاہئے اس میں عروج اور

Marfat.com

ازواج سے مراد ہم فکر رفقاء کے ہوں گے۔ جن میں مرد اور عورتیں سب شامل ہوں گے۔ جنت کی زندگی اجتماعی زندگی ہوگی اس میں بندگان خدا کا ایک دوسرے سے مل جل کر رہنا ضروری ہوگا۔ فادخلی فی عبادی وادخلی جنتی 'پس تو میرے بندوں میں شامل ہو جا اور جنت میں داخل ہو جا' یہ سب مرد اور عورت ایک دوسرے کے زوج ہوں گے۔

حورانِ بہشت کون ہیں؟

ہمارے یہاں تصور یہ ہے کہ جنتی مردوں کو بڑی خوبصورت بیویاں ملیں گی جنھیں قرآن نے حوروں کا نام دیا ہے اس سے آدمی کا ذہن آخرت کی زندگی میں مرد اور عورت کے جنسی تعلقات کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ چند مفسرین کا خیال ہے کہ دنیا کی زندگی میں بیویاں آخرت میں حوروں کی شکل اختیار کر لیں گی۔ چنانچہ ترمذی کی ایک حدیث پیش کی جاتی ہے کہ ایک بڑھیا نبی کریم ﷺ کے پاس آئی اور عرض کیا: یارسول اللہ ﷺ میرے لیے دُعا کریں کہ میں جنت میں جاؤں آپ نے فرمایا جنت میں کوئی بڑھیا داخل نہیں ہوگی۔ وہ روتی ہوئی لوٹ گئی تو آپ نے فرمایا کہ اِسے کہہ دو کہ مطلب یہ ہے کہ بڑھیا ہونے کی حالت میں کوئی عورت جنت میں داخل نہیں ہوگی کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: 'اِنَّآ اَنْشَاْنٰهُنَّ اِنْشَاۗءً ○ فَجَعَلْنٰهُنَّ اَبْكَارًا○' (الواقعہ۵۶:۳۵،۳۶)۔ 'ہم نے ان عورتوں کو خاص طور پر پیدا کیا ہے یعنی ہم نے اُن کو ایسا بنایا کہ وہ کنواریاں ہیں'۔ حقیقت یہ ہے کہ ان آیات میں بھی ان حوروں کا ذکر ہے جن کا بیان پہلے ہو چکا ہے۔ اس سے اس دُنیا کی عورتیں مراد نہیں۔ بہرکیف جن مفسرین کا خیال ہے کہ وہ اس دنیا کی بیویاں ہوں گی وہ عجیب وغریب مخمصے کا شکار ہوئے ہیں۔

جس کا مختصر سا ذکر محمود آلوسی نے روح المعانی میں (۱۳:۱۳۵) میں آیت ۴۴،۴۵ کے تحت کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ جنت میں آدمی کو وہ بیویاں ملیں گی جو اس دنیا میں اس کے پاس ہوں گی۔ ان کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ ان عورتوں کو بھی شامل کر دے گا جو بن بیاہے مر گئی ہوں گی اور جن عورتوں نے ایک مرد سے زیادہ مردوں سے نکاح کیا ہوگا وہ اپنے آخری شوہر کو ملیں گی یا پہلے خاوند سے اگر اس نے ان کو دنیا میں طلاق نہ دی ہوگی یا پھر عورت کو اختیار ہوگا کہ وہ اس خاوند کا انتخاب کریں جس کا سلوک ان کے ساتھ اچھا ہوگا۔ کافر کی وہ بیوی جو جنت میں داخل ہوگی اسے اللہ جسے چاہے گا عنایت کر دے گا اور حدیث میں یہ آیا ہے کہ فرعون کی بیوی آسیہ ہمارے نبی کریم ﷺ کی زوجہ ہوں گی۔ یہ سوچ صرف اس وجہ سے پیدا ہوئی ہے کہ ہم آخرت کی زندگی کو اس دنیا کی زندگی پر قیاس کر کے مرد اور عورت کے جنسی تعلقات کا

Marfat.com

سلسلہ جاری رکھنا چاہتے ہیں۔اس لیے اکثر مفسرین نے حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت کے مطابق حورانِ جنت کو اس دنیا کی بیویوں سے الگ مخلوق قرار دیا ہے۔

ان صفات کے علاوہ قرآن حکیم نے حوروں کے لیے دو تشبیہیں استعمال کی ہیں جو ان کے حسن وجمال کو نکھار عطا کرتی ہیں۔سورۃ صٰفّٰت میں ہے: 'كَأَنَّهُنَّ بَيْضٌ مَّكْنُونٌ ' (۴۹:۳۷)، 'گویا کہ محفوظ انڈے ہیں'۔ انڈے کے اندر جو سفیدی ہوتی ہے جسے ابھی ہاتھ نہ لگا ہو اور نہ اس پر غبار پڑا ہو اس سے حوروں کی رنگت کو تشبیہ دی گئی ہے۔

اکثر مفسرین نے اس تشبیہ کو شتر مرغ کے انڈے سے مخصوص کیا ہے جس کا رنگ سفید ہوتا ہے اور اس کی خوبصورت زردی ہوتی ہے اور دوسرے انڈوں کی نسبت خوش نما ہوتا ہے۔خوبصورت عورتوں کو انڈے سے تشبیہ دیتے ہوئے، انہیں بیضات الخدر کہتے ہیں جیسا کہ امرؤالقیس کا شعر ہے:

و بیضۃ خِدرٍ لا یرام خباؤھا

تمتعت من لھو بھا غیر معجل

'بہت سی ان چھوئی صاف رنگت کی عورتیں جن کے خیموں کا کوئی قصد نہیں کر سکتا۔ میں بڑے سکون کے ساتھ اُن کے ساتھ چھیڑ چھاڑ سے لطف اندوز ہوتا رہا ہوں'

عورت کو انڈے سے تشبیہ دینے کی تین وجوہات ہیں ایک تو صحت وسلامتی، دوسرے حفاظت، تیسرے رنگ کا صاف وشفاف ہونا۔حضرت ام سلمہؓ کا ایک اثر ہے کہ میں نے نبی کریم ﷺ سے کَاَنَّھم بیضٌ مکنون کے بارے میں پوچھا تو آپؐ نے فرمایا کہ ان کی جلد اتنی پتلی اور شفاف ہوتی ہے جس طرح انڈے کے چھلکے کے نیچے سفید جھلی۔تشبیہ میں یہاں زردی مائل سفید انڈے مراد ہیں۔ عربوں کے یہاں معشوقہ کے لیے صفراء(زرد رنگ والی) کی صفت معروف ہے۔چونے کی طرح سفید رنگ مرغوب نہیں ہوتا۔عورت کے چہرے کی رنگت کو بیض مکنون کہنا قرآن حکیم کا اعجاز ہے کیونکہ اس نے بالکل صحیح تصویر کشی کی ہے۔پرندے کے پروں کے نیچے محفوظ انڈے میں زندگی کی حرارت موجود ہوتی ہے جس سے چھلکا غذا حاصل کرتا ہے بالکل ایسے ہی جیسے جلد کا ظاہری حصہ تندرست وتوانا انسان کے جسم کی حرارت سے غذا حاصل کرتا ہے۔وہ چھلکا جس میں انڈا لپٹا ہوتا ہے اس کا رنگ توانائی کے اُس بہاؤ پر دلالت کرتا ہے جو اُس کے وجود میں رواں دواں ہوتی ہے جس طرح جلد کی ظاہری رنگت تندرست وتوانا جسم سے پھوٹی پڑتی ہے۔

بعض مفسرین نے بیض سے مراد موتی لیے ہیں اس صورت میں وجہ شبہ رنگت کا صاف اور شفاف ہونا ہے

Marfat.com

جیسا کہ ابو دہبل کا شعر ہے:

وھی زھراء مثل لؤلؤة الغوّا
ص میزت من جوھر مکنون

دوسری تشبیہ کا ذکر سورۃ رحمان میں یوں ہے: "کَاَنَّهُنَّ الْیَاقُوْتُ وَالْمَرْجَانُ" (۵۵:۵۸)۔ گویا وہ حوریں یاقوت اور مرجان ہیں۔ ان کے حسن و جمال کو صاف شفاف گوہر آبدار سے تشبیہ دے کر قرآن حکیم نے اپنے ذوق جمال کا ثبوت پیش کیا ہے۔ قتادہ کا قول ہے کہ صاف و شفاف ہونے میں انہیں یاقوت سے تشبیہ دی گئی اور رنگت کی سفیدی میں مرجان سے۔ ابن عطیہ کا قول ہے کہ یاقوت مرجان ایسے ہیرے اور موتی ہیں جن کو دیکھ کر انسان فرحت و سرور محسوس کرتا ہے اس لیے اللہ نے ان کے حسن و جمال کو شفافیت اور لطافت میں ان سے تشبیہ دی ہے۔

عبداللہ بن مسعود سے مروی ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا کہ جنت کی عورتوں نے اگر ریشم، اطلس کے لباس بھی پہنے ہوں گے تو ان کی پنڈلیوں کی سفیدی پھر بھی نظر آ جائے گی۔ ابن حیان نے اس اثر کے لیے ترمذی کا حوالہ دیا ہے۔ صاحب کشاف کا کہنا ہے کہ ان کی پنڈلیوں کا گودا ایسے نظر آئے گا جیسے سفید بلوریں جام میں سرخ شراب۔ یاقوت میں اگر آپ دھاگا ڈالیں تو وہ اس کی صاف و شفاف سطح سے واضح طور پر نظر آ جائے گا۔ مرجان (مونگا) چھوٹا موتی ہوتا ہے جو بڑے موتی کی نسبت زیادہ سفید ہوتا ہے اس لیے خاص طور پر اس کا ذکر کیا گیا ہے۔ مقصد یہ ہے کہ وہ یاقوت و مرجان کی طرح شگفتہ اور تابناک ہوں گی صورت کے لحاظ سے بھی اور سیرت کے لحاظ سے بھی۔

جنت کی نعمتیں کیا صرف مردوں ہی کے لیے ہیں؟

جنت صرف مردوں کے لیے مخصوص نہیں بلکہ مومن مرد اور مومن عورتیں سب جنت میں داخل ہوں گے جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: "وَمَنْ يَعْمَلْ مِنَ الصَّالِحَاتِ مِن ذَكَرٍ اَوْ اُنْثَىٰ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ وَلَا يُظْلَمُوْنَ نَقِيْرًا" (النساء ۴:۱۲۴) جو کوئی بھی نیک کام کرے گا خواہ وہ مرد ہو یا عورت اور وہ مومن بھی ہو وہ جنت میں داخل ہوں گے اور ان پر ذرا بھی ظلم نہ ہوگا۔ جنت کی تمام نعمتیں دونوں کو ملیں گی۔ حورعین بھی جنت کی نعمتوں میں سے ایک نعمت ہے جسے نہ آنکھوں نے دیکھا نہ کانوں نے سنا۔

Marfat.com

لفظ حور کا ذکر آتے ہی ہمارے یہاں ذہن عورت اور مرد کے جنسی تعلقات کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ ہمیں جنتی زندگی کی تفصیل کو مادی شکلوں میں سامنے نہیں لانا چاہیے۔

جس طرح بہشت کے پھلوں کو اس دنیا کے پھلوں پر قیاس نہیں کیا جا سکتا اور بہشت کے پانی اور دودھ کی نہروں کو یہاں کی نہروں پر قیاس نہیں کیا جا سکتا اسی طرح بہشت کی حوروں کو اس دنیا کی عورتوں پر قیاس نہیں کیا جا سکتا۔ اعمال حسنہ کے نیک نتائج کو جس طرح ان الفاظ میں ظاہر کیا گیا ہے جو کھانے پینے سے تعلق رکھتے ہیں اور انسان کی بقا کا موجب ہیں اسی طرح ان الفاظ میں بھی ظاہر کیا گیا ہے جو حسن منظر سے تعلق رکھتے ہیں اور راحت ولذت وسرور کا موجب ہوتے ہیں۔ جس طرح اس دنیا کی زندگی میں ایک وہ چیزیں ہوتی ہے جو انسان کی بقا کی موجب ہیں اور دوسری وہ جو اس کی راحت وسرور کا موجب ہیں۔

اسی طرح بہشتی نعمتوں میں دونوں چیزوں کا ذکر ہے اور غرض صرف یہ بتانا ہے کہ بہت سی وہ اعلیٰ سے اعلیٰ چیزیں ملیں گی جو انسان کی روح کے بقا کا موجب ہیں اور وہ بھی جو اس کی روح کے لیے لذت وسرور کا موجب ہیں۔ پس ایک طرف اگر پھلوں کا، گوشت کا، دودھ کا اور پانیوں کا ذکر ہے تو دوسرے طرف مناظر حسن کا ذکر ہے کیونکہ حسن انسان کی طبیعت میں سرور وراحت پیدا کرنے کا سب سے بڑا سبب ہے پھر اس حسن کا رنگ کہیں تو زیب وزینت کے سامانوں میں نظر آتا ہے جیسے تخت اور فرش اور کہیں مناظر قدرت کے رنگ میں جیسے بہتے ہوئے چشمے، گھنے سایہ دار درخت۔ لیکن ان دونوں سے بڑھ کر اللہ تعالیٰ نے انسان کی شکل میں حسن کو انسان کے لیے مرغوب خاطر کیا ہے۔ اس لیے منظر حسن و جمال کو کمال تک پہنچانے کے لیے اس رنگ کا بھی ذکر فرمایا ہے اور اسی سلسلہ میں حور وغلمان کا ذکر ہے۔ یہ ذکر بطور مثال ہے کیونکہ خوبصورتی میں اگر کسی چیز کی مثال دینی ہو تو وہ عورت سے ہی دی جا سکتی ہے۔ عورت حسن کی علامت ہے مگر اس کو شہوانی خیالات سے منسوب کرنا انسان کے اپنے شہوانی میلانات کا نتیجہ ہے۔

قرآن نے بہشت کی کسی نعمت کے لحاظ سے مردوں اور عورتوں میں فرق نہیں رکھا۔ بلاشبہ حور بہشت کی نعمت ہے اور یہ نعمت مردوں اور عورتوں کے لیے یکساں ہے۔ امام راغب نے جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے لفظ زوج کی بحث میں اس بات کو صاف کر دیا ہے کہ حور کے ساتھ تزویج نکاح کے رنگ میں نہیں بلکہ

Marfat.com

ساتھی اور ہم نشین کے رنگ میں ہے یعنی جنتی زندگی ایسے رفقاء پر مشتمل ہوگی جو صورت و سیرت میں یکتا ہوں گے اور جن کے درمیان جنسی رشتہ کی بجائے انسانیت اور اخوت کا رشتہ ہوگا۔ اس کے علاوہ لفظ حور اور عین بھی صرف مؤنث کے لیے نہیں بولا جاتا۔ یہ الفاظ جمع ہیں اُن کا واحد احور اور اُعین بھی ہے جو مذکر ہے اور حوراء اور عیناء بھی جو مؤنث ہے۔ اگر چہ یہ الفاظ ایسے ہیں جو عام طور پر عورتوں کے لیے استعمال ہوتے ہیں مگر ان سے مراد صرف عورتیں نہیں ہوسکتیں کیونکہ بہشتی نعمتوں میں نام بیشک اسی دُنیا کے ہیں گو ان چیزوں کی اصلی حقیقت وہ نہیں۔ اصل مقصد کمال حسن کا اظہار ہے جو انسان کے حسن عمل کا نتیجہ ہے مگر اس عالم میں ایک نیا رنگ اختیار کر لیتا ہے جس کی حقیقت کو ہم اس دُنیا میں نہیں سمجھ سکتے۔ جنت کی کیفیت کو ہم نہیں سمجھ سکتے لیکن بظاہر یہی سمجھ آتا ہے کہ جنت میں نہ تو بقائے نوع کی ضرورت ہے اور نہ ان امور کی جو بقائے نوع سے تعلق رکھتے ہیں۔

ایک اور توجیہہ یہ ہے کہ حوروں سے مراد اس دنیا کی عورتیں لی جائیں اس صورت میں حور بھی انہی مقربین بارگاہ الٰہی کی صفت ہوگی جو عورتوں میں سے قرب الٰہی کا بلند مرتبہ حاصل کریں گی اور نگاہیں جھکانے والی بھی وہ بیبیاں ہوں گی جنہوں نے اس دنیا میں بھی اپنی نگاہوں کو ناجائز موقع پر نہیں اٹھایا ہوگا۔

ترمذی کی ایک حدیث میں ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ایک بوڑھی عورت کے سوال پر کہا کہ جنت میں کوئی عورت بوڑھی نہ ہوگی وہ غمزدہ ہوئی، تو آپؐ نے فرمایا اسے کہو کہ مطلب یہ ہے کہ بڑھیا ہونے کی حالت میں کوئی عورت جنت میں داخل نہ ہوگی کیونکہ اللہ فرماتا ہے: "إِنَّـآ أَنشَـأۡنَـٰهُنَّ إِنشَـآءً ٥ فَجَعَلۡنَـٰهُنَّ أَبۡكَارًا ٥" "ہم نے انہیں خاص طور پر بنایا ہے پس انہیں نوجوان بنایا ہے (۵۶:۳۵:۳۶) ہر عورت اس بات پر فخر کرسکتی ہے کہ وہ اعمال حسنہ سے قرب الٰہی کا بلند مقام حاصل کرے گی۔

Marfat.com

رحم (بچہ دانی)

لغوی مفہوم

اکثر اہل لغت کا خیال ہے کہ رَحْمٌ، رِحْمٌ اور رَحِمٌ کے بنیادی معنی ماں کے پیٹ کی وہ جگہ ہے جہاں بچہ وجود پذیر ہوتا ہے پھر بطور استعارہ یہ لفظ قرابت اور رشتہ داری کے لیے بولا جاتا ہے کیونکہ تمام رشتہ دار رحم کی پیداوار ہوتے ہیں۔ چنانچہ رحم مادر سبب قرابت بن جاتا ہے۔ لفظ رحمت بھی رحم سے ماخوذ ہے کیونکہ وہ اس چیز پر مہربان ہوتا ہے جو اس کے اندر پرورش پا رہی ہوتی ہے۔ اس طرح رحم مادر محل رحمت و نعمت قرار پاتا ہے۔ المفردات، لسان العرب، المصباح المنیر، المعجم الوسیط اور Lexicon میں اسی رائے کا اظہار کیا گیا ہے۔ مگر احمد بن فارس صاحب مقاییس اللغۃ کا خیال ہے کہ راء، حا اور میم کا مادہ رقت، شفقت اور رافت پر دلالت کرتا ہے۔ رحمت اور رُحم کے ایک ہی معنی ہیں۔ پھر استعارۃً رحم مادر اور قرابت کو رحم کہا جاتا ہے کیونکہ اس کے اندر وہ بچہ پرورش پاتا ہے جس کے بارے میں رحمت و شفقت کے جذبات اُبھرتے ہیں۔ صاحب القاموس المحیط کی بھی یہی رائے ہے۔ وہ سنن ابی داؤد کی اس روایت سے استدلال کرتے ہیں کہ اللہ کا فرمان ہے کہ 'میں رحمان ہوں اور یہ رحم ہے میں نے اسے اپنے نام سے مشتق کیا ہے'۔ وجہ تشبیہ یہ ہے کہ رحم وہ مقام ہے جہاں لوگوں میں ایک دوسرے کے لیے رحمت کے جذبات پیدا ہوتے ہیں۔ امام رازی تفسیر کبیر (۹:۱۶۵) میں فرماتے ہیں: 'چاہے رحم مادر اصل ہو یا رحمت و شفقت دونوں قریب المعنی ہیں ان کا مفہوم ایک ہی ہے'۔

بے محل نہ ہوگا اگر ایک آیت مبارکہ کے لغوی نکتہ کی تھوڑی سی تشریح کر دی جائے۔ سورۃ کہف میں ارشاد ربانی ہے: 'فَأَرَدْنَا أَن يُبْدِلَهُمَا رَبُّهُمَا خَيْرًا مِّنْهُ زَكَاةً وَأَقْرَبَ رُحْمًا' (۱۸:۸۱) 'پس ہم نے ارادہ کیا کہ بجائے اس کے ان کا پروردگار ایسا بچہ دے دے جو پاکیزگی میں اس سے بہتر ہو اور محبت کرنے میں اس سے بڑھ کر ہو'۔ جب بندۂ خدا نے ایک لڑکے کو قتل کر دیا تو موسیٰ علیہ السلام نے اعتراض کیا کہ تو نے ناحق ایک پاکیزہ نفس کو قتل کر دیا۔ زیر بحث آیت میں بندۂ خدا اس اعتراض کا جواب دیتا ہے۔ آیت مبارکہ میں لفظ رحم قابل تشریح ہے۔ بعض بصری اہل لغت کا خیال ہے کہ یہ رحم سے ماخوذ ہے اور استعارۃً قرابت داری کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ امام راغب نے بھی رُحم کو رَحِم کی دوسری لغت قرار دیتے ہوئے آیت کا ترجمہ یہ کیا ہے کہ 'قرابت داری اس سے بہتر ہو'۔ صاحب البحر المحیط ابو حیان نے بھی اسی معنی کی تائید کی ہے مگر اکثر اہل لغت کا خیال ہے کہ رُحْمٌ، رَحِمٌ

Marfat.com

سے اسی طرح مصدر ہے جس طرح رحمة اور مرحمة اس سے مصدر ہیں۔ ابواسحاق کا قول ہے کہ رُحْمَ کے معنی شفقت اور رحمت کے ہیں۔ یہاں قرابت کے معنی اس لیے موزوں نہیں کیونکہ مقتول اور اس کا نعم البدل قرابت کے لحاظ سے بالکل ایک جیسے ہیں ان میں قطعی کوئی فرق نہیں۔ صاحب کشاف بھی اسی رائے کی تاکید کرتے ہیں۔ لسان العرب میں ان معنوں کی تائید میں رؤبہ بن حجاج کا یہ شعر نقل کیا گیا ہے:

یا مُنزِلَ الرُّحْمِ علی اِدریسا

ومنزل اللعن علی ابلیسا

روح المعانی میں ابن منذر اور ابن ابی حاتم کے حوالہ سے ابن عباس کی روایت نقل کی گئی ہے کہ "اس بچے کے قتل ہونے کے بعد ان کے ہاں ایک لڑکی پیدا ہوئی جس کے بطن سے نبی پیدا ہوا" مزید تفصیل کے لیے ثعلبی کا قول نقل کیا گیا ہے کہ اس لڑکی نے پیغمبر یونس علیہ السلام بن متی کا زمانہ پایا۔ وہ ایک نبی سے بیاہی گئی اور اس کے بطن سے ایک نبی پیدا ہوا جس کے ذریعہ سے اللہ نے ایک امت کو ہدایت بخشی۔ اس روایت کی وجہ تائید بیان کرتے ہوئے صاحب روح المعانی فرماتے ہیں کہ "لڑکی عادتاً اپنے والدین پر لڑکے سے بڑھ کر مہربان ہوتی ہے"۔

ذوالأرحام اور أولو الأرحام قرآن حکیم کی اصطلاحیں ہیں۔ فصیح عربی میں ان سے مراد رشتے دار ہیں مگر فقہ اور قانون کی زبان میں ان کا اطلاق اُن رشتہ داروں پر ہوتا ہے۔ جو باپ کی جانب سے نہ ہوں۔ ورثے میں اُن کا حصہ چونکہ متعین نہیں ہوتا اس لیے انہیں اصحاب فروض نہیں گردانا جاتا ہے۔ یہ عام طور پر عورت کی جانب کے رشتے دار ہوتے ہیں۔ ان کو اولو الارحام کہا جاتا ہے کیونکہ وہ ایک ہی رحم کی پیداوار ہوتے ہیں۔

آیت کا اعراب

سورۃ نساء کی آیت (۱:۴) میں الأَرْحَامَ کے آخر میں عام طور پر دو حرکتیں پڑھی گئی ہیں۔ قراء سبعہ میں سے حمزہ کے علاوہ سب قراء نے الارحام کے میم پر زبر پڑھی ہے۔ اس صورت میں الارحام اللہ پر معطوف ہے۔ یعنی اتقوا اللہ و (اتقوا) الأرحام "یعنی اللہ سے ڈرو اور رحموں سے ڈرو" یعنی جس طرح اللہ کا تقویٰ اس کی اطاعت گزاری اور گناہوں سے اجتناب سے حاصل ہوتا ہے۔ بالکل اسی طرح ارحام کا تقویٰ صلہ رحمی کرنے اور قطع رحمی نہ کرنے سے حاصل ہوتا ہے۔ تقوی میں یہ قدر مشترک ہے یہ خاص کا عطف عام پر ہے۔ ارحام کا تقویٰ اللہ کے تقوی کا ایک جزو ہے۔ مجاہد،

Marfat.com

قتادہ، سدی، ضحاک، ابن زید، فراء اور زجاج جیسے مشاہیر نے آیت کی یہی تفسیر کی ہے۔ واحدی نے الارحام کے آخر میں زبر کی توجیہ یہ کی ہے کہ یہ اغراء (Warning & Exhortation) کی وجہ سے منصوب ہے بالکل ایسے جیسے کہا جاتا ہے: 'الأسدَ الأسدَ' (شیر سے بچو) یعنی قطع رحمی سے بچو۔ یہ توجیہ قطع رحم کی حرمت اور صلہ رحمی کے وجود پر دلالت کرتی ہے اور اتقوا کا تکرار نفوس کی تنبیہہ کے لیے ہے۔

عبداللہؓ بن مسعود، عبداللہ بن عباسؓ، ابراہیم النخعی، قتادہ حسن البصری، اعمش اور قراء سبعہ میں سے حمزہ نے الارحام میم کی زیر کے ساتھ پڑھا ہے۔ اس صورت میں، تسآؤلون به میں ضمیر مجرور متصل پر معطوف ہے یعنی اس اللہ سے ڈرو جس کے نام کا واسطہ دے کر تم ایک دوسرے سے سوال کرتے ہو اور ان رحموں سے ڈرو جن کا واسطہ دے کر تم ایک دوسرے سے سوال کرتے ہو۔ عربوں کی عادت تھی کہ وہ اللہ کے نام کے ساتھ رحم کا واسطہ دے کر ایک دوسرے سے رحم کی اپیل کرتے تھے اور کہا کرتے تھے: 'اسالك بالله والرحم' مشرکین مکہ بھی اللہ کے رسول ﷺ کو لکھا کرتے تھے 'ننا شدك الله والرحم ان لا تبعث الینا فلانا فلانا' 'ہم آپ کو اللہ اور رحم کا واسطہ دیتے ہیں کہ فلاں فلاں کو ہمارے یہاں نہ بھیجنا'۔ علامہ رشید رضا تفسیر المنار میں لکھتے ہیں کہ استاد امام یعنی مفتی محمد عبدہ نے بھی اسی قرأت کو اختیار کیا ہے۔ علماء نحو اور بعض مفسرین (خاص طور پر صاحب کشاف) نے اس قرأت پر یہ اعتراض وارد کیا ہے۔ کہ اسم ظاہر کا عطف ضمیر پر جائز نہیں۔ امام رازی نے اس اعتراض کو اس وجہ سے ضعیف قرار دیا ہے کہ حمزہ کا شمار قراء سبعہ میں ہوتا تھا۔ وہ کتاب وسنت کے عالم تھے انھوں نے یہ قرات اپنی طرف سے نہیں بلکہ رسول اللہ ﷺ کی سند سے پیش کی ہے۔ علاوہ ازیں ابوحیان نے قرآن حکیم میں اس عطف کی یہ مثال پیش کی ہے: 'وکفر به والمسجد الحرام' (البقرۃ ۲:۲۱۷) 'اور اس کے ساتھ کفر کرنا اور مسجد حرام کے ساتھ'۔ البحر المحیط میں عبداللہ کی قرأت کا ذکر کیا گیا ہے جو یوں ہے: 'تسآء لون به وبالارحام' ارحام سے پہلے بھی حرف جار ہے اس طرح ضمیر پر عطف والا اعتراض بھی رفع ہوجاتا ہے۔ بہرکیف دونوں قرأتوں کا مفہوم تقریباً ایک ہی ہے۔ زبر والی قرأت میں اللہ کی نافرمانی سے منع کرنے کے ساتھ قطع رحمی سے منع کیا گیا ہے اور حقوق اللہ کے ساتھ حقوق العباد پر زور دیا گیا ہے جبکہ زیر والی قرأت میں اللہ کے نام کی عظمت کے ساتھ رحم کی عظمت کا تصور بھی ابھر کر سامنے آیا ہے۔ یہ دونوں قرأتیں ایک دوسرے کی تکمیل کرتی ہیں۔ اللہ کے تقوی کو رحم کے تقوی سے جوڑ کر لوگوں کی سوچ میں توازن پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے تاکہ ان کی اجتماعی زندگی میں یہ توازن اثر انداز ہو۔

Marfat.com

رحم کی عظمت

کم وبیش سب مفسرین کرام نے اس جانب اشارہ کیا ہے کہ اللہ پر ارحام کا عطف ان کی عظمت پر دلالت کرتا ہے۔ اللہ نے رحم کو اپنے نام سے جوڑ کر یہ اعلان کیا ہے کہ رحم کا اس کے یہاں کیا مرتبہ اور مقام ہے؟ ارحام ان چیزوں سے ہے جن کے بارے میں تقوی اختیار کرنا چاہیے اور یہ ان چیزوں میں سے بھی ہے جن کا واسطہ دے کر ایک دوسرے سے شفقت کی اپیل کی جاتی ہے۔

اللہ سے اس لیے ڈرنے کا حکم دیا گیا ہے کہ وہ سب کا خالق ہے اور رحم سے ڈرنے کا حکم اس لیے دیا گیا کیونکہ وہ سب کے وجود پذیر ہونے کا ذریعہ ہے جو حکم اتقوا ربکم میں دیا گیا ہے۔ اس کی تفصیل والارحام میں بیان ہوئی ہے گویا ارحام کا تقوی بھی اللہ ہی کا تقوی ہے اور اللہ کے بعد پہلی چیز جو تقوی اور احترام کی سزاوار ہے وہ رحم ہے۔ اس لیے حدیث قدسی میں ہے کہ جو رحم سے تعلق جوڑتا ہے میں اس سے تعلق جوڑتا ہوں اور جو اس سے تعلق توڑتا ہے میں بھی اس سے تعلق توڑتا ہوں۔ احترام رحم کا تقاضا ہے کہ نطفہ کے لیے حلال جگہ کا انتخاب کیا جائے۔ بخاری، باب النکاح، نبی کریم ﷺ کی حدیث ہے تخیرو النطفکم 'یعنی' اپنے نطفہ کے لیے صحیح جگہ کا انتخاب کرو' کیونکہ للعاھر حجر 'نطفہ زناکار کے لیے پتھر ہے۔

علاوہ ازیں اللہ نے ارحام کو اپنے نام کے ساتھ ملا کر رحموں کے حقوق کی نگہداشت کو اپنے حقوق کی نگہداشت سے وابستہ کیا ہے۔ ایک طرف اگر حقوق اللہ کی طرف توجہ دلائی ہے تو دوسری طرف حقوق العباد کی طرف۔ اللہ نے بتایا ہے کہ محض عبادت کوئی چیز نہیں جب تک ہر طرح کے حقوق جو انسان کے ذمے ہیں ادا نہ ہوں۔ جس طرح اللہ کے کچھ حقوق ہیں جن کی نگہداشت واجب ہے بالکل اسی طرح رحم کے بھی کچھ حقوق ہیں جن کی نگہداشت واجب ہے۔ رحم سے تعلق باہمی محبت اور تعاون پر قائم ہوتا ہے اس لیے اس تعلق میں رضائے الٰہی شامل ہے اور اس سے تقویٰ الٰہی کی تکمیل ہوتی ہے۔ صراط مستقیم بھی ہے کہ دونوں تقووں کا خیال رکھا جائے۔ ان دونوں رابطوں میں کوتاہی فساد کا باعث بنتی ہے۔ اللہ کے ساتھ ایمان کا رابطہ اور اس کے نام کی تعظیم اور رحم کے ساتھ انسانی تعلق کا رابطہ اور اس کے نام کی عظمت ہے۔ ان دونوں رابطوں میں کوتاہی سے فطرت میں بگاڑ پیدا ہو جاتا ہے اور یہ بگاڑ گھرانوں، خاندانوں اور قوموں میں سرایت کر جاتا ہے۔

سید قطب فی ظلال القرآن میں فرماتے ہیں: "کہ اللہ کے تقوی کا مفہوم واضح ہے کیونکہ اس کا ذکر قرآن میں بار بار ہوا ہے مگر رحم کے تقوی کی تعبیر عجیب وغریب معلوم ہوتی ہے۔ یہ تعبیر نفوس انسانی

Marfat.com

میں شعوری طور پر سایہ فگن ہوتی ہے۔ اتقوا الأرحام سے مراد یہ ہے کہ رحم کی پیوستگی کو محسوس کرنے کے لیے اپنی حساسیت کو تیز کرو۔ اس کی حق تلفی سے بچو۔ اس پر ظلم نہ کرو۔ اسے ایذا نہ پہنچاؤ۔ اس کی آواز کی طرف کان دھرو اور اس کے سایہ میں پناہ لو۔

اللہ تعالیٰ نے حقوق العباد کو صلہ رحمی میں داخل کر کے، ساری نسل انسانی کو ایک ماں باپ کی اولاد قرار دے کر، سب کو ایک ہی خاندان کے افراد تصور کیا ہے۔ اسلام میں صلہ رحمی کا حکم ساری نسل انسانی پر حاوی ہے۔ نبی کریم ﷺ نے اہل مصر کو حضرت ہاجرہ سے تعلق کے باعث اپنے ننھیال قرار دیا۔ صحیح مسلم میں ہے کہ جب اہل مصر نہایت تنگی کی حالت میں نبی کریم ﷺ کے پاس آئے تو آپ نے صدقہ کی ترغیب کے لیے لوگوں کے سامنے یہی آیت پڑھی جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے ساری نسل انسانی کو ایک ہی کنبہ قرار دیا ہے اور سب کے ساتھ نیکی کو صلہ رحمی میں داخل کیا ہے۔ دوسرے صلہ رحمی سے حقوق العباد کی بنیاد پڑتی ہے۔ ایک انسان جب اپنے قریبی عزیزوں سے حسن سلوک کرتا ہے تو وہ دوسروں سے حسن سلوک کا بھی عادی بن جاتا ہے۔ رحم بھی آفاقی ہے اور صلہ رحمی کا حکم بھی آفاقی۔ صلہ رحمی کے حکم کو کتاب و سنت میں تفصیل سے بیان کیا گیا ہے:

سورۃ بقرۃ میں ارشاد ربانی ہے: 'جو توڑتے رہتے ہیں اس معاہدہ کو جو اللہ سے باندھ چکے ہیں اور توڑتے ہیں ان تعلقات کو جن کو اللہ نے وابستہ رکھنے کا حکم دیا ہے اور فساد کرتے ہیں زمین میں بس یہ لوگ خسارے میں ہیں' (البقرۃ ۲:۲۷)۔ اس آیہ مبارکہ میں اللہ کے سب سے بڑے عہد کا ذکر ہے۔ یہ عہد انسان نے اللہ کے سوال ألست بربکم؟ (کیا میں تمھارا رب نہیں ہوں؟) کے جواب میں قالو ابلی (کیوں نہیں) کہہ کر باندھا تھا۔ اس عہد ربوبیت کے متعلق اللہ نے قطع رحمی کا ذکر کیا اور اسے فساد انسانیت کا سبب قرار دیا ہے یہ رحم کے حق کی عظمت کی ایک بہت بڑی دلیل ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات اقدس کے بعد دوسرا درجہ اسے ہی دیا ہے اسی بات کو سورۃ محمد میں یوں دہرایا گیا ہے۔ 'بس اگر تم اس حکم سے پھر جاؤ تو قریب ہے کہ تم زمین میں فساد پھیلاؤ اور اپنے رحموں کو قطع کرو' (محمد ۴۷:۲۳) اس آیہ مبارکہ میں بھی قطع رحمی کو فساد کا سبب بیان کیا گیا ہے۔ سورۃ توبہ میں مشرکین کے بارے میں فرمایا گیا ہے ان کی حالت یہ ہے کہ اگر وہ تم پر غلبہ پالیں تو تمھارے بارے میں نہ قرابت کا پاس کریں نہ قول وقرار کا' (التوبۃ ۹:۸)۔ یعنی مشرک کی صفت ہے کہ وہ ناتے اور قرابت کا لحاظ نہیں رکھتا جبکہ مومن اس کا لحاظ رکھتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی عبادت کو والدین کے ساتھ حسن سلوک سے منسلک کیا ہے۔ سورۃ بنی اسرائیل میں ارشاد ربانی ہے: 'اور تیرے رب نے حکم دیا ہے کہ اس کے سوا کسی

Marfat.com

کی عبادت نہ کرو اور تم اپنے ماں باپ کے ساتھ حسن سلوک کرو (بنی اسرائیل ۱۷:۲۳)۔ یعنی اللہ کی عبادت کے بعد دوسرا درجہ صلہ رحمی یا حقوق العباد کا ہے۔ قرآن حکیم کی آیات مبارکہ کے بعد مندرجہ ذیل احادیث رحم اور اس کے حقوق کی عظمت پر دلالت کرتی ہیں۔

بخاری اور مسلم نے ابو ہریرہؓ سے روایت کی ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا: 'بے شک اللہ نے مخلوق کو پیدا کیا جب اس کام سے فراغت ہوئی تو رحم کھڑا ہو کر کہنے لگا: کیا یہ اس کا مقام ہے جو قطع رحمی سے تیری پناہ میں آجائے؟ اللہ نے فرمایا ہاں۔ کیا تو اس بات پر راضی نہیں کہ میں اس سے تعلق جوڑلوں جو تجھ سے جڑتا ہے اور اس سے کٹ جاؤں جو تجھ سے کٹتا ہے؟ رحم نے کہا! ہاں۔ اللہ نے فرمایا تو یہ مقام تجھے مل گیا'۔ بزار نے سند حسن کے ساتھ روایت کی ہے 'رحم حجنة' (تکلے کے سرے پر مُنڈھا ہوا لوہا جس کے گرد دھاگہ گھومتا ہے) ہے جو عرش سے چپکا ہوا ہے اور لجاجت سے کہتا ہے: اے اللہ اس سے تعلق رکھ جو مجھ سے تعلق رکھتا ہے اور اس سے کٹ جا جو مجھ سے کٹتا ہے، تو اللہ فرماتا ہے: 'میں رحمان ورحیم ہوں میں نے رحم کو اپنے نام سے مشتق کیا ہے جو اس سے جڑتا ہے میں اس سے جڑ جاتا ہوں اور جو اس سے کٹتا ہے میں اس سے کٹ جاتا ہوں'۔ امام احمد نے صحیح سند سے روایت کی ہے کہ 'بے شک یہ رحم، رحمان کی ایک الجھی ہوئی شاخ (شجنة) ہے جو اس سے قطع تعلق کرتا ہے اللہ اس پر جنت حرام کر دیتا ہے'۔ سنن ابی داؤد (کتاب زکوٰۃ) میں ہے کہ بہترین صدقہ وہ ہوتا ہے جو دشمن قریبی رشتہ دار کو دیا جائے۔

اس آیت کی تفسیر کے ضمن میں مولانا امین احسن اصلاحی نے معاشرہ کی تنظیم کے بارے میں درج ذیل بنیادی حقائق کی طرف اشارہ کیا ہے:

۱۔ خدا سب کا خالق بھی ہے اور رب بھی۔۔۔ جو بھی خدا کی مخلوق کے معاملات میں دھاندلی مچائے گا وہ اس کی گرفت سے بچ نہیں سکتا۔

۲۔ تمام نسل انسانی ایک ہی آدم کا گھرانا ہے۔

۳۔ خدا اور رحم کا واسطہ ہمیشہ سے باہمی تعاون اور ہمدردی کا محرک رہا ہے۔ جس طرح ان واسطوں پر حق مانگنا حق ہے اسی طرح ان کا حق ادا کرنا بھی حق ہے۔ درحقیقت حق طلبی اور حق شناسی کا یہی توازن صحیح اسلامی معاشرے کا اصل جمال ہے۔

۴۔ جس طرح آدم نسلِ انسانی کے باپ ہیں اسی طرح حوا نسلِ انسانی کی ماں ہیں۔ اللہ نے حوا کو آدم ہی کی جنس سے پیدا کیا ہے، اسی وجہ سے عورت کوئی ذلیل، حقیر اور فرو تر مخلوق نہیں

Marfat.com

بلکہ وہ بھی شرفِ انسانیت میں برابر کی شریک ہے نہ تو اسے حقیر سمجھ کر حقوق سے محروم کیا جاسکتا ہے اور نہ کمزور خیال کر کے اس کو ظلم وستم کا نشانہ بنایا جاسکتا ہے۔

جنس کا قرآنی تصور

آیت زیرِ نظر میں ایک ایسی حقیقت بیان کی گئی ہے جس کی طرف اشارہ بے محل نہ ہوگا۔ ہماری فطرت کے سربستہ رازوں میں سے سب سے حیرت انگیز راز جنس کا راز ہے۔ گم کردہ راہ مرد اپنی جسمانی طاقت کے بل بوتے پر اس اہم رول کو بھول جاتا ہے جو ایک عورت اس کے وجود اور زندگی کے اجتماعی تعلقات کے بارے میں ادا کرتی ہے۔ وہ ماں جو ہمیں جنم دیتی ہے ہمارے احترام کی سزاوار ہے اور وہ بیوی جو ہمیں باپ بننے کا شرف عطا کرتی ہے احترام کی حقدار ہے۔ رحم جنس کی علامت ہے وہ جنس جو ہماری جسمانی زندگی پر حکمران ہے اور جو ہمارے روحانی جذبات پر بھی اثر انداز ہوتی ہے۔ نہ اس میں ڈوب جانا مناسب ہے اور نہ اس سے ڈر کر اسے قابلِ نفرت سمجھنا مناسب ہے بلکہ اس کی عزت واحترام زیادہ موزوں ہے۔ قرآن حکیم نے جنس کو اللہ کے نام سے ملا کر اسے تقدس کا درجہ عطا کیا ہے اور اس تمہید کے بعد عورتوں، یتیموں اور عائلی تعلقات کے بارے میں گفتگو شروع کی ہے۔ ہماری بدقسمتی ہے کہ برصغیر ہندوپاک میں مسلمانوں نے جنس کے قرآنی تصور سے روگردانی کر کے اپنے دین میں غیراسلامی تصور کو پال رکھا ہے۔ احترام تو ایک طرف رہا وہ اس سے خوف زدہ ہیں اور اس کے بارے میں گفتگو کو گناہ تصور کرتے ہیں۔

رحمِ مادر اللہ تعالیٰ کے علم، قدرت اور حکمت کا مظہر

اللہ کے علم اور قدرت کا سب سے بڑا مظہر وہ طریق کار ہے جس سے انسان رحمِ مادر میں وجود پذیر ہوتا ہے۔ اس طریق کار کے لیے علم، قوت اور حکمت درکار ہے جو اللہ کو بدرجہ اتم حاصل ہے۔ کیا وہ اللہ جس نے سب کو پیدا کیا اور جو رحموں سے صورت گری کرتا ہے بے خبر ہوسکتا ہے؟ رحمِ مادر میں مختلف مراحل سے گزرتے ہوئے انسان کی تشکیل کو دیکھ کر آدمی حیرت زدہ ہو جاتا ہے۔ رات کی تاریکی میں معمولی سی حرکت، دن کی روشنی میں ہر عمل، اللہ کے علم کا نور اس کا پیچھا کرتا ہے۔ دیہات ہوں یا شہر گھر ہو یا غار، علمِ الٰہی مادہ کے رحم میں ہر حمل کو جانتا ہے۔ خون کا جو قطرہ مادہ کے رحم میں کم یا زیادہ ہوتا ہے اس کے علم میں ہوتا ہے۔ انسان نہیں جانتا کہ جس وقت رحمِ مادر میں نئی زندگی کا آغاز ہوتا ہے تو کیا کیا مخفی طاقتیں اور صلاحیتیں کارفرما ہوتی ہیں۔ مگر اللہ پر سب کچھ عیاں ہوتا ہے کیونکہ جو کچھ ہو رہا ہوتا ہے وہ اس

Marfat.com

کے مجوزہ قانون عدل وحکمت کے مطابق ہورہا ہوتا ہے۔ اس مقام پر انسانی نفوس کے لیے اللہ کی طرف رجوع کرنے کے علاوہ کوئی چارہ کار نہیں رہتا کیونکہ وہ سمجھ لیتا ہے کہ اللہ کا علم سب چیزوں پر حاوی ہے۔ قرآن حکیم میں کئی ایک مقامات پر اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ سورۃ آل عمران میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''هُوَ الَّذِيْ يُصَوِّرُكُمْ فِي الْأَرْحَامِ كَيْفَ يَشَاءُ لَا إِلٰهَ إِلَّا هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ'' (آلِ عمران ۳:۶) ''وہی ہے جو تمہاری تصویریں رحموں میں جس طرح چاہتا ہے بناتا ہے اس کے سوا کوئی معبود نہیں غالب ہے حکمت والا ہے''۔ صورت کی دو قسمیں ہیں ایک محسوس جسے خاص وعام سب بلکہ حیوان بھی پہچان سکتے ہیں، دوسری معقول جیسے عقل اور رویہ جو انسان سے مخصوص ہوتا ہے، اسے صرف خواص ہی پہچان سکتے ہیں۔ آیت میں دونوں صورتیں مراد ہیں اللہ اپنے ارادے اور منشا کے مطابق صورت گری کرتا ہے اور اس صورت کی خصوصیات عطا کرتا ہے۔ وہ عزیز ہے، تصویر بنانے پر قدرت رکھتا ہے۔ حکیم ہے جس کی تصویر گری کرتا ہے اس کے معاملات کو حکمت کے تحت چلاتا ہے۔ مختلف صورتیں سب اللہ کے ارادہ اور تقدیر کے مطابق ہیں خوبصورت، بدصورت، گورا، کالا، لمبا، چھوٹا، کامل، ناقص، بدبخت، خوش بخت، نر اور مادہ یہ سب كيف يشاء (جس طرح سے چاہتا ہے) کی تفسیر ہے۔ جو آدمی یہ جان لیتا ہے کہ رحم مادر میں بچے کی صورت گری کس قدر حکمت اور ترتیب سے تکمیل پاتی ہے وہ سمجھ لیتا ہے کہ یہ سب کچھ اتفاقاً نہیں ہوا بلکہ یہ ایک باخبر عالم کا فعل ہے جو جزئیات کا علم رکھتا ہے۔ وہ اس دانا کا فعل ہے جو یونہی بے مقصد کام نہیں کرتا وہ اس زبردست ہستی کا فعل ہے جو تمام فیصلے علم وحکمت کی بناء پر کرتی ہے۔ کیا ادنیٰ سے اعلیٰ مخلوق کی طرف ترقی کرنا کوئی بے ارادہ اتفاقیہ فعل ہے؟ کیا عقل مانتی ہے کہ یہ کسی بے خبر صانع کا فعل ہے؟ رحم مادر میں وہ کون سا مقیاسِ معرفت ہے جو یہ گوناں گوں تغیرات ظہور میں لاتا ہے کہ ہر فعل ٹھیک وقت پر ضرورت کے مطابق منظم طریقے سے سرانجام پاتا ہے؟ کیا اس وقت کوئی تصور کر سکتا ہے کہ اس جرثومہ حیات کے اندر پورا انسان اپنی جملہ صلاحیتوں کے ساتھ چھپا بیٹھا ہے؟ ہم میں سے ہر انسان ایک مستقل بالذات عالم ہے۔ یہ انسان جو تکبر سے اتراتا پھرتا ہے اور عظمت وکبریائی میں خدائی کا دعویدار بن بیٹھتا ہے۔ یہ انسان قدرت کے ہاتھوں نشوونما پا کر مختلف مراحل سے گزر کر عدم سے وجود میں آتا ہے۔ حضرت عیسیٰؑ کی محیر العقول پیدائش کو کم علم انسان نے فوق العادت سمجھ کر انہیں الوہیت کے درجہ تک پہنچا دیا۔ اس لیے آیت میں لا الٰہ الا اللہ کہہ کر

Marfat.com

اس کی نفی کر دی اور بتا دیا کہ عیسیٰ علیہ السلام اللہ نہیں بلکہ تمام مخلوق کی طرح ان کی بھی رحم مادر میں تصویر کشی ہوئی ہے۔ گویا کہ تخلیق انسان کے راز سے نقاب کشائی کر کے اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش کی گتھی کو سلجھا دیا ہے۔

قرآن حکیم میں سورۃ رعد، سورۃ حج اور سورۃ لقمان میں مزید تفصیل سے بتایا گیا ہے کہ رحم اللہ کے علم اور قدرت کی علامت ہے۔ سورۃ رعد میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: 'اَللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تَحْمِلُ كُلُّ أُنْثٰى وَمَا تَغِيضُ الْأَرْحَامُ وَمَا تَزْدَادُ وَكُلُّ شَيْءٍ عِنْدَهُ بِمِقْدَارٍ' (الرعد ۱۳:۸) 'اللہ جانتا ہے جو ہر ایک مادہ حمل میں لیتی ہے اور جو کچھ رحموں میں گھٹتا ہے اور بڑھتا ہے اس کے ہاں ہر چیز ایک خاص انداز سے ہے'۔ قتادہ کا قول ہے کہ 'تَغِيضُ' اور 'تَزْدَادُ' سے مراد یہ ہے کہ بچے کی پیدائش مدت حمل سے پہلے یا تکمیل کے بعد سب اس کے علم میں ہے۔ جبکہ ابنِ عباس کا قول ہے کہ رحم میں خون کم ہوتا ہے یا زیادہ وہ سب اللہ کے علم میں ہے۔ ایک قول کے مطابق تَغِيضُ (کم ہوتا ہے) سے مراد حمل کی وجہ سے خون کا بند ہونا اور تَزْدَادُ (زیادہ ہونا ہے) سے مراد وضع حمل کے بعد نفاس کے خون کا زیادہ ہونا ہے۔ یہ سب کچھ علم خداوندی کے مطابق ہوتا ہے کہ مادہ کے پیٹ میں کیا ہے؟ اور رحم کے اندر کون کون سی چیزیں کم ہوتی رہتی ہیں اور کون سی بڑھتی رہتی ہیں؟ کون سا بچہ ناقص ہے اور کون سا کامل؟ بچہ ایک ہے یا ایک سے زیادہ؟ یہ سب ان اندازوں کے مطابق ہوتا ہے جو اللہ نے مقرر کیے ہیں۔ ابن عباس کا قول زیادہ درست معلوم ہوتا ہے۔ یہ اللہ کی وسیع قدرت کا مظہر ہے کہ جب رحم مادر میں بچہ پرورش پاتا ہے تو اس میں زندگی کی لہر دوڑ جاتی ہے بالکل اس پانی کی طرح جس سے زمین کو زندگی ملتی ہے وہ پھلتی پھولتی ہے اور بارآور ہوتی ہے۔ جب بچہ رحم مادر میں قرار پکڑتا ہے تو رحم بھی پھلتا پھولتا ہے اور جب بچہ پیدا ہوتا ہے تو رحم بھی سکڑ جاتا ہے۔ 'تَغِيضُ، تَزْدَادُ سے پہلے اس لیے آیا ہے کیونکہ اس حالت میں رحم نارمل ہوتا ہے۔

سائنس کی دریافتوں سے علم الٰہی پر کوئی آنچ نہیں آتی۔ یہ علم بھی تو اللہ کے انوار میں سے ایک نور ہے جو اللہ کے علم اور قدرت کا اظہار ہے۔ سائنس نے تو صرف یہ ثابت کیا ہے کہ رحم مادر میں بچے کے نر یا مادہ ہونے کا پتہ چلایا جا سکتا ہے۔ اللہ کے علم کے مقابلہ میں اس کی مثال ایسے ہے جیسے سمندر کے مقابلہ میں قطرۂ شبنم۔ رحم مادر خواہ گھر کے اندر ہو یا کسی غار میں اللہ اس کے اندر ہر قطرۂ خون کی کمی بیشی کو جانتا ہے۔ رحم کے اندر پرورش پانے والے بچے کے ہر پل اور ہر لحہ سے واقف ہوتا ہے۔ اس کی صلاحیتوں سے باخبر ہوتا ہے اس کے مستقبل کو جانتا ہے۔ اگر خوردبین سے مچھر کو دیکھ کر یہ پتہ چلتا ہے کہ وہ دو

Marfat.com

آنکھیں، پر اور بازوؤں والی مخلوق ہے یا خوردبین کے نیچے سے اس کے نظام ہضم اور نظام تنفس کا پتہ چلتا ہے تو اس سے علم الٰہی کا کیا بگڑتا ہے۔ یہ تو اس کی عملی وضاحت ہے۔ سورج دیکھنے میں چھوٹا سا چمکدار کرہ نظر آتا ہے مگر حجم میں وہ زمین سے بہت بڑا ہے۔ یہ علم الٰہی کی ایک دلیل ہے۔ اگر علم کے ذریعہ کہکشاں میں کئی سورج نظر آتے ہیں جو حجم میں ہمارے سورج سے بڑے ہوتے ہیں تو اس سے علم الٰہی پر کوئی آنچ نہیں آتی۔ علم تو اللہ اور ایمان کا بہترین داعیہ ہے اور دل اور آنکھوں کو اس کی عظمت اور جلال سے بھر دیتا ہے۔

ع کہ بے علم نتواں خدارا شناخت

سورۃ حج کی ایک آیت اللہ کی قدرت کی بہترین دلیل ہے۔ مٹی سے لیکر انسان کامل تک تمام مراحل کو ترتیب وار بیان کیا گیا ہے۔ ان میں سے ایک، ایک مرحلہ اللہ کی قدرت کی شہادت پیش کرتا ہے۔ ارشار ربانی ہے: 'وَنُقِرُّ فِي الْأَرْحَامِ مَا نَشَاءُ إِلَىٰ أَجَلٍ مُسَمًّى' (الحج ۲۲:۵) 'اور رحم مادر میں جس (نطفہ) کو چاہتے ہیں ایک مدت معین تک ٹھہرائے رکھتے ہیں'۔ یعنی اللہ اپنی مرضی کے مطابق نقص و تکمیل کی صورت میں ایک مدت تک ٹھہراتا ہے پھر رحم سے نکالتا ہے۔ اشارہ چونکہ رحم حمل کے مختلف مراحل یعنی نطفہ، علقہ اور مضغہ کی طرف ہے اور یہ صورتیں جامد ہوتی ہیں اس لیے مـا استعمال ہوا ہے۔ آیت مبارکہ کے آغاز میں بتایا گیا ہے کہ انسان کی پیدائش مٹی سے ہوئی۔ کیونکہ نطفہ خون سے بنتا ہے اور خون غذا سے اور غذا مٹی سے۔ گویا انسان کا مادۂ تخلیق ارضی عناصر ہوئے۔ نطفہ کیا ہے مرد کے پانی کا ایک قطرہ۔ ایک قطرے میں ہزاروں جراثیم یعنی حیوانات (Spermatozoa) ہوتے ہیں۔ ان میں سے ایک حیوان (جرثومہ) رحم مادر میں انڈے (Ovum) کو بارآور کرتا ہے۔ وہ اس سے مل کر رحم کی دیوار سے چپک جاتا ہے۔ اسے علقہ (جما ہوا خون) کہا گیا ہے۔ جو نطفہ رحم مادر سے تعلق پیدا نہیں کرتا وہ بچہ نہیں بن سکتا۔ اس انڈے میں جسے مرد کی منی کا قطرہ بارآور کرتا ہے مستقبل کے انسان کی تمام خصوصیات موجود ہوتی ہیں۔ جسمانی صفات، لمبائی اور چوڑائی، طاقت اور کمزوری، خوبصورتی اور بدصورتی، بیماری اور صحت، اسی طرح اس کے اندر تمام عصبی اور عقلی صفات بھی مضمر ہوتی ہیں۔ جذبات و احساسات، مزاج و میلانات، صلاحیت اور بے راہ روی۔ کون یقین کر سکتا ہے کہ یہ سب کچھ مرد اور عورت کے خلیات (Cells) میں ہوتا ہے۔ یہ علقہ ماں کے پیٹ میں نشوونما پا کر ایک گوشت کا ٹکڑا بن جاتا ہے جسے مضغہ کہا گیا ہے اس کی کوئی شکل ہوتی ہے نہ صورت۔ اس میں بتدریج تغیرات ہوتے ہیں پھر ایک وقت آتا ہے جب آدمی کا پورا نقشہ (مخلقة) سب کچھ تیار ہو جاتا ہے۔ یا یوں کہیے کہ کبھی اس کی مدت حمل

Marfat.com

پوری ہو جاتی ہے اور کبھی ادھورا رہ کر نا تمام گر جاتا ہے۔ یہ سب اس لیے بیان کیا گیا تا کہ دلائل قدرت کو واضح کیا جائے۔ جسے اللہ مکمل کرنا چاہتا ہے اسے رحم مادر میں برقرار رکھتا ہے یہاں تک کہ اس کی نشوونما کے مراحل مکمل ہو جاتے ہیں اور وہ بچہ کی شکل میں زندہ ہو کر باہر نکل آتا ہے۔ پھر جس طرح رحم مادر میں نطفہ نے بتدریج ارتقا کی بہت سے منزلیں طے کی تھیں اسی طرح باہر کی دنیا میں آ کر کئی مدارج سے گزرتا ہے۔ بچپن کی ناتوانی اور بے شعوری سے گزر کر پوری قوت اور مرتبہ کمال تک پہنچایا۔ پھر کچھ لوگ نکمی عمر تک پہنچا دیے جاتے ہیں اور باخبر انسان بننے کے بعد پھر بے خبر ہو جاتے ہیں۔ آیت کے آخر میں ساری بات کو مثال دے کر سمجھایا۔ آدمی زمین کو تیار کرتا ہے، بیج ڈالتا ہے، پانی دیتا ہے۔ یہ سارے اسباب ذرائع ہیں، انسان کا اس میں کوئی اختیار نہیں کہ وہ ان ذرائع سے وہ پھل نکالے جس کا اس نے بیج ڈالا ہے۔ اسی طرح کیا انسان کو قدرت حاصل ہے کہ وہ اس قطرۂ منی کو جو رحم مادر سے چپک جاتا ہے تخلیق کر سکے اور اس میں روح پھونک سکے؟ اس کا ایک یہی جواب ہے کہ نہیں انسان اس پر قادر نہیں چنانچہ ہمیں ایک خالق، قادر اور موجد کی قدرت کا اقرار کرنا پڑتا ہے جس کی قدرت کی کوئی حد نہیں۔ اللہ نے چاہا کہ انسان کی اپنی پیدائش اس کے خالق کی قدرت وحکمت کی درس گاہ بن جائے تا کہ وہ اپنے اور کائنات کے خالق کی معرفت حاصل کر لے۔

سورۃ لقمان میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: "إِنَّ اللَّهَ عِندَهُ عِلْمُ السَّاعَةِ وَيُنَزِّلُ الْغَيْثَ وَيَعْلَمُ مَا فِي الْأَرْحَامِ وَمَا تَدْرِي نَفْسٌ مَّاذَا تَكْسِبُ غَدًا وَمَا تَدْرِي نَفْسٌ بِأَيِّ أَرْضٍ تَمُوتُ إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ خَبِيرٌ" (لقمان ۳۱:۳۴) "بیشک اللہ ہی کو قیامت کی خبر ہے اور وہی مینہ برساتا ہے اور وہی جانتا ہے کہ جو کچھ رحم میں ہے اور کوئی شخص نہیں جانتا کہ وہ کل کیا عمل کرے گا اور کوئی شخص نہیں جانتا کہ وہ کس زمین میں مرے گا۔ بے شک اللہ سب باتوں کا جاننے والا باخبر ہے"۔

بخاری میں ایک حدیث ہے جس میں جبریلؑ نبی کریم ﷺ سے ایمان، اسلام اور احسان کے بارے میں سوال کرتے ہیں۔ آخر میں جبریلؑ نے پوچھا قیامت کب آئے گی؟ آپؐ نے فرمایا جس سے پوچھا گیا ہے اس کا علم سائل سے زیادہ نہیں۔ پھر آپؐ نے فرمایا کہ یہ ان پانچ باتوں میں سے ہے جنہیں سوائے اللہ کے کوئی نہیں جانتا اور پھر آپؐ نے زیر نظر آیت پڑھی جس میں ان پانچ باتوں کو بیان کیا گیا ہے۔ حضرت ابن عباسؓ کا قول ہے کہ ان پانچ باتوں کو نہ کوئی مقرب فرشتہ جانتا ہے اور نہ کوئی نبی مرسل۔ قیامت کی طرح رحم کا علم بھی علم الٰہی کے امتیازات میں سے ہے۔ یہ علم ایک ہمہ گیر علم ہے۔ جو انسان اور حیوان، نر اور مادہ، موت وحیات اور رزق سب پر حاوی ہے۔ اللہ کو رحم میں پلنے والے بچہ کے

Marfat.com

ہر لحظہ، ہر پل اور ہر مرحلہ کا علم ہوتا ہے۔ جب حمل کی کوئی شکل نہیں ہوتی وہ اس وقت سے اسے جانتا ہے۔ پہلے مرحلہ میں جب خلیہ انڈے سے ملتا ہے وہ اسے جانتا ہے۔ ماں کے پیٹ میں بچوں کے خدوخال، اس کی خاصیتیں اور اس کی صلاحیتیں سب جانتا ہے۔ بعض مفسرین نے اسے صرف نر اور مادہ تک محدود کر لیا ہے لیکن یہ تفسیر اللہ کے علم کا احاطہ نہیں کر سکتی۔ اس کا علم رحم اور جنین (پیٹ میں بچہ) کے ماضی و مستقبل پر حاوی ہے۔ زندگی میں اس کا مقام کیا ہے؟ اور وہ موت تک کس راہ پر گامزن ہوگا؟ ارحام میں جو ہے، سے مراد آئندہ نسل بھی ہے۔ اس میں کافروں کی اولاد کی طرف اشارہ ہے کہ جو لوگ آج حق کی مخالفت کر رہے ہیں، ان کی اولاد کل حق کی حامی و ناصر ہوگی۔ کاہن بھی تجربے کی بنیاد پر نر اور مادہ کے متعلق جان لیتے تھے مگر تجربات مختلف ہو سکتے ہیں۔ عادات بدل سکتی ہیں مگر اللہ کا علم قائم اور باقی رہنے والا ہے۔ پیٹ میں پلنے والے بچے کے مختلف مراحل کا علم انسان بھی حاصل کر سکتا ہے مگر اللہ وہ کچھ جانتا ہے جو ابھی انسان کے تصور میں بھی نہیں آیا۔ یہ علم اللہ ہی کا عطا کردہ ہے۔ یہ حق کے انوار میں سے ایک نور ہے جو اللہ کی آیات قدرت اور علم سے پردہ ہٹاتا ہے۔ علمی انکشافات دیکھ کر ہمارا دل تنگ نہیں ہونا چاہیے بلکہ کھلے دل کے ساتھ ہمیں بھی اس کارواں میں شریک ہونا چاہیے تاکہ ہم بھی علم الٰہی کی نقاب کشائی کر کے انسانیت کی خدمت کر سکیں۔

أولو الأرحام (رشتے دار)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: 'وَالَّذِينَ آمَنُوا مِن بَعْدُ وَهَاجَرُوا وَجَاهَدُوا مَعَكُمْ فَأُولَٰئِكَ مِنكُمْ وَأُولُوا الْأَرْحَامِ بَعْضُهُمْ أَوْلَىٰ بِبَعْضٍ فِي كِتَابِ اللَّهِ إِنَّ اللَّهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ' (الأنفال ۸:۷۵) 'جو لوگ بعد میں ایمان لائے اور انھوں نے ہجرت کی اور تمھارے ساتھ مل کر جہاد کیا تو وہ تم میں سے ہی ہیں اور رشتہ دار اللہ کے حکم میں آپس میں زیادہ حقدار ہیں'۔ سورۃ احزاب کی آیت نمبر ۶ کا مضمون بھی یہی ہے، ارشاد ہوتا ہے: 'وَأُولُو الْأَرْحَامِ بَعْضُهُمْ أَوْلَىٰ بِبَعْضٍ فِي كِتَابِ اللَّهِ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُهَاجِرِينَ إِلَّا أَن تَفْعَلُوا إِلَىٰ أَوْلِيَائِكُم مَّعْرُوفًا كَانَ ذَٰلِكَ فِي الْكِتَابِ مَسْطُورًا' (احزاب ۳۳:۶) 'اور رشتہ دار اللہ کے حکم میں مومنوں اور مہاجروں کی نسبت زیادہ حق رکھتے ہیں لیکن یہ الگ بات ہے کہ اپنے دوستوں سے اچھا سلوک کرو۔ یہ کتاب میں لکھا ہوا ہے'۔ طیالسی اور طبرانی نے ابن عباس سے روایت کی ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے (ہجرت کے بعد) صحابہ کے درمیان بھائی چارہ قائم کیا، وہ ایک دوسرے کے وارث بھی ہوتے تھے یہاں تک کہ یہ آیت نازل ہوئی۔ پھر وہ نسب کی بنیاد پر وارث ہونے لگے۔ ابن مردویہ نے بھی ابن عباس سے اس قسم کی

Marfat.com

روایت کی ہے کہ مسلمان جب مدینہ آئے تو ہجرت کی بنیاد پر ایک دوسرے کے وارث ہونے لگے۔ پھر یہ بات آیت زیر نظر سے منسوخ ہوگئی۔ فتح مکہ کے بعد جب اسلام پھیل گیا تو ہجرت ختم ہوگئی۔ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا: 'لا هجرة بعد الفتح'، 'فتح مکہ کے بعد کوئی ہجرت نہیں'۔ اکثر مفسرین کا خیال ہے کہ اس آیت میں ولایت سے مراد ورثے میں ولایت ہے۔

اولوالارحام سے لغت میں مراد عام رشتہ دار ہیں مگر علماء فرائض کی اصطلاح میں اس سے مراد وہ رشتہ دار ہیں جن کے حصے مقرر نہیں اور نہ ہی ان کو باپ کے رشتہ دار ہونے کی وجہ سے ورثہ ملتا ہے۔ مگر ابن عباس اس آیت اولوالارحام (رشتہ داروں) کو عام معنی میں لیتے ہیں اور ان کا استدلال ہے کہ ذوالارحام کو وارث بنانا جائز ہے کیونکہ وراثت صرف ہجرت کی بنیاد پر منسوخ ہوئی ہے۔ عصبہ (باپ کے رشتے دار) اور غیر عصبہ میں کوئی فرق نہیں۔ صحابہ میں سے حضرت علیؓ، عبداللہؓ بن مسعود اور ابوالدرداء اور تابعین میں سے مسروق، محمد بن حنفیہ، نخعی اور ثوری، بعض ائمہ اہل بیت اور امام ابوحنیفہؒ کی بھی یہی رائے ہے۔ وہ سورۃ نساء کی اس آیت سے دلیل لیتے ہیں: 'لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ وَلِلنِّسَاءِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ' (النساء ۴:۷) 'مردوں کے لیے بھی حصہ ہے اس میں سے جس کو ماں باپ اور قریبی چھوڑ جائیں اور عورتوں کے لیے بھی حصہ ہے اس میں سے جس کو ماں باپ اور قریبی چھوڑ جائیں'۔ اس کے علاوہ وہ خال (ماموں) کے ورثہ کے بارے میں خبر واحد اور صحیحین کی حدیث 'ابن اخت القوم منهم' یعنی 'بہن کا بیٹا قوم میں سے ہوتا ہے' سے دلیل پکڑتے ہیں۔ علامہ رشید رضا نے وقت حاضر میں اسی رائے کو پسند کیا ہے اور کہا ہے کہ فرائض کی کتابوں میں ماں کے رشتہ داروں کا حق موجود ہے۔ اس آیت کے بارے میں صاحب البحر المحیط ابوحیان اندلسی فرماتے ہیں کہ امام مالکؒ سمیت بعض علماء کا قول ہے کہ اس آیت کا میراث سے کوئی تعلق نہیں۔ اہل تحقیق کا قول ہے کہ آیت زیر بحث ماقبل آیات اور سورۃ نساء کی آیت: 'وَلِكُلٍّ جَعَلْنَا مَوَالِيَ مِمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ وَالَّذِينَ عَقَدَتْ أَيْمَانُكُمْ' (النساء ۴:۳۳) 'اور ہم تو کہ میں سے جس کو والدین قریبی چھوڑ جائیں تو ان میں سے ہر ایک کے لیے، ہم نے حق دار مقرر کر دیے ہیں اور نیز جن سے تمھارے دائیں ہاتھوں نے عہد باندھے ہیں ان کے لیے بھی' کی ناسخ نہیں ہوسکتی کیونکہ:

الف۔ سورۃ انفال، سورۃ نساء اور سورۃ احزاب سے پہلے نازل ہوئی ہے اس لیے اس کا یہ حکم عام ہے اس کا وراثت سے کوئی تعلق نہیں۔ سورۃ انفال میں غزوۂ بدر کے بارے میں کلام ہے جو غزوۂ احزاب جس کا سورۃ احزاب میں ذکر ہے سے دو یا ایک روایت کے مطابق تین

Marfat.com

سال پہلے وقوع پذیر ہوا۔

۲۔ آیت زیر بحث میں وہ شہری اصول پیش کیا گیا ہے جس پر اسلامی معاشرہ قائم ہے۔ اللہ کے قول میں رحم کے اس تعلق کی طرف اشارہ ہے جو تمام مومنوں میں موجود ہے۔ ان میں قدر مشترک ایمان ہے جو نسل بعد نسل ان کی یکجہتی کا باعث بنتا ہے۔ رحم کا تعلق فطری تقاضا ہے اس لیے دین فطرت میں صلہ رحمی کو واجب قرار دیا ہے۔ ان مومنوں کا اصل نسب ایمان ہے جس کی بنیاد پر وہ تعلق توڑتے اور جوڑتے ہیں۔ قرآنی آیت اس اصول کو کیسے منسوخ کر سکتی ہے؟

۳۔ سورۃ نساء میں میراث کی آیت بالکل واضح ہے۔ اگر اس آیت کا وراثت سے تعلق ہوتا تو اس کا ذکر بھی ان کے ساتھ ہوتا، نہ کہ اس مقام پر جس میں اس اصول کا ذکر کیا گیا ہے جس کی بنا پر مومنوں کے آپس میں اور دوسروں کے ساتھ تعلقات استوار ہوتے ہیں۔

۴۔ آیات وراثت، قرآن حکیم میں مخصوص ہیں ان کہ کسی ایسی نص کی ضرورت نہیں جو ایمان اور ہجرت کی بنیاد پر وراثت کو حرام قرار دے۔

۵۔ سورۃ احزاب کی آیت (۶:۳۳) قرابت و نسب کو تبنی (بیٹا بنانا) کے ابطال کے بعد صراحۃ بیان کرتی ہے۔ اس آیت سے پہلے ایمان اور ہجرت کا بیان ہے۔ مسلمانوں کو اپنے دینی بھائیوں کے ساتھ حسن سلوک اور نصرت و تعاون کی تاکید کی گئی ہے۔ یہاں یہ بتایا گیا ہے کہ رحم کے سبب سے رشتہ دار اجنبی مہاجرین اور انصار سے بڑھ کر ایک دوسرے کے تعاون اور مدد کے حقدار ہیں ان کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔ فی کتاب اللہ سے مراد جیسا کہ زجاج اور زمخشری نے کہا ہے وہ حکم ہے جو اللہ نے صلہ رحمی کی صورت میں اپنے مومن بندوں پر واجب کیا ہے۔ بتایا یہ گیا ہے کہ قریبی رشتہ دار دوسرے مومنوں کے مقابلہ میں وجوب ہجرت اور دیگر زمانوں میں بھی زیادہ حق دار ہیں اور ہر قسم کی ولایت مثلاً نکاح اور جنازہ کی روایت میں ان کو فضلیت حاصل ہے۔ ساتھ ساتھ یہ بھی بتادیا گیا ہے کہ اگر قریبی رشتہ دار شرک پر مجبور کرے (۵:۳۱) یا وہ محارب یعنی قتال کرنے والا ہو (۸:۶۰) تو اس کے رحم کے حقوق ختم ہوجاتے ہیں۔

قطع رحمی اللہ کی زمین پر فساد پھیلانے کے مترادف ہے

قطع رحمی انسانی فطرت کے خلاف ہے اس لیے دین فطرت کے بھی خلاف ہے۔ اس سے امن و

Marfat.com

آشتی کی بجائے فتنہ فساد، لوٹ مار اور برادر کشی کا بازار گرم ہوتا ہے۔ قرآن حکیم نے اس اصول کو واضح طور پر یوں پیش کیا ہے: 'فَهَلْ عَسَيْتُمْ إِن تَوَلَّيْتُمْ أَن تُفْسِدُوا فِي الْأَرْضِ وَتُقَطِّعُوا أَرْحَامَكُمْ' (محمد ۴۷: ۲۲) 'پس اگر تم حکم سے پھر جاؤ یا حاکم بن جاؤ تو قریب ہے کہ زمین میں فساد پھیلاؤ اور اپنے رحموں کو قطع کرو'۔ یہ خطاب ان لوگوں سے ہے جن کے دل میں مرض ہے۔ فَهَلْ عَسَيْتُمْ کی تعبیر سے پتہ چلتا ہے کہ جن کو مخاطب کیا جا رہا ہے ان کا حال آئندہ کیا ہوگا؟ یہ ایک طرح کی تنبیہ ہے کہ اگر انھوں نے اللہ کے حکم سے سرتابی کی تو وہ مومنین کے راستے کے علاوہ کسی اور راستے پر پہنچ جائیں گے اور رفتہ رفتہ یہ راستہ ان کو ایمان سے خارج کر دے گا تو وہ دوبارہ عہد جاہلیت کی طرف لوٹ جائیں گے۔ لوٹ کھسوٹ، ظلم و ستم، برادر کشی اور قتل اولاد ان کا وتیرہ تھا۔ ان منافقین کے رشتہ دار مسلمان تھے کافروں سے مل کر ان کو مروانا قطع رحمی تھی۔ قتادہ کا قول ہے: 'جنھوں نے اللہ کی کتاب سے منہ موڑ لیا کیا انھوں نے ناحق خون نہیں بہایا؟ کیا انھوں نے رحم سے تعلق توڑ کر اللہ کی نافرمانی نہیں کی؟ یا اگر تم حاکم بن جاؤ تو پھر تم فتنہ و فساد اور قطع رحمی کے مرتکب ہو جاؤ گے، دنیا پر ٹوٹ پڑو گے، چھینا جھپٹی میں مبتلا ہو جاؤ گے، ظلم و ستم کو روا رکھو گے اور رحم سے رشتہ توڑ لو گے'؟ مولانا امین احسن اصلاحی نے اس آیت کی تفسیر بڑے دانشمندانہ انداز میں کی ہے۔ فرماتے ہیں: 'اوپر کی آیات میں ان منافقین کے رویہ پر جو تبصرہ ہوا ہے وہ تمام تر غائب کے اسلوب میں ہے لیکن اس آیت میں ان سے براہ راست خطاب ہے۔ اسلوب کی یہ تبدیلی اس 'نصیحت' کو زیادہ موثر بنانے کے لیے ہے جو اس میں ان کو کی گئی ہے'۔ فرمایا کہ 'اگر تم نے اس دعوت سے اعراض کیا تو اس سے تم اپنے آپ کو یا اپنی قوم کو کوئی نفع نہیں پہنچاؤ گے۔ بس یہی کرو گے کہ دور جاہلیت میں جس فساد، جس قطع رحمی اور برادر کشی میں متبلا رہے ہو اس میں پھر مبتلا ہو جاؤ گے'۔۔۔۔۔ ان منافقین کو خاص اہتمام کے ساتھ خطاب کر کے یہ نصیحت کرنے کی ضرورت اس وجہ سے پیش آئی کہ ان کے اندر ایک گروہ ان لوگوں کا بھی تھا جو کفار قریش کے ساتھ سمجھوتے کا خواہشمند تھا۔۔۔۔ یہ لوگ اپنی منافقانہ روش پر اس وقت تک تو پردہ ڈالنے میں ایک حد تک کامیاب رہے جب تک جنگ کا مرحلہ سامنے نہیں آیا تھا لیکن جب یہ مرحلہ سر پر آ گیا تو ان کے لیے چھپنے کا موقع باقی نہ رہا۔ پھر ان لوگوں نے یہ وسوسہ اندوزی شروع کر دی کہ ہم بھائیوں کے اندر خونریزی پسند نہیں کرتے۔ یہ لوگ اپنی اس منافقانہ روش کی وجہ سے اپنے آپ کو صلح جو اور امن پسند کہتے تھے۔ ان کی پوری کوشش تھی کہ مسلمان ان کی یہ پالیسی اپنا لیں تاکہ ان کے نفاق پر بھی پردا پڑا رہے اور اسلام کے دشمنوں کا مقصد بھی پورا ہو جائے۔ ان کی اسی ذہنیت کو سامنے رکھ کر آیت زیر بحث میں فرمایا کہ یہ راہ جو تم نے اختیار کی ہے اور جس

Marfat.com

کو چاہتے ہو کہ دوسرے بھی اختیار کریں امن وصلح کی راہ نہیں ہے بلکہ سیاسی فساد اور برادر کشی کی طرف تمہاری واپسی ہے جس میں تم پہلے مبتلا رہے ہو۔ اس آیت میں ایک کھلا چیلنج ہے کہ منافقین جو نبی ﷺ کی صداقت ظاہر ہونے کے باوجود ضد اور عداوت سے آپ کی مخالفت کر رہے ہیں وہ اپنی مکاریوں اور چالبازیوں میں کبھی کامیاب نہیں ہوں گے اور اپنے کیے پر پچھتائیں گے۔

امام رازی اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں: 'کیا لڑکیوں کو زندہ درگور کرنا قطع رحمی اور فتنہ فساد نہیں ہے؟ اس آیت میں قطع رحمی کا خاص طور پر ذکر یہ بتانے کے لیے کیا گیا ہے کہ جو بھی اللہ پر ایمان سے روگردانی کرتا ہے اس سے انسان کے لیے کسی بھلائی کی توقع بے کار ہے اور اگر اس سے کسی خیر کی توقع ہو سکتی تو وہ اپنے رشتہ داروں کے درمیان رحم کے تعلق کو قطع نہ کرتا۔

رحم مرد اور عورت میں تمیز کی نفی کرتا ہے

مشرکین توہم پرستی پر اس قدر آگے بڑھ چکے تھے کہ انھوں نے حلال وحرام میں دخل اندازی شروع کر دی تھی، چنانچہ حلال اور حرام کے بارے میں ان کے باطل تصورت کی ایک اور قسم کو بیان کرتے ہوئے اللہ کا فرمان ہے: 'وَقَالُواْ مَا فِي بُطُونِ هَـٰذِهِ الأَنْعَامِ خَالِصَةٌ لِّذُكُورِنَا وَمُحَرَّمٌ عَلَىٰ أَزْوَاجِنَا وَإِن يَكُن مَّيْتَةً فَهُمْ فِيهِ شُرَكَاء' (الأنعام۶:۱۳۹) 'اور وہ کہتے ہیں کہ جو چیز ان مویشیوں کے پیٹ میں ہے وہ صرف ہمارے مردوں کے لیے ہے اور ہماری عورتوں پر حرام ہے اور اگر وہ مردہ ہے تو اس میں وہ (مرد اور عورتیں) سب برابر کے شریک ہیں'۔ مَا فِي بُطُونِ سے مراد ابن عباس اور قتادہ کے نزدیک دودھ ہے جبکہ سدی اور مجاہد کے نزدیک اس سے مراد بحیرہ (جس نے دس بچوں کو جنم دیا ہو) اور سائبہ (جس نے پانچ بچوں کو جنم دیا ہو) ہیں اس سے مراد عام جانور بھی ہو سکتے ہیں۔ مشرکین مکہ جانور کے دودھ کو مردوں کے لیے حلال اور عورتوں کے لیے حرام سمجھتے تھے اور جب بچہ نر پیدا ہوتا تو اسے مردوں کے لیے مخصوص کر دیتے تھے عورتیں اسے کھا نہیں سکتی تھیں اور اگر بچہ مادہ ہوتا تھا تو اسے افزائش نسل کی خاطر ذبح نہ کرتے تھے حالانکہ انصاف کا تقاضا تھا کہ اسے ذبح کر کے عورتوں کے لیے مخصوص کر دیتے۔ ہاں اگر بچہ مردہ پیدا ہوتا تو اس میں مردوں کے ساتھ عورتوں کو بھی شریک کر لیتے تھے غالباً اس لیے کہ عورت ان کے خیال سے حقیر تھی اس لیے مردہ بچے میں اسے شریک کر لیتے تھے۔ ازواج اس آیت میں چونکہ ذکور کے مقابلہ میں آیا ہے اس لیے اس سے مراد بیویاں نہیں بلکہ بیویوں کی جنس یعنی عورتیں ہیں۔ یہ بات مشرکین محض اپنی خواہشات کی بنیاد پر کہتے تھے اور بغیر کسی دلیل کے کہتے تھے۔ وہ اپنے لیے ایک ایسا دین تراشنا چاہتے تھے جو خواہ عقل سے بالاتر ہو مگر ان کی خواہشات

Marfat.com

کے عین مطابق ہو۔ یہی انسانی شقاوت کی بنیادی برائی ہے۔ اللہ نے ان کے وہم وخیال کی نہایت ہی معقول تردید کی ہے حکم ہوتا ہے: ثَمٰنِيَةَ اَزْوَاجٍ مِّنَ الضَّاْنِ اثْنَيْنِ وَمِنَ الْمَعْزِ اثْنَيْنِ قُلْ آٰلذَّكَرَيْنِ حَرَّمَ اَمِ الْاُنْثَيَيْنِ اَمَّا اشْتَمَلَتْ عَلَيْهِ اَرْحَامُ الْاُنْثَيَيْنِ نَبِّئُوْنِيْ بِعِلْمٍ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ o وَمِنَ الْاِبِلِ اثْنَيْنِ وَمِنَ الْبَقَرِ اثْنَيْنِ قُلْ آٰلذَّكَرَيْنِ حَرَّمَ اَمِ الْاُنْثَيَيْنِ اَمَّا اشْتَمَلَتْ عَلَيْهِ اَرْحَامُ الْاُنْثَيَيْنِ اَمْ كُنْتُمْ شُهَدَآءَ اِذْ وَصّٰىكُمُ اللّٰهُ بِهٰذَا فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا لِّيُضِلَّ النَّاسَ بِغَيْرِ عِلْمٍ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ o

(الانعام ۶: ۱۴۳ تا ۱۴۴) 'آٹھ جوڑے (نر اور مادہ) دو بھیڑوں میں سے اور دو بکریوں میں سے (ان سے) کہیے کیا دونوں نر حرام کیے ہیں، یا دونوں مادہ، یا وہ جو دونوں مادہ اپنے رحم میں لیے ہوئے ہیں تم مجھے کسی علم (دلیل) کے ساتھ خبر دو اگر تم سچے ہو اور اونٹوں میں سے دو (نر اور مادہ) اور گائیوں میں سے دو، کہیے کہ کیا دونوں نر حرام کیے ہیں، یا دونوں مادہ، یا وہ جو دونوں مادہ اپنے رحم میں لیے ہوئے ہیں۔ کیا تم اس وقت حاضر تھے جس وقت اللہ نے تم کو اس کا حکم دیا۔ تو اس سے بڑھ کر ظالم کون ہے جو اللہ پر جھوٹی تہمت لگائے تاکہ بے علمی سے لوگوں کو گمراہ کرے۔ یقیناً اللہ ظالم لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا'۔

بھیڑ، بکری اور اونٹ، گائے ہر نوع کا جوڑا ہے کل آٹھ جوڑے ہوئے۔ آپ سے کہا گیا کہ ان سے پوچھیے کہ ان میں سے کس کس کو حرام قرار دیا گیا ہے؟ اگر حرمت کا سبب نر پیدا ہونا ہے تو سارے نر حرام ہوں گے اس طرح اگر حرمت کا سبب مادہ پیدا ہونا ہے تو سارے مادہ حرام ہوں گے۔ اگر ذبح شدہ مادہ کے پیٹ سے بچہ نکلے تو اگر وہ حلال ہے۔ تو سب کے لیے حلال ہو۔ یہ کیا ہوا کہ مردوں کے لیے حلال ہو اور عورتوں کے لیے حرام۔ یہ سب باتیں کسی علمی سند پر مبنی نہیں۔ کیا اللہ نے نر اور دونوں مادہ کو حرام کیا ہے یا اس کو جس پر دونوں مادہ کے رحم مشتمل ہیں؟ استفہام انکاری ہے اللہ نے ان تینوں میں سے کسی کو حرام قرار نہیں دیا۔ اس تفصیلی سوال سے سوچنے والے پر واضح ہو جاتا ہے کہ ان کے قول کی کوئی معقول سند نہیں کیونکہ احکام تذکیر و تانیث میں تمیز کی بنا پر مرتب نہیں ہوتے یہ لغو اور جاہلانہ بات ہے۔ اگر وہ اس بات کا اقرار کرلیں کہ ہم پر وہ بچہ حرام ہے جس کو دونوں مادہ اپنے پیٹ میں لیے ہوئے ہیں تو پھر بھی ان کا قول باطل قرار پاتا ہے اور ان کا جھوٹ نمایاں ہو جاتا ہے کیونکہ ان کے اقرار سے ثابت ہوگا کہ اللہ نے بھیڑ بکری، اونٹ گائے کے نر اور مادہ دونوں بچوں کے گوشت کو ان پر حرام کر دیا ہے کیونکہ وہ پیٹ نر اور مادہ دونوں کو لیے ہوئے ہیں۔ نر ہو یا مادہ دونوں ایک ہی جوڑے سے ایک ہی رحم (بچہ دانی) میں پیدا ہوتے ہیں تو پھر ایک کو حلال اور دوسرے کو حرام سمجھنا محض زعم باطل ہے۔ اس خیال کے اظہار سے اس

Marfat.com

کے تراشنے والے کو بھی شرم محسوس ہوتی ہے کیونکہ وہ سمجھتا ہے کہ نہ علم سے نہ مشاہدے سے اور نہ ہی کسی سماوی کتاب سے اس کی دلیل دی جاسکتی ہے۔ ان آٹھ جوڑوں میں سے کس کو کس کے لیے اللہ نے حرام قرار دیا ہے؟ اس حرمت کی دلیل کیا ہے؟ کیا یہ لوگ اس وقت موجود تھے جب اللہ نے یہ حکم صادر کیا؟ اللہ پر بہتان باندھ کر لوگوں کو گمراہ کرنا بہت بڑا ظلم ہے اور جو لوگ تحلیل و تحریم کے بارے میں اللہ پر بہتان باندھتے ہیں اللہ ان کو سزا دے گا۔ جس طرح رحم مادر نر اور مادہ میں کوئی امتیاز روا نہیں رکھتا بالکل اسی طرح ایک انسان میں جنس کی بنیاد پر تمیز کرنا خلاف فطرت اور خلاف دین فطرت ہے۔

رحم کا رشتہ اور اس کی حدود

اس میں کوئی شک نہیں کہ خالق کائنات نے رحم کو اپنے نام کے ساتھ منسلک کر کے اس کو عظمت بخشی ہے۔ اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ توحید کے فوراً بعد والدین سے حسن سلوک کا مرتبہ و مقام ہے مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس رشتہ کی محبت انسان کو دوسروں کی حق تلفی اور ان پر ظلم کرنے پر آمادہ کرے۔ یا اللہ کے کسی حق کو نظر انداز کر دے اور والدین کی محبت انسان کو شرک پر آمادہ کرے۔ اللہ کا حکم ہے: 'وَإِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوا وَلَوْ كَانَ ذَا قُرْبَىٰ ' (الأنعام ۶:۱۵۲) 'اور جب تم بات کیا کرو تو عدل کیا کرو گو وہ شخص (جس کے بارے میں تم بات کر رہے ہو) رشتہ دار ہی کیوں نہ ہو۔ جو لوگ اقربا پروری اور محاباۃ کا شکار ہو جاتے ہیں' اللہ نے ان کو ان الفاظ میں وارننگ دی ہے: 'لَن تَنفَعَكُمْ أَرْحَامُكُمْ وَلَا أَوْلَادُكُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ يَفْصِلُ بَيْنَكُمْ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ ' (الممتحنة ۶۰:۳) 'تمہارے رشتے دار اور اولاد قیامت کے دن تمہارے کام نہیں آئیں گے، اللہ تمہارے درمیان فیصلہ کرے گا اور اللہ تمہارے اعمال کو خوب دیکھتا ہے'۔ بخاری میں حضرت علیؓ کی روایت مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھے زبیر اور مقداد کو بھیجا اور فرمایا کہ 'روضہ خاخ' نامی مقام پر تمہیں ایک عورت اونٹ پر سوار ملے گی اس کے پاس ایک خط ہوگا وہ لے لینا چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ وہ خط حاطب بن ابی بلتعہ (بدری صحابی) کی طرف سے مشرکین مکہ کے نام تھا جس میں نبی کریم ﷺ کی بعض باتوں کی خبر (فتح مکہ کے بارے میں) انہیں پہنچائی گئی تھی دریافت کرنے پر حاطبؓ نے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول ﷺ! مہاجروں کے تو اہل مکہ میں رشتہ دار ہیں میں قریش میں سے نہیں۔ میں نے خیال کیا کہ میں ان پر کوئی احسان کر دوں تا کہ وہ میرے رشتہ داروں کو نہ ستائیں۔ میں نے یہ بات کفر و ارتداد کی وجہ سے نہیں کی۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا حاطبؓ نے سچ کہا ہے۔ اس حدیث کے پہلے راوی عمرو بن دینار کا قول ہے کہ یہ آیت اسی واقعہ

Marfat.com

کے بارے میں نازل ہوئی۔

اللہ کا ارشاد ہے: 'جن کی خاطر تم کفار سے دوستی کرتے ہو اور جن کے بارے میں تم خوف کی وجہ سے مشرکین کے قرب کے خواہاں ہو، قیامت کا دن تمھارے اور ان کے درمیان فیصلہ کن ہوگا۔ اہل ایمان جنت میں داخل ہوں گے اور اہل کفر جہنم میں'۔ قرآن ہی میں اس روزِ قیامت کا نقشہ یوں کھینچا گیا ہے 'یَوْمَ یَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ اَخِیْهِ o وَاُمِّهٖ وَاَبِیْهِ o وَصَاحِبَتِهٖ وَبَنِیْهِ o' (عبس ۸۰: ۳۴ تا ۳۶) 'اس روز آدمی اپنے بھائی سے، اپنی ماں اور اپنے باپ سے اور اپنی بیوی اور بچوں سے بھاگے گا گویا کہ اللہ کہہ رہا ہے کہ تمہیں کیا ہوگیا ہے کہ کل جو تم سے بھاگ جائے گا تو اس کی خاطر نہ حقوق اللہ کا خیال رکھتے ہو نہ حقوق العباد کا'۔ ان آیات میں یہ بتایا گیا ہے کہ اگر عقیدے کا رشتہ ٹوٹ جائے تو قیامت کے دن رحم کے رشتہ کا کیا حال ہوگا؟ عقیدے کا رشتہ نہ اس دنیا میں ٹوٹتا ہے نہ اُس دنیا میں۔ انسان کا دل رحم کے رشتہ سے وابستہ ہوتا ہے۔ وہ اس کی خاطر عدل و انصاف کی حدود سے بھی تجاوز کر جاتا ہے۔ مگر وہ بندھن جو تمھیں اپنے عزیزوں سے باندھتا ہے وہ ٹوٹنے والا ہے کیونکہ تم حزب اللہ کے رکن ہو اور وہ رشتے دار جنھوں نے شرک کو تھامے رکھا وہ حزب الشیطان کے رکن ہیں۔ یہ دونوں جماعتیں کبھی اکٹھی نہیں ہوسکتیں۔ ان کے درمیان مصلحتوں کا تبادلہ ممکن نہیں۔ جیسے ایمان اس دنیا میں تمھارے اور تمھارے مشرک رشتہ داروں کے درمیان تمیز کا باعث ہے بالکل اسی طرح قیامت کے دن وہ تمھارے اور ان کے درمیان تمیز کا باعث بنے گا۔ تم اللہ کی رحمت اور رضا کے سزاوار ہو اور وہ اللہ کی ناراضگی اور عذاب کے سزاوار۔ اس طرح اللہ نے ایمان کی حدود کے اندر رہتے ہوئے اور عدل و انصاف کے تقاضوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے رحم کے رشتوں کی پاسداری کا حکم دیا ہے۔ ان حدود کے بغیر رحم کے رشتے اور آل اولاد قیامت کے دن کام نہیں آئیں گے۔

قرآن حکیم میں لفظ رحم کو اپنے نام سے جوڑ کر عورت کی عظمت کو اجاگر کیا گیا ہے۔ تخلیقی قوت یا تو اللہ کے پاس ہے یا عورت کے پاس۔ گویا تصویر کائنات میں جو رنگ نظر آرہا ہے وہ عورت کے وجود سے ہے۔ اگر دنیا میں سارے مرد ختم ہو جائیں تو دنیا ختم نہیں ہوگی لیکن اگر سب عورتیں ختم ہو جائیں تو بقائے نوع کا سلسلہ رک جائے گا اور دنیا ختم ہو جائیگی۔ یہ عجیب بات ہے کہ دین کی سمجھ نہ رکھنے والے نفس انسانی کے اس نصف بہتر کا مرتبہ و مقام گھٹانے پر تلے ہوئے ہیں۔ حالانکہ خالق کائنات اس کے تخلیقی جزو کو اپنے نام سے جوڑ کر اس کی عظمت کا اعلان کر رہا ہے۔

Marfat.com

زوج (جوڑا)

لغوی مفہوم

احمد بن فارس بن زکریا (المتوفی ۲۹۰ھ) مقاییس اللغۃ میں کہتے ہیں: 'زاء، واو اور جیم (زوج) ایسے حروف ہیں جو بنیادی طور پر ہر چیز کو دوسری چیز کے ساتھ ملانے پر دلالت کرتے ہیں۔ چنانچہ وہ ادنی کپڑا جو ہودے پر ڈالا جاتا ہے اسے 'زوج' کہا جاتا ہے کیونکہ وہ جس چیز پر ڈالا جاتا ہے اس سے مل کر وہ اس کا جوڑا بن جاتا ہے۔ اللہ کا قول ہے: 'یُزَوِّجُهُمْ ذُکْرَانًا وَّاِنَاثًا' (الشوری ۴۲:۵۰) 'انہیں ملا دیتا ہے بطور نر اور مادہ'۔ ہر دو چیزوں کو جو ایک دوسرے سے ملی ہوئی ہوں زوجان کہا جاتا ہے۔ عربی محاورہ: 'تزوّجہ النوم' کے معنی ہیں 'نیند آنکھ میں گھل مل گئی'۔ اللہ کا قول ہے: 'وَاِذَا النُّفُوْسُ زُوِّجَتْ' (التکویر ۸۱:۷) 'اور جب نفوس باہم ملا دیئے جائیں گے'۔ یعنی ہم مذاق لوگوں کو ایک ساتھ اکٹھا کیا جائے گا یا نفوس کو ان کے اعمال کے ساتھ ملایا جائے گا۔ Lane نے اپنی ڈکشنری Lexicon میں لکھا ہے: 'زوج الشئی بالشئی والیہ'، 'ایک چیز کو دوسری کے ساتھ ملانا' جیسا کہ اللہ کا قول ہے: 'وَزَوَّجْنٰهُمْ بِحُوْرٍ عِیْنٍ' (الدخان ۴۴:۵۴) 'ہم انہیں خوبصورت حوروں کے ساتھ ملا دینگے' یعنی 'ان کا ساتھی بنا دیں گے'۔ عربی میں کہیں گے: 'قرنّا ھم' (ہم نے ان کو ملا دیا) اساس البلاغۃ میں زمخشری کا قول ہے کہ عربوں کا محاورہ ہے: 'زوجت ابلی'، 'میں نے ایک اونٹ کو دوسرے سے ملا دیا'۔

قرآن حکیم میں چار مقامات پر ازواج کا استعمال انہی بنیادی معانی پر دلالت کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: 'وَلَا تَمُدَّنَّ عَیْنَیْكَ اِلٰی مَا مَتَّعْنَا بِهٖۤ اَزْوَاجًا مِّنْهُمْ زَهْرَةَ الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا' (طٰہٰ ۲۰:۱۳۱) 'اپنی نگاہیں اس پر نہ جمائیں جو ہم نے ایک دوسرے سے ملتے جلتے لوگوں کو دنیا کی زندگی کی آرائش کے لیے دے رکھی ہیں اور وہ ان سے فائدہ اٹھا رہے ہیں'۔ یہاں ازواج سے مراد اشباہ و اقران یعنی 'ایک دوسرے سے مشابہ لوگ ہیں'۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: 'اُحْشُرُوا الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا وَاَزْوَاجَهُمْ وَمَا كَانُوْا یَعْبُدُوْنَ' (الصافات ۳۷:۲۲) 'اکٹھا کرو انہیں جو ظلم کرتے تھے اور ان کے ساتھیوں کو اور انہیں جن کی وہ اللہ کے سوا عبادت کرتے تھے'۔ اس آیت میں ازواج سے مراد قرناء (قرین کی جمع) ہیں یعنی ان

Marfat.com

کے ساتھی جو افعال میں ان کی پیروی کرتے رہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَّآخَرُ مِنْ شَكْلِهِ أَزْوَاجٌ (ص ۳۸:۵۸) اور اسی صورت کی اور رنگا رنگ سزا یعنی اس کے علاوہ اس سے ملتی جلتی اور سزائیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَكُنْتُمْ أَزْوَاجًا ثَلَاثَةً (الواقعہ ۵۶:۷) اور تم ایک دوسرے سے ملتے جلتے تین گروہ ہو گے۔ یہاں ازواج سے مراد تین گروہ ہیں جو ایک دوسرے کے قرین ہوں چنانچہ بعد میں ان ہم مشرب اور ہم مذاق تین گروپوں کی تفصیل ہے۔ ان چاروں آیات مبارکہ میں ہر چیز کی امثال و نظائر کو ازواج کہا گیا ہے اس لیے یہ آیات بنیادی معنی یعنی ایک چیز کو دوسری چیز کے ساتھ ملانے پر دلالت کرتی ہیں۔

زوج

ابن سیدہ، ابن عبیدہ اور ابن فارس کے قول کے مطابق زوج اس فرد کو کہتے ہیں جس کا کوئی جوڑا یا ساتھی ہو۔ عربی محاورہ میں کہا جاتا ہے زوج او فرد، زوج یا فرد۔ امام راغب کی تصریح کے مطابق جو حیوانات باہم جنسی ملاپ کرتے ہیں ان کے نر اور مادہ ہر ایک پر زوج کا اطلاق ہوتا ہے۔ حیوانات کے علاوہ دوسری اشیاء میں سے ہر اس چیز پر زوج کا اطلاق ہوتا ہے جس کا جوڑا ہو۔ جیسے موزے اور جوتے وغیرہ۔ ایسی دونوں چیزوں کو ملا کر زوجان کہا جاتا ہے۔

ازہری (المتوفی ۳۷۰ھ) نے تہذیب اللغة (۱۱:۱۱۵) میں ابوبکر کا قول نقل کیا ہے کہ عوام غلط طور پر یہ سمجھتے ہیں کہ زوج کے معنی دو ہیں مگر یہ عربوں کا محاورہ نہیں کیونکہ وہ زوج حمام (کبوتروں کا جوڑا) نہیں کہتے بلکہ کہتے ہیں: عندی زوجان من الحمام یا زوجان من الخفاف یعنی میرے پاس کبوتروں کا یا جوتوں کا جوڑا (دایاں اور بایاں پاؤں) ہے۔ اس کے بعد انھوں نے نضر بن شمیل کا قول نقل کیا ہے کہ زوج دو کو بھی کہتے ہیں اور ایک کو بھی یعنی هما زوج یا هما زوجان۔ اس قول کے جواب میں ازہری نے کہا ہے کہ نحوی اس قول کو نہیں مانتے کیونکہ ان کے نزدیک زوج سے مراد فرد ہے اور دونوں کو زوجان کہا جاتا ہے اور یہی بات درست ہے۔ اصمعی نہ کبوتر کے جوڑے کو اور نہ جوتے کے جوڑے کو زوج کہنے کی اجازت دیتے ہیں۔ المصباح المنیر میں ابن الانباری کا قول نقل کیا گیا ہے کہ عام لوگ غلطی سے یہ سمجھتے ہیں کہ زوج سے مراد دو ہیں مگر یہ عربوں کا محاورہ نہیں کیونکہ وہ زوج حمام نہیں کہتے بلکہ زوجان من الحمام اور زوجان من الخفاف کہتے ہیں۔ یعنی کبوتروں کا جوڑا یا جوتوں کا جوڑا، اس کے نزدیک دو کو زوجان کہا جاتا ہے اور بجستانی بھی یہی کہتے ہیں کہ وہ دو کو زوج نہیں کہتے خواہ وہ پرند ہوں یا کوئی اور چیز، یہ جاہلوں کا کلام ہے بلکہ دو کو زوجان کہا جاتا ہے۔ قرآن حکیم کی

Marfat.com

درج ذیل آیات اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ نر اور مادہ میں سے ہر ایک کو زوج کہا گیا ہے اور دونوں کو زوجان:

۱۔ ثمانیة أزواج (الأنعام ۶:۱۴۳) 'آٹھ نر اور مادہ'۔ یہاں أزواج أفراد کے معنوں میں ہے۔

۲۔ قُلْنَا احْمِلْ فِيهَا مِن كُلٍّ زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ (ھود ۱۱:۴۰) 'ہم نے (نوح علیہ السلام) سے کہا کہ ہر جوڑے میں سے دو کو کشتی میں سوار کرلو'۔

۳۔ 'وَمِن كُلِّ شَيْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَيْنِ' (الذاریات ۵۱:۴۹) ہر ایک چیز سے ہم نے ایک جوڑا پیدا کیا۔

۴۔ 'فَجَعَلَ مِنْهُ الزَّوْجَيْنِ الذَّكَرَ وَالْأُنثَىٰ' (القیامة ۷۵:۳۹) 'پس اس (نطفے سے) سے ہم نے جوڑا بنایا نر کا اور مادہ کا۔

مندرجہ بالا آیات کریمہ اس بات کا واضح ثبوت ہیں کہ زوج سے مراد ایسا فرد ہے جس کا کوئی جوڑا یا ساتھی ہو اور دونوں کو ملا کر زوجان کہا جائے گا۔ زمخشری نے حضرت ابوذرؓ کی روایت بیان کر کے کہا ہے کہ حضرت ابوہریرہ نے بھی نبی کریم ﷺ سے ایسی روایت کی ہے۔ حضرت ابوذرؓ کی روایت یوں ہے: 'میں نے اللہ کے رسول اللہ ﷺ کو کہتے سنا ہے جو اپنے مال میں سے زوجان (جوڑا) خرچ کرتا ہے جنت کے دربان اس کی طرف لپکتے ہیں۔ میں نے پوچھا! زوجان من المال (مال کا جوڑا) کا کیا مطلب ہے؟ آپ نے فرمایا! دو غلام یا دو گھوڑے یا دو اونٹ'۔ حدیث کی عبارت سے ثابت ہوتا ہے کہ زوجان دو کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

مرد عورت کا زوج ہے اور عورت مرد کی زوج، کیونکہ وہ عقد نکاح میں باہم مشابہ ہیں اور یہی لغت عالیہ ہے جسے قرآن نے استعمال کیا ہے اور اس کی جمع ازواج ہے۔ بیوی کے لیے زوجة کا لفظ قرآن حکیم نے قطعی استعمال نہیں کیا۔ کیونکہ امام راغب کے الفاظ میں یہ گھٹیا لغت ہے۔ أزهري، ابن فارس، صاحب المصباح المنیر اور ابن منظور نے بیوی کے لیے زوج کے لفظ کو ہی لغت عالیہ قرار دیا ہے۔ ابن السکیت کا قول ہے کہ اہل حجاز عورت کے لیے زوج بغیر ھا کے بولتے ہیں۔ لسان العرب میں اصمعی کا قول نقل کیا گیا ہے کہ 'بیوی کے لیے زوجة کا لفظ استعمال نہیں ہوتا' آپ دیکھتے ہیں کہ اللہ کا قول ہے: 'اسْكُنْ أَنتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ' (البقرة ۲:۳۵) 'اے آدم تم اور تمہاری بیوی جنت میں رہا کرو'۔ قرآن نے

Marfat.com

آیت (البقرۃ ۲:۳۵:۱۰۲)، (النساء ۴: ۲۰)، (الأعراف ۷: ۱۹)، (طٰہٰ ۲۰: ۱۱۷)، (الأنبیاء ۲۱: ۹۰) اور (الأحزاب ۳۳: ۳۷) میں کم و بیش سات مقامات پر زوج کا لفظ بیوی کے معنوں میں استعمال کیا ہے اور کسی ایک مقام پر بھی زوجۃ کا لفظ استعمال نہیں کیا۔ یہ لفظ مذکر اور مؤنث دونوں کے لیے مشترک ہے۔ بعض اہل لغت زوجہ کو ازدشنوءۃ یا بنو تمیم کا لہجہ قرار دیتے ہیں اور یہ لفظ ایک آدھ شعر میں بھی کہیں استعمال ہوا ہوگا مگر فقہا نے اس لفظ کو کہیں بعد میں وضاحت کے لیے استعمال کیا ہے محض اس سبب سے کہ کہیں مذکر و مؤنث رضاعت اور وراثت کے معاملات میں گڈمڈ نہ ہو جائیں۔ مثلاً اگر ترکہ کے بارے میں کہا جائے کہ اس کا وارث زوج ہے تو پتہ نہیں چلے گا کہ وہ مذکر ہے یا مؤنث، بہر کیف لغت عالیہ مرد اور عورت دونوں کے لیے زوج ہے۔

کائنات کی ہر چیز میں زوجیت کا قانون

لفظ زوج قرآن حکیم کا وہ لفظ ہے جو اپنے اندر معانی کا سمندر سمیٹے ہوئے ہے۔ کئی معانی کا اہل علم نے حال ہی میں سراغ لگایا ہے، جانے کتنے معانی اور ہوں گے جو ابھی تک ہماری رسائی سے باہر ہیں۔ معانی کے یہ موتی قرآن میں جابجا بکھرے ہوئے ہیں۔ میں نے مقدور بھر کوشش کی ہے کہ ان بکھرے ہوئے موتیوں کو یکجا کر سکوں۔

زوجیت نہ صرف زندگی کا قانون ہے بلکہ کائنات کا قانون ہے، کائنات کیا ہے؟ ایک ذرہ جو منفی اور مثبت زوج کے الیکٹرون سے مرکب ہے۔ یہ تو بے جان ذرے کا حال ہے۔ بے جان مٹی سے جاندار کی طرف انتقال کا مرحلہ ساخت کے اعتبار سے زمان و مکان سے وسیع تر ہے۔ اس کے بعد خلیے کی شکل میں نطفے سے کامل مخلوق کی طرف انتقال کا مرحلہ ہے۔ پھر اس کے بعد جوڑے جوڑے بنانے کا مرحلہ ہے۔ نطفہ سے تذکیر و تانیث کی طرف انتقال کا مرحلہ بھی زمان و مکان کے بعد سے وسیع تر ہے۔ زندہ وجود سے نطفہ کی شکل میں سادہ سا تنہا خلیہ جوش نمو میں اپنی ذات پر تقسیم ہو کر افزائش نسل کا باعث بنتا ہے۔ اس ایک خلیے سے خلیوں کا مجموعہ ترکیب پاتا ہے تاکہ ان سے ایک خاص عضو پیدا ہو جس کے ذمے خاص کام ہو۔ پھر اعضاء کے درمیان تناسب و توافق ہوتا ہے اور وہ سب مل کر ایک مخلوق کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ یہ سب کچھ ایک نطفے سے ہوتا ہے جس میں نر اور مادہ کی کوئی تمیز نہیں ہوتی۔ پھر یہی خلیے شکست و ریخت اور تغیر کے مرحلہ سے گزر کر جوڑے بن جاتے ہیں جو نئے نطفوں کے وجود پر قادر ہوتے ہیں۔ پھر وہ نطفے اسی سفر پر چل نکلتے ہیں۔ کس قدر حیرت انگیز ہے یہ سفر! ایک ایسی حیرت جو ختم ہونے کا نام نہیں لیتی۔

Marfat.com

کائنات کے اس قانون کو قرآن حکیم نے سورۃ یٰسین (۳۶:۳۶) سورۃ زخرف (۱۲:۴۳) سورۃ ذاریات (۴۹:۵۱) اور سورۃ نبا (۸:۷۸) چار مقامات پر بیان کیا ہے۔ سورۃ زخرف اور سورۃ نبا میں محض اتنا ساذکر ہے کہ اللہ نے (سب جوڑوں کو اور) تم سب کو جوڑوں کی شکل میں پیدا کیا ہے مگر سورۃ یٰسین اور سورۃ ذاریات میں یہ بات بتائی گئی ہے کہ روئے زمین کی ہر چیز چاہے جمادات ہوں، حیوانات ہوں یا نباتات سب کو جوڑوں کی شکل میں تخلیق کیا گیا ہے۔ کچھ جوڑوں کے بارے میں ہمیں پتہ ہے مگر بہت سے جوڑے ایسے ہیں جہاں تک ہمارا علم پہنچ نہیں پایا۔ سورۃ ذاریات میں ارشاد ربانی ہے: 'من کل شئی خلقنا زوجین لعلکم تذکرون' ہر چیز کو ہم نے جوڑا جوڑا پیدا کیا تا کہ تم یاد رکھو یا نصیحت حاصل کرو'۔ آیہ مبارکہ کے آغاز میں حرف جار من استغراق کے لیے ہے یعنی ساری کی ساری چیزوں کو جوڑا پیدا کیا۔ آیت میں شئی کا لفظ غیر جانداروں کی طرف اشارہ کر رہا ہے یعنی زوجیت کا قانون صرف جانداروں کے لیے نہیں بلکہ جمادات اور عالم معانی میں بھی یہ قانون کارفرما ہے۔ امام رازی شئی کی تفصیل بتاتے ہوئے تفسیر کبیر میں زیر نظر آیت کی تفسیر کے ضمن میں فرماتے ہیں: 'منطقیوں کے نزدیک شئی سے مراد جنس ہے اور ہر جنس سے دو انواع تخلیق ہوتی ہیں جیسے جوہر سے مادی (Material) اور مجرد (Abstract)، مادی سے نامی (Organic) اور جامد (Inorganic)، نامی سے مدرک (Rational) اور نبات، مدرک سے ناطق (Speaking) اور صامت (Non speaking)، اس تعریف کے تحت روئے زمین پر جاندار اور بے جان مخلوق سب اس قانون کے تحت ہے۔ کائنات میں کوئی چیز اکیلی نظر نہیں آتی۔ ہر چیز میں دو دو ہونے کی حقیقت کام کر رہی ہے۔ رات کے لیے دن، صبح کے لیے شام، بہار کے لیے خزاں ہے۔ گرمی کے لیے سردی ہے، آسمان کے لیے زمین ہے، اوپر کے مقابلہ میں نیچے، آگے کے مقابلہ میں پیچھے۔ دائیں کے مقابلہ میں بائیں اور ماضی کے مقابلہ میں مستقبل ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ یہ زوجیت عالم معانی میں بھی موجود ہے جیسے حق و باطل، خیر و شر، ایمان و کفر، ہدایت و گمراہی، خوش بختی و بدبختی، روشنی و ظلمت، موت و حیات اور دنیا و آخرت۔ جب تک کسی شے کا اس کی جنس سے مقابل نہ ہو اس کا وجود قائم نہیں رہ سکتا۔ یہ جوڑے ایک دوسرے کی مخفی قوتوں اور صلاحیتوں کو ابھار کر آپس میں ملے جلے رہتے ہیں۔ چنانچہ ان میں سے کوئی تنہا اپنے مقصد تخلیق کو پورا نہیں کر سکتا۔ ان میں ظاہری طور پر ضدین کی نسبت ہے لیکن قدرت نے ان کے اندر ایسے ظاہری اور باطنی واعیے رکھے ہیں کہ باہم مل جل کر ایک بلند مقصد کو پورا کرتے ہیں۔

Marfat.com

جاندار اور بے جان جوڑوں میں ایک فرق نمایاں ہے کہ جانداروں کے جوڑے ایک دوسرے کے مماثل ہوتے ہیں جبکہ جمادات اور عالم معانی کے جوڑے ایک دوسرے کی ضد ہوتے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ زندہ جوڑے نفس واحدہ کی پیداوار ہیں، ان کی تخلیق کا ایک مقصد سکون، محبت اور رحمت ہے اور دوسرا مقصد بقائے نوع۔ ان مقاصد کو پورا کرنے کے لیے ان میں مکمل پیوستگی، وابستگی اور ہم خیالی از بس ضروری ہے اس لیے وہ ایک دوسرے کے مماثل ہوتے ہیں نہ کہ مقابل۔ سورۃ یسین میں حق تعالیٰ کا ارشاد ہے: 'سُبْحَانَ الَّذِیْ خَلَقَ الْاَزْوَاجَ كُلَّهَا مِمَّا تُنْبِتُ الْاَرْضُ وَمِنْ اَنْفُسِهِمْ وَمِمَّا لَا یَعْلَمُوْنَ' (یسین ۳۶:۳۶) 'وہ ذات پاک ہے جس نے ہر چیز کے جوڑے پیدا کیے خواہ وہ زمین کی اُگائی ہوئی چیزیں ہوں خواہ خود ان کے نفوس ہوں اور خواہ وہ چیزیں ہوں جنہیں یہ جانتے بھی نہیں'۔ یہ قرآن حکیم کی معرکتہ الآراء آیت ہے جو علمی انکشافات کی نقاب کشائی کرتی ہے۔ اس آیت میں یہ بتایا گیا ہے کہ وحدت خلق کی حقیقت اصل میں قاعدہ تکوین کی وحدت کی حقیقت ہے۔ اللہ نے جانداروں کو جوڑا جوڑا بنایا۔ نباتات بھی انسان ہی کی مانند ہیں اور اس میں بھی نر اور مادہ موجود ہیں۔ اس بات کی خبر اس وقت لوگوں کو نہ تھی لیکن پودوں میں نر اور مادہ کا وجود ایک مسلمہ حقیقت ہے۔ ہمارے مفسرین پودوں میں زوج کا ترجمہ انواع و اقسام کرتے رہے کیونکہ ان کا مبلغ علم اتنا نہیں تھا کہ اس حقیقت کو سمجھ سکتے لیکن اب جبکہ علمی طور پر پودوں میں نر اور مادہ کا وجود ثابت ہو چکا ہے یہ ترجمہ غلط شمار ہوگا۔ اللہ نے اہل علم کو اس بات کی توفیق دی ہے کہ وہ اللہ کی بیان کی ہوئی حقیقت کو علمی طور پر سچ ثابت کر دکھائیں۔ یہ پودوں میں جنسیت کی تفصیل بعد میں نباتات میں زوجیت کے تصور کے تحت بیان ہوگی۔ اسی آیت میں اس حقیقت کا بیان ہے کہ بہت سے ایسے جوڑے بھی ہیں جن کا ہمیں علم نہیں۔ اللہ نے ہمیں ان کے وجود کے بارے میں تو بتا دیا مگر ان کی حقیقت کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔ محض اس لیے کہ انسان خود ان کا علم حاصل کر کے ان کی حقیقت تک پہنچ جائے۔ کون جانتا تھا کہ مقناطیس کے دو قطب ہیں یا بجلی کی دو قسمیں ہیں جن کو منفی اور مثبت کہا جا سکتا ہے؟ اب پتہ چلا ہے کہ مادہ کا چھوٹے سے چھوٹا جزو یعنی ذرہ بھی برقی شعاعوں کے مثبت اور منفی جوڑے پروٹون (Protone) اور الیکٹرون (Electrone) سے مل کر بنتا ہے۔ آج سے پندرہ صدیاں پہلے تحقیق کے اس بنیادی قاعدے کی تعلیم دی گئی ہے مگر اس حقیقت کو ثابت غیر مسلم سائنسدانوں نے کیا ہے۔ علم کسی کی میراث نہیں اور نہ ہی اس پر کسی مذہب کی اجارہ داری ہے۔ یہ آیت اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ اللہ کی قدرت بڑی عظیم ہے اور اس کی مملکت بڑی وسیع ہے جس کے کئی گوشے ابھی تک دریافت نہیں ہوئے۔ اسی طرح ستاروں کے ہزاروں جوڑوں کا مشاہدہ

Marfat.com

ہو چکا ہے جو دو باہم پیوستہ ستاروں سے مل کر بنتے ہیں اور دونوں ایک ہی مدار میں گھومتے ہیں گویا دونوں مدتوں سے ایک ہی طرح کا گیت گا رہے ہیں۔

دنیا میں ہر چیز کا مقابل یا مماثل جوڑا ہے جو اللہ کی فردیت اور وحدانیت کی شہادت دیتا ہے۔ وہ اس طرح کہ سب جوڑے اپنے ذات میں ممکن الوجود ہیں۔ اس لیے ان میں تعدد اور کثرت ہے۔ جوڑے کا کوئی فرد مطلقاً کامل نہیں اس لیے وہ ایک دوسرے کی تکمیل کرتے ہیں۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ ان جوڑوں کا خالق جو واجب الوجود ہے تعداد اور کثرت سے پاک ہے۔ وہ فرد ہے۔ ضد، مقابل اور معاون سے پاک ہے۔ اور وہ کامل مطلق ہے اسی لیے اللہ نے فرمایا: 'خلق الأزواج کلها' یعنی 'اس نے سب جوڑوں کو پیدا کیا' تاکہ ہمیں یاد رہے کہ ازواج کا خالق زوجیت سے پاک ہے کیونکہ اگر اس کی زوج ہوتی تو وہ بھی مخلوق ہوتی نہ کہ خالق۔ وہ فرد ہے لاشریک ہے اس لیے عبادت کے لائق ہے۔ لعلکم تذکرون میں یہ معانی بھی پوشیدہ ہیں کہ تاکہ ہمیں یاد رہے کہ ازواج کا خالق جسموں کو ان کی روحوں سے ملانے (اذا النفوس ذوجت) پر قدرت رکھتا ہے اور ملانے کے بعد ان کو دوبارہ اُٹھانے پر بھی قادر ہے۔

کائنات اور فلسفہ زوجیت

قانون زوجیت اللہ کی وحدانیت اور کمال قدرت پر دلالت کرتا ہے۔ امام طبری آیت (۴۹:۵۱) کی تفسیر کے ضمن میں فرماتے ہیں کہ جس ذات نے اپنی قدرت کاملہ سے تمام چیزوں کے جوڑے بنائے وہ ان چیزوں کی مانند نہیں جو ایک دوسرے کے بغیر مکمل نہیں ہوتیں۔ دنیا کی ہر چیز یک رخی ہے مثلاً آگ کا کام گرم کرنا ہے اس میں ٹھنڈا کرنے کی صلاحیت موجود نہیں جبکہ برف صرف ٹھنڈا کرتی ہے اس میں گرم کرنے کی صلاحیت نہیں۔ ان میں سے کوئی چیز بنفسہ کامل نہیں۔ کامل صرف وہ ذات ہے جو ایسی چیزوں کی تخلیق کرتی ہے جو ایک دوسرے کی متماثل بھی ہیں اور متقابل بھی۔ حسن نے مذکورہ بالا آیت کی تفسیر میں متضاد چیزوں کا ذکر کرنے کے بعد کہا ہے کہ ان دو میں سے ہر ایک دوسرے کی زوج ہے مگر اللہ فرد ہے جس کی کوئی مثال نہیں۔ مولانا ابوالکلام آزاد ترجمان القرآن (۸۲:۱) میں لکھتے ہیں: 'اسی قانون اختلاف کا ایک گوشہ وہ بھی ہے جسے قرآن نے تزویج سے تعبیر کیا ہے اور ہم اسے قانون تثنیہ بھی کہہ سکتے ہیں یعنی ہر چیز کے دو، دو متماثل یا متقابل ہونے کا قانون۔ کائنات خلقت کا کوئی گوشہ بھی دیکھو تمہیں یہاں کوئی چیز اکہری اور طاق نظر نہیں آئے گی۔ ہر چیز میں جفت یا دو، دو ہونے کی حقیقت کام کر رہی ہے یا یوں کہیے کہ ہر چیز کوئی نہ کوئی مثنیٰ (Duplicate) رکھتی ہے۔ رات کے لیے دن ہے صبح کے لیے شام

Marfat.com

ہے۔ نر کے لیے مادہ ہے اور مرد کے لیے عورت ہے۔ زندگی کے لیے موت ہے۔ قرآن حکیم نے آخرت کے وجود کا جن جن دلائل سے اذعان پیدا کیا ہے ان میں سے ایک یہ بھی ہے وہ کہتا ہے کہ دنیا میں ہر چیز کوئی نہ کوئی متقابل وجود یا شئی ضرور رکھتی ہے پس ضروری ہے کہ دنیوی زندگی کے لیے بھی کوئی متقابل اور شئی زندگی ہو۔ دنیوی زندگی کی متقابل زندگی آخرت کی زندگی ہے چنانچہ بعض سورتوں میں انھی متقابل مظاہرات سے استشہاد کیا گیا ہے جیسے سورۃ الشمس میں فرمایا: 'وَالشَّمْسِ وَضُحَاهَا'، 'قسم ہے سورج کی اور اس کی روشنی کی'۔ 'وَالْقَمَرِ إِذَا تَلَاهَا'، 'اور چاند کی جب وہ اس کے پیچھے آتا ہے'۔ 'وَالنَّهَارِ إِذَا جَلَّاهَا'، 'اور دن کی جب وہ اُسے روشن کرتا ہے'۔ 'وَاللَّيْلِ إِذَا يَغْشَاهَا'، 'اور رات کی جب وہ اِسے ڈھانپ لیتی ہے'۔ 'وَالسَّمَاءِ وَمَا بَنَاهَا'، 'اور آسمان اور اس کے بنانے کی'۔ 'وَالْأَرْضِ وَمَا طَحَاهَا'، 'اور زمین کی اور اِس کے بچھانے کی' (الشمس ۹۱: ۱ تا ۶)۔

قانون زوجیت کے فلسفہ وحکمت کو مولانا حمید الدین فراہی (مجموعہ تفسیر فراہی صفحہ ۱۴۰) نے قدرے تفصیل سے بیان کیا ہے وہ کہتے ہیں: 'جوڑے کے ہر فرد کا ایک دوسرے کے لیے ساز گار ہونا اس بات کی صاف دلیل ہے کہ ان کا خالق ان سے الگ کوئی ایسی بالاتر ہستی ہے جو ان کے فوائد اور مصالح کو اچھی طرح سمجھتی ہے اور جو جوڑے کے ہر فرد کو دوسرے کے لیے ساز گار بناتی ہے۔ دنیا بحیثیت مجموعی ایک وحدت ہے اور اس کے بہت سے پہلو ایسے ہیں جو کھلے طور پر ناقص نظر آرہے ہیں۔ اس کا وجود کسی ایسے جوڑے کا تقاضا کر رہا ہے۔ جس سے اس کے اس نقص کی تلافی ہو سکے اور جس کے ساتھ مل کر یہ اپنے مصالح کی تکمیل کرے۔ یہی چیز ہے جس کو آخرت کہتے ہیں۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ ایک ایسا خالق ہے جس نے کائنات کی ہر چیز کو دوسرے جزو کے نقص کی تلافی کرنے والا اور اس کے ساتھ اس کے جوڑے کی حیثیت سے تعاون اور ساز گاری کرنے والا بنایا ہے تاکہ وہ باہم مل کر ان مصالح کو وجود میں لائیں جو اس کے بندوں کے لیے مفید ہیں۔ دوسرے اس سے معاد اور آخرت کا اثبات ہوتا ہے جو اس ظاہری اور فانی دنیا کے لیے بمنزلہ زوج کے ہے جس سے اس سارے نقص کی تلافی ہوگی جو اس دنیا کے اندر محسوس ہو رہا ہے'۔ 'ایک اور رخ یہ ہے کہ یہ تمام کائنات مختلف ایسی انواع سے بھری ہوئی ہے جو اپنی اصل، اپنے ماحول اور اپنے اسباب میں مشترک ہونے کے باوجود ایک دوسرے کے بالکل مخالف ہیں۔ یہ چیز اس بات پر دلیل ہے کہ اس دنیا کا انتظام کرنے والا ایک رب ہے جو ان تمام انواع کی نوعی تقاضوں کے مطابق تربیت کر رہا ہے کہ ان میں سے کوئی چیز بھی دوسری چیز سے متصادم نہیں ہو سکتی اور اس دنیا کا نظام بغیر کسی خلل اور خرابی کے چل رہا ہے'۔ 'ہر چیز کے جوڑا جوڑا پیدا ہونے سے یہ

Marfat.com

استدلال اپنے مذکورہ دونوں پہلوؤں سے جس طرح اس بات کو ثابت کر رہا ہے کہ اس کائنات کا ایک خالق ہے جو فرد ہے اور اس تمام کائنات کی تدبیر فرما رہا ہے۔ اسی طرح اس بات کو ثابت کر رہا ہے کہ یہ خالق مہربان اور محبت کرنے والا ہے۔ اس کا علم اور اس کی رحمت ہر چیز کا احاطہ کیے ہوئے ہے اور آسمان سے لے کر زمین تک ہر چیز اس کے قبضہ، تصرف میں ہے اور وہ ان کو اپنے بندوں کی خدمت اور نفع رسانی میں سرگرم کار کیے ہوئے ہے۔

قرآن حکیم میں نباتات کے زوج (نر اور مادہ)

قرآن حکیم میں نباتات کے جوڑوں کا تذکرہ سورۃ رعد (۳:۱۳)، سورۃ طٰہٰ (۵۳:۲۰)، سورۃ الحج (۵:۲۲)، سورۃ شعراء (۷:۲۶)، سورۃ لقمان (۱۰:۳۱)، سورۃ یٰسین (۳۶:۳۶)، سورۃ ق (۷:۵۰) اور سورۃ رحمٰن (۵۲:۵۵) یعنی کل آٹھ مقامات پر واحد تثنیہ اور جمع کے صیغوں کے ساتھ ہوا ہے جبکہ حیوانات کے جوڑوں (ازوج) کا ذکر صرف تین مقامات پر ہوا ہے۔ اکثر مفسرین نے ان مقامات پر زوجان کا ترجمہ ذائقے، رنگ، مزاج اور حجم کے اعتبار سے دو مختلف اصناف کیا ہے یعنی میٹھا اور کڑوا، سفید اور کالا، خشک اور تر، چھوٹا اور بڑا، کچھ مفسرین نے درخت اور غیر درخت، پھلدار اور بے پھل، معروف اور غیر معروف دو اصناف کا ذکر کیا ہے۔ امام رازی کے پائے کے فلسفی مفسر نے سورۃ رعد کی آیت (۳:۱۳) میں زوجین کی تفسیر کرتے ہوئے لکھا ہے: 'حاصل کلام یہ ہے کہ اب تو لوگ بہت بڑھ گئے ہیں مگر ان کی ابتداء دو شخصوں آدم و حوا سے ہوئی اور یہی حال سب درختوں اور نباتات کا ہے یعنی اللہ نے ابتداء میں زمین پر دو دو درخت پیدا کیے۔ اس میں ان مفسرین کا قصور بھی نظر نہیں آتا کیونکہ علم نباتات میں اس حد تک تحقیق نہیں ہوئی تھی جو سورۃ یٰسین میں موجود اس حقیقت کا سراغ لگا سکتی کہ کئی ایسے جوڑے بھی ہیں جو ہمارے علم میں نہیں۔ علمی طور پر اس حقیقت کی نقاب کشائی کو تھوڑا عرصہ ہوا ہے۔ البتہ مجھے البحر المحیط میں سورۃ رعد کی آیت (۳:۱۳) کی تفسیر میں لغت کے امام فراء کے حوالے سے ایک قول ملا ہے کہ پھل میں نر اور مادہ ہوتے ہیں۔

جدید تحقیقات کہتی ہیں کہ درختوں یا پودوں کے جنسی جوڑے (Sexual pairs) ہوتے ہیں۔ ان میں سے ایک نر ہوتا ہے اور دوسرا مادہ۔ نر کا صنفی عضو زرریشہ (Stamens) کہلاتا ہے اور مادہ کی تخم دانی کو بقچہ گل (Pistil) کہا جاتا ہے۔ نر اور مادہ کے ملاپ سے یہ پودے بار آور ہوتے ہیں۔ وہ اس طرح کہ زرگل (Pollen) کے تلقیحی ذرات بقچہ گل (Pistil) کے چپکنے والے سر بقچہ (Stigma) کو ڈھانپ

Marfat.com

لیتا ہے اور بار آور کرتا ہے۔ ہر ایک سے نلکی سی نکلتی ہے جو بڑی ہو کر بیضہ دانی (Ovary) کے اندر چلی جاتی ہے اور اس نلکی کے سرے سے نر خلیہ نکلتا ہے اور مادہ خلیہ سے نکل کر پھل پیدا کرتا ہے۔ بعض پودوں میں زرریشہ (Stamens) اور بلچہ گل (Pistil) ایسے مقامات پر ہوتے ہیں کہ موخر الذکر آسانی سے (Pollen) حاصل کر لیتا ہے لیکن بعض میں زرریشہ (Stamens) اتنا چھوٹا ہوتا ہے کہ آسانی سے پولن تک نہیں پہنچ پاتا۔ اکثر حالات میں ایک ہی پھول میں صنفی اعضا موجود ہوتے ہیں۔ ایسی صورتوں میں زردان (Anther) سے بلچہ گل (Pistil) تک (Pollen) پہنچانے کے لیے ہوا، پرندوں، تتلیوں اور شہد کی مکھیوں سے خدمت لی جاتی ہے۔ مگر بعض حالات میں صنفی اعضا الگ الگ پھولوں اور درختوں میں موجود ہوتے ہیں۔ عرب کی کھجور اور پاک و ہند کا پپیتہ ایسے ہی یک جنسی (Uni Sexual) درخت ہیں۔

علمی حقیقت سے کس قدر قریب ہے سورۃ یٰسین میں ارشادِ خداوندی ہے: "سُبْحَانَ الَّذِیْ خَلَقَ الْاَزْوَاجَ کُلَّهَا مِمَّا تُنْبِتُ الْاَرْضُ وَمِنْ اَنْفُسِهِمْ وَمِمَّا لَا یَعْلَمُوْنَ" پاک ہے وہ ذات جس نے سب جوڑے پیدا کیے اس سے جو زمین اگاتی ہے اور ان کی اپنی جانوں سے اور اس سے جس کا علم اُن کو نہیں (یٰسین ۳۶:۳۶)۔ آیت کے آغاز میں سبحان (پاک ہے وہ ذات) اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ صرف اللہ ہی بغیر جوڑے اور مثال کے ہے۔ ہر چیز جس کا جوڑا ہے وہ فنا پذیر ہے جبکہ اللہ اس سے پاک ہے اس کی کوئی مثال نہیں۔ نباتات کے جوڑوں کو بھی لوگ نہیں مانتے تھے۔ قرآن کا اعجاز ہے کہ اس نے پندرہ صدیاں پہلے آٹھ مقامات پر اس حقیقت کی طرف رہنمائی کی مگر اس سے پردہ اُٹھانے کی توفیق یورپ کے علماء کو ہوئی۔ کون جانتا تھا کہ مقناطیس کے دو قطب یا بجلی کی مثبت اور منفی دو قسمیں اور ذرے میں Electron اور Proton دو عناصر ہوتے ہیں اور جانے کتنے ایسے جوڑے ہیں جو ابھی انسانی نظروں سے اوجھل ہیں۔

قرآن حکیم کی درج ذیل دو آیات میں تو اس بات کی واضح دلیل ہے کہ حیوانات کی مانند نباتات کے بھی نر اور مادہ جوڑے ہوتے ہیں سورۃ رعد میں ارشاد ربانی ہے: "وَمِنْ کُلِّ الثَّمَرٰتِ جَعَلَ فِیْهَا زَوْجَیْنِ اثْنَیْنِ" (الرعد ۱۳:۳)۔ "اور اس زمین میں ہر قسم کے پھلوں کا نر اور مادہ جوڑا بنایا"۔ زوجین کی تشریح "الذَّکَرَ وَالْاُنْثٰی" (القیامۃ ۷۵:۳۹) "نر اور مادہ قرآن نے خود کر دی ہے۔ اسی طرح سورۃ رحمٰن میں ارشادِ باری ہے: "فِیْهِمَا مِنْ کُلِّ فَاکِهَةٍ زَوْجٰنِ" (۵۵:۵۲) "ان دونوں جنتوں میں ہر پھل کا جوڑا (نر اور مادہ) ہے۔ اس آیت کی تفسیر میں امام رازی کہتے ہیں: "احتمال ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ ہر جنت میں ہر پھل کی ایک قسم ہے اور دونوں جنتوں میں دو قسمیں ہیں"۔ علمی

Marfat.com

ترقی کے بعد یہ تفسیر غیر علمی دکھائی دیتی ہے اور محض متقدمین کے احترام میں اب بھی اس قسم کی تفسیر سے علم کی کوئی خدمت نہیں ہوتی۔

نباتات کے جوڑے کی صفت قرآن حکیم نے آیات نمبر (الحج ۲۲:۵)؛ (الشعراء ۲۶:۷) اور (لقمان ۳۱:۱۰) میں زوج بھیج (تروتازہ جوڑا) اور زوج کریم (مہربان جوڑا) کہہ کر کی ہے۔ اس سے مراد وہ تروتازہ اور مہربان نر اور مادہ ہیں جو انسان کو فائدہ پہنچاتے ہیں۔ یہ اس بات کی طرف لطیف اشارہ ہے کہ جو پھل نر اور مادہ کے جنسی ملاپ کے بعد پیدا ہوتا ہے وہ خوشنما اور مہربان ہوتا ہے اور جو پھل تخم ریزی کے بغیر پیدا ہوتا ہے جیسے بعض حیوانات خلیہ کی اپنی ذات پر تقسیم سے تخم ریزی کے بغیر پیدا ہوتے ہیں وہ پھل گھٹیا اور ردی ہوتا ہے۔ اسی لیے جدید مفسرین نے نباتات میں نر اور مادہ کے جوڑے کو تسلیم کرتے ہوئے آیات کا صحیح ترجمہ کیا ہے۔ سید قطب شہید نے اپنی تفسیر فی ظلال القرآن میں آیات نمبر (۳:۱۳)، (۵۲:۲۰)، (۳۱:۱۰) اور (۳۶:۳۶) میں زوج سے مراد جنسی جوڑا لیا ہے وہ سورۃ رعد کی تفسیر میں فرماتے ہیں: 'حال ہی میں علمی طور پر ثابت ہو چکا ہے کہ درخت اور نباتات نر اور مادہ کے ملاپ سے پھل اور دانے پیدا کرتے ہیں۔ اکثر درختوں میں نر اور مادہ کے اعضاء ایک ہی درخت میں موجود ہوتے ہیں اور کبھی نر کا عضو ایک درخت میں ہوتا ہے اور مادہ کا دوسرے درخت میں جیسا کہ کھجور، جیسے ایک درخت میں نر اور مادہ کے اعضاء موجود ہوتے ہیں ویسے ہی ایک پھول میں یہ اعضاء موجود ہوتے ہیں جیسا کہ کپاس یا ہر عضو علیحدہ پھول میں ہوتا ہے جیسا کہ کدو۔ عبدالکریم الخطیب نے اپنی تفسیر التفسیر القرآنی للقرآن میں جہاں جہاں نباتات کے زوج، کا لفظ استعمال ہوا ہے وہاں انھوں نے اس کا ترجمہ جنسی جوڑا ہی کیا ہے۔ محمد پکھتال نے قرآن کے انگریزی ترجمہ میں ان آیات میں زوج کا ترجمہ جنس کے اعتبار سے کیا ہے۔ علامہ عبداللہ یوسف علی نے اپنے (انگریزی ترجمہ اور تفسیر میں Sex in s plant کا نقطۂ نظر پیش کیا ہے۔ سورۃ رعد کی آیت کے تحت وہ لکھتے ہیں پودوں کے بھی جانوروں کی مانند اعضائے تناسل ہوتے ہیں۔ اکثر اوقات ایک ہی پھول میں نر اور مادہ اعضاء موجود ہوتے ہیں مگر بعض اوقات یہ اعضاء دو مختلف پھولوں میں موجود ہوتے ہیں عرب کی کھجور اور ہند و پاک کا پپیتہ یک جنسی (Uni sexual) ہوتا ہے۔

زوجیت کا قانون ایک ہی ہے جو سب جاندار اور بے جان مخلوق میں جاری و ساری ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ انسان، حیوان اور نبات کے جوڑے ہم جنس ہوتے ہیں اس لیے ایک دوسرے کے مماثل ہوتے ہیں جبکہ عالم جمادات اور عالم معانی کے جوڑے ایک دوسرے کے مقابل ہوتے ہیں۔

Marfat.com

قرآن حکیم میں حیوانات کے زوج

قرآن حکیم نے جانوروں کے نر اور مادہ کا ذکر سورۃ انعام (۶:۱۴۳)، سورۃ زمر (۳۹:۶) اور سورۃ شوری (۴۲:۱۱) تین مقامات پر کیا ہے۔

سورۃ انعام میں ارشاد ربانی ہے: 'ثَمَانِيَةَ أَزْوَاجٍ مِّنَ الضَّأْنِ اثْنَيْنِ وَمِنَ الْمَعْزِ اثْنَيْنِ قُلْ آلذَّكَرَيْنِ حَرَّمَ أَمِ الْأُنثَيَيْنِ أَمَّا اشْتَمَلَتْ عَلَيْهِ أَرْحَامُ الْأُنثَيَيْنِ' (الأنعام ۶:۱۴۳) 'نر اور مادہ کی کل تعداد آٹھ یعنی بھیڑ کا نر اور مادہ جوڑا، بکری کا نر اور مادہ جوڑا، اونٹ کا نر اور مادہ جوڑا، اور گائے کا نر اور مادہ جوڑا' یہ چار جوڑے کل آٹھ نر اور مادہ ہوئے۔ لغوی اعتبار سے اس آیہ کریمہ سے ثابت ہوتا ہے کہ نر اور مادہ کے جوڑے کو زوجان کہا جاتا ہے جیسا کہ سورۃ نجم کی آیت میں زوجان کی تشریح یوں کی گئی ہے: 'وَأَنَّهُ خَلَقَ الزَّوْجَيْنِ الذَّكَرَ وَالْأُنثَىٰ' (النجم ۵۳:۴۵) 'اور یہ کہ اس نے جوڑا یعنی نر اور مادہ پیدا کیا ہے'۔ اس آیت میں کل تعداد بتانے کے لیے لفظ زوج استعمال ہوا ہے۔ جب کسی چیز کا ہم جنس موجود نہ ہو تو اسے فرد کہا جاتا ہے نہ کہ زوج۔ اس کی مثال صاحب کشاف نے یہ دی ہے کہ شیشے کو جام اس وقت کہا جائے گا جب اس میں شراب ہوگی وگرنہ یہ پیالہ کہلائے گا۔

پہلے کل تعداد بتائی اور بعد میں اس کی تفصیل۔ یہاں صرف نمائندہ کے طور پر ان چار گھریلو جانوروں کے جوڑوں کا ذکر ہے جو اس ماحول میں مفید اور کارآمد تھے۔ گھوڑے کو عرب محاورہ میں غالباً اس کی برق رفتاری کے باعث انعام (چوپایوں) میں شامل نہیں کیا جاتا۔ آیت زیر نظر میں مشرکین کے اس عقیدہ اور عمل کی تردید کی گئی ہے جو انھوں نے اپنے طور پر گھڑ رکھے تھے۔ ان میں ایک باطل وہ تھا جس کا آیت نمبر ۱۳۹ میں ذکر ہے یعنی یہ کہ ان جانوروں کے پیٹ میں جو بچہ ہے اگر وہ زندہ پیدا ہوا تو مردوں کے لیے حلال ہوگا اور عورتوں کے لیے حرام، ہاں اگر بچہ مردہ پیدا ہوا تو اس کے کھانے میں عورتیں بھی شریک ہو سکتی ہیں۔ میرا خیال ہے کہ عورت اور مرد میں یہ جاہلانہ امتیاز تا حال ہماری سوسائٹی میں بھی موجود ہے۔

جانوروں کا زوج اور نفس واحدہ

سورۃ زمر میں ارشاد باری ہے: 'خَلَقَكُم مِّن نَّفْسٍ وَاحِدَةٍ ثُمَّ جَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَأَنزَلَ لَكُم مِّنَ الْأَنْعَامِ ثَمَانِيَةَ أَزْوَاجٍ' (الزمر ۳۹:۶) 'اس نے تم سب کو نفسِ واحدہ سے پیدا کیا پھر اسی سے اس کا جوڑا بنایا اور تمھارے لیے چوپایوں سے کل آٹھ نر اور مادہ اتارے'۔ اس آیت میں بھی سورۃ

Marfat.com

انعام کی مانند حیوانات کے چار جوڑوں یعنی کل آٹھ نر اور مادہ کا بیان ہے لیکن اس کے علاوہ ایک تو اس اہم بات کا اشارہ ہے کہ مخلوقات کی تخلیق نفس واحدہ (جرثومہ حیات) سے ہوئی ہے اور اسی سے ان کا جوڑا بھی پیدا ہوا اس لیے روئے زمین پر پھیلی جاندار مخلوق کی تمام نسلیں تمام مقامات پر ایک ہی طرح کی خاصیتوں کی مالک ہیں۔ ان کے نر اور مادہ اس میں برابر کے شریک ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حیوانوں پر بھی انسانوں کی طرح قانون تکوین لاگو ہے۔ باہمی پیار اور محبت کا جذبہ ان میں بھی موجود ہے۔ بقائے نوع کا داعیہ ان کے یہاں بھی پایا جاتا ہے۔ دوسرے خلق لکم کی بجائے انزل کہا گیا ہے انزل بھی خلق کے معنوں میں ہے مگر بتانا یہ مقصود ہے کہ وہ انسان کے لیے بمنزلہ ایک نعمت کے ہیں جو اتاری گئی یا پھر فتح القدیر کی توجیہ کے مطابق ان جانوروں کو چارے کی ضرورت ہوتی ہے اور چارے کو پانی کی جو آسمان سے نازل ہوتا ہے۔ اللہ نے چار قسم کے چار جوڑوں کے علاوہ بھی بہت سے جانور انسان کے فائدے کے لیے پیدا کیے ہیں۔ یہ صرف نمائندہ چار جوڑے ہیں جو اس ماحول میں انسانوں کے لیے فائدہ مند تھے۔ اس لیے قربانی، عقیقہ، زکاۃ اور دیت کے لیے بھی انہی کو مخصوص کیا گیا ہے۔

جانوروں کا زوج بھی انسانوں کی طرح ہم جنس ہے

سورۃ شوریٰ میں ارشاد ربانی ہے: "جَعَلَ لَكُم مِّنْ أَنفُسِكُمْ أَزْوَاجًا وَمِنَ الْأَنْعَامِ أَزْوَاجًا" (الشوریٰ ۴۲:۱۱) "اس نے تمہاری جنس سے جوڑے بنا دیے اور چوپایوں کی جنس سے بھی جوڑے بنا دیے" یعنی جیسے انسانی جوڑوں کو ان کی جنس سے پیدا کیا بالکل ویسے ہی حیوانی جوڑوں کو ان کی جنس سے پیدا کیا۔ اگر جوڑے ہم جنس نہ ہوتے تو اجنبیت کی وجہ سے محبت کی بجائے نفرت اور سکون کی بجائے بے سکونی پیدا ہو جاتی اور اگر سکون نہ ہوتا تو بقائے نوع کا مقصد فوت ہو جاتا۔ اس آیت کی تفسیر کے ضمن میں سید قطب شہید نے فی ظلال القرآن میں بڑے پتے کی بات کہی ہے۔ لکھتے ہیں: "زمین و آسمان کی تدبیر اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ کائنات کے مظاہر فطرت میں جو ناموس فطرت کارفرما ہے وہ دراصل اللہ کی تدبیر یا مشیت کی دوسری شکل ہے جو زندگی اور اس کے معاملات میں جاری و ساری ہے۔ ساری مخلوق کائنات کا ایک جزو ہے۔ اس کے بارے میں اللہ کی مشیت، ناموس فطرت سے ہم آہنگ ہے تاکہ مخلوق کائنات کے ساتھ یک رنگ ہو کر اپنا جیون بتائے۔ خالق نے جانداروں کے جوڑے ان ہی کے نفوس سے بنائے اور ان میں مساوات قائم کر دی۔ چنانچہ وحدت تکوین وحدت مشیت کی گواہ ہے۔ اس مشیت کے مطابق اس نے جانداروں میں بھی تناسل و تکاثر کا سلسلہ جاری کر کے ان سے الگ ہو گیا۔ وہ منفرد ہے بے مثال ہے"۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو یہ اللہ کی نعمت ہے کہ اس نے روئے زمین پر موجود

Marfat.com

تمام مخلوقات کو خواہ وہ انسان ہوں یا حیوان ہوں یا نباتات، ہم جنس نر اور مادہ کے جوڑے سے پیدا کیا۔ اسی پیوستگی کی وجہ سے اس کے تناسل کا سلسلہ چلتا ہے۔ اس طرح جاندار مخلوق کے درمیان ایک توازن قائم رہتا ہے۔ خشکی اور تری کے حیوانات اور نباتات انسانی تناسل کے مطابق پھلتے پھولتے رہتے ہیں اور زندہ رہنے کے لیے انسانی ضروریات پوری ہوتی رہتی ہیں۔

انسانوں میں زوجیت کا تصور

خلیہ زندہ وجود کی اصل ہے وہ اس طریقے سے تقسیم ہوتا ہے جس طریقے سے توالد وتناسل کا سلسلہ چلتا ہے اور اسی تقسیم سے زندہ وجود نشوونما پاتا ہے۔ یہی ایک خلیہ دو خلیوں میں تقسیم ہو جاتا ہے۔ لاتعداد خلیے جو زندہ وجود میں پائے جاتے ہیں پیدائش سے لے کر نشوونما کی تکمیل تک تقسیم ہوتے رہتے ہیں جب زندہ وجود کی نشوونما پایہ تکمیل تک پہنچ جاتی ہے تو توالد کا سلسلہ رُکتا نہیں۔ اس کے مقابلہ میں شکست وریخت کا عمل شروع ہو جاتا ہے جوں جوں زندہ وجود فنا کی طرف بڑھتا ہے شکست وریخت کا عمل تعمیر کے عمل سے بڑھ جاتا ہے جب تعمیر کا عمل رک جاتا ہے تو وجود فنا ہو جاتا ہے۔ انسان عبارت ہے ایک بڑے خلیے سے جو بیشمار خلیوں سے مل کر بنتا ہے اور جیسا کہ اس کا شخصی نشوونما خود بخود کثرت پیدائش سے تکمیل پذیر ہوتا ہے بالکل اسی طرح اس کی جنسی نشوونما نر اور مادہ کے جوڑے سے مکمل ہوتی ہے۔ وہ اس طرح کہ جب مرد عورت سے ملتا ہے تو نر خلیہ مادہ خلیہ سے مل جاتا ہے۔ حیوانات اور نباتات کا بھی یہی حال ہے۔

جوڑے اللہ تعالیٰ کی قدرت اور نعمت کے دلائل ہیں

انسان پیدائش سے پہلے ایک نطفہ تھا۔ نطفہ کیا ہے؟ انسان کے جسم سے خون اور پسینہ کی طرح کا ایک سیال مادہ جو ایک خاص مدت کے بعد ایک انسانی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ پھر یہ انسان نر اور مادہ بن جاتا ہے۔ یہ عجوبہ کیسے وقوع پذیر ہوتا ہے؟ انسان پانی کے ایک قطرہ یعنی اس نطفہ میں کہاں چھپا ہوتا ہے؟ وہ اس نطفہ کے لاکھوں اجزاء کے صرف ایک جزو میں اپنے گوشت پوست، ہڈیوں، رگوں، بالوں اور ناخنوں سمیت کہاں چھپا ہوتا ہے؟ وہ اپنے خدوخال، خصوصیات، عادات اور صلاحیتوں سمیت کہاں چھپا ہوتا ہے؟ وہ اس خوردبینی خلیہ میں کہاں تھا جس سے لاکھوں خلیے پانی کے اس قطرہ میں تیر رہے تھے؟ اس خلیہ میں نر اور مادہ کی خصوصیات کہاں تھیں؟ وہ خلیہ کیسے دو خلیوں میں منقسم ہو کر نر اور مادہ جوڑے کی شکل اختیار کر گیا؟ قرآن نے ان باتوں کی طرف اشارہ کر کے اللہ کی قدرت اور حکمت کے لیے دلیل

Marfat.com

پکڑی ہے۔ سورۃ قیامہ میں ارشاد ربانی ہے: "کیا اس (انسان) پر یہ حالت نہیں گزری کہ پیدائش سے پہلے نطفہ تھا پھر نطفہ سے علقہ (جونک) ہوا پھر علقہ سے (اس کا ڈیل ڈول) پیدا کیا گیا۔ پھر اسی (ڈیل ڈول کو) ٹھیک ٹھیک درست کیا گیا۔ پھر اس کا جوڑا یعنی نر اور مادہ بنایا اور کیا وہ اللہ اس بات پر قادر نہیں کہ مردوں کو جلا اٹھائے" (القیامہ ۷۵: ۳۷ تا ۴۰)۔

سورۃ نجم میں ارشاد ہے: "اور یہ کہ جوڑا نر اور مادہ اس نے پیدا کیا اس نطفے سے جو رحم میں ٹپکایا جاتا ہے (۵۳: ۴۵)۔ آیہ مبارکہ میں دو چیزیں خاص طور پر قابل غور ہیں۔ ایک تو اس میں سابقہ آیات کی طرح ضمیر ھو کا ذکر نہیں کیونکہ زوجین کی تخلیق کی نسبت اللہ کے سوا کسی اور کی طرف ہو ہی نہیں سکتی اس لیے یہ ضمیر استعمال نہیں کی گئی۔ دوسرے اذا تمنی میں مبدأ حیات کی طرف اشارہ ہے۔ یہ مبدأ حیات اس جرثومہ میں پایا جاتا ہے جو منی میں تیر رہا ہوتا ہے۔ منی نکلنے سے پہلے اس میں زندہ وجود کا جرثومہ تیار حالت میں نہیں ہوتا جب یہ مرد سے خارج ہو کر رحم مادہ میں پڑتی ہے وہ تیار حالت میں ہوتا ہے چنانچہ وہ رحم میں پڑ کر جرثومہ حیات کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ قلبی اور جسمانی روحانی نشوونما کے علاوہ اللہ کے بہت سے احسانات ہیں مثلاً ایک یہ کہ ہماری نوع کا جوڑا پیدا کیا۔ اگر عورت کسی غیر جنس سے ہوتی تو اجنبیت کے باعث طبعاً کامل موافقت نہ ہوتی۔ وہ مرد کی جنس سے ہے یعنی اس کا حصہ ہے نہ کہ کمتر جنس کہ جس کی پیدائش کی خبر دی جائے تو آدمی رنجیدہ ہو کر منہ چھپاتا پھرے۔ لفظ نفس میں تمام خصوصیات، صلاحیتیں، مزاج اور طبعی میلانات موجود ہیں۔ جنسی میلانات کے علاوہ بھی اس کے میلانات ذہنی ہیں جو مرد کے ہیں۔ اسی لیے مرد کی طرح تمام اخلاقی اور دینی ذمہ داریاں اسے بھی سونپی گئی ہیں۔ عورت تمام برائیوں کا منبع نہیں جیسا کہ عیسائیت میں اسے سمجھا جاتا ہے۔ بلکہ یہ اللہ کی نعمتوں میں سے ایک نعمت ہے۔ یہ سکون قلب اور بقائے نوع کا ایک ذریعہ ہے۔ سلسلۂ تخلیق کے لیے عورت اور مرد دونوں لازم و ملزوم ہیں۔ ازدواجی زندگی ایک نعمت ہے جس سے معاشرے کی خدمت کا موقع ملتا ہے۔ سورۃ نحل میں ارشاد ربانی ہے۔ اور اللہ نے تمہاری جنس میں سے تمہارے لیے جوڑے پیدا کیے (یعنی مرد کے لیے عورت اور عورت کے لیے مرد) اور تمہارے جوڑوں میں سے تمہارے لیے بیٹے اور بیٹیاں یا پوتے (حفدۃ کے دونوں معنی ہیں) پیدا کر دیے۔ (کہ اس سے تمہاری زندگی ایک وسیع خاندان کی نوعیت اختیار کر لے) نیز تمہاری روزی کے لیے اچھی اچھی چیزیں پیدا کیں۔ پھر کیا یہ لوگ جھوٹی باتیں تو مان لیتے ہیں لیکن اللہ کی نعمتوں کی حقیقت سے انکار کرتے ہیں (۱۶: ۷۲)۔ اللہ تعالیٰ نے شخصی اور نوعی وجود کو اپنی قدرت کے لیے بطور دلیل پیش کر کے اسے ایک نعمت قرار دیا ہے۔

Marfat.com

زوج (جوڑا) بنانے کی غرض وغایت

قرآن حکیم نے جوڑوں کی تخلیق کے دو مقصد بیان کیے ہیں سکونِ قلب اور بقائے نوع۔ سورۃ روم میں ارشاد ربانی ہے: 'اور اس کی نشانیوں میں سے ایک نشانی یہ ہے کہ اس نے تمہاری ہی جنس سے تمھارے لیے جوڑے پیدا کیے تاکہ تم ان سے تسکین پاؤ (مرد عورت سے تسکین پائے اور عورت مرد سے) اور تمھارے لیے محبت اور رحمت کو پیدا کیا۔ بلاشبہ ان لوگوں کے لیے جو غور وفکر کرنے والے ہیں اس میں بڑی ہی نشانیاں ہیں (روم ۳۰:۲۱)۔ یہاں مردوں کے لیے ان کے نفسوں (جنس) سے جوڑے پیدا کرنے کا ذکر ہے۔ صرف حوا ہی آدم کی جنس سے پیدا نہیں ہوئیں بلکہ سب کے لیے جوڑے ان کی جنس سے اس لیے پیدا کیے تاکہ ایک دوسرے کے لیے سکون کا باعث بنیں۔ اگر وہ غیر جنس سے ہوتے تو محبت کی بجائے نفرت اور سکون کی بجائے بے سکونی پیدا ہوتی۔ اللہ نے ہم جنس جوڑوں میں جذب وانجذاب کے وجدانی احساسات ودیعت کر دیے ہیں کہ جوڑے آپس میں ملاپ کی قدرتی طلب رکھتے ہیں تاکہ محبت اور سکون حاصل ہو۔ مولانا آزاد کے الفاظ میں اللہ نے تین چیزیں پیدا کیں جن کے بغیر انسان مطمئن اور خوشحال زندگی بسر نہیں کر سکتے:

۱۔ سکون۔ ۲۔ مودت۔ ۳۔ رحمت۔

سکون عربی میں ٹھہراؤ اور جماؤ کو کہتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ انسان کی طبیعت میں ایسا ٹھہراؤ اور جماؤ پیدا ہو جائے جسے زندگی کی بے چینیاں اور پریشانیاں ہلا نہ سکیں۔

مودت سے مقصد محبت ہے۔ قرآن مجید کے نزدیک ازدواجی زندگی کی تمام تر بنیاد محبت پر ہے لیکن یہ محبت کا رشتہ پائیدار نہیں ہو سکتا اگر رحمت کا سورج دلوں پر نہ چمکے۔

رحمت سے مقصد یہ ہے کہ میاں بیوی نہ صرف ایک دوسرے سے محبت کریں بلکہ ایک دوسرے کی خطائیں اور کمزوریاں نظر انداز کر دیں۔ رحمت کا جذبہ خود غرضانہ محبت کو فیاضانہ محبت میں بدل دیتا ہے۔ خود غرضی میں انسان اپنی ہستی کو سامنے رکھتا ہے لیکن رحیمانہ محبت میں اپنی ہستی کو بھول جاتا ہے۔ رحمت کا تقاضا یہ ہے کہ دوسرے کی غلطیاں بخش دے۔ غضب و انتقام کی پرچھائیاں دل پر نہ پڑنے دے۔ چنانچہ جوڑا بنانے کا ایک مقصد سکون، محبت اور رحمت کے جذبات پیدا کرنا ہے۔ کیا یہ مقصد عورت اور مرد کو حاکم ومحکوم قرار دینے سے حاصل ہو سکتا ہے؟ بالکل نہیں بلکہ وہ ایک دوسرے کے ساتھی اور شریک حیات ہیں۔

Marfat.com

دوسرا مقصد بقائے نوع ہے۔ سورۃ الشوریٰ میں ارشاد ربانی ہے: 'اس نے تمھارے لیے تمہاری ہی جنس سے جوڑے بنادیئے اسی طرح چوپایوں میں بھی جوڑے پیدا کردیے۔ وہ اس طرح تمھیں پھیلاتا اور بڑھاتا ہے' (۴۲:۱۱) یعنی چارپایوں کے جوڑے ان کی جنس سے پیدا کیے جس طرح انسانوں کے جوڑے اس کی جنس سے پیدا کیے۔ اس تدبیر سے وہ تمہیں پھیلاتا ہے یعنی تعلق زوجیت کی غرض یہ ہے کہ ان کے درمیان توالد ہو اور انسانوں اور حیوانوں کی نسل پھیلے۔ ایک جنس سے ہونے کی وجہ سے فطری احساسات کے تحت جوڑے ایک دوسرے سے ملتے ہیں۔ یہ ملاپ سکون اور محبت کا باعث بنتا ہے اور اس سے نسل آگے بڑھتی ہے ایک دوسرے سے تعاون اور باہمی محبت کے بغیر یہ مقصد احسن طور پر پورا نہیں ہوسکتا۔

جوڑے (زوج) کی نفسِ واحدہ سے تخلیق

نفس واحدہ سے زوج کی تخلیق کا ذکر قرآن حکیم نے تین مقامات پر کیا ہے۔ سورۃ نساء میں ارشاد ربانی ہے: 'یَا أَیُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا رَبَّكُمُ الَّذِی خَلَقَكُم مِّن نَّفْسٍ وَاحِدَةٍ وَخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا' (نساء ۴:۱) 'اے لوگو! اپنے رب سے ڈرو جس نے تمہیں نفسِ واحدہ سے پیدا کیا اور اسی سے اس کا جوڑا پیدا کیا۔ سورۃ اعراف میں ارشاد ہے: 'هُوَ الَّذِی خَلَقَكُم مِّن نَّفْسٍ وَاحِدَةٍ وَجَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا لِیَسْكُنَ إِلَیْهَا' (اعراف ۷:۱۸۹) 'وہ ذات جس نے تمہیں نفس واحدہ سے پیدا کیا اور اسی سے اس کا جوڑا بنایا تاکہ وہ اس جوڑے سے سکون حاصل کرے۔ سورۃ زمر میں ارشاد ہے: 'خَلَقَكُم مِّن نَّفْسٍ وَاحِدَةٍ ثُمَّ جَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا' (زمر ۳۹:۶) 'اس نے تم کو نفس واحدہ سے پیدا کیا پھر اسی سے اس کا جوڑا پیدا کیا'۔

سورۃ نساء کی مذکورہ آیت یتیموں اور عزیزوں کے حقوق بیان کرنے کا مقدمہ ہے۔ گویا کہا یہ جارہا ہے کہ یتیم اور تمھارے عزیز تمھارے ساتھ ایک نسب میں بندھے ہوئے ہیں کیونکہ تم سب کو نفسِ واحدہ سے تخلیق کیا گیا ہے۔ اس لیے تم پر لازم ہے کہ تم ان پر شفقت کرو۔ یہاں لفظ رب بھی پیار اور شفقت کا داعی ہے یعنی یتیم کی پرورش کرو اور صلہ رحمی کرو۔ یہ تکوین و تخلیق کے مسائل بیان کرنے کے لیے کوئی مستقل کلام نہیں!! اکثر مفسرین نے نفس واحدہ سے مراد سیدنا آدم علیہ السلام اور زوجھا سے مراد ان کی بیوی حوا لی ہے۔ انھوں نے اس مفہوم کو نہ تو کسی نص سے اخذ کیا ہے اور نہ ظاہر آیت سے یہ مفہوم نکلتا ہے۔ بلکہ اس کی بنیاد محض ان کا یہ تصور ہے کہ آدم ابوالبشر ہیں۔ یہ خطاب عام لوگوں سے ہے اسے ذہن

Marfat.com

میں موجود ایک خاص نفس سے کیسے مخصوص قرار دیا جاسکتا ہے؟ اور یہ مفہوم سب لوگوں کے یہاں معروف بھی نہیں۔ آیت زیر بحث کا آدم اور حوا سے اصلا کوئی تعلق نہیں۔

مندرجہ ذیل وجوہات کی بنیا پر یہ ترجمہ کہ تمھیں ایک جان یعنی آدم علیہ السلام سے پیدا کیا اور اسی جان یعنی آدم سے اللہ نے اُن کی بیوی حوا پیدا کی، درست نہیں۔

ا۔ یہ آیت تکوین وتخلیق کا بیان نہیں بلکہ یتیموں اور عزیزوں کے حقوق کا مقدمہ ہے۔ مقصد لوگوں کو یہ باور کرانا ہے کہ بنی نوع انسان اپنی اصل کے اعتبار سے ایک ہے تو پھر یہ تقسیم، یہ تفریق، یہ ناانصافی کیا معنی؟

۲۔ اللہ تعالیٰ نے اس نفسِ واحدہ کا معاملہ جس سے سب لوگوں کو پیدا کیا گیا مبہم رکھا ہے اس لیے اسے بطور نکرہ استعمال کیا ہے، پس ہم بھی اِسے مبہم رہنے دیں گے۔ تاکہ اگر مغربی محققین کی یہ بات ثابت ہو جائے کہ بشر کی ہر صنف کا باپ الگ ہے تو یہ اعتراض قرآن کریم پر وارد نہ ہو۔

۳۔ اس بات کا قرینہ کہ نفسِ واحدہ سے مراد آدم نہیں اللہ کا یہ قول ہے: 'فبث منهما رجالا كثيرا و نساء' (ان دونوں سے بہت سے مرد اور عورتیں پھیلا دیں) ہے، چاہیے تو یہ تھا کہ کہا جاتا کہ 'فبث منهما جميع الرجال والنساء'۔ 'ان دونوں سے سب مرد اور عورتیں پھیلا دیں'۔ یہاں رجالا و نساءً نکرہ استعمال ہوا ہے اور کثیرا سے اس کی تاکید کی گئی ہے۔ اس سے کثرت انواع کی طرف اشارہ ہے اور اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ منهما سے مراد آدم اور حوا نہیں بلکہ نر اور مادہ کا جوڑا ہے۔

۴۔ لفظ نفس روح، جنس، ماہیت و جوہر (Essence) اور شخص کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ دیگر تمام معانی میں وہ مؤنث ہے لیکن اگر شخص کے معنوں میں استعمال ہو تو مذکر ہوگا۔ اسی لیے فرّاء جو لغت کے امام ہیں اپنی تفسیر معانی القرآن میں سورۃ نساء کی آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں: 'لو كانت من نفس واحد لكان صوابا يذهب الى تذكير الرجل' اگر یہ نفسِ واحدہ کی بجائے نفسِ واحد ہوتا تو درست ہوتا کیونکہ آدمی مذکر ہوتا ہے۔ لغت کے اس امام نے اس اشکال کا اعتراف کیا ہے۔

۵۔ قرآن کی دیگر تمام آیات میں نفس، جنس کے معنوں میں استعمال کیا گیا ہے اور ان تمام مفسرین نے جنہوں نے نفس واحدہ کا ترجمہ آدم کیا ہے ان آیات میں نفس کا ترجمہ جنس کیا

Marfat.com

ہے۔ کیا 'جعل لکم من انفسکم ازواجا' (الشوری ۴۲:۱۱) کا ترجمہ یہ کیا جائے گا کہ تم میں سے تمھارے جوڑے پیدا کیے؟

۶۔ سورۃ اعراف کی آیت نمبر ۱۸۹، اس بات کی صاف نفی کرتی ہے کہ نفس واحدہ سے مراد آدم علیہ السلام ہے، ارشاد ربانی ہے: 'اللہ ایسا ہے جس نے تم کو نفس واحدہ سے پیدا کیا اور اسی سے اس کا جوڑا بنایا تاکہ وہ اس جوڑے سے سکون حاصل کرے پھر جب اس نے مادہ سے قربت کی تو مادہ کو ہلکا سا حمل ہو گیا سو وہ اسے لیے چلتی پھرتی رہی پھر جب بوجھل ہو گئی تو وہ دونوں اللہ سے جو ان کا رب ہے دعا کرنے لگے کہ اگر آپ نے ہم کو صحیح سالم اولاد دے دی تو ہم خوب شکر گزاری کریں گے۔ پھر جب اللہ نے ان دونوں کو صحیح سالم اولاد دے دی تو اللہ کی دی ہوئی چیز میں وہ دونوں اللہ کا شریک ٹھہرانے لگے۔ سو اللہ ان کے شرک سے پاک ہے'۔

یہ ایک مربوط کلام ہے جس میں یسکن تغشّی کا فاعل مذکر ہے۔ حملت، مرّت، اثقلت کا فاعل مؤنث ہے۔ دعوا اور جعلا کے فاعل وہی دو مذکر اور مؤنث ہیں، اگر نفسِ واحدہ سے مراد آدم اور زوج سے مراد حوا لی جائے تو سب افعال کے فاعل یہ دونوں ہی ہوں گے۔ اس صورت میں دونوں شرک کے مرتکب ہوں گے جو قطعی ناممکن ہے لیکن اگر نفس سے مراد جنس لی جائے تو پھر یہ الزام ان پر وارد نہ ہوگا، یہ کیا بات ہوئی کہ آدم اور حوا کو شرک سے بری کرنے کے لیے جعل کے بعد اولادھما کے مضاف کو محذوف قرار دے کر مضاف الیہ کو اس کا قائم مقام بنا دیا جائے اور اسی طرح فیما آتا ھما میں مراد فیما آتی اولاد ھما لی جائے؟ یہ حیلہ گری نظم قرآن کے منافی ہے۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ ایک مربوط کلام میں کچھ افعال کا فاعل آدم اور حوا کو قرار دیا جائے اور اسی آیت میں کچھ افعال کو ان کی اولاد کی طرف منسوب کرنے کے لیے تاویل باطل سے کام لیا جائے۔ امام رازی نے تفسیر کبیر میں ابن عباس کی روایت نقل کی ہے کہ ابلیس نے حوا سے کہا کہ اپنے بیٹے کا نام عبدالحارث رکھے کیونکہ ملائکہ میں ابلیس کا نام حارث تھا۔ اس روایت کے مطابق جعلا لہ شرکا میں جعلا کے فاعل آدم اور حوا ہیں یعنی وہ دونوں اللہ کا شریک ٹھہرانے لگے۔ العیاذ باللہ۔ امام رازی نے اس تاویل کو فاسد قرار دیا ہے کیونکہ اس آیت میں ابلیس کا ذکر تک نہیں پھر آدم تو سب لوگوں سے بڑھ کر ابلیس کو پہچانتے تھے۔ انھوں نے اپنے بیٹے کا نام

Marfat.com

عبدالحارث کیسے رکھ دیا؟ اُنھوں نے قفال کا قول نقل کیا ہے کہ اللہ نے تمثیلاً اس آیت میں مشرکین کی جہالت کی تصویر کھینچی ہے۔ اللہ نے انسان کی جنس سے اس کا جوڑا انسان پیدا کیا، دونوں میاں بیوی نے لڑکے کے لیے دُعا کی جب لڑکا ہو گیا تو اللہ کا شریک ٹھہرانے لگے کیونکہ وہ کبھی تو نیچریوں کی طرح اسے نیچر کی طرف منسوب کرتے اور کبھی نجومیوں کی طرح اسے ستاروں کی طرف منسوب کرتے اور کبھی بت پرستوں کی طرح بتوں کی طرف۔

۷۔ سورۃ زمر کی مذکورہ آیت بھی اس بات کی تردید کرتی ہے کہ نفس واحدہ سے مراد آدم لی جائے۔ ارشاد ہے: 'اس نے تم کو نفسِ واحدہ سے پیدا کیا پھر اسی سے اس کا جوڑا بنایا'۔ اگر یہاں نفسِ واحدہ سے مراد تن واحد حضرت آدم علیہ السلام کو لیا جائے تو مشکل یہ پیش آتی ہے کہ سب لوگ حوا سے پہلے ہی آدم سے پیدا ہو گئے۔ حالانکہ والدین بچوں سے پہلے موجود ہوتے ہیں۔ یہ بات طے شدہ ہے کہ حوا یا تو آدم کے ساتھ یا ان کے فوراً بعد پیدا ہوئیں۔ حرف "عطف ثم" آیت میں استعمال ہوا ہے جو ترتیب اور مہلت کا متقاضی ہوتا ہے۔ اس لیے یہ ترجمہ کہ اللہ نے پہلے آدم سے تمھیں پیدا کیا پھر اس کے بعد اس کی بیوی کو اس میں سے پیدا کیا قطعی غلط ہوگا۔ صحیح ترجمہ یہ ہے کہ 'اس نے تمھیں ایک جنس سے پیدا کیا پھر اسی جنس سے تمھارا جوڑا بنایا'۔ مفسرین نے اس اشکال کو رفع کرنے کے لیے کبھی آدم کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرا ہے اور کبھی حرف عطف کی تقدیم و تاخیر کی دور راز کار تاویلوں سے کام لیا ہے مگر بات نہیں بن سکی۔ مندرجہ بالا دونوں سورتوں میں جعل منہا زوجہا ہے۔ ایک بات تو یہ ہے کہ جعل، خلق سے مختلف ہے۔ خلق سے مراد مخلوق ایجاد کرنا یا وجود میں لانا ہے جبکہ جعل مخلوق کی خصوصیات کو ظاہر کرتا ہے اور اس کی صفات کو نمایاں کرتا ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ زندگی کا پہلا جرثومہ ایک ساتھ نر اور مادہ تھا۔ یہ تخلیق کا مرحلہ تھا پھر جرثومۂ حیات کو اپنی ذات پر تقسیم کر کے اللہ نے اسے تکاثر کے مرحلے میں ڈال دیا۔ اسے جعل سے تعبیر کیا گیا ہے جب جرثومۂ حیات اپنی ذات پر تقسیم ہوا تو ہر قسم نر اور مادہ کے جرثومہ پر مشتمل ہو گئی اور اسی طرح خلیے اپنی ذات پر تقسیم ہو کر بڑھتے رہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ نر اور مادہ کی علیحدگی بعد کے مرحلے میں جاری رہی جس کا مطلب یہ ہے کہ خلق اور جعل کے درمیان ایک طویل عرصہ ہے۔ یہی وہ راز ہے جس کی وجہ سے ثم کے حرف کے ساتھ عطف ڈالا گیا ہے۔ ثم زمانے کی طوالت اور دوری پر دلالت کرتا ہے۔

Marfat.com

۸۔ خطاب تو ساری نوعِ انسانی سے ہے اس سے مراد ایک ایسا خاص نفس کیسے ہوسکتا ہے جس کا تصور ساری نوعِ انسانی کے ذہن میں نہیں۔ بہت سی اقوام آدم وحوا کو جانتی بھی نہیں بلکہ انھوں نے ان کے بارے میں سنا تک نہیں۔ مثلاً اہل چین بشر کو کسی اور باپ کی طرح منسوب کرتے ہیں اور انھوں نے بشر کی جس تاریخ کو متعین کیا ہے وہ عبرانیوں کی تاریخ سے بہت پہلے کی ہے۔ روح المعانی میں ہے کہ ہمارے باپ آدم سے پہلے تیس آدم اور ہوئے ہیں اور ہر آدم کے درمیان ایک ہزار برس کا فاصلہ ہے۔

سورۃ نساء کی آیت میں انسان کی ابتدا کا ذکر نہیں جو قرآن کے مطابق طین (مٹی گارا) سے شروع ہوئی بلکہ پہلے انسانی جوڑے اور بعد کے جنسی عمل کا ذکر ہے۔ 'انسان کو اس کیچڑ سے پیدا کیا گیا ہے جو بعد میں کھنکتی مٹی کی صورت اختیار کر کے ٹھیکری بن جاتا ہے' (الرحمن ۵۵:۱۴)۔ یہ خدا ہی جانتا ہے کہ گارے کے اجزاء سے سب سے پہلے خلیے (Life cell) کا مواد کس طرح یکجا ہوا جس سے اس کا جوڑا پھوٹ پڑا؟ ارشاد ربانی ہے: 'مَآ اَشْهَدْتُّهُمْ خَلْقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلَا خَلْقَ اَنْفُسِهِمْ' (الکہف ۱۸:۵)۔ 'میں نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کرتے وقت انہیں گواہ نہ بنایا تھا اور نہ خود انہیں پیدا کرتے وقت'۔

ہم یہ نہیں جانتے کہ پہلا انسانی جوڑا کس منفرد عمل تخلیق سے ظہور پذیر ہوا یا سلسلہ ارتقاء سے۔ اگر موخر الذکر کا نظریہ درست ہے تو نفس واحدہ سے مراد 'Protozoa' (ایک بہت ہی چھوٹی سی ایک خلیے والی مخلوق جسے صرف خوردبین سے دیکھا جا سکتا ہے)۔ لغوی طور پر نفس واحدہ سے مراد ماہیت، جوہر اور حقیقت ہے اور علمی طور پر اس سے مراد وہ جرثومۂ حیات ہے جس سے نسل اس طرح بڑھتی ہے جیسے بیج سے خوشہ بنتا ہے اور خوشے سے دانے اور دانوں سے خوشے اسی طرح سلسلہ چلتا رہتا ہے۔ اس خلیے کے اندر فرد خواہ مرد ہو یا عورت کی موروثی خصوصیات (Chromosome & Genes) موجود ہوتی ہیں۔ بنیادی خلیہ دو چار اور اس سے زیادہ خلیوں میں تقسیم ہو جاتا ہے یہاں تک کہ آخر میں انسانی شکل وجود میں آجاتی ہے۔ جنس کی واضح علامتیں ہر نئے خلیہ میں اسی ترکیب سے پائی جاتی ہیں جس ترکیب سے پہلے خلیے میں موجود ہوتی ہیں۔ فرق صرف جنس کے خلیوں میں ہوتا ہے۔ وہ ہارمون (Hormone) جو مرد کی امتیازی خاصیت ہیں کسی حد تک عورت میں بھی پائے جاتے ہیں اور وہ ہارمون جو عورت کی امتیازی خاصیت ہیں کسی حد تک مرد میں بھی پائے جاتے ہیں اور ان کا خروج دونوں سے ہوتا رہتا ہے۔ علم طب نے ثابت کر دیا ہے کہ انسان میں جنسی ازدواجیت ہے۔ اس میں اللہ کی حکمت یہ ہے کہ مرد اور عورت میں سے ہر

Marfat.com

ایک اپنے ہم جنس جوڑے کے ساتھ جڑا رہے تاکہ دونوں کی تکمیل ہوتی رہے اور زندگی کا سفر خوشگواری سے کٹے۔ S. Taylor اپنی کتاب Word of Science میں کہتا ہے:

'A male or woman is male or femine in every cell of his or her body'

نفس واحدہ سے مراد ماہیت اور جوہر ہے یعنی تمہیں ایک جنس اور ایک حقیقت سے پیدا کیا۔ منھا میں جو ضمیر نفس واحدہ کی طرف اشارہ کرتی ہے وہ اس نفس واحدہ کو آدم کی شکل میں انسانی وجود نہیں سمجھتی بلکہ وہ اسے مادہ اور ماہیت سمجھتی ہے جو انسان کی تخلیق کے لیے میسر تھا۔ اسی مادہ سے آدم کی تخلیق ہوئی اور اسی مادہ سے اس کی بیوی حوا کی۔ اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ وہ ماہیت یا حقیقت آدم سے شروع ہوئی جیسا کہ عبرانی سمجھتے ہیں یا آدم کے علاوہ کسی اور سے شروع ہوئی جیسا کہ اہل چین سمجھتے ہیں۔ بہر کیف سب لوگ نفس واحدہ یعنی ایک جنس سے ہیں۔ یہ نفس واحدہ وہ انسانیت ہے جس کی وجہ سے سب لوگ انسان کہلائے۔ سب انسان انسانیت میں ہمارے بھائی ہیں۔ انسانیت ہی وحدت کی بنیاد ہے جو انسانوں کے درمیان محبت والفت کی داعی ہے۔

لوگوں کو یہ یاد دلانے کے بعد کہ وہ نفس واحدہ سے ہیں ان کو یتیموں اور عزیزوں کے حقوق ادا کرنے کے احکام بیان کیے گئے ہیں نفس واحدہ سے مراد جنس ہے۔ اس بات کی تائید وہ مفسرین کرتے ہیں جن کا قول ہے کہ اس قسم کی ہر نداء کے مخاطب قریش یا اہل مکہ ہیں۔ صاحب کشاف نے سورۃ نساء کی تفسیر میں کہا ہے کہ اس کی ایک صورت اور ہے وہ یہ کہ خطاب قریش سے ہو اور مراد یہ ہو کہ تمہیں قصی کے نسب سے پیدا کیا اور اس کے جوڑے کو بھی اسی جنس یعنی قریش سے پیدا کیا۔ یہ قول ضحاک کا ہے یعنی تمہیں قصی کی جنس نے پیدا کیا اور اس کی بیوی کو بھی اسی کی جنس سے یعنی قریش سے پیدا کیا۔ احمد بن محمد بن منیر نے الانتصاف کے نام سے کشاف کا حاشیہ لکھا ہے۔ اس میں وہ کہتا ہے کہ یہی قول صحت سے قریب تر ہے کیونکہ احمد اور مسلم کا قول ہے کہ دونوں تفسیروں میں سے نسبتاً یہ تفسیر درست ہے کہ نفس واحدہ سے مراد نر اور مادہ کی جنس لی جائے۔ اگر یہ بات درست ہے تو نفسِ واحدہ سے مراد قریش یا عدنان لیا جائے گا اور اگر خطاب سب عربوں سے ہے تو یہ سمجھنا روا ہوگا کہ نفس واحدہ سے مراد قحطان ہیں اور اگر یہ خطاب ان سب لوگوں سے ہے جن کو اسلام کی دعوت دی گئی ہے تو بلاشبہ ہر امت اپنے اپنے عقیدے کے مطابق اس کی تعبیر کرے گی جو سمجھتے ہیں کہ تمام بشر آدم کی اولاد ہیں وہ نفس واحدہ سے مراد آدم لیں گے اور جو یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ بشر کی ہر صنف کا باپ علیحدہ ہے وہ اسے اپنے عقیدے پر محمول کریں گے۔ اس صورت میں صرف ایک گروہ کے سوا جو آدم کو ابوالبشر سمجھتا ہے سب لوگ اس سے

Marfat.com

مراد جنس ہی لیں گے۔

دیگر آیات میں لوگوں سے خطاب کرتے ہوئے جو یا بنی آدم (اے بنی آدم) کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں وہ جنس کے مفہوم کے منافی نہیں اور نہ ہی اس بات پر نص قطعی ہیں کہ تمام بشر اسی آدم کی اولاد ہیں کیونکہ بنی آدم کا خطاب ان لوگوں سے ہے جو نزول قرآن کے زمانہ میں موجود تھے۔ خود سورۃ بقرہ میں آدم کے قصہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ زمین پر قرآنی آدم سے پہلے اس جنس کی ایک قسم موجود تھی جو زمین میں فساد مچاتی تھی اور خونریزی کرتی تھی۔ نتیجتاً نفس واحدہ سے لغوی طور پر ماہیت، جوہر اور جنس مراد لیا جائے گا اور علمی طور پر وہ جرثومہ حیات (Life cell) مراد لیا جائے گا جو جوشِ نمو میں دو حصوں (Sister cell) میں تقسیم ہو کر نر اور مادہ بن گیا۔ انسان کی تخلیق کی ابتدا کسی ایک فرد کے ذریعہ نہیں ہوئی تھی بلکہ نفس واحدہ سے ہوئی تھی۔ وحدت خالق سے وحدت مخلوق قرآن کا بنیادی نکتہ ہے۔

خلق منها زوجها

آیت مبارکہ کے اس حصے کے بارے میں امام رازی نے دو قول نقل کیے ہیں ایک تو عام مفسرین کا کہ آدم کے جسم سے اس کا جوڑا پیدا کیا اور دوسرا قول ابو مسلم اصفہانی کا ہے کہ اس کی جنس سے اس کا جوڑ پیدا کیا۔ صاحب البحر المحیط نے ابو مسلم اصفہانی کے ساتھ ابن بحر کا نام بھی اسی قول میں شامل کیا ہے۔ ابو مسلم حرف جار من کو یہاں ابتدا کے معنوں میں سمجھتے ہیں نہ کہ تبعیض کے معنوں میں یعنی وہ من کو جنسی سمجھتے ہیں نہ کہ جزوی۔ ان کے نزدیک اس کے معنی یہ ہے کہ اللہ نے اسے نفس واحدہ کی جنس سے پیدا کیا نہ کہ اس کے جسم سے۔ اس لیے وہ حوا کے آدم کی پسلی سے پیدا ہونے کے مخالف ہیں۔ اپنے نقطۂ نظر کی تائید میں انھوں نے قرآن حکیم ہی سے ٹھوس دلائل پیش کیے ہیں کیونکہ قرآن کی ایک آیت، دوسری آیت کی تفسیر کرتی ہے جیسا کہ سورۃ توبہ میں ارشاد ربانی ہے: 'لقد جاء کم رسول من انفسکم' (۱۲۸:۹) 'تمھارے پاس ایک ایسے پیغمبر آئے ہیں جو تمھاری جنس سے ہیں'۔ سورۃ نحل میں ارشاد ربانی ہے: 'واللہ جعل لکم من انفسکم ازواجا' (۷۲:۱۶) 'اللہ نے تمھاری جنس سے تمھارے جوڑے بنائے۔ سورۃ روم میں ارشاد ہے: 'وَمِنْ آيَاتِهِ أَنْ خَلَقَ لَكُم مِّنْ أَنفُسِكُمْ أَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوا إِلَيْهَا'۔ 'اور اس کی نشانیوں میں سے ہے کہ تمھاری ہی جنس سے تمھاری بیویاں پیدا کیں تاکہ تم ان سے سکون پاؤ' (۲۱:۳۰)۔ سورۃ الشوریٰ میں ارشاد ربانی ہے: 'فَاطِرُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ جَعَلَ لَكُم مِّنْ أَنفُسِكُمْ أَزْوَاجًا وَمِنَ الْأَنْعَامِ أَزْوَاجًا'۔ 'وہ آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنے والا ہے اس نے تمھارے لیے تمھاری جنس کے جوڑے بنا دیے اور چوپایوں کی جنس سے ان

Marfat.com

کے جوڑے بنا دیئے' (۱۱:۴۲)۔ ان تمام آیات میں منھا کی ضمیر نفس کی طرف مڑ رہی ہے اور ہر جگہ ترجمہ اس نفس کی جنس سے کیا جا رہا ہے۔ اللہ کا قول 'خلقکم من نفس واحدۃ' اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ ساری مخلوق نفس واحدہ سے پیدا ہوئی اور اس کا قول 'خلق منھا زوجھا' اس بات پر دلالت کر رہا ہے کہ جوڑا بھی اسی نفس یعنی جنس سے پیدا ہوا۔ ساتھ ہی نہ صرف اس جنس سے پیدا ہونے کی حکمت سکون بتائی گئی بلکہ یہ بتایا گیا کہ جوڑے کا جنس سے پیدا ہونے والا قانون حیوانات میں بھی کارفرما ہے۔ یہ ایک ہی مزاج والا نفس ہے۔ اس کی خاصیتیں بھی ایک ہیں جو اسے تمام مخلوقات سے ممیز کرتی ہیں۔ روئے زمین پر پھیلی مخلوقات کی تمام نسلیں تمام مقامات پر ایک ہی نفس کی مالک ہیں۔ ان کے جوڑے بھی نفس انسانی میں ان کے شریک ہیں۔ انسانی وجود کا بنیادی ڈیزائن ایک ہی ہے۔ یہ خاصیت حیوانات میں بھی پائی جاتی ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ سب جانداروں میں ہم جنس ہونے کا ایک ہی قانون جاری وساری ہے۔ صاحب روح المعانی نے لکھا ہے کہ 'بعض علما نے ابو مسلم اصفہانی کے قول کی تائید اس وجہ سے کی ہے کہ عام مفسرین کے قول کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ آدم اولاد کا نکاح ایک دوسرے سے کر دیتے تھے۔ یہ بڑی ہی قبیح بات ہے۔

خلق منھا زوجھا یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ جرثومہ اولی اور اس کے مادہ کے درمیان جو ملاپ ہوا وہ دونوں کی ہم آہنگی اور اوصاف میں اشتراک کے باعث ہوا، اس لیے کہ اسے اپنے مادہ کی وجہ سے سکون وچین ملے۔ ایک جنس سے جوڑا بنانے میں یہ حکمت ہے کہ اختلاف اور دوئی ختم ہو اور اس کی جگہ محبت اور الفت کی فضا قائم ہو۔ یہ اس اختلاف کی بیماری کا علاج ہے جو جوڑے میں ہجر وفرق کا سبب بنتی ہے۔ بیماری کی تشخیص سے پہلے حق تعالیٰ نے علاج مہیا کر دیا۔ اللہ نے مرد اور عورت کو اپنی نشانیوں میں سے ایک نشانی قرار دے کر ان کی تکمیلی حیثیت کا اعتراف کیا ہے۔

ساری کائنات کے لیے اللہ نے پہلے زوجیت کا بنیادی قاعدہ مقرر کیا ہے 'وَمِنْ كُلِّ شَيْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَيْنِ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ' (الذاریات ۵۱:۴۹) 'اور ہر چیز کو ہم نے جوڑا جوڑا پیدا کیا تاکہ تم نصیحت حاصل کرو'۔ اس بنیادی قاعدے کے بعد اللہ نے نفسِ اولیٰ کا ذکر کر کے بتایا ہے کہ اس نے اسی نفس اولیٰ سے جوڑے کی تخلیق کی۔ علمی طور پر ہر انسان کی تخلیق خواہ مرد ہو یا عورت نفس واحدہ یعنی جرثومۂ حیات سے شروع ہوتی ہے۔ ایک بار آور کیے ہوئے خلیے سے اس کا جوڑا دوسرا خلیہ بنتا ہے۔ پھر دو سے چار اور چار سے آٹھ۔ ان خلیوں سے کسی کو جگر یا دل بنایا۔ کسی سے آنکھ، کسی سے کھال، بال اور کسی سے ناخن بنائے۔ پھر ان سارے خلیوں کی بستی سے ایک وجود (انسان) بنایا اسی طرح اس وجود کا جوڑا یعنی ایک کو لڑکا اور

Marfat.com

دوسرے کو لڑکی بنایا پھر ان دونوں سے بے شمار نر اور مادہ خلیے پھیلا دیئے۔ علامہ رشید رضا نے بعض ہم عصر محققین کے حوالہ سے تفسیر المنار میں نفسِ واحدہ کے بارے میں ایک اور نقطۂ نظر پیش کیا ہے کہ اس سے مراد مادہ ہے اسی لیے یہ جہاں بھی استعمال ہوا ہے مؤنث استعمال ہوا ہے اور وہ جوڑا جو اس سے پیدا کیا گیا مذکر استعمال ہوا ہے جیسا کہ سورۃ اعراف (۱۸۹:۷) میں 'یسکن الیھا' تاکہ وہ پُر امن راہ سے سکون حاصل کرے۔ اسی لیے سورۃ کا آغاز بھی نفس واحدہ سے ہوا ہے اور اس کا نام بھی نساء (عورتیں) رکھا گیا ہے۔ یہ رائے رکھنے والے ریسرچ سکالروں کا قول ہے کہ آج علماء کے نزدیک توالد بکری (Virgin procreation) ایک مسلمہ حقیقت میں سے ہے وہ ایسے کہ بعض حیوانات کی مادہ، نر کے نطفہ کے بغیر بچوں کے کئی جھاڑ نکالتی ہے لیکن اس کے لیے ضروری ہے کہ پہلے اس کے کچھ اصول کی بارآوری ہو چکی ہو اور اس کا زوج بھی اس سے پیدا ہوا ہو اور وہ اس کی ذات اور اس کی جنس سے ہو۔ سید قطب اپنی تفسیر فی ظلال القرآن میں سورۃ اعراف (۱۸۹:۷) کے ضمن میں فرماتے ہیں: 'تکوین کے اعتبار سے عورت نفس واحدہ ہے'۔

حوا کی پیدائش

یہ بات طے شدہ ہے کہ اللہ نے آدم کو مٹی سے پیدا کیا۔ اللہ کا فرمان ہے: 'خلقہ من تراب' (آلِ عمران ۵۹:۳) پھر اللہ نے تمام مخلوق کے بارے میں فرمایا: 'منھا خلقناکم' (الروم ۵۵:۳۰) 'اسی مٹی سے ہم نے تمھیں پیدا کیا'۔ جو مادہ انسان کی تخلیق کے لیے میسر تھا اسی مادہ سے آدم کی تخلیق ہوئی اور اسی مادہ سے اس کی بیوی حوا کی تخلیق ہوئی۔ اللہ نے حوا کو بھی اسی ہیئت میں پیدا کیا جس ہیئت میں آدم مٹی، کیچڑ، بجنے والی مٹی اور سیاہ گارے کے مراحل سے گزر کر پہنچے تھے۔ جب اللہ آدم کو اس ہیئت میں پیدا کرنے پر قادر تھا وہ حوا کو اس میں پیدا کرنے سے کیا معاذ اللہ عاجز تھا کہ ہمیں آدم کی پسلی سے پیدائش کا قصہ گھڑنا پڑا۔ حوا تخلیق آدم کے ارتقائی مراحل میں سے ایک مرحلہ تھی۔ اس مرحلہ میں افزائش نسل کی کارروائی ہوئی وہ جرثومہ حیات کے جوش نمو کی وجہ سے دو حصوں میں تقسیم ہونے کی وجہ سے ہوئی۔ اس کا ایک حصہ نر بن گیا اور دوسرا مادہ۔ یہی وجہ ہے کہ ابو حیان نے البحر المحیط میں ایک قول نقل کیا ہے کہ 'خلق منھا زوجھا' میں مضاف محذوف نہیں۔ (بعض لوگوں نے ضمیر ھا سے پہلے جنس کا مضاف محذوف مانا ہے) بلکہ ضمیر اس طینۃ (مٹی) کی طرف اشارہ کر رہی ہے جس سے آدم کی تخلیق ہوئی یعنی اسی مٹی سے اس کے جوڑے کی تخلیق ہوئی۔

پسلی والا قصہ مرد اور عورت کی تخلیق میں امتیاز کرتا ہے۔ اسے حقیقت میں مرد کی فضیلت ثابت کرنے

Marfat.com

کے لیے گڑھا گیا ہے حالانکہ یہ بات عقل وفہم سے بالاتر ہے۔ وہ آیات مبارکہ جن میں مرد اور عورت کا ذکر ملتا ہے وہ اصل کے اعتبار سے دونوں کی تخلیق میں کوئی امتیاز نہیں کرتیں بلکہ وہ مرد اور عورت کو ایک ہی طبقہ تصور کرتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا قول ہے: 'أَنِّي لَا أُضِيعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنكُم مِّن ذَكَرٍ أَوْ أُنثَىٰ بَعْضُكُم مِّن بَعْضٍ' (آلِ عمران ۳:۱۹۵) 'تم میں سے کسی کام کرنے والے کے کام کو میں ہرگز ضائع نہیں کرتا خواہ وہ مرد ہو یا عورت، تم ایک دوسرے کا جزو ہو اور یہی مفہوم اللہ کے اس قول سے نکلتا ہے: 'فَجَعَلَ مِنْهُ الزَّوْجَيْنِ الذَّكَرَ وَالْأُنثَىٰ' (القیامۃ ۷۵:۳۹)۔ اس آیت میں اس بات کا صاف اشارہ ہے کہ انسان اپنے وجود میں نر اور مادہ کا مزاج رکھتا ہے یعنی وہ مادہ جس سے نر اور مادہ کی تخلیق ہوئی نر اور مادہ دونوں کا مزاج رکھتا ہے۔ اس کے نر میں نر اور مادہ، اور اس کے مادہ میں مادہ اور نر دونوں کا مزاج ہے۔ جدید علوم بھی قرآن کی اس بات کو تسلیم کرتے ہیں۔ ہوسکتا ہے پسلی والی کہانی بیان کرنے والے مفسرین کی نظر اس پہلے خلیے پر پڑ چکی ہو۔ جو امیبا (Ameba) کی شکل میں ہر زندہ وجود میں ہوتا ہے اور اس کے تقسیم ہونے سے تناسل اور تکاثر کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ ان کا یہ خیال ہو کہ آدم اور حوا کی تخلیق ایک ہی جرثومہ حیات سے ہوئی پہلے آدم بنے پھر جرثومہ تقسیم ہو گیا تو آدم و حوا بن گئے۔ اگر بات یہی ہے تو پھر اس کہانی میں کوئی حرج نہیں۔ ہم بھی تو یہی کہہ رہے ہیں کہ آدم ایک طویل سلسلۂ ارتقاء کی پیداوار ہیں۔ یہ امیبا ہی زندگی کا پہلا سلسلہ ہے اس کے اپنی ذات پر تقسیم ہونے سے نسل چلتی ہے۔

ٹیڑھی پسلی سے حوا کی تخلیق اور شیخین کی روایت

بخاری (کتاب بدء الخلق) اور مسلم (کتاب الرضاع) میں ابو ہریرہ سے مرفوعاً روایت ہے۔ 'عورت پسلی سے پیدا کی گئی ہے اور پسلی میں سب سے ٹیڑھا حصہ اس کا بالائی حصہ ہے۔ اگر تو اسے سیدھا کرنا چاہے تو توڑ دے گا اور اگر تو اس سے فائدہ اٹھانا چاہے تو کجی کے ساتھ ہی فائدہ اٹھا سکتا ہے'۔ اس روایت میں حوا کا نام نہیں مگر ابن عباسؓ کا قول ہے کہ حضرت حوا مرد (یعنی آدم) سے پیدا ہوئی یعنی ان کی بائیں پسلی سے۔ حافظ ابن حجر عسقلانی فتح الباری میں اس حدیث کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں: 'کہا گیا ہے کہ اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ حوا، آدم کی بائیں پسلی سے پیدا کی گئی اور ابن اسحاق کی روایت کے مطابق اس پسلی سے جو گردن کے قریب ہے۔ ابن اسحاق نے یہ اضافہ بھی کیا ہے کہ بائیں پسلی میں جنت میں داخل ہونے سے پہلے پسلی کی جگہ کو گوشت سے بھر دیا'۔ اور خُلِقَتْ کے معنی ہیں اُخْرِجَتْ جیسے کھجور گٹھلی سے نکلتی ہے'۔ اور اس پر غور کریں کہ حافظ صاحب نے

Marfat.com

روایت کے بارے میں کہا ہے: 'کہا گیا ہے کہ یہ روایت اس مسئلہ کی طرف اشارہ کرتی ہے، گویا کہ ان کے نزدیک یہ بات یقینی نہیں ورنہ وہ مجہول کے صیغہ کے ساتھ اشارے کا لفظ استعمال نہ کرتے۔ پھر انھوں نے روایت کی تشریح کرتے ہوئے انسان کی تخلیق کو نباتات کی تخلیق کے ساتھ تشبیہ دے کر ساری بات ہی صاف کردی ہے۔ علمی تحقیق بھی تو یہی کہہ رہی ہے کہ جرثومہ حیات سے انسان کی تخلیق بالکل اسی طرح ہوئی جس طرح گٹھلی سے کھجور نکلتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان، حیوان اور نباتات میں سے ہر زندہ وجود کے لیے یہی تدبیر اختیار کی ہے'۔

شیخین کی روایت کے بارے میں ابوحیان نے البحر المحیط میں سورۃ نساء کی آیت کی تفسیر کے ضمن میں کہا ہے کہ 'اس روایت میں تشبیہ و تمثیل کے طور پر عورت کی طبیعت کی کجی کو بیان کیا گیا ہے اس کی فطرت میں ایک اضطراب سا ہے۔ وہ ایک حالت پر قائم نہیں رہ سکتی۔ وہ ٹیڑھی پسلی کی مانند سخت مزاج ہے۔ وہ ایسے ہی ہے جیسا کہ اللہ کا قول ہے: 'خُلِقَ الْإِنسَانُ مِنْ عَجَلٍ' (انبیاء ۲۱: ۳۷)۔۔۔ اگر اس قصے کو تمثیلاً تصور کیا جائے تو اس میں اس کی طرف لطیف اشارہ موجود ہے کہ عورت اور مرد ایک جزو ہیں جو ایک دوسرے کے بغیر نامکمل ہیں۔ یہ ایک طرح کا وعدہ ہے کہ وہ ایک دوسرے سے جدا نہ ہوں گے اور ایک کی سعادت دوسرے سے وابستہ ہوگی۔ چنانچہ الجامع الصغیر میں حضرت ابوہریرہؓ سے جو روایت مروی ہے اس میں ان الفاظ کا اضافہ ہے کسرھا طلاقھا یعنی پسلی کو توڑنے سے مراد اسے طلاق دینا ہے۔ اس روایت سے عورت کو متہم کرنا اور مرد کو بری الذمہ کرنا مراد نہیں، کیونکہ اس طرح توزوجین کی زندگی مکدر ہو جائے گی، بلکہ مقصد یہ ہے کہ مرد کو سمجھایا جائے کہ ازدواجی زندگی میں جو رکاوٹیں آئیں گی ان کے مقابلہ میں صبر و حوصلہ سے کام لیتے ہوئے اسے اپنی زندگی کو ساحل مراد تک لے جانا ہے۔ یہ رکاوٹیں جن کی طرف روایت میں اشارہ کیا گیا ہے مرد کی طرف سے بھی آسکتی ہیں۔

اسی لیے ابومسلم اصفہانی نے ابن عباس کے قول کہ 'حوا، آدم کی بائیں پسلی سے پیدا ہوئیں' کا سختی سے انکار کیا ہے۔ صاحب روح المعانی محمود آلوسی نے سورۃ اعراف کی آیت (۷: ۱۸۹) کی تفسیر بیان کرتے ہوئے کہا کہ 'وجعل منها سے مراد اس کی جنس سے بنایا'۔ مشہور تو یہی ہے کہ 'من تبعیض کے لیے ہے یعنی اس کے جسم سے، آدم کی پسلی سے، یہ کیفیت ہمارے لیے مجہول ہے کیونکہ اللہ تو کسی چیز سے عاجز نہیں۔ میرے نزدیک یہ آیت مشکلات میں سے ہے۔ ہم نے منھا سے مراد اس کی جنس سے کیا ہے اس کی طرف جبائی معتزلی کا کلام بھی اشارہ کرتا ہے اگر روایات سے اس کی عام مخالفت کو نظر انداز کر دیا جائے تو اس کی بات میں کوئی قباحت نہیں'۔

Marfat.com

نفسِ واحدہ سے تخلیق کی حکمت

امام فخر الدین رازی اس آیت کی تفسیر کے ضمن میں فرماتے ہیں: 'نفس واحدہ سے پیدا ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ جو ذات نفسِ واحدہ سے مختلف اشخاص پیدا کر سکتی ہے وہ مرنے کے بعد زندہ بھی کر سکتی ہے۔ پھر نفسِ واحدہ سے تخلیق باہمی فخر و مباہات کے منافی ہے۔ سید قطب شہید سورۃ النساء کی آیت (۱:۴) کی تفسیر میں لکھتے ہیں: 'وحدتِ انسانی کو نفسِ واحدہ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ یہ ایک دوسری حقیقت کی طرف بھی اشارہ ہے کہ انسان اسی نفسِ واحدہ سے پیدا ہوا ہے جس سے اس کے جوڑے کی تخلیق ہوئی۔ اس سے اِن تمام تصورات کی نفی ہوتی ہے جو عورت کے بارے میں قائم کیے گئے تھے مثلاً یہ کہ وہ گندگی اور نجاست کا سرچشمہ ہے، بدی اور شرارت کی جڑ ہے۔ وہ تو فطرت اور طبیعت کے لحاظ سے نفسِ اولیٰ سے ہے جسے اللہ نے اس کے جوڑے کے طور پر پیدا کیا۔ اصل اور فطرت کے اعتبار سے دونوں میں قطعی کوئی فرق نہیں۔ وہ انسان ہے جو انسان کے لیے پیدا کی گئی، ایک نفس ہے جو نفس کے لیے پیدا کی گئی، ایک جزو ہے جو دوسرے جزو کی تکمیل کرتی ہے، وہ دو ملتے جلتے فرد ہیں۔ وہ جوڑے (زوجان) ہیں جو ایک دوسرے کی تکمیل کرتے ہیں'۔

قرآن حکیم میں نر اور مادہ کا انسانی زوج

مرد عورت کا زوج ہے اور عورت مرد کا زوج۔ بیوی کے لیے زوجۃ کا لفظ قرآن نے قطعی استعمال نہیں کیا کیونکہ ازہری، ابن فارس، فیومی، صاحب المصباح المنیر اور ابنِ منظور کے نزدیک زوجہ لغت عالیہ یا فصیح لغت نہیں۔ اہلِ حجاز اسے استعمال نہیں کرتے اور انہی کی لغت میں قرآن نازل ہوا۔ اس کا استعمال چند ایک قبائل میں نہ ہونے کے برابر ہے۔ اسی لیے قرآن میں زوج کی جمع قلت ازواج استعمال ہوئی ہے۔ زوج کا لفظ مذکر بھی ہے اور مونث بھی۔ فقہ اسلامی میں سب سے پہلے فرائض میں زوجۃ کا لفظ استعمال کیا گیا تاکہ مرد اور عورت کے ورثے کا حصہ خلط ملط نہ ہو جائے۔ قرآن حکیم میں زوج بمعنی مرد اور عورت تثنیہ اور جمع دونوں صیغوں کے ساتھ استعمال ہوا ہے۔ سورۃ ھود (۴۰:۸)، سورۃ مومنون (۲۷:۲۳)، سورۃ ذاریات (۴۹:۵۱)، سورۃ نجم (۴۵:۵۳) اور سورۃ قیامۃ (۳۹:۷۵) یعنی پانچ مقامات پر تثنیہ کے صیغے کے ساتھ زوجین استعمال ہوا ہے۔ کہیں تو تاکیداً اس کے بعد اثنین (دو) لگایا گیا ہے اور کہیں الذکر والانثی (مذکر اور مونث) کہہ کر اس کی تفسیر کر دی گئی ہے۔ مراد یہ ہے کہ اس لفظ میں مرد اور عورت دونوں شامل ہیں، جبکہ سورۃ بقرہ (۲۵:۲)، سورۃ آل

Marfat.com

عمران (۳:۱۵)، سورۃ نساء (۴:۵۷)، سورۃ توبہ (۹:۲۴)، سورۃ رعد (۱۳:۲۳)، سورۃ فرقان (۲۵:۷۴)، سورۃ فاطر (۳۵:۱۱)، سورۃ یسین (۳۶:۳۶، ۵۶)، سورۃ غافر (۴۰:۸)، سورۃ شوریٰ (۴۲:۱۱)، سورۃ زخرف (۴۳:۱۲، ۷۰)، سورۃ تغابن (۶۴:۱۴)، سورۃ نباء (۷۸:۱۸) یعنی پندرہ مقامات پر جمع کے صیغے کے ساتھ لفظ ازواج استعمال ہوا ہے، مطلب یہ ہے کہ یہاں سب مرد اور سب عورتیں شامل ہیں۔ ان آیات کے دو گروپ بنتے ہیں ایک گروپ میں وہ آیات ہیں جن میں ازواج کا ذکر جنت کے سلسلہ میں ہے اور دوسرے گروپ میں وہ آیات ہیں جن میں ازواج کا ذکر مطلقاً ہوا ہے۔ پہلا گروپ مزید دو اقسام میں منقسم ہے۔ ایک قسم میں ازواج کے ساتھ مطہرۃ (پاک) کی صفت ہے جیسا کہ آیات نمبر (البقرۃ ۲:۲۵)؛ (آلِ عمران ۳:۱۵) اور (نساء ۴:۵۷) جبکہ دوسری قسم میں مطہرہ کی صفت کے بغیر ازواج کا جنت میں ذکر ملتا ہے جیسے آیات نمبر (الرعد ۱۳:۲۳)، (یٰسین ۳۶:۵۶)، (غافر ۴۰:۸) اور (الزخرف ۴۳:۷۰)۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ پہلے انہی آیات کے بارے میں گفتگو کی جائے۔ سورۃ البقرہ، سورۃ آل عمران اور سورۃ نساء کی آیات کا ترجمہ زیادہ تر پاکیزہ بیویاں (ازواج مطہرۃ) کیا گیا ہے یہ ترجمہ غور طلب ہے۔ اس ترجمہ سے پہلے تین چیزیں توجہ طلب ہیں۔

۱۔ مرد عورت کا زوج ہے اور عورت مرد کی زوج۔ اس کے معنی میاں بیوی بھی ہیں مگر قرآن نے اس لفظ کو ہم مشرب اور ہم خیال ساتھیوں کے لیے سورۃ حجر (۱۵:۸۸)، سورۃ طٰہٰ (۲۰:۱۳۱)، سورۃ صافات (۳۷:۲۲)، سورۃ ص (۳۸:۵۸)، سورۃ واقعہ (۵۶:۷) اور سورۃ التکویر (۸۱:۷) چھ مقامات پر استعمال کیا ہے۔ جنت کا تصور چونکہ مادی تصور نہیں۔ اس لیے یہ کہنا مشکل ہے کہ وہاں حیاتیاتی یا جنسی تمیز اسی طرح رہے گی۔ چنانچہ لفظ ازواج سے ذہن کو جنسی تعلقات کی طرف منتقل نہیں ہونا چاہیے۔ اس لیے یہاں ازواج سے مراد ہم خیال اور ہم مشرب ساتھی ہوں گے جن میں مرد اور عورتیں سب شامل ہیں۔

۲۔ علم بیان کا ایک اسلوب ہے جسے تغلیب کہا جاتا ہے اس کی ایک شکل یہ ہے کہ صیغۂ مذکر کا بولا جائے اور اس میں مؤنث کو بھی شامل سمجھا جائے مثلاً اللہ کے قول اقیموا الصلوٰۃ کا لفظی معنی ہے تم مرد نماز قائم کرو مگر اس حکم میں عورتیں بھی شامل ہیں۔ یہ اسلوب قرآن حکیم میں کثرت سے استعمال ہوا ہے۔ اگر اسے نظر انداز کر دیا جائے تو یوں معلوم ہوگا کہ احکام صرف مردوں کے لیے نازل کیے گئے ہیں عورتوں کے لیے نہیں۔

Marfat.com

۳۔ اگران آیات کا سیاق وسباق دیکھا جائے تو بات بالکل صاف ہوجائے گی کہ ازواج کا ترجمہ بیویاں قطعی نہیں ہیں مثلاً سورۃ بقرہ کی مذکورآیت یوں شروع ہوتی ہے: وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ آمَنُوْا وَعَمِلُوْا الصَّالِحَاتِ اَنَّ لَهُمْ جَنَّاتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ ،'اور ایمان والوں اور نیک عمل کرنے والوں کوخوشخبری دو کہ ان کے لیے ایسی جنتیں ہیں جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہوں گی' (...) وَلَهُمْ فِيْهَا أَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ ،'اور ان کے لیے اس میں پاکیزہ ساتھی ہوں گے'۔ کیا ایماندار اور عمل صالح کرنے والے صرف مرد ہوں گے یا عورتیں بھی ہوں گی؟ اور اگر دونوں ہوں گے تو ازواج کا ترجمہ رفقاء یا ساتھی ہو گا ورنہ یہ ماننا پڑے گا کہ ایماندار اور نیکوکار صرف مرد ہوں گے اور وہی جنت میں داخل ہوں گے، وہاں اللہ ان کو پاک وصاف بیویاں دے کر خوش کر دے گا۔ جنت کا ساتھ روحانی ساتھ ہوگا۔ لفظ زوج سے جنس کا جو تصور ابھرتا ہے لفظ مطھّرۃ کی صفت کا اضافہ کر کے اس کی مطلقاً نفی کر دی گئی ہے۔ یہ ساتھ روح کا پاکیزہ ساتھ ہوگا اور اس کا اطلاق دنیا کے مردوں اور عورتوں دونوں پر ہوگا۔ سورۃ آل عمران کی آیت کا آغاز یوں ہوتا ہے: لِلَّذِيْنَ اتَّقَوْا عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنَّاتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِيْنَ فِيْهَا وَأَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ ،'جنہوں نے تقویٰ کیا ان کے لیے ان کے رب کے پاس جنتیں ہیں جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہیں جن میں وہ ہمیشہ رہیں گے اور پاکیزہ ساتھی'۔ اگر ہم یہاں ترجمہ پاکیزہ بیویاں کریں تو لازم آئے گا کہ تقویٰ والے صرف مرد ہیں۔ اگر اس اسلوب تغلیب میں عورتوں کو بھی شامل کر لیں تو پھر پاکیزہ بیویوں والا ترجمہ غلط ہو جائے گا۔

سورۃ نساء کی آیت یوں شروع ہوتی ہے: وَالَّذِيْنَ آمَنُوْا وَعَمِلُوْا الصَّالِحَاتِ سَنُدْخِلُهُمْ جَنَّاتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِيْنَ فِيْهَا أَبَدًا لَهُمْ فِيْهَا أَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ ۔'جو ایمان لائے اور انھوں نے عمل صالح کیے۔ ہم عنقریب انہیں ان جنتوں میں داخل کریں گے جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہوں گی جن میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ ان کے لیے صاف ستھرے ساتھی ہوں گے'۔ اگر والّذین کا اطلاق عورتوں پر بھی ہوتا ہے تو ضمیر لھم میں لھن بھی شامل ہوگا اور صحیح ترجمہ صاف ستھرے ساتھی ہوگا نہ کہ بیویاں۔ جنت میں دونوں کا رشتہ میاں بیوی سے بڑھ کر رفاقت کا ہوگا۔ یہ دونوں ایک دوسرے کے زوج ہوں گے۔ سورۃ فجر میں ارشاد ربانی ہے: اے نفس مطمئنہ! تو اپنے رب کی طرف لوٹ اس طرح کہ تو اس سے راضی وہ تجھ سے خوش۔ پس میرے خاص بندوں میں داخل ہو جا اور میری جنت

Marfat.com

میں داخل ہو جا۔ (۸۹: ۲۷ تا ۳۰)۔ ان آیات مبارکہ میں اللہ نفس مطمئنہ سے مخاطب ہے جو مرد کا بھی ہو سکتا ہے اور عورت کا بھی۔ اس کے خاص بندوں سے مراد بھی مرد اور عورت دونوں ہیں۔ چنانچہ اللہ تعالٰی دونوں کو اجتماعی طور پر جنت میں داخل ہونے کا حکم صادر کر رہا ہے جہاں اللہ کے بندے مل جل کر رہیں گے اور ہمیشہ ایک دوسرے کے زوج (ساتھی) ہوں گے۔ یہی وجہ ہے کہ محمود آلوسی نے سورۃ یٰسین کی آیت (۳۶: ۵۶) میں ازواج کے بارے میں فرمایا: 'جائز ہے کہ یہاں ازواج سے مراد ان جیسے ہوں جیسا کہ اللہ کا قول ہے: 'وَآخَرُ مِنْ شَكْلِهِ أَزْوَاجٌ' (ص ۳۸: ۵۸)؛ 'اور کچھ اور اسی شکل کی ان سے ملتی جلتی چیزیں' اور قریب قریب یہی مراد اس قول سے ہے: 'احْشُرُوا الَّذِينَ ظَلَمُوا وَأَزْوَاجَهُمْ' (الصافات ۳۷: ۲۲)؛ 'ظالموں کو اور ان کے ہمراہیوں کو اور جن کی اللہ کے سوا وہ پرستش کرتے تھے، ان سب کو جمع کر کے انہیں دوزخ دکھا دو'۔ اس آیہ مبارکہ میں صاف طور پر ازواج کے معنی ساتھی اور ہمراہی کے ہیں۔ مولانا امین احسن اصلاحی نے سورۃ زخرف کی آیت (۴۳: ۷۰) میں ازواج کا ترجمہ یوں کیا ہے۔ جنت میں داخل ہو جاؤ اور تم اور تمہارے ہم عقیدہ۔ اسی آیت کا ترجمہ عبدالکریم الخطیب نے التفسیر القرآنی میں یوں کیا ہے: 'تمہیں مسرت اور خوشی ملے گی اپنے ان ساتھیوں کے ساتھ جن کے ساتھ تمہیں ایمان کی دولت ملی'۔

ہمارے مفسرین نے سارا زور مذکورہ آیات کی تفسیر میں ازواج کو بیویاں ثابت کرنے پر لگایا ہے۔ مطہرۃ سے مراد انھوں نے یہ لی ہے کہ وہ بیویاں حیض و نفاس اور منی کی جسمانی آلائشوں سے پاک ہوں گی اور ساتھ ہی معنوی عیوب مثلاً خباثت اور مکر و فریب سے پاک ہوں گی۔ دوسری جس بات پر انھوں نے اپنا زور قلم صرف کیا ہے وہ یہ ہے کہ وہ بیوی ایک ہوگی، دو ہونگی یا اس سے زیادہ پھر وہ بیوی کون ہوگی؟ دنیا میں ان کی اپنی مومن بیوی یا دنیا میں بن بیاہی عورت جس کی شادی اللہ جس سے چاہے گا جنت میں کرے گا یا دنیا میں کافر کی مومن بیوی۔ یہ بیویاں جوان ہوں گی یہاں تک کہ دنیا میں بڑھاپے کے باعث جس بیوی کی آنکھوں سے کیچڑ بہہ رہا ہوگا وہ بھی جوان ہو جائے گی۔ مفسرین کرام کا نقطہ نظر یہ ہے کہ جنسی لذت کے بغیر جنت میں بھی بیوی کا تصور نہیں کیا جا سکتا، کیونکہ عورت صرف جسم ہے دماغ نہیں، اس لذت کے بغیر ان کا ساتھ ممکن ہی نہیں۔ اس سلسلہ میں عورت کے بارے میں مفسرین کی سوچ کا ایک نمونہ پیش کرنے کی جسارت کر رہا ہوں وہ کوئی چھوٹے موٹے مفسر نہیں بلکہ بلند پایہ مفسر اور فلسفی امام رازی ہیں۔ وہ سورۃ روم کی آیت (۳۰: ۲۱) کی تفسیر میں رقمطراز ہیں: 'خلق لکم' (تمہارے لیے پیدا کیا) اس بات کی دلیل ہے کہ عورتوں کو جانوروں اور نباتات کی فائدہ مند چیزوں کی طرح پیدا

Marfat.com

کیا گیا ہے جیسا کہ اللہ نے فرمایا 'خلق لکم ما فی الأرض جمیعا' (روئے زمین کی ساری کی ساری چیزوں کو تمہاری خاطر پیدا کیا) یہ چیز اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ یہ مخلوق نہ عبادت کے لیے ہوا ورنہ اس کو احکام کا مکلف بنایا جائے۔ ہم کہتے ہیں کہ عورتوں کی تخلیق ہمارے لیے نعمت ہے۔ ان کا ہماری خاطر پیدا کرنا اور ان کو احکام کا مکلف بنانا صرف اس لیے ہے تا کہ یہ نعمت ہمارے لیے مکمل ہو جائے نہ کہ اس لیے کہ ان کو بھی ہماری مانند احکام کا مکلف کیا جائے۔ ہم یہ بات نقل، حکم اور معنی کے اعتبار سے کر رہے ہیں۔ نقلاً تو خلق لکم اور اس جیسی دوسری آیات ہیں۔ حکماً عورت کو مرد کی مانند زیادہ احکام کا مکلف نہیں کیا گیا۔ معناً عورت کی جسمانی ساخت کمزور اور عقل ناقص ہے پس وہ بچے سے مشابہت رکھتی ہے لیکن بچہ غیر مکلف ہے، مناسب تو یہی تھا کہ عورت بھی غیر مکلف ہوتی، لیکن ہم پر اللہ کی نعمت اس وقت تک مکمل نہیں ہو سکتی تھی جب تک ان کو مکلف نہ کیا جاتا تا کہ ان میں سے ہر کوئی عذاب الٰہی سے ڈرتی رہے اور اپنے شوہر کی فرمانبردار رہے اور حرام باتوں سے رکی رہے، اگر ایسا نہ ہوتا تو فساد برپا ہو جاتا۔"

ان خیالات کا اظہار امام صاحب نے اس آیت کے ضمن میں کیا ہے جو مرد اور عورت کے ہم جنس ہونے کو علت سکون قرار دیتی ہے اور جوان دونوں کے درمیان باہمی پیار و محبت اور تعاون و تقابل کا تقاضا کرتی ہے۔ امام رازی کے ان خیالات سے ظاہر ہوتا ہے کہ مرد فرشتہ سیرت آسمان سے نازل شدہ مخلوق ہے۔ دنیا کی ہر چیز بشمول عورت اس کی خدمت کرنے اور متقی بن کر اللہ کے یہاں باعزت ہونے کے لیے پیدا کی گئی ہے بلکہ اول تو اس کے ضعف اور کم عقلی کی وجہ سے اللہ کو انہیں تکلیف دینی نہیں چاہیے تھی جیسا کہ بچے کو تکلیف نہیں دی گئی۔ ان کو تو تکلیف محض اس لیے دی گئی ہے کہ وہ اپنے شوہر کی فرمانبردار رہیں نہ کہ اپنے خالق کی، اس کا کام بس مرد کو خوش کرنا ہو۔ امام صاحب نے تو عورت کو انسانوں کی صف سے نکال کر ڈھور ڈنگروں کی صف میں شامل کر دیا ہے اور بات یہاں پر ختم کی ہے کہ اگر وہ مرد کو خوش نہ رکھے گی تو دنیا میں اودھم مچ جائے گا۔ گویا کہ دنیا میں فساد کا سبب عورت ہے نہ کہ مرد، کیونکہ وہ تو آسمانی مخلوق ہیں۔ جن مفسرین کرام کا عورت کے بارے میں یہ ذہن ہو وہ کیسے تصور کر سکتے ہیں کہ یہ دنیا ہو یا وہ دنیا، عورت بیوی بنے بغیر مرد کے ساتھ رہ سکتی ہے؟ خواہ جنتی معاشرہ ہو، بیوی بنے بغیر مردوں کا ساتھ نبھانے کا ان کے یہاں کوئی تصور نہیں۔

حالانکہ جنت کی رفاقت تناسل و تکاثر سے پاک اعلیٰ درجہ کی ہوگی اور اس کی حکمت بھی بلند و بالا ہوگی۔ تناسل و تکاثر پر بقائے نوع کا دار و مدار ہے۔ اس کا اطلاق جنت کے ساتھیوں پر ہو ہی نہیں سکتا

Marfat.com

کیونکہ وہ تو ہمیشہ ہمیشہ جنت میں رہیں گے اور اولاد سے بے نیاز ہوں گے۔

چنانچہ اگر اسلوب تغلیب کو پیش نظر رکھا جائے، سیاق و سباق کو دیکھا جائے اور جنتی معاشرہ کا تصور کیا جائے تو ازواج مطھرۃ سے مراد پاک اور صاف مرد اور عورت ساتھی ہو گا نہ کہ پاکیزہ بیویاں۔

جن آیات مبارکہ میں مطھرۃ کی صفت نہیں مگر تعلق ان کا بھی جنت سے ہے۔ ان میں بھی اگر سیاقِ آیت اور اسلوب تغلیب کو مدنظر رکھا جائے تو ازواج کا ترجمہ بیویاں غلط معلوم ہوتا ہے۔ سورۃ رعد کی آیت (۲۴:۱۳) 'جَنّٰتُ عَدْنٍ یَّدْخُلُوْنَهَا وَمَنْ صَلَحَ مِنْ اٰبَآئِهِمْ وَاَزْوَاجِهِمْ وَذُرِّیّٰتِهِمْ'، 'ہمیشہ رہنے والے باغات جہاں یہ خود جائیں گے اور ان کے باپ داداؤں اور ساتھیوں اور اولادوں میں سے بھی جو نیکوکار ہوں گے'۔ پچھلی آیات میں ان صاحبان عقل کا ذکر ہے 'جو اللہ کے عہد و پیمان کو پورا کرتے ہیں، قول و قرار کو توڑتے نہیں اور اللہ نے جن چیزوں کو جوڑنے کا حکم دیا ہے وہ اسے جوڑتے ہیں، وہ اپنے رب سے ڈرتے ہیں اور حساب کی سختی کا اندیشہ رکھتے ہیں، وہ اپنے رب کی رضامندی کے لیے صبر کرتے ہیں، نمازوں کو قائم کرتے ہیں اور جو کچھ ہم نے انہیں دے رکھا ہے اسے کھلے چھپے خرچ کرتے ہیں اور برائی کو بھی بھلائی سے دور کرتے ہیں۔ انہی کے لیے عاقبت کا گھر ہے'۔ اس بات سے کون انکار کرسکتا ہے کہ ان سب صفات میں عورت اور مرد برابر کے شریک ہیں اور جنت کی خوشخبری دونوں کے لیے ہے اور دونوں کے لیے ہمیشہ رہنے والے باغات ہیں۔ جہاں یہ سب مرد اور عورتیں اور ان سب مرد اور عورتوں کے باپ دادا، ساتھیوں اور اولادوں سے بھی جو نیکوکار ہوں گے، داخل ہوں گے۔ اگر پچھلی صفات میں مرد اور عورت سب شریک ہیں اور حرف مَـــــن میں بھی دونوں شامل ہیں تو اسلوب تغلیب کے مطابق لھم میں لھن اور آباؤھم و ازواجھم میں آباؤ ھن وازواجھن شامل سمجھے جائیں گے تو ترجمہ یوں ہوگا اور ان مردوں یا عورتوں کے باپ دادا، بیویاں یا شوہر (ساتھی) اور ان کی اولاد میں سے بھی، جو نیکوکار ہوں گے، داخل ہوں گے صرف بیویاں غلط ترجمہ ہوگا۔ یہی حال سورۃ یٰسین کی آیت (۵۶:۳۶) کا ہے ارشاد ربانی ہے: 'هُمْ وَاَزْوَاجُهُمْ فِیْ ظِلٰلٍ عَلَی الْاَرَآئِكِ مُتَّكِـُٔوْنَ' (وہ اور ان کے ساتھی سایوں میں مزین تختوں پر تکیہ لگائے بیٹھے ہوں گے)۔ اس سے پہلی آیت میں ہے کہ 'اہل جنت آج کے دن اپنے مشغلوں میں خوش باش ہوں گے'۔ یہ مسلمہ حقیقت ہے کہ اہل جنت میں مرد اور عورتیں سب شامل ہیں۔ تو ترجمہ یوں ہوگا 'وہ مرد اور عورتیں اور ان کے ساتھی (بیویاں اور شوہر) سایوں میں تخت پر ٹیک لگائے بیٹھے ہوں گے یعنی لھم (ان مردوں کے لیے) میں لھن (ان عورتوں کے لیے) خود بخود شامل ہوگا ورنہ ماننا پڑے گا کہ جنت میں صرف مرد داخل ہوں گے۔

Marfat.com

اس لیے علامہ عبداللہ یوسف علی نے ترجمہ یوں کیا: 'They and their Associates' 'یعنی وہ اوران کے رفقاء' اس طرح سورۃ مومن کی آیت (۴۰:۸) بالکل مذکورہ سورۃ رعد کی آیت سے ملتی جلتی ہے۔ سورۃ زخرف کی آیت (۴۳:۷۰) میں ارشادِ ربانی ہے: 'اُدْخُلُوا الْجَنَّةَ أَنتُمْ وَأَزْوَاجُكُمْ تُحْبَرُونَ'، 'تم اور تمھارے ساتھی راضی خوش جنت میں داخل ہو جاؤ'۔ اس سے پہلے آیت میں ہے 'جو ہماری آیات پر ایمان لائے اور تھے بھی وہ مسلمان'۔ ظاہر ہے ان میں مرد اور عورت سب داخل ہیں اس لیے أزواج کا ترجمہ 'ساتھی' درست ہوگا۔ اسی لیے مولانا امین احسن اصلاحی نے اس کا ترجمہ یوں کیا ہے: 'جنت میں داخل ہو جاؤ تم اور تمھارے ہم عقیدہ'۔

رہی وہ آیات مبارکہ جن میں أزواج مطلقاً استعمال ہوا ہے ان کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ وہاں بھی اس کے معنی ساتھی درست ہیں نہ کہ بیویاں، ہاں اگر قرینہ موجود ہو تو بات اور ہے۔ سورۃ توبہ کی آیت (۹:۲۴) سے پہلی آیت میں اہلِ ایمان کو مخاطب کر کے فرمایا ہے کہ 'تم اپنے باپوں اور بھائیوں کو دوست نہ بناؤ اگر وہ کفر کو ایمان سے زیادہ عزیز سمجھیں'۔ اس کے بعد زیرِ نظر آیت میں ارشاد ہے: 'آپ کہہ دیجیے کہ اگر تمھارے باپ اور تمھارے لڑکے اور تمھارے بھائی اور تمھارے ساتھی یعنی جوڑے (...) اگر یہ سب تمھیں اللہ اور اس کے رسول سے زیادہ پسند ہیں'۔ اہل ایمان میں مرد اور عورتیں سب شامل ہیں اس لیے یہاں أزواج کے معنی ساتھی درست ہوگا۔ آیت کے آخر میں ہے کہ اللہ فاسق قوم کو ہدایت نہیں دیتا۔ ظاہر ہے قوم میں عورتیں اور مرد شامل ہیں۔ بیویاں ترجمہ کرنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ خطاب صرف مردوں کے لیے ہے عورتیں اس میں شامل نہیں۔ سورۃ فرقان کی آیت نمبر (۲۵:۷۴) میں ارشاد ربانی ہے: 'وَالَّذِينَ يَقُولُونَ رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ أَزْوَاجِنَا وَذُرِّيَّاتِنَا قُرَّةَ أَعْيُنٍ'، 'اور جو دعا کرتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار تو ہمیں اپنے ساتھیوں اور اولاد سے آنکھوں کی ٹھنڈک عطا کر'۔ کیا یہ دعا صرف مرد کرتے ہیں یا عورت بھی کر سکتی ہے اگر عورت دعا کرے گی تو کیا کہے گی؟ تو ظاہر ہے کہ أزواج کے معنی بیویاں نہیں لیا جائے گا۔ لفظ ساتھی مرد اور عورت دونوں کے لیے مناسب رہے گا۔ روح المعانی نے اس آیہ مبارکہ کے تحت لکھا ہے کہ 'روایت ہے کہ آغاز اسلام میں باپ ہدایت یافتہ ہوتا تو بیٹا کافر، خاوند ہدایت یافتہ ہوتا تو بیوی کافر، بیوی ہدایت یافتہ ہوتی تو خاوند کافر تو ہدایت یافتہ کی زندگی خوشگوار نہ گزرتی تو وہ دعا کرتا کہ جنت میں زندگی خوشگوار ہو' ظاہر ہے کہ دعا کرنے والا مرد بھی ہوتا اور عورت بھی۔ سورۃ فاطر کی آیت (۳۵:۱۱) ہمارے موقف کی صاف تائید کر رہی ہے کیونکہ اس میں ثم جعلکم ازواجا کا ہر کسی نے ترجمہ یہ کیا ہے 'پھر تمھیں جوڑے جوڑے یعنی مرد اور عورت بنا

Marfat.com

دیا۔ القرآن یفسر بعضہ بعضا۔ قرآن کی ایک آیت دوسری کی تفسیر کر دیتی ہے اسی طرح سورۃ یٰسین کی آیت (۳۶:۳۶)، سورۃ شوریٰ کی آیت (۱۱:۴۲)، سورۃ زخرف کی آیت (۱۲:۴۳) اور سورۃ نبا کی آیت (۸:۷۸) میں ازواجا کا ترجمہ جوڑا جوڑا (ساتھی) کیا گیا ہے اور یہ سب آیات ہمارے ترجمہ کی تائید کرتی ہیں۔

اب صرف سورۃ تغابن (۱۴:۶۴) کی آیت رہ گئی ہے اس آیہ مبارکہ میں ازواج کے غلط ترجمہ کی وجہ سے عورت کی وفا پر داغ لگایا گیا ہے، ارشاد ربانی ہے: 'یَا أَیُّهَا الَّذِیْنَ آمَنُوا إِنَّ مِنْ أَزْوَاجِکُمْ وَأَوْلَادِکُمْ عَدُوًّا لَّکُمْ فَاحْذَرُوهُمْ' اس کا ترجمہ یوں کیا جاتا ہے۔ 'اے ایمان والو! تمہاری بعض بیویاں اور بعض بچے تمہارے دشمن ہیں پس ان سے بچو (ہوشیار رہو)'۔ ظاہر ہے کہ ازواج کا ترجمہ بیویاں کرنے سے عورت کے خلاف قرآن کی ایک نص ہاتھ آجاتی ہے۔ اس لیے اسی ترجمہ میں عافیت سمجھی گئی ہے۔ امام طبری نے اس سلسلہ میں روایت نقل کی ہے اگر کوئی آدمی مکہ سے مدینہ ہجرت کرنے کا ارادہ کرتا تو اس کے بیوی بچے اسے روکتے اور اس کی ہمت توڑتے۔ سورۃ تغابن مکی سورۃ ہے اس لیے ہجرت سے روکنے والی روایت غیر مستند ہے۔ کاش امام طبری وہ روایات بھی بیان کر دیتے جن میں بیویاں اسلام کی خاطر اپنا گھر بار چھوڑ کر مدینہ کی طرف ہجرت کر گئیں۔ اب آتے ہیں ترجمہ کی طرف، خطاب سب اہل ایمان سے ہے جس میں مرد بھی شامل ہیں اور عورتیں بھی۔ چنانچہ ازواج کا ترجمہ جوڑے اور ساتھی کیا جائے گا اور صحیح ترجمہ یہ ہوگا: 'اے اہل ایمان! تمہارے بعض 'جوڑے یا ساتھی' اور تمہاری اولاد (لڑکوں اور لڑکیوں سمیت) تمہارے دشمن ہیں ان سے ہوشیار رہنا' صاحب روح المعانی اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ 'ہم نے بہت سی بیویوں کو دیکھا ہے جنھوں نے اپنا خاوند قتل کر دیا، جنھوں نے کچھ کھلا کر اس کی عقل ماؤف کر دی اور جنھوں نے اس کی عزت کو لٹا دیا اور کیا کیا نہ کیا؟ کاش وہ اس بات کو ذہن میں رکھتے کہ جس طرح بیوی میاں کی دشمن ہو سکتی ہے بعینہٖ اسی طرح میاں بھی اس کا دشمن ہو سکتا ہے۔ یہ جو آئے دن چولہے پھٹتے ہیں۔ پٹرول پھینک کر جلایا جاتا ہے یا تیزاب پھینک کر مسخ کیا جاتا ہے، کس لیے؟ محض اس لیے کہ میاں دوسری شادی کرنا چاہتا ہے۔ کیا یہ دشمنی نہیں؟ ہمارے یہاں ذاتی انتقام کے لیے جو بے گناہ عورتوں کو بھینٹ چڑھایا جاتا ہے کیا یہ دوستی ہے؟ انسانی فطرت کے مطابق جس طرح دوستی کا اظہار مرد اور عورت دونوں کی طرف سے ہوتا ہے اسی طرح دشمنی کا اظہار بھی دونوں جانب سے ہوتا ہے۔ قرآن مجید کے ترجمہ کی تحریف کر کے محض مرد کی جنسی فضیلت کو ثابت کرنا قرین قیاس نہیں۔

Marfat.com

زوج یا ازواج بیوی کے معنوں میں

قرآن حکیم کی مندرجہ ذیل آیات میں زوج اور اس کی جمع ازواج صرف بیویوں کے معنی میں استعمال ہوا ہے اور ان میں سے ہر آیت میں قرینہ موجود ہے کہ اس کے معنی بیوی ہی کے ہیں:

سورۃ بقرۃ (۲:۳۵،۱۰۲)، النساء (۴:۲۰)، الانعام (۶:۱۳۹)، الاعراف (۷:۱۹،۱۸۹)، النحل (۱۶:۷۲)، طٰہٰ (۲۰:۱۱۷)، الشعراء (۲۶:۱۶۶)، الروم (۳۰:۲۱) اور الاحزاب (۳۳:۴، ۶، ۲۸، ۳۷، ۵۰، ۵۲، ۵۹) یعنی اٹھارہ مقامات پر لفظ زوج اور اس کی جمع بیوی کے معنوں میں وارد ہوا ہے اور ہر آیت میں اس معنی کا قرینہ بھی موجود ہے۔ میں نے دو مقامات یعنی سورۃ نساء (۴:۱) اور سورۃ زمر (۳۹:۶) کو اس فہرست سے خارج کیا ہے کیونکہ ان آیات میں ایسا کوئی قرینہ نہیں جس سے پتہ چلے کہ یہاں زوج کے معنی بیوی ہیں۔ یہاں نفس واحدہ سے مراد چونکہ جرثومہ حیات ہے اس لیے زوج جوڑے کے معنوں میں ہے! البتہ علمی طور پر یہ دلیل دی جاسکتی ہے کہ ان کے ہم معنی دو آیات یعنی الاعراف (۷:۱۸۹) اور الروم (۳۰:۲۱) میں چونکہ قرینہ موجود ہے اس لیے مذکورہ روایات میں بھی بیوی کے معنی لیے جاسکتے ہیں۔

زوج خاوند کے معنوں میں

قرآن حکیم میں صرف ایک مقام پر یعنی سورۃ البقرۃ (۲:۲۳۰) میں زوج خاوند کے معنوں میں استعمال ہوا ہے وہ بھی اس طرح کہ وہاں بیوی فاعل ہے اور میاں مفعول۔ ارشادِ ربانی ہے: "فَإِن طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهُ مِن بَعْدُ حَتَّىٰ تَنكِحَ زَوْجًا غَيْرَهُ"۔ "اگر وہ اسے طلاق دیدے (یعنی تیسری طلاق) تو اب وہ اس کے لیے حلال نہیں جب تک کہ وہ بیوی اس کے سوا دوسرے سے نکاح نہ کرلے"۔ حیرت کی بات ہے کہ بیوی کے لیے زوجۃ کی بجائے زوج قرآنِ حکیم میں قرینہ کے ساتھ اٹھارہ مقام پر استعمال ہوا ہے اور خاوند کے لیے صرف ایک بار۔ اس کے باوجود لفظ زوج کو خاوند کے لیے مخصوص کردیا گیا ہے محض اس لیے کہ یہ قرآنی لفظ اپنے اندر ساتھی اور ہمراہی کا مفہوم سمیٹے ہوئے ہیں۔

زوج ہم خیال ساتھی کے معنوں میں

قربان جائیے کلامِ الٰہی کے جس نے لفظ زوج کو ہم خیال ساتھی کے معنوں میں استعمال کرکے یک رنگ اور ہم آہنگ ساتھی کے مفہوم کو دوام بخش دیا ہے ملاحظہ فرمائیے درج ذیل آیات کو:

Marfat.com

سورۃ حجر (۱۵: ۸۸) اور سورۃ طہٰ (۲۰: ۱۳۱) کے الفاظ بالکل ایک جیسے ہیں۔ ارشاد ربانی ہے: 'لَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ إِلَىٰ مَا مَتَّعْنَا بِهِ أَزْوَاجًا مِّنْهُمْ '۔ آپ ہرگز اپنی نظر اس چیز کی طرف نہ دوڑائیں جس سے ہم نے ان جیسے یا ان کے طبقہ کے لوگوں کو بہرہ مند کر رکھا ہے'۔ امام طبری نے حسن اور مجاہد کے حوالہ سے بتایا ہے کہ یہاں ازواج کے معنی ہم شکل، مماثل اور شبیہ کے ہیں۔ اس کی اصل مزاوجۃ ہے جس کا مطلب ہے کہ دو چیزوں کو ایک دوسرے سے قریب کرنا۔ اس سے مشابہت اور موافقت کے معنی نکلتے ہیں کیونکہ کافر صحیح راہ سے ہٹنے میں ایک دوسرے کے مشابہ تھے اس لیے ان کو ازواج کہا گیا۔ ابن عباس کا قول ہے کہ ازواج سے مراد نعمتوں میں ایک جیسے ہیں۔ مولانا امین احسن کا قول ہے کہ ازواج (ملتے جلتے) طبقات کے معنوں میں بھی آتا ہے، جیسا کہ اللہ کا قول ہے 'کنتم ازواجا ثلاثۃ'۔ سورۃ صافات میں ارشاد ربانی ہے: 'احْشُرُوا الَّذِينَ ظَلَمُوا وَأَزْوَاجَهُمْ وَمَا كَانُوا يَعْبُدُونَ' (۳۷: ۲۲)، 'ظالموں کو اور ان کے ساتھیوں کو اور جن کی وہ اللہ کے علاوہ عبادت کرتے تھے جمع کرو اور انہیں جہنم کی راہ دکھاؤ'۔ امام طبری نے ازواج کے معنی ان کے مماثل ان کی نظیر اور انجیسے ظالم کیے ہیں اور ابن زید کا قول نقل کیا ہے کہ 'ازواج سے مراد اعمال کے جوڑے ہیں جن میں اللہ نے ان کو باندھ دیا ہے'۔ امام رازی نے تفسیر کبیر میں ذرا تفصیل سے بات کی ہے فرماتے ہیں: 'مراد ان کے شبیہ، ان کے ہم جماعت اور کفر میں ان کے ہم مثال ہیں۔ یہود کے ساتھ یہودی اور نصرانی کے ساتھ نصرانی'۔ ازواج سے مشابہت رکھنے والا امراد لینے پر جو باتیں دلالت کرتی ہیں وہ درج ذیل ہیں:

۱۔ اللہ کا قول کنتم ازواجا ثلاثۃ یعنی ہم شکل اور شبیہ۔

۲۔ عربی کا محاورہ ہے: عندی من ھذا ازواج یعنی میرے پاس اس کا ہم مثال ہے اور محاورہ ہے زوجا الخف (موزوں کا جوڑا) کیونکہ جوڑے کا ہر فرد بالکل دوسرے جیسا ہوتا ہے اور اسی طرح عورت اور مرد کو زوجان کہا گیا ہے کیونکہ وہ اکثر احکام نکاح میں ایک دوسرے سے مشابہت رکھتے ہیں۔ زوج عدد کو اس لیے زوج کہا جاتا ہے کیونکہ ہر عدد دوسرے کی مثال ہوتا ہے

۳۔ ازواج سے مراد ان کے شیطان ساتھی ہو سکتے ہیں کیونکہ اللہ کا قول ہے: 'وَإِخْوَانُهُمْ يَمُدُّونَهُمْ فِي الْغَيِّ ثُمَّ لَا يُقْصِرُونَ' یعنی 'ان کے بھائی بند گمراہی میں بڑھتے چلے جا رہے ہیں اور کوئی کوتاہی نہیں کرتے' (الأعراف ۷: ۲۰۲)۔

روح المعانی میں اس آیت کی تفسیر میں لکھا ہے۔ حضرت عمرؓ بن الخطاب کا قول ہے ازواجھم سے

Marfat.com

مراد ان کے ہم مثال ہیں یعنی زانی زانیوں کے ساتھ اور شرابی شرابیوں کے ساتھ اٹھائے جائیں گے۔ ابن عباس کا قول ہے کہ ان کے نظیر اور شبیہ۔ زوج کے اصل معنی ساتھی کے ہیں جیسے زوجا نعل یعنی جوتے کا جوڑا۔ اس کا اطلاق دوسرے لازمی فرد پر ہوتا ہے جو ہم مثال ہوتا ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے اس کا ترجمہ یوں کیا ہے: "گھیر لاؤ سب ظالموں اور ان کے ساتھیوں کو"۔

سورۃ ص (۳۸:۵۷تا۵۸) میں ارشاد ربانی ہے: "هَذَا فَلْيَذُوقُوهُ حَمِيمٌ وَغَسَّاقٌ ο وَآخَرُ مِن شَكْلِهِ أَزْوَاجٌ" "یہ ہے پس اسے چکھیں گرم پانی اور پیپ اور کچھ اور اسی شکل کے ملتے جلتے عذاب"۔ امام طبری نے لکھا ہے کہ احتمال یہ ہے کہ اس آیت میں لفظ ازواج حمیم، غساق اور آخر من شکلہ کی خبر ہو۔ مراد یہ ہوگی یہ تین چیزیں ازواج ایک جیسے جوڑوں کی شکل میں بھیجی جائیں گی۔ صاحب کشاف کا قول ہے کہ ازواج سے مراد اجناس ہے اور ازواج آخر کی صفت ہے یعنی گرم پانی، پیپ اور اس کی ہم جنس کوئی اور چیز یا یہ تینوں یعنی حمیم، غساق اور آخر من شکلہ کی صفت ہے یعنی "شدت قباحت میں ان جیسی"۔

تفسیر مراغی میں اس کو زیادہ واضح کر دیا گیا ہے۔ اس میں یہ ہے کہ اس جیسا شدید عذاب جیسے زقوم، صعود اور سموم۔

سورۃ واقعہ (۵۶:۷) میں اس لفظ کو زیادہ وضاحت کے ساتھ استعمال کیا گیا ہے ارشاد ربانی ہے: "وَكُنتُمْ أَزْوَاجًا ثَلَاثَةً" "تم تین (مماثل) طبقات بن جاؤ گے"۔ امام طبری نے قتادہ کا قول نقل کیا ہے کہ قیامت کے دن لوگوں کے تین مرتبے ہوں گے دائیں ہاتھ والے، بائیں ہاتھ والے اور سابقون جو یا تو مرتبہ وار مقام اول پر ہوں گے جیسے انبیاء کرام یا وہ لوگ جنہوں نے ایمان لانے میں پہل کی۔ صاحب روح المعانی نے اس آیت کی تفسیر میں لکھا ہے: "ہر صنف جو وجود میں یا ذکر میں دوسری صنف کے ساتھ ہو زوج کہلاتی ہے"۔

راغب کا قول ہے کہ حیوانات کے جوڑوں میں نر اور مادہ ساتھیوں کا ہر فرد زوج کہلاتا ہے۔ اس کے علاوہ دو ساتھیوں میں سے ایک کو (جیسے جوتوں کا جوڑا) زوج کہتے ہیں، ہر ساتھی جو دوسرے کے ساتھ جڑا ہو خواہ مماثل ہو (جانداروں میں) یا مقابل (جمادات اور عالم معانی میں) کو زوج کہا جاتا ہے سورۃ تکویر میں ارشاد ربانی ہے: "وَإِذَا النُّفُوسُ زُوِّجَتْ" (۸۱:۷) "جب نفوس کو ان کے ہم شکلوں سے ملا دیا جائے گا"۔ تزویج سے مراد کسی چیز کو اس جیسی چیز سے ملانا اور جوڑنا ہے۔

فراء کا قول ہے کہ میں نے بعض عربوں کو کہتے سنا ہے کہ زوّجتُ ابلی، یعنی میں نے ایک اونٹ کو

Marfat.com

دوسرے اونٹ سے ملایا یا باندھ دیا تا کہ وہ اکٹھے چارہ کھائیں اور اکٹھے سفر کریں۔

امام طبری نے اس آیت کی تفسیر میں حسن، مجاہد اور قتادہ کا قول نقل کیا ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ ہر انسان کو اس کے ہم مثال گروہ سے ملا دیا جائے گا یعنی مومن مومن سے، یہود یہود سے اور نصاریٰ نصاریٰ سے۔ اس صورت میں اس کے معنی وہی ہوں گے جو اوپر اللہ کے قول كُنْتُمْ أَزْوَاجاً ثَلاثَةً' کے گزر چکے ہیں۔

جبکہ عکرمہ اور شعبی کا کہنا ہے کہ ارواح کو لوٹا کر ان کے اجسام سے ملا دیا جائے گا بہر کیف دونوں اقوال میں تزویج میں ایک جیسی چیزوں کو آپس میں ملانے کا مفہوم موجود ہے۔ اس آیت کا مفہوم كُنْتُمْ أَزْوَاجاً ثَلاثَةً' سے وسیع تر ہے۔ وہاں عام تقسیم ہے جبکہ اس آیت میں تقسیم کا دائرہ وسیع تر ہے اس دنیا میں نیکی بدی سے ملی ہوئی ہے۔ علم جہالت سے اور طاقت غرور سے مگر آخرت کی حقیقی دنیا میں تمام صحیح اقدار کو لوٹا دیا جائے گا۔ ایک جیسی چیزیں ہمراہی بن جائیں گی کیونکہ اس دنیا میں مکمل امن، ہم آہنگی اور انصاف ہوگا۔

مندرجہ بالا آیات کے مطالعہ سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ قرآن کریم کے مطابق ازواج ان دو چیزوں کو کہا جاتا ہے جو ہم شکل، ہم رنگ، ہم آہنگ اور ہم فکر ہوں۔ قول اول کی دلیل حق تعالیٰ کا قول ہے: 'ثمانیة ازواج' (الأنعام ۶:۱۴۳) آٹھ زوج (نر اور مادہ) اس کے بعد اس کی تفسیر یہ کی گئی ہے کہ بھیڑ کے نر اور مادہ کا جوڑا اور بکری کے نر اور مادہ کا جوڑا۔ زوجین کا اطلاق ہم جنس نر اور مادہ پر ہوا ہے اور انہی معنوں میں عربوں کا محاورہ ہے۔ زوجا خُفّ (موزوں کا جوڑا) اور زوجا حمام (کبوتروں کا جوڑا) اس میں کوئی شک نہیں کہ اللہ نے کفار اور مومنوں کے درمیان مشابہت اور موافقت کو کاٹ دیا ہے اور دنیوی احکام میں بھی ان کے درمیان ملاپ کو ختم کر دیا ہے۔ نہ وہ ایک دوسرے سے نکاح کر سکتے ہیں اور نہ ایک دوسرے کے وارث بن سکتے ہیں اور نہ ان میں سے کوئی ایک دوسرے کا سرپرست بن سکتا ہے، جس طرح معناً ان کے درمیان تعلقات منقطع ہیں اسی طرح لفظاً بھی منقطع ہیں۔ ان کی بیوی کے لیے امراۃ کا لفظ استعمال ہوا ہے جو محض نسوانیت کا مفہوم ادا کرتا ہے اور لفظ زوج جس سے مشاکلت اور مشابہت کا مفہوم نکلتا ہے ان کے لیے استعمال نہیں ہوا۔ ان معانی پر غور کریں تو یہ قرآنی الفاظ و معانی کے عین مطابق ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کافر کی مسلمان بیوی اور مومن کی کافر بیوی پر لفظ امراۃ (عورت) کا اطلاق ہوا ہے نہ کہ زوج (بیوی) کا۔

ذرا آیت میراث میں ان معانی پر غور کریں۔ حق تعالیٰ نے باہمی ورثہ کو لفظ زوج سے وابستہ کیا ہے

Marfat.com

جیسا کہ اللہ کا قول ہے: "وَلَكُمْ نِصْفُ مَا تَرَكَ أَزْوَاجُكُمْ" (النساء ۴:۱۲) اور تمھارے لیے اس حصہ کا نصف ہے جو تمہاری ازواج (بیویاں) چھوڑ جائیں (بشرطیکہ ان کی اولاد نہ ہو)'۔ یہ اعلان ہے اس بات کا کہ ورثے کا استحقاق محض زوجیت کی وجہ سے ہے جو مشابہت اور موافقت کا تقاضا کرتی ہے چونکہ مومن اور کافر کے درمیان نہ کوئی مشابہت ہے نہ کوئی نسبت، اس لیے مناسب نہیں کہ ان کے درمیان ورثہ تقسیم ہو۔

زوجین کا باہمی رشتہ

اللہ نے انسان کو پیدا کیا اور اس کی فطرت میں زوجیت رکھ دی۔ یہ اللہ کی حکمت ہے کہ اس نے ایک ہی جنس کے دو اجزاء کو اس طور پر پیدا کیا کہ دونوں میں نفسیاتی، ذہنی اور جسمانی ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔ ان کی نفسیاتی، اعصابی اور عضوی ساخت میں اسی بات کو پیش نظر رکھا گیا ہے کہ دونوں میں سے ہر ایک دوسرے کی خواہشات پر لبیک کہے۔ عورت اسی جنس سے ہے جس جنس سے مرد ہے اور دونوں ایک دوسرے کا جزو ہیں۔ اس بات کو سیدہ عائشہؓ کی روایت میں یوں بیان کیا گیا ہے: 'إنما النساء من شقائق الرجال'، 'عورتیں تو بس مردوں کا آدھا حصہ ہیں'۔ اس روایت کو امام احمد، ابوداؤد اور ترمذی نے روایت کیا ہے۔ قرآنی فکر کے مطابق اللہ نے نفس واحدہ کے دو حصے کر کے انسان کو زوجین بنادیا۔ پھر اللہ کو یہ منظور ہوا کہ ان کا باہمی ملاپ ہو کیونکہ ان کے باہمی ملاپ میں انسانی زندگی کا بیج ہے۔ تمام ادیان میں سے صرف اسلام نے فطرتی خواہشات کا صاف صاف اعتراف کیا ہے۔

اللہ کا ارشاد ہے: 'زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوَاتِ مِنَ النِّسَاءِ' (۳:۱۴) 'لوگوں میں شہوتوں مثلاً عورتوں وغیرہ کی محبت فطرتی طور پر مزین کی گئی ہے'۔ اس آیت میں روئے زمین کی تمام خواہشات کو ایک ساتھ جمع کر دیا گیا ہے اور اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ ان کا میلان لوگوں کی فطرت میں موجود ہے۔ یہ قابل اعتراض بات نہیں۔ یہ تصور کہ فطرتی خواہشات نجس ہیں ایک شیطانی تصور ہے۔ اسی تصور کے تحت عورت کو نجس اور تمام فساد کی جڑ سمجھا جاتا ہے۔ اسے عورت پر مرد کی فضیلتؐ کے لیے بطور دلیل پیش کیا جاتا ہے۔ قرآنی نقطۂ نگاہ کے مطابق زندگی کی تکمیل ان شہوتوں کے بغیر ممکن نہیں لیکن قرآن روح اور شعور کو مہذب بناتا ہے اور جانوروں کی طرح لذتوں میں غرق ہونے کی اجازت نہیں دیتا۔ وہ اس میلان کو ازدواجی رشتوں میں محفوظ کرتا ہے۔ اسی اصول کو نبی کریم ﷺ نے مسلم کی روایت کے مطابق ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے: 'إن الرجال يثاب على عمل الجنس ياتيه مع زوجه قالوا: يا رسول الله ايأتي احدنا شهوته ويكون له فيها اجر؟ قال ارأيتم لو وضعها في حرام كان

Marfat.com

علیہ فیھا وزر فکذالك اذا وضعھا فی حلال کان له أجر' 'ایک آدمی جب اپنی بیوی سے جنسی ملاپ کرتا ہے تو اسے ثواب ملتا ہے۔ صحابہ کرامؓ نے پوچھا: اے اللہ کے رسول ہم میں سے کوئی اپنی شہوت پوری کرے تو کیا اس کو اس کا اجر ملے گا؟ آپؐ نے فرمایا: دیکھو اگر وہ اپنا عضو حرام جگہ پر ڈالتا تو کیا اس کا وبال اس پر نہ پڑتا؟ چنانچہ اگر اس نے اپنا عضو حلال جگہ میں ڈالا ہے تو اس کا اجر بھی اسے ملے گا'۔

پھر اللہ کو منظور ہوا کہ زوجین کا باہمی ملاپ جسم وروح کی تسکین کا باعث ہو اور ایک دوسرے کے لیے ستر کا کام دے اور اِن کی ایک دوسرے کے بغیر تکمیل نہ ہو سکے۔ اگر ان دو چیزوں میں معمولی سی بھی عدم مطابقت ہوگی تو ان کو زوج نہیں کہا جائے گا۔ تزویج کے معنی قرآنی مفہوم کے مطابق ایک جیسی دو چیزوں کو آپس میں ملانا یا جوڑنا ہے۔

قرآن حکیم کے مطابق میاں بیوی کا زوج ہے اور بیوی میاں کی۔ لفظ زوج کے اندر جو وسیع مفہوم موجود ہے وہ میاں بیوی میں بدرجہ اتم ہونا چاہیے کیونکہ اللہ کی کتاب میں اس بات پر خاص زور دیا گیا ہے کہ میاں بیوی کو ایک دوسرے کا ہم خیال اور یک رنگ ساتھی ہونا چاہیے۔ وہ ہم جنس ہیں اس لیے ان کے درمیان پیار و محبت اور رحمت کا باہمی رشتہ ہونا ازبس ضروری ہے ورنہ وہ زوجان کی تعریف سے خارج ہو جائیں گے۔ زوجیت کا رشتہ حاکم ومحکوم اور افضل اور مفضول کے تصور کے کلیۃً منافی ہے۔

جنت کا تصور چونکہ مادی تصور نہیں اس لیے وہاں جنسی تقاضوں کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ وہاں مرد اور عورت ہم رنگ، پاک وصاف ساتھیوں اور رفقا کی صورت میں اللہ کی نعمتوں سے لطف اندوز ہوں گے۔

لفظ زوج حافظ امام ابن قیمؒ کی نظر میں

مطالعہ کے دوران میری نظر اس موضوع کے بارے میں امام ابن قیم کی رائے پر پڑی جو اس موضوع پر حرفِ آخر ہے۔ امام صاحب کی یہ عبارت جلاء الافھام (۱۵۰۔۱۵۲) اور تفسیر القیم (صفحہ ۱۲۹) میں موجود ہے۔ وہ فرماتے ہیں: 'ازواج، زوج کی جمع ہے۔ عورت مرد کی زوج ہے اور وہ عورت کا۔ یہی زیادہ فصیح زبان ہے اور یہی قریش کی زبان ہے جس میں قرآن نازل ہوا۔ کچھ عرب لفظ زوجۃ بھی استعمال کرتے ہیں مگر یہ نادر ہے اور نہ کہنے کے برابر ہے۔ حق تعالیٰ نے زکریا علیہ السلام کے بارے میں فرمایا: 'وَأَصْلَحْنَا لَهُ زَوْجَهُ' (انبیاء۲۱: ۹۰)، 'اور ہم نے اس کے لیے اس کی بیوی کو سازگار بنادیا'۔ (اس کے بعد انھوں نے ابن عباس کا قول اور فرزدق کا شعر نقل کیا ہے جس میں زوجۃ کا لفظ استعمال ہوا ہے) اور لکھا ہے کہ کبھی کبھی ازوجۃ کی جمع زوجات بھی آتی ہے ورنہ زوج کی جمع ازواج ہے۔ اللہ کا

Marfat.com

قول ہے: 'هُمْ وَأَزْوَاجُهُمْ' وہ اوران کے جوڑے (یسین ۳۶: ۵۶) اور اللہ کا قول ہے: 'أَنْتُمْ وَأَزْوَاجُكُمْ تُحْبَرُونَ' (الزخرف ۴۳: ۷۰)، 'تم اور تمھارے جوڑے راضی خوشی جنت میں چلے جاؤ'۔ اور قرآن میں اہلِ ایمان کے بارے میں بتانے کے لیے فقط زوج واحد اور جمع دونوں طرح استعمال ہوا ہے۔ اللہ کا قول ہے: 'وَأَزْوَاجُهُ أُمَّهَاتُهُمْ' (الأحزاب ۳۳: ۶)، 'اور اس کی بیویاں ان کی مائیں ہیں اور' قُلْ لِأَزْوَاجِكَ ' (الأحزاب ۳۳: ۵۹) 'اپنی بیویوں کو کہہ دیجیے' اور اہل شرک کے بارے میں خبر دینے کے لیے امراۃ (عورت) کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ جیسے کہ اللہ کا قول ہے: 'وَامْرَأَتُهُ حَمَّالَةَ الْحَطَبِ' (المسد ۱۱۱: ۴)، 'اور اس کی عورت (بیوی) لکڑیاں ڈھونے والی' اور اللہ کا قول ہے: 'اِمْرَأَةُ فِرْعَوْنَ' (التحریم ۶۶: ۱۰)، 'فرعون کی عورت (بیوی)' بلاشبہ وہ مشرک تھا اور یہ مومن اس لیے اسے زوج نہیں کہا گیا اور اللہ کا قول اِمْرَأَةَ نُوحٍ وَامْرَأَةَ لُوطٍ (التحریم ۶۶: ۱۱)، 'نوح اور لوط کی عورت (بیوی)' چونکہ وہ دونوں مشرک ہیں اس لیے ان کے لیے امراۃ کا لفظ استعمال کیا گیا اور آدمؑ کے بارے میں کہا گیا: 'انت وزوجك' "تو اور تمہاری بیوی" اور نبی کریم ﷺ کے بارے میں کہا گیا: 'إِنَّا أَحْلَلْنَا لَكَ أَزْوَاجَكَ' (الأحزاب ۳۳: ۵۰)، 'ہم نے تیرے لیے تیری بیویاں حلال کر دی ہیں'۔ پھر سہیلی نے حضرت زکریا کا قول 'وَكَانَتِ امْرَأَتِي عَاقِرًا' (مریم ۱۹: ۵)، 'میری عورت (بیوی) بانجھ ہے' اور حضرت ابراہیمؑ کا قول 'فَأَقْبَلَتِ امْرَأَتُهُ فِي صَرَّةٍ' (الذاریات ۵۱: ۲۹) 'پس ان کی عورت (بیوی) شور مچاتی ہوئی آگے بڑھی'۔ نقل کر کے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ ان مقامات پر امرأته کا لفظ اس لیے مناسب ہے کہ سیاق میں بچے کے حمل اور ولادت کا ذکر ہے اور یہ لفظ نسوانیت کی صنف حمل اور ولادت کی حیثیت سے ہے نہ کہ زوجیت کی حیثیت سے۔ میرا قول ہے کہ اگر یوں کہا جاتا کہ مومنوں اور ان کی عورتوں کا ذکر 'ازواج' کے لفظ سے کرنے میں یہ راز مضمر ہے کہ یہ لفظ مشابہت مجانست اور آپس میں پیوست ہونے کا احساس دلاتا ہے تو یہ بہت بہتر ہوتا کیونکہ زوجان دو مشابہ اور ہم شکل چیزوں کو کہا جاتا ہے اور انہی معنوں میں حق تعالیٰ کا قول ہے: 'احْشُرُوا الَّذِينَ ظَلَمُوا وَأَزْوَاجَهُمْ' (الصافات ۳۷: ۲۲)۔ حضرت عمر بن الخطاب کا قول ہے کہ أَزْوَاجَهُمْ سے مراد مشابہت رکھنے والے نظراء ہیں، امام احمد کا قول بھی یہی ہے اور انہی معنوں میں اللہ کا قول ہے: 'وَإِذَا النُّفُوسُ زُوِّجَتْ' (التکویر ۸۱: ۷)، '(ہم شکل) جب نفوس آپس میں ملا دیے جائیں گے' یعنی کہ یہ ہم شکل کو ثواب اور عذاب میں ایک دوسرے کے ساتھ ملا دیا جائے گا۔ حضرت عمرؓ بن الخطاب کا قول ہے کہ جنت میں صالح کے ساتھ صالح اور جہنم میں فاجر کے ساتھ فاجر ہوگا اور یہی قول حسن، قتادہ اور اکثر لوگوں کا ہے۔

Marfat.com

ایسا خاندانی نظام نفسِ واحدہ کے دونوں حصوں کو امن، چین اور تحفظ فراہم کرنے کا ذمہ دار ہے۔ اصل اور انجام کے لحاظ سے دونوں حصوں میں وحدت کامل ہے۔ جن حقوق کا تعلق انسانی وجود سے ہے وہ اسی نقطۂ نظر کا حتمی نتیجہ ہیں۔ جان، مال اور عزت کی حرمت اور احترامِ انسانیت یہ سب مشترکہ حقوق ہیں۔ مرد اور عورت کے درمیان ان حقوق میں کوئی تمیز نہیں، شریعت کے اوامر ونواہی، ملکیت وتصرف اور مستقل شخصیت میں دونوں برابر ہیں۔

انسان کے احترام میں عورت کا احترام پوشیدہ ہے۔ مرد عورت کے بغیر ناقص ہے اور عورت مرد کے بغیر۔ دونوں ایک دوسرے کی تکمیل کرتے ہیں مرد کو عورت کی ضرورت ہے اور عورت کو مرد کی، یہ ضرورت صرف جسمانی حدود تک محدود نہیں ہوتی۔ اس زندگی کی کیا اہمیت ہے جس میں مرد عورت کے جسم میں تو شریک ہو مگر اس کے جذبات واحساسات آفاق میں گھوم رہے ہوں۔ یہ دھوکا اور فریب کی زندگی ہے لوگوں کی سعادت کا راز جسمانی راحت میں نہیں بلکہ دلوں کے سکون میں ہے۔ دونوں کو ایک دوسرے کے پہلو میں الفت، محبت اور ہمدردی کا احساس ہوتا ہے۔ یہ احساسات، جذبات وقتی خوشی اور خارجی جذبے پر قائم نہیں رہ سکتے۔ انہیں امن اور قرار کی فضا مطلوب ہوتی ہے نہ کہ حاکمیت اور محکومیت کی فضا۔ نفس واحدہ کے دونوں حصوں کو اس بات کی ضرورت ہے کہ وہ جذباتی اور فکری طور پر ایک کو دوسرے کے سپرد کر دیں اس کے سامنے سب اسرار کھول کر رکھ دیں، اس کے ساتھ ہمدردی کریں اور مل جل کر زندگی کے حقائق کا سامنا کریں۔ دو محبت کرنے والے دلوں کے سامنے دنیا کے دروازے کھل جاتے ہیں۔ صرف ایک دل کے سامنے جو محبت سے عاری ہو کھلے ہوئے دروازے بھی بند ہو جاتے ہیں۔ جذباتی ٹھہراؤ عورت اور مرد کی نفسیاتی ضرورت ہے۔ جسمانی لذت اس سے بے نیاز نہیں ہو سکتی۔ یہ ٹھہراؤ، گھر اور خاندان ہی میں صورت پذیر ہوتا ہے جب تک مرد عورت سے مطمئن نہ ہو اور عورت مرد سے ذہنی اور جسمانی طور پر مطمئن نہ ہو اور جب تک ہر مرد بیوی کو اپنے جسم کی مانند اپنی روح، اپنے جذبات اور احساسات سپرد نہ کر دے وہ زوجیت کی سعادت سے بہرہ ور نہیں ہو سکتا۔ ہر تجربہ، ہر معاملہ بلکہ ہر بول اپنے ساتھی کے دل پر گہرا اثر چھوڑتا ہے اور شعور میں چھپے ہوئے یہ آثار انسان کی زندگی کا رخ موڑ دیتے ہیں اور اسے پتہ بھی نہیں چلتا۔ اس حقیقت کی طرف قرآن کی یہ آیت اشارہ کرتی ہے: ﴿وَقُل لِّعِبَادِي يَقُولُوا الَّتِي هِيَ أَحْسَنُ إِنَّ الشَّيْطَانَ يَنزَغُ بَيْنَهُمْ إِنَّ الشَّيْطَانَ كَانَ لِلْإِنسَانِ عَدُوًّا مُّبِينًا﴾ (بنی اسرائیل ۱۷:۵۳)، زوجین کے منہ سے نکلا ہوا درشت کلمہ اور اس کا ویسا ہی جواب محبت کی فضا کو مکدر کر کے نفرت پیدا کرتا ہے۔ میٹھا بول دلوں کے زخم پر مرہم رکھتا ہے۔ شیطان زبان کی لغزشوں

Marfat.com

کا منتظر رہتا ہے اسی سے وہ فتنہ وفساد کے بیج بوتا ہے۔ میٹھا بول اس رخنے کو بند کر دیتا ہے۔

دونوں ہم جنس ایک دوسرے کی تکمیل کرتے ہیں۔ ہر ایک اپنی جگہ اہم ہے۔ مرد اور عورت دونوں (Functioning unit) ہیں دونوں میں مزاج کا اختلاف باہم مربوط ہو کر ایک نئے وجود (New Entity) کو جنم دیتا ہے۔ یہ تکامل اس وقت تک صورت پذیر نہیں ہوتا جب تک مرد اور عورت میں اپنے اختلافات کو قبول کرنے اور ان سے فائدہ اٹھانے کا سچا جذبہ موجود نہ ہو۔ یہ تکامل بنا بنایا نہیں ملتا اسے بنانا پڑتا ہے۔

عورت کمتر جنس نہیں کہ جس کی پیدائش کی خبر سن کر انسان رنجیدہ ہو جائے اور منہ چھپاتا پھرے۔ ہم جنس کو کمتر سمجھنا حماقت ہے۔ مرد اور عورت میں کسی ایک کی فضیلت کا اندازہ اس طرح لگایا جاتا ہے کہ وہ سوسائٹی میں کیا کردار ادا کر رہا ہے۔ روایتی خاصیتوں کی وجہ سے یہ اندازہ نہیں لگایا جا سکتا مثلاً ایک ہی نوعیت کے کام میں مرد اور عورت کی فضیلت کا اندازہ ان کی کارکردگی سے کیا جائے گا نہ کہ ان کی صنف سے۔ اس بات کو حق تعالیٰ نے سورۃ حجرات کی آیت (۱۳:۴۹) میں ایک اصول کی شکل میں بیان کر دیا ہے۔ ارشاد ہے: ﴿إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِندَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ﴾، 'اللہ کے نزدیک تم سب میں سے بہتر باعزت وہ ہے جو سب سے زیادہ تقویٰ والا ہے'۔

قرآن حکیم میں لفظ زوج کا بطور فعل استعمال

قرآن حکیم میں لفظ زوج ماضی اور مضارع کے صیغہ کے ساتھ سورۃ احزاب (۳۷:۳۳)، سورۃ شوریٰ (۵۰:۴۲)، سورۃ دخان (۵۴:۴۴)، سورۃ طور (۲۰:۵۲) اور سورۃ تکویر (۷:۸۱) یعنی پانچ مقامات پر ہوا ہے۔ زوج سے باب تفعیل زَوَّجَ ہے۔ تزویج کے بنیادی معنی ایک کو دوسرے سے ملانے کے ہیں۔ یہ ملانا ساتھی کی شکل میں بھی ہو سکتا ہے۔ جیسا کہ سورۃ شوریٰ (۵۰:۴۲) اور سورۃ تکویر (۷:۸۱) میں ہے اور میاں بیوی کی شکل میں جیسا کہ سورۃ احزاب (۳۷:۳۳) میں ہے۔ سورۃ شوریٰ میں ارشاد ربانی ہے: ﴿أَوْ يُزَوِّجُهُمْ ذُكْرَانًا وَإِنَاثًا﴾، 'یا انہیں جمع کر دیتا ہے بیٹے بھی اور بیٹیاں بھی' اور سورۃ تکویر میں ارشاد ہے: ﴿وَإِذَا النُّفُوسُ زُوِّجَتْ﴾، 'اور جب نفوس کو اکٹھا کر دیا جائے گا یا ملا دیا جائے گا'۔ جبکہ سورۃ احزاب میں ہے: ﴿زَوَّجْنَاكَهَا﴾، 'اور ہم نے اسے یعنی زینب کو تیری بیوی بنا دیا'۔ یہاں تک تو بات واضح ہے۔ قرآن حکیم نے دو مقامات پر یہ فعل حوروں کے ساتھ استعمال کیا ہے جیسا کہ سورۃ دخان اور سورۃ طور میں ہے: ﴿وَزَوَّجْنَاهُم بِحُورٍ

Marfat.com

عِیْـــنٍ "اور ہم نے ان کو گوری گوری، موٹی موٹی آنکھوں والی حوروں کا ساتھی بنا دیا"۔ ان آیات کا ترجمہ یوں بھی کیا گیا ہے: 'اور ہم نے ان کا نکاح گوری گوری، موٹی موٹی آنکھوں والی حوروں سے کر دیا'۔ دیکھنا یہ ہے کہ ان دونوں میں سے کونسا ترجمہ زیادہ صحیح ہے۔ اس مسئلہ کا تجزیہ مفسرین نے لغوی اور گرامر کے قواعد کے لحاظ سے کیا ہے۔ امام رازی تفسیر کبیر میں سورۃ دخان کی آیت کے ضمن میں کہتے ہیں: 'ابو عبیدہ کا قول ہے ہم نے ان کو ملا کر جوڑا بنایا جیسا کہ جوتے کے ایک پاؤں کو دوسرے پاؤں سے ملا کر جوڑا بناتے ہیں'۔ یونس کا قول ہے کہ اس کا مطلب ہے کہ ہم نے ان کو حوروں سے ملا کر ساتھی بنا دیا مگر شادی بیاہ کے طریقے سے نہیں کیونکہ عرب محاورہ میں شادی کے لیے تزوجت تو کہتے ہیں مگر تزوجت بھا نہیں کہتے۔ اور واحدیؒ کا قول ہے کہ قرآن یونس کے قول کی تائید کرتا ہے۔ اللہ فرماتا ہے: 'زوجنا کھا' اور ہم نے تم کو اس سے یعنی زینبؓ سے بیاہ دیا اور اگر تزوجت بھا درست ہوتا تو کہا جاتا زوجنا ک بھا۔ کہنے والا کہتا ہے زوجت بہ جس کا مطلب ہوتا ہے کہ وہ فرد تھا دوسرے سے ملا کر اسے جوڑا یعنی ساتھی بنا دیا جیسا کہ کہا جاتا ہے شفعتہ بآخر میں نے اسے دوسرے کے ساتھ ملا کر جفت کر دیا۔ ازہری کا قول ہے کہ عرب کہتے ہیں: 'زوّجتہ امراۃ' (میں نے اس سے عورت بیاہ دی) تزوّجتُ امراۃ (میں نے عورت سے شادی کر لی) وہ یہ نہیں کہتے کہ تزوجتُ بامراۃ یعنی زوجت کو دو مفعولوں کی ضرورت ہے اور تزوجت کو ایک مفعول کی۔

صاحب روح المعانی کے قول کے مطابق باء اس آیت میں تضمین فعل کے لیے ہے اس کے معنی قران اور الصاق (ملانے) کے ہیں یا یہ باسببیہ ہے یعنی حوروں کی وجہ سے ان کو جوڑا جوڑا کر دیا نہ کہ شادی کر دی۔

امام طبری نے سورۃ طور کی آیت کی تفسیر میں لکھا ہے: 'ہم ان تمام متقی مردوں کو گوری گوری موٹی موٹی آنکھوں والی حوروں سے ملا دیں گے' کہنے والا کہتا ہے: 'زوّج ھذا الخف الفرد اوالنعل الفرد بھذا الفرد' یعنی اس نے موزے یا جوتے کے ایک پاؤں کو دوسرے سے ملا دیا یعنی اسے اس کا جوڑا بنا دیا۔

صاحب کشاف نے سورۃ طور کی آیت کی تفسیر میں لکھا ہے: 'ہم نے ان کو حوروں سے اور اہل ایمان سے ملا دیا یعنی رفقاء اور ہم نشینوں سے ۔۔۔ پس کبھی تو وہ حوروں کے ساتھ کھیل کود اور کبھی مومن بھائیوں کے پیار اور محبت سے لطف اندوز ہوں گے'۔

مختصر یہ ہے کہ جب زوّج کا فعل حرف جار با کے ساتھ استعمال ہو تو اس کے معنی ساتھی بنانے کے

Marfat.com

ہیں نہ کہ نکاح کرنے کے۔ دوسرا اہم نکتہ یہ ہے کہ سورۃ دخان اور سورۃ طور دونوں میں ماضی کا صیغہ استعمال ہوا ہے جبکہ سورۃ دخان میں اس سے پہلے یلبسون (وہ پہنیں گے) مضارع کا صیغہ استعمال ہوا ہے۔ کیا اس کا ترجمہ یوں کیا جائے گا کہ اللہ نے ان کا نکاح پہلے سے پڑھا رکھا ہے؟ ہاں اگر یہ ترجمہ یوں کیا جائے کہ اللہ نے ان کو ساتھی بنا رکھا ہے تو ترجمہ برمحل ہوگا۔ ہمارے یہاں سوسائٹی میں مرد اور عورت کی رفاقت کا میاں بیوی بنے بغیر تصور نہیں اس لیے ہم جنتی معاشرے میں بھی اس جنسی تعلق کو برقرار رکھنے پر مصر ہیں۔ حالانکہ قرآن حکیم نے سورۃ توبہ میں اہل ایمان مردوں اور عورتوں کی رفاقت کا برملا اعتراف کیا ہے۔ ارشاد ربانی ہے: 'وَالْمُؤْمِنُونَ وَالْمُؤْمِنَاتُ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ' (التوبہ ۹:۷۱)، 'مومن مرد اور عورت آپس میں ایک دوسرے کے دوست ہیں'۔ یہ دوستی یہ رفاقت جنس سے ماورا ہے۔ جنت کا تصور مادی تصور نہیں اس لیے وہاں کوئی بھی تکلف نہ ہوگا اور نہ معروف معنوں میں شادی بیاہ ہوگا۔ اہل جنت ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جنت میں رہیں گے۔ انہیں بقائے نوع کا مسئلہ بھی درپیش نہ ہوگا۔ اس لیے زوج کے فعل سے ذہن کو جنسی تعلقات کی طرف منتقل نہیں ہونا چاہیے، اس سے رفاقت کا مفہوم ہی لینا چاہیے۔ اس فعل کے بعد حرف جار باء واضح طور پر رفاقت اور مصاحبت کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔ اسی لیے صاحب روح المعانی نے سورۃ دخان کی تفسیر میں کہا ہے کہ اکثر مفسرین کا خیال ہے کہ یہاں مراد یہ ہے کہ ہم نے ان کو حوروں کا ساتھی بنا دیا ہے۔ ایک آدھ کو چھوڑ کر کسی اہل لغت نے تزویج کو باء کے ساتھ شادی کے معنوں میں استعمال کرنے کی اجازت نہیں دی۔ اس لیے صحیح ترجمہ یہی ہوگا کہ ہم نے ان کو گوری گوری اور موٹی موٹی آنکھ والی حوروں کا ساتھی بنا دیا ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا جنت پر صرف مردوں کی اجارہ داری ہوگی اور مرد عورتوں کی رفاقت سے لطف اندوز ہوں گے یا یہ حق عورتوں کو بھی حاصل ہوگا اور کیا وہ جنت میں مستقل حیثیت سے داخل ہوں گی یا مردوں کا کھلونا بن کر؟ سورۃ توبہ کی آیت کے مطابق 'عورتیں جنت میں ایسے ہی مستقل حیثیت سے داخل ہوں گی جیسے کہ مرد۔ ارشاد ربانی ہے: 'ایمان دار مردوں اور عورتوں سے اللہ نے ان جنتوں کا وعدہ فرمایا ہے جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہوں گی جہاں وہ ہمیشہ رہنے والے ہیں اور ان صاف ستھرے اور پاکیزہ مساکن کو جوان ہمیشگی والی جنتوں میں ہیں' (التوبہ ۹:۷۲)۔ آیہ مبارکہ میں صاف طور پر ہے کہ عورتوں کو بھی مردوں کی طرح صاف ستھرے محلات ملیں گے۔ اگر ایسا ہے تو مردوں کے ساتھ تو ان مقامات پر حوریں ہوں گی، عورتوں کے ساتھ کون ہوگا؟ کیا حور وقصور مردوں کے لیے ہے اور عورتیں اس سے محروم ہیں؟

Marfat.com

اس کے لیے لفظ حور کی طرف رجوع کرنا پڑے گا۔ امام طبری سورۃ دخان کی آیت کی تفسیر کے ضمن میں اس لفظ پر یوں روشنی ڈالتے ہیں۔ 'حور اسے کہتے ہیں جن کے حسن و جمال کو دیکھ کر آنکھیں محو حیرت ہو جائیں۔ جن کے کپڑوں میں سے ان کی گوری پنڈلیوں کا گودا نظر آئے اور جن کے چہرے کی صاف اور شفاف جلد میں سے دیکھنے والے کو اپنا چہرہ ایسے نظر آئے جیسے آئینے میں نظر آتا ہے'۔ مجاہد کا قول ہے کہ یہ قول کہ حور وہ ہے جس کا حسن و جمال دیکھ کر آنکھیں محو حیرت ہو جائیں عربوں کے یہاں بے معنی کلام ہے۔ کیونکہ حور، حوراء کی جمع ہے جیسے حُمُر، حمراء کی اور سُوْد، سوداء کی جمع ہے۔ حور افعلاء کے وزن پر ہے اور یہ چٹی سفید چیز کو کہا جاتا ہے جیسا کہ صاف ستھرے اور سفید کھانے کو الطعام الحواری کہا جاتا ہے'۔ حوّر کے معنی کپڑے کو سفید کرنا ہے اور حَوِرَتْ آنکھ کی صفت ہے جس کا مطلب ہے آنکھ کی سفیدی اور سیاہی کا بہت ہی سفید و سیاہ ہونا۔ حور جیسے حوراء (مونث) کی جمع ہے اسی طرح احور (مذکر) کی بھی جمع ہے۔ اسی طرح عِین (موٹی آنکھوں والی) جس طرح عیناء (مونث) کی جمع ہے بالکل اسی طرح یہ اعین (مذکر) کی جمع بھی ہے۔ لفظ حور علامت ہے حسن کی، پاکیزگی نگاہ کی اور سچائی اور خیر خواہی کی۔ وہ جنت میں پر مسرت فضا ہو گی جس میں مرد اور عورت برابر کے شریک ہوں گے۔ جنت کی زندگی میں رفقاء قلب و نظر کی پاکیزگی کے حامل ہوں گے۔ ایسے رفقاء جو پاکیزہ سیرت اور پاکیزہ فکر ہوں گے۔ لفظ حور عین کے حسن و جمال سے جنسی طور پر حظ اٹھانا اور ان کو بیوی کے روپ میں دیکھنا جنت کے پاکیزہ ماحول سے متصادم ہے۔ جنت کی زندگی کو دنیا کی زندگی پر قیاس کرنا قرآنی فکر کے منافی ہے۔ اس طرح وہ اختلاف بھی ختم ہو جاتا ہے کہ یہ حوریں دنیا کی بوڑھی عورتیں ہونگیں جن کے منہ میں دانت بھی نہ ہونگے اور ان کو جوان کر دیا جائے گا جیسا کہ حسن کا قول ہے یا وہ اس دنیا کی عورتیں نہیں ہوں گی جیسا کہ حضرت ابو ہریرہؓ کا قول بیان کیا جاتا ہے اور یہ اختلاف بھی ختم ہو جائے گا کہ ان کی تعداد دو ہو گی یا بہتر۔ وصل کی راحت کے سوا اور بھی بہت سی راحتیں ہیں۔ اس سلسلہ میں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ازواج مطہرہ کی تفسیر میں مولانا امین احسن کی عبارت نقل کی جائے جو انھوں نے سورۃ بقرۃ کی آیت (۲:۲۵) کے ضمن میں لکھی ہے، فرماتے ہیں:

'انسان کے اندر قدرت نے ایک خلا چھوڑا ہے جو اس جوڑے کے سوا کسی اور شکل سے پورا نہیں ہو سکتا، اس وجہ سے اس کے بغیر انسان کے لیے کسی نعمت کا تصور بھی کامل نہیں ہوتا چنانچہ جنت میں بھی جو کمال نعمت کی تعبیر ہے اس کا ذکر موجود ہے'۔ تطہیر کے معنی میں خاص اہتمام اور توجہ کے ساتھ کسی کے عادات و خصائل اور طبیعت مزاج کو سنوارنا اور پاکیزہ بنانا ہے۔۔۔ نہایت اہتمام کے ساتھ ان کا تزکیہ کیا گیا ہے تاکہ وہ اہل جنت کی رفاقت کے لیے پوری طرح موزوں ہو سکیں'۔

Marfat.com

صاحبۃ (ساتھی۔بیوی)

لغوی مفہوم

مقاییس اللغۃ میں ابن فارس کا قول ہے کہ 'صاد، حاء اور باء کے بنیادی معنی کسی شی کے ساتھ یا قریب رہنے کے ہیں۔اس اعتبار سے ساتھ رہنے والے کو صاحب کہا جاتا ہے جس کی جمع صُحْب ہے۔

صَحِبَ سمِعَ کے وزن پر ہے اس کی مصدر صَحَابۃ، صِحَابۃ اور صُحْبۃ ہے۔اس کے معنی ہیں ساتھی ہونا، دوستی کرنا اور ایک ساتھ زندگی بسر کرنا اور القاموس المحیط کے مطابق صاحب کے معنی معاشر یعنی ایک ساتھ زندگی بسر کرنے والے کے ہیں۔أَصْحَبَ الرجل کے معنی ہیں آدمی ساتھی والا ہو گیا۔پھر اس کے معنی ہیں کہ بیٹا بالغ ہو کر باپ کی مانند ہو گیا۔ ادیم مُصْحَب اس چمڑے کو کہتے ہیں جس سے بال نہ اتارے گئے ہوں، عود مصحب اس لکڑی کو کہتے ہیں جس کا چھلکا علیحدہ نہ کیا گیا ہو اور تمر مُصْحَب ایسی کھجور کو کہتے ہیں جس سے گٹھلی الگ نہ کی گئی ہو۔اصحب الماء پانی کائی والا ہو گیا۔اَصْحَبَ فلانا اس نے فلاں کی حفاظت کی۔انہی معنوں میں قرآن حکیم کی آیت (الأنبیاء۲۱:۴۳) میں ہے: 'وَلَا هُمْ مِّنَّا يُصْحَبُوْنَ' 'اور نہ وہ ہماری طرف سے پناہ دیے جائیں گے۔' یعنی ہماری طرف سے ان کے لیے سکون، راحت اور مہربانی کی صورت میں کسی قسم کا ساتھ نہیں دیا جائے گا۔یہ قول کہ صَحِبَكَ اللہُ اللہ تمہاری حفاظت کرے' انہی معنوں میں ہے۔استصحب ایک چیز جو دوسری سے لگی اور بندھی ہو اس کے لیے کہا جاتا ہے 'استصحبت' جیسے محاورہ میں کہا جاتا ہے کہ استصحبتُ الحال یعنی میں اس حالت سے چپکا رہا جدا نہ ہوا۔صاحب کی جمع صَحْب، اصحاب اور صَحَابۃ آتی ہے اور اصحاب کی جمع اصاحیب۔صاحبۃ، صاحب کا مؤنث ہے۔اس کے معنی بیوی کے ہیں اور اس کی جمع صاحبات اور صواحب ہے اور صواحب کی جمع صواحبات بھی آتی ہے۔

صحبت یا ساتھ کی نوعیت

امام راغب مفردات میں فرماتے ہیں: 'صاحب کے معنی مستقل طور پر ہمیشہ ساتھ رہنے والا ہے خواہ وہ کسی انسان یا حیوان کے ساتھ رہے یا زمان و مکان کے ساتھ، خواہ یہ ساتھ بدنی ہو جو کہ اصل ہے اور اکثر ہوتا ہے یا یہ ساتھ توجہ اور مقصد و شوق کے ذریعہ سے معنوی یا فکری ہو۔جیسا کہ شاعر نے کہا ہے:

انا والذی لو شاء لم یخلق الھوی
لئن غِبتِ عن عینی لما غبتِ عن قلبی

Marfat.com

"قسم ہے اس ذات کی جو اگر چاہتی تو عشق و محبت (کے جذبات) کو پیدا ہی نہ کرتی
میری تو یہ کیفیت ہے کہ گر تو میرے آنکھوں سے اوجھل ہو بھی تو میرے دل سے اوجھل
نہیں ہوتی"۔

یہ دل کا معنوی ساتھ ہے۔اسی ساتھ کی طرف قرآن حکیم نے سورۃ سبا (۳۴:۴۶) میں اور سورۃ تکویر (۸۱:۲۲) میں اشارہ کیا ہے اور فرمایا ہے: "وَمَا بِصَاحِبِكُم مِّن جِنَّةٍ" "تمھارے رفیق کو سودا نہیں" آنحضرت ﷺ کو صاحب کہہ کر اس بات کی طرف تنبیہہ کی گئی ہے کہ تم نے ان کے ساتھ زندگی گزاری ہے ان کے ظاہر و باطن سے واقف ہو چکے ہو پھر بتاؤ کہ ان میں کوئی دماغی خلل یا جنون نظر آیا؟

یہ ساتھ رہنا لمبے عرصہ کے لیے ہونا چاہیے۔اگر لمبا عرصہ نہ ہو تو اس ساتھ کو اجتماع کہیں گے۔امام راغب کا قول ہے کہ مُصَاحَبَۃٌ اور اصطحاب (ساتھ دینا) اجتماع سے زیادہ بلیغ ہے کیونکہ مصاحبۃ کا لفظ عرصہ دراز تک ساتھ رہنے کا تقاضا کرتا ہے۔ ہر اصطحاب اجتماع ہوتا ہے لیکن ہر اجتماع اصطحاب نہیں ہوتا۔ مندرجہ بالا تصریحات سے معلوم ہوتا ہے کہ صاحب وہ ہے جو ایک لمبے عرصہ تک کسی کے ساتھ رہے اور اس سے جدا نہ ہو۔ یہ ساتھ بدنی بھی ہو اور فکری بھی۔اور ساتھ میں مشابہت پائی جائے جیسے بیٹا جوان ہو کر باپ جیسا ہو جاتا ہے۔(أصْحَب الرجل) یا جیسا کہ سورۃ ذاریات (۵۱:۵۹) میں اصحاب سے مراد انھی جیسے لوگ ہیں۔اصحاب ابی حنیفہ اور اصحاب شافعی بھی ہم مسلک کے معنوں میں استعمال کرتے ہیں جیسا کہ قرآن میں أصحاب موسیٰ اور أصحاب سفینۃ، اصحاب القریۃ بھی انھی معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ساتھ میں ایک دوسرے کی حفاظت کا جذبہ ہونا چاہیے اور اسی نوعیت کے ساتھ کی وجہ سے بیوی کو صاحبۃ کہا جاتا ہے۔

صاحب اور اس کی جمع اصحاب مجازاً (Owner یا Inmate) کے لیے بھی بولا جاتا ہے جیسے صاحب مال (مال والا) صاحب علم (علم والا) کیونکہ مال اور علم کی صفت اس آدمی سے لگی رہتی ہے جدا نہیں ہوتی۔قرآن حکیم میں انھی معنوں میں أصحاب المیمنۃ (دائیں ہاتھ والے) أصحاب المشئمۃ (بائیں ہاتھ والے) أصحاب الجنۃ (جنت والے) أصحاب النار (جہنم والے) استعمال ہوئے ہیں۔اس کے علاوہ قرآن حکیم نے مختلف قوموں اور جماعتوں کے لیے أصحاب الفیل، أصحاب الأخدود، أصحاب الأیکۃ، أصحاب الرس، أصحاب مدین اور أصحاب الحجر کی ترکیب مجازاً استعمال کی ہے۔ان سب ترکیبات میں اگرچہ اصحاب،

Marfat.com

صاحب کی جمع ہے جو مذکر ہے لیکن اسلوب تغلیب کے مطابق ان میں مرد اور عورت دونوں شامل ہیں۔ قرآن حکیم میں مندرجہ ذیل مقامات پر صاحب اور اصحاب کے الفاظ مرد اور عورت دونوں کے لیے استعمال ہوئے ہیں۔

سورۃ البقرۃ (۲:۳۹، ۸۱، ۸۲، ۲۱۷، ۲۵۷، ۲۷۵)، سورۃ آل عمران (۳:۱۱۶)، سورۃ نساء (۴:۳۶) میں الصاحب بالجنب 'پہلو کے ساتھی' کے الفاظ ہیں۔ ان کی تشریح بعد میں ہوگی۔ سورۃ مائدہ (۵:۱۰، ۸۶) سورہ أعراف (۷:۳۶، ۴۲، ۴۴، ۴۶ تا ۴۸، ۵۰)، سورۃ أعراف کی آیت نمبر ۴۶ اور ۴۸ میں لفظ رجال (مرد) کے باوجود اس میں مرد اور عورتیں بھی شامل ہیں کیونکہ ظاہر ہے کہ اصحاب الأعراف سے مراد صرف مرد نہیں لیے جا سکتے۔ سورۃ توبہ (۹:۷۰، ۱۱۳)، سورۃ یونس (۱۰:۲۶، ۲۷)، سورۃ ھود (۱۱:۲۳)، سورۃ رعد (۱۳:۵)، سورۃ حجر (۱۵:۷۸، ۷۰)، سورۃ طٰہٰ (۲۰:۱۳۵)، سورۃ حج (۲۲:۴۴، ۵۱)، سورۃ فرقان (۲۵:۲۴، ۳۸)، سورۃ شعراء (۲۶:۶۱، ۱۷۶)، سورۃ عنکبوت (۲۹:۱۵)۔ سورۃ شعراء آیت نمبر ۶۱ میں اصحاب موسیٰ اور سورۃ عنکبوت آیت نمبر ۱۵ میں اصحاب السفینۃ (کشتی والے) ہم خیال اور ہم مشرب کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ کشتی والوں میں تو صراحت کے ساتھ مونث کا ذکر موجود ہے مگر صیغہ اصحاب مذکر استعمال ہوا ہے۔ سورۃ فاطر (۳۵:۶)، سورہ یسین (۳۶:۱۳، ۵۵) کی آیت نمبر ۱۳ میں اصحاب القریۃ (بستی والے) ہم خیال اور ہم مشرب کے معنوں میں اصحاب استعمال ہوا ہے۔ سورۃ ص (۳۸:۱۳)، سورۃ مومن (۴۰:۶، ۴۳)، سورۃ احقاف (۴۶:۱۴ تا ۱۶)، سورۃ ق (۵۰:۱۲، ۱۴)، سورۃ الذاریات (۵۱:۵۹) میں اصحاب ہم خیال ساتھیوں کے معنوں میں ہے۔ سورۃ واقعہ (۵۶:۸، ۹، ۲۶، ۳۸، ۴۱، ۹۰)، سورۃ حدید (۵۷:۱۹)، سورۃ مجادلۃ (۵۸:۱۷)، سورۃ حشر (۵۹:۲۰)، سورۃ ممتحنۃ (۶۰:۱۳) میں اصحاب القبور (قبر والے) ہم خیال ساتھیوں کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ سورۃ تغابن (۶۴:۱۰)، سورۃ ملک (۶۷:۱۰، ۱۱)، سورۃ قلم (۶۸:۱۷) میں اصحاب الجنۃ (باغ والے) ہم خیال اور ہم آہنگ ساتھیوں کے معنوں میں ہے۔ سورۃ مدثر (۷۴:۳۹)، سورۃ بروج (۸۵:۴) اصحاب الاخدود (خندقوں والے) ہم مشرب ساتھی ہیں، سورۃ بلد (۹۰:۱۸، ۱۹)۔

لفظ صاحب اور اصحاب میں ایک اہم عنصر ہم خیال ساتھیوں کا ہے۔ کچھ مقامات کی میں نے

Marfat.com

صراحتاً نشاندہی کردی ہے۔ باقی آیات میں جہاں أصحاب جنة، أصحاب نار، اصحاب میمنة اور أصحاب مشئمةکا ذکر ہے وہاں بھی لفظ اصحاب ہم خیال ساتھیوں کے معنوں میں ہے۔ سوائے ان آیات کے جہاں اصحاب کسی قوم یا بستی کی طرف منسوب ہیں عام طور پر اس سے یہی معنی مراد لیے گئے ہیں۔

'صحب' کے مادہ کے اگر تمام مضمرات کو ذہن میں رکھیں تو صاحبة اس بیوی کو کہیں گے جو میاں کے ساتھ لمبے عرصے کے لیے مسلسل بدنی اور فکری مصاحبت کے ساتھ زندگی بسر کرنے والی ہو، جو مقام و مرتبہ میں اپنے ساتھی جیسی اور اس کی ہم خیال ہو اور اس کی عزت و ناموس کی حفاظت کرنے والی ہو۔ صاحبة کا لفظ زوج کی تمام خوبیوں کا حامل ہے بلکہ ایک لحاظ سے یہ اس سے بلیغ تر ہے کیونکہ یہ مسلسل ساتھ رہنے کے لیے قصد، ارادہ، شوق، ہمت اور حوصلے کا تقاضا کرتا ہے اور زندگی گزارنے کے لیے ایک مستحکم بنیاد فراہم کرتا ہے۔ لفظ زوج کی مانند صاحبة کا لفظ عورت کی مستقل حیثیت کو تسلیم کرتا ہے اور میاں بیوی کے درمیان حاکم و محکوم، افضل و مفضول کے تعلقات کی قطعاً نفی کرتا ہے۔ قرآن کی رو سے بیوی ساتھی ہے، دوست ہے، شریک حیات ہے نہ کہ کوئی ملکیتی چیز جس پر حکومت چلائی جائے، لفظ صاحبة اسی مفہوم پر دلالت کرتا ہے۔

سب سے پہلے اس آیہ مبارکہ کا ذکر مناسب ہوگا جس میں صاحب کا لفظ بول کر اس میں صاحبة کو بھی شامل کیا گیا ہے۔ سورۃ نساء (۴:۳۶) میں اللہ تعالیٰ نے والدین، عزیزوں، یتیموں، مسکینوں، رشتہ دار، پڑوسی اور اجنبی پڑوسی، پہلو میں بیٹھنے والے ساتھی اور مسافر کے ساتھ حسن سلوک کا حکم دیا ہے۔ اس آیت میں ہم نشین کے لیے الصاحب بالجنب کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں جس کے لفظی معنی پہلو کا ساتھی ہیں۔ صاحبِ کشاف نے اس کی تشریح یوں کی ہے: 'جو آپ کا ساتھ دیتا رہے، آپ کے پہلو میں، یعنی' آپ کے برابر آ گیا ہو۔' مفسرین نے اس سے متعلق تین اقوال نقل کیے ہیں ایک قول ہے سفر کا ساتھی۔ مجاہد نے اس کی وضاحت کی ہے کہ سفر کا وہ ساتھی جس کا ہاتھ تمھارے ہاتھ میں ہو۔ دوسرا قول ہے تیری وہ بیوی، جو تیرے پہلو میں تمھارے گھر میں رہتی ہے اور تیسرا قول ہے مطلقاً ساتھی خواہ وہ سفر ہی کا ساتھی ہو، علم و معرفت میں آپ کا ہم جماعت ہو یا کسی مجلس یا مسجد میں آپ کا ہم نشین ہو۔ صاحب البحر المحیط کے مطابق علیؓ، عبداللہؓ بن مسعود، ابراہیم النخعی اور عبدالرحمان بن ابی لیلیٰ کا قول ہے کہ اس سے مراد بیوی ہے۔ عبد بن حمید نے حضرت علیؓ سے روایت کی ہے کہ اس سے مراد عورت (امراۃ) ہے۔ فطرت اور نظامِ معیشت کا تقاضا یہی ہے کہ عورت مرد کے پہلو میں رہے۔ بہرکیف اگر اس سے مراد مجرد

Marfat.com

ساتھی ہی لیا جائے تو بیوی بدرجہ اولیٰ اس میں شامل ہوگی، کیونکہ اس سے بڑھ کر ہر وقت پہلو میں رہنے والا اور کون ہو سکتا ہے؟ ہر ساتھی کا دوسرے ساتھی پر حق ہے۔ اس کا فرض ہے کہ وہ اس حق کی نگہداشت کرے اور اسے ہرگز نہ بھولے۔ جس نسبت سے یہ ساتھ ہوگا اسی نسبت سے حق بھی بڑھتا جائے گا۔ صاحب بالجنب کے معنوں میں ہر ساتھی داخل ہے خواہ سفر کا ساتھی ہو یا نکاح کا ساتھی۔ امام طبری نے اس آیت کے ذیل میں ایک روایت نقل کی ہے کہ نبی کریم ﷺ ایک صحابی کے ساتھ جنگل میں سے گزر رہے تھے۔ دونوں سوار تھے آپؐ نے دو شاخیں کاٹیں، ایک سیدھی تھی اور دوسری ٹیڑھی۔ آپ نے ٹیڑھی شاخ خود رکھ لی اور سیدھی شاخ ساتھی کو دے دی۔ تو وہ کہنے لگا! اے اللہ کے رسول میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں۔ مجھ سے زیادہ آپ کا حق ہے کہ آپ سیدھی شاخ لیں۔ تو آپؐ نے فرمایا! بالکل نہیں اے فلان! ہر آدمی جو اپنے ساتھی کے ساتھ ہوتا ہے وہ ساتھ نبھانے کا ذمہ دار ہوتا ہے۔ خواہ دن میں پل بھر کے لیے کیوں نہ ہو؟ دوسری روایت امام طبری نے حضرت عبداللہ بن عمرو سے روایت کی ہے کہ اللہ کے یہاں بہترین ساتھی وہ ہوتا ہے جو اپنے ساتھی کے حق میں بہتر ہو اور بہترین پڑوسی وہ ہے جو اپنے پڑوسی کے حق میں بہتر ہو۔ ان روایات سے ثابت ہوتا ہے کہ لفظ صاحب کا اطلاق مرد اور عورت پر یکساں ہوتا ہے۔

سورۃ نساء کی آیت میں لفظ احسان سے حسن اور عمدگی مطلوب ہے۔ نیکی کرتے وقت بدنیتی سے کام کرنے والا اور کوتاہی کرنے والا محسن نہیں سمجھا جائے گا۔ حسن سلوک کی کئی صورتیں ہیں مثلاً دین و دنیا کے معاملات میں باہمی تعاون، خیر خواہی، تنگی خوشی میں ساتھ نبھانا، ساتھی کے لیے وہی پسند کرنا جو اپنے لیے پسند کرے اور وہی ناپسند کرنا جو اپنے لیے ناپسند کرے۔ ساتھی کی طاقت سے بڑھ کر اسے تکلیف نہ دینا۔ درشت کلامی سے اس کے جذبات کو مجروح نہ کرنا۔ یہ سب ساتھی کے ساتھ احسان کی مختلف صورتیں ہیں۔ امام رازی نے تو اس میں ساتھی کے کھانے اور لباس کی ضروریات پوری کرنے کو بھی احسان میں شامل کیا ہے۔ کیا آپ کی جیون بھر کی ساتھی آپ کی شریک حیات اس احسان کی حقدار نہیں جس کو مفسرین نے ہر ساتھی کے لیے فرض قرار دیا ہے؟ دوسروں کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آنے کے لیے اس بات کی ضرورت ہے کہ انسان جو ہر انسانیت سے مزین ہو، وہ دوسروں کی امداد میں خوشی محسوس کرے اور عالی ظرف ہو۔ اس کے برعکس جو خود فریبی میں مبتلا ہو، اپنی ذات میں محدود رہے اور اپنے آپ کو برتر جنس سمجھتا ہو اس سے نہ تو احسان کی توقع کی جا سکتی ہے اور نہ ہی وہ اللہ کی نظر میں قابل ستائش ہو سکتا ہے۔

وہ آیات مبارکہ جن میں لفظ صاحبۃ (بیوی) استعمال ہوا ہے کل چار ہیں یعنی سورۃ انعام

Marfat.com

(۱۰۱:۶)، سورۃ معارج (۱۲:۷۰)، سورۃ جن (۳:۷۲) اور سورۃ عبس (۳۶:۸۰)۔ ان چار مقامات میں سے دو مقامات یعنی سورۃ انعام (۱۰۱:۶) اور سورۃ جن (۳:۷۲) میں حق تعالیٰ نے اپنے ساتھ صاحبہ (بیوی) کے وجود کی نفی کر کے اپنے بیٹے اور بیٹوں کے باطل عقیدہ کی تردید کی ہے۔

سورۃ انعام کی آیت میں حق تعالیٰ کا ارشاد ہے: 'بَدِیْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اَنّٰی یَکُوْنُ لَہٗ وَلَدٌ وَّلَمْ تَکُنْ لَّہٗ صَاحِبَۃٌ'، 'وہ آسمانوں اور زمین کا موجد ہے اللہ تعالیٰ کے اولاد کیسے ہو سکتی ہے حالانکہ اس کی کوئی بیوی تو ہے ہی نہیں'۔ اس سے پہلی آیت میں یہود و نصاریٰ کی طرف اشارہ ہے کہ انھوں نے بیٹے یعنی عزیر اور عیسیٰ تراش رکھے ہیں اور قریش کی طرف اشارہ ہے جو فرشتوں کو اللہ کی بیٹیاں قرار دیتے تھے۔ حیرت کی بات ہے کہ ان میں سے کوئی بھی اللہ کی بیوی کا قائل نہ تھا۔ چنانچہ اللہ ان سے پوچھتا ہے کہ لڑکا یا لڑکی کیسے اور کہاں سے پیدا ہو گی جبکہ اس کی بیوی ہی نہیں جس سے بچہ پیدا ہو سکتا ہے؟ بچہ اصلاً والدہ کے بغیر ہو ہی نہیں سکتا، والد کے بغیر اس کا وجود علمی طور پر ممکن ہے۔

آیت میں لم تکن لہ صاحبۃ کا جملہ حال واقع ہوا ہے جو مذکورہ ناممکن بات کی تاکید کر رہا ہے۔ اس آیت میں ایک تو توالد و تکاثر کی نفی ہے کہ اللہ توحدہ لاشریک ہے۔ اس کے علاوہ جو بھی ہے وہ اس کی مخلوق ہے۔ دوسرے اس بات کی تاکید ہے کہ اگر اس کی بیوی ہوتی تو وہ الٰہ ہوتی اور اس کی ہم جنس ہوتی کیونکہ توالد تو دو مماثل چیزوں کے درمیان ہوتا ہے اور اللہ سبحانہ تو مثال اور تشبیہ سے پاک ہے۔ اس آیت میں اور سورۃ جن کی آیت میں اللہ نے لفظ صاحبۃ کو اپنی طرف نسبت دے کر اس لفظ کی وقعت میں اضافہ کر دیا ہے اور ثابت کر دیا ہے کہ صاحبۃ کا لفظ زوج سے بلیغ تر ہے، اسی لیے یہاں لفظ زوج کی جگہ صاحبہ کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ لفظ زوج سے ذہن فوری طور پر تکاثر اور تناسل کی طرف منتقل ہوتا ہے جبکہ لفظ صاحبہ تکاثر و تناسل سے ماوراء صفات کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ یہ لفظ ساتھ، دوستی، شرکت اور مستقل شخصیت کا مجموعہ ہے۔ مقام فخر ہے کہ اللہ جل جلالہ نے اس لفظ کو اپنی طرف منسوب کیا ہے۔

سورۃ جن کی آیت میں ارشاد باری ہے: 'وَّاَنَّہٗ تَعٰلٰی جَدُّ رَبِّنَا مَا اتَّخَذَ صَاحِبَۃً وَّلَا وَلَدًا' 'اور بے شک ہمارے رب کی شان بڑی بلند ہے نہ اس نے کسی کو بیوی بنایا ہے نہ بیٹا'۔ بیوی اور بچے کی ضرورت اسے ہوتی ہے جو ان کا محتاج ہو۔ اگر وہ سامنے نظر نہ آئیں تو اس کا دل انہی کی طرف لگا رہتا ہے مگر حق سبحانہ وتعالیٰ تو ان چیزوں سے بے نیاز ہے کیونکہ ہر چیز اسی سے ہے، اس کے لیے ہے اور لوٹ کر اسی کی طرف جائے گی اور اللہ کی شان بلند ہے۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ ان کا یہ خیال کہ اللہ

Marfat.com

کے بیوی اور بچے ہیں، باطل ہے۔ اللہ تو ہر صفت میں کامل ہے ہر نقص اور کمزوری سے پاک ہے۔ بیوی اور بچے اللہ کی صفت بے نیازی کی نفی کرتے ہیں۔ جنوں نے ان کمزوریوں سے اللہ تعالیٰ کی تنزیہہ کی سورۃ معارج (۷۰:۱۲) میں فرار ایک وہی خطرے اور آنے والی برائی سے ہے۔ اس میں انسان صرف اپنے نفس کی طرف دیکھتا ہے۔ اگر اس کا نفس اجازت دے کہ وہ کوئی چیز ساتھ لے جائے تو وہ عزیز ترین چیز کی طرف دیکھتا ہے۔ وہ اسے ساتھ لے کر اپنے آپ کو بچانے کی تمنا کرتا ہے۔ جب دائرہ اس قدر تنگ ہو جاتا ہے کہ صرف اپنے آپ کو بچانے کی گنجائش رہ جاتی ہے تو وہ ہر چیز پھینک کر اپنے آپ کو بچا کر نکل جاتا ہے۔ اس قدر دقت کے ساتھ منظر کشی قرآن ہی کا خاصہ ہے۔ کیا کوئی شاعر اور کاتب اس مقام پر زوجۃ اور صاحبۃ کے درمیان امتیاز کر سکتا ہے؟ جس سے وہ قیامت کے دن بھاگ رہا ہے وہ صرف اس کی زوج نہیں بلکہ قیامت تک اس کا ساتھ دینے والی رفیق ہے۔ یہ ایک معجزاتی لفظ ہے جو اپنے اندر معانی کا سمندر سمیٹے ہوئے ہے۔ قرآن حکیم میں حرف واو زیادہ تر ترتیب اور تعقیب کا مفہوم ادا کرتا ہے۔ متقدم اور متاخر کی وضع حکم کے اشتراک کے باوصف مختلف ہو جاتی ہے۔ حکم کے سلسلہ میں ان میں درجہ بندی کی گئی ہے اور یہ قرآنی اسلوب کا خاصہ ہے۔ صرف حرف واو کے ساتھ عطف اس اختلاف و ائتلاف کو ایک ساتھ، ایک ہی وقت میں جمع رکھتا ہے دونوں متعاطفین کے درمیان کوئی مہلت نہیں ہوتی جیسا کہ فا اور ثم کے عطف سے ہوتی ہے۔ وہ اپنے اہل وعیال سے یک دم بھاگتا ہے۔ افراد کو زمانہ کی فرصت علیحدہ نہیں کرتی بلکہ وہ ایک مفصل لمحہ ہے جو انتہائی تیزی سے گزر جاتا ہے۔

مندرجہ بالا آیت اور سورۃ عبس کی آیت (۸۰:۳۶) میں ایک واضح فرق ہے۔ اوپر والی آیت میں رشتہ داروں کی ترتیب اقرب (زیادہ قریب) سے ابعد (زیادہ دور) کی طرف ہے جبکہ اس آیت میں اس کے برعکس ابعد (زیادہ دور کے رشتہ دار) سے اقرب کی طرف ہے۔ بقول مولانا اصلاحی یہ دونوں اسلوب بلاغت کلام کے تقاضے سے اختیار کیے گئے ہیں اور بلاغت یوں واضح ہے کہ جہاں قربانی پیش کر کے اپنے آپ کو بچانے کا مرحلہ درپیش ہو تو انسان سب سے پہلے عزیز ترین متاع کی قربانی پیش کرتا ہے۔ بچے اس کے جگر کے ٹکڑے ہیں دنیا میں وہ ان پر اپنا سب کچھ نچھاور کرنے کے لیے تیار ہوتا ہے۔ تعلق کے اعتبار سے بچوں کے بعد قریب تر بیوی اور بیوی بھی ایسی جس نے زندگی بھر ساتھ نبھایا ہو۔ اس کی حفاظت کے لیے وہ اپنی جان اور مال سب کچھ قربان کرنے کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔

Marfat.com

دنیوی دستور کے مطابق انسان اپنی قیمتی متاع کو آخر تک سنبھالنے کی کاوش کرتا ہے مگر جہاں معاملہ جہنم کے عذاب سے گلو خلاصی کا ہو تو معیار بدل جاتے ہیں، میزان بگڑ جاتے ہیں، وہاں اختیار کی گنجائش نہیں ہوتی۔ انسان چاہتا ہے کہ کوئی اس سے اس کی سب سے قیمتی چیز لے لے اور اس کی گلو خلاصی کر دے۔ جب انسان عذاب کے دائرہ سے باہر ہو تو اس کے پاس اختیار ہوتا ہے اس لیے وہ پہلے عزیز سے پہلو تہی کرتا ہے پھر عزیز تر سے وہ فدیہ نہیں دے رہا ہوتا اس لیے وہ ان روابط کو پیش نظر رکھتا ہے جو اس نے بھائی، ماں، باپ اور بیوی بچوں سے باندھے ہوئے ہوتے ہیں۔ وہ وہاں سے شروع کرتا ہے جو ان میں روابط کے اعتبار سے بعید تر ہوتا ہے پھر ان روابط کو گرہ در گرہ کھولتا ہوا اس فرد تک پہنچ جاتا ہے جو اس سے قریب تر ہے۔ یہ ترتیب نفسیاتی اعتبار سے بڑی دقیق اور محکم ہے۔ یہ قرآنی اسلوب کا خاصہ ہے۔

سوال یہ ہے کہ وہ ان سے بھاگتا کیوں ہے؟ روح المعانی میں قتادہ سے روایت نقل کی گئی ہے کہ انسان پر قیامت کے دن سے بھاری کوئی دن نہ ہوگا۔ اس روز وہ اپنی جان پہچان کے لوگوں کی طرف اس خوف سے نہ دیکھے گا کہ انہیں کوئی دادرسی نہ کر دے۔ اس کے بعد قتادہ نے سورۃ عبس کی آیت پڑھی دنیا میں آدمی جن کی طرف بھاگ کر جاتا تھا اور ان کی پناہ لیا کرتا تھا آخرت میں انہی سے بھاگے گا۔ اس خوف سے کہ ان میں سے کوئی اپنا حق نہ مانگ لے اور اس وجہ سے کہ اسے یقین ہوگا کہ ان میں سے کوئی نفسا نفسی کے اس عالم میں اس کے کام نہیں آسکتا۔ دنیا کا معیار اور ہے اور آخرت کا معیار اور، جیسے آدمی دنیا میں اپنے پیاروں کی خبر گیری کرتا رہتا تھا آخرت میں وہ ایسا نہیں کر پائے گا کیونکہ اس کو اپنی فکر پڑی ہوگی۔

مختصر یہ ہے کہ مذکورہ بالا چاروں آیات سے ثابت ہوتا ہے کہ بیوی کے لیے صاحبہ کا لفظ اللہ کی طرف نسبت کے باعث انتہائی مقدس ہے۔ اس میں دوست، ساتھی، شریک اقتدار اور مماثل کا مفہوم شامل ہے۔ اس کی مستقل شخصیت کو تسلیم کیا گیا ہے، انسان نے اسے تسلیم نہیں کیا مگر اللہ نے اسے تسلیم کیا ہے۔ دوسرے یہ کہ انسان کا قریب ترین تعلق ماں باپ اور اپنے بھائیوں سے بڑھ کر فطرتی طور پر اپنے بیوی بچوں سے ہوتا ہے، قرآن اس کی گواہی دیتا ہے۔

Marfat.com

الصالح جمع صالحون (نیک مرد اور عورت)، صالحة جمع صالحات (نیک عورت)

لغوی مفہوم

احمد بن فارس مقاییس اللغة میں لکھتے ہیں کہ صاد، لام اور حاء کے تین حروف بنیادی طور پر فساد کی ضد پر دلالت کرتے ہیں۔ ثلاثی مجرد کا باب صَلَحَ، یصلُحُ بروزن دَخَلَ، یدخُلُ یا صلُحَ، یصلُحُ بروزن کرُمَ یکرُمُ دونوں طرح استعمال ہوتا ہے۔ صلاح اور صلاحِیّة اس کی مصدر ہے۔ اس کے معنی ہیں فساد کا زائل ہونا، درست ہونا۔ صلح الرجل کے معنی ہیں آدمی نیک ہو گیا۔ محاورہ ہے صلحت حال فلان 'فلاں کا حال درست ہو گیا'۔

ثلاثی مزید کے باب اَصْلَحَ کے معنی درست کرنا مثلاً أصلح بینھم اس نے ان کے درمیان صلح کرادی اور صَالَحَ کے معنی ہیں موافق ہونا یا صلح کرانا۔ صُلح، صِلاح یا مُصَالَحَة کا اسم ہے اور مذکر مؤنث دونوں طرح استعمال ہوتا ہے۔ اس کے معنی سلامتی، دوستی اور مصالحت کے ہیں۔ صَالِحْ اسم فاعل ہے اس کے معنی راست باز، حقوق و واجبات کو پورا کرنے والا، ٹھیک ٹھاک اور درست کے ہیں۔ اس کی جمع صالحون ہے جو قرآن حکیم میں مرد اور عورت دونوں کے لیے استعمال ہوئی ہے۔ صالحة صالح کی مونث ہے۔ اس کے ایک معنی بڑی نعمت اور بڑی بھلائی کے ہیں۔ محاورہ میں کہا جاتا ہے: 'أتتنی صالحة من فلان'؛ 'مجھے فلاں کی طرف سے بہت بڑی بھلائی یا نعمت ملی'۔ محاورہ میں قوم صلوح رضامند قوم کو کہا جاتا ہے، مکہ مکرمہ کا ایک نام صلاح بھی ہے۔

Lane نے Lexicon میں لکھا ہے کہ صلاح اور صلاحیّة اسم مصدر ہے اس کا اطلاق ہر اُس آدمی یا چیز پر ہوتا ہے جو اچھی درست، نیک، عادل، راستباز اور دیانت دار ہو اور جو آدمی یا چیز جس حال میں ہونی چاہیے وہ ٹھیک ٹھیک اسی حالت میں ہو۔

زمخشری نے اساس البلاغة میں لکھا ہے کہ صلح کا فعل مجازاً درج ذیل معنوں میں استعمال ہوتا ہے:

۱۔ 'ھذا الأدیم یصلح للنعل'؛ 'یہ چمڑا جوتا بنانے کے لیے موزوں ہے'۔

۲۔ 'فلان لا یصلح بصحبتك'؛ 'فلاں تمہاری صحبت کے قابل نہیں'۔

Marfat.com

۳۔ 'أصلح الیٰ دابتہ': اس نے اپنی سواری کی خبر گیری کی یا اچھا سلوک کیا'۔

المفردات کے مطابق قرآن حکیم میں صلح یا اصلاح (صالح اور اصلاح) عام طور پر اعمال کے بارے میں استعمال ہوا ہے۔ قرآن میں صلاح کبھی فساد کے مقابل میں استعمال ہوا ہے جیسے سورۃ اعراف کی آیت (۵۶:۷) میں 'وَلَا تُفْسِدُوا فِي الْأَرْضِ بَعْدَ إِصْلَاحِهَا'، 'زمین پر اس کی درستی کے بعد فساد مت پھیلاؤ'۔ اور کبھی برائی کے مقابل میں سورۃ توبہ کی آیت (۱۰۲:۹) میں 'خَلَطُوا عَمَلًا صَالِحًا وَآخَرَ سَيِّئًا'، 'انھوں نے ملے جلے عمل کیے کچھ بھلے اور کچھ برے'۔

قرآن حکیم میں اکثر مقامات پر صالحۃ کی جمع صالحات استعمال ہوئی ہے۔ جس کے ایک معنی تو صلاحیت بخش ایسے کاموں کے ہیں جس سے انسان کی صلاحیتیں بیدار ہوتی ہیں اور انسانوں کے معاملات سدھر جاتے ہیں۔ ایسے کام کرنے والی عورتوں کے لیے بھی یہ لفظ استعمال ہوا ہے جیسا کہ سورۃ نساء کی آیت (۳۴:۴) میں۔

الصلح (صلح) کا لفظ خاص کر لوگوں سے باہمی نفرت دور کر کے امن و سلامتی پیدا کرنے کے لیے بولا گیا ہے جیسا کہ سورۃ نساء کی آیت (۱۲۸:۴) 'کہ ان دونوں کے درمیان صلح کرا دے اور صلح بہتر ہوتی ہے'۔ اللہ کے کسی بندے کی اصلاح کرنے کے کبھی تو یہ معنی ہوتے ہیں کہ اللہ نے اسے فطرتاً صالح بنایا ہے جیسے سورۃ اعراف کی آیت (۱۹:۷) 'جب اللہ نے ان دونوں کو صالح اولاد دے دی'۔ یہاں ایک نکتہ قابل غور ہے کہ آیت میں لفظ صالح مذکر مؤنث دونوں کے لیے بولا گیا ہے۔ کبھی وجود کے بعد اس سے خرابی اور نقص دور کرنے کے معنی مراد ہوتے ہیں جیسے سورۃ محمد کی آیت (۲:۴۷) 'ان کی حالت سنواری اور کبھی اصلاح کا حکم صادر ہوتا ہے'۔ جیسے سورۃ انبیاء کی آیت (۹۰:۲۱) 'ہم نے اس کی بیوی کو سازگار بنا دیا'۔ سورۃ یوسف میں صالح کا لفظ اپنے لغوی معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ ارشاد باری ہے: 'اقْتُلُوا يُوسُفَ أَوِ اطْرَحُوهُ أَرْضًا يَخْلُ لَكُمْ وَجْهُ أَبِيكُمْ وَتَكُونُوا مِن بَعْدِهِ قَوْمًا صَالِحِينَ'، 'یوسف کو قتل کر دو یا اسے کسی جگہ پھینک دو، باپ کی توجہ تمہاری طرف ہو جائے گی تو تمہارے حالات درست ہو جائے گے'۔ عربی محاورے میں ہے: 'صلحت حال فلان'، اس کی حالت درست ہو گئی، اس کی پریشانی دور ہو گئی۔

صاحب الفاظ القرآن نے ایک اہم نکتہ بیان کرتے ہوئے کہا ہے: 'ایمان اور عمل صالح لازم و ملزوم ہیں وہ اعمال جن کا سرچشمہ ایمان نہ ہو محض رسم یا عادت کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ ان سے صحیح نتائج مرتب نہیں ہو سکتے اسی طرح وہ ایمان جو اعمال صالح کا محرک نہ ہو محض زبان کے رسمی اقرار کا نام ہے جو اسی طرح بے نتیجہ

Marfat.com

رہتا ہے جس طرح اعمال ساتھ ایمان کے بغیر۔ سورۃ روم (۴۴:۳۰) میں عمل صالح کے مقابلہ میں کفر لا کر اس حقیقت کو واضح کیا گیا ہے کہ اگر اعمال صالحہ ساتھ نہ ہوں تو ایمان ایمان نہیں ہوتا'۔

لفظ صالح اور اس کی جمع صالحون قرآن حکیم میں مرد اور عورت دونوں کے لیے استعمال ہوئے ہیں۔ تین مقامات پر تو صراحت کے ساتھ جیسے سورۃ اعراف کی آیت (۷:۱۸۹ تا ۱۹۰) میں اور سورۃ نور کی آیت (۲۴:۳۲) میں اور سورۃ عنکبوت (۲۹:۹) میں۔ باقی مقامات میں اسلوب تغلیب کے تحت اعمال صالحہ میں مرد اور عورت کا مقام مساوی ہے اور یہی اعمال ان کے درمیان فضیلت کا درجہ طے کرتے ہیں۔

صالحات کون ہیں؟

سورۃ نساء (۴:۳۴) میں حق تعالیٰ کا قول ہے: 'فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ حٰفِظٰتٌ لِّلْغَيْبِ بِمَا حَفِظَ اللّٰهُ'، 'پس نیکوکار باصلاحیت عورتیں، اللہ کی حفاظت کی وجہ سے غیر حاضری میں نگہداشت کرنے والیاں'۔ اس آیت مبارکہ کی واضح تفسیر یہ ہے کہ دین پر استقامت سے قائم راستباز اور نیکوکار عورتیں ہمیشہ اللہ کی اطاعت و فرمانبرداری میں رہنے والیاں ہیں۔ وہ خاوند کی غیر حاضری میں اس چیز کی حفاظت کرنے والیاں ہیں جس کی حفاظت ان پر واجب ہے وہ اس لیے کہ اللہ نے بھی ان کے حقوق کی حفاظت کی ہے، اس کے مقابلہ میں انہیں بھی خاوند کے حقوق کی حفاظت کرنی چاہیے یا اس لیے کہ اللہ نے ان کو صالح اور فرمانبردار بنایا اور انہیں اس حفاظت کی توفیق عطا کی۔ بعض مفسرین نے اس آیت میں قانتات کا ترجمہ اپنے شوہروں کی فرمانبردار کیا ہے اور وہ اس پر اصرار کرتے ہیں۔ یہ ترجمہ نہ تو لغوی طور پر موزوں ہے نہ موقع اور محل کی مناسبت سے۔ قانتات، قنوت سے اسم فاعل ہے یعنی ہمیشہ اطاعت کرنے والیاں، ہمیشہ کی اطاعت صرف حق تعالیٰ کے لیے مخصوص ہے اس کی نافرمانی کر کے کسی کی، خواہ وہ والدین ہوں یا خاوند، اطاعت کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ کیا خاوند کے اللہ کا نافرمان ہونے کی صورت میں بھی عورت اس کی فرمانبردار رہے گی؟ بالکل نہیں! ایسا ترجمہ کرنے والوں کے دل و دماغ پر مردکی مردانگی سوار ہے۔ وہ ہر حال میں بیوی کو اس کا زیردست رکھنا چاہتے ہیں خواہ وہ شیطان ہی کیوں نہ ہو۔ جیسا کہ سید قطب شہید نے کہا ہے کہ قنوت اس اطاعت کو کہتے ہیں جو توجہ، ارادہ، رغبت اور صحبت کے نتیجہ میں ہو نہ کہ زور اور زبردستی کے نتیجہ میں۔ اسی لیے طائعات کی جگہ قانتات استعمال ہوا کیونکہ اس لفظ کا مدلول نفس ہے۔ ایسی اطاعت صرف اس ذات کے لیے مخصوص ہے جو اپنے بندوں کی تربیت کر کے ان کو ناموس فطرت سے ہم آہنگ کرتی ہے۔ ایسی اطاعت شوہر کے لیے ممکن نہیں اس لیے

Marfat.com

قرآن میں قانتین اور قانتات (۳۳:۳۵) کا لفظ ساتھ ساتھ آیا ہے یعنی اللہ کی اطاعت کرنے والے مرد اور عورتیں۔ اس آیت میں پہلے اللہ کے حق یعنی اطاعت کو بیان کیا گیا ہے پھر اس کے بعد خاوند کے حق یعنی اس کی عزت و آبرو اور اس کے مال و جائیداد کی حفاظت۔ یہ حفاظت اس لیے اس پر واجب ہے کیونکہ اللہ نے اپنی کتاب میں ان کے حقوق کی حفاظت کا حکم دے رکھا ہے۔ اللہ نے مردوں کو ان کے ساتھ عدل کرنے کا، دستور کے مطابق ان کو اپنے ساتھ رکھنے کا، ان کو حق مہر ادا کرنے کا اور ان کے نان ونفقہ کو برداشت کرنے کا حکم دے رکھا ہے۔ آیت کی عبارت اس عربی محاورے کے مطابق ہے 'ھذا بذالك'، اس کے بدلہ میں یہ' اللہ کے رسول نے بھی یہ کہہ کر اس کا حکم دیا ہے: استوصوا بالنساء خیرا 'عورتوں کے بارے میں خیر خواہی کی نصیحت کرو'۔ الصالحات جمع ہے اس سے پہلے ال استغراق کا فائدہ دیتا ہے جس کا مطلب ہے کہ ہر عورت صالحہ ہو سکتی ہے اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ اللہ کی فرمانبردار ہو۔ ظاہر ہے جو اللہ کا فرمانبردار ہوگا وہ اللہ کی حدود اور اس کے اوامر کی پاسداری کرے گا، اس کی فطرت میں یہ بات ہوگی کہ وہ امانت میں خیانت نہ کرے۔ اس کے لیے خاوند کے حاضر! غیر حاضر ہونے کی تخصیص نہیں وہ تو ان رازوں اور ان باتوں سے پردہ نہ اُٹھائے گی جو اس کے اور اس کے شوہر کے درمیان ہوتی رہی ہیں۔ نفسِ واحدہ کے دو حصوں کے درمیان سکون و محبت کے لیے ضروری ہے کہ وہ ایک دوسرے کے حقوق کو ادا کریں اور امانت میں خیانت نہ کریں۔ تفسیر طبری میں اس آیت کے ضمن میں ابن عباس اور سدی کا قول نقل کیا گیا ہے کہ فالصالحات کے بعد کوئی چیز محذوف ہے۔ ظاہر کلام کی دلالت کے باعث اس کے ذکر کی ضرورت نہیں پڑی۔ تقدیر کلام یوں ہے: 'الصالحات فاحسنوا الیھن'، 'نیک عورتوں سے حسن سلوک کرو' یا اصلحوا الیھن 'ان کے ساتھ بہتری کا سلوک کرو'۔ باصلاحیت عورتوں کے لیے اللہ کی یہ شہادت کہ ایسی عورتیں ہمیشہ اللہ کی فرمانبردار رہتی ہیں اور حالت غیب میں بھی امانت میں خیانت نہیں کرتیں ایک بہت بڑا اعزاز ہے۔

قرآن حکیم نے مندرجہ ذیل آیات میں صراحت کے ساتھ بیان کیا ہے کہ لفظ صالح مفرد اور جمع مردوں اور عورتوں کے لیے مشترکہ طور پر استعمال ہوتا ہے۔

سورۃ اعراف (۷:۱۸۹) میں حق تعالیٰ کا قول ہے: 'دَّعَوَا اللّٰهَ رَبَّهُمَا لَئِنْ آتَيْتَنَا صَالِحاً لَّنَكُونَنَّ مِنَ الشَّاكِرِينَ'، 'دونوں میاں بیوی نے دعا کی کہ اگر تو نے ہم کو صحیح سالم اولاد (بچہ یا بچی) دے دی تو ہم خوب شکر گزاری کریں گے'۔ کم و بیش سب مفسرین کا اتفاق ہے کہ اس آیت میں صالح سے مراد والدین کی مانند ٹھیک ٹھاک بشر ہے کچھ اور نہیں۔ وہ ماں باپ جنہوں نے دعا مانگی وہ نفس واحدہ

Marfat.com

کے دو حصے تھے اور تذکیر و تانیث کے امتیاز سے بالاتر تھے۔ پھر بھی بعض لوگوں نے اپنی ذہنی اپج اور اپنے معاشرتی ماحول سے مجبور ہو کر یہاں صالح سے مراد لڑکا لیا ہے چنانچہ کشاف نے ایک قول نقل کیا ہے کہ اس سے مراد نر بچہ ہے کیونکہ اس میں صلاحیت اور خوبی ہوتی ہے۔ امام طبری نے اس قول کو حسن کی طرف منسوب کر کے کہا ہے کہ دوسروں کا قول ہے کہ اس سے مراد ایسی اولاد (بچہ یا بچی) ہے جو ان کی طرح صحیح اور سالم ہو۔ صاحب کشاف نے بھی مذکورہ قول نقل کرنے سے پہلے یہی بات کہی ہے۔ لفظ صالح ایک جامع لفظ ہے جس میں صلاح کے سب پہلو پائے جاتے ہیں مثلاً جسمانی اور دماغی اعتبار سے تندرست و توانا، جو نفع بخش انسانی کام کر سکتا ہے۔ نیک بخت، نیک سیرت اور خوبصورت، یہ لڑکا بھی ہو سکتا ہے اور لڑکی بھی۔ ٹھیک ٹھاک بچے یا بچی کی پیدائش پر اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیے نہ کہ جیسا کہ قرآن نے بیان کیا ہے کہ زمانہ جاہلیت کے لوگوں کی طرح بچی کی پیدائش پر غم زدہ ہو کر منہ چھپانا چاہیے۔ ہماری سوسائٹی میں بھی لڑکے کی پیدائش پر جو خاص خوشی منائی جاتی ہے وہ اسی ذہنیت کی غمازی کرتی ہے۔

دوسری آیت جو ظاہر کرتی ہے کہ صالحون کا لفظ مرد اور عورت کے لیے مشترکہ بولا جاتا ہے وہ سورۃ نور (۳۲:۲۴) میں ارشاد باری تعالیٰ ہے: "وَأَنكِحُوا الْأَيَامَىٰ مِنكُمْ وَالصَّالِحِينَ مِنْ عِبَادِكُمْ وَإِمَائِكُمْ"، "تم میں سے جو مرد اور عورت بے نکاح ہوں ان کا نکاح کر دو اور اپنے صالح غلام اور لونڈیوں کا بھی"۔

ماہرِ لغت نضر بن شمیل کا قول ہے کہ عرب ہر اس مذکر کو جس کی مونث نہ ہو اور ہر اس مونث کو جس کا مذکر نہ ہو ایّم کہتے ہیں جس کی جمع ایامی ہے یعنی یہ لفظ تذکیر و تانیث میں مشترک ہے۔ اس لفظ کا اطلاق غیر شادی شدہ یا رنڈوے مرد پر اور غیر شادی شدہ یا مطلقہ یا بیوہ عورت پر ہوتا ہے۔ آیت میں لفظ صالحین میں غلام اور لونڈیاں دونوں شامل ہیں۔ لفظ صالحین سے یہاں مراد یا تو غلاموں اور لونڈیوں (مردوں اور عورتوں) کی جسمانی اور مالی صلاحیت ہے یعنی وہ حقوق زوجیت ادا کر سکتے ہوں۔ اس لحاظ سے صلاح اپنے لغوی معنوں میں استعمال ہوا ہے یا پھر صلاح سے مراد نفس نکاح میں صلاحیت ہے یعنی عمر میں اتنے چھوٹے نہ ہوں کہ نکاح کے قابل ہی نہ ہوں۔ انکحو امر کا صیغہ ہے جس سے بعض فقہا نے دلیل دی ہے کہ نکاح کرنا واجب ہے مگر اکثر و بیشتر فقہا نے اسے مستحب سمجھا ہے۔ لیکن اس بات پر اتفاق ہے کہ اگر بن بیاہی عورت اپنے ولی سے شادی کا مطالبہ کرے تو ولی پر یہ شادی واجب ہو جاتی ہے۔

تیسری آیت جس میں لفظ صالحون مرد اور عورت دونوں کے لیے استعمال ہوا ہے وہ سورۃ

Marfat.com

عنکبوت (۹:۲۹) میں باری تعالیٰ کا ارشاد ہے: "وَالَّذِيْنَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَنُدْخِلَنَّهُمْ فِي الصَّالِحِيْنَ"، "اور جو ایمان لائے اور نیک کام کرتے انہیں ہم ضرور صالحین میں داخل کریں گے"۔ قرآن حکیم میں بے شمار مقامات پر ایمان اور عمل صالح کا بیان ہوا ہے ہر جگہ ایمان لانے اور عمل صالح کرنے والوں میں مرد بھی شامل ہیں اور عورتیں بھی۔ دونوں ان کی بدولت کمال کے اعلیٰ ترین مقام پر پہنچ جاتے ہیں۔ صلاح فساد کی ضد ہے وہ ہر بھلائی کا جامع ہے۔ اس کے مراتب کا سلسلہ نہ ختم ہونے والا ہے، اس میں کمال کا مرتبہ اعلیٰ ترین مرتبہ ہے جس کی تمنا سب انبیاء کرام کرتے رہے۔ سیدنا سلیمان علیہ السلام نے دُعا کی "وَأَدْخِلْنِيْ بِرَحْمَتِكَ فِيْ عِبَادِكَ الصَّالِحِيْنَ" (۱۹:۲۷)۔ سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا "وَإِنَّهُ فِي الْآخِرَةِ لَمِنَ الصَّالِحِيْنَ" (۲:۱۳۰)۔ اکثر انبیاء اللہ سے درخواست کرتے رہے ہیں: "الحقنی بالصالحین"۔ اسی لیے مولانا امین احسن اصلاحی زیر نظر آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں: "صالحین" سے مراد اللہ کے ان خالص و مخلص بندوں کا گروہ ہے جن کو اس دنیا کی مختلف آزمائشوں سے گزر کر اللہ تعالیٰ آخرت کی ابدی شادمانی کیلئے منتخب فرماتا ہے۔ اس گروہ میں ہر مدعی کے لیے جگہ نہیں اس میں صرف وہی لوگ بار پائیں گے جو اپنے آپ کو امتحان کی کسوٹیوں پر کھرا ثابت کریں گے۔

بقا صرف صالحون کو ہے ان کی بقا ان کی ذات کی وجہ سے نہیں بلکہ ان کے باقی رہنے والے اعمال کی وجہ سے ہے۔ عامل کو صرف اپنے اعمال کے باعث دوام حاصل ہے دنیا کے معاملات میں فاعل کی وجہ سے فعل کو بقا ملتی ہے جبکہ آخرت میں فعل کی وجہ سے فاعل کو بقا ملے گی اس حقیقت کا اظہار سورۃ کہف (۱۸:۴۶) اور سورۃ مریم (۱۹:۷۶) میں ہوا ہے۔ جو اللہ پر ایمان لاتا ہے اور عمل صالح کرتا ہے خواہ مرد ہو یا عورت اللہ نے اس سے وعدہ کیا ہے کہ وہ اسے صالحین کے ساتھ جنت میں داخل کرے گا۔ یہ صالحین کون ہیں انبیاء، صدیقین اور شہداء جیسا کہ سورۃ نساء (۴:۶۹) میں اس کا ذکر ہوا ہے۔ ہر ایک کا اپنا درجہ اور مقام ہے۔ صالحین وہ لوگ ہوتے ہیں جن کو اللہ پر ایمان کامل ہوتا ہے، ان کے ایمان میں کوئی خلل واقع نہیں ہوتا۔ ہر وہ شخص جس کی صدیقیت (سچائی) توبہ اور شہادت میں کوئی خلل نہ ہو صالح ہوتا ہے۔ ہر شخص کو چاہیے کہ وہ اپنی صلاح کے لیے دعا گو رہے کیونکہ خلل کا پیدا ہونا اور اس کا دور ہونا انسان کے اختیار میں نہیں۔ یہ اللہ کا خاصہ ہے اسی لیے کوئی نبی ایسا نہیں جس نے صالحین میں شمار ہونے کی دعا نہ کی ہو۔ اس مقام کو وہ بھی حاصل کر سکتے ہیں جو نہ نبی ہوں نہ صدیق ہوں اور نہ شہید، صحیح ایمان اور عمل صالح کے ذریعہ ہر بشر خواہ وہ مرد ہو یا عورت اس عظیم مقام تک پہنچ سکتے ہیں۔

Marfat.com

صالحین اور خلافت ارضی

قرآن کریم نے دو مقامات پر اس موضوع کی طرف صراحت سے اشارہ کیا ہے۔

سورۃ انبیاء (۲۱:۱۰۵) میں باری تعالیٰ کا قول ہے: 'وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُورِ مِن بَعْدِ الذِّكْرِ أَنَّ الْأَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصَّالِحُونَ' ہم زبور میں پند و نصیحت کے بعد لکھ چکے ہیں کہ زمین کے وارث میرے صالح بندے ہوں گے۔ The Book of Pslams (11,37) میں لکھا ہے کہ The righteous shall inherit the land یعنی صالح خواہ مرد ہو یا عورت خلافت ارضی کے مستحق ہوں گے۔ یہ وراثت کس لیے ہے؟ اور اللہ کے صالح بندے کون ہیں؟ اللہ نے آدم کو زمین پر خلافت عطا کی تاکہ وہ اسے آباد کرے، اس کی اصلاح کرے، اس کو ترقی دے اور اس میں موجود قوتوں اور خزانوں کو اپنے کام میں لائے۔ اس کے ظاہری اور باطنی ذرائع پیداوار سے فائدہ حاصل کرے اور اسے کمال تک لے جائے۔ اللہ نے بشر کے لیے ایک طریق کار وضع کیا تاکہ وہ اس کے مطابق زمین پر کام کرے۔ ایک ایسا طریق کار جو ایمان اور عمل صالح پر مبنی ہے۔ اپنے آخری پیغام میں اللہ نے اسے تفصیل سے بتادیا ہے۔ اس پر وگرام پر چل کر انسان درک اسفل میں نہیں گرتا بلکہ اوج کمال کی طرف رواں دواں ہو کر زمین کے ظاہری اور باطنی ذرائع سے فائدہ حاصل کرتا ہے۔ کبھی کبھی فاسق و فاجر اور آمر و جابر بھی زمین پر تسلط جما لیتے ہیں لیکن یہ سب راستے کے تجربات ہیں آخری وراثت صالحین کیلئے ہے جو ایمان اور عمل صالح کے جامع ہیں۔ جس امت میں تاریخ کے کسی بھی دور میں قلبی ایمان اور عملی سرگرمی ایک ساتھ جمع ہو جائے وہ زمین کی وارث بن جاتی ہے۔ مگر جب یہ دو عناصر الگ الگ ہو جائیں تو توازن بگڑ جاتا ہے اور مادی وسائل کے ساتھ غلبہ دوسروں کو حاصل ہو جاتا ہے۔ جب ایمان کا اظہار کرنے والے ان دو عناصر کو نظر انداز کر دیتے ہیں اور جب مومنوں کا دل صحیح عمل صالح سے متزلزل ہو جاتا ہے تو وہ خلافت کے ان فرائض کو سرانجام دینے کے قابل نہیں رہتے جو اللہ نے ان کے سپرد کیے ہیں۔ اہل ایمان کو پہلے مدلول ایمان پر توجہ دینی چاہیے جو کہ عمل صالح اور خلافت کی ذمہ داریوں کی ادائیگی ہے۔ کام کرنے والے مومن ہی صالح ہوتے ہیں جو ثبوت مہیا کرتے ہیں کہ زمین کے وہی وارث ہیں اسی بات کو پیش نظر رکھ کر صاحب تفسیر المراغی نے اس آیت کے ضمن میں لکھا ہے کہ زمین کو وہی بندے آباد کرتے ہیں جو اسے آباد کرنے کے قابل ہوتے ہیں خواہ ان کا تعلق کسی دین اور مذہب سے ہو۔

دوسرے مقام پر سورۃ نور (۲۴:۵۵) میں حق تعالیٰ کا ارشاد ہے: 'وَعَدَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنكُمْ وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْأَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِينَهُمُ الَّذِي ارْتَضَىٰ لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُم مِّن بَعْدِ خَوْفِهِمْ أَمْنًا يَعْبُدُونَنِي لَا

Marfat.com

یُشْرِکُوْنَ بِیْ شَیْئًا" "تم میں سے ان لوگوں کے لیے جو ایمان لائے اور عمل صالح کیے اللہ وعدہ کر چکا ہے کہ انہیں ضرور خلافت ارضی عطا کرے گا اور یقیناً ان کے لیے اس دین کو جما دے گا جسے ان کے لیے وہ پسند کر چکا ہے اور ان کو خوف کے بدلے امن عطا کرے گا۔ وہ میری عبادت کریں گے اور میرے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں گے"۔ اس آیت میں اللہ نے سب کے ساتھ نہیں بلکہ ان لوگوں کے ساتھ جو صحیح ایمان لائے اور جنہوں نے صلاحیت بخش کام کیے تین باتوں کا وعدہ فرمایا ہے:

۱۔ ان کو زمین پر اقتدار کی وراثت ملے گی اپنے ذاتی مفادات کے لئے نہیں بلکہ قانون الٰہی کے مطابق خلق خدا کے مفاد کیلیے۔

۲۔ دین حق کو اللہ نے ان کے لئے منتخب کیا ہے قائم ہوگا جو ظلم و ستم کا خاتمہ کرے گا۔

۳۔ صالحین سختیاں جھیلنے، گھر بار چھوڑنے اور چوری چھپے ارکان دین ادا کرنے کی بجائے امن اور چین کی زندگی بسر کریں گے۔

آیت زیر نظر میں ارض سے مراد جزیرۃ العرب ہے یا اس سے وسیع تر علاقہ۔ اس سلسلہ میں صحیح مسلم نے کتاب الفتن میں ایک روایت بیان کی ہے کہ اللہ کے رسول نے فرمایا: **ان اللہ زوی لی الارض فرایت مشارقھا و مغاربھا وان امتی سیبلغ ملکھا ما زُوی لی منھا** "بے شک اللہ تعالیٰ نے زمین کو میرے لیے سکیڑ دیا بس میں نے اس کے مشرق و مغرب دیکھے عنقریب میری امت کی حکومت وہاں تک پہنچے گی جہاں تک زمین میرے لیے سکیڑ دی گئی"۔ یہ پیشین گوئی ایک دفعہ تو اسلام کے ابتدائی عہد میں پوری ہو چکی ہے۔ مسلمانوں کو مشرقی اور مغربی حصوں پر غلبہ حاصل ہوا۔ پسندیدہ دین اسلام کو عروج حاصل ہوا، مسلمانوں کا خوف امن میں تبدیل ہو گیا۔ لیکن کیا آئندہ بھی یہ غلبہ حاصل ہو سکتا ہے؟ قرآن کے الفاظ بتاتے ہیں کہ ایسا ہو سکتا ہے مگر شرط ایمان اور عمل صالح ہے۔

صحیح ایمان کی تعریف میں کسی قسم کا کوئی اختلاف نہیں، اختلاف صرف عمل صالح کی تعریف میں ہے۔ روایتی حلقے یہ سمجھتے ہیں کہ عمل صالح عبادات اور ظاہری وضع قطع تک محدود ہے اگر سب لوگ صحیح طریقے سے عبادت ادا کرتے رہیں اور ظاہری وضع قطع ان کے تصور جیسی بنالیں تو یہ وعدہ پھر پورا ہو سکتا ہے۔ چنانچہ اس وقت کی اکثر و بیشتر دینی جماعتیں عبادت کی کثرت، سفید، کالی اور سبز پگڑیوں کو اور خاص ظاہری وضع کو اس وعدہ کے پورا ہونے کے لئے لازمی قرار دیتی ہیں۔

عبادات قانون الٰہی کا اہم جزو ہیں اس سے گریز نہیں لیکن یہ ایک مقصد تک پہنچنے کا ذریعہ ہے مقصود بالذات نہیں۔ وہ مقصد کیا ہے؟ قرآن کے الفاظ میں تقویٰ ہے۔ عبادت کا یہی مقصد ہے۔ یہ تقویٰ ان عبادات کے ذریعہ ہی حاصل ہو سکتا ہے۔ تقویٰ کیا ہے حضرت ابی کعب کے الفاظ ہیں زندگی جو پر خار ہے اس کو احتیاط سے گزارنے کا ڈھنگ۔ چنانچہ اعمال صالحہ سے مراد وہ صلاحیت بخش کام ہیں جو زندگی

Marfat.com

کو عصری تقاضوں کے مطابق قانون الٰہی سے ہم آہنگ کر کے بسر کرنے میں مدد کریں اور معاشرے کو خوبصورت بنائیں۔ یہ اعمال اگر صحیح ایمان اور عملی سرگرمیوں کے بغیر سرانجام دیئے جائیں گے تو ان کے میکانکی عمل سے صحیح نتائج برآمد نہیں ہوں گے۔ صحیح نتائج مرتب کرنے کے لیے حصول علم وفن اعمال صالحہ کا جز ولاینفک ہے اس کے حصول کے بغیر وعدہ الٰہی کے پورا ہونے کا انتظار کرنا عبث ہے اگر ہم اسلام کی ابتدائی تاریخ کا بغور مطالعہ کریں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے علوم وفن میں اس قدر ترقی کی کہ تہذیب وتمدن پر دین اسلام کی چھاپ پڑ گئی۔ آج بھی ہم ابن خلدون اور ابن سینا، جابر بن حیان، زہراوی، ادریسی اور اصطخری جیسے علماء کا نام فخر سے لیتے ہیں اور جب بھی کوئی دریافت ہوتی ہے تو اسے ان علماء کی طرف منسوب کرتے ہیں یا قرآن کی کسی آیت کا حوالہ دیتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ کسی مسلمان صاحب علم نے اس کو دریافت کیوں نہ کیا؟ علم کو مذہبی حدود میں محدود کرنا سراسر زیادتی ہے۔ ہمارے وہ مذہبی پیشواء جو عصری علوم سے بالکل ناآشنا ہیں اور دینی علوم میں بھی وہ تقلید سے آگے نہیں بڑھتے ان پر علماء کا لیبل چسپاں کیا جاتا ہے۔ اس حالت میں اللہ کے وعدہ کی پورا ہونے کی توقع کرنا، احمقوں کی جنت میں بسنا ہے۔ علم کے بارے میں ہمارا نقطۂ نظر کتاب وسنت سے صریحاً متصادم ہے۔ **استخلاف فی الارض** سے مراد تخریب وفساد کی بجائے تعمیر واصلاح، ظلم وجبر کی بجائے عدل وانصاف اور نوع انسانی کو نیچے گرانے کی بجائے اوپر اٹھانے کی قوت ہے۔ ان سب کا سرچشمہ صرف اور صرف علم ہے جو وقتی تقاضوں سے ہم آہنگ ہو۔

اہل ایمان اور صالح لوگ خواہ مرد ہوں یا عورت

سورۃ البیّنۃ (۹۸:۷) میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ أُولَٰئِكَ هُمْ خَيْرُ الْبَرِيَّةِ**۔ بے شک جو لوگ ایمان لائے اور جنہوں نے صالح عمل کئے یہ لوگ بہترین مخلوق ہیں۔ ایمانداروں اور صالحین میں مرد اور عورت بھی شامل ہیں' اللہ نے ان سب کو بہترین قرار دیا ہے اس سے ان تمام تصورات کی نفی ہو جاتی ہے جو عورتوں کے متعلق لوگوں نے گھڑ رکھے ہیں یعنی عورت نجس ہے، عقل کی ناقص ہے اور اس کی صلاحیتیں مرد کی نسبت کم ہیں اللہ نے دونوں کو مساویانہ طور پر ایمان اور عمل صالح کی وجہ سے بہترین قرار دیا ہے۔

مختصر یہ ہے کہ حقوق وواجبات پورا کرنے والے ایسے صلاحیت بخش کام کرنے والے جن سے معاشرہ سنور جائے اور امن کا گہوارہ بن جائے راستباز اور تندرست وتوانا مردوں اور عورتوں پر لفظ صالحین کا اطلاق ہوتا ہے اور وجہ فضیلت ایمان اور عمل صالح ہے نہ کہ مرد اور عورت ہونا۔ استخلاف فی الارض کے حق دار صالح مرد اور صالح خواتین دونوں ہیں۔

Marfat.com

طائفہ (جماعت۔گروہ)

لغوی مفہوم

طائفہ اسم فاعل مؤنث ہے اس کی مصدر طوف یا طواف ہے جس کے معنی گھومنے اور کسی چیز کے گرد چکر لگانے کے ہیں۔ چنانچہ زجاج کا قول ہے کہ لغت میں طائفہ اصل میں جماعت یا گروہ کیلئے استعمال ہوتا ہے کیونکہ ایک جماعت ہی کسی چیز کا احاطہ کرسکتی ہے اسی لئے اس کو ایک کے لیے بولنا بھی جائز ہے۔ فراء نے ابن عباس کی سند سے روایت کی ہے کہ طائفہ سے مراد ایک یا ایک سے زیادہ (القاموس المحیط کے مطابق ایک سے ہزار تک) لی جاسکتی ہے۔ ایک کو طائفہ کہنے کا سبب یہ ہے کہ جب وہ ایک مذہب یا رائے اختیار کرتا ہے تو وہ دل ہی دل میں اس کے گرد گھومتا رہتا ہے اور ہر جانب سے اس کا دفاع کرتا ہے۔ جب یہ کہا جائے الطائفہ من الناس تو اس سے مراد لوگوں کی وہ جماعت ہے جو ایک رائے اور ایک مذہب رکھتی ہو اور اس وجہ سے دوسروں سے ممتاز ہو۔

طائفہ تعداد میں فرقہ سے چھوٹا ہوتا ہے جیسا کہ آیت مبارکہ (التوبۃ ۹:۱۲۲) میں ہے: فَلَوْلَا نَفَرَ مِن كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَآئِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوا فِي الدِّينِ 'سو ایسا کیوں نہ ہو کہ ان کی ہر بڑی جماعت میں سے ایک چھوٹی جماعت جائے تاکہ وہ دین کی سمجھ بوجھ حاصل کرے'۔ اگر طائفہ سے مراد لوگوں کی جماعت لی جائے تو اس جماعت کی تعداد کم از کم تین ہوگی جیسا کہ جمع کے بارے میں جمہور کا قول ہے۔ اس صورت میں طائفہ جماعۃ کی صفت ہوگی اور اگر طائفہ سے مراد ایک آدمی لیا جائے تو اس صورت میں یہ نفس کی صفت ہوگی۔ (نفسٌ طائفةٌ) اگر یہ کہا جائے طائفة من الشیء تو مطلب ہوگا چیز کا ٹکڑا۔ جیسے طائفة من اللیل رات کا حصہ یا طائفة من العمر عمر کا حصہ یا طائفة من المال مال کا حصہ۔ طائفہ کی جمع طائفات اور طوائف ہے۔ مفردات میں ہے کہ اگر طائفہ جمع کے معنی میں ہوگا تو اس کا واحد طائف ہوگا اور اگر یہ واحد کے معنی میں ہوگا تو جمع واحد کے معنی میں استعمال ہوگی۔ جیسے کہا جاتا ہے فلان خرج الی مکة علی الجمال فلاں اونٹوں پر سوار ہو کر مکہ کی طرف نکلا حالانکہ سوار تو وہ ایک جمل (اونٹ) پر ہے۔

سورۃ نور کی آیت (۲:۲۴) کے ضمن میں تعداد کے بارے میں مفسرین اور فقہا کا باہمی اختلاف ہے کہ عرب ایک یا ایک سے زیادہ کو طائفہ کہتے ہیں اور وہ طائفہ کو کسی خاص تعداد میں محدود نہیں کرتے

Marfat.com

۔اللہ کا ارشاد ہے: ولیشہد عذابھا طائفہ ان دونوں کی سزا کے وقت اہل ایمان کی ایک جماعت موجود ہونی چاہیے۔

۱۔ مجاہد کا قول ہے کہ طائفہ سے مراد کم از کم ایک سے لے کر ایک ہزار تک ہے اور انہی کا قول ہے کہ اللہ کے قول وَإِن طَائِفَتَانِ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ اقْتَتَلُوا فَأَصْلِحُوا بَيْنَهُمَا (الحجرات ۹:۴۹) اگر مسلمانوں کے دو طائفے آپس میں لڑ پڑیں تو ان کے درمیان صلح کرادو، میں طائفتان سے مراد دو آدمی ہیں۔ امام راغب نے بھی دو آدمی ہی مراد لئے ہیں۔ امام طبری نے آیت زیر نظر کی تفسیر میں سدی، حسن، قتادہ اور ابن جریج کے حوالہ سے دو آدمیوں کی روایت کو بیان کیا ہے۔ یہ آیت مسلمانوں کی عام ہدایت کے لئے ہے جیسا کہ الفاظ سے ظاہر ہے اور کسی خاص واقعہ سے اس کا کوئی تعلق دکھائی نہیں دیتا۔

اس کے علاوہ سورۃ توبہ (۹:۶۶) میں اللہ کا ارشاد ہے: 'إِن نَّعْفُ عَن طَائِفَةٍ مِّنكُمْ نُعَذِّبْ طَائِفَةً' اگر ہم تم میں سے کچھ لوگوں سے درگزر بھی کرلیں تو کچھ لوگوں کو ان کے جرم کی سزا دیں گے، میں امام طبری اور صاحب روح المعانی کے نزدیک طائفہ سے مراد ایک شخص بنوسلمہ کا حلیف مخشی بن حمیر الاشجعی ہے۔ امام احمد کا بھی یہی قول ہے کہ سورۃ نور میں طائفہ سے مراد ایک آدمی ہے اور تابعی حماد اور ابراہیم کا بھی یہی قول ہے۔

۲۔ مراد دو یا دو سے زیادہ ہے۔ عطاء، عکرمہ اور اسحاق بن راہویہ کا یہی قول ہے۔ اللہ کے قول (التوبہ ۹:۱۲۲) فَلَوْلَا نَفَرَ مِن كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَائِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوا فِي الدِّينِ 'سوایسا کیوں نہ ہو کہ ان کی ہر بڑی جماعت میں سے ایک ایک چھوٹی جماعت کے کچھ لوگ جائیں تاکہ وہ دین کی سوجھ بوجھ حاصل کریں'۔ اس آیت میں طائفۃ کا اطلاق بطور جماعت تین پر ہوتا ہے۔ تینوں میں سے خارج ایک یا دو شخص ہوں گے۔ احتیاط کا تقاضا ہے کہ زیادہ یعنی دو مراد لئے جائیں۔ امام مالک کا مشہور قول بھی یہی ہے۔

۳۔ مراد تین یا تین سے زیادہ ہیں۔ زہری اور قتادہ کا یہی قول ہے ان کی یہ سزا حلقہ بنا کر دی جائے گی اس حلقہ کے گرد گھیرا ڈالنے والی جماعت کو طائفہ کہا گیا ہے اس صورت میں کم از کم تین کا ہونا لازمی ہے۔

۴۔ مراد چار یا چار سے زیادہ ہے۔ ابن عباس اور ابن زید کا یہی قول ہے ان کی دلیل یہ ہے کہ اتنی ہی تعداد ہونی چاہیے جتنی زنا کے ثبوت کے لئے ضروری ہے۔ امام مالک کا ایک قول اور

Marfat.com

امام شافعی کا یہی قول ہے۔صاحب کشاف کا کہنا ہے کہ ابن عباس کا قول افضل ہے کیونکہ چار کی تعداد سے حد قائم ہو جاتی ہے، اس لئے یہ تعداد لازمی ہے کیونکہ اس سے سزا کی تشہیر بھی ہو جاتی ہے، ایک یا دو سے تشہیر تو نہیں ہو سکتی۔امام طبری لکھتے ہیں کہ اس بات کو مستحب سمجھتا ہوں کہ کم از کم چار ہونے چاہئیں یعنی اتنے جن کی شہادت زنا کے بارے میں لازمی ہے کیونکہ اس پر تو سب کا اتفاق ہے کہ چار کی تعداد سے حد قائم ہو جاتی ہے۔اختلاف تو اس سے کم تعداد میں ہے۔

بخاری کی شرح میں ہے کہ امام شافعیؒ نے قرآن کے مختلف مقامات پر سیاق سباق اور موقع و محل کی مناسبت سے طائفہ کے مختلف معانی لئے ہیں مثلاً سورۃ توبہ (۱۲۲:۹) فَلَوْلَا نَفَرَ مِن كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَآئِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوا فِي الدِّينِ میں طائفہ سے مراد ایک یا ایک سے زیادہ ہیں کیونکہ یہاں ایک ہی سے انذار کا کام لیا جا سکتا ہے وہ واپس جا کر اپنی قوم کو ڈرا سکتا ہے۔

سورۃ نساء کی آیت (۱۰۲:۴) فَلْتَقُمْ طَآئِفَةٌ مِّنْهُم مَّعَكَ وَلْيَأْخُذُوٓا أَسْلِحَتَهُمْ 'ان کی ایک جماعت تمہارے ساتھ اپنے ہتھیار لئے کھڑی ہو۔یہاں طائفہ سے مراد تین ہیں کیونکہ لیاخذو اسلحتھم میں جمع کی ضمیر ہے اس لئے یہ کم از کم تین ہونے چاہئیں اور سورۃ نور میں طائفہ سے مراد چار ہیں کیونکہ حد چار ہی سے قائم ہوگی۔ہر مقام پر انہوں نے طائفہ کے معنی قرآن کو مدنظر رکھ کر متعین کئے ہیں۔

طائفہ کا لفظ لوگوں کی ایسی جماعت کے بارے میں بولا گیا ہے جو اپنی رائے اور مذہب کی بنیاد پر ہم آہنگ ہو اس میں مردوں کے ساتھ ساتھ عورتیں بھی شامل ہیں۔

مندرجہ ذیل آیات میں اسلوب تغلیب کی بنیاد پر عورتیں مردوں کے ساتھ طائفہ کے مفہوم میں برابر کی شریک ہیں۔

سورۃ آل عمران (۷۲،۶۹:۳)، سورۃ نساء (۱۱۳:۴)، سورۃ انعام (۱۵۶:۶)، سورۃ اعراف (۸۷:۷)، سورۃ نور (۲:۲۴)، سورۃ صف (۱۴:۶۱) اور سورۃ مزمل (۲۰:۷۳) جبکہ مندرجہ ذیل آیات میں اس بات کی صراحت ہے کہ عورتیں اور مرد لفظ طائفہ کے مفہوم

Marfat.com

میں شامل ہیں۔

سورۃ توبہ (۹:۶۶) میں یہ ارشاد کرنے کے بعد ایک جماعت (طائفہ) کو معاف کرنے کے بعد ایک جماعت کو جرم کی سزا دی جائے گی۔ اگلی آیت نمبر ۶۷ اور ۷۱ میں منافق مرد اور منافق عورتوں، مومن مردوں اور مومن عورتوں کا ذکر واضح کرتا ہے کہ سزا و جزا میں مرد اور عورت برابر کے شریک ہیں۔

سورۃ قصص (۲۸:۴) میں ارشاد الٰہی ہے: اِنَّ فِرْعَوْنَ عَلَا فِی الْاَرْضِ وَجَعَلَ اَهْلَهَا شِيَعًا يَّسْتَضْعِفُ طَآئِفَةً مِّنْهُمْ يُذَبِّحُ اَبْنَآءَهُمْ وَيَسْتَحْيٖ نِسَآءَهُمْ اِنَّهٗ كَانَ مِنَ الْمُفْسِدِيْنَ۔

'یقیناً فرعون نے زمین میں سرکشی کر رکھی تھی اور وہاں کے لوگوں کو گروہ گروہ بنا رکھا تھا اور ان میں سے ایک جماعت کو کمزور کر رکھا تھا ان کے لڑکوں کو تو ذبح کروا ڈالتا اور ان کی لڑکیوں کو زندہ چھوڑ دیتا۔ بے شک وہ مفسدوں میں سے تھا'۔

پہلی بات تو اس آیت سے یہ واضح ہوتی ہے کہ عورتیں لفظ طائفہ کے مفہوم میں شامل ہیں۔ دوسری اہم بات جس کی طرف اشارہ کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ جو حاکم لوگوں کو گروہوں میں تقسیم کر کے مردوں اور عورتوں میں امتیاز کرتے ہیں وہ فسادی ہوتے ہیں۔ معاشرے میں اس قسم کی تفریق اور تقسیم مہلک ہے۔ مرد اور عورت کی تمیز سے معاشرہ کمزور ہو جاتا ہے۔ فرعون مردوں کو اس لئے قتل کرتا تھا کہ وہ اس کے لئے خطرہ نہ بن جائیں اور عورتوں کو اس لئے زندہ چھوڑتا تھا کہ اہل مصر ان کے ساتھ عیش و عشرت کریں۔ حاکم کا فرض ہے کہ وہ معاشرے کی اصلاح کرے اور عورتوں اور مردوں میں تمیز کر کے اسے کمزور نہ بنائے۔ جس معاشرہ میں نفس واحدہ کے دو حصے برابر کے شریک نہ ہوں وہ کبھی ترقی نہیں کر سکتا۔ عورت کو صرف شہوت کی تسکین کا آلہ سمجھنا فرعونی سوچ ہے۔ وہ معاشرے کی دینی، اجتماعی، اقتصادی اور تعلیمی سرگرمیوں میں برابر کی شریک ہے۔ وہ صاحب فکر ہے، صاحب عقل ہے اور ایک مستقل شخصیت کی مالک ہے بالکل اسی طرح جس طرح مرد ہے۔ معاشرہ دونوں کے شانہ بشانہ شریک ہونے سے سنورتا ہے۔

Marfat.com

عبد (بندہ، غلام)

لغوی مفہوم

عَبَدَ یَعْبُدُ (ن) ذلیل ہونا، مطیع ہونا، انکساری کرنا، اس کی مصدر زیادہ تر عبادۃ ہے۔ بقول راغب عبادت کی دو قسمیں ہیں:

۱۔ تسخیری عبادت۔ ۲۔ اختیاری عبادت۔

اختیاری عبادت کا تعلق صاحبان عقل کے ساتھ ہے۔ ان کے علاوہ دوسری مخلوق اس قسم کی عبادت کی مکلف نہیں۔ بلکہ وہ تسخیری طور پر اللہ کے آگے سربسجود ہے۔ اعبدو اربکم (البقرۃ ۲:۲۱) اپنے رب کی عبادت کرو میں اسی قسم کی عبادت کا حکم ہے۔

عَبْد کی جمع عباد ہے اس کے معنی وہ بندہ ہے جسے اللہ نے پیدا کیا۔ وہ اللہ کے لئے خاص ہے اور اسی کا قصد کرتا ہے۔ سورۃ مریم کی آیت (۹۳:۱۹) میں انہی معنوں کی طرف اشارہ ہے۔ ارشاد ربانی ہے: اِنْ كُلُّ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اِلَّآ اٰتِی الرَّحْمٰنِ عَبْدًا ' آسمان و زمین میں جو بھی ہیں سب کے سب اللہ کے بندے بن کر ہی آنے والے ہیں۔ وہ عبادت اور خدمت کی بدولت عبد کہلاتا ہے۔ بندوں کی ایک قسم تو وہ ہے جو اللہ کے مخلص بندے ہوتے ہیں جیسا کہ اللہ کا ارشاد ہے: 'اِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِيْنَ ' (الحجر ۱۵: ۴۰) سوائے تیرے ان بندوں کے جو مخلص ہیں۔ اللہ نے ان بندوں کو قرآن کے متعدد مقامات پر مختلف صفات سے نوازا ہے۔ کہیں ان کو صالحین کہا ہے اور کہیں اپنی ذات کی طرف منسوب کرتے ہوئے عبادنا اور عباد الرحمٰن کہا ہے یعنی ایسے بندے جو اپنی تمام قوتوں اور صلاحیتوں کو احکام الٰہی کی پابندی میں صرف کرتے ہیں۔ وہ پابندیاں جو وہ اپنے اوپر بلند و بالا مقاصد کے حصول کے لیے اپنے اختیار اور اپنی مرضی سے عائد کرتے ہیں نہ کہ کسی خارجی دباؤ کے نتیجہ میں۔ بندوں کی دوسری قسم وہ بندے ہیں جو دنیا کے مال و متاع کے غلام بن کر ہر وقت اس کی پرستش میں لگے رہتے ہیں۔ جیسے بخاری اور ابن ماجہ نے نبی ﷺ سے روایت کی ہے: 'تَعِسَ عبدالدینار، تَعِسَ عبدالدرھم ' دینار اور درہم کے بندے برباد ہوں۔

عبد کا لفظ عابد (عبادت گزار) سے زیادہ بلیغ ہے کیونکہ ہر عابد اللہ کا مخلص بندہ نہیں ہوسکتا۔ عبد کے لفظ کا اطلاق جس طرح مذکر کے لئے ہوتا ہے بالکل اسی طرح مؤنث کے لئے بھی ہوتا ہے۔ لہٰذا قرآن کے وہ مقامات جہاں جہاں اللہ کے مخلص اور منتخب بندوں کا ذکر ہے وہاں اس میں

Marfat.com

عورتیں بھی شامل ہیں۔

عَبُدَ یَعبُدُ (ک) غلام ہونا، اس کی مصدر عبوۃ اور عبودیّۃ ہے یہ حرّ (آزاد) کی ضد ہے جیسا کہ قرآن میں ہے: 'اَلْحُرُّ بِالْحُرِّ وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ' (البقرۃ ۲:۱۷۸) آزاد کے بدلے آزاد اور غلام کے بدلے غلام۔ اس کی مؤنث اَمۃ (لونڈی) ہے۔ غلام بالکل بے اختیار ہوتا ہے جیسا کہ ارشاد ربانی ہے: 'عَبْدًا مَّمْلُوكًا لَّا يَقْدِرُ عَلَى شَيْءٍ' (النحل ۱۶:۷۵) 'ایک غلام ہے دوسرے کی ملکیت جو کسی بات کا اختیار نہیں رکھتا'۔ یہی وجہ ہے کہ امام راغب عبادت و عبودیت کے فرق کو واضح کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ عبادت کا لفظ انتہائی درجہ کی ذلت و انکساری لیے بولا جاتا ہے۔ یہ ذلت اختیاری ہوتی ہے اس لیے معنوی اعتبار سے عبادت کا لفظ عبودیت سے زیادہ بلیغ ہے۔ القاموس المحیط میں ہے عبد ایک خوشبودار پودا ہے اور اونٹ اسے پسند کرتے ہیں۔ اس کے کھانے سے پیاس تو لگتی ہے مگر جانور موٹا ہوتا ہے اور اس کا دودھ بڑھ جاتا ہے۔ گویا کہ عبد میں عبادت کی جس قدر پیاس بڑھے گی اتنی ہی اس کے لئے مفید ہوگی۔

عَبِدَ یعبد (س) غضبناک ہونا، ناک چڑھانا، نفرت کرنا، جدا نہ ہونا، اس کی مصدر عبد اور عَبَدَۃ ہے ارشاد باری تعالیٰ ہے: 'إِن كَانَ لِلرَّحْمَٰنِ وَلَدٌ فَأَنَا أَوَّلُ الْعَابِدِينَ' (الزخرف ۴۳:۸۱) اور اگر اللہ کا کوئی بچہ ہوتا تو میں سب سے پہلے بیزاری کا اظہار کرتا، ابن قتیبہ نے القرطین (۲:۳۵) میں عابدین کے معنی مستنکفین یعنی نفرت کرنے والے لکھا ہے۔

غلام کے معنوں میں عبد کی جمع عبید ہے اگر اس جمع کی نسبت اللہ کی طرف ہو تو یہ لفظ عباد سے زیادہ عام ہوتا ہے۔ اللہ کا ارشاد ہے: 'وَمَا أَنَا بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيدِ' (ق ۵۰:۲۹) 'میں بندوں پر ظلم نہیں کیا کرتا'۔ لفظ عبید میں اس بات کا اشارہ ہے کہ اللہ کسی بندے پر ذرہ برابر بھی ظلم نہیں کرتا، خواہ وہ اللہ کی پرستش کرے یا کسی اور کی۔ لفظ عبید، سورۃ آل عمران (۳:۱۸۲)، سورۃ انفال (۸:۵۱)، سورۃ حج (۲۲:۱۰)، سورۃ فصلت (۴۱:۴۶) اور سورۃ ق (۵۰:۲۹) میں بھی وارد ہوا ہے۔

عَبَّدَ یُعَبِّدُ تعبید ثلاثی مزید کا باب ہے۔ اس کا مطلب ہے کسی کو محکوم بنانا، قرآن کریم میں اللہ کا فرمان ہے: 'أَنْ عَبَّدتَّ بَنِي إِسْرَائِيلَ' تو نے بنی اسرائیل کو محکوم بنا رکھا ہے (۲۶:۲۲)۔ طریق معبّد سے مراد ہموار راستہ ہے جس پر لوگ آسانی سے چل سکیں۔ بعیر معبّد ایسا اونٹ جس پر تارکول مل کر اسے ذلیل کر دیا گیا ہو۔

قرآن حکیم میں عبد اور عباد کا لفظ جہاں جہاں وارد ہوا ہے وہاں اس میں مرد اور عورت دونوں

Marfat.com

شامل ہیں، ہاں اگر کوئی قرینہ موجود ہو تو اس کے مطابق ترجمہ کیا جائے گا۔ مثلاً درج ذیل مقامات پر لفظ عبد مرد اور عورت دونوں کے لیے استعمال ہوا ہے۔ سورۃ مریم (۱۹:۹۳)، سبا (۹:۳۴)، زمر (۳۶:۳۹)، ق (۸:۵۰)۔

درج ذیل مقامات پر عباد کا لفظ مرد اور عورت کے لیے مشترکہ طور پر استعمال ہوا ہے:

البقرۃ (۱۸۲:۲)، آل عمران (۱۸۲،۷۹:۳)، مائدہ (۱۱۸:۵)، انعام (۸۸،۶۱،۱۸:۶)، أعراف (۱۲۸،۳۲:۷)، توبہ (۱۰۴:۹)، یونس (۱۰۷:۱۰)، مریم (۶۳:۱۹)، فرقان (۶۳:۲۵)، فاطر (۲۸:۳۵)، یٰسین (۳۰:۳۶)، صافات (۱۶۹،۱۶۰،۱۲۸،۷۴:۳۷)، زمر (۱۷،۱۶،۱۰:۳۹)، غافر (۴۸،۳۱:۴۰)، زخرف (۶۸:۴۳)، دخان (۱۸:۴۴) اور نوح (۲۷:۷۱) اس آیت میں صراحت کے ساتھ عورت لفظ عباد میں داخل ہے کیونکہ 'لا یلدوا' (نہیں جنم دیں گے) کا قرینہ موجود ہے۔ انسان (۶:۷۶) فجر (۲۹:۸۹)۔

قرآن حکیم میں لفظ عبد یا عباد کو اللہ تعالیٰ نے اضافت تشریف کے ساتھ اپنی ذات یا صفات کی طرف منسوب کیا ہے مثلاً عبدی، عبادی، عبادنا کہا ہے یا اس کے ساتھ مخلص کی صفت لگائی ہے۔ وہاں ان بندوں سے مراد اہل فضل، اہل علم اور اہل ایمان ہیں۔ یہ لفظ انھی اصحاب فضیلت کے ساتھ مخصوص ہے، مثلاً سورۃ فرقان (۶۳:۲۵) میں رحمان کے بندوں کی صفات گنوائی گئی ہیں کہ وہ زمین پر فروتنی کے ساتھ چلتے ہیں اور جب جاہل ان سے مخاطب ہوتے ہیں تو وہ بحث نہیں کرتے بلکہ گریز کا راستہ اختیار کرتے ہیں۔ وہ اپنے رب کے روبرو سجود و قیام کی حالت میں راتیں گزارتے ہیں۔ وہ دعا گو رہتے ہیں کہ ہم سے جہنم کا عذاب پرے رکھ کیونکہ وہ عذاب چپک جانے والا ہے۔ وہ خرچ کرتے وقت نہ تو اسراف کرتے ہیں اور نہ بخل سے کام لیتے ہیں بلکہ درمیان کا راستہ اختیار کرتے ہیں۔ وہ اللہ کے علاوہ کسی اور کو نہیں پکارتے اور کسی ایسے شخص کو قتل نہیں کرتے جس کا قتل کرنا اللہ نے بجز حق کے حرام قرار دیا ہے۔ وہ زنا نہیں کرتے جو ایسا کام کرتا ہے وہ گناہ گار ہوتا ہے۔ سوائے ان کے جو توبہ کر لیں اور ایمان لائیں اور عمل صالح کریں۔ ایسے لوگوں کے گناہوں کو اللہ نیکیوں میں بدل دیتا ہے۔ وہ لوگ جھوٹی گواہی نہیں دیتے اور کسی بیہودہ چیز کے پاس سے شریفوں کی طرح گزر جاتے ہیں اور جب انہیں رب کی آیات سنائی جاتی ہیں تو وہ بہروں اور اندھوں کی طرح ان سے اعراض نہیں کرتے اور یہ دعا کرتے ہیں کہ اے ہمارے رب تو ہمیں ہمارے ساتھیوں اور اولاد سے آنکھوں کی ٹھنڈک عطا فرما۔ یہاں ازواج کا ترجمہ بیویاں قطعی غلط ہے کیونکہ یہ سب عباد الرحمان کی صفات ہیں اور یہ صرف مرد نہیں

Marfat.com

بلکہ عورتیں بھی ہیں۔ جب عورت یہ دعا مانگے گی تو کیا یہ کہے گی کہ ہمیں اپنی بیویوں کی طرف سے' بلکہ وہ کہے گی کہ ہمیں اپنے شوہروں کی طرف سے آنکھوں کی ٹھنڈک عطا کر۔ ان لوگوں کو صبر واستقامت کے بدلے جنت میں بالاخانے دیئے جائیں گے۔ جس طرح عورتیں عبادالرحمان میں شامل ہیں بالکل اسی طرح وہ ان صفات میں مردوں کے شانہ بشانہ شریک ہیں۔

اللہ نے عبودیت کو ان بندوں کے ساتھ خاص کیا ہے جو ہمہ وقت عبودیت میں مشغول رہتے ہیں۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ یہ صفت انسان کی اعلیٰ ترین صفت ہے۔ رحمان کی طرف بندوں کی نسبت یہ بتانے کے لیے ہے کہ ان پر اللہ کی خاص رحمت ہے اور دوسروں پر ان کو فضیلت حاصل ہے کیونکہ وہ اللہ کی رحمت کے امیدوار رہتے ہیں۔

عبادت کیا ہے؟ ان کاموں کا کرنا جو اللہ کو پسند ہوں اور عبودیت کیا ہے؟ ان کاموں پر راضی ہونا جو اللہ کرتا ہے۔ بعض اہلِ علم نے عبادت اور عبودیت میں یہ فرق کیا ہے کہ عبادت نام ہے اوامر کو بجالانے اور نواہی سے رکنے کا، اس امید پر کہ اس کے نتیجہ میں اجر ملے گا اور نجات حاصل ہوگی اور عبودیت نام ہے اوامر کو بجالانا اور نواہی سے رکنا محض اس لیے کہ اللہ نے ان کو نعمتوں سے نوازا ہے اور اس سے اوپر عبودۃ کا مقام ہے اور اس سے مراد ہے اوامر کو بجالانا اور نواہی سے رُوکنا محض اس لیے کہ یہ اللہ کا حکم ہے اور وہ ذات اس بات کی سزاوار ہے کہ اس کی تعظیم کی جائے اور اس کا کہا مانا جائے۔

جن آیات مبارکہ میں لفظ عباد استعمال ہوا ہے وہ بے شمار ہیں۔ اپنے موضوع کے پیش نظر ان کو درج ذیل چند گروپوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔

علم اور عباد

آیت مبارکہ کا حوالہ دینے سے پہلے میں یہ بتا تا چلوں کہ جس طرح عباد میں عورتیں مردوں کے ساتھ برابر کی شریک ہیں، بالکل اسی طرح علم میں بھی وہ مردوں کے ساتھ برابر کی شریک ہیں کیونکہ علم کا حصول مرد اور عورت دونوں پر فرض ہے، اس میں قطعی کوئی تخصیص نہیں کہ علم کی کچھ شاخیں مردوں کے لیے ہوں اور کچھ عورتوں کے لیے۔ یہ من گھڑت تصور ہے اس کا شریعت کے ساتھ کوئی واسطہ نہیں۔

سورۃ فاطر میں حق تعالیٰ کا ارشاد ہے: 'اِنَّمَا یَخْشَی اللّٰہَ مِنْ عِبَادِہِ الْعُلَمٰٓؤُا' (۳۵:۲۸)، 'اللہ سے اس کے وہی بندے ڈرتے ہیں جو علم رکھتے ہیں'۔ اس سے پہلی آیات میں مظاہر قدرت کے رنگ وروغن اور مخلوقات کے حسن وجمال کا ذکر ہے۔ بتانا یہ مقصود ہے کہ جس طرح عالم ظاہری کو ہم مختلف رنگوں کے ذریعہ سے جان اور پہچان سکتے ہیں اسی طرح عالم باطنی کو ہم علم کی بناء پر جان اور پہچان سکتے

Marfat.com

ہیں جب تک ہمیں عالم باطنی کا علم نہ ہوگا ہم اس عالم کی قدر و قیمت نہیں جان سکتے ہیں۔ اس عالم کی معرفت صرف اللہ کے بندوں کو حاصل ہے جو علم سے آراستہ ہوں کیونکہ ع۔ بے علم نتواں خدارا شناخت۔ صرف اللہ کے بندے جانتے ہیں کہ خشیت الٰہی علم کا نقطہ آغاز ہے۔ آیت میں لفظ علما کو ایک خاص دائرے میں محدود نہیں کیا جا سکتا۔ ایسا کرنا عربی محاورے سے متصادم ہے۔ عربی محاورے میں علم سائنس کے معنوں میں ہے۔ چنانچہ آج کل سائنس کالج کو کلیة العلوم کہا جاتا ہے۔ لفظ علم کے زمرے میں تمام علوم آتے ہیں خواہ ان کا تعلق کتاب سے ہو، مظاہر قدرت کی مخفی صلاحیتوں کے بیدار کرنے یعنی فزکس، کیمسٹری اور طب سے ہو یا معاشرتی، اجتماعی اور اقتصادی علوم سے ہو، ان سب کا علم رکھنے والے علما کہلائیں گے۔ آیت زیر نظر کا سیاق و سباق بھی اس کی تائید کرتا ہے۔

جوں جوں بندے کی معرفت بڑھتی جاتی ہے توں توں اس کا ڈر بڑھتا جاتا ہے۔ جتنا کسی کا علم بڑھتا ہے اتنا ہی اس کا حق بڑھتا ہے۔ عالم ہی اللہ کو پہچانتا ہے اس لیے کہ وہ اس سے ڈرتا ہے اور اسی سے امید باندھتا ہے۔ وہ اس کی اتنی قدر کرتا ہے جتنی قدر کرنے کا حق ہے اور اس سے اتنا ہی ڈرتا ہے جتنا ڈرنے کا حق ہے۔ علم خوف خدا کا داعی ہے اہل علم ہی اہل خشیہ ہیں اور اہل خشیہ ہی اہل کرامت ہیں جن سے اللہ راضی ہوتا ہے اور وہ اللہ سے راضی ہوتے ہیں۔ اللہ کی قدرتوں اور اس کے کمال کو وہی جان اور سمجھ سکتے ہیں جو اہل علم ہوتے ہیں۔ علم کا کام عالم کو صرف علم تک محدود رکھنا نہیں بلکہ اسے کائنات کے صانع کی ذات تک پہنچانا ہے۔ اللہ کا خوف اللہ کی حمد و ثنا اور اس سے محبت ہی کی ایک شکل ہے۔ اس ذات کی حمد و ثنا جس کے عجائبات ظاہری اور باطنی عالم میں پھیلے ہوئے ہیں۔ اس کی ذات سے محبت کہ وہ ہم پر اتنا مشفق اور مہربان ہے۔

شیطان اور عباد

سورة بنی اسرائیل میں حق تعالیٰ کا ارشاد ہے: 'إِنَّ عِبَادِي لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطَانٌ وَكَفَىٰ بِرَبِّكَ وَكِيلًا' (۱۷:۶۵)۔ آدم و ابلیس کا قصہ اس سے پہلے سورة بقرہ، اعراف اور حجر میں گزر چکا ہے یہاں چوتھی مرتبہ اسے بیان کیا جا رہا ہے علاوہ ازیں سورة کہف، طٰہٰ اور سورة ص میں بھی اس کا ذکر موجود ہے۔ ابلیس اپنے تکبر کی وجہ سے راندہ درگاہ ہوا جب وہ اللہ کے سامنے بے بس ہو گیا تو اس نے یہ کہہ کر اپنی بھڑاس نکالی 'لَأَتَّخِذَنَّ مِنْ عِبَادِكَ نَصِيبًا مَّفْرُوضًا'، میں لازمی طور پر تیرے بندوں سے اپنا مقررہ حصہ لے کر رہوں گا' (۴:۱۱۸)۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ شیطان نے اپنے لیے جہنمیوں کا ایک واجبی کوٹہ نکال رکھا ہے وہ ایسے لوگ ہیں جو اس کے وسوسوں کا شکار ہو کر اس کے پیچھے

Marfat.com

چلیں گے۔ امام رازی کہتے ہیں کہ نصیبا مفروضا قلت و کثرت کے بارے میں کوئی نص نہیں بلکہ ان الفاظ سے قلت کا تصور ہی ابھرتا ہے۔ اس مقررہ حصے سے مراد ہر انسان کی حق اور نیکی کی فطری استعداد کے مقابلہ میں باطل اور برائی کے لیے فطری استعداد ہے جیسا کہ اللہ کا قول ہے: 'وَهَدَيْنَاهُ النَّجْدَيْنِ'، 'اسے دونوں راستے دکھا دیئے ہیں' (۹۰:۱۰)۔ دوسرے اس سے یہ گمان گزرتا ہے کہ بندے اس کے سامنے بے بس ہوں گے اور وہ اللہ کے مخلص بندوں کے سوا جنہیں چاہے گا گمراہ کردے گا۔ آیت زیر نظر میں اللہ نے اس بات کو واضح کیا ہے کہ شیطان کا اللہ کے کسی بندے پر اختیار نہیں خواہ وہ مخلص ہو یا غیر مخلص بلکہ اس کا داؤ ان پر چلے گا جو اپنے اختیار سے اس کی پیروی کریں گے جیسا کہ خود شیطان اعتراف کرتا ہے کہ 'وَمَا كَانَ لِيَ عَلَيْكُم مِّن سُلْطَانٍ إِلَّا أَن دَعَوْتُكُمْ فَاسْتَجَبْتُمْ لِي' (ابراھیم ۱۴:۲۲)، 'مجھے تم پر کوئی اختیار نہیں مگر ہوا یہ کہ میں نے تمہیں دعوت دی تو تم نے میری دعوت کو قبول کرلیا'۔ پھر اللہ کا فرمان ہے: 'إِنَّمَا سُلْطَانُهُ عَلَى الَّذِينَ يَتَوَلَّوْنَهُ وَالَّذِينَ هُم بِهِ مُشْرِكُونَ' (النحل ۱۶:۱۰۰)، 'اس کا بس تو صرف ان پر چلے گا جو اسے اپنا ولی بنائیں گے اور اس کی وجہ سے شرک کا ارتکاب کریں گے'۔ سورۃ بنی اسرائیل کی آیت نمبر ۶۳ میں ہے: 'اذْهَبْ فَمَن تَبِعَكَ مِنْهُمْ'، 'جا ان میں جو بھی تیرے پیچھے چلے گا تو تم سب کی سزا جہنم ہے'۔ اگر شیطان کو بندوں کے اعمال پر قدرت حاصل ہوتی تو لازم تھا کہ وہ اہل ایمان مخلصین کو بہکاتا تاکہ معاشرے کو اس کی طرف سے زیادہ ضرر پہنچتا۔ اس لیے شیطان نے سورۃ حجر کی آیت نمبر ۴۰ میں خود ہی مخلصین کو مستثنیٰ قرار دیا ہے کیونکہ وہ جانتا ہے کہ ان پر میرا داؤ کارگر نہیں ہوسکتا۔ شیطان کا بس صرف ان پر چلتا ہے جو اپنی مرضی سے اس کے پیچھے ہو لیتے ہیں۔

اس کا مطلب یہ نہیں کہ صالحین اور مخلصین سے کوئی گناہ سرزد نہیں ہوتا اہل ایمان کی صفت یہ ہے کہ وہ گناہ پر اصرار نہیں کرتے بلکہ نادم ہو کر فوراً توبہ کر لیتے ہیں اور آئندہ گناہ سے بچنے کی کوشش کرتے ہیں۔ شیطان جن لوگوں کو اپنی دخل اندازیوں سے گمراہ کرتا ہے ان میں مرد اور عورتیں دونوں شامل ہیں، کیونکہ دونوں صاحبان اختیار اور مستقل شخصیت کے مالک ہیں۔ یہ تصور کہ شیطان پہلے عورت کو بہکاتا ہے پھر عورت مرد کو بہکاتی ہے صریحاً کتاب وسنت سے متصادم ہے۔ یہ کہ آدم کو حوا نے بہکایا اور عورت کا کام ہی فریب دینا اور بہکانا ہے، اہل کتاب کا مسخ شدہ تصور ہے اور اسی سے وہ تصور پیدا ہوا کہ جسے ہمارے ہاں ضعیف احادیث میں سمو دیا گیا ہے کہ عورت زمانے کا سب سے بڑا فتنہ ہے، اسے گھر کی چار دیواری میں بند ہو کر معاشرے سے بالکل کٹا ہوا ہونا چاہیے۔ یہی وجہ ہے کہ مذہبی دانشوروں کی طرف

Marfat.com

سے فحاشی و عریانی کے خلاف تو ہا ہا کار مچائی جاتی ہے مگر عورت کے حقوق کے لیے ان کی طرف سے کوئی آواز بلند نہیں ہوتی۔ گویا کہ عصر حاضر کا سب سے بڑا مسئلہ یہی ہے اگر اسے حل کر لیا جائے تو دودھ کی نہریں بہنے لگیں گی اور اسی ایک مسئلہ کے حل سے شریعت نافذ ہو جائیگی۔

اللہ نے چونکہ اپنے بندوں کو صاحب اختیار پیدا کیا ہے اس لیے شیطان کی مہلت کی درخواست مان لی گئی اور وہ ڈینگ مارنے لگا کہ میں بندوں کو بہکا کر اپنی جماعت میں شامل کرلوں گا۔ ساتھ ہی اللہ نے واضح کر دیا کہ جو میرے بندے ہوں گے خواہ وہ مرد ہوں یا عورتیں وہ بدی کے بہکاوے سے بچ نکلنے میں کامیاب ہوں گے۔

رزق اور عباد

لفظ رزق کا اطلاق بنیادی طور پر روزی اور مادی ساز و سامان پر ہوتا ہے اور مجازی طور پر اس کا اطلاق ذہنی صلاحیتوں، اقتدار، اثر و نفوذ اور مواقع پر ہوتا ہے۔ اس اعتبار سے روحانی صلاحیتوں کو قائم رکھنے والی چیزوں کے لیے بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے۔ قرآن مجید میں مخلوق کے ذکر کے ساتھ رزق کا تذکرہ ہے۔ انسان کا کمال اس کی بقا میں ہے اور انسان کی بقا رزق سے ہے۔ اللہ کا رزق اپنے بندوں یعنی مردوں اور عورتوں کے لیے عام ہے۔ وہ جو بھی ہوں جہاں بھی ہوں ان کو رزق بہم پہنچاتا ہے۔ سورۃ ق میں یہ بیان کرنے کے بعد کہ 'ہم نے آسمان سے بابرکت پانی برسایا اور اس سے باغات اور کھیت کے کٹنے والے غلے اور تہ بہ تہ خوشوں والے کھجور کے بلند و بالا درخت پیدا کیے' فرمایا 'رزقا للعباد' (۵۰:۱۱) 'یعنی یہ سب کچھ بندوں کے رزق کے لیے ہے'۔ اس رزق پر کسی کی اجارہ داری نہیں۔ یہ سواء للسائلین 'سب سائل اس میں برابر کے شریک ہیں'۔ یہ رزق کسی خاص جگہ سے مختص نہیں ہے۔

اللہ اپنے بندوں میں سے جسے چاہے رزق کی فراوانی عطا کرتا ہے اور جسے چاہے رزق کی تنگی (العنکبوت ۲۹:۶۳) یعنی وہ رزق کی مقدار کو بھی جانتا ہے اور ضرورتوں کی مقدار کو بھی۔ یہ سب تکوینی حکمت عملی ہے کیونکہ اللہ کی ذات سے بڑھ کر بندوں کی ضروریات کو کون جانتا ہے؟ نہ رزق میں فراوانی شرف و کرامت کی دلیل ہے اور نہ مال میں کمی ذلت و اہانت کی۔ بلکہ یہ سب ایک آزمائش اور امتحان ہے۔ قارون کی دولت و حشمت کی آرزو کرنے والوں نے جب اس کا عبرتناک انجام دیکھا تو وہ پکار اُٹھے۔ 'اللہ تعالیٰ اپنے بندوں میں سے جس کے لیے چاہے رزق کشادہ کر دے اور تنگ بھی، اگر اللہ تعالیٰ ہم پر فضل نہ کرتا تو ہمیں بھی زمین میں دھنسا دیتا' (القصص ۲۸:۸۲)۔ مال و دولت اس بات کی دلیل نہیں کہ اللہ صاحب مال سے راضی ہے۔ مال و دولت کے سوا بھی بہت سی بیش بہا اور پسندیدہ چیزیں

Marfat.com

ہوتی ہیں جن سے دولت میں کھیلنے والے محروم ہوتے ہیں۔ وہ خوشحالی جھوٹی خوشحالی ہوتی ہے جس میں روح ترقی نہ پائے۔ سورۃ سبا (۳۹:۳۴) میں اس مضمون کو دو مرتبہ بیان کیا گیا ہے، ایک دفعہ آیت نمبر ۳۶ میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ مال و اولاد کی کثرت بہتر حالت اور بہتر عقیدے پر دلالت نہیں کرتی۔ دوسرے یہ بیان کرنے کے لیے کہ یہ بات ان کے ساتھ مخصوص نہیں کیونکہ اللہ جس کے لیے چاہے رزق کشادہ کر دیتا ہے اور جس کے لیے چاہے تنگ کر دیتا ہے۔ مال کی فراوانی اس کی رضا کی اور اس کی کمی اس کی ناراضگی کی دلیل نہیں۔ یہ ضروری نہیں کہ سب چیزیں نیک لوگوں کو ملیں اور نہ ہی ان کی عدم موجودگی اللہ کے فضل سے محرومی پر دلالت کرتی ہے۔ عام طور پر یہ صورت حالات اس کے برعکس ہوتی ہے۔ یہ اللہ کی تکوینی حکمت عملی اور تدبیر کا نتیجہ ہے مگر نادان لوگ سمجھتے نہیں۔ کبھی وہ استدراج کے طور پر کافر کو خوب مال دیتا ہے اور کبھی مومن کو آزمائش کے طور پر تنگ دست رکھتا ہے۔ اگر اللہ اپنے بندوں کی خواہش کے مطابق سب کے لیے ان کی ضرورتوں سے زائد رزق میں فراوانی کر دیتا تو زمین میں فساد برپا ہو جاتا۔ سورۃ شوریٰ (۴۲:۲۷) میں ارشاد ہے: "اگر اللہ تعالیٰ سب بندوں کا رزق فراخ کر دیتا تو زمین پر ظلم وستم کا دور دورہ ہوتا لیکن وہ اندازے کے ساتھ جو کچھ چاہتا نازل فرماتا ہے۔ وہ اپنے بندوں سے خوب باخبر ہے اور ان کو خوب دیکھنے والا ہے"۔ بندوں کے باہمی مفادات اس قدر گھلے ملے ہیں کہ ان کی خواہشات کو پورا کرتے وقت کوئی معیار تو قائم رکھنا پڑے گا۔ اس معیار اور مقدار کا اندازہ اللہ سے بڑھ کر کون کر سکتا ہے؟ اس کا ایک اور پہلو بھی ہے۔ امام طبری نے اس آیت کی تفسیر میں بڑا خوبصورت جملہ نقل کیا ہے وہ یوں ہے: 'خیر الرزق ما لا یطغیك و لا یلهیك'، "بہترین رزق وہ ہے جو نہ تجھے سرکش بنائے اور نہ تجھے غافل کرے"۔ تونگری غلبہ اور اقتدار کا باعث بنتی ہے اور انسان سمجھنے لگتا ہے یہ سب کچھ میری ذاتی کاوش کا نتیجہ ہے۔ قارون بھی اسی تکبر کا شکار ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا: "میں اپنی اُمت کے بارے میں سب سے زیادہ جس چیز سے ڈرتا ہوں وہ دنیا کی زیب و زینت اور مال و دولت کی کثرت ہے"۔

ایک اہم بات جو ذہن میں راسخ ہونی چاہیے کہ بندوں کے بارے میں قرآن کا فلسفہ اس غیر طبقاتی عادلانہ معاشی نظام میں کارگر ہوگا جس میں ذرائع پیداوار پر چند لوگوں کی اجارہ داری نہ ہو، بلکہ یہ سب کے لیے کھلے ہوں سب کو یکساں مواقع میسر ہوں۔ جہاں مصنوعی طور پر معاشی و اقتصادی حالات خراب کیے جائیں، جہاں منافع خوری اور ذخیرہ اندوزی کا دور دورہ ہو، جہاں دولت گردش کرنے کی بجائے ہر پھر کر چند مالداروں میں گھومتی رہے، وہاں یہ حکمت اور یہ فلسفہ کارگر نہ ہوگا بلکہ حیلہ جو سرمایہ دار قرآن کی مذکورہ

Marfat.com

بالا آیات کو اپنے حق میں دلیل کے طور پر پیش کریں گے کہ اللہ کی مشیت میں ہمارا کیا دخل ہے؟ وہ جسے چاہے کم دیتا ہے جسے چاہے زیادہ۔ جیسا کہ ایک فوجی آمر نے کہا تھا کہ میں کیسے فقر کو دور کر سکتا ہوں یہ تو اللہ کا لایا ہوا ہے۔ جب عادلانہ نظام قائم ہوگا اور ہر ایک کو اس کی محنت کے مطابق مزدوری ملے گی اور ہر کسی کی بنیادی ضروریات پوری ہوں گی پھر دولت کی زیادتی یا کمی کے بارے میں خالق کائنات کی حکمت اور مشیت سمجھ آجائے گی، اور پھر پتہ چلے گا کہ رزق کی فراوانی اور تنگی کا انحصار ایمان یا کفر پر، عزت یا اہانت پر نہیں ہے بلکہ یہ ایک امتحان ہے، ایک مرحلہ وار آزمائش ہے، خالی پیٹ تو انسان کا ایمان خطرے میں پڑ جاتا ہے۔ نبی کریم ﷺ کی اس حدیث کا یہی مطلب ہے کہ 'کاد الفقر ان یکون کفرا'، 'ہوسکتا ہے کہ فقر کفر بن جائے'۔

دوسرا اہم نکتہ یہ ہے کہ اللہ نے رزق کے سوتوں کو اپنے بندوں یعنی مردوں اور عورتوں کے لیے عام پیدا کیا ہے۔ ہر کسی کا حق ہے کہ وہ طلب رزق کرے اور جائز طریقوں سے کرے۔ کتاب وسنت میں طلب رزق کے لیے کوئی جنسی پابندی نہیں۔ طلب رزق پر مردوں کی اجارہ داری نہیں۔ یہ درست ہے کہ مالی کفالت مردوں پر واجب ہے لیکن اگر میاں یا سرپرست کی آمدنی ناکافی ہو یا عورت مطلقہ ہو یا بیوہ ہو تو رزق کی تلاش اس کے لیے واجب ہوگی۔ اسی اصول کے تحت دیہات میں عورتیں مردوں کے شانہ بشانہ کام کرتی نظر آتی ہیں اور اسی اصول کے تحت عہدِ نبوت اور خلافتِ راشدہ کے دور میں خواتین سب سماجی سرگرمیوں میں حصہ لیتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ وہ تجارت بھی کرتی تھیں، نخلستانوں میں مردوں کے شانہ بشانہ کام بھی کرتی تھیں اور جنگوں میں دوا دارو بھی کرتی تھیں بلکہ عملی طور پر شمشیر بدست نبی ﷺ کا دفاع بھی کرتی تھیں۔ حضرت اسماءؓ بنت ابی بکرؓ کا قصہ تو حدیث سے ثابت ہے کہ وہ مدینہ سے ڈھائی تین کلومیٹر دور اپنے شوہر زبیرؓ بن عوام کے گھوڑے کے لیے چارہ کاٹ کر لایا کرتی تھیں۔ سیدۃ فاطمۃ الزہرا ؓ کنویں سے مشکیزہ بھر کر لایا کرتی تھیں۔ عورت کو معاشرے سے نکال کر گھر کی چار دیواری میں محبوس کر دینا کہاں کا انصاف ہے؟

وراثتِ جنت اور عباد

سورۃ مریم (۱۹:۶۳) میں ارشادِ الٰہی ہے: تِلْكَ الْجَنَّةُ الَّتِي نُورِثُ مِنْ عِبَادِنَا مَنْ كَانَ تَقِيًّا، 'یہ ہے وہ جنت جس کا وارث ہم اپنے بندوں میں سے انھیں بنائیں گے جو متقی ہوں گے'۔ آیت میں نُورِثُ کا استعمال بطور استعارہ ہوا ہے یعنی ہم جنت کو وارث کے لیے اس طرح باقی رکھیں گے جیسے ورثہ کو وارث کے لیے باقی رکھا جاتا ہے۔ متقی جب قیامت کے دن اپنے رب سے ملاقات کریں گے تو

Marfat.com

ان کے اعمال کا سلسلہ ٹوٹ چکا ہوگا، لیکن ان کا پھل یعنی جنت باقی ہوگی جب اللہ انھیں تقویٰ کی وجہ سے جنت میں داخل کرے گا تو وہ انہیں جنت کا وارث اس طرح بنائے گا جیسے مرنے والے کو مال متروکہ کا وارث بنایا جاتا ہے۔

جس طرح لفظ عباد میں مرد اور عورت دونوں شریک ہیں بالکل اسی طرح جنت کے وارث بھی دونوں ہوں گے مستقل حیثیت سے نہ کہ تابع مہمل بن کر۔ دوسری اہم بات یہ ہے کہ یہ وراثت صرف اور صرف تقویٰ کے سبب ہوگی۔ سب مخلوق کے درمیان تقویٰ ہی فضیلت کا پیمانہ ہے اور مرد و عورت کے درمیان بھی یہی فضیلت کا پیمانہ ہے جیسا کہ سورۃ حجرات (۴۹:۱۳) میں حق تعالیٰ کا ارشاد ہے: إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِندَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ اللہ کے نزدیک تم (مرد اور عورت) میں باعزت وہ ہے جو تم میں سے سب سے زیادہ متقی ہے۔ اتنی صریح نص کے بعد یہ کہنا کہ مرد کو مرد ہونے کی وجہ سے عورت پر فضیلت ہے قرآن کی تکذیب کے مترادف ہے۔

وراثت ارضی اور عباد

سورۃ اعراف (۷:۱۲۸) اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: إِنَّ الْأَرْضَ لِلَّهِ يُورِثُهَا مَن يَشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِينَ۔ زمین اللہ تعالیٰ کی ہے اپنے بندوں میں سے جسے چاہے اس کا وراث بنادے۔ انجام کار کامیاب وہ ہوتے ہیں جو متقی ہوں۔ الارض میں ال جنس کے لیے ہے اس سے مراد مصر کی زمین بھی ہوسکتی ہے اور فلسطین کی زمین بھی۔ وسیع تر معنوں میں اس سے ہر زمین مراد لی جاسکتی ہے۔ اس سے پہلی آیت میں اللہ نے دو باتوں کا حکم دیا ہے اللہ سے مدد مانگنے کا اور صبر کرنے کا۔ زیر نظر آیت میں ان دو باتوں کا نتیجہ بتایا گیا ہے یعنی وراثت ارضی اور حسن انجام۔ سب سے پہلے قوم موسیٰ کو اللہ سے مدد مانگنے کا حکم دیا۔ وہ اس لیے کہ جس کو اس بات کا یقین ہو کہ اللہ کے علاوہ کوئی دنیا کا مدبر نہیں تو نور معرفت سے اس کا سینہ کھل جاتا ہے۔ اس وقت مشکلیں اس کے لئے آسان ہو جاتی ہیں کیونکہ وہ سمجھتا ہے کہ مصیبت تقاضائے الٰہی ہے۔ چنانچہ مقتضائے الٰہی کے مشاہدہ کی استعداد مصیبت کو اس کے لئے آسان بنادیتی ہے۔ دوسرے بندے کا کام ہے کہ قدرت کی حالت میں جہاں تک ممکن ہو اپنا دفاع کرے۔ مگر بے بسی کی حالت میں صبر کرے اور تکلیف کے ٹلنے کا انتظار کرے۔

زیر نظر آیت میں حضرت موسیٰؑ نے اپنی قوم کو امید دلائی ہے کہ فرعون اور اس کی قوم کو ہلاک کرنے کے بعد انہیں اس سرزمین کا وراث بنائے گا۔ وراثت کے معنی ہیں سلف (پہلے لوگوں) کے بعد خلف (بعد میں آنے والوں) کے لئے کسی چیز کو معین کرنا۔

Marfat.com

لفظ متقین میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ زمین کی وراثت ان بندوں کو ملے گی جو اللہ سے ڈرتے ہیں اور اس سلسلہ میں سنت الٰہی کا خیال رکھتے ہیں وہ مشکلات میں اللہ سے مدد طلب کرتے ہیں اور صبرو استقامت سے کام لیتے ہیں۔ جن کی صفوں میں اتحاد ہوتا ہے اور وہ عدل وحق کے قیام کیلئے کوشاں ہوتے ہیں۔ بات یوں نہیں جیسا کہ فرعون اور اس کی قوم سمجھتی تھی کہ قوی ہمیشہ قوی رہے گا اور ضعیف ہمیشہ ضعیف رہے گا خواہ وہ کتنے ہی ظلم وستم ڈھاتے رہیں۔ زمین ان کی جاگیر نہیں کہ وہ ہمیشہ کے لیے ان کے پاس رہے خواہ وہ کچھ ہی کیوں نہ کرتے رہیں۔ زمین اللہ کے قانون کے مطابق ملتی ہے اور اس کے مطابق چھنتی ہے۔ جیسا کہ اللہ کا قول ہے کہ زمین کے وارث میرے بندے ہوں گے۔ زیر نظر آیت میں صالحون کے ساتھ متقین کا اضافہ کیا گیا ہے۔ جو قوم با صلاحیت ہوگی اللہ کا تقویٰ اختیار کرے گی یا بالفاظ دیگر سنت الٰہی کی نگہداشت کرے گی، زمین کی وراثت اسی کو ملے گی اور ایسے ہی لوگ دنیا اور آخرت میں سرخرو ہوں گے۔ زمین کا مالک فیصلہ کرتا ہے کہ کس کو کب زمین سے بیدخل کرنا ہے۔ لفظ عباد سے ثابت ہوتا ہے کہ اللہ کے بندوں میں سے خواہ وہ مرد ہو یا عورت جو صالح اور متقی ہوں گے، وہی زمین کے وارث ہوں گے وہی حکومت کے حقدار ہوں گے۔ زمین اور اس کی حکومت مردوں کی جاگیر نہیں کہ وہ جو کچھ بھی کرتے رہیں وہی اس کے وارث رہیں گے یہ فرعونی نقطہ نظر ہے نہ کہ قرآنی۔ من یشاء من عبادہ کا جملہ پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ اس میں مرد بھی شامل ہیں اور عورتیں بھی۔

اس بات کی تائید سورۃ توبہ کی آیت نمبر ۷۱ کرتی ہے ارشاد ہے: وَالْمُؤْمِنُونَ وَالْمُؤْمِنَاتُ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ يَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ وَيُقِيمُونَ الصَّلَاةَ وَيُؤْتُونَ الزَّكَاةَ وَيُطِيعُونَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ أُولَٰئِكَ سَيَرْحَمُهُمُ اللَّهُ إِنَّ اللَّهَ عَزِيزٌ حَكِيمٌ۔ مومن مرد عورت آپس میں ایک دوسرے کے دوست ہیں۔ وہ بھلائی کا حکم دیتے ہیں۔ اور برائی سے روکتے ہیں۔ نمازوں کو قائم کرتے ہیں۔ اور زکوٰۃ ادا کرتے ہیں۔ اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرتے ہیں یہی لوگ ہیں جن پر اللہ تعالیٰ بہت جلد رحم فرمائے گا۔ بے شک اللہ علم والا اور حکمت والا ہے۔ خدارا بتایئے کہ مذکورہ وہی فرائض نہیں جو قرآن حاکم کو سونپتا ہے۔ کیا اس سے ثابت نہیں ہوتا کہ مومن عورتیں مومن مردوں کی طرح حکومت کا حق رکھتی ہیں؟

نبوت اور عباد

درج ذیل آیات میں نبوت اور عباد کا ساتھ ساتھ ذکر ہے: سورۃ بقرہ (۲:۹۰)، ابراھیم (۱۴:۱۱)، نحل (۱۶:۲)، نمل (۲۷:۵۹)، مومن (۴۰:۱۰)۔ ان آیات مبارکہ کے مطالعہ سے مندرجہ

Marfat.com

...حقائق سامنے آتے ہیں۔

نبوت اللہ تعالیٰ کا عطیہ ہے وہ اپنے بندوں میں سے جسے چاہے اس سے نوازتا ہے۔ سوائے سورۃ النحل کی آیت کے باقی سب آیات میں 'من یشاء من عبادہ' کا جملہ وارد ہوا ہے یعنی یہ اللہ کا احسان اور فضل ہے وہ جس بندے کو چاہے اس پر احسان کر کے نبوت کے لیے منتخب کر لیتا ہے۔ نبوت اللہ تعالیٰ کا عطیہ ہے۔ وہ اپنے بندوں میں سے جسے چاہتا ہے اسے عطا کرتا ہے۔ اس کے حصول کا انحصار اس بات پر نہیں کہ وہ انسان دوسرے انسانوں سے ممتاز ہو۔ یہ لوگ سورۃ ابراھیم (۱۱:۱۴) کی آیت سے استدلال کرتے ہیں جس میں اللہ نے واضح کیا ہے کہ نبوت کا حصول محض اللہ کے فضل اور احسان کا نتیجہ ہے۔ یہ کبھی چیز نہیں جسے محنت کر کے بعض کمالات کی وجہ سے حاصل کر لیا جائے۔ اللہ جس بندے کو چاہتا ہے اس کو فضائل کمالات اور استعدادات سے نوازتا ہے اور نبوت کے لیے منتخب کر لیتا ہے۔ یہ احسان نہ صرف رسولوں پر ہے بلکہ نوع بشری پر ہے جس کے افراد کو اللہ اس عظیم مشن کے لیے چن لیتا ہے۔

سورۃ نحل (۲:۱۶) میں اللہ کا ارشاد ہے: 'وہ فرشتوں کو وحی دے کر اپنے حکم سے اپنے بندوں میں سے جس پر چاہتا ہے اتارتا ہے کہ تم لوگوں کو آگاہ کرو کہ میرے سوا کوئی معبود نہیں، پس تم مجھ سے ڈرو'۔ یہ آیت اس بات کی دلیل ہے کہ نبوت عطائی ہے یہی مسلک صحیح ہے۔

اس آیت میں اور سورۃ مومن (۱۵:۴۰) میں وحی کو استعارۃً روح کہا گیا ہے یعنی جس طرح روح انسانی جسم کی بقا کا سبب ہے اسی طرح وحی ان دلوں میں زندگی کی روح پھونک دیتی ہے جو کفر اور شرک کی وجہ سے مردہ ہو چکے ہوتے ہیں جیسا کہ اللہ کا قول ہے: 'اومن کان میتا فاحییناہ'، 'کیا وہ جو مردہ تھا پس ہم نے اسے زندہ نہیں کیا'؟ صاحب روح المعانی نے اس آیت کے تحت لکھا ہے کہ اس آیت میں ان صوفیاء کی تردید ہے جو کہتے ہیں کہ مخلوق کو رسولوں کی کوئی حاجت نہیں کیونکہ رسول اللہ کے ماسوا ہیں اور جو بھی اللہ کے ماسوا ہوتا ہے وہ بمنزلہ حجاب ہوتا ہے اور جو چیز حجاب ہوتی ہے مخلوق کو اس کی ضرورت نہیں ہوتی۔ پس رسولوں کی کوئی ضرورت نہیں، یہ سراسر جہالت ہے۔ رسول تو اللہ تک پہنچاتے ہیں اور اللہ کی طرف وصول کیسے حجاب ہو سکتا ہے۔ وحی بھیجنے کی اصل غرض وغایت یہ ہے کہ انبیاء مخلوق کا رخ عالم مادی سے عالم روحانی کی طرف موڑ دیتے ہیں اور اسی کی طرف اشارہ 'اَنْ

Marfat.com

أَنذِرُوا أَنَّهُ لَا إِلَٰهَ إِلَّا أَنَا ' (النحل ۱۶:۲) میں ہے اور سورۃ مومن (۴۰:۱۵) 'لِيُنذِرَ يَوْمَ التَّلَاقِ' میں بھی 'تا کہ ملاقات کے دن یعنی قیامت سے ڈرائے'۔

۲۔ نبوت پر ایک بڑا اعتراض تو یہ تھا کہ نبی کوئی فرشتہ ہونا چاہیے نہ کہ ہماری طرح کا انسان جو کھاتا پیتا اور بازاروں میں گھومتا ہو یعنی وہ بشر کو نبوت کے قابل نہیں سمجھتے تھے۔ یہ اعتراض مشرکین کی طرف سے تھا۔ اس کا جواب یہ دیا گیا کہ ٹھیک ہے کہ ہم تمہاری طرح کے بشر اور عبد ہیں لیکن اللہ اپنے بندوں میں سے جس کو چاہے منصب نبوت کے لیے چن لے۔ بشریت اللہ کی مشیت کے راستہ میں رکاوٹ نہیں بنتی اور پھر انسانوں کی ہدایت کے لیے اللہ انسانوں میں سے جسے چاہے وحی اور نبوت کے لیے چن لیتا ہے اگر کوئی فرشتہ نبی ہوتا تو وہ انسانوں کی ضروریات کیسے سمجھتا؟ دوسرا اعتراض مدینہ کے یہودیوں نے کیا۔ سورۃ بقرہ (۲:۹۰) میں اللہ کا ارشاد ہے: 'بہت بری ہے وہ چیز جس کے بدلے میں انھوں نے اپنے آپ کو بیچ ڈالا۔ وہ اللہ تعالیٰ کی نازل شدہ وحی کے ساتھ ان کا کفر ہے اس بات سے حسد کی وجہ سے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنا فضل جس بندے پر چاہا نازل کیا۔ وہ اپنے تئیں جس نبی کا انتظار کر رہے تھے ان کا خیال تھا کہ وہ ان کی نسل سے ہوگا لیکن جب اس کا ظہور عرب میں بنو اسماعیل میں ہوا تو حسد اور جلن کی وجہ سے انھوں نے اس کا انکار کر دیا۔ ان کا انکار دلائل پر مبنی ہونے کی بجائے نسلی منافرت پر مبنی تھا۔ وحی کا شرف اللہ اپنی مشیت اور حکمت کے مطابق اپنے بندوں میں سے جسے چاہے بغیر نسلی اور جنسی امتیاز کے عطا کرتا ہے۔ کسی کو حق نہیں پہنچتا کہ وہ اللہ کے فضل کو رنگ و نسل میں محدود کرے۔ وہ کائنات کا خالق ہے عزت و شرف اور قدرت کا سرچشمہ ہے۔ اسے خاص انسانوں کو منتخب کرنے پر کون مجبور کر سکتا ہے؟ وہ علیم بھی ہے اور خبیر بھی۔ وہ بندوں کی مصلحتوں کو سمجھتا ہے۔

۳۔ نبوت کا انتخاب رنگ و نسل یا اور کسی قسم کے امتیاز پر موقوف نہیں۔ اللہ اپنی حکمت کے تقاضوں کے تحت جس بندہ و بشر کو چاہتا ہے چن لیتا ہے کس کو، کہاں اور کس وقت نبی بنا کر بھیجنا ہے یہ اس کا استحقاق ہے۔ کسی کی کیا مجال کہ وہ اس کے فضل اور احسان کو کسی نسلی یا کسی اور قسم کے امتیاز تک محدود کرے۔

۴۔ فرشتوں کی نبوت کی تردید کرتے ہوئے قرآن حکیم نے بشر اور عبد کا لفظ استعمال کیا ہے۔ یہ دونوں الفاظ عمومیت کے حامل ہیں ان میں مرد بھی شامل ہیں اور عورتیں بھی۔ صرف ایک

Marfat.com

مقام پر رجــال کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ مگر وہاں بھی سیاق وسباق کو پیش نظر رکھیں تو یہ لفظ فرشتوں کے مقابلہ میں بشر کے معنوں میں استعمال ہوا ہے نہ کہ مرد کے معنوں میں۔ پہلے قرآن حکیم کے کئی مقامات کی نشان دہی کر چکا ہوں جہاں یہ لفظ بشر کے معنوں میں بولا گیا ہے اور اردو میں اس کے معنی لوگ کیے گئے ہیں نہ کہ مرد۔ جب خالق کائنات نے انسان کی تخلیق کی تو عورت کے اندر بھی اپنی وہی روح پھونکی جو مردوں کے اندر پھونکی تھی۔ اس لیے نفس کی دونوں قوتیں نظری اور عملی مرد کی طرح عورت میں بدرجہ اتم موجود ہیں۔ نظری صلاحیت کی سعادت علم ومعرفت ہے اور سب سے بڑھیا معرفت یہ ہے کہ اللہ کے علاوہ کوئی معبود نہیں۔ عملی صلاحیت کی سعادت اعمالِ صالحہ ہیں۔ یہ دونوں استعدادات اور کمالات مرد اور عورت کو یکساں حاصل ہیں۔ جبھی تو جزا اور سزا میں دونوں مشترک ہیں۔ جس نورِ الٰہی سے مرد روشنی حاصل کرتا ہے اسی نورِ الٰہی سے عورت بھی روشنی حاصل کرتی ہے۔ عورت میں بھی ملأ اعلیٰ سے ملاقات اور ان سے حصول کی صلاحیت موجود ہے اور قرآن اس کا شاہد ہے۔ حضرت مریمؑ سے فرشتوں نے خطاب کیا۔ اللہ نے ان کا ذکر دوسرے انبیاء کے ساتھ ایک ہی سلوب 'واذکر فی الکتب مریم' (کتاب میں مریم کا واقعہ بھی بیان کرو) کہہ کر کیا ام موسیٰ پر وحی نازل ہوئی۔ حضرت سارہ فرشتوں سے ہم کلام ہوئی۔ یہی وجہ ہے کہ امام ابن حزم اندلسی، امام قرطبی اور حافظ ابن حجر حضرت مریم کو نبی تسلیم کرتے ہیں اور امام ابن حزم حضرت سارہ اور اُم موسیٰ کو بھی نبی تسلیم کرتے ہیں۔ اس موضوع پر امام ابن حزم کے مدلل مقالہ کا لفظی ترجمہ میں لفظ بشر کے تحت نقل کر چکا ہوں۔ وہاں عورت کی نبوت کے بارے میں اور بھی حوالے موجود ہیں۔

عورت کی نبوت پر جو اعتراضات وارد کیے گئے ہیں وہ سطحی اور غیر علمی ہیں۔ عورت کی جن خوبیوں کو خالق کائنات نے حیاتیاتی عمل کے لیے ناگزیر قرار دیا ہے انہی کو عورت کی خامیاں اور عیوب تصور کیا گیا ہے۔ مثلاً حیض، حمل، ولادت، نفاس اور رضاعت بقائے نسل کے لیے ناگزیر ہیں۔ یہ عورت کی صحت کی علامت ہیں لیکن انہی خوبیوں کو خامیاں شمار کیا گیا ہے۔ گویا کہ یہ فطری عمل نہیں عورت کے اپنے پیدا کردہ نقائص ہیں۔ ابتدائے آفرینش سے لے کر عورت ان تمام مراحل کے باوصف معاشرے کی سب سرگرمیوں میں حصہ لیتی رہی ہے اور حصہ لیتی رہے گی۔ عہد نبوت میں عورت بچوں کو جنم بھی دیتی رہی ہے۔ ان کی پرورش

Marfat.com

بھی کرتی رہی ہے اور اس کے ساتھ تجارت وزراعت میں بھی حصہ لیتی رہی ہے۔ وہ ہر مشکل سے مشکل کام پوری تندہی سے کرتی رہی ہے۔ یہاں تک کہ میدان کارزار میں زخمیوں کی مرہم پٹی کے علاوہ شمشیر بکف نبی ﷺ کا دفاع کرتی رہی ہے۔ مسجد نبوی میں پنج وقتہ نماز کے ساتھ ساتھ نماز استسقاء اور عیدین کی نماز میں بھی شرکت کرتی رہی۔ نماز استسقاء کی راوی بھی ایک عورت ہے۔ خلافتِ راشدہ کے دور میں مسجد نبوی میں کھڑے ہو کر خلیفہ کو غلط بات پر ٹوکتی بھی رہی ہے۔ بعد کے ادوار میں مسلمان عورتیں ملکہ بلقیس کی طرح حکمران رہی ہیں اور یہ سلسلہ اب تک جاری ہے اور کامیابی سے جاری ہے۔

عورت کو رسول بنا کر اس لیے نہیں بھیجا گیا کہ اس میں نقص ہے بلکہ حکمت الٰہی کا تقاضا یہ تھا کہ فاسد معاشروں میں جہاں عورت کو ایک چیز سمجھا جاتا تھا ان معاشروں میں عورت کو اس کی صلاحیتوں کے باوجود رسول بنا کر نہ بھیجنا حالات کے تقاضوں کے عین مطابق تھا۔ انبیاء کے مخالفین کی سوچ اور فکر، سیرت اور کردار کو سامنے رکھا جائے تو بات آسانی سے سمجھ میں آجاتی ہے وہ جو دلوں کے بھید جانتا ہے وہ جو آنے والے حالات سے باخبر ہے اس نے عورت کو نبوت سے توفیق یاب کیا مگر اپنی حکمت کے تقاضوں کے پیش نظر اس کو رسالت سے نہ نوازا۔ اور یہ نہ عورت کے لیے کوئی عیب ہے نہ مرد کے لیے وجہ فضلیت۔ کیونکہ یہ تو عطائی چیز ہے۔ وجہ فضیلت اعمال صالح اور تقویٰ ہے اور بس۔

عورت کی حکمرانی کے خلاف جو حضرت ابو بکرہؓ سے روایت ہے اس کا تجزیہ میں نے اپنے کتابچہ 'عورت کی حکمرانی اور حضرت ابو بکرہؓ کی روایت' میں کیا ہے یہ مطبوعہ شکل میں مکتبہ دانشوراں اُردو بازار لاہور سے دستیاب ہے۔

زینت اور عباد

سورۃ اعراف (۷:۳۲) میں ارشاد باری ہے: "قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ قُلْ هِيَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا خَالِصَةً يَّوْمَ الْقِيٰمَةِ كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ"، "آپ کہہ دیجیے کہ اللہ تعالیٰ کی پیدا کی ہوئی زینت کو جسے اس نے اپنے بندوں کے واسطے بنایا ہے کس نے حرام کیا ہے؟ آپ کہہ دیجیے کہ یہ زینت جس طرح اہلِ ایمان کے لیے قیامت کے دن خاص ہوگی اسی طرح دنیوی زندگی میں بھی ان کے لیے ہے"۔ لفظ زینت

Marfat.com

خوبصورتی، آراستگی اور جمال کے لیے بولا جاتا ہے۔ آیت کے دوسرے حصے میں جنت کی زینت کا ذکر کر کے اس کا مطلب واضح کر دیا گیا ہے۔ جنت کے حسن و جمال کا نقشہ آنکھوں کے سامنے رکھیے۔ خوبصورت اور بڑھیا لباس، حسین ساتھی، پرکشش ماحول، گھنے سرسبز و شاداب باغ، درمیان میں لہراتی نہریں، ہنستے مسکراتے چہرے، یہ سب زینت ہی تو ہے جسے اللہ نے بندوں کے فائدے کے لیے پیدا کیا ہے۔ یہ زینت جس طرح قیامت کے دن اہل ایمان سے مخصوص ہوگی دنیا میں بھی وہ اس کا حقدار ہے۔ ہمارے یہاں فن اور جمال کی نفی کو زہد سمجھا جاتا ہے۔ گندے اور غلیظ مجذوبوں کو اللہ کے قریب سمجھا جاتا ہے۔ حالانکہ اللہ خود بھی حسین ہے اور حسن سے محبت کرتا ہے۔ دنیا کی ہر خوبصورت اور پاک چیز خواہ وہ لباس ہو یا کھانے پینے کی چیز ہو یا کوئی فن پارہ ہو زینت کے زمرے میں آتا ہے۔

یہ آیت اس بات کی دلیل ہے کہ تمام پہننے، کھانے پینے اور زیب و زیبائش کی اشیاء اصلاً مباح ہیں کیونکہ ان میں بندوں کا فائدہ ہے۔ یہ شریعت کا اصول ہے۔ صاحب روح المعانی نے ابن الفرس کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ جو لوگ مردوں کے لیے ریشم کو جائز سمجھتے ہیں وہ اسی آیت سے استدلال کرتے ہیں۔ نبی کریم ﷺ نے ریشم پہننے کی ممانعت اس لیے فرمائی تھی کہ اسے اس وقت تکبر اور اسراف کی علامت سمجھا جاتا تھا جیسا کہ صحیح بخاری کتاب اللباس باب قول من حرم زینۃ اللہ میں حدیث ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا جو چاہو کھاؤ اور جو چاہو پیو البتہ دو باتوں سے گریز کرو، اسراف اور تکبر سے۔ یہ حدیث ان لوگوں کی صحیح رہنمائی کر سکتی ہے جو ایک خاص قسم کے لباس کو سنت نبوی سمجھ کر جوبا پہنتے ہیں اور طرفہ تماشا یہ کہ اسے اسلامی انقلاب کی علامت سمجھتے ہیں۔ کل کو وہ اپنے یہاں کی حلال چیزوں کو چھوڑ کر وہی کھائیں گے جو نبی ﷺ کھایا کرتے تھے اور دعویٰ کریں گے کہ یہ سنت نبوی ہے اس سے دنیا میں اسلامی انقلاب بپا ہو جائے گا۔

آخر میں ایک اہم بات کی طرف اشارہ کرتا چلوں کہ بعض لوگوں نے اُردو میں زینت کا ترجمہ لباس کیا ہے یہ ناقص ترجمہ ہے اور زینت کے مفہوم کو ادا کرنے سے قاصر ہے۔ قرآنی الفاظ کا ترجمہ اپنے تصورات کی روشنی میں کرنا سراسر زیادتی ہے۔

Marfat.com

عورۃ (عیب، شرم گاہ)

لغوی مفہوم

اِبن فارس نے مقاییس اللغۃ میں لکھا ہے کہ عین، واو اور راء کے دو بنیادی معانی ہیں۔ ایک یہ کہ کسی چیز کا لینا دینا دوسرے انسان کی دونوں آنکھوں میں سے ایک آنکھ کی بینائی کا جاتے رہنا اور اس کا مفہوم یہ ہے کہ وہ دیکھنے سے خالی ہوگئی۔ محاورہ میں یہ تو کہا جاتا ہے: أنظروا الی عینه العوراء 'اس کی کانی آنکھ کی طرف دیکھو'۔ یہ نہیں کہا جاتا کہ لا حدی العینین العمیاء 'اس کی ایک اندھی آنکھ کی طرف دیکھو'۔ تشبیہ کے طور پر کلمۃ عوراء یعنی بری بات یا بقول خلیل ایسا کلمہ جو عقل اور راستگی کے بغیر منہ سے نکلے۔ شاعر کا شعر ہے:

؎ لا تنطق العوراء فی القوم سادرا
فان لها فاعلم من القوم واعیا

تو لوگوں کے بارے میں لاپرواہی سے احمقانہ بات منہ سے نہ نکال
اچھی طرح سمجھ لو کہ لوگوں میں سے کچھ اسے ذہن میں محفوظ کرنے والے ہیں۔

بعض کا قول ہے کہ کلمۃ عوراء اس قبیح بات کو کہتے ہیں جسے سن کر آدمی ناراض ہو جائے اور اسے غصہ آجائے۔ جیسا کہ شاعر کا شعر ہے:

؎ وعوراء قد قیلت فلم التفت لها
وما الکلم العوراء لی قبول

کتنی ہی بری باتیں کہی گئیں مگر میں نے ان کی طرف توجہ نہ دی
اور بری باتیں مجھے پسند نہیں۔

ابن فارس کی طرح اہل لغت میں سے صاحب القاموس المحیط، المصباح المنیر اور لسان العرب نے اور مفسرین میں سے صاحب کشاف، البحر المحیط اور روح المعانی نے عور کے حقیقی اور بنیادی معنی عیب اور خلل کے لیے ہیں۔ خلل خواہ وہ سرحد میں ہو یا پہاڑ میں ہو یا گھر میں ہو اسے عورۃ کہا جاتا ہے۔ محاورہ میں کہا جاتا ہے عورت الدار 'گھر میں خلل ہے' یا 'أعور منزلك' تیرے گھر میں خلل ہے۔ عربی محاورہ ہے فلان یحفظ عورتهٗ 'فلاں اپنے عیب کی حفاظت کرتا ہے'۔ حدیث کے الفاظ ہیں: من ستر مومنا فی الدنیا علی عورة ستره الله یوم القیامة 'جو دنیا میں

Marfat.com

کسی مومن کا کوئی عیب چھپائے گا اللہ قیامت کے دن اس کی پردہ پوشی کرے گا'۔ سامان کے عیب کو عَوار کہا جاتا ہے۔ جیسا کہ سلعة ذات عَوار۔ عیب والا سامان اور آنکھ کے عیب کو عُوار کہا جاتا ہے۔ ابن فارس کا قول ہے کہ عور کے باب سے عوراء کپڑے کی پھٹن کو کہا جاتا ہے اور اسی باب سے لفظ عورۃ ہے گویا اس سے مراد ہر وہ چیز ہے جس کی خالی ہونے کی وجہ سے نگہداشت ضروری ہو۔ اسی بناء پر اللہ کے قول ان بیوتنا عورۃ کی تفسیر غیر محفوظ کی گئی ہے۔ ابن الاعرابی کا قول ہے کہ سورج کے مشرق و مغرب کو عورتا الشمس یعنی سورج کے دو برہنہ اور غیر محفوظ کنارے۔

انہی بنیادی معنوں کی بناء پر ترتیب القاموس المحیط علی طریقة المصباح المنیر و أساس البلاغة نے اور Lane نے Lexicon میں عور کے معنی گھٹیا چیز اور اعور کے معنی ضعیف، بزدل، کند ذہن، ایسا شخص جس کا حقیقی بھائی نہ ہو اور ایسا راستہ جس میں کوئی علامت نہ ہو، کیے ہیں۔

امام راغب نے المفردات میں ان اہل لغت اور مفسرین کے برعکس عورۃ کو عار سے مشتق گردانا ہے اور کہا ہے کہ شرم گاہ اس سے کنایہ ہے اور اسے عورۃ اس لیے کہا جاتا ہے کہ اس کے کھلنے سے عار محسوس ہوتی ہے اور کلمة عوراء بھی اس لیے کہا جاتا ہے کہ وہ باعث ننگ و عار ہوتا ہے، حالانکہ انہوں نے خود اس مادہ کے پہلے بنیادی معنوں یعنی تعاور الشئی (کسی چیز کا لینا دینا) کو عار سے مشتق گردانا ہے کیونکہ أعرته الشئی اعارة یعنی کسی کو عاریۃً دینا اور ایسی چیز کو واپس لینا باعث عار ہے۔ ازہری کا قول بھی یہی ہے کہ عارۃ، اعارۃ سے اسم ہے اور لیث کا قول بھی یہی ہے کہ اسے عاریة اس لیے کہا جاتا ہے کہ وہ مانگنے والے کے لیے باعث عار ہے۔ صاحب المصباح المنیر نے بھی ازہری کے قول کو درست قرار دیا ہے۔ وہ اس کے بنیادی معنی ابن فارس کی طرح عیب اور خلل سمجھتے ہیں۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ شرم گاہ کو عورۃ اس لیے کہا جاتا ہے کہ اس کا دیکھنا قباحت کا باعث ہے اور کلمة عوراء قبیح بات کو کہا جاتا ہے۔

مقام حیرت ہے کہ راغب نے عورۃ کو عار سے مشتق قرار دے کر بعد میں اپنے قول کی تردید کیسے کر دی؟ محض اس بات کو ثابت کرنے کے لیے کہ مقام ستر کے کھلنے سے، چونکہ عار محسوس ہوتی ہے اس لیے اسے عورۃ کہا جاتا ہے۔

صاحب المفردات سمیت سب اہل لغت کا اس پر اتفاق ہے کہ استعارۃ کے طور پر عورۃ کے معنی شرم گاہ کے ہیں خواہ وہ مرد کی ہو یا عورت کی۔ سب نے صاحب المفرادت کے سوا یہ لکھا ہے کہ اس کا مادہ عور ہے جس کے معنی نقص اور قباحت کے ہیں اور شرم گاہ کو عورۃ اس لیے کہتے ہیں کہ اس کے

Marfat.com

دیکھنے میں قباحت ہے۔ صرف امام راغب نے اِسے عار سے مشتق قرار دے کر یہ کہا ہے کہ مقامِ ستر کے کھلنے سے بھی چونکہ عار محسوس ہوتی ہے اس لیے اِسے عورۃ کہا جاتا ہے اور المراۃ کو بھی عورۃ اسی لیے کہا جاتا ہے۔

لفظ عورۃ کا اطلاق کنایۃً جس طرح عورت کی شرم گاہ پر ہوتا ہے، بالکل اسی طرح مرد کی شرم گاہ پر ہوتا ہے۔ حدیث کے الفاظ میں لا ینظر الرجل الی عورۃ الرجل ولا المراۃ الی عورۃ المراۃ 'نہ مرد مرد کے مقامِ ستر کو دیکھے اور نہ عورت عورت کے مقامِ ستر کو'۔ اسی لیے فقہ کی کتابوں میں عورۃ الرجل اور عورۃ المراۃ کے الگ الگ باب باندھے گئے ہیں۔ اگر مقامِ ستر کے کھلنے سے عار محسوس ہوتی ہے تو اس میں خواتین کی تخصیص کیوں کی گئی ہے؟ اس اعتبار سے مرد کو بھی عورۃ کہنا چاہیے۔ اس توہین آمیز لفظ کو عورت کی ذات کے لیے کیوں استعمال کیا گیا ہے مرد کی ذات کے لیے کیوں نہیں؟

ابن فارس نے خلیل کا قول نقل کیا ہے کہ عورۃ ایک ایسی صفت ہے جو واحد بھی ہے اور جمع بھی، مذکر بھی ہے اور مؤنث بھی۔ جیسا کہ کہا جاتا ہے کہ رجل صوم، امراۃ صوم، رجال صَوْم، نساء صومٌ، روزہ دار مرد، روزہ دار عورت، روزہ دار بہت سے مرد اور روزہ دار بہت سی عورتیں۔ اسی طرح آپ رجل عورۃ، امراۃ عورۃ، رجال عورۃ و نساء عورۃ۔ محمود آلوسی نے روح المعانی میں اس بات کو وضاحت کے ساتھ یوں کہا ہے 'کہ دراصل عورۃ خلل کے معنوں میں مصدر ہے اور مبالغہ کے لیے اسے بطور صفت بیان کیا گیا ہے۔ دوسری مصادر کی مانند اس کا اطلاق مذکر مؤنث اور واحد جمع دونوں کے لیے ہوتا ہے یعنی رجل عورۃ و امراۃ عورۃ عیب دار مرد اور عیب دار عورت۔ جیسا کہ قرآن میں ان بیوتنا عورۃ 'بیشک ہمارے گھر خلل والے ہیں'۔ اس میں بیوت جمع جبکہ ان کی صفت عورۃ واحد ہے۔ اسی طرح عورات النساء میں النساء جمع اور اس کے لیے عورات بھی جمع استعمال کیا گیا ہے۔ اس اعتبار سے بھی لفظ عورۃ کو صرف خواتین کی ذات کے ساتھ مخصوص کرنے کا کوئی جواز نظر نہیں آتا۔ عورۃ القوم اس مقام کو کہا جاتا ہے جہاں سے کسی قوم کو دشمن کے حملہ آور ہونے کا خطرہ ہو۔ قوم میں مرد اور عورتیں دونوں شامل ہیں۔ شاہسوار پر ضرب لگانے کے لیے مقامِ ضعف کو محاورہ میں کہا جاتا ہے کہ اعور الفارس یعنی شاہسوار پر وار کرنے کے لیے کوئی ایسا شگاف تھا جہاں سے اس پر ضرب لگائی جا سکتی تھی۔ اوپر جس حدیث کا حوالہ دیا گیا ہے اس میں لفظ مومن مرد اور عورت سے عبارت ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ عورۃ کی صفت مرد اور عورت دونوں کے لیے یکساں استعمال ہوتی ہے۔ اس صفت کو صرف عورت کی ذات کے لیے

Marfat.com

استعمال کرنا کسی طرح قرین قیاس نہیں۔

اس سلسلہ میں لسان العرب اور معجم الوسیط میں ایک حدیث کا حوالہ دیا گیا ہے کہ المرأۃ عورۃ خاتون عورۃ ہے۔ مفردات اور المصباح المنیر میں حدیث کا حوالہ تو نہیں دیا گیا بلکہ یہ کہا گیا ہے کہ ہر وہ چیز جس کو غیرت یا حیا کی وجہ سے چھپایا جاتا ہے وہ عورۃ کہلاتی ہے اور خواتین بھی عورۃ کہلاتی ہیں۔

المرأۃ عورۃ۔ خاتون عورۃ ہے یہ حدیث عبداللہ بن مسعود سے مروی ہے۔ عبداللہ بن مسعود کا عورت کے چہرے کے بارے میں موقف جمہور صحابہ سے الگ ہے اور امام احمد نے اپنے ایک قول میں اس موقف کی تائید کی ہے جبکہ باقی تین امام اس موقف کو تسلیم نہیں کرتے۔ امام قرطبیؒ نے پوری حدیث یوں بیان کی ہے: انّ المرأۃ کلھا عورۃ الا وجھھا ویدیھا' بیشک عورت ساری کی ساری قابل ستر ہے سوائے چہرے اور ہاتھوں کے۔ امام عبدالبر اندلسی التمہید (۱۲۶:۶) میں فرماتے ہیں کہ عورت کا سارا جسم سوائے چہرے اور ہاتھوں کے قابل ستر ہے۔ اکثر اہل علم کا یہی مسلک ہے اس کے بعد وہ ابوبکر بن عبدالرحمان بن الحارث کا قول نقل کرتے ہیں کہ عورت کا سارا جسم ناخنوں سمیت قابل ستر ہے۔ اس قول کی تردید کرتے ہوئے امام صاحب فرماتے ہیں کہ ابوبکر کا یہ قول اہل علم کے قول کے منافی ہے کیونکہ علماء کا اس بات پر اجماع ہے کہ عورت کھلے چہرے اور ننگے ہاتھوں کے ساتھ نماز پڑھے گی اور ان کے ساتھ زمین کو چھوئے گی۔ یہ بات اس کی واضح دلیل ہے کہ چہرہ اور ہاتھ ستر میں شامل نہیں۔

امام موفق الدین ابن قدامہ نے المغنی (۶۳۹:۱) میں ابوبکر کے قول کی تردید اصول کی بنیاد پر کی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا قول المرأۃ عورۃ ایک عام حکم ہے جس کی تخصیص اللہ کا قول الا ما ظھر منھا اور اس سلسلہ کی صحیح احادیث کرتی ہیں۔۔۔ جمہور علماء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ آزاد عورت اپنے سر کو اوڑھنی سے ڈھانپے گی اور حالت نماز میں اس کا سر کھلا ہو تو اسے نماز دہرانی پڑے گی۔ امام مالک، اوزاعی اور شافعی کا قول ہے کہ آزاد عورت کا سارا جسم سوائے چہرے اور ہاتھ کے قابل ستر ہے (امام حنیفہ چہرے اور ہاتھ کے ساتھ پاؤں بھی استثناء میں شامل کرتے ہیں)۔۔۔ کیونکہ ابن عباس نے الا ما ظھر منھا کی تفسیر میں فرمایا ہے کہ اس سے مراد چہرہ اور ہاتھ ہیں کیونکہ نبی کریم ﷺ نے حالت احرام میں عورت کو نقاب اور دستانے پہننے سے منع کیا ہے اگر چہرہ اور ہاتھ بھی عورۃ ہوتے تو آپ ان کے چھپانے کو حرام قرار نہ دیتے۔ یہ اس لیے کہ ضرورت تقاضا کرتی ہے کہ خرید و فروخت کے لیے چہرہ اور لین دین کے لیے ہاتھ کھلے رہیں۔ امام احمد کا ایک قول بھی اسی مسلک کی تائید کرتا ہے

Marfat.com

اور اکثر حنبلی فقہا نے اس قول کا اتباع کیا ہے۔ اس مسئلہ کی تفصیل میری کتاب 'چہرے کا پردہ واجب یا غیر واجب' میں موجود ہے۔

تصریحات بالا کی روشنی میں یہ کہنا روا نہیں کہ خاتون کو عورۃ (قابل پوشیدگی) کہا جائے اور اصل حدیث بھی اس سلسلہ میں کوئی مدد نہیں کرتی۔ قرآن حکیم میں عورۃ کا لفظ درج ذیل چار مقامات پر وارد ہوا ہے۔

۱۔ سورۃ نور (۲۴:۳۱) میں اللہ کا ارشاد ہے: 'أَوِ الطِّفْلِ الَّذِينَ لَمْ يَظْهَرُوا عَلَىٰ عَوْرَاتِ النِّسَاءِ' وہ اپنی زینت ظاہر کرسکتی ہیں ایسے لڑکوں پر جو عورتوں کے مقامِ ستر (Carnal knolwledge) سے آگاہ نہیں۔

اس آیہ مبارکہ میں عَوْرات عورۃ (Pudenda) کی جمع ہے۔ فراء کے قول کے مطابق اکثر عرب عورات کو واو ساکنہ سے پڑھتے ہیں سوائے بنو ھذال کے جو واو کی حرکت کے ساتھ عَوَرات پڑھتے ہیں۔ مراد یہ ہے کہ ایسے بچے جو ابھی اتنے چھوٹے ہیں کہ وہ عورۃ (قابل ستر) اور غیر عورۃ (نا قابل ستر) میں تمیز نہیں کرسکتے یعنی نابالغ ہونے کی وجہ سے وہ عورت سے مجامعت کی طاقت نہیں رکھتے اور عورت کا جسم ان کے جنسی شعور کو ابھارتا نہیں۔ وہ کیا جانیں عورۃ کیا ہوتا ہے؟ مولانا امین احسن اصلاحی نے ان الفاظ میں اس کی وضاحت کی ہے کہ وہ بچے جن کے اندر جنسی شعور نہیں اور وہ عورتوں کے صنفی اعضاء کو اس نگاہ سے نہیں دیکھتے جس نگاہ سے ایک مرد دیکھتا ہے۔ ایسے بچوں کے سامنے خواتین اپنی زینت ظاہر کرسکتی ہیں۔

اس آیہ مبارکہ میں یہ بتایا گیا ہے کہ خواتین کے لیے عربی میں اسم ذات النساء ہے اور ان کے صنفی عضو عورۃ کی نسبت اسم ذات کی طرف کی گئی ہے۔ گویا صنفی عضو (عورۃ) کو اسم ذات کی جگہ استعمال کرنا لغوی طور پر محال ہے اور اگر اس سے اسم ذات کی توہین کا پہلو نکلتا ہو تو یہ بدتر ہے۔ یہ اس سلسلہ میں نص قطعی ہے کہ خواتین کی جگہ ان کے مقامِ ستر (Private Part) سے پکارنا لغوی طور پر بھی برا ہے اور دینی طور پر بھی برا ہے۔ یہ انسانیت کی توہین ہے۔

۲۔ سورۃ نور (۲۴:۵۸) میں اللہ کا ارشاد ہے: 'وَالَّذِينَ لَمْ يَبْلُغُوا الْحُلُمَ مِنكُمْ ثَلَاثَ مَرَّاتٍ مِّن قَبْلِ صَلَاةِ الْفَجْرِ وَحِينَ تَضَعُونَ ثِيَابَكُم مِّنَ الظَّهِيرَةِ وَمِن بَعْدِ صَلَاةِ الْعِشَاءِ ثَلَاثُ عَوْرَاتٍ لَّكُمْ' (اندر آنے کی اجازت لے لیا کریں) وہ جو تم میں سے بالغ نہیں تین مرتبہ نماز فجر سے پہلے اور دوپہر کو جب آرام کرنے کے لیے (دن کے)

Marfat.com

کپڑے اُتار دیتے ہو اور نمازِ عشاء کے بعد، یہ تین وقت تمہارے پردے کے ہیں'۔

اس آیہ مبارکہ میں خطاب مردوں اور عورتوں سمیت سب مومنوں سے ہے۔ ان کو خلوت (Privacy) کے آداب اور معاشرتی ضابطوں کی ہدایت کی گئی ہے۔ اس میں بھی عورات جو عورۃ کی جمع ہے۔ مردوں اور عورتوں دونوں کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔ لفظ عورۃ کے بنیادی معنی خلل اور نقص ہے اور کنایۃً کے طور پر اس کا اطلاق ان انسانی اعضاء پر ہوتا ہے جن کا کھولنا ناگوار لگتا ہے۔ جیسا کہ حدیث کے الفاظ ہیں: 'احفظ عورتك الامن زوجتك اوما ملكت يمينك'۔ 'اپنی بیوی اور اس عورت کے علاوہ جو جنگ میں تمھارے ہاتھ لگی، اپنی شرم گاہ کی حفاظت کر'۔ اس حدیث میں عورۃ کا لفظ واضح طور پر مرد کے لیے استعمال ہوا ہے۔ اسے صرف عورت کی ذات سے مخصوص کرنا لغوی طور پر درست نہیں۔ آیت مبارکہ میں تین حالتوں میں سے ہر حالت کو عورۃ کہا گیا ہے کیونکہ ان اوقات میں پردے اور حفاظت کے اہتمام میں خلل پڑ جاتا ہے۔ انسان پردے کا خیال نہیں رکھتا اور اس کے قابل ستر اعضا آرام کے لباس میں کھلے رہتے ہیں۔

۳۔ سورۃ احزاب (۱۳:۳۳) میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: 'وَيَسْتَأْذِنُ فَرِيقٌ مِّنْهُمُ النَّبِيَّ يَقُولُونَ إِنَّ بُيُوتَنَا عَوْرَةٌ وَمَا هِيَ بِعَوْرَةٍ' اور ان میں سے ایک فریق نبی ﷺ سے اجازت مانگتا تھا اور کہتا تھا کہ بیشک ہمارے گھر کھلے پڑے ہیں حالانکہ وہ کھلے نہیں تھے۔

اس آیت میں لفظ عورۃ سے مراد خلل اور شگاف ہے۔ جب مکان میں خلل ہو تو محاورۃً استعمال ہوتا ہے عَوِرَ المكان عورا مکان میں خلل پڑ گیا' اس طرح محاورہ ہے: اعور الفارس یعنی جب سوار پر وار کرنے کے لیے کوئی خلل یا شگاف ظاہر ہو۔ کہنے کا مطلب یہ تھا کہ ہمارے مکانوں میں خلل ہونے کی وجہ سے چوری چکاری اور دشمن کے حملے کا ڈر ہے۔ ان میں داخل ہونا آسان ہے کیونکہ ان کا کوئی محافظ نہیں۔

اس آیت کا تعلق غزوہ احزاب سے ہے۔ اجازت لینے والوں سے مراد ایک روایت کے مطابق اوس بن قیظی اور اس کا خاندان ہے اور دوسری روایت کے مطابق اجازت مانگنے والے بنو حارثہ تھے۔

لفظ عورۃ کی تشریح کے بارے میں مختلف اقوال ہیں۔ سدی کا قول ہے کہ ان کی دیواریں نیچی تھیں اس لیے چوری کا ڈر تھا۔ انہوں نے اجازت مانگی کہ وہ دیواریں اونچی کر کے غزوہ میں شریک ہو جائیں گے۔ کلبی کا قول ہے کہ وہ آدمیوں سے خالی ہیں اور غیر محفوظ ہیں۔ قتادہ کا قول ہے کہ وہ بہت دور ہیں ان کو دشمن کے حملے کا ڈر ہے۔ ان مختلف اقوال سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ عورۃ کا لفظ اپنے بنیادی معنی خلل کے لیے استعمال ہوا ہے۔ یہ اصل میں مصدر ہے جو مبالغہ کے معنوں میں بطور صفت استعمال ہوئی ہے۔

Marfat.com

اللہ نے ان منافقین کی جو اجازت مانگتے تھے یہ کہہ کر تکذیب کی کہ ان مکانوں میں کوئی خلل نہیں وہ غیر محفوظ اور خالی (Bare & Exposed) نہیں۔ ان کے گھر بالکل اسی طرح محفوظ ہیں جس طرح دوسرے مسلمانوں کے گھر ہیں اور خندق میں بیٹھی ہوئی فوج ان کی نگہبانی ایسے ہی کر رہی ہے جیسے دوسرے مسلمانوں کے گھروں کی۔ یہ سب منافقوں کے غزوہ احزاب میں نہ شریک ہونے کے حیلے بہانے ہیں۔

پہلی آیت میں لفظ عورات کنایہ کے طور پر استعمال ہوا ہے اور اس کی اضافت عربی میں خواتین کے اسم ذات النساء کی طرف ہے۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ دونوں کو ایک معنی میں استعمال کرنا قطعی غلط ہے۔ دوسری آیت میں لفظ عورات مردوں اور خواتین دونوں کے لیے استعمال ہوا ہے یعنی اگر خاتون کو عورۃ کہا جائے تو مرد کو بھی عورۃ کہنا پڑے گا۔ عورت کے ساتھ اس کی تخصیص غلط ہے۔ تیسری آیت میں لفظ عورۃ اپنے بنیادی معنوں یعنی خلل میں استعمال ہوا ہے اور یہ مصدر بطور صفت خاتون کی طرح مرد کے لیے بھی استعمال ہوتی ہے۔ اردو زبان کی مانند خاتون کے ساتھ اس کی تخصیص کا کوئی جواز نہیں۔

خلاصہ بحث

لغوی تشریحات اور آیات مبارکہ اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ عورۃ کے بنیادی معنی خلل اور عیب کے ہیں اور کنایۃً اسے مرد اور عورت کی شرم گاہ (سوأۃ) کے معنوں میں استعمال کیا جاتا ہے۔ یہ لفظ مصدر ہے اور اسے بطور صفت واحد، جمع اور مذکر، مؤنث کے لیے بولا جاتا ہے۔ محض خاتون پر اس کے اطلاق کی کوئی گنجائش ہی نہیں۔ عربی کی قدیم و جدید لغت میں اس لفظ کو خاتون کی ذات کے لیے استعمال نہیں کیا گیا ہے۔

عربی، فارسی اور ہندی کسی زبان میں بھی اس جیسا بھونڈا لفظ صنف انسانی کے لیے استعمال نہیں ہوا۔ فارسی زبان میں رشید الدین وطواط کے ایک شعر میں یہ لفظ شاذ طور پر استعمال ہوا ہے۔ اردو زبان میں عربی، فارسی اور ہندی کے شائستہ الفاظ کو چھوڑ کر عربی کے اس لفظ کا انتخاب کیا گیا جو توہین آمیز ہے۔ خدا بھلا کرے اس شخص کا جس نے سب سے پہلے یہ لفظ اردو میں داخل کیا۔ میرے اندازے کے مطابق وہ نہ تو شاعر تھا اور نہ ادیب، وہ ایک ذہین دانشور تھا جس نے اس لفظ کو اختیار کیا جو خاتون کے بارے میں اس کے ذہن میں موجود تصورات کی عکاسی کرتا ہے۔ خدا بھلا کرے اس کا جس نے اس لفظ کے بارے میں قرآنی مفہوم کو پس پشت ڈال کر جنس انسانی کے لیے ایک ایسے لفظ کا استعمال کیا جس میں خلل، عیب، برہنگی، ننگ و عار، شہوت و جنسیت اور حقارت و ذلت کے معانی یکجا موجود ہیں۔ لطف کی

Marfat.com

بات یہ ہے کہ اردو کی کم ذخیرہ لغات میں اس کے حقیقی معنی موجود ہیں لیکن اس زبان میں اس لفظ کو اصل معانی میں استعمال نہیں کیا گیا بلکہ اس صفت کو جو مرد و زن کے لیے یکساں ہے خاتون کی ذات پر چسپاں کر دیا گیا ہے۔ اسے اردو زبان کی کم مائیگی کہیے کہ خاتون کی صنف کے لیے اس زبان میں دوسرا کوئی لفظ موجود نہیں جو اس کا بدل ہو۔ اردو زبان میں اس لفظ کو Coin کرنے والے کی یہ نیکی قیام قیامت تک یاد رکھی جائے گی۔

ایسا کیوں کیا گیا؟ خاتون کے بارے میں دورِ جاہلیت کے تصورات کو راسخ کرنے کے لیے جو اسلامی تعلیمات کی روشنی میں ڈھندلا گئے تھے۔ امام راغب اصفہانی (متوفی ۵۲۰ء) مفردات میں لکھتے ہیں: مقامِ ستر کے کھلنے سے عار محسوس ہوتی ہے اس لیے عورۃ کہا جاتا ہے اور خواتین (نساء) کو بھی عورۃ اسی لیے کہا جاتا ہے۔ ان سے کوئی پوچھے کیا مرد کے مقامِ ستر کھلنے سے عار محسوس نہیں ہوتی؟ اس منطق کے تحت اسے عورۃ کیوں نہیں کہا جاتا۔ امام راغب اپنے زمانے کے سماجی میلانات کی نمائندگی کرتے ہیں۔ یہ سماج خاتون کو انسانی سوسائٹی سے الگ تھلگ دیواروں کے پیچھے مقید کرنے پر تلا ہوا ہے اور سمجھتا ہے کہ اگر عہدِ نبوت میں عورتیں پانچ وقت نماز مسجد میں جا کر ادا کرتی تھیں۔ نمازِ استسقاء، نماز کسوف و خسوف میں مردوں کے شانہ بشانہ شامل ہوتی تھیں یا عیدین مردوں کے ساتھ عید گاہ میں پڑھتی تھیں تو معاذ اللہ غلط کرتی تھیں۔ اگر وہ غزوات میں مردوں کی مرہم پٹی کرتی تھیں اور شمشیر بکف اللہ کے رسول کا دفاع کرتی تھیں تو معاذ اللہ غلط کرتی تھیں، اگر وہ کھیت کھلیان اور نخلستان میں مردوں کے شانہ بشانہ کام کرتی تھیں تو غلط کرتی تھیں۔ اگر وہ حدیث روایت کرتی تھیں، حدیث سننے کے لیے دور دراز کا سفر کرتی تھیں یا ان کے قائم کردہ حدیث کے حلقوں میں امام شافعی جیسے علما حدیث پڑھنے آتے تھے تو یہ معاذ اللہ غلط تھا۔ غرضیکہ ان کی سب دینی، اجتماعی اور اقتصادی سرگرمیاں خلاف اسلام تھیں۔ ان کے لیے سب سے بہتر کام گھر کی چار دیواری میں بند ہونا ہے۔ وہ تو پیدا ہی مردوں کی جنسی تسکین کے لیے ہوئی ہیں، وہ سراپا جسم ہیں، عقل سے عاری ہیں جبھی تو خاتون کے لیے عورۃ کی صفت کا اطلاق کیا جاتا ہے مگر ان تصورات کے باوجود کسی کو ہمت نہیں ہوئی کہ وہ عربی زبان میں لفظ عورۃ کو صنف انسان کے ساتھ مخصوص کر دے۔ یہ شرف صرف پاک و ہند کے اہل دین کو حاصل ہے کہ انہوں نے اپنے تصورات کو لفظ عورۃ کی شکل میں عملی جامہ پہنا دیا۔

Marfat.com

الفتیٰ (نوجوان)

لغوی مفہوم

احمد بن فارس نے مقاییس اللغۃ میں لکھا ہے کہ فاء ، تاء اور حرف علت کے دو بنیادی معنی ہیں ایک تازگی اور جدت اور دوسرے حکم کی وضاحت۔ پہلے معنی سے الفتی جوانی کا مفہوم نکلتا ہے چنانچہ فِتاء کے معنی عنوانِ شباب (The prime of life) کے ہیں۔ شاعر (ربیع بن ضبع الفزاری) کا قول ہے۔

اذا عاش الفتیٰ مائتین عاما
فقد ذهب البشاشة والفتاء

جب نوجوان دو سو برس زندہ رہتا ہے
تو اس کی شگفتگی اور جوانی کی بہار جاتی رہتی ہے۔

(شعر کے آغاز میں الفتیٰ مقصورہ ہے اور آخر میں الفتاء ممدودہ ہے)

دوسری اصل الفتیا ہے محاورہ ہے: 'أفتی الفقیه فی المسئلة' فقیہ نے مسئلہ کے بارے میں حکم واضح کیا۔ تاج العروس میں ہے: 'أفتی (اس نے فتوی دیا) کی اصل فتی ہے یعنی ایسا نوجوان جو تازگی اور قوت رکھتا ہو، گویا فتویٰ وہ دے سکتا ہے جس کے پاس علمی تازگی اور قوت ہو۔ فتاء اصل میں فتی کی مصدر ہے جس کے معنی نوجوان اونٹ کے ہیں پھر استعارۃً اس سے نوجوان مراد لیا جاتا ہے۔ اس کی جمع أفتاء ہے جیسے یتیم کی جمع ایتام ہے اور اس کی مونث فتیۃ ہے۔ فتی کے معنی لڑکے کے ہیں اس کی جمع قلت فِتیۃ اور جمع کثرت فِتیان ہے۔ اس کی مونث فتاۃ ہے جس کی جمع فتیات ہے۔ بطور کنایہ یہ لفظ غلام اور لونڈی کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔

قرآن حکیم میں حضرت ابراہیم کے لیے فتی کا لفظ نوجوان لڑکے کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ ارشاد ہے: 'قَالُوا سَمِعْنَا فَتًى يَذْكُرُهُمْ يُقَالُ لَهُ إِبْرَاهِيمُ' (الأنبیاء ۲۱: ۶۰) 'انھوں نے کہا کہ ہم نے ایک نوجوان کو جس کو ابراہیم کہہ کر پکارا جاتا ہے ان بتوں کا تذکرہ کرتے سنا ہے'۔ مگر سورۃ یوسف میں حضرت یوسفؑ کے لیے یہی لفظ غلام اور خادم کے معنوں میں ہے۔ ارشاد ربانی ہے: 'تُرَاوِدُ فَتَاهَا عَن نَّفْسِهِ' (الیوسف ۱۲: ۳۰) (عزیز مصر کی بیوی) اپنے غلام کو اس کے ارادے سے پھیر رہی ہے'۔ اسی سورت میں فتیان کا لفظ بھی غلاموں کے معنوں میں ہے۔ ارشاد ہے: 'دَخَلَ مَعَهُ

Marfat.com

السِّجْنَ فَتَیَانَ '(الیوسف ۳۶:۱۲) یوسف کے ساتھ قید میں دو غلام داخل ہوئے۔ تورات کے مطابق ان میں سے ایک ساقی اور دوسرا نانبائی تھا۔ اسی سورت میں ہے: ' وَقَالَ لِفِتْیَانِهِ '(الیوسف ۶۲:۱۲) یوسف نے اپنے غلاموں اور نوکروں سے کہا۔ سورۃ کہف میں ارشاد ربانی ہے: 'قَالَ لِفَتَاهُ آتِنَا غَدَائَنَا '(۶۲:۱۸) حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے غلام اور خادم کو کہا کہ ہمارا ناشتہ لاؤ۔ بالکل اسی طرح فتی کا مونث فتاۃ ہے جس کے معنی لونڈی کے ہیں اور اس کی جمع فتیات ہے قرآن نے دو مقامات (نساء ۲۵:۴) اور (النور ۳۳:۲۴) پر یہ لفظ استعمال کیا ہے۔ قرآن نے عبد اور امۃ جیسے توہین آمیز الفاظ کی جگہ اتنا باعزت لفظ کیوں استعمال کیا؟ اس کی تفصیل آگے آئے گی۔

اس کا فعل دو طرح سے آتا ہے زیادہ تر فَتُوَ، یَفْتُو، فِتَاء اور کبھی فَتِیَ، یَفْتَی، فَتَاءً آتا ہے۔ لسان العرب نے التہذیب کے حوالہ سے لکھا ہے: 'تَفَتَّتَتْ الجاریۃ 'لڑکی سن مراہقہ یعنی طفولیت اور بلوغ کے درمیانی عرصہ میں داخل ہوگئی۔ القاموس المحیط میں ہے: 'فُتِیَتْ البنت فَتَفَتَّتْ 'لڑکی کو بچوں کے ساتھ کھیلنے سے روک دیا گیا اور وہ رک گئی۔ تفتی الرجل آدمی سخی اور جوانمرد ہو گیا اس کا اسم فُتُوّۃ ہے۔

نوجوان کے علاوہ فتی کے لفظ کے لغت میں کئی معنی پائے جاتے ہیں۔ لسان العرب نے قتیبی کا قول نقل کیا ہے کہ فتی کے معنی نوجوان کے نہیں ہیں بلکہ ایک کامل اور دیالو آدمی کو فتی کہا جاتا ہے۔ شاعر کا شعر ہے:

ان الفتی حمّال کل مُلِمّۃ
لیس الفتی بمنعّم الشبان

بے شک فتی تو ہر مصیبت کا برداشت کرنے والا ہوتا ہے
ناز و نعمت میں پلا ہوا جوان فتی نہیں ہو سکتا۔

القاموس المحیط کے مطابق فتی سخی اور صاحب کرم نوجوان کو کہا جاتا ہے۔ اس کے معنوں میں سخاوت، قوت اور مروت شامل ہے۔

Lane Lexicon کی میں فتی کے یہ معنی لکھے ہیں:

Generous, Honorable, Liberal & Bountifal.

فتیات کا لفظ سب سے پہلے سورۃ نساء کی آیت میں یوں استعمال ہوا ہے: 'وَمَن لَّمْ یَسْتَطِعْ مِنكُمْ طَوْلًا أَن یَنكِحَ الْمُحْصَنَاتِ الْمُؤْمِنَاتِ فَمِن مَّا مَلَكَتْ أَیْمَانُكُم مِّن

Marfat.com

فَتَيٰتِكُمُ الْمُؤْمِنٰتِ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِاِيْمَانِكُمْ بَعْضُكُمْ مِّنْ بَعْضٍ (النساء ۴:۲۵) ؛ اور جو شخص تم میں سے یہ مقدور نہیں رکھتا کہ آزاد مومن عورتوں سے نکاح کرے تو تمھاری ان مومن نوجوان لڑکیوں سے نکاح کر لے جو تمھارے قبضے میں ہیں۔ اللہ تمھارے ایمان کو خوب جانتا ہے۔ تم ایک دوسرے کا جزو ہو۔ اس آیۂ مبارکہ میں اہلِ ایمان کو لونڈیوں سے نکاح کی ترغیب کے دو اسباب بیان کیے گئے ہیں ایک ان کا صاحبِ ایمان ہونا اور دوسرا یہ کہ غلام اور لونڈیاں، آزاد مرد اور آزاد عورتیں سب ایک ہی نسلِ انسانی کے افراد ہیں اور ایک دوسرے کا جزو ہیں۔

خود نبی کریم ﷺ کا عمل بتاتا ہے کہ وہ غلاموں اور لونڈیوں سے مساوات کا سلوک کرتے تھے چنانچہ ام المومنین حضرت صفیہ ملک یمین (لونڈی) تھیں۔ نبی کریم ﷺ نے ان کو آزاد کیا، ان سے نکاح کیا اور ان کو قریشی بیویوں کے برابر درجہ دیا۔ یہی حالت ماریہ قبطیہ کی تھی جن کے بطن سے حضرت ابراہیم علیہ السلام پیدا ہوئے۔ مصر کے بادشاہ نے انہیں بطور لونڈی آپ کی طرف بھیجا تھا مگر آپ نے اس کو بھی اتنا ہی مرتبہ دیا۔ وہ دیگر ازواج کی طرح حجاب میں رہتیں تھیں۔ ایسا ہی ریحانہ کا حال ہے جس کے متعلق ایک روایت میں صاف ہے کہ آپ نے ان کو آزاد کر کے ان سے نکاح کیا۔ ان ازواج کو حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ ان کی وفات تک دوسری ازواج کی طرح برابر وظیفہ دیتے رہے اور دوسری ازواج کی مانند آپ کی وفات کے بعد ان میں سے کسی کا نکاح نہیں ہوا۔ بخاری میں باب من اسلم من اھل الکتابین میں روایت ہے: الرجل تکون له الأمة فیعلمها فیحسن تعلیمها فیحسن أدبها ثم یعتقها لیتزوجها فله أجران ؛ جس شخص کے پاس ایک لونڈی ہے پھر وہ اسے تعلیم دے اور اچھی تعلیم دے۔ اس کو آداب سکھائے اور اچھے آداب سکھائے پھر اسے آزاد کر کے اس سے نکاح کر لے تو اس کے لیے دہرا اجر ہے۔

اسلام نے لونڈیوں کو سب سے پہلے فتیات کہہ کر اور پھر ان کو مساوی قرار دے کر ان کی عزتِ نفس بحال کی ہے۔ زیرِ نظر آیت میں بعضکم من بعض کے تحت پہلے گفتگو کر چکا ہوں۔

دوسری آیت جس میں لونڈیوں کے لیے فتیات کا استعمال ہوا ہے اور اس میں ایک اہم انسانی مسئلہ کو بیان کیا گیا ہے۔ وہ سورۃ نور کی یہ آیت ہے: وَلَا تُكْرِهُوْا فَتَيٰتِكُمْ عَلَى الْبِغَآءِ اِنْ اَرَدْنَ تَحَصُّنًا لِّتَبْتَغُوْا عَرَضَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَمَنْ يُّكْرِهْهُّنَّ فَاِنَّ اللّٰهَ مِنْۢ بَعْدِ اِكْرَاهِهِنَّ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (۲۴:۳۳) اور اپنی نوجوان لڑکیوں (لونڈیوں) کو اگر وہ پرامن رہنا چاہتی ہیں بدکاری پر مجبور نہ کرو تاکہ تم دنیا کی زندگی کا سامان چاہو اور جو کوئی انہیں مجبور کرے گا تو اللہ ان کے جبر کے بعد بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔

Marfat.com

شانِ نزول

اس آیت کے سبب نزول کے بارے میں مختلف روایات ہیں۔

مسلم اور ابوداؤد نے جابر بن عبداللہ سے روایت کی ہے کہ عبداللہ بن ابی کی مُسیکہ نامی ایک لونڈی تھی اور دوسری کا نام اُمیمہ تھا وہ ان دونوں کو زنا پر مجبور کرتا تھا ان دونوں نے رسول اللہ ﷺ کے پاس شکایت کی تو آیت نازل ہوئی۔ ابن ابی حاتم نے سدی سے روایت کی ہے کہ عبداللہ بن ابی کی معاذہ نامی ایک لونڈی تھی۔ جب کوئی اس کے یہاں مہمان آتا تو وہ اسے شب بسری کے لیے اس کے ہاں بھیج دیتا۔ مقصد یہ ہوتا کہ اجرت بھی مل جائے گی اور مہمان کا احترام بھی ہو جائے گا۔ وہ حضرت ابوبکرؓ کے پاس آئی اور شکایت کی۔ حضرت ابوبکرؓ نے رسول کریم ﷺ سے ذکر کیا۔ آپؐ نے حکم دیا کہ اسے (اپنے پاس) روک لیں۔ عبداللہ بن ابی نے شور مچایا۔ مجھے محمد ﷺ سے کون بچائے گا؟ وہ ہمارے غلاموں پر قبضہ کرنے لگے ہیں تو آیت نازل ہوئی۔ ایک روایت ہے کہ عبداللہ بن ابی کی معاذہ، مسیکہ، امیمہ، عمرہ، قتیلہ اور اروی نامی چھ لونڈیاں تھیں۔ جن کو وہ بدکاری پر مجبور کرتا تھا۔ اس نے ان پر ٹیکس عائد کر رکھا تھا۔ ایک اس کے پاس ایک دن دینار اور دوسری عمدہ سبز چادر لائی تو وہ ان سے کہنے لگا جاؤ پھر بدکاری کرو۔ تو وہ کہنے لگیں ہم ایسا نہیں کریں گی کیونکہ اللہ نے ہمارے لیے دین اسلام پسند کیا ہے اور زنا کو حرام قرار دیا ہے۔ وہ دونوں اللہ کے رسول ﷺ کے پاس آئیں اور شکایت کرنے لگیں تو آیت نازل ہوئی۔

طبرانی، بزار اور ابن مردویہ نے صحیح سند کے ساتھ ابن عباس سے روایت کی ہے کہ عبداللہ ابن ابی کی لونڈی جاہلیت میں زنا کرتی تھی اور اس کے لیے اولاد جنتی تھی۔ جب اللہ نے زنا حرام قرار دیا تو وہ اس سے کہنے لگا تو زنا کیوں نہیں کرتی؟ تو اس نے جواب دیا کہ بخدا وہ کبھی بھی زنا نہیں کرے گی اس پر وہ اسے مارتا۔ پیٹتا تب آیت نازل ہوئی۔

یہ تمام روایات ایک شخص کے ساتھ مخصوص نہیں ہیں جس کے بارے میں آیت نازل ہوئی بلکہ وہ سب مکلفین کے لیے عام ہیں۔ دوسرے یہ بھی اگر چہ لونڈیوں کے ساتھ خاص ہے مگر شریف زادیوں کا بھی یہی حکم ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد اس آیت کے تحت لکھتے ہیں کہ کلدانیوں، ہندوؤں اور رومیوں کی طرح عربوں میں یہ طریقہ عام تھا کہ لونڈیوں سے پیشہ کراتے تھے اور ان کی کمائی کھاتے تھے۔ بڑے بڑے معزز لوگوں کا اس طرح زنا کو علانیہ رائج کرنا بتاتا ہے کہ عرب میں زنا کاری کی حالت کہاں تک پہنچ چکی تھی۔ ان لوگوں نے زمانہ جاہلیت میں چکلے کھول رکھے تھے جن میں وہ اپنی لونڈیوں سے پیشہ کراتے

Marfat.com

تھے اوران کی کمائی کھاتے تھے۔ مسعودی کی مروج الذاہب (۱۰:۳) کے مطابق پیشہ ور عورتوں کے لیے طائف سے باہر ایک محلہ مخصوص تھا جس کے مکانوں پر جھنڈا لہراتا تھا۔ اس محلے کو حارة البغایا (پیشہ ور عورتوں کا محلہ) کہا جاتا تھا۔ اسی محلہ میں حارث بن کلدہ نے اپنی لونڈی سمیہ کو بٹھادیا تھا۔ اسی سمیّہ سے ابوسفیان نے زمانہ جاہلیت میں بدکاری کی اور اسی کے نطفہ سے زیاد پیدا ہوا جسے زیاد بن ابیہ یا زیاد بن ابی سفیان کہا جاتا ہے اسی رشتہ کی وجہ سے امیر معاویہ نے زیاد کو اپنا بھائی قرار دے دیا تھا۔

بعض لوگوں نے اسلام کے دور میں بھی خفیہ چکلے قائم کئے ہوئے تھے۔ ایسا ہی ایک چکلہ رئیس المنافقین عبداللہ بن ابی نے مدینہ میں قائم کررکھا تھا جہاں وہ اپنی لونڈیوں کو زنا پر مجبور کرتا اوران کی آمدنی سے فائدہ اٹھاتا تھا۔ شان نزول کی روایات اس کے اس کردار پر روشنی ڈالتی ہیں۔ ایسے دیوث لوگ بھلا کس طرح رضامند ہوسکتے تھے کہ لونڈیاں ان کے چنگل سے نکل کر پاکدامنی اختیار کریں یا کسی کے قیدِ نکاح میں ہوکر زندگی گزاریں۔ اصلاحات کے دور میں بقول مولانا امین احسن اصلاحی 'نیکی کے رجحان کا پیدا ہونا ایک قدرتی امر تھا لیکن اس کی زد ان مالکوں کے مفاد پر پڑتی تھی جنہوں نے زمانہ جاہلیت میں چکلے قائم کررکھے تھے'۔

غلامی کا زمانہ تو گزر چکا مگر عورت کا استحصال اس کی کمزوری اور بے بسی کی وجہ سے تاحال باقی ہے۔ غربت زدہ علاقوں سے عورت کو خرید کر یا شادی کا جھانسہ دے کر لایا جاتا ہے اوران کو کوٹھوں کی زینت بنایا جاتا ہے۔ گھروں میں ملازمہ لڑکیوں سے بدکاری کرکے ان کا گلا گھونٹ دیا جاتا ہے جب تک یہ پدر شاہی سوسائٹی رہے گی عورت کا استحصال ہوتا رہے گا۔ زیر نظر آیت میں لونڈیوں کے مالکوں سے خطاب مردوں کے غلبہ کی طرف اشارہ کرتا ہے جو برائی کی اصل جڑ ہے۔ عورت کو فتنہ سمجھنے والے خود فتنہ کا سرچشمہ ہیں۔

پس منظر

جب اسلام نے زنا پر حد جاری کرنے کا حکم دیا، غلاموں اور لونڈیوں کے نکاح کی ہدایت فرمائی اور مکاتب (قسط وار مال ادا کرکے آزادی) کے ذریعہ سے لونڈیوں اور غلاموں کی آزادی کی راہ ہموار کی تو لونڈیوں کے مالکوں کو حکم دیا کہ وہ ان کو ذاتی مفاد کے لیے حرام کاری پر مجبور نہ کریں ورگرنہ مجبور ہونے کی وجہ سے اللہ ان کو تو معاف کردے گا البتہ مالک اپنا انجام سوچ لیں۔ اکراہ صرف اس وقت صورت پذیر ہوتا ہے جب جان کا ڈر ہو۔ معمولی خوف کو اکراہ سے تعبیر نہیں کیا جاسکتا۔ زنا پر مجبور کرنا کلمہ کفر پر مجبور کرنے کے برابر ہے۔ اکراہ سے مراد وہ دعوت ہے جو مالک ان کو بدکاری کے لیے دیتے تھے تاکہ

Marfat.com

وہ مال حاصل کریں جو وہ اس نجس طریقے سے حاصل کرتی تھیں۔اس لفظ میں مار پیٹ اور تشدد سب شامل ہے،اکراہ سے تکلیف (فرائض) کا حکم ساقط ہو جاتا ہے۔حدیث کے الفاظ میں 'رُفع عن امتی الخطأ والنسیان وما استکرھوا علیہ 'میری امت کو غلطی بھول چوک یا وہ بات جس پر اسے مجبور کیا جائے معاف ہے'۔لونڈی تو اپنے مالک کی ملکیت ہے اس کے اختیار میں کچھ نہیں ہوتا،مالک اسے جس شخص کے لیے چاہے جائز قرار دے سکتا ہے۔

فتیات

جیسا کہ لغوی تشریح میں بتایا جا چکا ہے کہ جو فتی کی مونث فتاۃ ہے اور اس کی جمع فتیات ہے۔ اس لفظ میں سخاوت،مروت اور بہادری کے مفہوم کو بھی پہلے واضح کر دیا گیا ہے۔

قرآن مجید میں لفظ فتی اور فتاۃ کو غلاموں کے لیے بطور اصطلاح استعمال کیا گیا ہے تاکہ معاشرے کے اندر ان کی عزت بڑھے۔فتیات کا لفظ لونڈیوں کے معنی میں استعمال کیا گیا ہے۔مولانا امین احسن اصلاحی فرماتے ہیں: 'لونڈیوں اور غلاموں کے لیے الفاظ کی یہ تبدیلی بھی انہی اصلاحات کا ایک جزو ہے جو ان کے معاشی درجہ کو اونچا کرنے کے لیے ظہور میں آئیں۔مقصود اس لفظ کی تبدیلی سے غلاموں اور لونڈیوں کے اندر احساس خودداری کو پیدا کرنا اور لوگوں کو اس حقیقت کی طرف متوجہ کرنا تھا کہ اب لوگ غلاموں اور لونڈیوں سے متعلق اپنے قدیم تصورات کو بدلیں اور ان کو اپنے معاشرے کے بھائی بہنوں کی طرح دیکھیں۔نبی کریم ﷺ کی حدیث ہے: 'لیقل أحدکم فتای وفتاتی ولا یقل عبدی و أمتی 'تم میں سے ہر کسی کو فتای اور فتاتی (میرا نوجوان لڑکا اور لڑکی) کہنا چاہیے یہ نہیں کہنا چاہیے عبدی و امتی (میرا غلام اور میری لونڈی) یہ الفاظ اللہ کو سزاوار ہیں جبھی تو حضرت عمرؓ نے عمروؓ بن عاص کے بیٹے کو کہا تھا: 'متی استعبدتم الناس وقد ولدت أمھاتھم احرارا 'تم نے کب سے لوگوں کو غلام بنا لیا جبکہ ان کی ماؤں نے انہیں آزاد جنا ہے؟

بغاء

بغی کی مصدر ہے اس سے مراد اپنی شرمگاہ کی حفاظت نہ کر کے اللہ کی حدود سے بغاوت کرنا ہے۔ سب مفسرین نے اس کے معنی زنا لکھے ہیں: 'فان اُردن تحصنا' 'جبکہ وہ پاکدامن رہنا چاہیں'۔ آیت کے اس ٹکڑے میں حرف شرط ان کے استعمال نے مفسرین کو ورطہ حیرت میں ڈال دیا ہے۔بعض مفسرین نے اس کی تفسیر یہ کی ہے کہ لونڈی کے مالک کے لیے صرف اس صورت میں نہی ہے اگر لونڈی عفت کی خواہاں ہو لیکن اگر بدکاری کا ارتکاب مالک کی دعوت اور لونڈی کی رضا اور رغبت سے ہو تو اس

Marfat.com

بدکاری کی ممانعت نہیں۔ یہ مفہوم قطعی غلط ہے اس ٹکڑے میں حرف ان نہ قید کے لیے ہے اور نہ شرط کے لیے۔ نہی زنا سے بچنے کے لیے ان کے ارادہ اور دوسروں کو اس حکم سے خارج کرنے سے مخصوص نہیں۔ یہ مطلب نہیں کہ وہ اگر زنا سے بچنا چاہیں تو انہیں مجبور نہ کرو اور اگر بچنا نہ چاہیں تو مجبور کرو کیونکہ مجبور تو اسے ہی کیا جا سکتا ہے جو کسی کام کو نہ کرنا چاہے۔ یہ محض صورت حال کا بیان ہے ان لوگوں کے بارے میں جن کی یہ عادت تھی۔ مقصد ان کی بری عادت کو نمایاں کرنا اور ان کے فعل کے گھناؤنے پن کو ابھارنا ہے۔ ایک طرف جوان لڑکی ہے جس کو وفور شہوت بدکاری کی دعوت دیتی ہے اس کی حفاظت کا کوئی سامان نہیں اور نہ ہی اسے برائی سے روکنے والے محاسن کی خبر ہے، پھر بھی وہ پاکدامنی کی خواہش رکھتی ہے۔ دوسری طرف مالک ہے، اگر اس کے ہاں کم سے کم مروت ہو پھر بھی وہ اپنی لونڈی کی برائی پر راضی نہیں ہو سکتا، چہ جائیکہ وہ اسے زنا پر مجبور کرے اور وہ زنا سے انکار کرے۔ یہ پرلے درجے کی خست اور کمینگی ہے۔ یہ ان کے فعل کی برائی ظاہر کرنے کے لیے مبالغہ کا ایک اسلوب ہے۔ یہی وجہ ہے کہ علامہ عبداللہ یوسف نے ان کا ترجمہ if کی بجائے when کیا ہے اور عبدالماجد دریابادی نے ان کا ترجمہ while کیا ہے۔ البحر المحیط میں اس بارے میں ابن عیسیٰ کا قول ہے کہ اکراہ کو گھناؤنا کرنے کے لیے شرط کا صیغہ استعمال ہوا ہے۔ کرمانی کا قول ہے کہ ظاہری طور پر یہ شرط ہے حقیقت میں شرط نہیں جیسا کہ اللہ کا قول ہے: اِنْ عَلِمْتُمْ فِيهِمْ خَيْرًا (النور ۲۴: ۳۳) اگر تم ان میں بہتری پاؤ حالانکہ اگر ان میں کوئی بہتری معلوم نہ بھی ہو تو بھی مکاتبت صحیح ہو گی۔

اس ٹکڑے میں لفظ تحصن سے مراد شادی ہے۔ وہ لونڈیاں شادی کے ذریعہ سے اپنے آپ کو پاکدامن رکھنے کی رغبت رکھتی ہیں۔ ان کو شادی سے روکنا ہی حقیقت میں اکراہ ہے۔ کیونکہ حالت غلامی میں ان کے پاس زنا کے سوا کوئی چارہ نہیں، خواہ وہ چاہیں یا نہ چاہیں۔ آزاد عورت محصنہ ہوتی ہے خواہ وہ شادی شدہ ہو یا غیر شادی شدہ، جبکہ صرف شادی شدہ لونڈی محصنہ ہوتی ہے۔ لونڈی سے شادی اس کی عزت کا باعث بنتی ہے، وہ اسے خست سے نکال کر شریف زادی کے برابر لا کھڑا کرتی ہے کیونکہ شادی کی وجہ سے اس کے حقوق و فرائض متعین ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ اس ٹکڑے کا ترجمہ یہ ہو گا: "تمہاری لونڈیاں جو شادی کے ذریعہ اپنے آپ کو پاکدامن رکھنا چاہیں ان کو شادی سے روک کر بدکاری پر مجبور نہ کرو۔"

لتبتغوا عرض الحياة الدنيا

محض اس لیے کہ دنیوی زندگی کا وہ سامان تم کو حاصل ہو جائے جو مالک اور اس کی لونڈی کی رغبت

Marfat.com

کے درمیان حائل ہے۔ امام طبری نے عرض الحیاۃ الدنیا سے مراد عمدہ ساز و سامان، زیب و زینت اور مال و دولت لیے ہیں۔ لفظ عرض کے اصل معنی ایسا ساز و سامان ہے جو جلد ہی فنا ہونے والا ہو۔ اس میں اس علت کی طرف اشارہ ہے جس کی وجہ سے اکراہ کی ضرورت پڑتی ہے۔ اکراہ کی قید اس اعتبار سے نہیں کہ نہی کا دارومدار اس پر ہے بلکہ اس اعتبار سے ہے کہ یہ ان کی عادت تھی۔ مقصد یہ ہے کہ ان کی برائی کو نمایاں کیا جائے کہ وہ چند سکوں کے بدلے گناہ کا اتنا بڑا بوجھ اٹھا لیتے تھے۔

فان اللہ من بعد اکراھھن غفور رحیم اللہ تعالیٰ ان کے مجبور کیے جانے کے بعد بخشنے والا مہربان ہے۔ ابن مسعودؓ کی قرأت کے مطابق لھن غفور رحیم ہے۔ ابن ابی حاتم نے سعید بن جبیر کے واسطہ سے اسے نقل کیا ہے اور یہی روایت ابن عباسؓ سے بھی ہے اور اس کی تائید من بعد اکراھھن کرتا ہے۔ اکراہ مصدر مبنی للمفعول ہے۔ اس کا انّ کے اسم اور خبر کے درمیان آنا اس بات کا اعلان ہے کہ اکراہ مغفرت اور رحمت کا سبب ہے۔ ابن ابی شیبہ اور ابن جریر نے مجاہد سے روایت کی ہے کہ بخشش اور رحمت مجبور عورتوں کے لیے ہے نہ کہ مجبور کرنے والے مردوں کے لیے۔ تابعی حسنؒ جب یہ آیت تلاوت کیا کرتے تھے تو کہتے تھے لھن واللہ لھن بخشش ان عورتوں کے لیے ہے بخدا ان عورتوں کے لیے ہے۔ اس سے پہلے من یکرھھن (جو ان کو مجبور کرے گا) کا جملہ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ مجبور کرنے والے کلیتہً مغفرت اور رحمت سے محروم ہوں گے۔ فنا ہونے والے سامان کے بدلے اللہ کی مغفرت اور رحمت سے محروم ہونا کتنی بڑی محرومی اور کتنا بڑا عذاب ہے اور ان مجبور عورتوں کے لیے اکراہ (جبر) پر پکڑ کا ساقط ہونا ہی اللہ کی بخشش اور رحمت کا مصداق ہے۔

ابن العربی نے احکام القرآن میں لکھا ہے کہ مغفرت کا تعلق مجبور اور بے بس سے ہے جیسا کہ اللہ کا قول ہے فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (البقرۃ ۲:۱۷۳)۔ جو شخص لاچار ہو جائے بشرطیکہ نہ تو (لذت کی) خواہش کرنے والا ہو اور نہ حد سے تجاوز کرنے والا ہو تو اس پر کوئی گناہ نہیں۔ بے شک اللہ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔

خلاصۂ بحث

معاشرے میں غلامی کے وجود سے زیادہ خطرناک ان غلاموں کی طرف سے جسم فروشی کا پیشہ اختیار کرنا ہے۔ زمانہ جاہلیت میں لوگ اپنی لونڈیوں سے پیشہ کرواتے تھے اور ان سے ٹیکس وصول کرتے تھے۔ یہ پیشہ آج تک قائم ہے۔ اب لونڈیوں کی جگہ غریب نادار اور بے بس عورتیں ہیں جن کا استحصال مرد کرتے ہیں اور ہیرا منڈی میں بٹھا کر ان کی کمائی کھاتے ہیں۔ لونڈیوں کے مالکوں کی جگہ گاہکوں کے

Marfat.com

وڈیروں اور شہر کے بدمعاشوں نے لے لی ہے۔ یہ جو آئے دن کی وارداتیں ہوتی ہیں اس کی کڑیاں اسی پیشے سے ملتی ہیں۔ گاؤں میں وڈیرے اپنے مزارعوں کا استحصال کرتے ہیں اور شہروں میں آسودہ حال لوگ گھریلو ملازم عورتوں کا استحصال کرتے ہیں تو دفتر میں افسر اپنی ماتحتوں کا استحصال کرتے ہیں۔

اسلام نے معاشرے کو پاک صاف کرنے کے لیے زنا کو حرام قرار دیا ہے اور اس کے لیے خاص حکم (نص) نازل کیا ہے پھر ان لوگوں کو منع کیا ہے جو لونڈیوں کو حرام کاری پر مجبور کر کے ان کی کمائی کھاتے تھے۔ پھر ان مجبور اور لاچار عورتوں کے لیے بخشش اور رحمت کا اعلان کیا ہے۔

لونڈیوں کو بدکاری پر مجبور کرنے کی ممانعت اسلامی معاشرہ کو صاف کرنے کی سکیم کا حصہ ہے۔ مقصد جنسی تسکین کے لیے غلط راستوں کو بند کرنا ہے کیونکہ بدکاری کا وجود سہولت کی وجہ سے بہت سے لوگوں کو ورغلاتا ہے۔ اگر وہ بدکاری کی طرف راہ نہ پائیں تو جائز طریقوں سے جنسی لذت کو حاصل کرنے کی کوشش کریں گے۔ لازم ہے کہ جنسی میلان صاف ستھرا ہو، تاکہ آنے والی نسلیں چین سے زندگی گزار سکیں۔

مسئلے کا حل

سب سے پہلے اقتصادی نظام کو درست کرنے کی ضرورت ہے تاکہ ہر فرد معقول زندگی گزارنے اور شادی کرنے کے قابل ہو۔ اس نظام کی خرابی ان چکلوں کے وجود کا باعث ہے جن سے آدمیت کی تذلیل ہوتی ہے۔ ذرائع پیداوار اور دولت کی مساویانہ تقسیم اور مواقع کی مساویانہ فراہمی اس گندگی کو ختم کرنے میں کافی حد تک معاون ثابت ہو سکتی ہے۔ غلط رسم و رواج کا خاتمہ کر کے شادی بیاہ کو آسان بنایا جائے۔ جہیز کی ممانعت ہو اور حق مہر کی حد مقرر ہو۔ یہ رسم و رواج اتنے تباہ کن ہیں کہ غریب آدمی بیاہ کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔

خواتین کو تعلیم کی اشد ضرورت ہے تاکہ وہ اپنے حقوق سے واقف ہو کر ان کا مطالبہ کر سکیں۔ اس طرح وہ اقتصادی طور پر اپنے پاؤں پر کھڑی ہو جائیں گی اور کسی کو ان کا استحصال کرنے کی جرأت نہ ہوگی۔ جو لوگ عورت کو گھر کی چار دیواری میں محصور کر کے اسے مرد کا دست نگر بنانا چاہتے ہیں وہ عورت کے ساتھ ظلم کر رہے ہیں۔ مزے کی بات یہ ہے کہ وہ سب کچھ اسلام کے نام پر کرتے ہیں حالانکہ اسلام

Marfat.com

اس کی قطعی اجازت نہیں دیتا۔ ان لوگوں کا یہ تصور کہ عورت کو معاشرے سے کاٹ کر گھر میں بٹھا دیا جائے تو وہ زنا سے محفوظ رہیں گی قطعی طور پر خلاف حقیقت ہے۔ زنا سے بچاؤ کا دارومدار تربیت پر ہے اگر والدین بچوں کی تربیت دھیان سے کریں گے تو بچے برائی سے بچ جائیں گے خواہ وہ گھر کے اندر ہوں یا باہر اور اگر تربیت میں غفلت ہوگی تو گھر کے اندر بیٹھے ہوئے بچے بھی زنا سے نہیں بچ سکتے۔

گاؤں میں عورت مرد کے ساتھ کھیت کھلیان میں کام کرتی ہے وہاں بدکاری کے واقعات شہروں سے کہیں کم ہیں۔ کیونکہ وہاں عورتیں دن بھر اپنے کام میں مشغول رہتی ہیں گھر کے اندر بیٹھ کر ٹیلیویژن کے سامنے اپنا وقت نہیں گزارتیں۔

اسلام نے گھر سے باہر سرگرمیوں کے لیے مردوں اور عورتوں کے طرزِ گفتگو، چال ڈھال اور لباس کی تراش خراش کے بارے میں بڑی صحیح ہدایات دی ہیں جن کا گھر کے اندر کے ماحول سے کوئی تعلق نہیں۔ عہدِ نبوت اور خلافتِ راشدہ کے ادوار میں عورتیں مردوں کے شانہ بشانہ نخلستانوں میں، معاشرتی زندگی میں اور میدانِ جنگ میں حصہ لیتی تھیں مگر پاکیزگی کا دامن تھامے رکھتی تھیں۔ اسلام اس طرح اپنے پاک صاف نظام کی تکمیل چاہتا ہے۔ ایسا نظام جو زمین کو آسمان سے ملاتا ہے اور عالم بشر کو ایک ایسے روشن اُفق کی طرف بلند کرنا چاہتا ہے جو اللہ کے نور سے منور ہو۔

Marfat.com

فریق (جماعت۔گروہ)

لغوی مفہوم

فَرَقَ یَفرُقُ، فَرَقَ یَفرِقُ۔اس کی مصدر فَرقٌ بھی ہے اور فُرقانٌ بھی۔اس کے بنیادی معنی ایک چیز کو دوسری چیز سے الگ کرنا ہیں جیسے فَرَقَ البحرَ اس نے سمندر کو پھاڑا۔ فَرَقَ الشَّعرَ اس نے دونوں طرف سے بال الگ کر کے مانگ نکالی، فرق بینھما دونوں کو ایک دوسرے سے جدا کر دیا۔فِرق کسی چیز سے الگ ہونے والے ٹکڑے کے ہیں جیسا کہ سورۃ شعراء (۲۶:۶۳) میں ہے: فَانفَلَقَ فَكَانَ كُلُّ فِرقٍ كَالطَّودِ العَظِيمِ 'پس اسی وقت سمندر پھٹ گیا اور (پانی کا) ہر ٹکڑا بڑے پہاڑ کی مانند ہو گیا۔اسی سے فرقہ ہے جس کے معنی لوگوں کے گروہ اور جماعت کے ہیں جیسا کہ سورہ توبہ (۹:۱۲۲) میں ہے: فَلَولَا نَفَرَ مِن كُلِّ فِرقَةٍ مِّنهُم طَائِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوا فِي الدِّينِ 'پھر ایسا کیوں نہ کیا جائے کہ ان کی جماعت میں سے چھوٹا گروہ جایا کرے تا کہ وہ دین کی سوجھ بوجھ حاصل کرے۔ آیت میں فرقہ کے معنی لوگوں کی جماعت کے ہیں۔

فَرَق اور فَرْق سر کی مانگ کو کہا جاتا ہے۔نبت فَرِق متفرق نباتات کو کہا جاتا ہے جو ایک دوسرے سے فاصلہ پر ہو۔

فریق

جماعت جو فرقہ سے بڑی ہوتی ہے۔یہ ایسی جماعت کو کہتے ہیں جو دوسروں سے الگ ہو چنانچہ قرآن میں ہے: فَرِيقٌ فِي الجَنَّةِ وَفَرِيقٌ فِي السَّعِيرِ '(الشوریٰ ۴۲:۷) اس کی جمع فرقاء، افرقہ اور فروق آتی ہے۔سو سے کم بھیڑ بکریوں کے ریوڑ کو بھی فریق کہا جاتا ہے۔جدید عربی میں یہ ٹیم کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔

تشبیہ کے طور پر فاروق اس بدلی کو کہا جاتا ہے جو دوسری بدلیوں سے الگ ہو۔

فریقین

قرآنِ حکیم کی درج ذیل آیات میں ایک فریق یا دو فریقوں کا ذکر ہے۔مومنوں اور کافروں کے دو فریق ہیں ان دونوں میں مرد اور عورتیں لازمی طور پر شامل ہیں۔

سورۃ بقرہ (۲:۸۵)، آلِ عمران (۳:۷۸)، انعام (۶:۸۱)، اعراف (۷:۳۰)

Marfat.com

توبہ (۹:۱۲۲)، ھود (۱۱:۲۴)، نحل (۱۶:۵۴)، مریم (۱۹:۷۳)، مومنون (۲۳:۱۰۹)، نور (۲۴:۴۷، ۴۸)، شعراء (۲۶:۶۳)، نمل (۲۷:۴۵)، روم (۳۰:۳۳)، سبا (۳۴:۲۰)، شوریٰ (۴۲:۷)۔

حق اور باطل کا ٹکراؤ تاریخ انسانیت کے آغاز سے ہوتا آرہا ہے اور قیام قیامت تک چلتا رہے گا۔ ابلیس و آدم کے قصہ میں شیطان نے آدم کو چیلنج کیا تھا کہ وہ اس کی نسل میں چند باصلاحیت لوگوں کو چھوڑ کر سب کو بہکانے کی کوشش کرتا رہے گا۔ اللہ نے انسان کو صاحب اختیار بنایا اور خیر و شر کی تمیز اس کی فطرت میں ڈال دی، اس اعتبار سے انسان دو فریقوں میں بٹ گیا۔ ایک فریق وحی کی روشنی میں صحیح راستے پر چلنے والا اور صرف اللہ کی عبادت کرنے والا موحدین کا فریق جو صرف اللہ سے ڈرتا اور اسی سے امید باندھتا ہے۔ دوسرے مشرکین کا اور منافقین کا فریق جو وحی سے انکار کرتا ہے اور اللہ کے علاوہ دوسرے معبودوں کی پرستش کرتا ہے اور انھیں سے ڈرتا اور انھیں سے امید باندھتا ہے۔ مومن اہل جنت ہیں اور کافر اہل جہنم۔ اس حقیقت کی طرف اس آیت میں ارشاد ملتا ہے: ھُوَ الَّذِیْ خَلَقَکُمْ فَمِنْکُمْ کَافِرٌ وَّمِنْکُمْ مُّؤْمِنٌ (التغابن ۶۴:۲) پھر جیسے ابتدا ہوئی تھی قیامت کے دن بھی وہ ویسے ہی ہوں گے۔ کَمَا بَدَاَکُمْ تَعُوْدُوْنَ ہ فَرِیْقًا ھَدٰی وَفَرِیْقًا حَقَّ عَلَیْھِمُ الضَّلٰلَۃُ (۷:۲۹ تا ۳۰) تم کو اللہ نے جس طرح شروع میں پیدا کیا تم پھر ویسے ہی ہو جاؤ گے۔ ایک فریق ہدایت یافتہ ہے اور دوسرا فریق جس پر گمراہی ثابت ہو چکی ہے۔ جب تک دنیا قائم ہے نیکی اور بدی کا تصادم قائم رہے گا۔ نیکی کا ساتھ دینے والوں کا انجام بھی واضح ہے اور بدی کا ساتھ دینے والوں کا انجام بھی۔ آدم اور حوا کو پھل نہ کھانے کے حکم الٰہی میں اس بات کی دلیل ہے کہ ابتدا ہی سے مرد اور عورت کو شر کے ساتھ ٹکراؤ کا اختیار دیا گیا ہے۔ قرآن نے حوا کو بھی اس فعل کا اسی طرح ذمہ دار ٹھہرایا ہے جس طرح آدم کو۔ اس پورے قصہ میں تثنیہ کا صیغہ استعمال ہوا ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ حوا جنت میں اختیار اور ارادہ میں شریک تھیں اور اس اختیار کا صحیح و غلط نتیجہ بھگتنے میں بھی شریک تھیں۔ یہ نہیں ہوا کہ ایک تو زمین پر اتر جائے اور دوسرا جنت میں رہے۔ مرد یا عورت ابتدائے آفرینش سے ذمہ داری، جزا و سزا، حریت فکر، ارادہ اور اختیار میں برابر ہیں اور لفظ فریق میں بھی وہ اس اعتبار سے برابر کے شریک ہیں۔

قوت و ضعف کا نظریہ

عباس محمود العقاد اپنی کتاب المرأۃ فی القرآن میں لکھتے ہیں کہ قرآن حکیم میں انسانی رویہ عدل و احسان کے اصول پر قائم ہے نہ کہ قوت یا ضعف کے اعتبارات پر۔ عورت جو کفایت اور قدرت میں

Marfat.com

پیچھے رہ گئی ہے یہ سب مردوں کے غلبہ کا کیا دھرا ہے۔ کیا بدنی قوت غلبہ اور فضیلت کی دلیل بن سکتی ہے؟ تاریخ میں ہم دیکھتے ہیں کہ تسلط اور غلبہ حاصل کرنے والے مغلوبین کی نسبت جسم کے کمزور تھے۔ بدنی طور پر طاقتور لوگ ان کی خدمت پر مامور تھے پھر ہم دیکھتے ہیں کہ مقہور و مغلوب لوگوں نے حکومتیں قائم کیں اور سیادت و قیادت میں طاقتوروں سے بڑھ گئے۔ بدقسمتی سے مشرق میں ایک ہی قدر کو تسلیم کیا جاتا ہے وہ ہے قوت۔ کسی کا کمزور ہونا ان کے نزدیک اسے ذلیل و رسوا کرنے کے لیے کافی ہے۔ قوت کی اس پرستش کی وجہ سے مرد عورت کو حقیر سمجھتا ہے اس لیے اس کا دل عورت کی انسانیت کے احترام سے خالی ہے۔ اگر کوئی عورت مال و دولت والی ہوگی تو مشرق کے ماحول میں وہ صاحب عزت ہوگی۔

قرآن حکیم نے سورۃ بقرہ (۸۵:۲) میں قوت کے اس تصور پر کاری ضرب لگائی ہے ارشاد ہے: ثُمَّ أَنتُمْ هَـٰؤُلَاءِ تَقْتُلُونَ أَنفُسَكُمْ وَتُخْرِجُونَ فَرِيقًا مِّنكُم مِّن دِيَارِهِمْ تَظَاهَرُونَ عَلَيْهِم بِالْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَإِن يَأْتُوكُمْ أُسَارَىٰ تُفَادُوهُمْ وَهُوَ مُحَرَّمٌ عَلَيْكُمْ إِخْرَاجُهُمْ "لیکن پھر بھی تم نے آپس میں قتل کیا اور ایک فریق کو ان کے گھروں سے نکال دیا، گناہ اور زیادتی کے طور پر ان کے خلاف دشمن کی مدد کی، ہاں جب وہ قیدی ہو کر تمہارے پاس آئے تو تم نے ان کے فدیے دیے لیکن ان کو نکالنا جو تم پر حرام تھا' (اس کا کچھ خیال نہ کیا)۔ یہودیوں سے مخاطب ہو کر کہا گیا ہے کہ ایک فریق کو کمزور دیکھا تو اس جان کر اُن کے گھروں سے نکالتے ہو، اس کے بعد انہیں قید سے چھڑانے کے لیے نیکیاں کماتے ہو ہمارے یہاں بھی وہی شکل ہے جسے یہودیوں نے اختیار کر رکھا تھا۔ ہمارے مذہبی رہنما ایک طرف تو یہ کہتے ہیں کہ خدا کا حکم ہے تم غلام اور لونڈیاں بناؤ اور دوسری طرف یہ کہا جاتا ہے کہ خدا نے غلاموں اور لونڈیوں کو رہا کرنا بڑے ثواب کا کام قرار دیا ہے۔ ایک طرف تو یہ کہا جاتا ہے کہ اسلام نے عورتوں کو مغرب سے زیادہ حقوق دیے ہیں دوسری طرف عورت کو اپنی مرضی کے مطابق شادی کی اجازت نہیں دی جاتی اور اگر وہ شادی کر لے تو اسے غیرت کے نام پر قتل کر دیا جاتا ہے۔ عورتوں پر گھریلو تشدد ہوتا ہے اور جب اس کے خلاف آواز بلند کی جاتی ہے تو جاگیردارانہ اور قبائلی رسوم و رواج کی پشت پناہی کی جاتی ہے۔ یہ سب کچھ اسلام کے نام پر ہوتا ہے۔ عورت کو ایسی دنیا میں جیون بسر کرنا پڑتا ہے جہاں مرد کا تسلط ہے جہاں مذہبی رہنما مرد کو حاکم اور عورت کو محکوم سمجھتے ہیں۔ جہاں عورت غیر محفوظ ہے قدم قدم پر اس کی تحقیر ہے، تذلیل ہے، اس کے لیے خوف ہے، خدشہ ہے، کیا ان حقوق کا ڈھنڈورا پیٹا جاتا ہے؟ قوت و ضعف کے اس تصور کا مذاق زیر نظر آیت میں اُڑایا گیا ہے۔ نبی کریم ﷺ نے درست فرمایا تھا کہ میری امت یہودیوں کی قدم بقدم پیروی کرے گی۔ سورۃ مریم (۷۳:۱۹) میں

Marfat.com

اللہ کا ارشاد ہے: 'کافر مومنوں سے کہتے ہیں کہ دونوں فریقوں میں سے کس کا مرتبہ زیادہ ہے اور کس کی مجلس شاندار ہے؟ اس آیت میں کافروں سے مراد قریش کے نضر بن حارث، عمرو بن ہشام اور ولید بن مغیرہ جیسے سردار ہیں اور مومنوں سے مراد بلال، آلِ یاسر (یاسر کے بیٹے عمار اور بیوی سمیہ جس نے سب سے پہلے اسلام کے پودے کو اپنے خون سے سینچا) خباب اور ان کے بھائی بند فقراء ہیں یعنی دونوں فریقوں میں سے کونسا فریق دنیوی لحاظ سے سعادت مند ہے۔ وہ بڑے جو محمد ﷺ پر ایمان نہیں رکھتے یا وہ فقراء جو اس کے گرد جمع ہیں تا کہ اسے بلندی و پستی اور برتری و کم تری کا معیار قرار دیا جائے۔ اللہ نے کہا یہ زمین والوں کی منطق ہے جن کا تعلق ہر زمان و مکان میں عالم بالا سے ٹوٹا ہوا ہوتا ہے۔ ہماری حکمت یہ ہے کہ عقیدہ کسی ٹیپ ٹاپ کا محتاج نہیں ہوتا، اسے صرف وہی قبول کرتے ہیں جو مخلص ہوتے ہیں۔ وہ ہوا و ہوس کے بندے نہیں ہوتے، نہ وہ مال و متاع کے طلبگار ہوتے ہیں۔ ایسے بندوں کی تعریف اللہ نے سورۃ مومنون (۱۹:۲۳) میں کی ہے۔ اللہ نے ان کی تعریف کی حالانکہ قریش ان کا مذاق اڑاتے تھے۔

امن و سلامتی کس فریق کے لیے ہے

سورۃ انعام (۸۱:۶) میں اللہ کا ارشاد ہے: 'فَاَیُّ الْفَرِیْقَیْنِ اَحَقُّ بِالْاَمْنِ اِنْ کُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ' اگر تم جانتے ہو تو بتاؤ دونوں فریقوں میں سے امن کا زیادہ حقدار کون ہے؟ پھر جواب دیا ہے: 'اَلَّذِیْنَ آمَنُوْا وَلَمْ یَلْبِسُوْا اِیْمَانَهُمْ بِظُلْمٍ اُولٰٓئِكَ لَهُمُ الْاَمْنُ وَهُمْ مُّهْتَدُوْنَ'، جو لوگ ایمان لائے اور اپنے ایمان کو شرک سے خلط ملط نہ کیا ایسے لوگوں کے لیے امن ہے اور وہی ہدایت یافتہ ہیں' (سورۃ انعام ۸۲:۶)۔ فریقین سے مراد توحید پرست مرد اور عورتیں اور بت پرست مرد اور عورتیں ہیں۔ ایک فریق اللہ کی عبادت کرتا ہے اور دوسرا اللہ کے سوا دوسرے معبودوں کی پرستش کرتا ہے یا صراحت کے ساتھ یوں کہیں کہ ایک طرف ابراہیم علیہ السلام ہیں اور دوسری طرف بت پرست۔ ایک مقام امن میں محفوظ و مامون فریق ہے اور دوسرا مقام خوف میں غیر محفوظ اور غیر مامون۔ بات کہنے کو جو اسلوب اختیار کیا گیا ہے وہ نظم قرآنی میں ایثار کی مثال ہے۔ یہ نہیں کہا گیا کہ امن کا کون زیادہ حقدار ہے میں یا تم؟ اپنے آپ کو پاکباز کہنے سے گریز کیا گیا ہے۔ یہ ایک تاکیدی اسلوب ہے جو حکم کی علت سے آگاہ کرتا ہے۔ دوسرے فریق کی غلطی کو صراحت کے ساتھ بیان نہیں کیا گیا تا کہ ضد اور عناد کا باعث نہ بنے۔ ساتھ ہی اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ امن و نجات کسی ذات سے مخصوص نہیں بلکہ یہ ہر توحید پرست کو حاصل ہو گی۔ یہ توحید کی طرف رغبت دلانے کا ایک انداز ہے۔ مومن کے پاس تو توحید کے دلائل ہیں جو مظاہر قدرت

Marfat.com

میں پھیلے ہوئے ہیں۔ وحی اُس کی رہنمائی کرتی ہے جبکہ مشرک کے پاس اللہ کی اُتاری ہوئی کوئی دلیل نہیں۔ صرف اوہام ہیں یا باطل تاویلیں۔ اس سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ دُنیا و آخرت کی امن و سلامتی کا حق دار کون ہے؟ آیت کا مفہوم ہے کہ مکمل امن مکمل ہدایت سے مشروط ہے۔ ایمان اور توحید وہ دو عناصر ہیں جو امن کی ضمانت دیتے ہیں۔ امن سے مراد دنیا میں خوف سے امن، بدبختی سے امن، آخرت میں عذاب سے امن اور نجات ہے۔ ان دونوں متضاد فریقوں میں مرد بھی شامل ہیں عورتیں بھی۔ ایک فریق ہدایت یافتہ ہے اور دوسرا گمراہ، ہدایت یافتہ فریق کے مرد اور عورتیں، گمراہ فریق کی مرد اور عورتوں سے اللہ کی نظر میں افضل ہیں۔ وجہ فضیلت صرف ایمان اور توحید ہے اس لیے مومن اور موحد عورتیں گمراہ مردوں سے کہیں بہتر ہوں گی۔ وجہ فضیلت صرف مرد ہونا نہیں بلکہ اس کا انحصار کارکردگی پر ہے۔

اسلام کا نظام تعلیم

سورۃ توبہ (۱۲۲:۹) میں حق تعالیٰ کا ارشاد ہے: "وَمَا كَانَ الْمُؤْمِنُونَ لِيَنفِرُوا كَافَّةً فَلَوْلَا نَفَرَ مِن كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَائِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوا فِي الدِّينِ وَلِيُنذِرُوا قَوْمَهُمْ إِذَا رَجَعُوا إِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُونَ" "اور مسلمانوں کو یہ نہیں چاہیے کہ سب کے سب نکل کھڑے ہوں ایسا کیوں نہ کیا جائے کہ اُن کی ہر بڑی جماعت میں سے ایک چھوٹی جماعت نکلے تا کہ وہ دین کی فہم و بصیرت حاصل کرے اور تا کہ یہ لوگ جب اپنی قوم کے پاس لوٹ کر جائیں تو ان کو ڈرائیں ہو سکتا ہے وہ (برائی سے) بچ جائیں۔" صاحب روح المعانی نے کہا ہے کہ اکثر لوگوں کا خیال ہے کہ نفر سے مراد طالب علم کا خروج ہے۔ یہ حکم جہاد کے حکم کے علاوہ ایک مستقل حکم ہے۔ امام رازی کا بھی یہی قول ہے۔

لَوْلَا نَفَرَ بات کرنے کا ایک خوبصورت انداز ہے۔ جب آپ یہ کہتے ہیں لولاد خلت علی۔ ایسا کیوں نہیں ہوا کہ آپ میرے یہاں آتے۔ کہنے کا مطلب ہوتا ہے کہ اگر آپ میرے پاس آجاتے تو مجھے خوشی ہوتی۔ مقصد ترغیب و تخصیص ہے۔ آیت زیرِ نظر سے پہلے دو آیات میں ان لوگوں کے رویے کو ناپسند کیا گیا ہے جو غزوہ تبوک میں پیچھے رہ گئے تھے اور اس اجرِ عظیم کو واضح طور پر بیان کیا جو اللہ نے مجاہدین کے لیے مخصوص کیا ہے۔ جس کے پیش نظر ہو سکتا تھا کہ سب کے سب مسلمان جہاد کے لیے نکل جاتے اگر ایسا ہو جاتا تو معاشرے کے نظام میں خلل پیدا ہو جاتا۔ یہ تدبیر الٰہی تھی کہ جہاد کے فرنٹ کے سوا ان کے لیے ایک نیا فرنٹ کھول دیا گیا اور اس کی طرف خروج کو جہاد کی طرف نفو (خروج) کی مانند قرار دے دیا۔ یہ خروج دین کی فہم و بصیرت حاصل کرنے کے لیے ہے۔ جہاد تو صرف مردوں پر فرض تھا

Marfat.com

مگر طلب علم مرد اور عورت دونوں پر فرض ہے۔"علم کے میدان میں جہاد میدان کارزار میں جہاد بالسیف کی مانند ہے۔ وہ دلوں سے جہالت اور گمراہی کے پردوں کو ہٹاتا ہے اور ان کا رخ محبت اور بھائی بندی کی طرف موڑتا ہے۔ یہ جہاد اکبر ہے کیونکہ دلائل سے بحث کرنے کا اثر شمشیر زنی سے بڑھ کر دیرپا ہوتا ہے۔ دین کی فہم و بصیرت مسلمان کے دل و دماغ میں صحیح ایمان کو راسخ کرتی ہے اور اسلامی معاشرے کے لیے مومن افراد تیار کرتی ہے۔ یہاں نفر کے معنی کجاوے کسنا یا باندھنا نہیں بلکہ علم کے حصول کے لیے کمر باندھنا اور راستے کی مشکلات کے مقابلے میں ہمت باندھنا ہے۔ اہلِ علم کی دوات کی سیاہی کو شہداء کے خون کے ترازو میں تولا گیا ہے۔ یہ خروج صرف میدان کارزار اور میدان علم تک محدود نہیں بلکہ زندگی کی کشمکش کے ہر میدان تک پھیلا ہوا ہے۔ جہاں کہیں انسان ایسے عمل صالح کے میدان میں جو اس کے لیے اور دوسروں کے لیے مفید ہو، مشکلات کو صبر و استقامت سے برداشت کرے گا وہ جہاد کی طرح خروج کہلائے گا اور کرنے والا مجاہدین کے زمرے میں شمار ہوگا۔ یہ آیت اسلامی معاشرے کے ہر فرد کے لیے دعوت عام ہے کہ وہ زندگی کے کسی میدان کو خالی نہ چھوڑے اور ہر میدان میں شریک ہو کر اپنی بہترین ذہنی اور جسمانی صلاحیتوں کا اظہار کرے۔ شرط صرف یہ ہے کہ وہ اپنے عمل میں مخلص ہو اور سستی اور کوتاہی کے بغیر اپنی پوری قوت صرف کرے، وگرنہ اس کے عمل کو منافقت اور خیانت سمجھا جائے گا جو اللہ اور ان کے رسول کے ساتھ منافقت اور خیانت کے مترادف ہوگا۔ یہ حکم مرد اور عورت دونوں کے لیے ہے۔

غزوہ تبوک کے بعد وہ قبائل جو اسلام کی تباہی کے درپے تھے انھوں نے جب دیکھا کہ مسلمان قیصر روم کا مقابلہ کر سکتے ہیں تو انھوں نے مقابلہ کا خیال چھوڑ دیا۔ نبی ﷺ کے پاس جوق در جوق آنے لگے اور اسلام کے بنیادی اصولوں کی تعلیم حاصل کر کے دین اسلام میں داخل ہونے لگے۔ دین کا بنیادی مقصد سیرت کی تعمیر ہے۔ اسی لیے رسول ﷺ کا اولین فرض کتاب و حکمت کی تعلیم قرار دیا گیا۔ اسی لیے جب اسلام کا دائرہ وسیع ہوا تو اس کے لیے تعلیم کا نظام مرتب کیا گیا۔ وہ یوں کہ ہر قبیلہ کے کچھ آدمی مدینہ آ کر تعلیم حاصل کریں اور یہی لوگ واپس جا کر اپنے قبیلے کے باقی لوگوں کو تعلیم دیں تاکہ زندگی کا کاروبار بھی چلتا رہے اور تعلیم و تعلم کا سلسلہ بھی جاری رہے۔ یہ فرض کفایہ مردوں کے لیے بھی تھا اور عورتوں کے لیے بھی کہ وہ دین کی فہم و بصیرت پہلے خود حاصل کریں پھر دوسروں کو تعلیم دیں۔ اس کے لیے قرآن نے انــــذار (ڈرانے) کا لفظ استعمال کیا ہے۔ تعلیم کا مقصد مخلوق کو حق کی دعوت دینا اور سیدھے راستے کی طرف رہنمائی کرنا ہے۔ صاحب کشاف نے تفقہ فی الدین (دین کی فہم و بصیرت) کے بارے میں

Marfat.com

فرمایا ہے' کہ تفقہ کے معنی کوشش کرکے دین کے فہم وبصیرت کوسیکھنا اوراُس کے حصول میں مشکلات کو برداشت کرنا ہے۔ لینذروا قومھم میں انذار کا مقصد اپنی قوم کوآنے والے دنوں سے ڈرانا، ان کی رہنمائی کرنا اوراُن سے خیر خواہی کرنا ہے نہ کہ وہ گھٹیا مقصد جس کی طرف ہمارے علمائے دین چل نکلے ہیں۔ وہ سینہ تان کر صدر مجلس بننے کے خواہاں ہوتے ہیں، لباس اور سواری میں ظالموں اور جابروں کی نقل کرتے ہیں، سوتنوں کی طرح ایک دوسرے سے مقابلہ کرتے ہیں، اپنی آنکھوں کی پتلیوں کو گھماتے رہتے ہیں اور جب کسی دوسرے کے مدرسہ کو دیکھتے ہیں کہ کچھ لوگ اس کے علما کے سامنے دوزانو ہوکر بیٹھے ہوئے ہیں تو اس بات کے لیے مرے جاتے ہیں کہ لوگ اُن کے سامنے بھی دوزانو ہوکر بیٹھیں۔ یہ لوگ اللہ کے اس قول سے کس قدر بعید ہیں' لَا یُرِیْدُوْنَ عُلُوًّا فِی الْاَرْضِ وَلَا فَسَادًا '(۸۳:۲۸) 'وہ زمین پر نہ تو تکبر اور بلندی کی خواہش رکھتے ہیں اور نہ فساد کی'۔ لفظ فساد سے ذہن اقبال کے مصرعہ کی طرف منتقل ہو رہا ہے۔ بقول 'کارملائی سبیل اللہ فساد'

حقیقت یہ ہے کہ جو دین کے ذریعے سے دنیا کا طالب ہوتا ہے اس پر اللہ کا قول (۱۸: ۱۰۳ تا ۱۰۴) 'قُلْ هَلْ نُنَبِّئُكُمْ بِالْاَخْسَرِيْنَ اَعْمَالًا ۝ اَلَّذِيْنَ ضَلَّ سَعْيُهُمْ فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَهُمْ يَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ يُحْسِنُوْنَ صُنْعًا ۝' 'کہہ دیجئے کہ کیا تمہیں بتاؤں کہ اعمال کے اعتبار سے سب سے زیادہ خسارے میں کون ہیں؟ وہ کہ جن کی تمام تر کوششیں دنیوی زندگی میں گم ہوکر رہ گئیں اور وہ یہی سمجھتے رہے کہ وہ بہت اچھا کام کر رہے ہیں'۔ تفقہ سے مراد سطحی علم نہیں بلکہ اس سے مراد تحقیقی علم ہے جو چیز دن کی تہہ تک پہنچ جائے۔ دین کی یہی سمجھ بوجھ عالم کو مجاہد کے مقام تک بلند کرتی ہے۔ ایسا عمل جو عامل کو موجود وسائل کے مطابق درجہ کمال تک نہ پہنچائے وہ اللہ کے راستہ میں جہاد کے برابر شمار نہ ہوگا۔ اس عامل کے لیے ممکن نہ ہوگا کہ وہ مجاہدین یا متفقہین کی لڑی میں شامل ہو۔

تفقہ فی الدین کے لیے کتاب وسنت کے علاوہ تمام معاصر علوم خواہ اُن کا تعلق سائنس سے ہو، معاشیات، اقتصادیات یا اجتماعیات سے ہو، اُن سے آگاہ ہونا ناگزیر ہے۔ دین کے فہم وبصیرت کے لیے ایسے علوم کی ضرورت ہے جو تخلیقی صلاحیتیں بیدار کریں۔ یہ صلاحیتیں اٹھارہویں صدی کے فلسفہ و منطق یا کتاب وسنت کو رٹنے سے کبھی بھی پیدا نہیں ہوسکتیں۔ اس کے لیے ایسے سرپھرے محققین کی ضرورت ہے جو اپنا تن من دھن اس کام کے لیے وقف کردیں نہ کہ شعلہ بیان مقررین کی، جو لوگوں کے جذبات سے کھیلتے رہیں۔ آیت کے الفاظ سے واضح ہے کہ یہ کسی گروہ کی اجارہ داری نہیں بلکہ تحصیل وتبلیغ کے اس کام میں پوری امت شریک ہوگی مرد بھی اور عورت بھی۔ کس قدر افسوس کا مقام ہے کہ ہمارے

Marfat.com

مذہبی رہنما اپنے آپ کو اس آیت کا مصداق سمجھتے ہیں حالانکہ وہ اس کے اہل نہیں۔ عصری علوم تو دور کی بات ہے وہ پوری طرح کتاب وسنت سے بھی آگاہ نہیں۔ جو تھوڑی بہت شدھ بدھ اُن کو ہے اس کو بھی انھوں نے مذہبی فرقوں کے سانچے میں ڈھالا ہوا ہے۔ کسی مدرسے میں تحقیق وتدوین کا شعبہ نہیں۔ عصری تقاضوں کو سامنے رکھ کر کتاب وسنت کی روشنی میں مسائل کو سمجھے بغیر جہاں تقلید کو وجوب کا درجہ حاصل ہو، یہ کام کیسے ہو سکتا ہے؟ نہ ان کی نگاہ بلند ہے نہ ان کی سخن دلنواز اور نہ ان کے دل میں وسعت ہے مگر اس کے باوجود پیشوائی اور رہنمائی کا دعویٰ ہے۔ ان کے خلوص کے بارے میں پانچویں چھٹی صدی کے زمخشری کا تجزیہ کس قدر حقائق پر مبنی ہے۔ وہ کہتے ہیں:

'آج بھی اسلام کو ایسے محققین کی ضرورت ہے جو دین میں بصیرت حاصل کریں اور دنیا میں مختلف قوموں کی طرف نکل جائیں اور جب ان قوموں میں سے کچھ لوگ اسلام لے آئیں تو پھر وہی لوگ دین کا فہم اور بصیرت حاصل کر کے اپنی قوم کی رہنمائی کریں۔ دین میں فہم وبصیرت کے بغیر کم علم لوگ کتنے ہی ملکوں کا چکر لگائیں یا سیر کریں کچھ بھی حاصل نہ ہوگا'۔

مومن اپنے اللہ سے دنیا اور آخرت کی بھلائی کی دعا کرتا ہے۔ اسلام میں نہ دنیا معیوب ہے اور نہ اس کے علوم معیوب ہیں۔ بری بات یہ ہے کہ انسان دنیا میں محو ہو کر آخرت کو بھلا دے۔ آیت زیر بحث میں لطیف اشارہ اس بات کا موجود ہے کہ تعلیم کا مقصد دینی اور دنیوی مصلحتوں کا قیام ہے۔ ان مصلحتوں کا تعلق زندگی کے تمام معاملات سے ہے۔ مسلمانوں کو دوسروں کا دست نگر ہونے کی بجائے ایسے افراد تیار کرنے چاہیں کہ جو ان مصلحتوں کو روبکار لا سکیں اور یہ جدید علوم، جن کو ہم دنیوی علوم کا نام دیتے ہیں، کے بغیر ممکن نہیں۔ علم تو بہرکیف علم ہے اس میں دین اور دنیا کی تفریق روا نہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ یہ علم ہماری دنیوی مصلحتوں کو پورا کرنے کے بعد ہمیں خالق کائنات سے قریب تر لے جائے۔ موجودہ دور کی ساری دریافتیں اور ایجادات ہماری توجہ اس خالق کی طرف موڑتی ہیں جس نے اشرف المخلوقات انسان کو اتنی صلاحتیں عطا کی ہیں۔ تاریخ اسلام کے سنہری دور میں ایسے علماء گزرے ہیں جن کو بیک وقت کتاب وسنت کے ساتھ ساتھ فزکس، کیمسٹری، طب، فلسفہ اور عمرانیات میں دسترس حاصل تھی۔ آخر آج کل ایسا کیوں نہیں ہو رہا؟ محض علم کی کمی کی وجہ سے۔ یہ آیت اس بات کی دلیل ہے کہ دین میں فہم وبصیرت کا انحصار علم کو عام کرنے پر ہے۔ اپنے وطن میں تعلیم کی صلاحیت پیدا کرنے سے ہی لوگ صحیح طریقہ سے دین کی بصیرت حاصل کریں گے اور دوسروں کے لیے ہدایت کا سبب بنیں گے۔ اس نیت سے تمام علوم سے لیس ہو کر ذہن میں بصیرت کی غرض وغایت کو پورا کرنے والا اللہ کے یہاں اپنے مال

Marfat.com

وجان سے جہاد کرنے والے سے کمتر نہیں بلکہ اس سے برتر ہے چونکہ وہ اعلائے کلمۃ اللہ کا فریضہ سرانجام دے کر پوری ملت اسلامیہ کا دفاع کرتا ہے۔ افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ ہمارے دینی مدارس موجودہ نصاب کے ساتھ کبھی بھی دین میں فہم وبصیرت کی صلاحیت والے طالب علموں کو پیدا نہیں کرسکیں گے۔ وہ زیادہ سے زیادہ بقول اقبال دو رکعت کے امام تیار کررہے ہیں جو قوموں کی امامت کے تصور سے بے بہرہ ہیں۔

آغاز اسلام میں خواتین کی تعلیم

آیت زیرنظر میں تفقہ فی الدین کا حکم مردوں کے لیے بھی ہے اور عورتوں کے لیے بھی لفظ فریق اس پر دلالت کررہا ہے۔ اس بارے میں امام رازی نے تفسیر کبیر میں اس آیت کی تفسیر میں بڑی خوبصورت بات کہی ہے وہ فرماتے ہیں کہ ''اگر اپنے وطن میں تحصیل علم ممکن ہو تو سفر واجب نہیں لیکن چونکہ آیت کا لفظ نفر سفر کی دلیل ہے تو ہماری رائے یہ ہے کہ نفع بخش علم کا حصول سفر کے بغیر ممکن نہیں''۔ ابتدائی ایام میں مسلمان خواتین نے گھربار چھوڑ کر دُور دراز ملکوں کا سفر کیا اور غربت وبے وطنی کی زندگی بسر کرکے حدیث وفقہ کی تعلیم حاصل کی۔ درج ذیل سطور میں ایسی خواتین کی علمی سرگرمیوں کا انتہائی مختصر تعارف کراؤں گا۔ اس سلسلہ میں مصری مصنف عمر رضا کحالہ کی أعلام النساء دیکھی جاسکتی ہے جو پانچ جلدوں میں ہے۔

امام ابن قیم کے نزدیک جن صحابہ کرام سے فقہی مسائل اور فتوے منقول ہیں ان کی تعداد ۱۱۳ ہے۔ اس میں مرد اور عورتیں دونوں شامل ہیں۔ انھوں نے فقیہ اور مفتی خواتین کے تین طبقے بنائے ہیں۔

طبقہ علیا: حضرت عائشہؓ

طبقہ وسطیٰ (درمیانی): حضرت ام سلمہؓ

طبقہ سفلیٰ (نچلا): ام المومنین صفیہؓ، حفصہؓ، اُم حبیبہؓ، جویریہؓ، میمونہؓ، سیدہ فاطمۃ الزہراء، ام عطیہؓ، اُسماءؓ بنت ابی بکر، اُم شریکؓ، اُم الدرداءؓ، عاتکہؓ بنت زید، فاطمہؓ بنت قیس، اُمِّ ایمن، اُم یوسف غامدیہؓ۔

حضرت عمر بن عبدالعزیز نے ابوبکر بن محمد بن حزم کو خاص طور پر تاکید کی وہ حضرت عمرۃ بنت عبدالرحمان انصاریہ کے مجموعہ احادیث کو حاصل کریں۔ جن خواتین نے دیارِ غیر میں جاکر علم حاصل کیا ان میں چند نام یہ ہیں۔

۱۔ اُم حسین، جھہ بنت احمد محمیۃ نے اپنے وطن نیشاپور سے بغداد کا سفر کرکے شیوخ ومحدثین سے

Marfat.com

راویت کی۔ ۳۹۶ھ میں شیخ ابوالحسن محمد بن محمد شروطی بغدادی نے ان سے بغداد میں روایت کر کے ان کی شاگردی کا شرف حاصل کیا۔

۲۔ ام علی تقیہ بنت ابوالفرخ غیث بن علی بغدادیہ نے بغداد سے مصر جا کر مدتوں قیام کیا اور اسکندریہ میں امام ابوطاہر احمد بن محمد سلفی سے علم حاصل کیا۔

۳۔ زلیخا بنت الیاس الواعظہ غزنین کے شہر کی رہنے والی تھیں۔ وہاں سے مکہ مکرمہ گئیں اور علماء ومحدثین سے روایت کی۔ کئی سال حرم میں رہنے کے بعد فارس کے شہر ساوہ چلی گئیں۔

۴۔ ام محمد زینب بنت احمد بن عمر کا وطن بیت المقدس تھا۔ امام ذہبی نے ان کا ذکر کیا ہے چونکہ دور دراز کا سفر کر کے تحصیل علم اور حدیث کی روایت میں مشہور تھیں اس وجہ سے دور دراز ملکوں کے طلبہ حدیث ان سے روایت کرتے ہیں۔

۵۔ کریمہ بنت احمد مروزیہ خراسان کے شہر مرو کی رہنے والی تھیں۔ مکہ مکرمہ میں حدیث کا درس دیتی تھیں۔ خطیب بغدادی نے ان سے پانچ دن میں صحیح بخاری پڑھ کر روایت کی۔ امام سمعانی، ابن المطلب اور ابوطالب زینبی جیسے ائمہ حدیث نے ان سے صحیح بخاری کی روایت کی ہے۔

۶۔ امتہ الرحمان بنت الفقہا بنت شیخ تقی الدین صرف جزء بن عرفہ کے سماع کے لیے شیخ عبدالحق کی خدمت میں حاضر ہوئیں۔

۷۔ عائشہ بنت محمد حرانیہ نے امام زین العابدین عراقی اور امام بلخی سے روایت کے لیے ان حضرات کی درسگاہ کا سفر کیا۔

۸۔ شمس الضحیٰ بنت محمد بن عبدالجلیل عالمہ فاضلہ، عابدہ اور زاہدہ تھیں۔ انھوں نے شیخ طریقت ابوالنجیب سہروردی کی خدمت میں رہ کر تصوف کی تربیت پائی۔

۹۔ صفیہ بنت ابراہیم حرمین شریفین کی عابدات کی مرشد تھیں۔ اصلاح وتربیت کی خدمت بھی سرانجام دیتی تھیں۔ مرد فقراء اور عباد وزہاد کی بھی خدمت کرتی تھیں۔

چھٹی صدی ہجری میں تاتاریوں کی جنگلی اور وحشی قوم کو ان مسلمان عورتوں نے حلقہ بگوش اسلام کیا جن کو وہ باندیاں بنا کر لے گئے تھے۔

تصنیفات

امام ذہبی نے عجیبہ بنت حافظ محمد بن ابی طالب بغدادیہ کے بارے میں لکھا ہے کہ انھوں نے اپنے

Marfat.com

اساتذہ اور شیوخ حدیث کے حالات دس جلدوں میں لکھے تھے۔اُم محمد فاطمہ بنت محمد اصفہانی کو تصنیف وتالیف کا بڑا سلیقہ تھا۔انھوں نے الرموز من الکنوز نامی کتاب پانچ جلدوں میں لکھی تھی۔

ان خواتین کے اسماء کو مشتے از خروارے سمجھنا چاہیے۔ وگرنہ لا تعداد خواتین کے نام کتابوں میں موجود ہیں جنہوں نے ہر میدان میں فعال حصہ لیا۔ مذکورہ بالا حوالوں سے کم از کم یہ تو ثابت ہوتا ہے کہ اسلام کے ابتدائی زمانے میں خواتین علم کے حصول کے لیے گھر سے باہر نکل کر دور دراز کا سفر کرتی تھیں اور یہ کہ مردوں کے حلقہ ہائے درس میں خواتین شریک ہوتی تھیں اور عورتوں کے حلقہ ہائے درس میں مرد شریک ہوتے تھے اور یہ جو آج کل ہمارے یہاں مذہبی رہنما مردوں اور عورتوں میں علمی تمیز کا نعرہ بلند کر رہے ہیں اور عورت کے فرائض کو گھر کی چار دیواری میں محدود کر رہے ہیں اس دور میں اس بات کا نام ونشان تک نہ تھا۔ وہ اپنے وضع کردہ تصور کو اسلام کے نام پر پیش کر رہے ہیں۔

اس سلسلہ میں علامہ اقبال نے خواتین سے خطاب کرتے ہوئے فارسی کے جو دو شعر کہے ہیں ان کا حوالہ برمحل ہوگا۔

زشام ما بروں آور سحر را   بہ قرآں باز خواں اہل نظر را
تو میدانی کہ سوز قرأت تو   دگرگوں کرد تقدیر عمر را

فریق کے حوالہ سے سورۃ ھود (۲۴:۱۱) کی آیت بھی اہم ہے۔اللہ کا ارشاد ہے: ''مَثَلُ الْفَرِيقَيْنِ كَالْأَعْمَىٰ وَالْأَصَمِّ وَالْبَصِيرِ وَالسَّمِيعِ هَلْ يَسْتَوِيَانِ مَثَلًا أَفَلَا تَذَكَّرُونَ ''،ان دونوں فریقوں کی مثال اندھے، بہرے اور دیکھنے سننے والے کی سی ہے کیا دونوں مثال میں برابر ہیں؟ کیا تم پھر بھی نصیحت حاصل نہیں کرتے''۔

پہلے کافروں کے فریق کا ذکر ہے پھر مومنوں کے فریق کا۔ تشبیہ میں چار الفاظ ہیں اور معنی دو اس لیے يَسْتَوِيَانِ تثنیہ کا صیغہ استعمال ہوا ہے۔ اندھے پن اور بہرے پن کے جامع کو دیکھنے اور سننے والے کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے یعنی ایک کی دو صفات کو دوسرے کی دو صفات کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے۔ اللہ نے جب آنکھوں کے اندھے پن کا ذکر کیا تو ساتھ ہی کانوں کے بہرے پن کا ذکر کر دیا اور جب آنکھوں کے کھلنے کا ذکر کیا تو فوراً کانوں کے کھلنے کا ذکر کر دیا۔ وجہ شبہ یہ ہے کہ اللہ نے انسان کو جسم اور روح کی ترکیب سے پیدا کیا جس طرح جسم میں آنکھیں اور کان بنائے اسی طرح روح میں یہ صلاحیت پیدا کر دی۔ جس طرح جسم نہ دیکھنے اور نہ سننے کی حالت میں حیران وسرگرداں ہوتا ہے اور اپنی مصلحتوں کی طرف راہ نہیں پاتا بلکہ اندھیروں میں کھو جاتا ہے بالکل اسی طرح جاہل اور گمراہ کا دل اندھا اور بہرہ ہوتا ہے اور وہ گمراہیوں کی

Marfat.com

ظلمت میں ہاتھ پاؤں مارتا رہتا ہے۔ یہ تشبیہ معقول کی محسوس کے ساتھ ہے۔ بصیرت کے اندھے اور بہرے کو بصارت کے اندھے اور بہرے سے تشبیہ دی گئی ہے۔ جس کا دیکھنے اور سننے کا حاسہ کامل ہوتا ہے۔ وہ کائنات اور قرآن کی آیات سے علم حاصل کرتا ہے کیونکہ علم وعرفان کے یہی دو سرچشمے ہیں۔ وہ قرآن سے جو کچھ سنتا ہے اور کائنات میں جو کچھ دیکھتا ہے اُس کے علم وہدایت سے آگہی حاصل کرتا ہے۔ آیۂ مبارکہ میں محسوس طور پر دونوں فریقوں کی تصویر کشی کی گئی ہے۔ پہلا فریق اس اندھے کی مانند ہے جو دیکھتا نہیں اور اس بہرے کی مانند ہے جو سنتا نہیں۔ جو آدمی ادارک اور تدبر کے لیے اپنے حواس اور اعضاء کو دل ودماغ تک پہنچے کا ذریعہ نہیں بناتا وہ گویا ان سے محروم ہو جاتا ہے جبکہ دوسرا فریق اپنے حواس اور اعضاء کو دل ودماغ تک پہنچنے کا ذریعہ بناتا ہے جو اُس کی رہنمائی کرتے رہتے ہیں۔ کافروں کا فریق نہ حق کو دیکھتا ہے نہ اس کی پیروی کرتا ہے اور نہ اس کے مطابق عمل کرتا ہے۔ نہ وہ اللہ کی طرف دعوت دینے والے کی آواز سنتا ہے چنانچہ وہ اپنی گمراہی پر قائم رہتا ہے جبکہ اہل ایمان انفس وآفاق میں اللہ کی حجتوں کو دیکھتے ہیں اور جس توحید پر وہ دلالت کرتے ہیں ان کا اقرار کرتے ہیں۔ وہ اللہ کی طرف بلانے والے کی آواز پر لبیک کہتے ہیں اور اللہ کی اطاعت کرتے ہیں۔ قرآن کے ایک اور مقام پر فرمایا گیا ہے: 'اندھا اور دیکھنے والا برابر نہیں، اندھیرا اور روشنی، سایہ اور دھوپ برابر نہیں، زندے اور مردے برابر نہیں' (۳۵:۱۹تا۲۲)۔

فریقین کی تصویر کشی کے بعد سوال کیا گیا ہے کیا دونوں برابر ہیں؟ اس سوال کا جواب سب جانتے ہیں اس لیے جواب دینے کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی یعنی جس طرح وہ لوگوں کے یہاں برابر نہیں بالکل اسی طرح اللہ کے یہاں بھی برابر نہیں۔ آخر میں کہا گیا ہے (افلا تذکرون) کیا وہ سوچتے نہیں؟ کیا وہ دونوں فریقوں کے درمیان فرق کو سمجھتے نہیں تاکہ گمراہی چھوڑ کر ہدایت کی طرف اور کفر چھوڑ کر ایمان کی طرف آجائیں؟ اس آیت سے ایک اور بات ثابت ہوتی ہے کہ اہل ایمان کے فریق میں مرد اور عورت دونوں شامل ہیں۔ اسی طرح اہل کفر کے فریق میں بھی دونوں شامل ہیں۔ جس طرح مومن مردوں کی فضیلت کافر مردوں پر واضح ہے بعینہٖ اسی طرح مومن عورتوں کی فضیلت کافر مردوں پر واضح ہے۔ اس میں ان لوگوں کے لیے لمحہ فکر ہے جو محض مردانگی کو عورت پر وجہ فضیلت سمجھتے ہیں۔ حالانکہ قرآن میں کئی ایک مقام پر وجہ فضیلت، ایمان، عمل صالح اور تقویٰ کو قرار دیا گیا ہے۔

Marfat.com

قوم

لغوی مفہوم

اکثر اہل لغت نے قوم کو اسم جمع (Collective noun) گردانا ہے جس کا اس لفظ سے کوئی واحد نہیں آتا۔ لسان العرب نے ابوالعباس کا قول نقل کیا ہے کہ نفر، قوم اور رھط سب اسم جمع میں جن کا اس لفظ سے کوئی واحد نہیں آتا۔ اس کی جمع اقوام اور جمع الجمع أقاوم، اقایم اور أقاویم آتی ہیں۔ صحاح اور القاموس المحیط کے مطابق اس کا فعل مونث استعمال ہوتا ہے جیسا کہ قرآن میں ہے: 'کذبت قوم نوح'۔ بعض اہل لغت قوم کا غیر لفظی واحد رجل یا امرؤ کو قرار دیتے ہیں جیسا کہ صاحب مقاییس اللغة اور المصباح المنیر۔ زمخشری نے اس بارے میں دو احتمال ظاہر کیے ہیں۔ ایک یہ کہ قوم قائم کی جمع ہے جیسے صائم کی جمع صُوّم اور زائر کی جمع زُوّر۔ (سمجھ نہیں آتی کہ وہ قَوْم کو صُوّم یا زُوّر کی مانند کیونکر قرار دے رہے ہیں)۔ دوسرا احتمال یہ ہے کہ عرب اسے مصدر سمجھتے ہیں جیسا کہ محاورہ ہے: 'طعاما احببت نوما و أبغضت قوما'؛ 'ایسا کھانا جسے میں نے نیند کی حالت میں مرغوب جانا اور اٹھنے کی حالت میں مبغوض۔ یہاں قوم سے مراد قیام ہے۔

اس لفظ کی لغوی تشریح میں اختلاف کے باعث اس کے معنی اور مفہوم میں اشکال پیدا ہو گیا ہے چنانچہ ابن فارس نے اس کے دو بنیادی معنی قرار دیے ہیں ایک لوگوں (مردوں اور عورتوں سمیت) کی جماعت اور دوسرے کھڑا ہونا اور عزم کرنا۔

اگر قوم کو اسم جمع سمجھا جائے تو اس کا واضح مفہوم یہی ہے کہ اس سے مراد مردوں اور عورتوں کی جماعت ہے۔ لیکن اگر اس کا واحد من غیر لفظہ رجل یا امرؤ کو قرار دیا جائے یا اسے قائم کی جمع یا مصدر سمجھا جائے تو اس کا مفہوم خالص مردوں کی جماعت نکلتا ہے جس میں عورتیں شامل نہیں۔ اس نقطہ نظر کو پیش کرنے والے کہتے ہیں کیونکہ مرد ہی سب بڑے بڑے کام کرتے ہیں اور وہ عورتوں کے نگران (قائم بالأمر) ہوتے ہیں جیسا کہ قرآن میں ہے: 'الرجال قوّامون علی النساء' (مرد عورتوں کے نگران ہیں) اس لیے اس لفظ میں عورتیں داخل نہیں ہو سکتیں۔ گویا ان کے نزدیک عورتیں بڑے بڑے کام سرانجام دینے کے قابل نہیں۔ وہ دلیل کے طور پر ایک تو زہیر بن ابی سلمٰی کا یہ شعر پیش کرتے ہیں:

Marfat.com

وما أدری وسوف إخال أدری

أقوم آل حصن ام نساء

میں جانتا نہیں لیکن کچھ دیر بعد میں سمجھتا ہوں کہ پتہ چل جائے گا

آیا آل حصن مرد ہیں یا عورتیں۔

دوسری دلیل قرآن مجید کی سورۃ حجرات (۴۹:۱۱) کی یہ آیت ہے کہ یَا أَیُّهَا الَّذِیْنَ آمَنُوا لَا یَسْخَرْ قَوْمٌ مِّن قَوْمٍ عَسَىٰ أَن یَكُونُوا خَیْرًا مِّنْهُمْ 'اے ایمان والو کوئی قوم (جماعت) دوسرے جماعت کا مذاق نہ اُڑائے ممکن ہے کہ یہ اس سے بہتر ہو اور نہ عورتیں عورتوں کا مذاق اڑائیں ممکن ہے کہ یہ ان سے بہتر ہوں'۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ اگر عورتیں قوم میں شامل ہوتیں تو ان کا ذکر علیحدہ کیوں ہوتا؟ اس آیت پر بحث بعد میں ہوگی۔

اس نقطہ نظر کے حاملین کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ قرآن حکیم کی دو آیات ہیں جن میں بے شمار موقعوں پر انبیاء کرام کی اقوام کا ذکر ہے۔ ظاہر ہے کہ اس میں مرد اور عورتیں سبھی شامل ہیں۔ اس کا جواب ان لوگوں نے یہ دیا ہے کہ عام طور پر لفظ قوم میں عورتیں شامل نہیں ہوتیں مگر کبھی کبھی تبعیت کی وجہ سے اس میں عورتیں شامل سمجھی جا سکتی ہیں یعنی چونکہ عورتیں مردوں کی تابع ہوتی ہیں اس لیے ان کا علیحدہ ذکر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اگر عورت کی حقارت کو ذہن سے نکال کر شائستہ انداز میں یہ کہا جاتا کہ چونکہ عورتیں مردوں کا جزو لاینفک ہیں اس لیے علیحدہ ذکر کرنے کی بجائے قرآنی اسلوب تغلیب کے پیش نظر انہیں قوم میں شامل سمجھا جائے گا تو کیا ہی اچھا ہوتا۔ مگر اپنے مفسروں کے سر میں مردانگی کا سودا سمایا ہوا ہے۔ لطف کی بات یہ ہے کہ قرآن حکیم میں کسی ایک جگہ بھی قوم کا لفظ صرف مردوں کی جماعت کے لیے استعمال نہیں ہوا۔ جاہلی نقطہ نظر یہی ہے کہ عورتیں لفظ قوم میں داخل نہیں۔ بنیادی طور پر زمانہ جاہلیت میں بھی قوم سے مراد وہ قریبی رشتہ دار سمجھے جاتے تھے جو ایک دادا میں شریک ہوں۔ کبھی کبھی اس قبیلہ کو جس میں کوئی اجنبی آدمی قیام پذیر ہو، مجازاً اس کی قوم کہہ دیا جاتا تھا۔ رفتہ رفتہ عورت کے خلاف تعصب کی وجہ سے قوم کا استعمال خالص مردوں کے لیے ہونے لگا۔ قرآن نے سب سے پہلے اس غلط تصور کی اصلاح کی۔ قرون اولیٰ کے گزرنے کے بعد سیاسی اور سماجی اسباب کی وجہ سے یہ غلط تصور دوبارہ در آیا اور سورۃ حجرات کی آیت اسی غلط تصور کا تختہ مشق بنی۔ خدا کا شکر ہے کہ اب یہ تصور حرف غلط کی طرح مٹ چکا ہے اس کا وجود نہ عربی زبان میں باقی رہا اور نہ اردو زبان میں۔ غلط اور غیر طبعی نظریات کو دوام حاصل نہیں ہوتا۔ اب وہ لوگ بھی جو پہلوں کی ہر بات کو ابدی سچائی سمجھتے ہیں لفظ قوم کا ترجمہ صرف

Marfat.com

مردوں کی جماعت نہیں کر پاتے۔ قرآن حکیم میں جہاں جہاں قوم نوح، قوم یونس، قوم ہود، قوم ابراہیم، قوم لوط، قوم صالح، قوم شعیب، قوم موسیٰ اور قوم فرعون کا ذکر ہے وہاں قوم سے مراد قبیلہ ہے جس کے افراد کو ایک دوسرے سے باندھنے والا خون کا رشتہ ہے۔ اس میں مرد بھی شامل ہیں اور عورتیں بھی۔ اس کے علاوہ قرآن حکیم میں جہاں جہاں لفظ قوم کے ساتھ ایمان والوں اور کافروں کی، علم والوں اور جاہلوں کی، نیکو کاروں اور فاسقوں کی، ہدایت پانے والوں اور گمراہوں کی، صالحین اور مفسدوں کی، شکر ادا کرنے والوں اور ناشکروں کی، انصاف کرنے والوں اور ظالموں کی صفت بیان ہوئی ہے وہاں قوم سے مراد لوگوں کی جماعت ہے جس میں مرد اور عورتیں سبھی شامل ہیں۔

جب باہمی مفاد میں تصادم کی بنیاد پر ہر ایک قوم یا قبیلہ دوسری قوم یا قبیلے کا دشمن بن گیا تو لفظ قوم دشمن کے معنوں میں بھی استعمال ہونے لگا۔ جیسا کہ صاحب المنجد نے اس لفظ کے معنی دشمن بھی لکھے ہیں۔ سورۃ نساء (۴:۱۰۴) میں ارشاد باری ہے: 'وَلَا تَهِنُوا فِي ابْتِغَاءِ الْقَوْمِ' اور ہمت مت ہارو دشمن کے تعاقب کرنے میں'۔

عہدِ حاضر میں ایک وطن کی چار دیواری میں رہنے والوں، ایک ہی بولی بولنے والوں اور تہذیب و تمدن میں ہم آہنگ لوگوں پر لفظ قوم کا اطلاق ہوتا ہے، لیکن قرآن نے اس محدود نقطہ نظر کو بدل کر قوم کے لیے نظریاتی طور پر اہل کفر اور اہل ایمان کا آفاقی نقطہ پیش کیا ہے: 'إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ إِخْوَةٌ' (۴۹:۱۰)، 'سب مومن آپس میں محض بھائی بھائی ہیں (خواہ ان کا رنگ و نسل زبان یا وطن کوئی بھی ہو)'۔

لفظ قوم کے ضمن میں سب سے پہلے سورۃ حجرات کی آیت (۴۹:۱۱) پر غور کریں گے جسے اہلِ لغت اور مفسرین نے اس بات کے لیے بطور دلیل پیش کیا ہے کہ قوم کا لفظ صرف مردوں کی جماعت کے لیے بولا جاتا ہے۔ اس میں عورتیں اور بقول امام رازی کے بچے بھی شامل نہیں۔

اللہ کا قول ہے: 'يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا يَسْخَرْ قَوْمٌ مِّن قَوْمٍ عَسَىٰ أَن يَكُونُوا خَيْرًا مِّنْهُمْ وَلَا نِسَاءٌ مِّن نِّسَاءٍ عَسَىٰ أَن يَكُنَّ خَيْرًا مِّنْهُنَّ'، 'اے لوگو! جو ایمان لائے ایک قوم دوسری قوم کی ہنسی نہ اڑائے شاید وہ اس سے بہتر ہو اور عورتیں دوسری عورتوں کی ہنسی نہ اڑائیں شاید وہ ان سے بہتر ہوں'۔ آیت میں خطاب اہلِ ایمان سے ہے جس میں مرد بھی شامل ہیں اور عورتیں بھی۔ پھر لفظ قوم اس لیے استعمال کیا گیا ہے کہ مذاق اڑانے کا اثر ایک فرد سے جماعت کی طرف منتقل ہو جاتا ہے اور عموماً مذاق بھرے مجمع میں اڑایا جاتا ہے اس لیے بجائے اس کے یہ کہا جاتا کہ لا یسخر رجل من رجل کہا یہ گیا کہ قوم من قوم۔ چونکہ اہلِ ایمان میں مرد اور عورت سب شامل

Marfat.com

ہیں اس لیے بداہۃً لفظ قوم میں مرد اور عورت سب شامل ہوں گے۔ آگے عورتوں کا ذکر بطور خاص اس وجہ سے کیا گیا کہ ایک تو معنی کی تاکید کی جائے اور اس میں مبالغہ پیدا کیا جائے جیسا کہ قاضی ثناء اللہ نے تفسیر مظہری میں ذکر کیا ہے۔ دوسرے اس لیے کہ عورتوں میں مذاق اُڑانے کی زیادہ عادت ہوتی ہے جیسا کہ امام قرطبی نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے۔ جن اہل علم نے قوم کے معنی مرد لیے ہیں ان کی وجہ استدلال یہ ہے کہ مذکورہ آیت میں نساء کا عطف قوم پر یہ ثابت کرتا ہے کہ یہاں قوم کے مقابلہ میں نساء استعمال کیا گیا ہے۔ چنانچہ وہ قوم کو قائم کی جمع تسلیم کر کے اس کے معنی قائم بالامور یعنی معاملات کو سرانجام دینے والے یا ان کا انتظام کرنے والے لیتے ہیں۔ اس سلسلہ میں وہ سورۃ نساء کی آیت (۳۴:۴) 'الرجال قوامون علی النساء' (مرد عورتوں کے نگران ہیں) بھی بطور دلیل پیش کرتے ہیں۔ امام رازی نے غالباً اپنے معاشرے کو سامنے رکھتے ہوئے یہ عجیب وغریب دلیل دی ہے کہ عورت ایک ضعیف مخلوق ہے وہ بیچاری مرد کا کیا تمسخر اڑائے گی وہ تو مرد کے لیے عدم التفات اور حقارت کا اظہار کر ہی نہیں سکتی کیونکہ وہ اپنی ضروریات کے لیے اس کی محتاج ہوتی ہے۔ انھوں نے قرآن کی اَبدی اور آفاقی ہدایت کو کس قدر محدود کر دیا ہے۔ جب ان سے یہ کہا گیا کہ قرآن حکیم میں جہاں جہاں لفظ قوم کا ذکر ہے وہاں مرد اور عورتیں دونوں مراد ہیں۔ تو اس کا جواب یہ دیا گیا کہ لفظ قوم اصل میں تو مردوں کے لیے ہے لیکن کبھی کبھی عورتیں بھی تبعیت (تابع مہمل) کی وجہ سے اس لفظ میں شامل ہوتی ہیں۔ عورت کی کوئی اہمیت نہیں اس لیے ان مقامات پر ان کے علیحدہ تذکرہ کو نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ زمخشری نے شائستہ طور پر اسے اسلوب تغلیب قرار دیا ہے جبکہ صاحب روح المعانی نے بڑی خوبصورت بات کہی ہے کہ عورت مرد کا جزو لاینفک ہے اس لیے لفظ قوم میں وہ فطری طور پر شامل ہے۔

مفسرین کا یہ قول کہ کبھی کبھی تبعیت کی وجہ سے عورتیں لفظ قوم میں شامل ہوتی ہیں درست نہیں، کیونکہ قرآن میں کسی مقام پر بھی قوم سے صرف مرد مراد نہیں لیے گئے ہیں۔ اس لیے ابن فارس اور فیروز آبادی کا قول ہے کہ اس کے بنیادی معنی مردوں اور عورتوں کی جماعت کے ہیں۔ رہا زہیر کا قول تو وہ جاہلانہ تصور کی غمازی کرتا ہے جس کی قرآن نے صراحت کے ساتھ تردید کر دی ہے۔ عورت مرد کی تابع ہے، وہ کم عقل ہے اور مرد صرف مرد ہونے کے ناتے سے اس سے افضل ہے، یہ جاہلانہ تصور ہے۔ قرآن مرد اور عورت دونوں کو انسان سمجھتا ہے جن کی تخلیق نفسِ واحدہ سے ہوئی۔ جن باتوں کے لیے مرد مکلف ہے انہی باتوں کے لیے عورت بھی مکلف ہے۔ ان دونوں میں وجہ فضیلت صرف تقویٰ ہے۔ عورت صاحب ارادہ، صاحب اختیار اور قوت فیصلہ کی حامل ایک مستقل شخصیت ہے، جو ہر وہ کام کر سکتی ہے جو

Marfat.com

انسان کے بس میں ہے۔

قرآن حکیم میں لفظ قوم کی جو صفات بیان ہوئی ہیں مثلاً مومن، کافر، ظالم، فاسق، صالح، گمراہ، شکر گزار، ناشکرے، صاحب یقین یا صاحب عقل، صاحب علم، صاحب فکر، مصلح، مفسد، ان صفات میں مردوں کے شانہ بشانہ عورتیں بھی شامل ہیں۔ علاوہ ازیں جہاں انبیاء کی اقوام قوم فرعون اور قوم تبع کا ذکر ہے وہاں بھی لفظ قوم مرد اور عورت دونوں پر دلالت کرتا ہے۔

اس آیت کے سلسلہ میں مولانا امین احسن اصلاحی تدبر قرآن میں فرماتے ہیں: 'یہاں مردوں کے ساتھ ساتھ عورتوں کا ذکر بھی خاص اہتمام سے ہوا ہے حالانکہ بظاہر اس کی ضرورت نہیں تھی۔ **لا یسخر قوم من قوم** کے عام الفاظ ان کے لیے بھی کافی تھے، لیکن قرآن نے فضائل اور رزائل دونوں کے بیان میں یہ اسلوب محفوظ رکھا ہے کہ عورتوں کا ذکر ان مواقع میں خاص اہتمام کے ساتھ ہوا ہے جہاں تاکید کے ساتھ ان کو کسی فضیلت کے لیے اُبھارنا یا کسی فتنے سے بچانا مقصود ہو۔ یہاں بھی دوسری صورت ہے جس برائی سے روکا گیا ہے وہ عورتوں میں مردوں سے زیادہ نہیں تو کم بھی نہیں پائی جاتی۔ جن عورتوں کے اندر اپنی خاندانی، نسبی اور مالی برتری یا اپنے ظاہری حسن و جمال کا غرور ہوتا ہے ان کا انداز خطاب و کلام ان عورتوں کے ساتھ حقارت آمیز ہوتا ہے جن کو وہ اپنے مقابل میں فروتر خیال کرتی ہیں۔

استبدال اور استخلاف قرآن حکیم کی دو اصطلاحیں ہیں جن کا مطب یہ ہے کہ ایک قوم دوسری قوم کی جگہ لے لیتی ہے اور اس کی جانشین بن جاتی ہے۔ مولانا آزاد کے الفاظ میں قانون الٰہی ہے کہ ظالم قومیں جن مظلوم قوموں کو حقیر و کمزور سمجھتی ہیں ایک وقت آتا ہے کہ وہی شاہی اور جہانداری کی وارث بن جاتی ہیں'۔

اس قانون الٰہی کا ذکر قرآن میں **سورۃ اعراف (۷:۱۳۷)**، **سورۃ توبہ (۹:۳۸ تا ۳۹)**، **سورۃ ہود (۱۱:۵۷)** اور **سورۃ محمد (۴۷:۳۸)** میں ہوا ہے۔

سورۃ اعراف میں ارشاد الٰہی ہے: 'وَاَوْرَثْنَا الْقَوْمَ الَّذِيْنَ كَانُوْا يُسْتَضْعَفُوْنَ مَشَارِقَ الْاَرْضِ وَمَغَارِبَهَا الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا ۭ وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ الْحُسْنٰى عَلٰي بَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ ڏ بِمَا صَبَرُوْا ۭ وَدَمَّرْنَا مَا كَانَ يَصْنَعُ فِرْعَوْنُ وَقَوْمُهٗ وَمَا كَانُوْا يَعْرِشُوْنَ'، اور ہم نے اس قوم کو جسے کمزور سمجھا جاتا تھا اس زمین کے مغربی اور مشرقی حصوں کا وارث بنا دیا جن میں ہم نے برکت رکھی تھی، اور میرے پروردگار کا اچھا وعدہ بنی اسرائیل کے حق میں ان کے صبر کی وجہ سے پورا ہوا، اور

Marfat.com

فرعون اور اس کی قوم جو کچھ بناتے رہتے تھے اور عمارتوں کی جو بلندیاں وہ اُٹھاتے تھے ان سب کو تباہ و برباد کر دیا"۔

کسی قوم کو دوسری قوم کا جانشین بنانے کو وارث بنانے سے تعبیر کیا گیا ہے۔ فرعون اور اس کی قوم بنو اسرائیل کو کمزور جانتے تھے۔ پھر بھی انہیں ملک کے جانے کا کھٹکا لگا رہتا تھا، وہ ان کو طرح طرح کے عذاب دیتے تھے، ان سے مشقت لیتے تھے، ان کی نسل کو مٹانے کے لیے ان کے بیٹوں کو ذبح کرتے تھے، لیکن وہ سب تکلیفیں صبر و ہمت کے ساتھ سہتے رہے تو اللہ نے ان کو قعرِ ذلت سے نکال کر اوجِ ثریا تک پہنچا دیا۔ ان کو مشرق میں شام اور مغرب میں مصر کے ملک کا وارث بنا دیا۔ ملک بھی ایسا کہ جس کی زرخیز زمین خیر و برکت کا باعث تھی۔ یہ حکومت سیدنا سلیمانؑ کے عہد میں حاصل ہوئی اور اللہ کا وعدہ پورا ہوا۔ اللہ نے ان پر احسان کیا، چنانچہ سورۃ قصص (۲۸: ۵ تا ۶) میں ارشاد ہے: "ہمارا فیصلہ تھا کہ جن لوگوں کو مصر کی زمین میں کمزور سمجھا جاتا ہے ان پر احسان کریں ان کو سرداری اور ریاست عطا کریں اور ان کو سلطنت کا وارث بنائیں اور ان کو زمین میں حکومت دیں اور فرعون، ہامان اور ان کے پیروکاروں کو ان بنی اسرائیل کی طرف سے وہ واقعات دکھلائیں جن کا ان کو کھٹکا لگا رہتا تھا۔ اللہ نے فرعون کے زمانہ کی بنی ہوئی عمارتوں اور اہرامات کو اس طرح تباہ کیا کہ ماہرین آثار قدیمہ انہیں زمین کا سینہ کھود کر نکال رہے ہیں۔ اس طرح بنو اسرائیل کے حق میں اللہ کا وعدہ پورا ہو گیا محض اس لیے کہ انھوں نے صبر و استقامت سے کام لیا اور موسیٰ علیہ السلام کی پیروی میں قانونِ الٰہی پر کاربند رہے۔ آیت میں الارض اسم جنس ہے اس سے مراد ساری کی ساری زمین ہے۔ صرف مصر و شام کی زمین نہیں جو قوم بھی کمزور ہو گی اور صبر و ہمت سے کام لیتے ہوئے قانونِ الٰہی پر کاربند رہے گی اسے لازمی طور پر زمین کی خلافت ملے گی۔ اس وعدے میں مرد اور عورت دونوں شامل ہیں۔

سورۃ توبہ (۹: ۳۸: ۳۹)، سورۃ ہود (۱۱: ۵۷) اور سورۃ محمد (۴۷: ۳۸) کے الفاظ ایک جیسے ہیں ان تین مقامات پر استخلاف اور استبدال کی اصطلاح استعمال ہوئی ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ ایک قوم کی جگہ دوسری قوم لے لیتی ہے اور اس کی جانشین ہو جاتی ہے سورۃ ہود میں اللہ کا ارشاد ہے: "وَيَسْتَخْلِفُ رَبِّي قَوْمًا غَيْرَكُمْ وَلَا تَضُرُّونَهُ شَيْئًا إِنَّ رَبِّي عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ حَفِيظٌ" (اگر تم حق سے پھر گئے) میرا رب تمہارے علاوہ دوسری قوم کو جانشین بنا دے گا اور تم اس کا کچھ بھی نہ بگاڑ سکو گے۔ بے شک میرا رب ہر چیز کا نگران حال ہے"۔

Marfat.com

حضرت ہود علیہ السلام کا واسطہ ایک مغرور اور ضدی قوم سے تھا۔ وہ ان کو بتا رہے ہیں کہ اگر تم حق سے پھرے تو اللہ تعالیٰ تمہیں ہلاک کر کے کوئی اور قوم لے آئے گا۔ صرف تم ہی اللہ کے بندے نہیں ہو اللہ کے اور بھی بہت سے بندے ہیں۔ جو اللہ کی قدر ایسے پہچانتے ہیں جیسا قدر پہچاننے کا حق ہے۔ وہ ہم سے زیادہ وفا شعار اور اطاعت گزار ہیں۔ اس کی وحدانیت پر ایمان رکھتے ہیں اور خلوص دل سے اس کی عبادت کرتے ہیں۔ وہ تمہارے ملک سلطنت اور مال و دولت کے جانشین ہوں گے، اللہ کا نقصان نہیں ہوگا، اُس کا تو تم کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتے۔ اس کے ملک میں کوئی کمی بیشی نہیں کر سکتے۔ تم چلے جاؤ یا باقی رہو، ایمان لے آؤ یا کفر پر اڑے رہو۔ اس میں اللہ کا کوئی نقصان نہیں، نقصان تمہارا اپنا ہے۔ اگر تم بغاوت، ظلم اور انحراف کو چھوڑ کر سیدھے راستے پر آ جاؤ تو تمہیں ہی فائدہ ہوگا۔ تمہاری شان و شوکت باقی رہے گی۔ وہ ہر چیز پر نگران ہے۔ وہ اپنے دین اور اپنے اطاعت گزار بندوں کا محافظ ہے۔ تم اس سے بھاگ نہیں سکتے اور نہ کوئی مخلوق اس کی حکومت میں ذرہ بھر تغیر و تبدل کر سکتی ہے۔

محکومیت کو قرآن نے استبدال اور استخلاف کی اصطلاحوں سے تعبیر کیا ہے یعنی پہلی قوم سے شان و شوکت اور مال و دولت چھن جاتی ہے اور دوسری قوم اس کی جگہ اس کی مالک بن جاتی ہے، یہی ایک قوم کا دوسری قوم کی جگہ لینا ہے۔ یہ عمل یکدم صورت پذیر نہیں ہوتا بلکہ اس کے لیے ایک عرصہ درکار ہوتا ہے۔ جب وہ قوم پوری طرح احکام الٰہی سے منہ موڑ لیتی ہے تو اس سے نعمتیں چھن جاتی ہیں یہاں تک کہ اللہ ان احکام کی پابندی کے لیے دوسری قوم کو کھڑا کر دیتا ہے اور وہ قوم انہی نعمتوں سے بہرور ہو جاتی ہے۔ یہ سنتِ الٰہی کسی وقت اور کہیں بھی جاری و ساری ہو سکتی ہے۔ اس بات پر تو سب متفق ہیں کہ مسلمان احکامِ خداوندی سے منہ موڑنے کی وجہ سے ذلت و خواری کی موجودہ حالت تک پہنچے ہیں مگر اختلاف اس میں ہے کہ احکامِ خداوندی سے مراد کیا ہے؟ کیا اس سے مراد صرف ظاہری وضع قطع کی اصلاح ہے یا اس سے مراد اجتماعی، اقتصادی اور معاشرتی معاملات کی اصلاح ہے۔ اگر معاملات کو نظر انداز کر کے آپ سارا زور ظاہری شکل و صورت اور تراش خراش کو اپنے زعم میں سنت کے مطابق کرنے پر دیتے رہیں گے تو آپ اپنی کاوش کے باوجود زیادہ سے زیادہ ایسے غیر متحرک اور غیر فعال افراد کا انبوہ پیدا کر سکیں گے جو اپنے زمانے سے کٹے ہوئے ہوں گے۔ جو زمین پر بسنے کی بجائے آسمان پر اُڑ رہے ہوں گے۔ پھر آپ کی پسماندگی کبھی بھی خوشحالی میں نہیں بدل سکے گی۔ اس کے لیے ہمیں ایسے متحرک اور

Marfat.com

فعال افراد کی ضرورت ہے جو وحی کی روشنی میں آگے بڑھتے ہوئے عصری تقاضوں کے مطابق اپنے آپ کو علم وفن سے آراستہ کریں۔ انسانوں کے دکھ درد میں شریک ہوں، ان کے مسائل کو حل کریں، معاشرت میں امن وآشتی کی فضا پیدا کریں، صرف دعائیں مانگنے اور معجزوں کا انتظار کرنے سے بلائیں نہیں ٹلا کرتیں۔ اس کے لیے اپنا تن من دھن سب کچھ نچھاور کرنا پڑتا ہے۔ ذرا ان سر پھرے محققین پر نظر ڈالیے جو دن رات اس ٹوہ میں لگے ہوئے ہیں کہ کینسر یا ایڈز کا علاج دریافت ہو جائے تاکہ انسان کو ان موذی مرضوں سے نجات دلائی جا سکے۔

اسلام کے سنہری دور میں علم وفضل کی بنا پر تہذیب وتمدن کے وارث مسلمان تھے۔ لوگ تعلیم کے لیے ان کی یونیورسٹیوں میں داخلہ لیا کرتے تھے۔ فزکس، کیمسٹری، بائیالوجی، ریاضیات، طب اور نجوم میں مسلمان علماء کی لکھی ہوئی کتابیں فرانس کی یونیورسٹیوں میں پڑھائی جاتی تھیں۔ جب ہمارے آباء کا ورثہ ہمارا علم وفضل ہم سے منتقل ہو کر یورپ چلا گیا تو ہم نیچے ہی گرتے چلے گئے۔ اب ہم سائنسی علوم اور اقتصادیات میں ان کے محتاج ہیں۔ اگر ہم اپنی غلطیوں کا احساس کر کے علم وفضل کی طرف لوٹ آئیں تو ہم اپنی فردوس گم گشتہ کو دوبارہ پا سکتے ہیں۔ مگر کھویا ہوا عروج صرف دعاؤں اور اپنی ظاہری وضع قطع کو بدلنے سے حاصل نہیں ہوگا۔ اس کے لیے ہمیں اپنے دل ودماغ میں تبدیلی لانا ہوگی۔ اسلامی انقلاب کا یہی ایک راستہ ہے۔

لفظ قوم کے سلسلہ میں قرآن نے اقوام کے عروج وزوال اور موت وحیات کا قانون بیان کیا ہے۔ سنت الٰہی ہے کہ جب وہ کسی جماعت کو اپنی نعمتوں سے نوازتا ہے تو وہ اس وقت تک ان نعمتوں میں کبھی تغیر وتبدل نہیں کرتا جب تک کہ خود اس جماعت کے افراد اپنی حالت میں تغیر نہیں کر لیتے۔ مولانا آزاد کے الفاظ میں قوم خود اپنی زندگی کا گہوارہ بناتی ہے اور پھر خود اپنے ہاتھوں سے اپنی قبر بھی کھودتی ہے۔ پوری تاریخ اس بات کی شاہد ہے۔

سورۃ انفال (۸:۵۳) میں ارشاد ربانی ہے: "ذٰلِكَ بِأَنَّ اللّٰهَ لَمْ يَكُ مُغَيِّرًا نِّعْمَةً أَنْعَمَهَا عَلٰى قَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوا مَا بِأَنْفُسِهِمْ وَأَنَّ اللّٰهَ سَمِيعٌ عَلِيمٌ" یہ بات اس وجہ سے ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی ایسی نعمت کو جب کسی قوم کو عطا فرمائی ہو نہیں بدلتا جب تک وہ قوم اپنی حالت نہ بدل لے اور یہ کہ اللہ سننے والا اور جاننے والا ہے۔

یہی مضمون سورۃ رعد (۱۳:۱۱) میں ان الفاظ میں بیان ہوا ہے: "إِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوا مَا بِأَنْفُسِهِمْ" اللہ تعالیٰ کسی قوم کی حالت نہیں بدلتا جب تک وہ اپنی حالت نہ بدلیں یعنی

Marfat.com

؎ خدا نے آج تک اس کی قوم کی حالت نہیں بدلی
نہ ہو جس کو خیال خود اپنی حالت کے بدلنے کا

مذکورہ دونوں آیات میں لفظ قوم نکرہ استعمال ہوا ہے جس سے مراد ہر قوم ہے خواہ وہ مسلمان ہو یا کافر۔ نعمت سے مراد نورِ عقل، صحتِ فکر اور اشراقِ بصیرت ہے جو کسی قوم کی عزت و اقتدار، آسودگی و خوشحالی اور امن و چین کا باعث ہوتی ہے۔ زندگی میں دونوں قسم کے تغیر وقوع پذیر ہوتے ہیں خیر سے شر کی طرف اور اس کے برعکس شر سے خیر کی طرف۔ صالح فاسد ہو جاتے ہیں اور فاسد صالح۔ اسی طرح لوگوں کے حالات بدلتے رہتے ہیں، کہیں یہ تغیر بد سے بدتر کی طرف بھی ہوتا ہے۔ آلِ فرعون اور مشرکین مکہ کی حالت اتنی اچھی اور قابلِ فخر نہ تھی کہ بدل کر بری ہو جاتی بلکہ وہ حالت بد سے بدتر ہوگئی۔ اللہ نے مہلت دے کر جو احسان ان پر کیا تھا اسے بدل کر ان کو عذاب میں مبتلا کر دیا۔ اس طرح ان کی حالت بد سے بدتر ہوگئی۔ انسان سے مطلوب یہ ہے کہ وہ ایسی تبدیلی کرے جو اسے تاریکی سے روشنی کی طرف لے آئے اس میں اس کی بھلائی اور سعادت ہے۔ یہ مشیت الٰہی ہے کہ وہ ان کو نعمت و عافیت سے محروم کر کے ان کو شدت و ابتلا میں نہیں ڈالتا جب تک وہ اپنے رویے میں تبدیلی نہیں کرتے۔ اسی تغیر کے مطابق اللہ تعالیٰ ان کا رخ حق و خیر کی طرف یا بدی و گمراہی کی طرف موڑ دیتا ہے۔

انسان صاحبِ ارادہ ہے کوئی مخفی طاقت اس پر اثر انداز ہو کر اسے اس کے ارادہ سے روک نہیں سکتی۔ یہ قوتیں اس آلہ تصویر کی طرح ہوتی ہیں جو واقعات کی تصویر کشی کرتی ہیں۔ وہ ان واقعات کے وقوع پذیر ہونے پر اثر انداز نہیں ہوسکتیں۔ ان واقعات کی باگ ڈور ان کے اپنے ہاتھ میں ہے۔ اللہ نے انسان کو حرکت و عمل کی آزادی عطا کی ہے۔ وہ اپنی سوچ اور سمجھ کے مطابق جیسے چاہتا ہے چلتا رہتا ہے۔ جو کام وہ کرتا ہے اللہ اس کی تکمیل کر دیتا ہے۔ لوگوں کی حالت کے تغیر کا ان کی ذات کے تغیر سے رابطہ ہے کیونکہ نفسِ انسانی سوچ بچار کا آلہ ہے اور ارادے کا مرکز ہے اور یہی انسان پر حکم چلانے والی طاقت ہے۔ جب نفسِ انسانی کی سمت میں تغیر ہوتا ہے تو اس کے مطابق زندگی میں انسان کا چلن بدل جاتا ہے۔ اللہ کا ارادہ ایک ہمہ جہتی ارادہ ہے جس میں تمام ارادے شامل ہیں۔ ہر ارادہ کرنے والے کا ارادہ اسی کے تابع ہوتا ہے۔ انسانی ارادہ اللہ کے ارادہ کے

Marfat.com

دائرے میں ایک متحرک اور فعال ارادہ ہے۔ اللہ کا ارادہ جامع اور کامل ہے۔

ایک پہلو سے یہ آیات بندوں کے معاملات میں اللہ کے عدل کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔ وہ اللہ جو کفر کے باوجود اقوام سے اپنی نعمتیں نہیں چھینتا وہ بھلا مسلمانوں سے نعمتیں کیسے چھین سکتا ہے؟ بقول سعدی:

دوستاں را کجا کنی محروم
تو کہ بر دشمناں نظر داری

جب تک انسانوں کی نیت نہ بدل جائے وہ کسی دی ہوئی نعمت کو چھینتا نہیں۔ کیونکہ اسی صورت میں وہ اس بات کے مستحق ہو جاتے ہیں کہ امتحان اور آزمائش کے طور پر ان کی نعمتوں کو انتقام میں بدل دیا جائے کیونکہ نعمت کی بے قدری کا یہی انجام ہوتا ہے۔ لوگوں کی زندگی میں تقدیر کی تبدیلی کا دارومدار ان کے دلوں، رویوں اور اعمال کی تبدیلی پر ہے۔ تکریم انسان کے مقابلہ میں اس پر ذمہ داریاں عائد کی گئی ہیں۔ یہ بات انسان کے اختیار میں ہے کہ وہ یا تو اس کی قدر کر کے اللہ کی نعمتوں سے ہمیشہ فیضیاب ہوتا رہے، بلکہ اس صورت میں نعمتیں بڑھتی رہتی ہیں۔ ان نعمتوں کا زوال بھی اسی کے اختیار میں ہے۔ یہ نعمتیں انتقام میں بدل جاتی ہیں اگر وہ ان کی ناشکری کرے۔ اینٹھتا پھرے، بہک جائے یا اس کی نیت بدل جائے۔ ان آیات سے واضح ہوتا ہے کہ اپنے انجام اور گردوپیش میں ہونے والے واقعات کا انجام طے کرنے کے بارے میں انسان کی صلاحیت کیا ہے؟ یہ صلاحیت اور یہ قوت ایک ایجابی عنصر ہے جو اللہ کے حکم اور اس کی تقدیر سے صورت پذیر ہوتا ہے اور اللہ کی تقدیر انسان کی حرکت، عمل، نعمت اور رویے سے دنیا میں جاری وساری ہوتی ہے۔ اللہ اپنے بندوں پر بے شمار نعمتیں نازل فرماتا ہے مگر وہ تحکمانہ طور پر نعمتیں واپس نہیں لیتا۔ نعمتوں میں تغیر وتبدل ہونے سے پہلے لوگوں کا زاویہ نگاہ بدلتا ہے۔ ان کے دلوں میں بغاوت ونافرمانی کے آثار پیدا ہوتے ہیں جو اس تبدیلی اور سزا کا باعث بنتے ہیں۔ جس طرح یہ ایک بنیادی اصول ہے کہ اللہ کسی قوم کی حالت اس وقت تک نہیں بدلتا جب تک وہ اپنا زاویہ نگاہ اور انداز فکر نہ بدل لیں اسی طرح یہ بھی ایک بنیادی اصول ہے کہ اللہ نعمتوں کو اس

Marfat.com

وقت تک نہیں چھینتا جب تک قوم ان کی صلاحیت اپنے اندر رکھتی ہو۔ انفرادی اور اجتماعی زندگی کا انحصار اسی بنیادی اصول پر ہے۔

دین اسلام میں ایمان کی اصطلاح دل کی تبدیلی کا نام ہے۔ نبی کریم ﷺ نے جو انقلاب بپا کیا وہ ایمان ہی کی بدولت تھا۔ ایمان کی وجہ سے مسلمانوں میں تغیر نفس پیدا ہو گیا تھا۔ یہ تغیر نفس نگاہ کی تبدیلی کا باعث بنا۔ تغیر نفس کے بغیر تغیر احوال کی امید کرنا عبث ہے۔ یہ سنت الٰہی کے خلاف ہے۔ تغیر نفس صحیح تعلیم وتربیت کے بغیر ممکن نہیں۔ مسلمانوں کے ہاتھ سے دولت وسلطنت کی نعمتیں تب گئیں جب انہوں نے اپنے زاویہ نگاہ کو بدل ڈالا۔ ضرورت اپنی حالت میں اصلاح کرنے کی ہے اور اسی جانب سے مسلمان غافل ہیں۔

خلاصہ بحث

لفظ قوم میں مرد اور عورتیں دونوں شامل ہیں۔ مفسرین نے اس لفظ کی لغوی تاویل سے عورت کی تحقیر کا جو پہلو نکالا ہے قرآن نے اسے سراسر باطل قرار دیا ہے۔ قرآن میں کسی مقام پر بھی لفظ قوم کو صرف مردوں کی جماعت کے لیے استعمال نہیں کیا گیا بلکہ اس کو بار بار استعمال کر کے واضح کر دیا کہ اسی لفظ کا اطلاق مردوں اور عورتوں کی مشترکہ جماعت پر ہوتا ہے۔ دور حاضر میں نہ عربی زبان میں اور نہ ہی اردو زبان میں اس لفظ کا استعمال صرف مردوں کے لیے ہوتا ہے۔ کسی قوم کی حالت میں تغیر وتبدل سے مراد اس قوم کے مردوں اور عورتوں کے زاویہ نگاہ میں تبدیلی ہے۔ جب تک دونوں کے زاویہ نگاہ میں تبدیلی نہیں ہوگی مسلمان قوم کبھی بھی خلافت ارضی کی سزاوار نہیں ہو سکتی۔

Marfat.com

مسلم اور مسلمہ، مومن اور مومنہ

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: إِنَّ الْمُسْلِمِينَ وَالْمُسْلِمَاتِ وَالْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ وَالْقَانِتِينَ وَالْقَانِتَاتِ وَالصَّادِقِينَ وَالصَّادِقَاتِ وَالصَّابِرِينَ وَالصَّابِرَاتِ وَالْخَاشِعِينَ وَالْخَاشِعَاتِ وَالْمُتَصَدِّقِينَ وَالْمُتَصَدِّقَاتِ وَالصَّائِمِينَ وَالصَّائِمَاتِ وَالْحَافِظِينَ فُرُوجَهُمْ وَالْحَافِظَاتِ وَالذَّاكِرِينَ اللَّهَ كَثِيرًا وَالذَّاكِرَاتِ أَعَدَّ اللَّهُ لَهُم مَّغْفِرَةً وَأَجْرًا عَظِيمًا (الأحزاب ۳۳:۳۵) "مسلمان مرد اور مسلمان عورتیں اور مومن مرد اور مومن عورتیں اور فرمانبردار مرد اور فرمانبردار عورتیں اور راستباز مرد اور راستباز عورتیں اور صبر کرنے والے مرد اور صبر کرنے والی عورتیں اور فروتنی کرنے والے مرد اور فروتنی کرنے والی عورتیں اور خیرات کرنے والے مرد اور خیرات کرنے والی عورتیں اور روزہ رکھنے والے مرد اور روزہ رکھنے والی عورتیں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرنے والے مرد اور اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کرنے والی عورتیں اور اللہ کو بہت یاد کرنے والے مرد اور بہت یاد کرنے والی عورتیں، ان کے لیے اللہ نے مغفرت اور بڑا اجر تیار کیا ہے"۔

شانِ نزول

امام طبری نے اپنی تفسیر میں اس آیت کے شانِ نزول کے بارے میں دو روایات نقل کی ہیں۔ ایک روایت قتادہ کی ہے کہ عورتیں ازواج مطہرات کے پاس آئیں اور کہنے لگیں اللہ نے قرآن میں آپ کا ذکر تو کر دیا ہے مگر ہمارا کوئی ذکر نہیں۔ کیا ہم میں کوئی ایسی بات نہیں جو قابل ذکر ہو؟ اس پر اللہ نے یہ آیت نازل فرمائی۔

دوسری روایت عبدالرحمان ابن شیبہ کی ہے کہ میں نے ام سلمہؓ کو کہتے سنا کہ انھوں نے اللہ کے رسول ﷺ سے پوچھا: کیا بات ہے کہ ہمارا قرآن میں اس قدر ذکر نہیں جس قدر مردوں کا ہے۔ ایک دن میں کنگھی کر رہی تھی کہ ظہر کے وقت منبر پر نبی ﷺ کی آواز نے مجھے حیران کر دیا۔ میں اپنے بال سمیٹ کر ایک حجرے میں گئی۔ میں نے اپنے کان کھجور کی شاخ پر لگائے تو آپ کو سر منبر یہ آیت پڑھتے سنا۔ مجاہد نے بھی ام سلمہ کی اس روایت کو بیان کیا ہے مگر ترمذی اور طبرانی کی روایت کے مطابق سوال پوچھنے والی ام عمارہ انصاریہ تھی نہ کہ ام سلمہؓ۔ اگر سیاق و سباق کو پیش نظر رکھا جائے تو قتادہ کی روایت برمحل معلوم ہوتی ہے۔ بہرکیف دونوں روایات اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ مردوں کے ساتھ عورتوں کی

Marfat.com

صلاحیتوں کا بطور خاص ذکر کیا گیا ہے وگرنہ وہ تمام احکام جو مردوں کے لیے اتارے گئے عورتوں پر بھی عائد ہوتے ہیں جداگانہ خطاب کی ضرورت نہ تھی کیونکہ دونوں اصناف ایک ہی نوع بشر سے تعلق رکھتی ہیں۔ اس آیت میں عورتوں کی دلجمعی کر کے ان کے مرتبہ و مقام کو اُجاگر کیا گیا ہے۔ آیت زیر بحث میں مردوں اور عورتوں کی دس خصوصیات کا ذکر کیا گیا ہے۔

۱۔ اسلام سے مراد قول و عمل میں دین کے احکام کو تسلیم کرنا ہے یہ دین کا ظاہر ہے۔

۲۔ دین نے جن احکام کو فرض قرار دیا ہے ان کی مکمل تصدیق ایمان ہے اور یہ دین کا باطن ہے۔ اسلام اور ایمان دین کی جامع تعبیر ہے یہ دونوں بیک وقت مطلوب ہیں۔

۳۔ قنوت اللہ کے احکام کی ایسی فرمانبرداری جو سکون اور اطمینان کے ساتھ ہمیشہ جاری رہے۔ اسلام کے بعد ایمان کا مرحلہ ہے اور ان دونوں سے قنوت اور خشوع صورت پذیر ہوتے ہیں۔

۴۔ قول و فعل اور ارادہ، صدقِ ایمان کی علامت ہے جیسے جھوٹ نفاق کی۔

۵۔ عبادات کی ادائیگی اور شہوات پر غلبہ پانے میں بہادری کے ساتھ تکلیف برداشت کرنا صبر ہے جو آدمی حق پر ڈٹا رہے اور اپنے رب سے راضی ہو وہ صابر ہے۔

۶۔ دل اور جوارح کے ساتھ اللہ کے سامنے فروتنی اور اس کے ثواب کی خواہش اور عذاب کا ڈر۔ یہ صفت انسان کو اپنے رب کے سامنے بھی جھکاتی ہے اور مخلوق کے سامنے بھی، وہ شاخ ثمر دار کی مانند نوع انسانی کی خدمت کے لیے جھکا رہتا ہے۔ تکبر اور غرور ان تمام برائیوں کی جڑ ہے جن کا تعلق حقوق اللہ اور حقوق العباد سے ہے۔

۷۔ صدقہ و خیرات نفس کے بخل سے پاکیزگی پر دلالت کرتا ہے۔ لوگوں پر رحم کھانے کا احساس دلاتا ہے۔ معاشرے میں تکافل کا بیج ڈالتا ہے۔ مال کے حقوق کو پورا کرتا اور اس پر منعم کا شکر یہ ادا کرنے کی توفیق بخشتا ہے۔ اس سے اللہ اور آخرت پر ایمان کی تصدیق ہوتی ہے۔

۸۔ صوم اپنے تسلسل کی وجہ سے ایک صفت بن جاتا ہے ضروریات زندگی سے بے نیازی، ارادہ کی پختگی، انسانی اوصاف کا حیوانی اوصاف پر غلبہ اس کا ثمر ہے۔ روزہ انسان کے تمام کردار کی بنیاد ہے اور صبر کی تربیت کا ایک ذریعہ ہے۔

۹۔ شرم گاہوں کی حفاظت سے مراد انسانی وجود میں موجود سب سے شدید رغبت کا ضبط ہے اور اس محرک پر کنٹرول صرف وہ کر سکتا ہے جسے اللہ نے توفیق بخشی ہو۔ ایک اعلیٰ حکمت کے تحت

Marfat.com

اللہ مرد اور عورت کو گوشت پوست کے تقاضوں سے اوپر اٹھا کر احکام الٰہی کے تابع بناتا ہے اور ان کے لیے تعمیر و ترقی کی راہ ہموار کرتا ہے۔

۱۰۔ اللہ کا ذکر کثیر۔ آیت کو اس بات پر ختم کیا گیا ہے کہ ان اوصاف کی نگہداشت کثرت سے اللہ کا ذکر کرنے سے ہوگی۔ بندہ جس قدر اپنے رب کا ذکر کرے گا اتنی ہی یہ صفات اس کے اندر راسخ ہوں گی۔ یہ اللہ کے بارے میں انسان کے عقیدہ اور اس کے اعمال کا نقطہ اتصال ہے۔ ہر لحظہ اور ہر وقت دل کو اللہ کا احساس دلانا چاہیے اور دل کو ذکر کے نور سے منور کرنا چاہیے کیونکہ دل نور حیات کا سرچشمہ ہے۔ بدنی اعمال میں کثرت غیر ممکن ہے کیونکہ بدن کے تقاضے اس بات میں حائل ہوتے ہیں کہ آدمی ہمیشہ عبادت کرتا رہے مگر اس بات میں تو کوئی رکاوٹ نہیں کہ وہ کھاتے پیتے اور چلتے پھرتے اللہ کو یاد کرتا رہے جیسا کہ اللہ کا قول ہے: 'اَلَّذِیْنَ یَذْکُرُوْنَ اللّٰہَ قِیَامًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰی جُنُوْبِھِمْ' (آلِ عمران ۳:۱۹۱) جو اللہ کو اٹھتے بیٹھتے اور پہلو پر لیٹے یاد کرتے رہتے ہیں۔ اسی بنا پر آیت میں ذکر کو کثیرا کے ساتھ متصف کیا گیا ہے۔

ان اوصاف کو ایک حکیم و علیم خدا نے جمع کیا ہے جس کی کوئی تدبیر حکمت سے خالی نہیں ہوتی۔ یہ تمام اوصاف ایک دوسرے کی تقویت کرتی ہیں، یوں معلوم ہوتا ہے کہ صفت ایک ہی ہے۔ اس کی مثال انسانی وجود ہے اگر آپ اسے مجملاً دیکھیں تو اس کی شخصیت ذات و صفات کے ساتھ نظر آئے گی اور اگر اسے مفصلاً دیکھیں تو بھی اس کی شخصیت ذات و صفات کے ساتھ نظر آئے گی۔ اس جسم کا سرمایہ بقا دل ہے اور ان تمام اوصاف کا سرمایہ بقا وہ ایمان ہے جو دل میں پیدا ہوتا ہے۔ سب سے پہلی صفت اسلام سیڑھی کا پہلا زینہ ہے جس پر چڑھ کر انسان شریعت کے تمام مراحل طے کرتا ہے۔ یہ وہ دروازہ ہے جس سے انسان اللہ کے دین میں داخل ہوتا ہے۔ ایمان اسلام کو اس کے اصل مقام دل کی طرف لے جاتا ہے اور قنوت اس ایمان کی قبولیت کا نام ہے جو دل میں قرا رپا جاتا ہے۔ صدق اس پودے کا نام ہے جو دل میں ایمان کے بیج سے اگتا ہے صبر اس غذا سے عبارت ہے جس سے یہ پودا پھلتا پھولتا ہے یہاں تک کہ وہ پیش آنے والے خطرات کے سامنے سینہ سپر ہو جاتا ہے یہاں تک کہ وہ پھل لگ جاتا ہے جس کی آس ہوتی ہے۔ خشوع اللہ سے ولاء اور اس کا حکم ماننے کا نام ہے۔ یہ صبر کے نتیجہ میں کھلنے والا سب سے پہلا پھول ہے۔ یہ صفات

Marfat.com

انسان اپنی ذات کی حدود میں زمان اور مکان کے درمیان پیدا کرتا ہے۔ یہ صفات انسان کا محفوظ سرمایہ ہے جو اس کے دل میں قوت ایمان کی شکل میں موجود ہوتا ہے اور وہ اس سرمایہ کو زندگی کے معاملات میں خرچ کرتا رہتا ہے۔

روزہ، صدقہ و خیرات، شرم گاہ کی حفاظت اور اللہ کا ذکر ایسے اعمال ہیں جن پر اعضاء کے ساتھ دل کی حکمرانی ہوتی ہے۔ یہ صفات ایک عمارت کی مانند ہیں جس کا ایک حصہ دوسرے کی تکمیل کرتا ہے۔ ہر بعد میں آنے والی صفت پہلی کی تقویت کرتی ہے یعنی یہ ترتیب ایک بدیہی بات ہے جس سے وہ نغمہ تشکیل پاتا ہے جو صحیح ایمان کی صورت میں انسانی وجود میں موجود رہتا ہے۔

وہ مومن جو اجر کا سزاوار ہوتا ہے وہ ان سب صفات کو ایک ساتھ اپناتا ہے تو مسلمان مومن اور قانت بن جاتا ہے۔ مجمل طور پر یہ ایک صفت ہے اور مفصل طور پر دس صفات۔ ان صفات میں کوئی باہمی فضیلت نہیں کیونکہ مومن کے وجود میں صحیح ایمان کی تعمیر کے لئے یہ صفات اس طرح سے ناگزیر ہیں جس طرح جسم کو قائم رکھنے کے لئے ہر عضو ناگزیر ہوتا ہے۔

سب سے پہلی صفت اسلام ہے یہ اللہ کے دین میں داخل ہونے کے لئے پہلا قدم ہے اور آخری قدم اللہ کا ذکر ہے جو اس شخص کو جو اللہ کے دین میں داخل ہوتا ہے اوج کمال تک پہنچا دیتا ہے۔ اللہ کے ذکر سے مراد دل میں اللہ کی عظمت و قدرت اور علم و حکمت اور اللہ کی صفات کمال و جلال کا احساس ہے۔ اس ذکر کے ذریعہ سے مومن اللہ سے مانوس ہوتا ہے اور اس کا قرب حاصل کر لیتا ہے۔ اس کا ہر عمل اللہ کی حضوری کے احساس کا تابع ہوتا ہے۔ اسے اس کی رحمت کی آس رہتی ہے اور اس کے عذاب کا خوف۔ یہ اوصاف اللہ کی نشانیاں ہیں اور قرآنی اعجاز کے شواہد۔

عورت کی قدر و قیمت

اس سورت کے آغاز میں ازواج مطہرات کی امتیازی خصوصیات کے بعد عام مسلمان مرد اور عورتوں کی شخصیت کے عناصر ترکیبی کے بارے میں گفتگو کی گئی ہے۔ مرد کے پہلو میں عورت کا ذکر عورت کی قدر و قیمت بلند کرنے سے عبارت ہے تا کہ معاشرہ میں اسے بلند مقام عطا ہو۔ اللہ کے ساتھ تعلق کے اس عقیدہ کی ذمہ داریوں میں اور زندگی میں سیدھے چلن کے لئے وہ دونوں برابر ہیں۔ اس آیت مبارکہ میں عورت اور مرد کے درمیان تکلیف اور جزا کی مساوات کا بیان ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ ایک دوسرے کی تکمیل کا باعث ہوں گے۔ ایک دوسرے کے بغیر دونوں اپنی ذات کی تکمیل نہیں کر سکتے۔

Marfat.com

آیت میں مردوں اور عورتوں کی دس صفات کا ذکر کیا گیا ہے ان میں سے جو بھی ان اوصاف سے متصف ہوگا بخشش اور اجر عظیم کا مستحق ہوگا۔

مولانا محمد علی لکھتے ہیں: 'یہاں ان تمام اعلیٰ صفات میں جو اللہ کے نزدیک مردوں کو بلند مرتبہ پر پہنچاتی ہیں عورتوں کو شریک کر کے یہ بتایا ہے کہ عورتیں اللہ کے ہاں مقامات عالیہ حاصل کرنے میں مردوں سے کسی طرح کم نہیں۔ اسی لئے آخر میں مغفرت اور اجر عظیم کا ذکر کیا گیا ہے۔ مغفرت سے مراد یہاں حفاظت الٰہی ہے اور یہ بتا دیا گیا ہے کہ جس اجر کے مستحق مرد ہیں اسی کی مستحق عورتیں بھی ہیں۔ چونکہ پچھلے رکوع میں ازواج رسول کا ذکر تھا اسی لئے ایک تو اس مناسبت سے یہاں عورتوں کا ذکر مردوں کے ساتھ کیا ہے اور دوسرے اس مناسبت سے کہ صرف ازواج رسول کے لئے مقامات عالیہ مخصوص نہیں بلکہ سب عورتیں انہی بلند مقام کو حاصل کر سکتی ہیں۔ تعجب ان لوگوں پر ہے جو باوجود قرآن کریم کی ایسی صریح تعلیم کے جس کی رو سے عورتیں مقامات عالیہ حاصل کرنے میں مردوں کی ہم پایہ قرار دی گئی ہیں یہ راگ الاپتے ہیں کہ اسلام نے عورت کی عزت مرد کے برابر نہیں کی یا اسلام کی تعلیم کی رُو سے عورت میں روح ہی نہیں'۔

مولانا امین احسن اصلاحی زیادہ واضح انداز میں اس آیت کی تفسیر کے ضمن میں فرماتے ہیں: 'مقصود اس سے یہ بتانا ہے کہ اللہ اور رسول کو جو معاشرہ مطلوب و محبوب ہے اس کی صفات کیا ہونی چاہیں۔ یہ گویا مسلمان مردوں اور عورتوں کے سامنے ایک آئینہ رکھ دیا گیا ہے کہ وہ اس کو سامنے رکھ کر اپنے آپ کو سنواریں۔ یہاں چونکہ خطاب خاص طور پر ازواج مطہرات سے ہے نیز مقصود اسلامی معاشرے کے اجزائے ترکیبی کو بتانا ہے اس وجہ سے عورتوں کا ذکر ضمناً نہیں بلکہ مردوں کے پہلو بہ پہلو مستقلاً آیا ہے اس لیے کہ عورتیں معاشرے کا بالکل نصف اور مساوی حصہ ہیں اور معاشرے کے بناؤ بگاڑ میں ان کا دخل مردوں سے شاید قدرے زیادہ ہو'۔

معاشرہ مردوں اور عورتوں دونوں پر مشتمل ہوتا ہے اس لئے معاشرے کو سنوارنے کے لئے ان دونوں کو شانہ بشانہ چلنا ہے۔ دونوں کے بغیر زندگی کی گاڑی نہیں چل سکتی۔ حیاتیاتی خصوصیات جو افزائش نسل کے لئے مرد اور عورت میں الگ الگ رکھی گئی ہیں، کے علاوہ ان دونوں کی صلاحیتوں میں قطعی کوئی فرق نہیں۔ آیت مبارکہ میں دونوں کی خصوصیات کو مساویانہ طور پر پیش کیا گیا ہے۔

Marfat.com

قرآن نے واضح طور پر عورت کی قدر و قیمت کو بیان کیا ہے آیت کا شان نزول اس پر دلالت کرتا ہے۔اس کے باوجود میں صاحب روح المعانی کے الفاظ دیکھ کر حیران رہ گیا فرماتے ہیں:

وللہ تعالیٰ در التنزیل اشار فی اول آلایۃ و آخرھا الیٰ افضلیۃ الذکور۔اللہ ہی کے لئے ہے قرآن کی خوبی! جس نے آیت کے آغاز میں اور آیت کے آخر میں مرد کی فضیلت کی طرف اشارہ کیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ آیت کے آغاز میں پہلے مسلمون (مذکر کا صیغہ ہے) ہے آخر میں لھم مذکر کی ضمیر ہے۔ذہن میں جمے ہوئے سماجی تصورات کے تحت کس قدر غلط تاویل کی گئی ہے۔قرآن میں اسلوب تغلیب کے تحت احکام کے بارے میں مذکر کا صیغہ استعمال کر کے اس میں مونث کو بھی شامل کیا گیا ہے۔اگر مونث کو علیحدہ کیا جائے تو سب احکام بے کار ہو جائیں۔

ایک ہی صیغہ اس لئے استعمال کیا گیا ہے کہ دونوں کا تعلق ایک ہی نوع بشر سے ہے اس میں فضیلت کا قطعی کوئی پہلو نہیں۔ متعدد مقامات پر قرآن نے عورت کی صفات بیان کرتے وقت مذکر کا صیغہ استعمال کیا ہے کیا وہاں عورت افضل ہوگی۔حضرت مریم کے لئے قانتین اور ام موسیٰ کے لئے مومنین کی صفت بیان کی گئی ہے۔سماج کا دباؤ محمود آلوسی کے پائے کے مفسر کے منہ سے بھی کس قدر غلط باتیں نکلواتا ہے۔

Marfat.com

الناس (لوگ)

لغوی مفہوم

بعض اہل لغت کا خیال ہے کہ الناس ، انس کی نادر جمع ہے صحاح اور قاموس المحیط کا یہی قول ہے جبکہ المصباح المنیر کا قول یہ ہے کہ یہ اسم ہے جو رھط اور قوم کی مانند جمع کے لیے وضع کیا گیا ہے۔ اس لیے اس لفظ سے اس کا کوئی واحد نہیں ہاں انسان اس کا غیر لفظی واحد ہے۔ امام طبری، زمخشری ، ابوحیان اور بیضاوی نے اسی قول کی تائید کی ہے اناسی اور اِنسی اسی کے مرادفات ہیں۔ سورۃ فرقان کی آیت نمبر ۴۹ میں اناسی استعمال ہوا ہے۔

الناس کا اطلاق انسان پر بھی ہوتا ہے اور جن پر بھی جیسا کہ قرآن مجید کی آخری سورۃ میں آیت نمبر ۵ الَّذِیْ یُوَسْوِسُ فِیْ صُدُوْرِ النَّاس (جو لوگوں کے سینوں میں وسوسہ ڈالتا ہے) کی تفسیر اگلی آیت میں مِنَ الْجِنَّةِ وَ النَّاس یعنی اُن میں جن بھی ہو سکتے ہیں اور انسان بھی۔ ابن خالویہ سے روایت ہے کہ عرب کہتے ہیں رایت ناسا من الجن میں نے جن لوگ دیکھے۔ مگر صاحب البحر المحیط کا قول ہے کہ الناس مجازاً جنوں کے لئے استعمال ہوا ہے۔ حقیقت میں اس سے مراد بنی آدم ہیں۔ جنوں کو اسی طرح الناس کہا گیا ہے جیسا کہ ان کو قرآن میں رجال کہا گیا ہے۔ اللہ کا قول ہے: وَّاَنَّهٗ كَانَ رِجَالٌ مِّنَ الْاِنْسِ یَعُوْذُوْنَ بِرِجَالٍ مِّنَ الْجِن (جن ۶:۷۲)۔ 'اور انسانوں میں سے کچھ مرد جنوں میں سے مردوں کی پناہ لیتے تھے'۔

اصل

جمہور اہل لغت کا خیال ہے کہ الناس اصل میں اناس ہے سیبویہ اور فراء کا قول ہے کہ اس کا مادہ ھمزہ، نون اور سین ہے۔ اناس کا ھمزہ کثرت استعمال سے تخفیفاً حذف کیا گیا ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے الوقة (مکھن) کو لُوقة کہا جاتا ہے۔ لام تعریف کے ساتھ اس کا حذف لازم ہو جاتا ہے الأناس نہیں کہا جاتا کیونکہ الف لام، ھمزہ کا بدل ہے۔ جوہری نے اس پر یہ اعتراض وارد کیا ہے کہ یہ ھمزہ کا بدل نہیں سمجھا جا سکتا کیونکہ شاعر (ذوجدون الحمیری) نے دونوں کو ایک ساتھ جمع کیا ہے، شعر یوں ہے:

ان المنایا یطلعـ
ـن علی الأناس الآمنین

Marfat.com

'بے شک موتیں محفوظ لوگوں کو اچانک آلیتی ہیں' مگر بیضاوی نے اس شعر کو خلاف قاعدہ اور شاذ قرار دیا ہے۔ کثرت استعمال سے ھمزہ ساقط ہوگیا ہے۔ پھر اس کے عوض الف لام تعریف کا داخل کیا گیا پھر لام کو نون میں مدغم کر دیا گیا۔ اُناس کے اصل ہونے کا ذکر اللہ کے اس قول میں ہے: يَوْمَ نَدْعُوا كُلَّ أُنَاسٍ بِإِمَامِهِمْ (بنی اسرائیل ۱۷:۷۱) 'اس دن سب لوگوں کو ان کے امام کے ساتھ بلائیں گے'۔ قرآن مجید میں استعمال ہونے والے الفاظ انس انسان اور أناس اسی اصل پر دلالت کرتے ہیں۔ سلمہ بن عاصم نے زور دے کر کہا ہے کہ الناس اور ناس کا مادہ الگ الگ ہے۔

مادہ

الناس کس مادہ سے مشتق ہے اس بارے میں مختلف چار اقوال ہیں۔ ایک قول تو یہ ہے کہ اس کا مادہ اُنس ہے جو وحشت کی ضد ہے۔ انسان مدنی الطبع ہے اس لیے وہ ہم جنس انسان سے مانوس ہو جاتا ہے، باہمی انس اور محبت کا جذبہ ہر بشر میں پایا جاتا ہے خواہ وہ مرد ہو یا عورت۔ شاعر کا شعر ہے:

وما سمّی الانسان الا لأنسه
ولا القلب الا انه یتقلب

'انسان کو انس کی وجہ سے انسان کہا جاتا ہے
اور دل کو قلب پلٹنے کی وجہ سے کہا جاتا ہے'۔

دوسرا قول یہ ہے کہ یہ نسی (بھول جانا) سے مقلوب ہے۔ قلب کی وجہ سے نسی نیس ہو گیا۔ ی کا ماقبل مفتوح ہے اس لئے وہ الف میں بدل گئی تو ناس ہو گیا۔ پھر اس پر الف اور لام داخل کیا گیا۔ ابن عباس سے بھی روایت ہے کہ انسان کو انسان اس لئے کہا جاتا ہے کیونکہ اس نے پہلے اللہ سے پیمان باندھا پھر اسے بھول گیا۔ ابوالفتح بستی کا شعر ہے:

یا اکثر الناس احسانا الی الناس
واکثر الناس فضلا علی الناس
نسیت عهدك والنسیان مغتفر
واغفر فاول ناس اوّل الناس

لوگوں میں سب سے بڑھ کر لوگوں پر احسان کرنے والے
اور ان پر سب سے بڑھ کر فضل و کرم کرنے والے
تو اپنا عہد و پیمان بھول گیا ہے اور بھول قابل معافی ہے

Marfat.com

معافی مانگ کیونکہ سب سے پہلے بھولنے والا سب سے پہلا انسان تھا۔

ایک قول ہے کہ الناس، انس سے مشتق ہے جس کے معنی دیکھنے اور دکھائی دینے کے ہیں۔ اللہ کا قول ہے: آنَسَ مِن جَانِبِ الطُّورِ نَارًا (القصص ۲۸:۲۹) کیونکہ انسان ظاہر ہے اسے دیکھا جاتا ہے جیسے جن کو چھپنے کی وجہ سے جن کہا جاتا ہے۔ ظاہر اور محسوس ہونے کی وجہ سے انسان کو بشر بھی کہا جاتا ہے۔ سورۃ الحجر (۲۵:۲۶،۲۸) میں انسان اور بشر ایک ہی معنوں میں آئے ہیں۔ چوتھا قول یہ ہے کہ اس کا مادہ نوس (حرکت کرنا) ہے۔ کسائی کی رائے ہے کہ انس کا مادہ ن، واو اور س ہے۔ کسی چیز کے ہوا میں لہرانے کو نوس کہا جاتا ہے۔ چنانچہ کہا جاتا ہے کہ نساس القرط فی الأذن بالی کان میں لہرائی۔ یہ کثرت حرکت کی دلیل ہے۔ ہوا میں لہرانے کا مفہوم جنوں پر بھی صادق آتا ہے اس قول کا سب سے بڑا شاہد یہ ہے کہ الناس کی اسم تصغیر اپنے اصل کے لحاظ سے تو نویس ہے اگر اصل انس ہوتا تو اُس کی تصغیر انیس ہوتی۔

مجازی معنی

صاحب المفردات کا قول ہے کہ کبھی مجازی طور پر الناس کے عام معنی مراد نہیں ہوتے۔ اس وقت اس میں انسانیت کے معنوں کو پیش نظر رکھا جاتا ہے۔ ان معانی میں فضیلت، اخلاق حمیدہ اور انسانی خصوصیات بدرجہ اتم موجود ہوتی ہیں۔ جو چیز ان خصوصیات سے عاری ہو وہ اس نام کی مستحق نہیں سمجھی جاسکتی۔ مثلاً اگر ید (ہاتھ) میں خصوصی وظیفہ کو ادا کرنے کی صلاحیت نہ ہو تو انسانی ہاتھ (ید) پر اس کا اطلاق بالکل ایسے ہی ہے جیسے چارپائی کے بازو کو ید اور اس کے پائے کو رجل کہا جاتا ہے یعنی اس کا ہاتھ چارپائی کے بازوں کی طرح بے حس وحرکت ہوگا۔ چنانچہ آیت مبارکہ آمِنُوا كَمَا آمَنَ النَّاسُ (البقرۃ ۲:۱۳) ایمان لاؤ جیسے انسان ایمان لاتے ہیں۔ وہی انسان مراد ہیں جو آیت مبارکہ أَمْ يَحْسُدُونَ النَّاسَ عَلَىٰ مَا آتَاهُمُ اللَّهُ مِن فَضْلِهِ (نساء ۴:۵۴) میں مذکور ہیں یا وہ حسد کرتے ہیں ان (پاکباز) انسانوں پر اس فضل کی وجہ سے جو اللہ نے ان کو عطا کیا ہے۔ یہاں الناس سے مراد وہ انسان ہیں جو اپنی اصل فطرت یعنی انسانیت سے مزین ہیں۔

قرآن حکیم میں ارشاد ربانی ہے: مِمَّا خَلَقْنَا أَنْعَامًا وَأَنَاسِيَّ كَثِيرًا (الفرقان ۲۵:۴۹)۔ اپنی مخلوقات میں سے بہت سے چوپایوں اور انسانوں کو۔ اس آیہ مبارکہ میں أناسی، الناس کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ سیبویہ کی رائے میں أناسی انسان کی جمع ہے۔ جیسے ظربان کی جمع ظرابین اور سرحان کی جمع سراحین۔ اصل میں یہ أناسین اور ظرابین ہے اس کے نون کو یاء میں بدل کر

Marfat.com

ماقبل میں مدغم کردیا گیا ہے۔ کبھی کبھی أناسیّ، یاء مخفف کے ساتھ اناسی بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ جیسے قرقور (بڑی کشتی) کی جمع قراقیر بھی ہوتی ہے اور قراقر بھی جیسے اناعیم اور أناعم گویا عین اور لام کلمہ کے درمیان کی یاء کو ساقط کردیا جاتا ہے۔ تخفیف کے ساتھ اناسیة بھی عرب اکثر استعمال کرتے ہیں حالانکہ أفاعلة کا وزن ان اسماء کی جمع میں استعمال ہوتا ہے جن میں یائے نسبت ہوتی ہے۔ جیسے مھلبی کی جمع مھالبة اور ازرقی کی جمع ازارقة۔ فراء، مبرد اور زجاج کی رائے میں یہ انسی کی جمع ہے جیسا کہ کرسی کی جمع کراسی اور قیاسا اسے اناسیة بھی کہا جاسکتا ہے۔ ایک لغوی روایت یہ بھی ہے کہ أناسی اِنس کی جمع ہے۔

لغوی بحث کا خلاصہ

قرآن حکیم میں استعمال ہونے والے الفاظ انس، انسان، أناس، الناس اور أناسی کا اطلاق رنگ و نسل اور جنس کی تمیز کے بغیر تمام نوع انسانی پر ہوتا ہے۔ اسے خواہ انــس سے مشتق مانا جائے یا آنــس سے یا نوس سے یا نسی سے انس ومحبت، دیکھنے کی صلاحیت، بھول جانے کی صفت اور حرکت کرنے کا خاصہ، کیا مرد اور کیا عورت سب میں مساویانہ موجود ہے، جہاں جہاں یہ الفاظ استعمال ہوئے ہیں وہاں مردوں کے ساتھ عورتیں بھی برابر کی شریک ہیں۔ اس سلسلہ میں مزید بحث سورۃ نساء کی آیت نمبر ایک کے تحت روح المعانی کے حوالے سے کی جائے گی۔ ان الفاظ کا استعمال خواہ حقیقی معنی میں ہو یا مجازی معنوں میں، ان میں مرد بھی شامل ہوں گے اور عورتیں بھی۔

اللہ تعالیٰ مردوں اور عورتوں سمیت سب انسانوں پر یکساں مشفق ومہربان ہے وہ ان پر ذرہ برابر بھی ظلم نہیں کرتا۔ اس نے انبیاء علیہ السلام اور آسمانی کتابوں کو نوع انسانی (مردوعورت) کی ہدایت کے لئے بھیجا۔ تورات وانجیل انہیں کی ہدایت کے لئے نازل ہوئیں۔ قرآن بھی انہیں کی ہدایت کے لئے نازل ہوا، اور جناب نبی کریم ﷺ کو ان سب انسانوں کی طرف رسول بنا کر بھیجا گیا۔ تاکہ انسان حق و باطل میں تمیز کرنے لگیں۔ اللہ کی بھیجی ہوئی ہدات کے بارے میں مردوں اور عورتوں سمیت سب کا رویہ ایک جیسا رہا۔ انسانوں میں کچھ ایسے ہیں جو اللہ کا شریک ٹھہراتے ہیں ان میں سے اکثر اللہ کے بھیجے ہوئے پیغام سے غافل ہیں۔ وہ دین قیم کو نہیں جانتے۔ بہت سے انسان فاسق ہیں اللہ کی ملاقات کا انکار کرتے ہیں۔ جب ان کو کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو وہ توبہ کرتے ہوئے اللہ کو پکارنے لگتے ہیں اور جب مصیبت ٹل جاتی ہے تو روگردانی کرتے ہیں۔ ایسے انسان بھی ہیں جو اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان لاتے ہیں اور اللہ کی رضا کی خاطر جان تک قربان کرنے سے گریز نہیں کرتے۔ یہ خوبیاں اور خامیاں

Marfat.com

مردوں میں بھی موجود ہیں اور عورتوں میں بھی۔ یہ الفاظ قرآن حکیم میں مختلف مقامات پر کثرت سے استعمال ہوئے ہیں۔ میں صرف ان آیات کا ذکر کروں گا جو انسانی نقطہ نظر سے خاص اہمیت کی حامل ہیں۔

انسان اور انسانیت

اللہ کا ارشاد ہے: وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ آمِنُوا كَمَا آمَنَ النَّاسُ قَالُوا أَنُؤْمِنُ كَمَا آمَنَ السُّفَهَاءُ (البقرۃ ۲:۱۳) 'جب ان سے کہا جاتا ہے کہ تم ایمان لاؤ جیسے وہ لوگ ایمان لائے جن کو تم پہچانتے ہو تو کہتے ہیں کیا ہم ایسا ایمان لائیں جیسا بیوقوف لائے ہیں'۔ الناس سے مراد کوئی خاص انسان نہیں بلکہ الف، لام یہاں جنس کے لئے ہے یعنی ان لوگوں کی طرح ایمان لاؤ جن میں انسانیت کے اوصاف پائے جاتے ہیں جو انسانیت کا حق ادا کرتے ہیں۔ یہاں کما آمن الناس کہا گیا ہے، کما آمن المؤمنون نہیں کہا گیا۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ ایمان اس انسانی فطرت سے قریب تر چیز ہے جس پر اللہ نے انسان کو پیدا کیا اور یہ کہ انسانوں کے شایان شان یہ ہے کہ وہ ایمان کی دعوت کو قبول کریں۔ حقیقت میں یہی انسان ہیں جو فطرت کے تقاضوں کے مطابق کام کرتے ہیں ان کے سوا باقی سب جانور ہیں کیونکہ وہ حق اور باطل میں تمیز نہیں کر سکتے۔ انسان کو حیوانات پر اپنی عقل اور ہدایت دینے والی سوچ کی وجہ سے فضیلت حاصل ہے۔

یہاں الف لام جنس کے لئے ہے مراد انسانیت میں کامل لوگ ہیں کیونکہ اسم جنس جس طرح مسمّی کے لئے مطلقاً استعمال ہوتا ہے اسی طرح مخصوص معانی کیلئے بھی استعمال ہوتا ہے اور اسے دوسرے معنوں سے الگ کر دیتا ہے۔ محاورۃ ہے زید لیس بانسان 'زید انسان نہیں'۔ اللہ کا قول صُمٌّ بُكْمٌ عُمْيٌ (البقرۃ ۲:۱۸) انہی معنوں میں ہے۔ شاعر نے دونوں کو ایک ہی شعر میں اکٹھا کر دیا ہے۔ ؎ اذا الناس ناس والزمان زمان۔ وہ لوگ بھی حقیقت میں انسان تھے اور زمانہ بھی حقیقت میں زمانہ تھا۔

اسی طرح مندرجہ ذیل آیات میں بھی النــاس سے خاص لوگ مراد نہیں بلکہ وہ لوگ مراد ہیں جو انسانیت میں کامل ہیں۔

۱۔ أَمْ يَحْسُدُونَ النَّاسَ عَلَى مَا آتَاهُمُ اللَّهُ مِن فَضْلِهِ 'جو اللہ نے انسانوں (کامل انسانوں) کو اپنے فضل سے دے رکھا ہے اس پر حسد کرتے ہیں' (نساء ۴:۵۴)۔

۲۔ الَّذِينَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ إِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوا لَكُمْ فَاخْشَوْهُمْ (آل عمران ۳:۱۷۳) 'وہ جن کو لوگوں نے کہا کہ لوگوں نے تمہارے لیے لشکر جمع کیے ہیں پس ان سے ڈرو'۔ انسانیت میں کامل مرد بھی ہو سکتے ہیں اور عورتیں بھی۔ لفظ الناس میں دونوں شامل ہیں۔

Marfat.com

امت وسط

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا ۙ (البقرہ ۲:۱۴۳)۔ ہم نے اسی طرح تمہیں معتدل اُمت بنایا ہے تاکہ تم لوگوں پر گواہ ہو جاؤ اور رسول ﷺ تم پر گواہ ہو جائیں۔ وسط اصل میں وہ اسم مکان ہے جہاں سے اس کے دونوں اطراف کا فاصلہ مساوی ہو۔ جو چیز دو کناروں کے درمیان ہوگی وہ نقطہ اعتدال پر ہوگی اور افراط و تفریط کی مذموم اطراف کے درمیان ہوگی اور یہ اس کے بہتر ہونے کی فطری دلیل ہے۔ چنانچہ استعارۃً اس کا استعمال اوصاف حمیدہ کے لئے ہوتا ہے۔ ولـــــد کی طرح یہ واحد و جمع اور مذکر و مؤنث دونوں کے لیے استعمال ہوتا ہے اسی طرح وہ اسماء جو اس صفت سے متصف ہوں گے وہ واحد جمع اور مذکر و مؤنث کیلئے استعمال ہوں گے۔ اُمت کے معنوں میں امام رازی نے قفال کا قول نقل کیا ہے (۱۱:۶) کہ یہ ایک ایسی قوم ہے جو کسی ایک مقصد کے لیے اکٹھی ہو اور اسی مقصد کے لیے ایک دوسرے پر قربان ہو۔ یہ اہتمام سے ماخوذ ہے۔ یہاں لفظ وسط میں سب معنی پائے جاتے ہیں خواہ وہ وساطت سے ماخوذ (اس میں مرد و عورت برابر کے شریک ہوتے ہیں) حسن و عمدگی کے معنی میں ہو یا وسط سے ماخوذ اعتدال اور میانہ روی کے معنی میں ہو یا وسط سے ماخوذ اپنے حسی اور مادی معنوں میں ہو۔ مولانا امین احسن اصلاحی کے الفاظ میں امت مسلمہ کو امت وسط کہنے کی وجہ یہ ہے کہ یہ امت ٹھیک دین کی اس شاہراہ کے وسط پر قائم ہے جو اللہ تعالیٰ نے خلق کی رہنمائی کے لئے اپنے نبیوں اور رسولوں کے ذریعے سے کھولی ہے۔ اس میں نہ تو شریعت موسوی جیسی شدت ہے اور نہ عیسائیوں جیسی رقت۔ یہ ان مادہ پرستوں کی بھی مخالفت کرتا ہے جو تفریط سے کام لیتے ہوئے کہتے ہیں: اِنْ هِیَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا (الانعام ۶:۲۹)۔ اور ان روحانی لوگوں کی بھی جو دین میں افراط سے کام لیتے ہوئے کہتے ہیں کہ ہمارا وجود روح کے لئے قید خانہ ہے اور باعث عذاب ہے۔ امت مسلمہ اپنے تصورات میں، اعتقادات میں، فکر و شعور میں، نظم و نسق میں، رشتوں اور تعلق میں اور زمان و مکان میں امت وسط ہے۔ اس سے پہلے بشریت کا عہد طفولیت ختم ہوا، اور اس کے بعد عقل بلوغت کا عہد رہتی دنیا تک قائم رہے گا۔ جغرافیائی لحاظ سے دیکھیں تو جزیرہ عرب کا مقام دنیا کے وسط میں ہے اور تاریخی طور پر ثابت ہے کہ یہاں سے اسلام مشرق و مغرب اور شمال و جنوب میں پھیلا۔

مفسرین نے عام طور پر اس شہادت کو آخرت سے متعلق مانا ہے حالانکہ آخرت میں یہ مرتبہ امت مسلمہ کو اس وجہ سے ملے گا کہ اللہ تعالیٰ نے اسے اس دنیا میں اسی منصب پر سرفراز کیا ہے۔ بات وہی

Marfat.com

درست ہے جو صاحب کشاف نے کہی ہے کہ امت وسط اس لئے ہے کہ وہ اس دنیا میں ان باتوں کے بارے میں لوگوں کی گواہی دے گی جن کو عادل اور نیک کی گواہی کے بغیر درست نہیں سمجھا جاسکتا۔ مطلب یہ ہے کہ تم سب افراط وتفریط کے مرتکب لوگوں کے خلاف گواہی دینے والے ہو اور اپنے اعتدال اور میانہ روی کی وجہ سے تمام اقوام سے سبقت لے گئے ہو۔ یہ امت اپنی سیرت اور جسمانی ور وحانی ارتقاء کے ذریعہ یہ گواہی دے گی کہ وہ اعتدال میں سب سے آگے ہے۔ یہ امت وسط ہے جو سب لوگوں کی گواہی دے گی اور ان میں عدل وانصاف قائم کرے گی۔ یہ اپنی اقدار، اپنے تصورات، رسوم و عادات اور شعار کو ترازو میں تولے گی۔ ان کی میزان، ان کی اقدار کا تعین کر کے اور ان کے اعمال اور رسوم وعادات پر حکم چلا کر رسول ﷺ خود ان کی شہادت دیں گے۔ رسول ﷺ اس امت کے بارے میں اس بات کی گواہی دیں گے کہ اس امت نے صراط مستقیم پر استقامت دکھائی اور قانون خداوندی کی پیروی کی۔ گویا کہا یہ جارہا ہے کہ تم میں اعتدال کی صفت اس وقت پوری ہوگی جس وقت احکام الٰہی کی پیروی کر کے اس پر استقامت دکھاؤ گے لیکن اگر تم اس راہ سے بھٹک گئے تو رسول ﷺ خود تمہارے خلاف حجت بن جائے گا کہ تم وہ امت نہیں ہو جس کی صفت اللہ نے اپنی کتاب میں بیان کی ہے۔ امت کے اندر اعتدال اور بے اعتدالی کے بارے میں گواہی کا منصب محمد مصطفیٰ ﷺ کے پاس ہوگا۔ آخری اپیل انہی کے یہاں دائر کی جائے گی اور آخری فیصلہ انہی کا ہوگا۔

مرغوب چیزوں سے فطری محبت

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوَاتِ مِنَ النِّسَاءِ وَالْبَنِينَ وَالْقَنَاطِيرِ الْمُقَنطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْأَنْعَامِ وَالْحَرْثِ ذَٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَاللَّهُ عِندَهُ حُسْنُ الْمَآبِ'' (آلِ عمران ۳:۱۴)۔ ''مرغوب چیزوں کی محبت لوگوں کے لیے مزین کردی گئی ہے جیسے عورتیں اور اولاد اور سونے اور چاندی کے جمع کیے ہوئے خزانے اور نشان زدہ گھوڑے اور چوپائے اور کھیتی۔ یہ دنیا کی زندگی کا سامان ہے اور لوٹنے کا اچھا ٹھکانہ تو اللہ کے پاس ہے''۔

زُيِّنَ میں فعل مجہول کا صیغہ انسان کی فطرتی ترکیب کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ مراد ہے کہ اللہ نے لوگوں کو اس فطرت پر پیدا کیا ہے۔ یہ انسانی زندگی کی ضرورت ہے اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ یہ ایک فعال قوت ہے جس کی بدولت انسان تگ ودو کرتا ہے، خطرات مول لیتا ہے۔ یہ نہ ہو تو انسان تہذیب و تمدن کی طرف قدم نہیں بڑھا سکتا اور زندگی کا ارتقاء رک جاتا ہے۔ اس لئے یہ زینت قابل مذمت نہیں اور نہ قابل نفرت ہے۔ قرآن حکیم نے اسے مباح قرار دیا ہے اور اس کی حرمت سے انکار کیا ہے۔

Marfat.com

ارشاد ربانی ہے: 'قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِينَةَ اللّٰهِ الَّتِيْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ' (الأعراف ۷:۳۲) 'کہہ دیجئے کہ اللہ کی بنائی ہوئی زینت کو کس شخص نے حرام قرار دیا ہے'۔ آیت مبارکہ میں لفظ زِيْـنَةَ کو اسم جلالہ سے منسوب کر کے اسے مقام شرف عطا کیا گیا ہے۔ دنیا میں زِيْـنَةَ کے حصول کو آخرت میں سعادت کے حصول کے منافی قرار نہیں دیا گیا کیونکہ وہ کثرت نسل، کثرت صدقات اور جہاد کے ذریعہ آخرت میں سعادت کا ذریعہ بنتی ہے۔

ارشاد ربانی ہے: 'اِنَّا جَعَلْنَا مَا عَلَى الْاَرْضِ زِيْنَةً لَّهَا لِنَبْلُوَهُمْ اَيُّهُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا' (الکہف ۱۸:۷) 'ہم نے زمین پر جو کچھ ہے اسے زمین کی زینت بنایا تا کہ ہم آزمائیں ان میں سے اچھا کام کرنے والا کون ہے'۔

شہوات شہوۃ کی جمع ہے اور یہ نفسیاتی ردعمل ہے اس احساس کا جو لذت حاصل کرنے کی ضرورت کے تحت نفس میں پیدا ہوتا ہے۔ شہوات کا لفظ ازرہ مبالغہ مشتہیات یعنی مرغوب چیزوں کے لئے استعمال ہوتا ہے جیسے محاورہ میں کہا جاتا ہے: هذا الطعام شهوة فلان 'یہ کھانا فلاں کو مرغوب ہے'۔

مولانا امین احسن اصلاحی کا قول ہے کہ مال و اولاد اور زن و فرزندان چیزوں میں سے ہیں جو انسان کو بالطبع مرغوب ہیں۔ اور ان کو مرغوب بھی ہونا چاہیے اس لیے کہ یہ چیزیں اس کی ذاتی اور نوعی بقا کے لوازم میں سے ہیں۔ مرغوبات نفس کی ترتیب بیان کرتے وقت پہلے سب سے اہم چیز کا ذکر کر دیا گیا ہے پھر اس سے کم اہم پھر اس سے کم اہم۔ عورتیں محبت اور بقائے نسل کی خاطر، اولاد قوت اور کثرت نسل کے لئے، مال و دولت زندگی کی آسائشوں کی فراہمی کے لئے، عمدہ نسل کے گھوڑے جہاد کی علامت کے طور پر، جانور اور کھیت کھلیان، کھیتی باڑی اور بار برداری کے لئے انسان کو مرغوب ہیں۔ اس فہرست میں دور حاضر کی مشینری کاروں اور جہازوں کو بھی داخل کیا جا سکتا ہے۔ سب سے پہلے عورتوں کا اور پھر اولاد کا ذکر کیا ہے کیونکہ ان دونوں کی جڑیں نفس انسانی میں راسخ ہیں۔ یہ دو ایسے اصول ہیں جو نہ زمانے کے بدلنے سے بدلتے ہیں اور نہ قوموں کے بدلنے سے۔ تمام اقوام میں خواہ وہ خوشحال ہوں یا بدحال عورتیں مرغوب ہیں اور ہر زمان و مکان میں اولاد والدین کی آنکھوں کی ٹھنڈک رہی ہے۔ یہ جو بعض مفسرین نے لکھا ہے کہ عورتیں چونکہ قطع رحمی اور حرام مال اور فتنوں کا باعث ہیں جبکہ اولاد صرف ایک فتنے یعنی حرام مال جمع کرنے کا باعث ہیں اس لئے پہلے عورتوں کا اور پھر اولاد کا ذکر کیا گیا ہے یہ قطعی غلط اور منفی سوچ ہے۔ آیت مبارکہ میں دونوں کا ذکر ازراہ مدح کیا گیا ہے نہ کہ ازراہ مذمت کہ ہم روایتی تصورات کے زیر اثر عورتوں میں کیڑے نکالنے شروع کر دیں۔ خود نبی ﷺ کا فرمان ہے: 'حبب لي النساء والطيب (مسند احمد)'

Marfat.com

عورت اور خوشبو مجھے محبوب ہیں۔ اسی طرح آپ نے فرمایا 'خیر متاع الدنیا المراۃ الصالحۃ' دنیا کی بہترین متاع نیک عورت ہے۔

یہاں ایک لطیف نکتہ قابل ذکر ہے۔ وہ یہ کہ آیت میں عورتوں سے مردوں کی محبت کا ذکر تو ہے مگر مردوں سے عورتوں کی محبت کا ذکر نہیں حالانکہ مردوں سے ان کی محبت بھی اسی نوع کی ہے جیسی عورتوں سے مردوں کی محبت۔ فرق یہ ہے کہ محبت عورتوں کو اسی طرح بے چین نہیں کرتی اور ان کو اس طرح ہجر و فراق کے عذاب میں مبتلا نہیں کرتی جس طرح مردوں کو کرتی ہے کیونکہ عورت ضبط نفس اور اپنی محبت پر قابو پانے پر زیادہ قدرت رکھتی ہے۔ آپ سینکڑوں اور ہزاروں مردوں کے قصے سنیں گے جو عورتوں کی محبت میں خوار اور دیوانے ہو گئے لیکن اس کے مقابلہ میں آپ کو دس عورتیں بھی ایسی نہیں نظر آئیں گی جن پر مردوں کی محبت کی وجہ سے وہ گزری ہو جو مردوں پر گزرتی ہے۔ آیت میں لفظ بنین کا اطلاق نر اور مادہ دونوں پر ہوتا ہے۔ محبت کے لحاظ سے سب سے اونچا مقام عورت کا اور پھر اولاد کا ہے۔ دوسری چیزوں کی محبت انہی کے تابع ہے بلکہ زیادہ تر انہی کے لیے ہے۔ اسلام مرغوب چیزوں اور ان کے محرکات کو دبا کر ان کا خون کرنے کی دعوت نہیں دیتا بلکہ ان کو مضبوط اور منظم کرنے کی تلقین کرتا ہے تاکہ انسان ان کو اپنا مقصد حیات نہ سمجھنے لگے۔ وہ اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ انسان ان پر غالب آ جائے بجائے اس کے وہ اس کو مغلوب کر لیں۔ انسان کی فطرت کا ایک پہلو یہ ہے کہ وہ ان کو محبوب و مرغوب سمجھتا ہے جبکہ اس کی فطرت کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ اس میں ضبط نفس کی بلند صلاحیت ودیعت کی گئی ہے جو نفس اور حیات کی حد بندی کرتی ہے۔ اسے شہوات میں مناسب حد سے تجاوز کرنے سے روکتی ہے اور انسان کی نگاہیں اس افق کی طرف اٹھا رکھتی ہے جس کی دعوت نغمہ ربانی دیتا رہتا ہے۔

بہترین امت

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: 'كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ وَتُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ' (آل عمران ۳:۱۱۰) 'تم بہترین امت ہو جو لوگوں کے لئے پیدا کی گئی ہو تم نیک باتوں کا حکم کرتے ہو اور بری باتوں سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو'۔

آیت مبارکہ میں امت مسلمہ، جس میں مرد و عورت دونوں شامل ہیں، کو خیر امت قرار دیا گیا ہے اور اس کی علت یہ بیان کی گئی ہے کہ یہ امت نیک باتوں کا حکم دیتی ہے اور بری باتوں سے روکتی ہے اور اللہ پر ایمان رکھتی ہے۔ گویا اگر یہ امت ان خصوصیات کی حامل رہے گی تو خیر امت ہے وگرنہ وہ اس امتیاز کی مستحق نہیں ہوگی۔ ایک عالمی دین کا منطقی نتیجہ یہ ہے کہ وہ نہ تو فرقوں میں بٹا ہوا ہو، اور نہ اس میں رنگ

Marfat.com

ونسل اور جنس کا امتیاز ہو۔ چنانچہ اس کے بدیہی تقاضے یہ ہیں کہ اللہ پر ایمان، خود نیکی کرنا اور دوسرں کے لئے نمونہ بننا اور اتنی صلاحیت اور قوت حاصل کرنا کہ نیکی کو پنپتا دیکھ سکے۔ برائی سے رُکنا اور دوسروں کے لئے یہ نمونہ پیش کرنا اور اتنی صلاحیت اور قوت حاصل کرنا کہ برائی کو مغلوب دیکھ سکے۔ مسلمان اپنے لئے زندگی نہیں گزارتا وہ نوع انسانی کے لئے جیتا ہے۔ یہ فریضہ اکیلے مرد یا اکیلی عورت نے سرانجام نہیں دینا بلکہ سوسائٹی نے مل جل کر اس فرض کو نبھانا ہے اس سلسلہ میں اللہ کا واضح حکم ہے۔

وَالْمُؤْمِنُونَ وَالْمُؤْمِنَاتُ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ يَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ (التوبہ ۹:۷۱) 'مومن مرد اور مومن عورت ایک دوسرے کے دوست اور معاون ہیں۔ وہ نیکی کا حکم دیتے ہیں اور برائی سے روکتے ہیں'۔

اس لئے صاحب کشاف نے کہا ہے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر مردوں اور عورتوں پر فرض ہے وہ یہ فریضہ مل جل کر ادا کریں گے۔

الناس اور ان کو دیئے گئے احکام میں مرد اور عورتیں دونوں شامل ہیں

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: يَا أَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا رَبَّكُمُ (نساء ۴:۱) اے لوگو! اپنے پروردگار سے ڈرو۔ لفظ الناس میں مرد اور عورتیں سب شامل ہیں اسی طرح تقویٰ کے حکم میں بھی سب شامل ہیں۔ چنانچہ امام رازی نے تفسیر کبیر میں فرمایا ہے۔ اصولی مفسرین کا اس بات پر اتفاق ہے کہ یہاں خطاب سب مکلفین سے ہے لفظ الناس جمع ہے جس پر الف اور لام استغراق کے لئے ہے جب لفظ الناس کا اطلاق عام لوگوں پر ہوتا ہے تو تقویٰ کا حکم بھی سب لوگوں کے لئے ہے۔ اس حکم کی علت کہ سب کو نفس واحدۃ سے پیدا کیا گیا ہے سب لوگوں کے حق میں عام ہے۔ اس واضح اصول کے برعکس صاحب روح المعانی کے قول کے مطابق اکثر مفسرین یہ تو تسلیم کرتے ہیں کہ لفظ الناس میں مرد اور عورت دونوں شامل ہیں مگر اس بات میں اختلاف ہے کہ اتقوا کے صیغہ میں سب شامل ہیں سوائے حنبلیوں کے۔ یہاں پر اس بحث کا خلاصہ برمحل ہوگا جو صاحب روح المعانی نے اس آیت کے ضمن میں کی ہے اس بحث سے صاف پتہ چلتا ہے کہ مفسرین اس زمانہ کے غلط تصورات کے زیر اثر کس طرح واضح اصول کی تردید میں بے جا تاویلیں کرتے ہیں وہ فرماتے ہیں لفظ الناس میں بغیر کسی نزاع کے مرد اور عورت دونوں شامل ہیں البتہ اس میں اختلاف ہے کہ اللہ کے قول اتقوا ربکم میں دونوں شامل ہیں۔ ماسوائے حنبلیوں کے اکثر کا خیال ہے کہ عورتیں اس قسم کے صیغہ میں ظاہراً داخل نہیں۔ ان لوگوں کی دلیل یہ ہے کہ حضرت ام سلمہ سے روایت ہے کہ انہوں نے کہا! اے اللہ کے رسول یہ عورتیں

Marfat.com

کہہ رہی ہیں کہ اللہ صرف مردوں کا ذکر کرتا ہے۔ اس کے بعد ان کا ذکر نازل ہوا۔ چنانچہ ام سلمہ نے ان کے مطلقاً ذکر کی نفی کی ہے اور اگر ان کا ذکر مردوں کے ذکر میں داخل ہوتا تو ان کی نفی بے معنی ہوتی۔ اور اس نفی کا اقرار رسول کریم ﷺ بھی نہ کرتے۔ پھر اہل لغت کا اس بات پر اجماع ہے کہ اس قسم کا صیغہ جمع مذکر کے لئے استعمال ہوتا ہے جو مفرد مذکر کی تعداد بڑھانے کے لئے آتا ہے۔ جیسا کہ المسلمون کا صیغہ ہے اگر اس میں مسلمات بھی داخل ہوتیں تو پھر قرآن میں اللہ کے قول ان المسلمین والمسلمات میں عطف اچھا نہیں لگتا، ہاں تاکید کے اعتبار سے ایسا کہا جا سکتا ہے مگر تاسیس تاکید سے بہتر ہوتی ہے۔ اس نقطہ نظر کے برعکس دوسرے معروف اہل لغت کا قول ہے کہ اسلوب تغلیب میں متفقہ طور پر دونوں کو اس صیغہ میں جمع کیا جاتا ہے اگر عورتیں اس قسم کے صیغہ میں داخل نہ ہوتیں تو وہ ان احکام میں بھی شریک نہ ہوتیں جن میں جمع مذکر کا صیغہ استعمال ہوا ہے جس سے ان کے دخول کی نفی لازم آتی ہے جیسا کہ نماز روزے اور زکاۃ کے احکام کا۔ اس کے علاوہ اگر عورتوں اور مردوں کو ایک سو درہم دینے کا حکم کے بعد کوئی کہے اوصیت لھم بکذا یعنی میں نے ان کو ایسا دینے کا حکم دیا تو اس میں عورتیں بھی لھم کی ضمیر مذکر میں بغیر کسی قرینے کے داخل ہوں گی۔ اس کو تو مجاز کے برعکس حقیقت کہا جاتا ہے۔ پس حقیقت میں وہ ظاہر امر داور عورت دونوں کے لئے ہوگا اور مطلوب بھی یہی ہے۔ اس قسم کی بحث لفظ قوم کے تحت بھی گزر چکی ہے ایسی بے معنی تاویلوں کا باعث ان فاضلین کے ذہن میں بیٹھا ہوا یہ تصور ہے کہ مرد کو محض مرد ہونے کے ناطے عورت پر فضیلت حاصل ہے حالانکہ قرآن نے دونوں کے درمیان فضیلت کا معیار تقویٰ قرار دیا ہے۔

احترام آدمی

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "كَتَبْنَا عَلَىٰ بَنِىٓ إِسْرَٰٓءِيلَ أَنَّهُۥ مَن قَتَلَ نَفْسًۢا بِغَيْرِ نَفْسٍ أَوْ فَسَادٍ فِى ٱلْأَرْضِ فَكَأَنَّمَا قَتَلَ ٱلنَّاسَ جَمِيعًا وَمَنْ أَحْيَاهَا فَكَأَنَّمَآ أَحْيَا ٱلنَّاسَ جَمِيعًا" (المائدہ ۵:۳۲) "ہم نے بنو اسرائیل پر یہ واجب کیا ہے کہ جو شخص کسی کو بغیر اس کے کہ وہ کسی کا قاتل ہو یا زمین میں فساد مچانے والا ہو قتل کر ڈالے تو گویا اس نے تمام لوگوں کو قتل کر دیا اور جو شخص کسی ایک کی جان بچا لے اس نے گویا تمام لوگوں کی جان بچالی" یہ حکم بنی اسرائیل اور غیر بنی اسرائیل سب کے لئے ہے۔ سلیمان بن علی کا قول ہے کہ میں نے حسن بصری سے پوچھا اے ابو سعید! کیا یہ آیت ہمارے لئے بھی ہے جس طرح بنو اسرائیل کے لئے تھی؟ انہوں نے کہا ہاں قسم ہے اس ذات کی جس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ بنو اسرائیل کے خون اللہ کے یہاں ہمارے خونوں سے زیادہ قابل احترام نہیں

Marfat.com

تھے۔ صاحب کشاف پوچھتے ہیں واحد کو جمع کے ساتھ کیونکر تشبیہ دی گئی ہے اور ایک کے حکم کو سب کے حکم کی طرح کیونکر قرار دیا گیا ہے؟ پھر اس کا جواب دیتے ہیں: 'میرے نزدیک اس کی وجہ یہ ہے کہ ہر انسان دوسرے انسان کی مانند اللہ کے یہاں قابل عزت ہے اور اس کی جان دوسرے کی جان کی مانند قابل حرمت ہے۔ جب اسے قتل کیا جاتا ہے تو گویا اس چیز کی توہین کی جاتی ہے جو اللہ کے یہاں قابل احترام تھی۔ چنانچہ اس بارے میں واحد اور جمع میں کوئی فرق نہیں۔ تعبیر کے اس اسلوب کا فائدہ یہ ہے کہ نفس انسانی خواہ مرد کا ہو یا عورت کا، کی عظمت کو دلوں میں اس طرح بٹھا دیا جائے کہ کوئی اس کی بے حرمتی کرنے کی جرات نہ کر سکے۔ جب ایک نفس کے قتل کو سب لوگوں کے قتل کی صورت میں تصور کیا جائے گا تو وہ اسے بہت بڑا گناہ سمجھے گا اور اس کی ہمت ٹوٹ جائے گی۔ جب سب لوگوں کو پتہ چلے گا کہ ایک انسان ان سب کے قتل کے درپے ہے تو وہ پوری قوت سے اسے روکیں گے۔ اسی طرح جب ان کو پتہ چلے گا کہ کوئی ایک خاص انسان کو قتل کرنے کا ارادہ رکھتا ہے تو لازمی طور پر اس انسان کے قتل کو روکنے کیلئے ان کی کاوش پہلی صورت جیسی ہوگی'۔

ہر نفس دوسرے نفس کی مانند ہے۔ زندگی کا حق مسلمہ طور پر ہر نفس کو حاصل ہے۔ ان نفوس میں ایک کا قتل دراصل حق حیات پر حملہ ہے۔ وہ حق جس میں سب نفوس برابر کے شریک ہیں۔ یہی صورت ایک نفس کو قتل سے بچانے اور اسے 'زندہ رکھنے کی ہے گویا وہ سب نفوس کو زندہ رکھنے کے برابر ہے کیونکہ دراصل وہ زندگی کے حق کی حفاظت ہے جس میں سب شریک ہیں۔

فرد واحد کو محض اس لئے قتل کرنا کیونکہ وہ ایک خاص مکتب فکر کی نمائندگی کرتا ہے گویا ان تمام افراد کو قتل کرنے کے مترادف ہے جو اس مکتب فکر کے نمائندہ ہوں۔ انہی حالات میں ایک فرد کی جان بچانا گویا پوری جماعت کی جان بچانے کے برابر ہے۔ قتل نفس کی اس سے بڑھ کر زوردار مذمت اور کیا ہو سکتی ہے؟

آیہ مبارکہ ہمیں اس بات کی تعلیم دیتی ہے کہ انسان ایک جیسے ہیں۔ ہر ایک کو سب کی زندگی کا خواہشمند ہونا چاہیے اور اسے ہر فرد کو ضرر پہنچانے سے بچنا چاہیے کیونکہ کسی ایک کی بے حرمتی سب کی بے حرمتی ہے۔ ایک فرد کے حق کو اس حیثیت سے پہچاننا کہ وہ پوری انسانیت کا ایک عضو ہے سب کے حق کو پہچاننے کے برابر ہے۔ یہ آیت انسانی زندگی کی قدر و قیمت اور انسانی جان کی حرمت کے بارے میں ایک عالمگیر اصول پیش کرتی ہے۔

اس دور میں اس آیت کریمہ کی روشنی میں اگر ہم اپنے رویوں کا جائزہ لیں تو ہمارے سر شرم سے

Marfat.com

جھک جاتے ہیں۔ انسان کا خون مسلمان ملکوں میں جتنا اب ارزاں ہے اتنا تو کبھی بھی نہیں تھا۔ پاکستان کے ہر بڑے شہر کی ہر گلی اور کوچے میں جوانوں، بچوں، بوڑھوں اور عورتوں کا خون ناحق بہایا جاتا ہے۔ اسلام کے نام پر خودکش حملے کیے جارہے ہیں۔ لوگوں کے لئے جہنم کا ماحول پیدا کر کے اسلام کے جان نثار یہ خودکش حملہ آور جنت کے خواب دیکھ رہے ہیں۔ حالانکہ قرآن ایک انسان کے ناحق خون کو پوری انسانیت کا خون قرار دے رہا ہے۔ انسانیت کا خون کرنے والے انسانیت کے یہ دشمن اپنے تئیں پوری دنیا میں اسلام کا بول بالا کرنا چاہتے ہیں اور ہمارے مذہبی پیشوا ان کو سند جواز عطا کر رہے ہیں۔ چند سکوں کی خاطر اپنی اور دوسروں کی جان لینے والے کچی عمر کے لڑکوں کو کون بہکا رہا ہے؟ کیا ان بہکانے والوں کو اپنے انجام کی خبر ہے؟

کائنات کا مزاج

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: 'فَأَمَّا الزَّبَدُ فَيَذْهَبُ جُفَاءً وَأَمَّا مَا يَنفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْأَرْضِ' (الرعد ۱۳: ۱۷) 'جہاں تک جھاگ کا تعلق ہے تو وہ ناکارہ ہو کر چلا جاتا ہے لیکن لوگوں کو نفع دینے والی چیز زمین میں ٹھہری رہتی ہے۔ اس آیت مبارکہ میں دو مثالیں پیش کی گئی ہیں ایک مثال میں بتایا گیا ہے کہ آسمان سے بارش برستی ہے اپنی اپنی وسعت کے مطابق نالے بہہ نکلتے ہیں اور پانی کا ریلا اوپر چڑھنے والی جھاگ کو اٹھالے جاتا ہے اور ہوائیں اسے ختم کر دیتی ہیں لیکن لوگوں کو نفع دینے والی چیز یعنی نباتات باقی رہ جاتی ہے۔ دوسری مثال ان دھاتوں کی ہے جن کو زیور یا ساز و سامان بنانے کے لئے آگ میں تپایا جاتا ہے تو اس پر بھی جھاگ آجاتا ہے یہ جھاگ ان دھاتوں کی میل کچیل ہوتا ہے پھر یہ جھاگ دیکھتے دیکھتے ختم ہو جاتا ہے اور دھاتیں اپنی اصل شکل میں باقی رہ جاتی ہیں۔ ان دونوں مثالوں سے خدا کی بنائی ہوئی کائنات کا مزاج واضح ہو جاتا ہے کہ نفع بخش چیز باقی رہتی ہے اور غیر نافع خود بخود ختم ہو جاتی ہے۔ یہ اصول انسانی عمل کی کسوٹی ہے جس سے پرکھ ہو جاتی ہے کہ دینی اعمال صالحہ میں جو دوسرے انسانوں کے لیے نفع بخش ہیں وہ اس زندگی میں باقی رہیں گے اور آخرت کی زندگی میں بھی۔ وہ کام پوری نوع انسانی کے لیے نفع بخش ہوتے ہیں نہ کہ کسی خاص خاندان اور کسی خاص قوم کے لئے۔ اگر ہم اس بنیادی اصول کو پیش نظر رکھیں تو ہمارے بہت سے معاشرتی مسائل بحث و تمحیص کے بغیر حل ہو سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر طرز کہن پر اڑنے کی روش کو کائنات کے اسی مزاج نے ختم کیا۔ عورتوں کو گھروں میں بند کر کے نور تعلیم سے محروم رکھنا، مدنی الطبع ہونے کے باوصف ان کو سوسائٹی سے الگ تھلگ کرنا، لباس کی تراش خراش اور جدید تعلیم کو کفر سمجھنے کے کتنے ہی مسائل ہیں جن کو کائنات کے مزاج نے ہمیشہ

Marfat.com

کے لیے حل کر دیا ہے۔ ریڈیو، ٹیلیویژن اور لاؤڈ سپیکر جیسی نفع بخش ایجادات کو خلاف اسلام قرار دینے والے نقطہ نظر کو اسی مزاج نے ہمیشہ کیلئے دفن کر دیا ہے۔ جو لوگ اس مزاج سے شناسا ہیں وہ نہ تو طرز کہن پر اڑتے ہیں اور نہ ہی آئین نو سے ڈرتے ہیں البتہ اس مزاج کو نظر انداز کرنے والوں کی تو بات ہی کچھ اور ہے۔

لفظ الناس بشر کے معنوں میں

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: 'اَللّٰہُ یَصۡطَفِیۡ مِنَ الۡمَلٰٓئِکَۃِ رُسُلًا وَّ مِنَ النَّاسِ' (الحج ۲۲:۷۵) 'فرشتوں میں سے اور انسانوں میں سے اللہ ہی رسولوں کو چھانٹ لیتا ہے'۔ یہاں دراصل ان لوگوں کی تردید کی گئی ہے جو اس بات کا انکار کرتے ہیں کہ رسول بشر ہو سکتا ہے آیت مبارکہ میں الناس بشر کے معنوں میں ملائکہ کے مقابل استعمال ہوا ہے۔ وہ لوگ جو لفظ رجال سے دھوکا کھا کر نبوت کو مردوں تک محدود سمجھتے ہیں ان کی توجہ لفظ الناس کی طرف منعطف کی گئی ہے۔ جس میں مرد اور عورت دونوں شامل ہیں۔ لفظ بشر کے تحت اس مسئلہ پر سیر حاصل بحث ہو چکی ہے۔ انسانوں کی طرف ہمیشہ انسانوں کو پیغمبر بنا کر بھیجا گیا ہے کیونکہ انسان نہ تو فرشتوں جیسی لطیف مخلوق کی بات سمجھ سکتے ہیں اور نہ ان کے ساتھ تعلقات قائم کر سکتے ہیں البتہ فرشتوں کو اللہ کے برگزیدہ بندوں کی طرف رسول بنا کر بھیجا جاتا ہے جو وقتاً فوقتاً اللہ کا پیغام ان تک پہنچاتے رہتے ہیں۔ دونوں صورتوں میں ان کا انتخاب اللہ ہی کرتا ہے اور وہ رسول مشیت الٰہی کے سامنے سر تسلیم خم کر دیتے ہیں ان کو معبود سمجھ کر پوجا نہیں جا سکتا۔

فطرت انسانی

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: 'فِطۡرَتَ اللّٰہِ الَّتِیۡ فَطَرَ النَّاسَ عَلَیۡہَا ؕ لَا تَبۡدِیۡلَ لِخَلۡقِ اللّٰہِ ؕ ذٰلِکَ الدِّیۡنُ الۡقَیِّمُ ٭ۙ وَ لٰکِنَّ اَکۡثَرَ النَّاسِ لَا یَعۡلَمُوۡنَ' (الروم ۳۰:۳۰) 'اللہ تعالیٰ کی وہ فطرت جس پر اس نے لوگوں کو پیدا کیا ہے اللہ تعالیٰ کے بنائے ہوؤں میں کوئی تبدیلی نہیں، یہی سیدھا دین ہے لیکن اکثر لوگ نہیں سمجھتے'۔

فطرت سے کیا مراد ہے اس سلسلہ میں صاحب البحر المحیط نے بڑی پتے کی بات کہی ہے۔ فرماتے ہیں ایک قول ہے کہ فطرت سے مراد دین اسلام ہے، ایک قول ہے کہ اس سے مراد وہ عہد الست ہے جو اللہ نے بنی آدم سے آدم کی پشت سے پیدا کرتے وقت لیا تھا مگر قابل ترجیح بات یہ ہے کہ اس سے مراد انسانی بچے (خواہ نر ہو یا مادہ) کی وہ صلاحیت ہے جس کی بنا پر وہ مصنوعات پر غور کر کے صانع کے وجود کا ادراک کرتا ہے، اس پر ایمان لاتا ہے اور اس کی شریعت کی تابعداری کرتا ہے۔ بالفاظ دیگر اسے

Marfat.com

یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ فطرت سے مراد عقلی قوت اور طبع سلیم ہے جو اللہ نے انسان کو ودیعت کی ہے جو اچھی اور عمدہ چیز کو قبول کرتی ہے اور بری اور گندی چیز سے نفرت کرتی ہے اور یہی صلاحیت دینی معاملات کے لئے سرمایہ بقا ہے۔ انسان فطرتاً نیکی اور راستبازی کی طرف مائل ہے۔ دنیا میں اسے اپنے مرتبہ اور اللہ کی طاقت وحکمت کے بارے میں ادراک عطا کیا گیا ہے۔ یہ اس کی اصل فطرت ہے لیکن بعض اوقات ماحول رسم ورواج، اوہام وخواہشات یا دیگر عوارض اسے اس راہ سے ہٹا دیتے ہیں جیسا کہ نبی پاک ﷺ کی حدیث ہے کہ ہر بچہ فطرت پر پیدا ہوتا ہے لیکن پھر اس کے ماں باپ اس کو یہودی عیسائی اور مجوسی بنا دیتے ہیں۔ (بخاری کتاب التفسیر) اسے خواہ کسی دین کو اختیار کرنے پر مجبور کیا جائے خیر وشر میں تمیز کرنے کی صلاحیت اس سے چھینی نہیں جاسکتی۔ پیغمبروں کا کام یہ ہوتا ہے کہ اس کی کجی کو درست کر کے مشیت الٰہی کے تابع اس کی فطرت کی طرف اسے لوٹا دیا جائے۔ اس سلسلہ میں مولانا اصلاحی کا تبصرہ فکر انگیز ہے وہ فرماتے ہیں انسان انبیائے کرام کی رہنمائی کا محتاج اس لئے نہیں کہ وہ حق وباطل میں امتیاز یا ان کے شعور سے عاری تھا بلکہ اس وجہ سے کہ اس راہ میں اس کی بعض کمزوریوں کے سبب سے بہت سے مغالطے پیش آسکتے تھے نیز مبادی فطرت کے تمام لوازم اور اس کے سارے مقتضیات کو سمجھنا بھی اس کے لئے ممکن نہ تھا۔ اس وجہ سے اللہ نے اس کی رہنمائی کے لیے نبی اور رسول بھیجے۔ ان نبیوں اور رسولوں کی تعلیمات چونکہ انہی مبادی پر مبنی ہیں جو انسان کے اندر ودیعت ہیں۔ اس وجہ سے جو سلیم الطبع تھے انہوں نے نبیوں کی ہر بات کو اپنے دل کی آواز سمجھا۔ اس آیت مبارکہ سے اس غلط تصور پر کہ عورت کی فطرت میں بدی ہے خط تنسیخ پھر جاتا ہے جسے ہمارے مفسرین نے اسرائیلی روایات کے زیر اثر اختیار کر رکھا ہے۔ کیا مرد اور کیا عورت سب کی فطرت اللہ کی بنائی ہوئی ہے اس میں قطعی کسی تبدیلی کی گنجائش نہیں۔

انسانوں میں فضیلت کا معیار

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُم مِّن ذَكَرٍ وَأُنثَىٰ وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوبًا وَقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِندَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ خَبِيرٌ" (الحجرات ۴۹:۱۳)۔

"اے لوگو! ہم نے تم کو مرد اور عورت سے پیدا کیا ہے تمہارے کنبے اور قبیلے بنائے تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچانو اللہ کے نزدیک تم سب میں باعزت وہ ہے جو تم میں سے سب سے زیادہ متقی ہے بیشک اللہ دانا اور باخبر ہے۔"

خطاب صرف مسلمانوں سے نہیں بلکہ تمام نوع انسانی سے ہے اے لوگو! اے مومنو اور کافرو! تم

Marfat.com

انسانیت کے ناتے ایک دوسرے کے بھائی ہو۔ سب انسان والدین کے جوڑے سے پیدا ہوئے، ان کے کنبے اور قبیلے ایک دوسرے کی پہچان کا محض ذریعہ ہیں اس کا مقصد ایک دوسرے پر برتری کا اظہار نہیں۔ اللہ کے یہاں سب برابر ہیں۔ جو جتنا راستباز ہوگا اللہ کے یہاں اتنا ہی باعزت ہوگا۔ نبی کریم ﷺ نے فتح مکہ کے دن کعبے کا طواف کیا اللہ کی حمد وثنا بیان کی اور پھر فرمایا: اے لوگو! لوگ دو طرح کے ہیں مومن اور متقی جو اللہ کے یہاں باعزت ہیں اور بدبخت، فاسق جو اللہ کے یہاں رسوا ہیں، پھر آپؑ نے مذکورہ آیت تلاوت فرمائی، رسول کریم ﷺ سے روایت ہے کہ جو اس بات پر خوش ہوتا ہے کہ اللہ کے یہاں اس کی عزت ہو اسے اللہ کا تقویٰ اختیار کرنا چاہیے۔

آیت زیر بحث سے پہلے جن معاشرتی برائیوں کا ذکر کیا گیا ہے ان کا بنیادی سبب یہ ہے کہ انسان اپنے آپ کو برتر اور دوسرے کو کمتر سمجھنے کی کوشش کرتا ہے یہی سبب زندگی کے دوسرے گوشوں میں بھی پایا جاتا ہے۔ مثلاً مردوں نے سمجھ رکھا ہے کہ وہ محض مرد ہونے کی وجہ سے عورتوں سے برتر ہیں یا بدقسمتی سے حسب ونسب کو برتری کی بنیاد بنالیا گیا ہے یہ تصورات غلط ہیں۔ ہم نے انسانوں کو مرد اور عورت کے ملاپ سے پیدا کیا، یعنی ہر انسانی بچے میں خواہ لڑکا ہو یا لڑکی کچھ حصہ نر کا ہوتا ہے اور کچھ حصہ مادہ کا۔ اس لئے یہ نہیں سمجھا جاسکتا کہ عورتیں مردوں سے الگ ہیں یا مرد عورتوں سے افضل ہیں۔ عزت کا ایک ہی معیار ہے وہ یہ کہ تم میں سے کون اللہ سے زیادہ ڈرنے والا ہے۔ اور کون احکام خداوندی پر عمل پیرا ہے۔ اتنے واضح معیار کی موجودگی میں ان فاضل لوگوں پر حیرت ہوتی ہے جو مرد کی فضیلت کو ثابت کرنے کے لئے عورت کی فطرت میں کیڑے نکالنے پر اپنی قوت صرف کرتے ہیں اور بقائے نوع کے لوازمات کو بھی اپنے دعویٰ کے ثبوت میں بطور دلیل پیش کرتے ہیں۔ کاش وہ آیت مبارکہ کے پیش کردہ معیار کو پیش نظر رکھیں۔

انسانیت کی بہبود

قرآن حکیم کا آغاز اس ذات کی حمد وثنا سے ہوتا ہے جو سارے جہان کی پالنہار ہے اور اس کا اختتام اسی ذات سے پناہ مانگنے پر ہوا ہے جس کے پیش نظر کسی خاص جنس، گروہ جماعت یا قوم کی نشوونما نہیں بلکہ پوری کی پوری انسانیت کی نشوونما ہے۔ وہ رب العالمین بھی ہے اور رب الناس بھی۔ اس سے پہلی سورۃ میں اللہ کی پناہ ان بیرونی عوامل کے خلاف مانگی گئی ہے جو انفرادی طور پر اثر انداز ہوتے ہیں جبکہ اس سورۃ الناس (۱۱۴:۱) میں ان اندرونی عوامل کے خلاف اللہ کی پناہ مانگی گئی ہے جو نوع انسانی پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ اللہ کے ساتھ انسانوں کا تعلق تین حیثیتوں سے بیان کیا گیا ہے۔

Marfat.com

۱۔ اللہ ان کا رب ہے خالق ہے اور رازق ہے وہ ان کو نشو و نما اور برائی سے ان کی حفاظت کے تمام وسائل ان کو مہیا کرتا ہے۔

۲۔ جو ذات تمام انسانوں کی پرورش اور نگہداشت کرنے والی ہے وہی اس لائق ہے کہ کائنات کی حکمرانی اور بادشاہی بھی اسی کے پاس ہو۔ اللہ کے پاس انسانوں کی رہنمائی اور ان کی سیرت کی تعمیر کا اختیار موجود ہے ان کی بہتری کے لیے اس نے دستور عطا کیا ہے۔

۳۔ جو تمام کائنات کا پروردگار ہو، پوری کائنات پر اس کی بادشاہی ہو، وہی ذات اس بات کی مستحق ہے کہ اس کی عبادت کی جائے، اپنے اعمال کا حساب کتاب دینے کے لئے اسی کی طرف لوٹنا ہے۔

ان تینوں حیثیتوں میں انسانوں کو برائی کے خلاف اس کی پناہ طلب کرنی چاہیے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ جس خلق خدا کے ساتھ ہم روئے زمین پر زندگی بسر کر رہے ہیں ان کی تمام اجناس میں ایک ہی فطرت کارفرما ہے لیکن انسان ایسے نہیں۔ ہر انسان اپنی ذات میں ایک عالم ہے۔ اس کا اپنا وجود ہے۔ اس کی اپنی عقل ہے۔ خیر و شر کے بارے میں اس کے اپنے تصورات ہیں لہٰذا ہر انسان کی برائی کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔ اس لیے انسانوں کے خلاف پناہ مانگی گئی ہے کیونکہ جو برائیاں ان سے یا ان میں سے کسی فرد سے سرزد ہوتی ہیں وہ ان گنت ہیں غالباً یہی وہ راز ہے جس کی وجہ سے سورۃ کے آغاز میں تین مرتبہ لفظ النساس کا تکرار وارد ہوا ہے۔ وہ النساس تو ہیں ہی لیکن ان کی تین قسمیں ہیں نیکوکار، بدکار اور ملے جلے نیک و بد۔ فرد ہونے کی حیثیت میں بھی وہ انہی تین اقسام میں منقسم ہیں اور جماعت ہونے کے اعتبار سے بھی۔ انسان نیکی بھی کرتا ہے اور بدی بھی اور کبھی کبھی نیکی اور بدی کا ملا جلا موقف اختیار کرتا ہے۔ بدی کی یہ قوت دکھائی دینے والے انسان بھی ہو سکتے ہیں اور جن بھی یا اس کا نفس امارہ جو اللہ کی عطا کردہ قوت ارادی پر حملہ آور ہوتا ہے اور وسوسہ ڈال کر پیچھے ہٹ جاتا ہے تاکہ اس کا بچھایا ہوا جال زیادہ جاذب نظر اور دھوکے میں ڈالنے والا ہو۔

Marfat.com

النساء (عورتوں کی جماعت)

لغوی مفہوم

النِسوۃ اور النُسوّۃ، النِساء، النِسوان اور النّسون امرأۃ (عورت) کی غیر لفظی جمع ہے۔ النِسّو، النُسوۃ سے زیادہ فصیح ہے اس کا اسم تصغیر نُسَیَّۃٌ اور نُسَیَّاتٌ ہے۔

قرآن حکیم میں نساء کا لفظ عورتوں کے علاوہ بیویوں کے معنی میں بھی آیا ہے جیسا کہ سورۃ بقرۃ میں اُلرَّفَثُ اِلٰی نِسَآئِکُمْ '(۲:۱۸۷) اور سورۃ احزاب میں یٰنِسَاءَ النَّبِیِّ '(۳۳:۳۲) ہے۔ نساء کا لفظ ابناء (بیٹے) کے مقابلہ میں بیٹیوں کے معنی میں قرآن حکیم میں سورۃ البقرۃ اور سورۃ ابراھیم میں استعمال ہوا ہے۔ سورۃ اعراف میں بھی نساء ابناء کے مقابلہ میں ہے مگر یہاں یذبحون کی جگہ سَنُقَتِّلُ ابناء ھم ہے۔

قرآن حکیم اور جنسی میلانات

لفظ نساء کے تحت قرآن حکیم نے درج ذیل آیات میں جنسی فطرت کی طرف لطیف اشارے کیے ہیں۔ سورۃ آلِ عمران (۳:۱۴) میں اس سلسلہ کی بنیادی آیت میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: زُیِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّھَوَاتِ مِنَ النِّسَاءِ وَالْبَنِیْنَ 'انسان کے لیے نفسانی خواہشات کی محبت مزین کی گئی ہے جیسے عورتوں کی اور اولاد کی'۔ ادیان عالم میں صرف اسلام نے فطرتی خواہشات کا صاف صاف اعتراف کیا ہے اور اس بات کو تسلیم کیا ہے کہ ان کا میلان لوگوں کی فطرت میں موجود ہے یہ تصور کہ فطرتی خواہشات ناپاک ہیں، نجس ہیں دراصل ایک شیطانی تصور ہے۔ قرآنی نقطہ نگاہ کے مطابق انسانی زندگی کی تکمیل ان کے بغیر نہیں ہو سکتی۔ یہ زندگی کی وہ قوت عاملہ ہے جس کی وجہ سے انسان بھاگ دوڑ کرتا ہے اور خطرات مول لیتا ہے۔ اگر یہ شہوتیں نہ ہوں تو انسان تہذیب و تمدن کی طرف گامزن نہیں ہو سکتا۔ یہ انسان کے لئے خیر کا باعث ہیں۔ یہ انسان کے ذاتی اور نوعی بقا کے لئے ضروری ہیں۔ اسی لئے وہ پسندیدہ بھی ہیں اور خوبصورت بھی۔ ان شہوتوں سے لطف اندوز ہونا آخرت کے ثواب کا باعث بنتا ہے۔ اسی لئے قرآن ان سے لطف اندوز ہونے کی دعوت دیتا ہے۔

سورۃ اعراف میں ہے یٰبَنِیْٓ اٰدَمَ خُذُوْا زِیْنَتَکُمْ عِنْدَ کُلِّ مَسْجِدٍ (...) قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِیْنَۃَ اللّٰہِ الَّتِیْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِہٖ '(۷:۳۱تا۳۲) اے اولادِ آدم! عبادت کے ہر موقع پر اپنے جسم کی

Marfat.com

زیب و زینت سے آراستہ رہا کرو (...)۔ اے پیغمبر! کہہ دیجئے اللہ کی زینتیں جو اس نے اپنے بندوں کے لئے پیدا کی ہیں کس نے حرام کی ہیں؟ سورۃ کہف (۱۸:۷) میں ارشاد باری ہے: اِنَّا جَعَلْنَا مَا عَلَى الْاَرْضِ زِيْنَةً لَّهَا لِنَبْلُوَهُمْ اَيُّهُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا 'ہم نے زمین پر کی چیزوں کو اس کے لئے باعث زینت بنایا ہے تاکہ ہم لوگوں کو آزمائیں کہ ان میں سے زیادہ اچھا عمل کون کرتا ہے؟ نبی کریم ﷺ کا قول ہے: حُبِّبَ الی من دنیا کم الطیب والنساء وجعلت قرۃ عینی فی الصلاۃ 'تمہاری دنیا میں خوشبو اور عورتیں مجھے محبوب ہیں اور نماز میں میری آنکھوں کی ٹھنڈک ہے'۔ اس حدیث میں جنسی رغبت کو بلند کر کے نماز کے ساتھ ملایا گیا ہے۔ مسلم کی روایت ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا: ان الرجل یثاب علی عمل الجنس یاتیہ مع زوجتہ قالو یارسول اللہ أیاتی احدنا شھوتہ ویکون لہ فیھا اجر قال أرأیتم لو وضعھا فی حرام اکان علیہ فیھا وزرہ؟ فکذالک اذا وضعھا فی حلال کان لہ أجر۔ 'جب آدمی اپنی بیوی کے ساتھ جنسی عمل کرتا ہے تو ثواب پاتا ہے۔ صحابہ نے پوچھا اے اللہ کے رسول! ایک آدمی اپنی شہوت پوری کرتا ہے کیا یہ بات باعث ثواب ہے؟ آپ نے فرمایا کیا خیال ہے اگر وہ حرام کاری کرتا تو اس کا وبال اس پر نہ پڑتا، اسی طرح اگر اس نے اپنا عضو حلال جگہ میں ڈالا ہے تو اسے اجر بھی ملے گا'۔ جنس کی فضیلت اور اعزاز کا اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نے سورۃ نساء (۴:۲) میں اپنے نام کے ساتھ رحم (مادر) کا ذکر کیا ہے۔ ارشاد ہے: 'وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْ تَسَآءَلُوْنَ بِهٖ وَالْاَرْحَامَ 'اس اللہ سے ڈرو جس کے نام کا واسطہ دے کر تم ایک دوسرے سے سوال کرتے ہو اور رحم کی قرابتوں سے بھی ڈرو (جن کا واسطہ دے کر تم ایک دوسرے سے سوال کرتے ہو) لیکن قرآن شہوت و لذت کے میلان اور روحانی افکار کے درمیان ایک حد فاصل قائم کرتا ہے۔ وہ روح اور شعور کو مہذب بناتا ہے اور جانوروں کی مانند لذتوں میں غرق ہونے کی اجازت نہیں دیتا۔ اگر ساری توانائیاں ایک ہی جذبہ کی تسکین کے لئے صرف ہو جائیں تو زندگی کا رخ سیدھا نہیں رہتا۔ اسلام نہ تو ان لذتوں سے انکار کرتا ہے اور نہ انہیں دباتا ہے۔ وہ ان کو مرتب اور منضبط کرتا ہے وہ بس یہ چاہتا ہے کہ نفس کی لگام انسان کے ہاتھ میں رہے نہ یہ کہ انسان کی لگام نفس کے ہاتھ میں۔ وہ اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ یہ انسان کے اعصاب پر سوار ہو کر اسے اپنا غلام بنالیں کیونکہ اس صورت میں یہ شہوات مسلسل عذاب بن جاتی ہیں۔ ایک ایسی بھوک جو مٹتی نہیں، ایک ایسی پیاس جو بجھتی نہیں۔ اسلام انسانی ڈھانچہ میں حیوانی محرکات اور روحانی وجدان کے درمیان ہم آہنگی پیدا کرتا ہے اور ان دونوں کے ملاپ سے ایک اکائی بناتا ہے۔ فرد زندگی کی ضروریات اور روح کی اعلیٰ پرواز کے

Marfat.com

درمیان بٹ نہیں جاتا اور اس کی شخصیت میں کوئی ٹوٹ پھوٹ نہیں ہوتی۔ مذکورہ آیت کے بعد کی آیت میں اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے۔ ارشاد ہے: "کہہ دیجئے کیا میں تمہیں بتا نہ دوں کہ اس سے اچھی بات کیا ہے؟ ان لوگوں کے لئے جو تقویٰ اختیار کرتے ہیں ان کے رب کے پاس باغ ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں۔ وہ ہمیشہ ان باغوں میں رہیں گے اور پاک ساتھی اور اللہ کی خوشنودی انہیں حاصل ہوگی یعنی ان مرغوب چیزوں سے اعتدال کے ساتھ لطف اندوز ہونا باعث ثواب ہے اور اخروی سعادت کا ذریعہ ہے"۔

مذکورہ آیت میں زُیِّنَ میں مجہول کا صیغہ اشارہ کر رہا ہے کہ شہوتوں کا میلان فطری ساخت میں رکھ دیا گیا ہے اور یہ رکھنے والا اللہ تعالیٰ ہے۔ مجاہد نے اسے مجہول کی بجائے معروف یعنی زین پڑھا ہے جس سے واضح ہوتا ہے کہ مزین اللہ ہے۔ شیطان صرف اعمال کو بنا سنوار کر پیش کر سکتا ہے فطرت پر اس کا کوئی اختیار نہیں۔ تزیین کے معنی ہیں اسے تخلیق کیا اور اس کا میلان فطرت میں رکھا۔ تزیین کی نسبت اللہ کی طرف اس بات کی دلیل ہے کہ ان شہوتوں سے محبت اچھی اور سود مند چیز ہے اس میں کوئی قباحت نہیں۔ نکاح ہی کو لے لیجئے جو بقائے نوع کا ذریعہ ہے۔

الناس سے مراد نوع بشری ہے شهوات شهوة کی جمع ہے اس کے اصل معنی نفس میں اس چیز کا شوق ہے جس کا ارادہ کیا جاتا ہے۔ یہ نفس کی وہ انفعالی کیفیت ہے جس میں اسے کسی لذیذ چیز کی حاجت کا احساس ہوتا ہے۔ شہوات سے مراد مشتہیات (مرغوب چیزیں) ہے اسے ازرہ مبالغہ شهوات کہا گیا ہے جیسا کہ محاورہ میں کہا جاتا ہے: "هذا الطعام شهوة فلان" یہ کھانا فلاں کا پسندیدہ ہے۔ اسے مبالغہ کے طور شهوة اس لئے کہا گیا ہے کیونکہ اس سے لطف اندوز ہونے کی خواہش ہوتی ہے اور اس خواہش کے پورا ہوئے بغیر بدن میں خلل واقع ہو جاتا ہے۔ اس آیت میں بالترتیب تین باتوں کا بیان ہے۔

۱۔ انسان مختلف مرغوب چیزوں کی خواہش رکھتا ہے۔

۲۔ وہ اپنی اس خواہش سے محبت کرتا ہے۔

۳۔ وہ سمجھتا ہے کہ یہ محبت باعث فضیلت ہے۔

اللہ نے اسے تمام انسانوں کی طرف منسوب کیا ہے یعنی یہ بات تمام انسانوں میں پائی جاتی ہے اور عقل اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ ہر وہ چیز جو لذیذ اور نفع بخش ہوتی ہے وہی مطلوب بالذات ہوتی ہے۔ اس آیت میں انسانی فطرت کے بارے میں گفتگو ہو رہی ہے اور اس کی نفسیاتی حقیقت کا بیان ہے۔ اس لئے یہاں تزیین کی نسبت شیطان کی طرف نہیں ہو سکتی۔ شیطان کی طرف (سورة

Marfat.com

انعام۶:۴۳) تزیین اعمال کی نسبت ہو سکتی ہے نہ کہ تزیین فطرت کی۔

اکثر و بیشتر مفسرین نے اللہ کے مزین ہونے کا صحیح نقطہ نظر لیا ہے۔ لیکن کچھ مفسر ایسے بھی ہیں جو سمجھتے ہیں کہ مزین شیطان ہے اور ان مرغوب چیزوں کو ان کی خست کی وجہ سے شہوت کہا گیا ہے کیونکہ حکماء کی نظر میں شہوت رذیل چیز ہے جو ان سے محبت کرتا ہے وہ قابل ملامت ہے۔ شہوتیں بہیمیت پر دلالت کرتی ہیں۔ زیر نظر آیت میں ان شہوتوں سے نفرت دلائی گئی ہے۔ یہ تصور قطعی غیر قرآنی ہے اور اسلام میں یہودیت، نصرانیت اور تصوف کے زیر اثر در آیا ہے۔ بدیہی نتیجہ کے طور پر اس نقطہ نظر کے حامل یہ سمجھتے ہیں کہ شہوت میں عورتوں کا ذکر سب سے پہلے اس لئے کیا گیا ہے کہ وہ مرد کے لئے (جو ایک معصوم مخلوق ہے) سب سے بڑا فتنہ ہیں وہ شیطان کی مانند اسے اپنے جال میں پھنسا لیتی ہیں۔ علامہ رشید رضا تفسیر المنار میں اس نقطہ نظر کے برعکس یہ فرماتے ہیں کہ عورتوں کا ذکر مقدم اس لئے ہے کہ ان کی محبت سب محبتوں پر غالب ہوتی ہے۔ وہ نفس کا سکون اور انس کا منتہاء و مقصود ہیں۔ آدمی محنت اور مشقت سے جو کماتا ہے انہیں پر خرچ کرتا ہے۔ دوسرے بقائے نسل کا داعیہ مرد میں قوی تر ہوتا ہے اس لیے اسے عورت کی طلب زیادہ ہوتی ہے اور وہ اپنا مال و متاع ان کے لیے خرچ کر ڈالتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عورت کے لیے اس کی محبت قوی تر ہوتی ہے۔ یہ تو ہم بہت سنتے ہیں کہ مرد عورت کی محبت میں ذلیل و حقیر اور دیوانے ہو گئے مگر یہ بہت کم سنا ہے کہ عورت کسی کی محبت میں خوار ہو گئی ہو۔ بنین سے مراد لڑکے اور لڑکیاں دونوں ہیں اس کا درست ترجمہ اولاد ہے۔ دوسرے نمبر پر ان کی محبت کا ذکر ہے کیونکہ بیوی کے بعد ان کی محبت غالب ہوتی ہے۔ وہ بھی تو عورتوں کا ثمر ہیں۔

قرآن حکیم کی دوسری آیت جس میں جنسی غریزے کو پاکیزہ سمجھا گیا ہے وہ سورۃ البقرۃ کی آیت ۲:۱۸۷ ہے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "أُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ إِلَىٰ نِسَائِكُمْ ۚ هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَأَنتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ" تم لوگوں کے لیے روزہ کی شب اپنی بیویوں سے خلوت کرنا جائز کر دیا گیا ہے کیونکہ وہ تمہارے لئے لباس ہیں اور تم ان کے لیے لباس ہو۔ یہودیوں کے یہاں روزے کی شرطیں بہت سخت تھیں جیسا کہ سورۃ مریم (۱۹:۲۶) سے ظاہر ہے کہ ان کے یہاں روزے میں بات چیت کی بھی ممانعت تھی۔ ایک شرط یہ تھی کہ اگر شام کو روزہ کھول کر سو جائیں تو پھر بیدار ہونے کے بعد کچھ کھا پی نہ سکتے تھے۔ اسی طرح پورے مہینے میں بیوی کا ملاپ بھی ممنوع تھا۔ مسلمانوں کو جب روزے کا حکم ہوا تو انہوں نے کما کتب علی الذین من قبلکم (جیسا کہ تم سے پہلے لوگوں پر فرض کئے گئے) سے یہی سمجھا کہ یہ تشبیہ فرضیت کے ساتھ کیفیت میں بھی ہے اس لئے انہوں نے ان پابندیوں کو اختیار کیا چونکہ

Marfat.com

پابندیاں سخت تھیں اسلئے لوگ انہیں نبھا نہ سکے اور اپنے فعل کو کمزوری سمجھ کر چھپانے لگے انکم کنتم تختانون انفسکم 'تم اپنے آپ سے خیانت کر رہے تھے'۔ میں اسی بات کی طرف اشارہ ہے۔ ابتداء ہی میں صحابہ افطار کے بعد سونے یا عشاء اخیرہ کی نماز پڑھنے تک کھاتے پیتے اور عورتوں سے مجامعت کرتے لیکن ان میں سے کوئی عشا اخیرہ پڑھ لیتا یا سو جاتا تو جاگنے کے بعد وہ روزے سے ہوتا خواہ رات کا آغاز ہی کیوں نہ ہو۔ ہوا یوں کہ حضرت عمرؓ اور کعب الانصاریؓ جیسے صحابہ افطار کے بعد سو گئے یا ان کی بیوی سو گئی۔ پھر انہیں مجامعت کی تحریک ہوئی تو انہوں نے مجامعت کر لی یا کسی کو افطار کے وقت گھر والوں کے یہاں کچھ کھانے کو نہ ملا اس پر نیند کا غلبہ ہوا اور وہ سو گیا جب بیدار ہوا تو کھانا پینا اس کے لئے روا نہ تھا تو اسے دوسرے دن تک اپنے روزے کو بڑھانا پڑا۔ مزدور تھا بھوک سے نڈھال ہو کر اس پر غشی طاری ہو گئی۔ یہ واقعہ قیس بن صرمہ انصاری کو پیش آیا۔ جب بات نبی کریم ﷺ تک پہنچی تو اللہ نے اس حکم کی پابندی سے جو تکلیف لوگوں کو پہنچی تھی اسے یہ آیت نازل کر کے دور کر دیا۔ اس حکم سے ایک غلط خیال کی تردید ہو گئی۔

زیر بحث آیت میں احل لکم (تمہارے لئے جائز کر دیا گیا ہے)، سورۃ المائدہ (۶۶:۵) أحل لکم صید البحر کی مانند ہے۔ سمندر کے شکار کی حرمت کے لئے پہلے کوئی حکم موجود نہ تھا یہاں بھی احل لکم کے الفاظ سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ یہ بات حرام نہ تھی بلکہ لوگوں کا خیال تھا کہ سونے کے بعد کھانا پینا اور بیوی کے پاس جانا روزے کے کمال کے منافی ہے۔ جس طرح روزے کی حالت میں دن کے وقت جنسی ملاپ کی اجازت نہیں اسی طرح رات کو بھی اس کی اجازت نہ ہو گی۔ اگر آدمی کوئی ایسا فعل کرے جو اس کے ضمیر کے نزدیک مشتبہ ہو تو یہ اپنے نفس کے ساتھ ایک گونہ خیانت ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے بھی اسے اپنے نفس کے ساتھ خیانت سے تعبیر کیا ہے چونکہ یہ احتیاط شریعت کے منشا کے خلاف تھی اور اسے از خود مسلمانوں نے اپنے اوپر عائد کر لیا تھا۔ اس وجہ سے اللہ نے اس خیانت سے درگزر کر دیا۔ روزے جب مسلمانوں پر فرض ہوئے تو عورتوں سے مباشرت کے بارے میں ان کا موقف واضح نہیں تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ عورتوں سے میل جول اور اپنی خواہشات کو بے لگام چھوڑنا ان کے روزے کو ناقص بنا دے گا۔ جنس ایک حیوانی غریزہ ہے جس پر انسان غالب نہیں آ سکتا۔ روزے کا یہ مقصد ہرگز نہیں تھا کہ جسمانی خواہش بالکل ترک کر دی جائے بلکہ مقصد ضبط و اعتدال تھا پس اس سلسلہ میں جو ممانعت ہے دن کے وقت ہے رات کے وقت کوئی ممانعت نہیں۔ یہ تصور کہ جنسی اختلاط قرب الٰہی کی راہ میں حائل ہوتا ہے خانقاہی تصور ہے اسلامی تصور نہیں۔ اسلام انسانی فطرت میں رکاوٹ جائز نہیں

Marfat.com

سمجھتا۔ وہ فطری رغبت کی تسکین چاہتا ہے۔ ان تعلقات کے لئے یہ جملہ بادنسیم کا ایک جھونکا ہے اس لئے قرآن نے میاں بیوی کے جنسی تعلق کو تقویٰ کے منافی قرار نہیں دیا بلکہ تقویٰ کا معاون بتایا ہے۔

رفث

ابن فارس مقاییس اللغة میں کہتے ہیں کہ ہر وہ کلام جس کو صاف صاف بیان کرنے میں شرم محسوس ہوتی ہو رفث کہلاتی ہے۔ رَفَثَ و ارفَثَ فی کلامہ اس نے فحش کلامی کی۔ ازہری کا قول ہے کہ رفث ہر اس چیز کے لیے ایک جامع لفظ ہے جو مرد عورت سے چاہتا ہے۔ راغب کا قول ہے کہ رفث سے مراد وہ فحش باتیں ہیں جن کا اظہار اچھا نہیں سمجھا جاتا یعنی جماع اور اس کے محرکات کا بیان۔ کشاف میں حضرت ابن عباس سے روایت ہے کہ وہ حالت احرام میں یہ شعر پڑھ رہے تھے۔

ھن یمشین بنا ھمیسا

ان تصدق الطیر ننك لمیسا

اونٹنیاں ہمیں لے کر آہستہ آہستہ چل رہی ہیں اگر پرندہ سچ کہتا ہے (یعنی پرندے کے شگون کو مان لیا جائے) تو اس کا مطلب ہے کہ ہم لمیس سے مجامعت کریں گے۔

جب لوگوں نے اعتراض کیا کہ آپ حالت احرام میں رفث (فحش کلامی) کے مرتکب ہوئے ہیں تو انہوں نے جواب دیا رفث سے مراد وہ جنسی گفتگو ہے جو عورت کے سامنے کی جائے۔ رفث کے بعد خالی حرف جار استعمال کر کے اس میں افضاء یعنی بیویوں تک پہنچنے اور صحبت کرنے کے معنی پیدا کئے گئے ہیں۔ یعنی رمضان کی راتوں میں اپنی بیوی کو جماع کے لئے بلانا اور اس بارے میں اس سے گفتگو کرنا جائز ہے۔

قرآن نے جنسی ملاپ کے لیے لطیف کنایے اور مہذب الفاظ استعمال کیے ہیں مثلاً **افضی بعضکم الی بعض** (نساء ۴:۲۱) 'تم ایک دوسرے سے بے حجابانہ مل چکے ہو'۔ **فلما تغشا ھا** (بنی اسرائیل ۱۷:۱۸۶) 'پھر جب میاں نے بیوی کو ڈھانپ لیا یعنی قربت کی'۔ **باشروھن** (البقرۃ ۲:۱۸۷) 'ان سے ملو ملاؤ'۔ **أو لا مستم النساء** (نساء ۴:۴۳) 'یا تم نے عورتوں کو چھوا ہو' (قربت کی ہو)۔ **دخلتم بھن** (نساء ۴:۲۳) 'تم نے ان سے دخول کیا ہو' (صحبت کی ہو)۔ **فاتو حرثکم** (البقرہ ۲:۲۲۳) 'پس تم آؤ اپنے کھیت (عورت کی شرمگاہ) کی طرف'۔ **من قبل ان تمسوھن** (الاحزاب ۳۳:۴۹) 'قبل اس کے کہ تم نے ان کو چھوا ہو' (قربت کی ہو)۔ **فما استمتعتم بہ منھن** (نساء ۴:۲۴) 'سو تم ان میں سے جس سے لطف اندوز ہوئے ہو' اور **ولا تقربوھن**

Marfat.com

(البقرہ ۲:۲۲۲) 'تم ان سے قربت نہ رکھو'۔ سوال یہ ہے کہ ایسے شائستہ الفاظ کا استعمال کرنے کے بعد یہاں رفث جیسا غیر شائستہ لفظ کیوں استعمال کیا گیا ہے؟ اس لفظ کے معنی یہ ہیں کہ عورت اور مرد کی مجامعت کا صراحتاً ذکر مناسب نہیں یعنی تمہارے لئے وہ کام جائز قرار دیا گیا ہے جس کے بارے میں صاف صاف گفتگو نہیں کرنا چاہیے۔ یا رمضان کے مہینے کی مناسبت سے اس فعل کی قباحت بتانے کے لئے یہ لفظ استعمال کیا ہے جیسا کہ حج میں اس فعل کی قباحت کے پیش نظر اسی لفظ کو استعمال کیا گیا ہے۔

ھن لباس لکم وانتم لباس لھن 'وہ تمہارے لیے لباس ہیں اور تم ان کے لیے لباس ہو'۔ یہ جملہ مستانفہ (نیا) ہے جو حلت اور جواز کے سبب کو واضح کرتا ہے مطلب یہ ہے کہ تم ایک دوسرے سے اس طرح گھلے ملے ہو کہ عورتوں سے الگ رہنا تمہارے لئے مشکل ہے۔ اسی لیے رمضان کی راتوں میں تمہیں ان سے ملاقات کی رخصت عطا کی گئی ہے۔ احکام القرآن میں ابن العربی کا قول ہے کہ اس میں فقہی نکتہ یہ ہے کہ تم میں سے کوئی بھی اپنے ساتھی سے اجتناب نہیں کر سکتا کیونکہ وہ دوسرے ساتھی سے گھلا ملا ہوتا ہے۔ ھن لباس لکم اس لیے مقدم ہے کہ بتایا جائے کہ مرد عورت کے لیے بے چین ہوتا ہے اور اس سے علیحدہ ہونے میں دقت کا سامنا کرتا ہے۔ جنسی فعل کا آغاز مرد کرتا ہے۔ سلیم فطرت عورت اس کا مطالبہ نہیں کرتی۔ اس سلسلہ میں صاحب روح المعانی نے ایک روایت نقل کی ہے: لاصبر عنھن یغلبن کریما ویغلبھن لئیم واحب ان اکون کریما مغلوبا ولا احب ان اکون لئیماً غالبا۔ عورتوں سے اجتناب ممکن نہیں وہ شریف پر غالب آ جاتی ہیں اور کمینہ ان پر غلبہ پا لیتا ہے۔ مجھے شریف اور مغلوب ہونا پسند ہے نہ کہ کمینہ ہو کر غالب ہونا۔ مفسرین نے لباس کا ایک مفہوم تو یہ لیا ہے کہ سوتے وقت وہ ایک کپڑے میں سوتے ہیں اور ایک کا برہنہ جسم دوسرے کے برہنہ جسم سے بمنزلہ لباس کے ہوتا ہے چنانچہ ربیع کا قول ہے: ھن فراش لکم وانتم لحاف لھن 'وہ تمہارا بستر ہیں اور تم ان کا لحاف'۔ گویا کہ ایک بستر پر ننگا ہونے اور بغلگیر ہونے کو کنایۃً لباس سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اس سلسلہ میں نابغہ جعدی کا یہ شعر بھی پیش کیا گیا ہے۔

اذا ما الضجیع ثنّی عطفھا
تثنّت فکانت علیہ لباسا

جب لیٹنے والا اس کا پہلو موڑتا ہے تو وہ مڑ جاتی ہے
اور اس پر لباس کی طرح ہو جاتی ہے۔

- عربی کا محاورہ ہے: لبست امراۃ ای تمتعت بھا 'یعنی میں اس سے لطف اندوز ہوا'۔ یہاں لباس

Marfat.com

بالکل ان معنوں میں ہے جن میں غشیان اور تغشی (ڈھانپنا) کے الفاظ قرآن میں استعمال ہوئے ہیں جو وظیفہ زوجیت کا کنایہ ہے۔ اللہ نے جنسی ملاپ پر ایک خوبصورت پردہ ڈالا ہے اور اس کیفیت کو چھپایا ہے جو میاں بیوی کے درمیان وصل کی گھڑی میں ہوتی ہے ان کے درمیان کیا ہوتا ہے کوئی نہیں جانتا۔ اگر میاں بیوی جنسی جذبات ومحرکات کے لیے لباس فراہم نہ کریں تو جنسی انارکی پیدا ہو جائے۔ چنانچہ مولانا امین احسن اصلاحی فرماتے ہیں کہ 'علمائے عمرانیات کا قول ہے کہ انسان نے تہذیب وتمدن کا پہلا قدم اسی دن اٹھایا جس دن پہلے مرد نے پہلی عورت سے اپنا تعلق استوار کیا'۔ لباس یہاں لا بس کی مصدر ہے جس کے معنی میل جول اور مخفی باتوں سے واقفیت ہے۔ یہ اس مفہوم میں نہیں جس مفہوم میں لباس اور ازار (تہہ بند) کا استعمال عورت کے لیے ہوتا ہے اور جسے عورت کی تحقیر کی غرض سے بعض مفسرین نے استعمال کیا ہے۔ امام راغب کا قول ہے کہ بیوی کو میاں کا لباس اور میاں کو بیوی کا لباس اس لیے قرار دیا گیا ہے کہ وہ دونوں ایک دوسرے کی حفاظت کرتے ہیں اور ایک دوسرے کو برے فعل سے بچاتے ہیں۔ ان دونوں کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ وہ ایک دوسرے سے پیوستہ ووابستہ ہیں۔ ابن عباس اور مجاہد نے لباس کا دوسرا مفہوم سکن اور سکون کو قرار دیا ہے یعنی عورتیں مردوں کے لیے سکون اور اطمینان کا باعث ہیں اور مرد عورتوں کے لیے۔ قرآن حکیم نے رات کو بھی ایک جگہ سکون (الیونس ۱۰:۶۷) اور ایک جگہ لباس (النبا ۷۸:۱۰) کہا ہے۔ لطیف استعارہ سے بتایا گیا ہے کہ میاں بیوی کا تعلق ایک دوسرے کے لیے تسکین کا موجب ہے اور کس طرح ایک کی کمی دوسرے سے پوری ہوتی ہے۔ اللہ نے سورۂ روم (۳۰:۲۱) میں فرمایا ہے۔ تمہاری جنس سے تمہارے لیے بیویاں پیدا کیں تاکہ تم ان سے سکون حاصل کرو۔ مولانا عبدالماجد دریابادی اپنی انگریزی کی تفسیر میں اس آیت کے تحت لکھتے ہیں: 'جنس کے بارے میں اسلام کا رویہ عیسائیت سے مختلف ہے۔ عیسائیت اسے خطرناک بنیادی گناہ تصور کرتی ہے جس کی وجہ سے آدم کو جنت سے نکالا گیا جبکہ اسلام کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ روزوں کا تقدس اور جنسی ملاپ ساتھ ساتھ چل سکتے ہیں'۔ آیت میں اس حقیقت پر زور دیا گیا ہے کہ میاں بیوی میں سے ایک کا انحصار دوسرے پر ہے۔ ایک دوسرے کے بغیر ناقص ہے۔ انہوں نے ماہر حیات Dr. Elisabeth Chesser کا مندرجہ ذیل قول نقل کیا ہے:

A vast amount of energy is wasted in futile agreement on as the reletive superiority of man & woman. Each sex contains undeveloped organs, functions which are more fully developed in the other.... the

Marfat.com

lesson of Biology is that where sex exists, the two sexes are mutually dependents.

اللہ نے انسان کو پیدا کیا اور اس کی فطرت میں زوجیت رکھی۔ نفس واحدہ کے دو حصے کر کے زوجین کو تشکیل دیا۔ پھر اللہ کو منظور ہوا کہ زوجین کا باہمی ملاپ جسم و روح کی تسکین کا باعث بنے اور ایک دوسرے کے لیے ستر کا کام دے۔ زندگی کو آگے بڑھانے کے لیے اسی جوڑے کے ذریعے نسل انسانی کی بقا کا اہتمام کیا۔

تیسری اہم آیت جس میں جنسی میلان کا ذکر ہے وہ سورۃ البقرۃ کی آیت نمبر ۲۲۳ ہے اللہ کا فرمان ہے: نِسَآؤُکُمْ حَرْثٌ لَّکُمْ فَاْتُوْا حَرْثَکُمْ اَنّٰی شِئْتُمْ تمہاری بیویاں تمہاری کھیتیاں ہیں اپنے کھیت میں جس طریقے سے چاہو آؤ'۔ اس آیت کو سمجھنے سے پہلے اس سے پہلی آیت نمبر ۲۲۲ کو سمجھنا ضروری ہے کیونکہ ان دونوں آیات کا آپس میں گہرا ربط ہے۔ اللہ کا ارشاد ہے: 'لوگ آپ کو حیض کے بارے میں پوچھتے ہیں آپ کہہ دیجئے یہ ضرر کی بات ہے۔ حیض میں تم عورتوں سے علیحدہ رہو اور ان سے قربت نہ کرو جب تک وہ صاف نہ ہو جائیں اور جب وہ اچھی طرح صاف ہو جائیں تو ان کے پاس آؤ جس جگہ سے اللہ نے تم کو اجازت دی ہے'۔ اس آیت میں حیض کا حکم بیان ہوا ہے اس کے بعد عورتوں سے مباشرت کو جائز قرار دیا گیا ہے اور مباشرت کی اس حکمت کا بیان کیا گیا ہے جس کی خاطر شادی کو شرعی طور پر جائز قرار دیا گیا ہے۔ حیض کی حالت میں مباشرت سے اجتناب کے لیے وحی کے ذریعہ حکم دیا گیا ہے کیونکہ حیوانی جبلت اس سلسلہ میں کوئی رہنمائی نہیں کرتی۔

آیت میں لفظ اذی سے مراد وہ ضرر ہے جو ماہواری کے ایام میں جنسی ملاپ سے لاحق ہوتا ہے۔ مطلب یہ نہیں کہ ماہواری بذاتہ ضرر رساں ہے یا ایک عیب ہے۔ ممانعت کی علت خون ہے اس لیے خون بند ہونے کے بعد یہ پابندی خود بخود ختم ہو جاتی ہے۔ ماہواری میں علیحدگی کا سبب یہ نہیں کہ عورتیں نجس ہوتی ہیں اور میل جول کے قابل نہیں رہتیں جیسا کہ یہودیوں کا خیال تھا بلکہ اصل بات یہ ہے کہ ان دنوں کا جنسی تعلق مضر ہوتا ہے اور بیماری کا اندیشہ ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں مباشرت ایک اعلیٰ و ارفع مقصد یعنی بقائے نسل تک پہنچنے کا ذریعہ ہے۔ ماہواری کے دوران مباشرت سے حیوانی لذت تو حاصل ہوتی ہے مگر عورت اس حالت میں نسل انسانی کی ترقی کے اصل مقصد کو پورا کرنے کے قابل نہیں ہوتی۔ انسانی فطرت بھی اس حالت میں جنسی ملاپ سے ابا کرتی ہے جس میں نہ بیج بویا جا سکے اور نہ زندگی پھوٹ سکے۔ جبکہ پاکیزگی کی حالت میں مباشرت سے طبعی لذت بھی حاصل ہوتی ہے اور فطری مقصد بھی پورا

Marfat.com

ہوتا ہے۔ حالت حیض پر طہر کا لفظ اس لیے نہیں بولا جاتا کہ وہ اس حالت میں فطرت کا مقصد پورا کرنے کی اہل نہیں ہوتی۔

حیض نہ مرض ہے، نہ نقص ہے اور نہ ضعف ہے اور نہ کوئی ایسی چیز جس کی وجہ سے عورت اپنی نسوانیت کھودے اور زندگی سے بیزار ہو جائے۔ یہ پختگی اور بلوغت کا مظہر ہے یہ عورت کا رشتہ عہد طفولیت سے کاٹ دیتا ہے۔ یہ صحت کی علامت ہے۔ یہ افزائش نسل کے لیے قدرت کا انتظام ہے جو ہر عورت کے لیے ناگزیر ہے۔ جس عورت کو حیض نہ آئے اسے بیمار تصور کیا جاتا ہے قرآن حکیم نے اس عمر کو جب حیض آنا بند ہو جائے سن یاس (مایوسی کی عمر) قرار دیا ہے۔ جب حج کے دوران اُم لمومنین سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کو حیض آیا تو آپ رونے لگیں نبی کریم ﷺ نے یہ کہہ کر ان کو تسلی دی کہ یہ بات تو اللہ نے آدم زادیوں پر واجب کی ہے۔ اس سے کسی عورت کو گریز نہیں۔ ہمارے مذہبی پیشوا مردانہ شاونزم کے تحت جن باتوں کو مردوں کے مقابلہ میں عورتوں کی کمزوریاں قرار دیتے ہیں ان میں حیض کو بھی شمار کرتے ہیں۔ گویا کہ یہ فطری بات نہیں بلکہ انسان کی پیدا کردہ خامی ہے۔ وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ اگر یہ صحت مند اور طبعی (Phenominon) نہ ہوتا تو اس دنیا میں ان کا وجود خطرے میں پڑ جاتا۔

دوسرے اس آیت کا بعد والی آیت سے گہرا رابط ہے۔ امام طبری نے اپنی تفسیر (۲:۲۹۳) میں سعید بن جبیر سے روایت کی ہے کہ میں اور مجاہد ابن عباس کے پاس بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک آدمی آیا اور ان کے سر پر کھڑا ہو گیا اور پوچھنے لگا اے ابو عباس یا ابو الفضل کیا آپ حیض والی آیت کے بارے میں میری تسلی نہیں کریں گے؟ آپ نے فرمایا کیوں نہیں۔ پھر اس نے حیض والی آیت آخر تک تلاوت کی۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا جس جگہ سے خون آتا ہے اسی جگہ میں عورت سے مباشرت کا حکم اللہ نے دیا ہے۔ اس نے پوچھا کہ اس کا کیا مطلب ہے کہ عورتیں تمہارے کھیت ہیں اپنے کھیت میں جس طریقے سے چاہو آؤ۔ آپ نے جواب دیا تجھ پر افسوس ہے کیا کھیت دبر (پچھلے حصہ) میں ہوتا ہے؟ اگر وہ بات صحیح ہوتی، جو تو کہہ رہا ہے تو حیض منسوخ ہو جاتا۔ حیض نے جس جگہ کو مشغول کیا ہے دخول بھی حالت طہر میں اسی جگہ سے ہوگا۔ انی شئتم سے مراد ہے رات کے وقت یا دن کے وقت۔ حالت حیض میں جس جگہ سے دخول کے اجتناب کا حکم ہے، حالت طہر میں اسی جگہ دخول کا حکم ہوگا گویا حــرث کا لفظ مــن حیث امرکم اللہ کی تفسیر ہے۔ یہ اللہ کا امر ہے جو جبلی طور پر حیوانات میں رکھ دیا گیا ہے اور یہی امر خداوندی انسان کے اندر بھی موجود ہے اور یہی وہ ادب ہے جو ہر جاندار کی فطرت میں ودیعت کیا گیا ہے۔ چنانچہ عورتوں کے پاس اسی راستہ سے آنا چاہیے جو اصل مقصد سے وابستہ ہے وہ راستہ فرج کا

Marfat.com

راستہ ہے حیض میں عورت سے علیحدگی اس لیے واجب ہے کہ طبع سلیم اس سے ابا کرتی ہے۔ اسی علت کی بنیاد پر دبر میں دخول سے اجتناب اس لئے واجب ہے چونکہ طبع سلیم اس سے بھی ابا کرتی ہے۔

اب آتے ہیں زیر نظر آیت نمبر ۲۲۳ کی طرف۔ اس آیت کے شانِ نزول کے بارے میں کئی متعارض روایات ہیں لیکن صحیح ترین وہ حدیث ہے جسے شیخین نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ اس کا سبب نزول یہ ہے کہ یہودی ایک خاص طریقہ کے علاوہ کسی اور طریق کار کو ممنوع سمجھتے تھے۔ ان کا خیال تھا جو اپنی بیوی کے فرج میں پیچھے سے مباشرت کرے گا اس کا بچہ بھینگا ہوگا۔ آیت میں ان کے اس خیال کی تردید ہے۔

اس آیہ مبارکہ میں یہ بتایا گیا ہے کہ عورت کی شرمگاہ (فرج) زمین کی مانند ہے اس میں جو نطفہ ڈالا جاتا ہے وہ بیج کی مانند ہے اور بچہ اگنے والی نباتات کی مانند۔ مبالغہ کے معنی پیدا کرنے کے لئے ماخذ ومصدر یعنی حرث کو عورت کی شرمگاہ قرار دیا گیا ہے اسی لئے حرث مفرد استعمال ہوا ہے۔

جیسا کہ شاعر کا قول ہے:

انما الأرحام أرضو ... ن لنا محترثات

فعلينا الزرع فيها ... وعلى الله النبات

رحم تو ہمارے لئے محض زمین ہے جس میں ہم کھیتی کرتے ہیں

ہمارا کام اس میں بیج بونا اور اللہ کا کام اگانا ہے۔

حرث

حرث (کھیت) اس زمین کو کہتے ہیں جہاں کچھ اُگے اور پیدائش نباتات کی مانند ہے۔ آیت میں پیداواری صلاحیت، پیدائش اور افزائش کا بیان ہے۔ یہ تعبیر بلاغت اور حسن بیان کا اعلیٰ نمونہ ہے اور اللہ کے قول فاتوھن من حیث امر کم اللہ (ان کے پاس وہاں سے آؤ جہاں سے اللہ نے تمہیں حکم دیا ہے) کی تشریح ہے یہ حکم نوع بشری کی بقا کے لیے دیا گیا ہے کیونکہ نباتات کھیتی باڑی سے محفوظ ہو جاتی ہے۔ لذت پرستی مقصود بالذات نہیں۔ اسی لیے حالت حیض میں مباشرت سے منع کیا گیا ہے کیونکہ یہ زمانہ عورت کے لیے غیر آمادگی کا زمانہ ہوتا ہے جب اس میں بچہ پیدا کرنے کی استعداد نہیں ہوتی۔ افزائش نسل کا مقصد پورا کرنے کے لیے حمل، وضع حمل اور اولاد کی تعلیم و تربیت کی مشقتیں اٹھانی پڑتی ہیں۔ اس لیے اس عمل میں لذت کا عنصر رکھا گیا ہے۔ تاکہ وہ اس مشقت طلب عمل میں ترغیب کا کام کرے۔ لفظ حرث سے ضمناً یہ مفہوم نکلتا ہے کہ اس جگہ مباشرت کرنی چاہیے جو حرث (کھیت) کا مقصد پورا کرتی

Marfat.com

ہو۔ فاتوا حرثکم انی شئتم پس تم اپنے کھیت میں آؤ جس طریقے سے چاہو۔

امام طبری نے ابن عباس کا قول نقل کیا ہے تمہاری بیویاں تمہاری اولاد کا کھیت ہیں اس کھیت میں جیسے چاہو آؤ۔ قتادہ کا قول ہے اولاد کی پیدائش کی جگہ میں اگر چاہے تو کھڑے ہوکر، چاہے تو بیٹھ کر اور چاہے تو پہلو کے بل آئے بشرطیکہ اس راستے سے آئے جہاں سے ماہواری کا خون آتا ہے یعنی تم مختلف آسن اختیار کر سکتے ہو۔ یہ ایک تمثیلی بیان ہے کہ جیسے تم ان کھیتوں کی طرف جن میں تم کاشت کاری کرتے ہو ہر طرف سے آسکتے ہو کوئی طرف بھی ممنوع نہیں ہوتی اسی طرح اپنی عورتوں سے جس طریقے سے چاہو ملاپ کرو بشرطیکہ مدخل ایک ہو اور اس پر کھیت کا اطلاق ہوتا ہو۔ پچھلی آیت میں حکم تھا وہاں سے آؤ جہاں سے آنے کا تمہیں اللہ نے حکم دیا ہے اور اس آیت میں اس جگہ کو حرث (کھیت) کہہ کر اس کی تشریح کردی ہے جب چاہو جس طرح چاہو اور جہاں سے چاہو آؤ۔ اس جگہ سے آؤ جس پر کھیت کا اطلاق ہو سکتا ہے۔ حالت حیض میں جس جگہ مباشرت سے اجتناب کا حکم ہے حالت طہر میں اس جگہ مباشرت کا حکم ہے۔ مولانا آزاد لکھتے ہیں فطرت نے مرد اور عورت کے باہم ملنے کے لیے جو بات جس طور پر ٹھہرادی ہے اس طرح ہونی چاہیے اس کے سوا اور کوئی بات نہیں ہونی چاہیے۔ اس معاملہ کی نسبت جو وہم پرستیاں پھیلی ہوئی ہیں مثلاً کسی خاص طریقے کو جائز سمجھتے ہیں کسی کو ناجائز، کسی خاص طریقے میں برکت سمجھتے ہیں اور کسی میں نحوست تو اس کی کوئی اصلیت نہیں جس طرح بھی چاہو فطری طریقے سے یہ عمل کر سکتے ہو۔

اس آیت میں چند امور کی دعوت دی گئی ہے عورتوں کا خیال رکھنا اور ان کے معاملات کا اہتمام کرنا، اور ان کو تمام فطری وسائل مہیا کرنا، بالکل اسی طرح جیسے کھیتی باڑی کرنے والا اپنے کھیت کا خیال رکھتا ہے اور اسے ہر مصیبت سے بچانے کی کوشش کرتا ہے اور وہ بیج ڈالتا ہے جو بار آور ہوتا ہے اور یہ سب اسی وقت ممکن ہے جب اس سے اس راستہ سے مجامعت کی جائے جہاں بیج بار آور ہو سکتا ہے۔ دوسرے جنس کوئی ایسی چیز نہیں جس سے شرم کھائی جائے اور جسے غیر سنجیدگی سے سمجھنے کی کوشش کی جائے اور جس سے حد سے زیادہ تجاوز کیا جائے۔ کھیت کسان کے لیے ایک اہم اور سنجیدہ معاملہ ہے وہ پیداوار کے لئے بیج ڈالتا ہے لیکن وقت اور کھیتی باڑی کے طریقہ کا انتخاب وہ خود کرتا ہے۔ نہ وہ بے موسم بیج ڈالتا ہے اور نہ اس طریقہ سے کھیتی باڑی کرتا ہے جو کھیت کے لیے نقصان دہ ہو، وہ دانشمندی اور حکمت عملی سے کام لیتا ہے۔ اسی طرح جنسی تعلقات میں اعتدال اور دانشمندی کا طریقہ اختیار کرنا چاہیے۔ اس کے لیے حکمت عملی اور باہمی افہام و تفہیم از بس ضروری ہے۔ یہ بات بھی فراموش نہیں کرنی چاہیے کہ ہم اللہ کے یہاں جوابدہ

Marfat.com

ہیں۔ یہی اس جسمانی عمل کا روحانی پہلو ہے۔

اس آیت کے سلسلہ میں ایک لغزش کی طرف اشارہ ضروری ہے جو کچھ اہل علم سے سرزد ہوئی ہے انہوں نے انّیٰ کو اینَ کے معنوں میں سمجھ کر نتیجہ یہ نکالا ہے کہ عورتوں کے دبر (پچھلے حصہ) میں مباشرت بھی جائز ہے۔ یہ تصور قطعی غلط اور غیر فطری ہے۔ اس سلسلہ میں حرث کے معنوں کی وضاحت کے سلسلہ میں قرآن مجید کے داخلی اور خارجی دلائل کا ذکر ہو چکا ہے۔ یہاں لفظ انی کے معنی اور مفہوم کی وضاحت کی جائے گی۔ انــی زیادہ تر استفہام کے لئے کیف (کس طرح۔ کیونکر) کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ جب ایک آدمی پوچھتا ہے: انی لك هذا المال؟ یعنی یہ مال تجھے کیونکر ملا؟ تو نے اسے کس طریقہ سے حاصل کیا؟ تو جواب دینے والا کہتا ہے كذا و كذا، اس اس طریقہ سے، سورۃ بقرۃ (۲:۲۰۹) میں ارشاد ہے: 'أَنّٰی يُحْيِي هٰذِهِ اللّٰهُ بَعْدَ مَوْتِهَا'۔ 'اللہ اس بستی کو مرنے کے بعد کیوں کر زندہ کرے گا؟' یا پھر سورۃ آلِ عمران (۳:۳۷) میں ہے: یامریم انی لك هذا 'اے مریم! یہ تیرے پاس کس طریقے سے آیا'۔ یہی وجہ ہے کہ عکرمہ اور ربیع کا قول ہے کہ اس آیت میں اَنّیٰ کیف کے معنوں میں ہے یعنی فرج (شرمگاہ) میں آگے سے، پیچھے سے، کھڑے ہو کر، لیٹ کر، سیبویہ نے بھی اس آیت میں اَنّیٰ کی تفسیر کیف سے کی ہے۔ کبھی کبھی اَنّیٰ اَینَ (کہاں) اور متٰی (کب) کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ جب اَنّیٰ اَینَ کے معنوں میں ہوتا ہے تو وہ شرطیہ ہوتا ہے اور صرف ظرف مکان کے لیے استعمال ہوتا ہے جیسے انی تجلس اجلس جہاں تو بیٹھے گا میں بیٹھوں گا۔ آیت زیر نظر میں یہ صورت نہیں اور کبھی یہ متٰی (کب) یعنی ظرف زمان کے لیے بولا جاتا ہے۔ جیسے انی جئت 'تم کب آئے'۔ ضحاک کے قول کے مطابق اس آیت میں انــی متــی کے معنوں میں استعمال ہوا ہے یعنی دن یا رات جس وقت بھی تم چاہو مباشرت کر سکتے ہو۔ انــی کا اطلاق بطور سوال اور بطور خبر ایسے معاملہ پر ہوتا ہے جس کی کئی صورتیں ہوں۔ یہ لغت میں کیف۔ این اور متٰی سے زیادہ عام ہے۔ چنانچہ اللہ کے قول کے معنی یہ ہیں کہ تم اپنے کھیت میں مختلف طریقوں (آسنوں) میں سے جس سے چاہو داخل ہو سکتے ہو، دبر کو کھیت نہیں کہا جا سکتا۔ مولانا امین احسن اصلاحی فرماتے ہیں انی شئتم بیک وقت دو چیزوں کی طرف اشارہ کرتا ہے ایک تو اس آزادی اور بے تکلفی، خودمختاری کی طرف جو ایک باغ یا کھیتی کے مالک کو اپنی کھیتی کے معاملہ میں حاصل ہوتی ہے دوسری اس پابندی، ذمہ داری اور احتیاط کی طرف جو ایک کھیتی والا اپنی کھیتی کے معاملہ میں ملحوظ رکھتا ہے۔ مسلم نے ام سلمہ سے روایت کی ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے اللہ کے قول نساء کم حرث لکم کے بارے میں فرمایا آدمی بیوی (کی شرمگاہ) کے پاس آگے، پیچھے سے

Marfat.com

آ ئے بشرطیکہ دخول ایک ڈاٹ (Valve) میں ہو۔ صاحب البحر المحیط کا قول ہے دبر میں دخول کی حرمت کو بارہ صحابہ کرام نے مختلف الفاظ کے ساتھ روایت کیا ہے۔ ان روایات کا ذکر مسند احمد ابو داؤد، ترمذی اور نسائی میں موجود ہے۔ ان سب روایات کو محدث ابو الفراج ابن الجوزی نے تحریم المحل المکروہ (مکروہ جگہ کی حرمت) نامی جزو میں جمع کر دیا ہے۔ جمہور صحابہ تابعین اور ائمہ نے اس سے مراد فرج میں کسی طریقہ سے یعنی آگے پیچھے اور پہلو کے بل لئے ہیں۔

اس کے جواز کو عبد اللہ بن عمر اور امام مالک کی طرف غلط طور پر منسوب کیا گیا ہے۔ نسائی نے ابو النصر سے روایت کی ہے کہ انہوں نے ابن عمر کے آزاد کردہ غلام نافع سے پوچھا کہ تو کہتا ہے کہ ابن عمر نے عورتوں کی دبر میں مباشرت کا فتویٰ دیا ہے۔ نافع نے جواب دیا کہ انہوں نے میرے بارے میں جھوٹ کہا ہے۔ لیکن میں انہیں اصل بات بتاتا ہوں۔ ابن عمر ایک روز قرآن پڑھتے پڑھتے نساؤ کم حرث لکم کی آیت پر پہنچے اور میں ان کے پاس تھا۔ انہوں نے کہا اے نافع! کیا تو جانتا ہے کہ اس آیت کا کیا معاملہ ہے ہم قریشی عورتوں سے قربت کرتے تھے، جب مدینہ میں آ کر ہم نے انصاری عورتوں سے نکاح کیے تو ہم نے ان کے ساتھ بھی ایسے ہی قربت کرنی چاہی جیسے ہم اپنی عورتوں سے کرتے تھے۔ انہوں نے اس کو ناپسند کیا اور برا منایا کیونکہ انصاری عورتیں پہلو کے بل جنسی ملاپ کی عادی تھیں تو اس آیت کا نزول ہوا، یعنی قریشی عورتوں سے ہم ہر طرح سے مباشرت کرتے تھے جبکہ انصاری عورتیں صرف ایک طریقہ یعنی پہلو کے بل مباشرت کی عادی تھیں۔ امام مالک نے بھی اس فعل سے انکار کیا ہے۔ صاحب البحر المحیط نے لکھا ہے کہ ان سے پوچھا گیا کہ لوگوں کا خیال ہے کہ آپ عورتوں کے دبر میں مجامعت کو جائز سمجھتے ہیں۔ انہوں نے جواب دیا معاذ اللہ کیا تم نے اللہ کے قول نساؤ کم حرث لکم نہیں سنا؟ کیا حرث کھیت اس جگہ کو نہیں کہتے جہاں بیج ڈالا جاتا ہے؟ امام ابو حنیفہ اور امام شافعی کا بھی یہی مسلک ہے۔

سورۃ بقرۃ کی ایک اور آیت (۲:۲۳۵) میں بڑے لطیف انداز میں جنسی رغبت کے بارے میں گفتگو کی گئی ہے حق تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيمَا عَرَّضْتُم بِهِ مِنْ خِطْبَةِ النِّسَاءِ أَوْ أَكْنَنتُمْ فِي أَنفُسِكُمْ عَلِمَ اللَّهُ أَنَّكُمْ سَتَذْكُرُونَهُنَّ وَلَٰكِن لَّا تُوَاعِدُوهُنَّ سِرًّا إِلَّا أَن تَقُولُوا قَوْلًا مَّعْرُوفًا وَلَا تَعْزِمُوا عُقْدَةَ النِّكَاحِ حَتَّىٰ يَبْلُغَ الْكِتَابُ أَجَلَهُ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ يَعْلَمُ مَا فِي أَنفُسِكُمْ فَاحْذَرُوهُ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ غَفُورٌ حَلِيمٌ ۔ اور جن بیوہ عورتوں سے تم نکاح کرنا چاہو تو تمہارے لئے کوئی گناہ نہیں کہ نکاح کا پیغام دینے کے بارے میں کوئی بات اشارۃً کہہ دو یا اپنے

Marfat.com

دل میں نکاح کا ارادہ پوشیدہ رکھو۔ اللہ جانتا ہے (کہ طبعی طور پر) تمہیں ان کا خیال آئے گا لیکن ایسا نہیں کرنا چاہیے کہ چوری چھپے نکاح کا وعدہ کرلو مگر یہ کہ کوئی بات دستور کے مطابق کی جائے اور نکاح کی گرہ کو پختہ مت کرو یہاں تک کہ مقرر کیا ہوا وقت (عدت) اپنی انتہا کو پہنچ جائے اور جان لو کہ اللہ تعالیٰ اسے جانتا ہے جو تمہارے دلوں میں ہے پس اس سے ڈرتے رہو اور جان لو کہ اللہ بخشنے والا اور بردبار ہے۔

زمانہ جاہلیت میں بیوہ عورت پر عزیزوں اور معاشرے کی جانب سے بڑی سختی کی جاتی تھی خاوند کے مرنے کے بعد ان کو گھٹیا جگہ پر رکھا جاتا تھا۔ وہ بدترین کپڑے پہنتی تھیں اور سال بھر خوشبو نہیں لگا سکتی تھیں۔ جاہلی رسوم ادا کرنے کے لئے ان کو بعض باتوں پر مجبور کیا جاتا تھا مثلاً اونٹ کی مینگنیاں پھینکنا یا گدھے اور بھیڑ پر سوار ہونا۔ ظہور اسلام کے بعد یہ سختیاں دور ہوگئیں۔ ان کی عدت کی مدت چار ماہ دس دن یعنی مطلقہ کی عدت سے طویل تر اس لئے مقرر کی گئی تا کہ اسی دوران رحم خالی ہو جائے اور اگر وہ گھر سے نکلے تو گھر والوں کے جذبات مجروح نہ ہوں۔ اب عدت کے دوران وہ باوقار لباس پہن سکتی ہے البتہ منگنی کے لئے آرائش نہیں کرسکتی۔ عدت کے بعد کسی کو اس پر پابندی عائد کرنے کا حق نہیں پہنچتا خواہ وہ اس کے رشتے دار ہوں یا اس کے خاوند کے۔ کتاب وسنت کی حدود میں رہتے ہوئے اسے اپنے لئے کوئی فیصلہ کرنے کی مکمل آزادی ہے۔ وہ زینت بھی کرسکتی ہے۔ نکاح کے پیغام بھی وصول کرسکتی ہے جس سے چاہے شادی کرسکتی ہے جھوٹی غیرت اس کا راستہ نہیں روک سکتی۔ اللہ کے علاوہ کسی کو اس کی نگرانی کا حق نہیں۔

جذبات واحساسات اور عام مصلحتوں کا خیال رکھتے ہوئے مردوں کو آداب نفس اور آداب جماع کے سلسلہ میں کچھ ہدایات دی گئی ہیں۔ دوران عدت بیتی زندگی کی یادیں تازہ ہوتی ہیں مرنے والے کے خاندان کے جذبات کا بھی خیال ہوتا ہے اس لیے صراحت کے ساتھ ازدواجی تعلقات کے اظہار سے منع کیا گیا ہے۔ ہاں اشارے کنائے میں بات کرنے کی اجازت ہے۔ اللہ جانتا ہے کہ جنسی رغبت پر قابو پانا انسان کے بس میں نہیں، فطری میلان اصلاً حلال ہے اسلام فطری میلان کو دباتا نہیں بلکہ اسے مہذب بناتا ہے اس لیے وہ چیز منع ہے جو ضمیر کی پاکیزگی اور شعور کی نظافت کے منافی ہو۔ نہ منگنی کی طرف اشارہ میں کوئی حرج ہے اور نہ نفسی رغبت کے اظہار میں کوئی حرج ہے حرج ہے تو عدت گزرنے سے پہلے چوری چھپے معاہدہ کرنے میں۔

یہ بھی عورت پر اللہ کی مہربانی ہے کہ رنج والم کے ان لمحات میں عدت گزرنے کے بعد ہونے والے خاوند کی صورت میں اسے امید کی ایک کرن نظر آتی ہے لیکن یہ سب کچھ اشارے اور کنائے سے ہوتا

Marfat.com

چاہیے کیونکہ صراحت عدت کے تمام آثار مٹا دیتی ہے۔ اللہ جانتا ہے کہ تم اپنا ماضی الضمیر چھپانے پر قدرت نہیں رکھتے اور تمہاری زبانوں پر عورتوں کا ذکر لازماً آئے گا۔ اس لئے اس پر کوئی گرفت نہیں لیکن یہ روا نہیں کہ تم ان سے ملو اور چھپ چھپ کر باتیں کرو یا پوشیدہ طور پر نکاح کا قول و اقرار کرو، اس سے شکوک و شبہات پیدا ہوں گے اور لوگوں کو باتیں بنانے کا موقع ملے گا۔ جب بات کرو تم لوگوں کی موجودگی میں بات کرو تاکہ کسی کو باتیں بنانے کا موقع نہ ملے۔ دوسرے عدت کے دوران عورت صحیح فیصلہ کرنے کی صلاحیت سے محروم ہوتی ہے اس لئے صراحت کے ساتھ نکاح کا ذکر کرنا مناسب نہیں ہوتا۔ اپنا ارادہ ظاہر کرنے میں کوئی حرج نہیں مگر اس طرح نہیں کہ وہ عہد و پیمان کی شکل اختیار کر لے۔

زیر نظر آیت میں عـرّضتم کا صیغہ استعمال ہوا ہے عربی میں اشارۃً بات کرنے کو تعریض کہتے ہیں اس کا مادہ عرض ہے اور عرض کسی چیز کے کنارے یا طرف کو کہا جاتا ہے۔ تعریض کے بنیادی معنی یہ ہیں کہ کسی کلام کو اس کے راستہ سے ہٹا کر ایک طرف کھینچ لیا جائے۔ گویا کہ وہ مقصد کے گرد گھوم رہی ہو اسے ظاہر نہ کرے۔ تعریض تصریح کے مقابل ہے۔ تعریض مقصود پر بھی دلالت کرتی ہے اور غیر مقصود پر بھی۔ مگر قرائن کی وجہ سے وہ مقصود پر نسبتاً زیادہ دلالت کرتی ہے مثلاً ایک محتاج کسی غنی کے پاس آتا ہے اور یہ کہتا ہے کہ میں تو سلام کرنے اور آپ کا دیدار کرنے حاضر ہوا تھا، دراصل وہ اپنی ضرورت پوری کرنے آتا ہے، مخاطب اس کی بات قرینے کی بنا پر سمجھ لیتا ہے۔ کنایہ اور تعریض میں فرق ہے۔ کنایہ یہ ہے کہ کسی چیز کا ذکر اس کے لئے مخصوص لفظ استعمال کئے بغیر صرف لوازمات کا ذکر کر دیا جائے جیسے عربی میں کنایۃً دراز قد کو طویل النجاد (لمبے پرتلے والا) یا سخی کو کثیر الرماد (زیادہ راکھ والا) کہا جاتا ہے جبکہ تعریض میں کسی چیز کا ذکر ان الفاظ میں کیا جاتا ہے جو اس پر دلالت کرتے ہیں۔ آیت میں اسی بات کی اجازت دی گئی ہے۔ قرآن کریم نے عدت کے دوران جس بات کی اشارۃ اجازت دی ہے اسے قول معروف سے تعبیر کیا ہے یعنی ایسا قول جو اس طرح کے حالات میں دستور کے مطابق ہو، مفسرین نے صحابہ اور تابعین کی سند سے جن تعبیرات کا ذکر کیا ہے وہ درج ذیل ہیں۔ تو خوبصورت ہے، تیرے اندر میرے لیے خیر ہے، میں چاہتا ہوں کہ مجھے کوئی صالح عورت ملے، تجھ میں کئی آدمی دلچسپی رکھتے ہیں، میں بھی دلچسپی رکھتا ہوں، میں چاہتا ہوں کہ اللہ میرے اور تیرے درمیان زمین ہموار کرے، جب تمہاری عدت پوری ہو جائے تو مجھے بتانا، تو مجھے بہت عزیز ہے۔ سند کے طور پر امام طبری نے حدیث کا

Marfat.com

حوالہ دیا ہے کہ ام سلمہ اپنے چچازاد بھائی ابو سلمہ کے نکاح میں تھیں وہ فوت ہو گئے۔ اللہ کے رسول ان کے پاس آ کر اللہ کے یہاں اپنے مرتبہ و مقام کا ذکر کرتے رہے۔ وہ ہر بات چٹائی پر بیٹھ کر کرتے اور بات کرتے وقت اپنے بازو پر اس قدر دباؤ ڈالتے کہ چٹائی کے نشان آپ کے ہاتھ پر پڑ جاتے۔ آپ اشارۃً پیغام دیتے رہے۔

آیت میں لفظ خطبہ سے مراد یا تو اہم معاملہ ہے محاورہ میں کہا جاتا ہے ماذا خطبك یعنی ماشانك مطلب تمہاری حالت، کیفیت اور معاملہ کیا ہے؟ کہا جاتا ہے: خطب فلان فلانة یعنی فلاں مرد نے فلاں عورت کے دل کے معاملات کے بارے میں سوال کیا یا یہ خطاب سے ہے یعنی بات کرنا۔ کہا جاتا ہے خطب المرأة خطبة 'اس نے عورت سے نکاح کے بارے میں بات کہی' النساء میں الف لام عہد کے لیے ہے یعنی اس سے مراد وہ عورتیں ہیں جو بیوہ ہوں۔ خطبة (منگنی) کے اعتبار سے عورتوں کی تین قسمیں ہیں۔

۱۔ جن کے ساتھ منگنی کی بات تصریحاً بھی کی جا سکتی ہے اور تعریضاً بھی۔ ایسی تمام عورتیں جن کے خاوند نہ ہوں اور نہ ان کے خاوند وفات پا چکے ہوں جب ان کے ساتھ نکاح جائز ہے تو منگنی کیسے جائز نہ ہو گی۔ صرف ایک استثنا ہے کہ رسول ﷺ کے قول کے مطابق کسی کی منگنی پر منگنی نہیں کرنی چاہیے۔

۲۔ وہ عورتیں جن سے نہ تصریحاً منگنی جائز ہے نہ تعریضاً، وہ تمام عورتیں جو دوسرے کی منکوحہ ہوں یا عدت رجعی میں ہوں۔

۳۔ جن کے لیے صرف تعریض جائز ہے۔ اس میں دو قسم کی عورتیں شامل ہیں ایک وہ جو غیر رجعی عدت میں ہوں یا اُن کے خاوند فوت ہو چکے ہوں۔ آیت کا آغاز منگنی کے لیے تعریض کی اجازت دیتا ہے اور انجام تصریح سے منع کرتا ہے۔ مرد کو عدت سے گزرنے والی عورت سے صراحتاً یہ نہیں کہنا چاہیے کہ میں تجھ سے شادی کروں گا، تجھ سے نکاح کروں گا یا تیرا ہاتھ مانگتا ہوں۔

اوا کننتم فی انفسکم (یا اپنے دل میں پوشیدہ رکھو) یعنی یا تو اشارے سے کوئی بات کرے یا کوئی بات نہ کرے صرف دل میں چھپائے رکھے۔ اسی بارے میں سدی کا قول ہے کہ آدمی عدت سے

Marfat.com

گزرنے والی عورت کے پاس آئے۔ سلام کرے اگر چاہے تو کوئی ہدیہ پیش کرے اور منہ سے کچھ نہ کہے۔ یا اس سے مراد ہے کہ اپنے دل میں نکاح کا ارادہ کرے۔

ان تمام تفسیروں سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ عورتوں کے پاس جانا ان کو سلام کرنا اور شادی کی غرض سے کوئی ہدیہ پیش کرنا عدت کے دوران اشاروں کنایوں میں شادی کا پیغام دینا اور عدت کے بعد صراحت کے ساتھ نکاح کا پیغام دینا جائز ہے اور سنت نبوی ہے۔

ولکن لاتواعدوھن سرا (لیکن تم چوری چھپے ان سے عہد و پیاں نہ باندھو)۔ حسن سے روایت ہے کہ ایک آدمی (بیوہ) عورت کے پاس آتا، وہ نکاح کا اشارہ کرتا اور کہتا مجھ سے مباشرت کرو، جب عدت پوری ہوگی میں تم سے نکاح کروں گا۔ اللہ نے اس سے منع کیا ہے۔ امام طبری نے حضرت ابن عباس سے بھی اسی قسم کی روایت کی ہے اسی لئے بہت سے تابعین نے یہاں سرّ کے معنی زنا کے لئے ہیں۔ امام طبری فرماتے ہیں کہ عرب عدت میں مباشرت کو سّر کہتے ہیں کیونکہ یہ مرد اور عورت کے درمیان چھپ کر ہوتی ہے علانیہ نہیں ہوتی جس کی دوسروں کو اطلاع ہو۔ چھپانے کی وجہ سے اسے سرّ کہا گیا ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ ان سے مباشرت کا وعدہ نہ کرو کہ اگر میں تجھ سے شادی کروں گا تو ایسا ایسا کروں گا۔ یعنی ایسی باتیں کرے جو لحاف کے نیچے کی جاتی ہیں یعنی مخفی گفتگو نہیں کرنی چاہیے۔

علم للہ انکم ستذ کرونھن۔ فاذکروھن (اللہ جانتا ہے کہ تم کو ان کا خیال آئے گا سو تم ان کا خیال کرو) اسی قسم کا اللہ کا قول ہے علم اللہ انکم کنتم تختانون انفسکم (اللہ جانتا ہے کہ تم اپنے آپ سے خیانت کر رہے تھے) یعنی جس طرح رمضان کی راتوں میں تم اپنے اوپر پابندی عائد کر کے اپنے جنسی میلان کو دبانے کی کوشش کر رہے تھے اور اس میں کامیاب نہیں ہو رہے تھے اب بھی ان عورتوں کا خیال نہ کر کے اپنے جنسی جذبات کو دبانے میں کامیاب نہیں ہو گے اس لیے ان کا خیال کرو یہ عین فطرت ہے اور قرآن فطرت کو دباتا نہیں۔

Marfat.com

نَفُس

لغوی مفہوم

ابن فارس۔ نے معجم المقاییس میں اور فیومی نے المصباح المنیر میں نفس کے بنیادی معنی 'خون' لکھے ہیں اور اسی سے عربوں کا قول ہے: 'لا نفس له سائلة'، 'اس کا خون بہنے والا نہیں' یا 'دفق نفسہ اس کا خون اچھل کر نکلا'۔ اس سلسلہ میں اکثر اہلِ لغت نے النخعی سے مروی ایک حدیث نقل کی ہے: 'مالانفس له سائلة فانه لا ینجس الماء اذامات فیه'، 'جس کا خون بہہ نہ رہا ہو اگر وہ پانی میں مرجائے تو وہ اسے ناپاک نہیں کرتا'۔ زچہ کو خون کی وجہ سے نفساء کہا جاتا ہے۔

امام راغب نے المفردات میں اس کے بنیادی معنی روح لکھے ہیں اور دلیل کے طور پر قرآن کی یہ آیت پیش کی ہے: 'أَخْرِجُوا أَنفُسَكُمُ' (الأنعام ۶:۹۳) 'نکال لو اپنی جانیں (ارواح)' جبکہ الصحاح، القاموس المحیط اور المنجد نے روح اور خون دونوں کو بنیادی معنی قرار دیا ہے اور دلیل کے طور پر یہ محاورہ پیش کیا ہے 'خرجت نفسه' اس کی روح نکل گئی۔

جسم پر بھی نفس کا اطلاق ہوتا ہے جیسا کہ الصحاح میں لکھا ہے۔ عربوں کا قول ہے: هو عظیم النفس وہ بڑے جسم کا ہے۔ اس قاعدہ کو پیش نظر رکھنا چاہیے کہ اگر نفس روح کے معنوں میں ہو تو وہ صرف مؤنث استعمال ہوتا ہے جیسے اللہ کا قول ہے: 'خَلَقَكُم مِّن نَّفْسٍ وَاحِدَةٍ' (نساء ۴:۱)، 'اس نے تمہیں ایک روح یا جرثومہ حیات سے پیدا کیا' لیکن اگر نفس سے مراد شخص ہو تو بقول ابن شحنہ، وہ محض مذکر استعمال ہوگا جیسا کہ 'عندی خمسه عشر نفسا یا عندی ثلاثة أنفس' میرے یہاں پندرہ یا تین شخص ہیں۔ مقامِ حیرت ہے کہ اس واضح قاعدہ کی موجودگی میں ہمارے مفسرین سورۃ نساء کی مذکورہ آیت میں نفس واحدہ سے مراد آدم کیونکر لیتے ہیں؟

نفس کی جمع أنفس ہے اور نفوس بھی۔

مجازی معنی

قرآن حکیم میں نفس 'عند' (حقیقت) کے معنوں میں استعمال ہوا ہے جیسا کہ اللہ کا قول ہے: 'تَعْلَمُ مَا فِي نَفْسِي وَلَا أَعْلَمُ مَا فِي نَفْسِكَ' (المائدہ ۵:۱۱۶)۔ اس کا ترجمہ ابن سیدہ نے یہ کیا ہے: 'تو جانتا ہے جسے میں چھپا رہا ہوں مگر میں تیری حقیقت کو نہیں جانتا' اس استعمال میں ابن کے معنی کسی چیز

Marfat.com

کے سب اجزاء اور حقیقت کے ہیں چنانچہ قتل فلان نفسہ کے معنی ہیں اس نے پوری کی پوری ذات کو اور اس کی حقیقت کو ہلاک کر دیا۔ نفس الأمر سے مراد حقیقۃ الأمر ہے۔ اسی طرح نفس عقوبت اور غضب کے معنوں میں بھی استعمال ہوا ہے جیسے 'وَيُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَهٗ' (آلِ عمران ۳:۳۰)، 'اللہ تم کو اپنی سزا و غضب سے ڈراتا ہے۔ لفظ نفس قرآن حکیم میں اُخ کے معنوں میں یوں استعمال ہوا ہے: 'فَإِذَا دَخَلْتُم بُيُوتاً فَسَلِّمُوا عَلَى أَنْفُسِكُمْ' (النور ۲۴:۶۱)، 'جب تم گھروں میں داخل ہو تو اپنے بھائیوں کو سلام کر لیا کرو'۔ مجازاً نفس نظر بد کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے جیسا کہ أصابته نفس کے معنی ہیں أصابته عين 'اسے نظر بد لگ گئی'۔ چنانچہ بد نظر والے کو نافس کہا جاتا ہے۔ نفس ارادے کے معنوں میں مجازاً استعمال ہوتا ہے جیسے کہا جاتا ہے: في نفسي أن أفعل كذا 'میرا ارادہ ہے کہ میں ایسا کروں'۔ رائے کے معنوں میں بھی لفظ نفس مجازی طور پر استعمال ہوتا ہے۔ عربوں کا قول ہے: 'فلان يؤامر نفسيه و يشاورهما'۔ 'فلاں اپنے ارادے میں متردد ہے اور اس کی دو رائے ہیں اور کسی پر استقلال نہیں'۔ یہ اس وقت کہا جاتا ہے جب کوئی کسی ناپسند چیز کو کرنے کا ارادہ کرتا ہے۔ حکم دینے والی رائے کو ایک نفس اور روکنے والی رائے کو دوسرا نفس کہا گیا ہے جیسا کہ شاعر کا مصرع ہے۔ ع يؤامر نفسيه وفي العيش فسحة 'وہ دونوں نفوں (رایوں) سے مشورہ کرتا ہے حالانکہ زندگی میں بڑی گنجائش ہے'۔ نفس کا لفظ عظمت، عزت، ہمت اور غیرت کے معنوں میں مجازاً بولا جاتا ہے رجل ذو نفس یعنی عظیم اور دلیر آدمی۔

نفس اور روح

کچھ اہلِ لغت کا خیال ہے کہ نفس اور روح دو مختلف چیزیں ہیں۔ نفس کا اطلاق مادی جسم پر ہوتا ہے جبکہ روح ایک لطیف جوہر ہے جو عنصری اجسام سے مشابہت نہیں رکھتا۔ روح نورانی اور آسمانی ہے اور اپنے متصل اجسام کی ماہیت سے متضاد ہے۔ جب روح بدن کثیف سے ملتی ہے تو بدن زندہ ہو جاتا ہے اور جب اس سے جدا ہوتی ہے تو وہ مر جاتا ہے۔ روح غیر متغیر ہے اور نفس تغیر پذیر۔ اللہ نے قرآن میں فرمایا ہے: 'نَفَخْتُ فِيهِ مِن رُّوحِي' (الحجر ۱۵:۲۹) 'میں نے اس خاکی پتلے میں اپنی روح پھونکی' مگر یہ نہیں کہا کہ 'نفخت فيه من نفسي'، 'میں نے اس میں اپنا نفس پھونکا'۔ ابن سیدہ نے المخصص (السفر الثانی ص:۱۴۰) میں لکھا ہے کہ نفس اور روح میں فرق ہے اور ایک حدیث کا حوالہ دیا ہے: 'لكل انسان نفس و روح أما النفس فتموت وأما الروح فيفعل به كذا و كذا'، 'ہر انسان کا ایک نفس اور ایک روح ہے۔ نفس کو موت لاحق ہو جاتی ہے مگر روح کے ساتھ ایسا ایسا کیا جاتا ہے'۔

Marfat.com

اس نقطۂ نظر کے مطابق روح انسان کو نیکی پر آمادہ کرتی ہے اسے سیدھا راستہ دکھاتی ہے جبکہ نفس اسے ورغلاتا اور بہکاتا ہے اور اعلیٰ اقدار کو چھوڑ کر وقتی مصلحتوں کی دعوت دیتا ہے۔ لفظ نفس اجسام کے ساتھ مخصوص ہے اور موت بھی جسمانی زندگی کے ساتھ مخصوص ہے جبکہ ارواح مجردہ پر موت وارد نہیں ہوتی۔

اکثر اہلِ لغت کے نزدیک نفس اور روح ہم معنی ہیں اگر فرق ہے تو بس اتنا کہ نفس مؤنث ہے اور روح مذکر۔ اس کا اطلاق انسانی شخصیت کے ظاہری اور باطنی پہلوؤں کے مجموعہ پر ہوتا ہے۔ نفس مایۂ عقل ہے اور روح مایۂ حیات۔ ابن منظور نے لسان العرب میں ابن خالویہ، ابن بری اور ابوبکر الانباری کی رائے کو تائیداً پیش کیا ہے اور حضرت عباس کا قول نقل کیا ہے: 'لکل انسان نفسان احداھا نفس العقل الذی یکون بہ التمیز والأخری نفس الروح الذی بہ الحیاۃ'، 'انسان کے دو نفس ہوتے ہیں ایک نفس عقل جو وجہ تمیز ہے دوسرا نفس روح جو وجہ حیات ہے' یعنی دونوں کو نفس کہتے ہیں کہ ایک نفس تمیز جس میں اچھے برے کی تمیز کی صلاحیت ہوتی ہے اور دوسرا نفس روح یا نفس حیاۃ جو وجہ حیات ہے۔ اس کی سب سے بڑی دلیل اللہ کا قول ہے: 'اَللّٰہُ یَتَوَفَّی الْاَنْفُسَ حِیْنَ مَوْتِھَا' (الزمر ۳۹:۴۲)، 'نفس تمیز سوتے وقت انسان سے الگ ہوجاتا ہے اور اسے اس کا شعور تک نہیں ہوتا'۔ اللہ اسے قبض کر لیتا ہے' اور نفس حیات کے زائل ہونے سے زندگی زائل ہو جاتی ہے اور اللہ اسے صرف موت کے وقت قبض کرتا ہے۔ یہی فرق ہے سونے والے کے نفس کی توفی (مرنے) میں اور زندہ کے نفس کی توفی میں۔

نفس تمیز، عقل، علم اور قلب کے معنوں میں بھی آتا ہے۔ یہ نفس انسانی تدبیر و تفکر، اختیار اور ارادے کا مرکز ہے اس کا حکم انسانی اقوال و افعال پر چلتا ہے۔ اس کی رہنمائی اور نشو و نما نفس روح ان احکام الٰہی کی روشنی میں کرتا ہے جو انبیاء کی وساطت سے بذریعہ وحی ملتے ہیں۔ اسی نفس کو اللہ تعالیٰ نے روحنا یا نفخ فیہ من روحہ کہا ہے۔ قرآن نے روحِ انسانی کا ذکر نہیں کیا بلکہ اللہ کی روح (Divine vitality) کا ذکر کیا ہے۔ جب یہ انسان کو عطا کی جاتی ہے تو اسے قرآنی اصطلاح میں نفس کہا جاتا ہے (۹۱:۷تا۹)۔

نفس روح نفس شریعت ہے جو اللہ کا امرِ عظیم ہے اور اللہ نے اس کی قسم کھائی ہے اور لا أعلم مافی نفسک میں اسی نفس کو اپنی طرف منسوب کیا ہے یہ نہ تو تغیر پذیر ہے اور نہ اسے موت آتی ہے بلکہ یہ نئی زندگی کی نوید سناتا ہے: 'کُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَۃُ الْمَوْتِ' (آلِ عمران ۳:۱۸۵) اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کیونکہ چکھنے والا مزا چکھنے کے بعد نابود نہیں ہوتا بلکہ باقی رہتا ہے۔ نفس روح نفس تمیز کو

Marfat.com

مضبوط کرتا ہے کیونکہ نیکی سے نفس انسانی میں قوت پیدا ہوتی ہے اور برائی ضعف کا باعث بنتی ہے۔
چنانچہ لفظ نفس کا اطلاقِ ذات انسان پر ہوتا ہے جو جسم اور روح سے مرکب ہے۔ قرآن حکیم نے جسے نفس کہہ کر پکارا ہے وہ دراصل ذات انسانی ہے جسے جدید اصلاح میں (Psyche) سائیکی کہا جاتا ہے۔
قرآن نے نفس کی مادی اور غیر مادی صلاحیتوں کو فجور اور تقویٰ سے تعبیر کیا ہے۔ اللہ کا قول ہے: 'فَأَلْهَمَهَا فُجُورَهَا وَتَقْوَاهَا' (الشمس ۹۱:۸) 'پس اس نفس میں ڈال دی برائی اور تقویٰ'۔ قرآن نے اس نفس کی صلاحیتوں کے نشوونما کا حکم دیا ہے تاکہ وہ صلاحیتیں دبی نہ رہیں۔ اللہ کا ارشاد ہے: 'قَدْ أَفْلَحَ مَن زَكَّاهَا ۝ وَقَدْ خَابَ مَن دَسَّاهَا' (الشمس ۹۱:۹ تا ۱۰) 'جس نے اس نفس کو آلائشوں سے پاک کیا وہ کامیاب رہا اور جس نے اسے دبا کر رکھا وہ ناکام رہا'۔
نفس انسانی یا ذات انسانی ہر پیدا ہونے والے بچے کے لیے خواہ وہ نر ہو یا مادہ قدرت کا عطیہ ہے۔ اسی کی بنیاد پر اسے قابلِ احترام سمجھا جاتا ہے اور یہی اس کے لیے وجہ فضیلت ہے اور ارشاد ہے: 'ولقد کرمنا بنی آدم' (بنی اسرائیل ۱۷:۷) 'یقیناً ہم نے اولاد آدم کو بڑی عزت دی'۔ اختیار اور ارادہ ذات انسانی کی خصوصیت ہے اور اسی سے اس کی انفرادیت قائم ہے۔ کسی کے ارادے اور اختیار کو چھین لینا اسے شرف انسانیت سے محروم کر دینے کے برابر ہے۔ یہ اختیار اور ارادہ اللہ کے اختیار اور ارادے کے دائرے کے اندر ہونا چاہیے کیونکہ مطلق اختیار اور ارادہ اسی ذات کو حاصل ہے۔ انسان ہر عمل اپنے اختیار اور ارادے سے کرتا ہے اس لیے اس کے عمل کا اثر اس کی ذات پر مرتب ہوتا ہے۔ اللہ کا قول ہے: 'وَلَا تَكْسِبُ كُلُّ نَفْسٍ إِلَّا عَلَيْهَا' (الأنعام ۶:۱۶۵) 'جو شخص بھی کوئی عمل کرتا ہے اس کا اثر اسی پر ہوتا ہے کوئی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھاتا۔ ہر نفس کو اپنے اعمال کا خمیازہ خود بھگتنا پڑتا ہے'۔ نفس خواہ مرد کا ہو یا عورت کا وہ اختیار ارادہ اور انفرادیت کی بنیادی خصوصیات کا حامل ہوتا ہے۔ ہر ذات بذاتہ قائم ہے کسی دوسرے سہارے کی محتاج نہیں وہ صاحب اِختیار و ارادہ ہے۔

نفس انسانی کی انفرادیت۔ قرآن کی آخری آیت

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: 'ثُمَّ تُوَفَّىٰ كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ' (البقرة ۲:۲۸۱) 'ہر نفس کو اس کے اعمال کا پورا پورا بدلہ دیا جائے گا اور ان پر ظلم نہیں کیا جائے گا'۔
امام طبری نے اپنی تفسیر جامع البیان میں ابن عباس کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ یہ قرآن کریم کی آخری آیت ہے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی اس کے بعد آپ صرف نو راتیں زندہ رہے۔ ہفتہ کے روز مرض کی وجہ سے لوگوں کی نظروں سے اوجھل ہوئے اور اگلے ہفتہ کے روز باہر نکلے پھر سوموار

Marfat.com

کو اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔ اس آیہ مبارکہ میں ایک اہم نکتے کا ذکر ہے۔ ایک تو یہ کہ ہر انسان اپنے عمل کا خود ذمہ دار ہے اور اسے اپنے کیے کی سزا خود بھگتنا پڑے گی، اس کا عذاب اللہ کی طرف سے ظلم شمار نہ ہوگا۔ جو ذات رحمان و رحیم ہے وہ اپنے بندے پر عذاب نازل کرنا نہیں چاہتی۔ اللہ نے اسے اختیار، ارادہ اور قوت عطا کی اور مہلت بھی دی اگر کوتاہی ہوئی تو صرف اس کی طرف سے۔ اس نے خود اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالا۔ نفوسِ انسانی میں مرد اپنا بوجھ خود اٹھائیں گے اور عورتیں اپنا بوجھ خود، ہر ایک منفرد ہے کوئی کسی کا تابع نہیں۔

کوئی نفس اپنی طاقت سے بڑھ کر کسی چیز کے لیے مکلّف نہیں

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: 'لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ' (البقرة ۲:۲۸۶)، 'اللہ تعالیٰ کسی نفس انسانی کو اس کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا، جو نیکی اس نے کی وہ اس کے لیے اور جو برائی اس نے کی وہ اس کے خلاف ہے'۔ آیت مبارکہ کے پہلے حصے میں ایک بنیادی اصول مقرر کیا گیا ہے کہ اپنی رحمت و شفقت اور فضل و کرم کے باعث اللہ نے انسانوں کو کسی ایسی بات کا مکلف نہیں کیا جو ان کی طاقت سے بڑھ کر ہو۔ عربی زبان میں وُسع سے مراد وہ چیز ہے جس پر انسان قدرت رکھتا ہے اور اس کو سرانجام دیتے ہیں کوئی تنگی یا مشقت محسوس نہیں کرتا۔ وُسع مشقت میں جہد سے فزوں تر ہوتا ہے۔ قرآن نے تین مختلف مقامات پر اس اصول کو بیان کیا ہے۔

ارشاد ہے: 'يُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّخَفِّفَ عَنْكُمْ' (النساء ۴:۲۸)، 'اللہ چاہتا ہے کہ تمھارے بوجھ میں تخفیف کرے'۔ پھر ارشاد ہے: 'وما جعل عليكم في الدين من حرج' (۲۲:۷۸)، 'دین کے معاملہ میں تمھیں کسی تنگی میں نہیں ڈالتا'۔ ارشاد ہے: 'يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ' (البقرة ۲:۱۸۵)، 'اللہ تمھارے لیے آسانی چاہتا ہے نہ کہ تنگی'۔ زیر نظر آیت تکلیف مالایطاق کی صریحاً نفی کرتی ہے۔

جو نیکی نفس انسانی کماتا ہے اس کا ثواب اسے ملتا ہے اور جو بدی وہ کماتا ہے اس کا وبال اسی پر پڑتا ہے۔ صاحب اختیار اور صاحب ارادہ نفس اپنے کیے کا خود ذمہ دار ہے۔ وہی مضمون ہے جس کا ذکر سورۂ بقرہ کی اوپر والی آیتوں میں گزر چکا ہے جیسا کہ اللہ کا قول ہے: 'كَفٰى بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيْبًا' (بنی اسرائیل ۱۷:۱۴) آج تو بذاتِ خود اپنے حساب کی جانچ پڑتال کریگا۔ اسی طرح 'وَوُفِّيَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ' (آلِ عمران ۳:۲۵) 'ہر شخص کو اپنے اعمال کی جزا پوری پوری دی جائیگی اور اس پر ظلم نہیں کیا جائے گا'۔

Marfat.com

نفس خواہ مرد کا ہو یا عورت کا آزاد، خود مختار اور صاحب ارادہ اور انفرادیت کا حامل ہے۔ اللہ اس نفس پر اس کی طاقت کے مطابق بوجھ ڈالتا ہے۔ مرد اور عورت کو مساویانہ طور پر عبادات اور معاملات کا حکم دیا گیا ہے اور انھیں مساویانہ طور پر جزا اور سزا کا سزاوار ٹھہرایا گیا ہے۔ وہ اپنے اعمال کے خود ذمہ دار ہیں۔ قرآن نے آدم حوا کی سرگزشت میں اسی برابری کو واضح الفاظ میں بیان کیا ہے۔ ان تعلیمات کی موجودگی میں مرد کی خوبیاں اور عورت کی خامیاں بیان کرنے والے نہ جانے کیوں نفس انسانی کی ان خصوصیات کو فراموش کر رہے ہیں۔ قرآن حکیم نے لفظ نفس اور انسان کے ضمن میں مرد اور عورت کے اوصاف کو مساویانہ طور پر بیان فرمایا ہے اس کے باوصف ہم اپنے سماجی رویوں سے استدلال کرتے ہیں اور وحی کی ہدایت کو خاطر میں نہیں لاتے اور بر سرِ منبر اپنے مرد ہونے کا فخریہ ذکر کرتے ہیں۔

سعودی عرب میں اپنے قیام کے دوران میں نے خطبہ جمعہ کے دوران ایک خطیب کو کہتے سنا: 'والحمد اللہ الذی جعلنا ذکورا وما جعلنا اناثا'، 'شکر ہے اسی ذات کا جس نے ہمیں مرد بنایا عورتیں نہیں بنایا'۔ یہ نقطہ نظر قطعی غیر اسلامی اور غیر قرآنی ہے۔ قرآن میں جا بجا اس بات کا ذکر ہے کہ اس نے اپنی مخلوق میں مرد بھی بنائے اور عورتیں بھی۔ بلکہ دونوں کو ایک دوسرے کے اختلاط سے پیدا کیا۔ کسی ایک مقام پر بھی نہ تو مردوں کی گن گائے گئے ہیں اور نہ عورتوں کی ذات میں کیڑے نکالے گئے ہیں۔

کیا نفس ہی روح ہے؟

قرآن حکیم میں نفس کا اطلاق بعض مقامات میں صرف روح پر ہوتا ہے جو مایۂ حیات ہے اور بعض مقامات پر اس کا اطلاق ذاتِ انسان پر ہوتا ہے جو جسم اور روح کا مرکب ہے۔ ایک ایسا ہی مقام ہے جس میں نفس کا اطلاق صرف روح پر ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: 'كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ'، 'ہر نفس موت کا ذائقہ چکھنے والا ہے' (آل عمران ۳:۱۸۵)۔ نفس میں مرد اور عورت دونوں کا نفس شامل ہے۔

امام فخر الدین محمد بن عمر الرازی تفسیر کبیر میں فرماتے ہیں کہ یہ آیت اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ 'نفس بدن کی موت کے ساتھ مرتے نہیں اور یہاں نفس بدن کے علاوہ ہے۔ موت انسانی جسم کو تو نقصان پہنچا سکتی ہے مگر ارواح مجردہ پر موت واقع نہیں ہوتی۔ یہاں پر لفظ نفس سے مراد وہ چیز ہے جو مایۂ حیات ہے۔ اس سے مراد جسم نہیں کیونکہ مزا چکھنے والا مزا حاصل کرنے کے بعد لازمی طور پر باقی رہتا ہے۔ جو چکھتا ہے وہ تو موجود ہوتا ہے۔ مردہ تو مزا چکھ نہیں سکتا کیونکہ چکھنا ایک شعور ہے۔ اس خاص حالت سے مراد روح کا جسم سے الگ ہونا ہے۔ شعور نفس کا خاصہ ہے جہاں تک جسم کا تعلق ہے وہ تو شعور سے عاری ہوتا ہے کیونکہ مر چکا ہوتا ہے۔ حکماء کا قول ہے کہ جسم میں رطوبت بھی ہوتی ہے اور

Marfat.com

حرارت بھی۔ حرارت رطوبت کی تحلیل پر اثر انداز ہوتی رہتی ہے۔ رطوبت کم ہوتی ہے تو حرارت بھی کمزور پڑ جاتی ہے۔ اس طرح یہ سلسلہ چلتا رہتا ہے یہاں تک کہ اصلی رطوبت لوٹ آتی ہے اور حرارت غریزی ٹھنڈی پڑ جاتی ہے تو موت واقع ہو جاتی ہے۔ ارواح مجردہ پر موت اس لیے واقع نہیں ہوتی کیونکہ وہاں نہ رطوبت ہوتی ہے اور نہ حرارت'۔ صاحب البحر المحیط نے امام رازی کے قول کی تردید کرتے ہوئے کہا ہے کہ آیت ظاہری طور پر اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ نفس مرجاتے ہیں۔

نفس واحدہ سے تخلیق

سب سے پہلے قرآن حکیم میں واردان تمام آیات کا تذکرہ ہوگا جن میں نفس واحدہ کا ذکر موجود ہے۔ نفس واحدہ کے بارے میں قدیم وجدید مفسرین کی رائے اور ان پر اعتراضات کا خارجی اور قرآن حکیم کی داخلی شہادتوں کی روشنی میں ان کا معروضی جائزہ پیش کیا جائے گا۔ عصر حاضر کی نفس واحدہ پر علمی تحقیق کا اختصار کے ساتھ بیان ہوگا۔ حوا کی پیدائش پر گفتگو ہوگی۔ قرآن حکیم کے متعدد مقامات پر نفس سے زوج کی تخلیق کا ذکر ہوگا اور آخر میں نفسِ واحدہ سے تخلیق کی حکمت بیان کی جائے گی۔

۱۔ نفسِ واحدہ کا ذکر سب سے پہلے سورۃ نساء کی اس آیت میں ہوا ہے: 'یَا اَیُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِیْرًا وَّنِسَاءً' (النساء ۴:۱)، 'اے لوگو! اپنے پروردگار سے ڈرو جس نے تمھیں نفس واحدہ نے پیدا کیا اور اسی سے اس کا جوڑا پیدا کر کے ان دونوں سے بہت سے مرد اور عورتیں پھیلا دیں'۔

۲۔ 'وَهُوَ الَّذِیْ اَنْشَاَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ فَمُسْتَقَرٌّ وَّمُسْتَوْدَعٌ' (الأنعام ۶:۹۸)، 'وہ اللہ ایسا ہے جس نے تم سب کو نفس واحدہ سے پیدا (Produce) کیا تمھارے لیے ایک ٹھہرنے کی جگہ ہے اور ایک سپرد ہونے کی'۔

۳۔ 'هُوَ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّجَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا لِیَسْكُنَ اِلَیْهَا فَلَمَّا تَغَشّٰهَا حَمَلَتْ حَمْلًا خَفِیْفًا فَمَرَّتْ بِهٖ فَلَمَّا اَثْقَلَتْ دَّعَوَا اللّٰهَ رَبَّهُمَا لَئِنْ اٰتَیْتَنَا صَالِحًا لَّنَكُوْنَنَّ مِنَ الشّٰكِرِیْنَ o فَلَمَّا اٰتٰهُمَا صَالِحًا جَعَلَا لَهٗ شُرَكَآءَ فِیْمَا اٰتٰهُمَا' (الأعراف ۷:۱۸۹ تا ۱۹۰)، 'وہ اللہ جس نے تم سب کو نفس واحدہ سے پیدا کیا اور اُس سے اس کا جوڑا بنایا تا کہ وہ اس سے سکون حاصل کرے پھر جب اس نے اس سے قربت کی تو اس کو حمل رہ گیا ہلکا سا۔ اس کو لیے پھرتی رہی پھر جب وہ بوجھل ہو گئی تو دونوں اللہ سے جو

Marfat.com

ان کا رب ہے دعا کرنے لگے کہ اگر تو نے ہمیں صحیح وسالم اولاد دے دی تو ہم خوب شکر گزاری کریں گے۔ سو جب اللہ نے ان کو صحیح سالم اولاد دے دی تو اللہ کی دی ہوئی چیز میں وہ دونوں شریک ٹھہرانے لگے'۔

۴۔ 'خَلَقَكُم مِّن نَّفْسٍ وَاحِدَةٍ ثُمَّ جَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَأَنزَلَ لَكُم مِّنَ الْأَنْعَامِ ثَمَانِيَةَ أَزْوَاجٍ' (الزمر ۳۹:۶)، 'اس نے تم سب کو نفسِ واحدہ سے پیدا کیا پھر اس سے اس کا جوڑا بنایا اور تمھارے لیے چوپایوں کے آٹھ جوڑے اُتارے'۔

۵۔ ان آیات مبارکہ کے علاوہ ایک اور جگہ اس موضوع سے ہٹ کر نفسِ واحدہ استعمال ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: 'مَا خَلْقُكُمْ وَلَا بَعْثُكُمْ إِلَّا كَنَفْسٍ وَاحِدَةٍ' (لقمان ۳۱:۲۸)، 'تم سب کی تخلیق اور مرنے کے بعد اُٹھانا ایسا ہی ہے جیسے کسی نفس واحدہ کا'۔

ان سب آیات مبارکہ میں خطاب کسی خاص شخص سے نہیں بلکہ پوری نوعِ انسانی سے ہے۔ نفسِ واحدہ بھی نکرہ استعمال ہوا ہے یعنی کوئی ایک نفس۔ خاص طور پر آیت نمبر ۵ میں کسی نے نفسِ واحدہ سے مراد آدم نہیں لیا اور نہ ہی مضمون کے اعتبار سے مراد لی جا سکتی ہے۔ آیت نمبر ۲ میں خلق کی بجائے انشا کم کا فعل استعمال ہوا ہے۔ امام رازی نے یہاں قاضی کا قول نقل کیا ہے کہ 'انشا کم اور خلقکم' میں فرق ہے کیونکہ انشا کم کے معنی ہیں کہ اس نے تمھیں ابتداء پیدا نہیں کیا بلکہ نشوونما کی صورت میں پیدا کیا ہے۔ چنانچہ نباتات کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ انتہا تک ان کی نشوونما کرتا ہے۔ امام راغب مفردات میں کہتے ہیں کہ عموماً انشاء کا لفظ زندہ چیز کے لیے استعمال ہوتا ہے علامہ عبداللہ یوسف علی نے اس کا ترجمہ Create کی بجائے Produce کیا ہے اور اس کی تشریح یہ کی ہے کہ تمھیں بڑھنے، پھلنے، پھولنے اور پختگی تک پہنچنے دیا جو تخلیق کا ایک مرحلہ ہے۔

آیت نمبر ۳ میں نفسِ واحدہ سے جوڑے کی پیدائش کو سکون کا باعث قرار دیا ہے جیسا کہ آیت نمبر ایک میں نفسِ واحدہ سے پیدائش کو تقویٰ کی علت قرار دیا گیا ہے۔

آیت نمبر ۴ میں بتایا گیا ہے کہ نفسِ واحدہ سے جوڑے کی پیدائش کا قانون جیسے انسانوں میں جاری وساری ہے ویسے حیوانات پر بھی یہ قانون چلتا ہے۔ ان تمام آیات میں ایک قدر مشترک ہے کہ ان میں انسان کی ابتداء کا ذکر نہیں جو طین (Clay) سے شروع ہوئی بلکہ انسانی جوڑے اور اس کے بعد کے جنسی عمل کا ذکر ہے۔

سورۃ نساء کا پہلی سورۃ سے ربط یہ ہے کہ جب اللہ نے مشرکین، منافقین، اہلِ کتاب اور مومنین

Marfat.com

کا ذکر کرنے کے بعد بتلایا کہ 'أَنِّي لَا أُضِيعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنكُم مِّن ذَكَرٍ أَوْ أُنثَىٰ بَعْضُكُم مِّن بَعْضٍ' (آلِ عمران ۳:۱۹۵) 'تم میں کسی کام کرنے والے کے کام کو خواہ وہ مرد ہو یا عورت میں ضائع نہیں کرتا (کیونکہ) تم ایک دوسرے کا جزو ہو' گویا ان کو قانون جزا سے آگاہ کر کے یہ بتا دیا کہ پیدائش کے لحاظ سے وہ ایک دوسرے کا حصہ ہیں۔ پھر اس سورۃ کے آغاز میں بھی بتا دیا سب لوگوں کی اصل ایک ہی ہے تاکہ ان میں باہمی محبت، شفقت اور یگانگت کے جذبات پیدا کر کے ان کو بچوں، یتیموں اور عورتوں کے حقوق کی ادائیگی اور ان کے مال کی حفاظت کا حکم دیا جائے۔ سورۃ کے آخر میں بھی اس موضوع کو یہ کہہ کر بیان کیا: 'يَسْتَفْتُونَكَ قُلِ اللَّهُ يُفْتِيكُمْ فِي الْكَلَالَةِ' (النساء ۴:۱۷۰) 'آپ سے فتویٰ پوچھتے ہیں آپ کہہ دیجئے کہ اللہ تمہیں کلالۃ (جس کا باپ زندہ ہو نہ اولاد) کے بارے میں فتویٰ دیتا ہے۔ اس آیت میں اور نہ بعد کی آیات میں تکوین و تخلیق کے مسائل کو بیان کیا گیا ہے اور ان کو بیان کرنا دین کا مقصد بھی نہیں۔

جمہور مفسرین کی رائے ہے کہ آیات مذکورہ میں آدمؑ کے سوا کوئی نفسِ واحدہ نہیں۔ صرف آیت نمبر ۵ (۳۰:۲۸) میں کسی مفسر نے نفسِ واحدہ سے آدم مراد نہیں لیے، کیوں؟ اللہ بہتر جانتا ہے۔ وہ اس بات کو تو تسلیم کرتے ہیں کہ نفس مؤنث ہے اس لیے لفظ کی رعایت سے اس کی صفت واحدہ بھی مؤنث ہے مگر معنوں کی رعایت سے یہ مذکر یعنی آدم کے لیے استعمال ہوا ہے اور خلق منھا میں ضمیر بھی اس کی طرف عائد ہے۔ اس کا استدلال وہ ایک شعر سے کرتے ہیں جو بقول امام طبری فراء نے پڑھا ہے شعر یوں ہے۔

ابوك خليفة ولدته الأخرى

و انت خليفة ذاك كمال

'تمہارا باپ خلیفہ تھا جسے کسی اور خلیفہ نے جنم دیا

کمال تو یہ ہے کہ تو بھی خلیفہ ہے'

وجہ استدلال یہ ہے کہ خلیفہ لفظی لحاظ سے مؤنث ہے کیونکہ اس کے آخر میں تائے تانیث ہے اسی وجہ سے فعل بھی مؤنث استعمال ہوا ہے مگر معنوی لحاظ سے خلیفہ مذکر ہے۔ لگتا ہے یہ شعر کسی شاعر نے کسی خلیفہ کی چاپلوسی کے لیے کہا ہے اور اس میں خلیفہ کو مؤنث استعمال کر کے شاذ اسلوب اختیار کیا ہے۔ ولادت کا تعلق تو ماں سے ہوتا ہے نہ کہ باپ سے مگر شاعر نے لفظ خلیفۃ کی رعایت سے اسے بھی باپ کی طرف منسوب کر دیا تاکہ خلافت کا پیدائشی حق ثابت کیا جا سکے۔ ورنہ لفظ خلیفۃ، طلحۃ اور خزیمۃ کی مانند مذکر استعمال ہوتا ہے۔ عام استعمال میں یہ نہیں کہا جاتا جاءت خليفة کہا جاتا ہے: جاء خليفة

Marfat.com

اس شذوذ کو صاحب لسان العرب نے یوں بیان کیا ہے کہ خلیفہ سلطان اعظم ہے۔ یہ لفظ کبھی کبھی مؤنث استعمال ہوتا ہے اور فراء نے اس شعر کو بطورِ مثال پیش کیا ہے یعنی یہ لفظ خلیفہ کا عام استعمال نہیں۔ امام طبری نے اس شعر کے فوراً بعد کہا ہے کہ اگر معنی کی رعایت سے آیت میں نفس واحدہ کی بجائے نفس واحد ہوتا تو درست ہوتا، معلوم نہیں کہ یہ قول امام صاحب کا اپنا ہے یا فراء کا۔ مگر ہے اللہ کے کلام کو بدلنے کی ایک بھونڈی تاویل۔ اس سے بھی بڑھ کر ابراہیم ابن ابی عبلہ نے قرطبی کے قول کے مطابق نفسِ واحدہ کی بجائے نفسِ واحد قرأت کیا ہے۔ یہ سب اس لیے کہ نفس واحدہ سے مراد آدم لی جائے۔

لغوی تاویل کی ایک اور مثال ہے جس میں مفسرین نے اپنے ہی بنائے ہوئے قاعدے کی کہ نفس ہے تو مؤنث سماعی اس لیے اس کی صفت واحدہ بھی مؤنث ہے مگر معناً اس سے مراد آدم ہے مگر سورۃ اعراف آیت (۱۸۹:۷) لِيَسْكُنَ إِلَيْهَا میں ان کا قول یہ ہے کہ نفس کی صفت واحدۃ مؤنث استعمال کرنے کے بعد یہاں نفس کے لیے نہ کہ آدم کے لیے مذکر کا صیغہ اس لیے استعمال ہوا ہے کہ صرف مرد ہی عورت سے سکون حاصل کر سکتا ہے اس لیے معنوں کے لحاظ سے نفس کے لیے مذکر کا صیغہ ہی بہتر تھا۔ کیا غیر منطقی تاویل ہے۔ قرآن نے مرد کو عورت کا زوج اور عورت کو مرد کا زوج قرار دیا ہے اور دونوں ایک دوسرے سے سکون حاصل کرتے ہیں۔ آیت میں نفس کے لیے مذکر کا صیغہ استعمال کرنے کی یہ توجیہ صاحب کشاف نے پیش کی ہے۔ صاحب روح المعانی نے اس کے برعکس یہ توجیہ کی ہے کہ نفس کی ضمیر مستتر ظاہراً مؤنث ہے کیونکہ مؤنث سماعی ہے لیکن اس سے مراد چونکہ آدم ہیں اس لیے (یہاں) مذکر استعمال ہوئی ہے۔ گویا ایک آیت میں آدم کے لیے مؤنث کی صفت استعمال ہوئی اور دوسری آیت میں اس کے لیے مذکر کا صیغہ۔ کس بات کو مانیں اور کس کو نہ مانیں؟ یہ سب تاویلیں اس لیے کی جا رہی ہیں کہ نفسِ واحدہ سے مراد صرف آدم لیے جائیں۔ اسی لیے وہ سب قواعد کو بالائے طاق رکھتے ہوئے قرآن کے مختلف مقامات پر نفس کی مختلف تاویلیں کرتے ہیں اور ایک شاذ شعر سے استدلال کرتے ہیں گویا اللہ تعالیٰ قرآن حکیم میں بات کرنے کے لیے شاذ اسلوب سے کام لیتا ہے۔ جمہور مفسرین کی رائے کی تائید نہ نص کرتی ہے نہ ظاہر آیت۔ درج ذیل سطور میں اس رائے کے خلاف ہم خارجی اور قرآن حکیم کی داخلی شہادتیں پیش کریں گے اور اس کے بعد بتائیں گے کہ نفسِ واحدہ کیا ہے؟

خارجی شہادت

آیت میں خطاب تمام انسانوں سے ہے۔ اس سے مراد ذہن میں موجود خاص نفس کیسے ہو سکتا ہے جو سب انسانوں کے نزدیک مسلم بھی نہیں۔ کچھ لوگ ایسے ہیں جو آدم و حوا کو جانتے تک نہیں اور انھوں

Marfat.com

نے ان کے بارے میں سنا تک نہیں۔ ہر قوم نفس واحدہ سے وہی مراد لے گی جس پر وہ عقیدہ رکھتی ہے مثلاً اہلِ چین بشر کو کسی اور باپ کی طرف منسوب کرتے ہیں اور ان کی تاریخ عبرانیوں سے بہت پہلی کی ہے۔ عبرانیوں کی تاریخ کا اپنی اصل حالت میں موجود ہونا بھی قابلِ اعتماد نہیں۔ آثارِ قدیمہ کی تاریخ نے بھی اسے مشکوک بنا دیا ہے۔ اس کے علاوہ روح المعانی میں سورۃ نساء کی آیت کے ضمن میں جامع الأخبار کی پندرہویں فصل کے حوالہ سے امام باقر کی روایت سے شیعہ امامیہ کا عقیدہ نقل کیا گیا ہے کہ اللہ نے ہمارے باپ آدم سے پہلے تیس آدم پیدا کیے۔ ان میں سے ہر آدم کے درمیان ایک ہزار سال کا فاصلہ تھا اور دنیا اس کے بعد پچاس ہزار سال بے آباد رہی، پھر پچاس ہزار سال تک آباد رہی، پھر ہمارے باپ آدم کی پیدائش ہوئی۔ شیخ اکبر نے اپنی کتاب فتوحات میں جو عبارت لکھی ہے اس کے مطابق آدم سے چالیس ہزار سال پہلے انسان موجود تھا۔

قرآن حکیم میں کوئی اصولی اور قطعی نص اس بارے میں موجود نہیں کہ آدم ہی انسان اول ہیں۔ قرآن میں انسان کی ابتدا کا ذکر نہیں جو طین سے شروع ہوئی بلکہ انسانی جوڑے کا ذکر ہے اور بعد کے جنسی عمل کا۔ سب سے پہلے یہ تصور عہد نامۂ قدیم، (پیدائش اصحاح دوم آیت ۲۱) میں یوں موجود ہے: 'خدا نے سب سے پہلے آدم کو پیدا کیا اور جب وہ سویا ہوا تھا تو اس کی پسلی سے اس کی بیوی حوا پیدا کی اور اس جوڑے سے تمام نوع انسانی بنائی'۔ ہمیں نبی کریم ﷺ نے یہ تعلیم دی ہے کہ جس بات کے بارے میں قرآنی نص موجود نہ ہو ہم اس میں اہلِ کتاب کی نہ تصدیق کریں اور نہ تکذیب، کیونکہ اس میں دونوں احتمال موجود ہوتے ہیں۔ قرآن حکیم میں لوگوں کو بنی آدم کہہ کر پکارا گیا ہے وہ اس بات کی نص قطعی نہیں کہ نوع بشری آدمؑ کی اولاد ہیں۔ ہاں نزولِ قرآن کے زمانہ میں جن لوگوں سے خطاب کیا گیا ہے وہ تو آدم کی اولاد ہو سکتے ہیں۔ سورۃ البقرۃ کے آغاز میں قصہ آدم کے تذکرہ میں یہ ثبوت موجود ہے کہ آدم سے پہلے ایسے بشر موجود تھے جو زمین پر فساد بپا کرتے تھے اور خون ریزی کرتے تھے۔

سورۃ اعراف کی آیت (۱۸۹:۷) سے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ آدم ابو البشر نہیں تھے یہی وجہ ہے کہ اس آیت کی تفسیر میں مفسرین میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ آدم کے قصہ کا انداز تمثیلی ہے جیسا کہ قفال نے سورۃ اعراف کی آیت کو تمثیل پر محمول کیا ہے۔ جیسا کہ مفتی محمد عبدہ کی رائے تفسیر المنار میں بتائی گئی ہے کہ ہر قوم نفس واحدہ سے مراد وہی لے گی جس پر وہ اعتقاد رکھتی ہے جو یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ عالم بشریت آدم کی اولاد ہیں وہ اس سے مراد آدم لیں گے جیسا کہ اہلِ سنت اور اہلِ کتاب اور جن کا عقیدہ یہ ہے کہ ہر نوع کا باپ الگ ہے وہ اسے اپنے عقیدے پر محمول کریں گے جیسا کہ امامیہ، صوفیا وغیرہ۔ آیت کا

Marfat.com

ظاہر اس بات سے انکار کرتا ہے کہ نفسِ واحدہ سے مراد آدم ہی ہوں خواہ وہ سب انسانوں کے باپ ہوں یا نہ ہوں۔

قرآن کی داخلی شہادت

۱۔ سورۃ نساء کی آیت میں لفظ الناس جمع ہے جس سے پہلے الف، لام استغراق کے لیے آیا ہے یعنی مردوں اور عورتوں سمیت سب لوگ مخاطب ہیں۔ خطاب صرف مردوں کے لیے نہیں جیسا کہ بعض مفسرین نے سمجھا ہے۔ سب کو تقویٰ کا حکم ہے جو سرمایہ بقا ہے۔ اس حکم کی علت نفس واحدہ سے پیدائش ہے۔ نفس واحدہ بھی نکرہ کے صیغہ کے ساتھ بیان ہوا ہے پھر اس سے ایک مخصوص نفس کیونکر مراد لیا جاسکتا ہے پھر سورۃ لقمان کی آیت (۲۸:۳۱) میں نفس واحدہ سے مراد کسی نے آدم نہیں لیا۔

۲۔ لفظ نفس کے بارے میں فیومی نے المصباح المنیر میں پتے کی بات کہی ہے کہ نفس اگر روح کے معنوں میں ہو جیسا کہ اللہ کے قول: 'خلقکم من نفس واحدة' 'تم سب کو نفس واحدہ سے پیدا کیا' تو یہ مونث استعمال ہوتا ہے لیکن اگر اس سے مراد شخص ہو تو مذکر استعمال ہوتا ہے۔ میرے مطالعہ کے مطابق قرآن حکیم میں کہیں بھی نفس مذکر کے صیغہ کے ساتھ شخص کے معنوں میں استعمال نہیں ہوا۔ یہ ذہن میں رہے کہ روح میں ذات، ماہیت، حقیقت اور جوھر کے سب معانی شامل ہیں۔

۳۔ نفسِ واحدہ سے آدم مراد لینے سے یہ مشکل پیش آتی ہے کہ اس طرح قرآنی آیات کا یہ مفہوم لینا پڑتا ہے کہ سب سے پہلے لوگوں کو آدم سے پیدا کیا پھر ان کی بیوی حوا کو ان کے جسم سے پیدا کیا۔ یہ بات ناممکن ہے کیونکہ والدین کا اولاد سے پہلے موجود ہونا لازمی ہے۔ مفسرین نے اس مشکل کو حل کرنے کی دو طرح کوشش کی ہے۔ ایک تو یہ کہ اللہ نے آدم کو پیدا کر کے اس کی پیٹھ پر ہاتھ پھیر کر قیامت تک پیدا ہونے والے سب انسانوں کو نکالا اور ان سے عہدِ الست لیا۔ پھر آدم کو جنت میں ٹھہرایا اور ان کی پسلی سے حوا کو پیدا کیا۔ اس قول کو امام طبری نے صحت سے قریب تر کہا ہے لیکن اس قول سے بھی یہی لازم آتا ہے انسانوں کی روحوں کو نکالا گیا، نہ کہ ان کے جسموں کو۔ جبکہ ان مفسرین کی رائے کے مطابق یہاں انسانوں کے جسموں کی پیدائش ہے نہ کہ ان کی ارواح کی۔ ارواح مراد لینے سے نفس واحدہ سے، ان کے خیال کے مطابق، بشری تخلیق کا نظریہ ہی باطل ہو جاتا ہے، دوسرے انھوں نے وخلق منها زوجها میں صرف واو کی مختلف تاویلیں کر کے

Marfat.com

ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ یہ واو ترتیب زمانی کا فائدہ نہیں دیتی۔ اس کے لیے انہوں نے کئی محذوف مقدر مان کر مفہوم کو اور پیچیدہ بنانے کی کوشش کی۔ عربی کا ایک محاورہ ہے: 'کلام الملوك ملوك الکلام' بادشاہوں کا کلام کلاموں کا بادشاہ ہوتا ہے مگر قرآن تو اس کا کلام ہے جو بادشاہوں کا بادشاہ ہے۔ اس نے تو قرآن کو لوگوں کے لیے آسان بنایا ہے۔ وہ بات کرتے وقت ان لغوی موشگافیوں سے کیسے کام لے سکتا ہے جو عام انسانوں کی فہم سے بالاتر ہوں۔ یہاں تو صریح طور پر معطوف اور معطوف علیہ میں ترتیب زمنی نظر آرہی ہے۔ اس تاویل کو اللہ تعالیٰ نے سورۃ زمر کی آیت (۶:۳۹) میں یہ کہہ کر باطل کر دیا ہے: 'ثم جعل منها زوجها'۔ پھر اس سے اس کا جوڑا پیدا کیا۔ ثم کا حرف تراخی (درازی زمانہ) کا فائدہ دیتا ہے جس سے حرف واو کے بارے میں ترتیب زمانی کی ساری بحث بےکار ہو جاتی ہے۔ قرآن کی ایک آیت دوسری آیت کی تفسیر کرتی ہے چنانچہ حرف ثم سے ظاہر ہوتا ہے کہ سورۃ نساء کی آیت میں حرف واو ترتیب زمانی پر دلالت کرتا ہے۔ اس کے باوجود ہمارے مفسرین یہ ثابت کرنے کے لیے کہ ان کے ذہن میں بیٹھا ہوا تصور ہی صحیح ہے یہاں حرف ثم کے پیچھے پڑ گئے اور اس کی ایسی ایسی تاویلیں پیش کیں جس سے یہی مصرعہ یاد آتا ہے کہ

ع جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے۔

صاحب کشاف حرف ثم کی تاویل کرتے ہوئے فرماتے ہیں "یہ ان نشانیوں میں سے دو نشانیاں ہیں جن کو اللہ نے اپنی وحدانیت اور قدرت پر دلیل کے طور پر پیش کیا ہے۔ اس نے بےشمار انسانی مخلوق کو آدم سے پیدا کیا اور حوا کو اس کی پسلی کی دو ہڈیوں سے پیدا کیا۔ پہلی نشانی کو تو عادت جاریہ کے طور پر جاری رکھا اور دوسری نشانی یعنی آدم کی پسلی سے حوا کی تخلیق کو ترک کر دیا اور دوسری نشانی کے سننے والے کی حیرانی کی خاطر پہلی نشانی پر حرف ثم سے معطوف کر دیا تاکہ پہلی نشانی کا فضل و مرتبہ واضح ہو جائے۔ چنانچہ یہ تراخی مرتبہ و مقام میں ہے نہ کہ وجود میں۔ کیا دور از کار تاویل ہے۔ بات کیا ہو رہی تھی لے کہاں گئے اسی لیے اقبال نے کہا ہے:

ے احکام تیرے حق ہیں مگر اپنے مفسر
تاویل سے قرآن کو بنا دیتے ہیں پاژند

کیا کسی قرآن کے پڑھنے والے کے ذہن میں یہ خیال گزر سکتا ہے جو اس تاویل میں پایا جاتا ہے۔ اول تو پسلی سے حوا کی پیدائش کا قصہ ایک بےاصل افسانہ ہے جس کا قرآن میں قطعاً کوئی

Marfat.com

ذکر نہیں۔اس پر بات بعد میں کی جائے گی۔

سورۃ زمر کی آیت میں مفسرین صاحب کشاف کی غیر منطقی تاویل کے علاوہ عربوں کے روزمرہ کے محاورے سے بھی تاویل کرتے ہیں۔امام طبری فرماتے ہیں کہ عربوں میں اکثر ایک آدمی دوسرے کو دو کاموں کی خبر دیتا ہے اور ان میں سے جو معنی میں پہلے ہوتا ہے۔اس پر ثم لگاتا ہے بشرطیکہ وہ خبر متکلم کی طرف سے ہو مثلاً 'قد بلغني ما كان منك اليوم ثم ما كان منك أمس اعجب'۔'آج آپ نے جو کچھ کیا اس کی خبر مجھ تک پہنچ چکی ہے پھر آپ نے جو کل کیا تھا وہ اس سے بھی حیرت انگیز تھا' یا جیسا کہ 'قد اعطيتك اليوم شيئا ثم الذي اعطيتك أمس اكثر' قرآن کی آیت کو ان دونوں جملوں پر قیاس نہیں کیا جا سکتا کیونکہ ان دونوں جملوں میں خبر کی ترتیب بتائی جارہی ہے اور ثم کے بعد لفظ أمس کا استعمال واضح کر رہا ہے کہ اس کام سے پہلے ایک کام کل ہو چکا ہے جبکہ آیت زیر بحث میں ایسا کوئی قرینہ موجود نہیں کہ لوگوں کے نفسِ واحدہ سے تخلیق سے پہلے بیوی کو پیدا کیا جا چکا ہوں۔آیت میں حرف ثم واضح طور جعل (بنانے یا پیدا کرنے) کی ترتیب پر دلالت کرتا ہے۔

ایک اور توجیہ فراء نے معانی القرآن میں اور صاحبِ کتاب التسهيل نے یہ کی کہ ثم کا عطف واحدۃ کے معنی پر ڈالا جائے یعنی ترجمہ یہ ہو گا اس نے تمہیں نفس سے پیدا کیا جو ایک تھا پھر اس ایک کے بعد اس کو جوڑا بنا دیا۔کتاب التسهيل کے مصنف نے اسی توجیہ کو اختیار کیا ہے اور یہ ہے بھی نفس واحدۃ کے علمی تصور سے قریب تر۔اس کا تذکرہ نفس واحدہ کی علمی تعریف میں ہوگا۔

۴۔ اس بات کا قرینہ کہ نفس واحدۃ سے مراد آدم نہیں اللہ کا یہ قول ہے: 'وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالاً كَثِيرًا وَنِسَاءً' (النساء ۴:۱) آیت کے اس ٹکڑے میں رجال و نساء نکرہ استعمال ہوئے ہیں اور کثیر کہہ کر تاکید کی گئی ہے۔اگر مراد آدم اور حوا ہوتے تو نکرہ کی بجائے جميع الرجال و النساء کہا جاتا یعنی 'سب کی سب عورتیں اور مرد۔نکرہ سے کثرت انواع کی طرف اشارہ ہے۔تثنیہ کے صیغے میں عام میاں بیوی کی طرف اشارہ ہے جو فطرتی طریقے سے افزائش نسل کا باعث بنتے ہیں۔تفسیر المنار میں یہ اعتراض مفتی محمد عبدہ کی طرف منسوب ہے اور یہی بات مولانا ابوالکلام آزاد نے ترجمان القرآن میں کہی ہے۔سورۃ نساء کی آیت (۴:۱) کی تفسیر میں فرماتے ہیں 'جس نے تمہیں اکیلی جان سے پیدا کیا (یعنی باپ سے پیدا کیا) اور اسی سے اس کا جوڑا بنایا (یعنی جس طرح مرد کی نسل سے لڑکا پیدا ہوتا ہے لڑکی بھی پیدا ہوتی ہے) اس آیت کی دوسری تفسیر یہ ہے کہ

Marfat.com

نفس واحدہ سے مقصود حضرت آدم ہیں اور خلق منھا زوجھا سے حوا۔ ہم نے تفسیر مندرجہ متن کو اس لیے ترجیح دی ہے کہ آگے چل کر نکرہ کے ساتھ فرمایا ہے وبث منھما رجالا کثیرا و نساء حالانکہ اگر مقصود آدم ہوتے تو ہونا چاہیے تھا: 'وبث منھما جمیع الرجال والنساء' (۱:۳۵۸)۔

۵۔ سورۂ اعراف کی آیت (۷:۱۸۹) اس بات کی تردید کرتی ہے کہ نفس واحدہ سے مراد آدم ہوں۔ اس کا اردو ترجمہ پیش کر رہا ہوں تاکہ اسے پڑھ کر اس پر غور کیا جائے۔ اللہ کا ارشاد ہے: 'وہ اللہ ایسا ہے جس نے تم کو نفس واحدۃ (ایک جان) سے پیدا کیا اور اس سے اس کا جوڑا بنایا تاکہ وہ اپنے اس جوڑے سے سکون حاصل کرے پس جب اس نے اس جوڑے سے قربت کی تو جوڑے (بیوی) کو ہلکا سا حمل رہ گیا تو وہ اسے لیے چلتی پھرتی رہی پھر جب وہ بوجھل ہو گئی تو دونوں نے اللہ سے جوان کا مالک ہے دعا کی کہ اگر تو نے ہمیں صحیح سالم اولاد دے دی تو ہم شکر گزار ہوں گے۔ سو جب اللہ نے ان دونوں کو صحیح سالم اولاد دے دی تو اللہ کی دی ہوئی چیز میں وہ دونوں اللہ کے شریک ٹھہرانے لگے' (۷:۱۸۹ تا ۱۹۰)۔

دو مربوط آیات ہیں جن کے فعل فاعل اور ضمائر میں ہم آہنگی ہے۔ اگر نفس واحدۃ سے مراد آدم اور جوڑے سے مراد حوا لیے جائیں تو سب افعال کے فاعل وہ دونوں تصور ہوں گے اور سب ضمائر ان کی طرف لوٹیں گی۔ یہ ناممکن ہے کہ ابتدائی حصہ کے فاعل آدم و حوا کو مانا جائے اور بعد کے حصے کے فاعل عام میاں بیوی کو۔ یہی دشواری مفسرین کو ان آیات کی تفسیر میں پیش آئی ہے۔ اگر آدم اور حوا کو فاعل تسلیم کیا جائے تو شرک بھی ان کی طرف منسوب ہوگا جس کا تصور کوئی مسلمان نہیں کر سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ قفال جیسا صاحب بصیرت نفس واحدہ سے مراد آدم نہیں لیتا۔ یہی وجہ ہے کہ مولانا ابوالکلام آزاد نے نفس واحدہ کا ترجمہ اکیلی جان یعنی مورث اعلیٰ کیا ہے اور یہی وجہ ہے کہ مولانا امین احسن اصلاحی نے اس آیت کی تفسیر میں ڈاکٹر رفیع الدین کی کتاب قرآن اور علم جدید کا اقتباس پیش کیا ہے۔ اس اقتباس کو بعد میں نفس واحدہ کے تعریف کی ضمن میں پیش کیا جائے گا۔

نفس واحدۃ

قرآن حکیم کی آیات واضح طور پر دلالت کرتی ہیں کہ انسان کی ابتدا مٹی سے ہوئی۔ مٹی کے مختلف مراحل کو قرآن نے یوں بیان کیا ہے۔ اللہ کا ارشاد ہے: 'وَمِنْ آيَاتِهِ أَنْ خَلَقَكُم مِّن تُرَابٍ ثُمَّ إِذَا أَنتُم بَشَرٌ تَنتَشِرُونَ' (الروم ۳۰:۲۰) اللہ کی نشانیوں میں سے ایک نشانی یہ ہے کہ اس نے تمھیں مٹی

Marfat.com

(dust) سے پیدا کیا۔ اب دیکھو تم بشر کی صورت میں پھیل رہے ہو۔ پھر ارشاد ہے: 'اِنَّا خَلَقْنٰهُمْ مِّنْ طِيْنٍ لَّازِبٍ' (الصافات ۳۷:۱۰) ہم نے ان کو چپکنے والے گارے (Sticky clay) سے پیدا کیا۔ اگلے مرحلہ میں فرمایا: 'وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ' (الحجر ۲۶:۱۵) 'ہم نے انسان کو بجنے والی مٹی سے یعنی ایسے گارے سے جس سے سانچہ بنایا جاتا ہے پیدا کیا'۔ گارے کے اجزاء سے سب سے پہلے خلیہ کا مواد کس طرح یکجا ہوا یہ خدا ہی جانتا ہے۔ سورۃ کہف میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: 'مَا اَشْهَدْتُّهُمْ خَلْقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلَا خَلْقَ اَنْفُسِهِمْ' (۵۱:۱۸) میں نے انھیں زمین و آسمان کی پیدائش اور نہ خود ان کی اپنی پیدائش میں گواہ بنایا۔

زندگی کا پہلا بیج جو مٹی کے اجزاء میں موجود تھا اسے علمی اصطلاح میں (Amoeba) یعنی ایک خلیہ (uni cellular organism) والی ننھی منھی جاندار مخلوق جسے صرف خوردبین سے دیکھا جا سکتا ہے) کہتے ہیں۔ ایمیبا ایک جرثومہ (Life cell) کی شکل اختیار کر لیتا ہے پھر یہ جرثومہ جوش نمو سے دو حصوں میں تقسیم ہو جاتا ہے جیسا کہ بعض کیڑوں (جونک) میں ہوتا ہے جس سے نر اور مادہ کی تقسیم وجود میں آتی ہے۔ اس طرح توالد و تکاثر کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے اور نر اور مادہ کے ملاپ سے روئے زمین پر مرد اور عورتیں پھیل جاتی ہیں۔ ایمیبا تقسیم ہو کر بالکل اسی طرح بڑھتا اور پھیلتا ہے جس طرح ایک بیج سے خوشے کے دانے بڑھتے اور پھیلتے ہیں پھر ان دانوں کے خوشے بنتے ہیں اور ان خوشوں سے دانے اور یہ سلسلہ چل نکلتا ہے۔ ڈاکٹر رفیع الدین نے اپنی کتاب قرآن اور علم جدید میں اس سلسلہ ارتقا کو اس طرح بیان کیا ہے: 'جس انسان کی اولین صورت ایک جونک کی طرح ایک ہی خلیہ (Cell) پر مشتمل تھی اور ایک خلیہ کے توالد کا طریقہ یہ ہے کہ وہ بڑھ کر خود بخود دو حصوں میں تقسیم ہو جاتا ہے جن میں سے ہر ایک حصہ مکمل جاندار ہوتا ہے پھر بدنی ارتقاء کے اگلے مراحل پر ایک حصہ مادہ کے فرائض کے لیے اور دوسرا حصہ نر کے فرائض کے لیے موزوں بن جاتا ہے'۔

اسی ایمیبا کو جو بعد میں جرثومہ کی شکل اختیار کر جاتا ہے قرآن نے نفس واحدہ سے تعبیر کیا ہے جس کا صحیح اردو ترجمہ ایک جان ہے۔ قرآن حکیم میں اس بارے میں آیا پہلا انسانی جوڑا سلسلہ ارتقاء کے نتیجہ میں یا اور کسی منفرد عمل سے ظہور پذیر ہوا جس کے دو واضح اشارے موجود ہیں۔

ایک تو یہ کہ سورۃ اعراف (۱۸۹:۷) اور سورۃ زمر (۶:۳۹) میں خلق کی بجائے جعل منها زوجها کا جملہ استعمال ہوا ہے۔ جعل اور خلق میں فرق یہ ہے کہ خلق سے مراد مخلوق کو ایجاد کرنا ہے جبکہ جعل سے مراد ان خصوصیات کا نمایاں کرنا ہے جو مخلوق میں پائی جاتی ہوں۔ دوسرے یہ کہ نر کی مادہ

Marfat.com

سے علیحدگی کسی بعد کے مرحلہ میں ہوئی یعنی خلق اور جعل کے درمیان ایک طویل عرصہ ہے اور یہی وہ راز ہے جس کی وجہ سے سورۃ زمر کی آیت (۶:۳۹) میں حرف ثم کے ذریعہ جعل کا عطف خلق پر ڈالا گیا ہے۔ حرف ثم تراخی یعنی درازی زمانہ پر دلالت کرتا ہے۔ صاحب البحر المحیط نے اس آیت کی تفسیر میں ایک قول نقل کیا ہے کہ 'اور ثم کے بعد خلق یا جعل منها زوجها کا عطف واحدۃ پر ڈالا جائے۔ اس صورت میں تقدیر عبارت یہ ہوگی یعنی جوڑے کی پیدائش اس نفس سے ہوئی جو اکیلا اور منفرد تھا کیونکہ عرب وحد یحد وحدۃ' کو انفرد کے معنوں میں استعمال کرتے ہیں۔ چنانچہ جملہ ایسے ہو گیا جیسا قرآن میں ہے: 'صٰٓفّٰتٍ وَّیَقْبِضْنَ' (۱۹:۶۷) 'پرندے جو پر پھیلائے ہوئے ہیں اور سکیڑ بھی لیتے ہیں'۔ یہ قول بھی اس بات کی تائید کرتا ہے کہ جرثومہ اولیٰ جس سے آدم کی تخلیق ہوئی وہ اپنی ذات پر تقسیم ہو گیا تو حوا کی پیدائش ہوئی۔

دوسرے یہ کہ سورۃ انعام کی آیت (۹۸:۶) میں خلقکم کی بجائے انشاکم آیا ہے۔ امام رازی نے قاضی کا قول نقل کیا ہے کہ خَلَقَ اور اَنشَا کے درمیان یہ فرق ہے کہ اس نے تمھیں ابتداء سے پیدا نہیں کیا بلکہ نشو و نما اور پرورش سے پیدا کیا ہے، نباتات کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اللہ نے ان کی نشو و نما (انشا) کی یعنی اس کو بڑھایا پھیلایا تاکہ وہ انتہا تک پہنچ جائے۔ یہ قول بھی اس بات کی تائید کرتا ہے کہ جرثومہ حیات ارتقاء کے مراحل طے کرتے ہوئے آگے بڑھا۔

یہ تو ہے نفس واحدہ کی علمی تفسیر۔ عام فہم اور سادہ الفاظ میں نفس واحدۃ عبارت ہے اس حقیقت، اس ماہیت، اس انسانیت اور اس مادہ سے جس سے انسان وجود میں آیا۔ لوگوں کو اس اصل کی یاد دلائی گئی ہے جس سے وہ نکلے ہیں اور ان کی توجہ اس خالق کی طرف مبذول کرائی گئی ہے جس نے جرثومہ حیات سے ان کی نشو و نما کر کے ان کو کامل انسان بنایا اور اسی مادہ سے اس کا جوڑا بنایا اور ان کو تمدن کی طرف رواں کیا۔ جب انسان اس حقیقت کو بھولتا ہے تو وہ سب کچھ بھول جاتا ہے پھر اس کے معاملات سیدھے نہیں رہتے۔ عالم بشریت کی اصل ایک ہے۔ وہ ایک رشتے میں پیوست ہے اور ایک نسب کی طرف منسوب ہے تو پھر انسانوں میں تفریق کیوں؟ غرور اور تکبر کے کیا معنی؟ زبان و وطن اور رنگ و نسل کے اختلاف کے کیا معنی؟ وحدت خلق سے وحدت خالق کا تصور ابھارا گیا ہے۔ یہاں تکوینی اور تخلیقی مسائل سے بحث نہیں ہے۔ نفس واحدہ میں نر اور مادہ دونوں کے اعضا موجود تھے پھر مرد اور عورت میں تفرقہ کیسا؟ اس وحدت میں مرد اور عورت دونوں شریک ہیں زندگی کا سلسلہ دونوں کے ملاپ سے چلتا ہے۔ تمام انسان انسانیت کے اعتبار سے ہمارے بھائی ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ رنگ و نسل کے اختلاف

Marfat.com

کے باوجود ہر کوئی یہ کہتا ہے کہ تمام اجناس انسانیت کے اوصاف کے اعتبار سے ہمارے بھائی ہیں۔ ہر کوئی انسانیت کو وحدت کا مدار سمجھ کر باہمی الفت و محبت کی پاسداری کرتا ہے۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ اس حقیقت کا آغاز آدم سے ہو جیسا کہ اہلِ سنت اور اہلِ کتاب کا عقیدہ ہے یا کسی اور باپ سے ہو جیسا کہ امامیہ، صوفیہ اور اہلِ چین کا عقیدہ ہے۔ نفس واحدۃ کی جرثومہ حیات، ایک حقیقت اور ایک انسانیت کی تعبیر سے وہ تمام اعتراضات خود بخود ختم ہو جاتے ہیں جو صرف آدم کو نفس واحدہ قرار دینے پر وارد ہوتے ہیں۔ نفس واحدۃ دراصل نفس انسانیت ہے جس سے سب انسانوں کا خمیر اُٹھا۔

عالم بشریت کی نفس واحدہ سے تخلیق اللہ کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے جو اس کی قدرت اور اس کے علم و حکمت پر دلالت کرتی ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ لوگ اس نشانی کو دیکھ کر اس کی نعمتوں کا شکر ادا کریں اور ان کے درمیان محبت اور باہمی تعاون کی فضا پیدا ہو۔ اقوام عالم اور خاندانوں کے درمیان عداوت کا خاتمہ ہو۔ ان تمام آیات کا منتہا و مقصود صرف یہی ہے ان میں تخلیقی مسائل پر بحث نہیں کی گئی ہے جس میں ہم الجھ گئے ہیں اور ان مسائل سے بحث کرنا دین کا مقصد بھی نہیں۔

تفسیر المنار میں نفس واحدہ کی ایک اور توجیہ کا ذکر ہے کہ نفس واحدہ سے مراد عورت ہے اسی لیے مؤنث کا صیغہ استعمال ہوا ہے۔ آغاز ہی میں نفس واحدہ کا تذکرہ ہے اس لیے سورۃ کا نام بھی نساء ہے اور اس جوڑے کے لیے جو عورت سے پیدا ہوا سورۃ اعراف کی آیت (۷:۱۸۹) میں مذکر کا صیغہ لیسکن الیھا (تاکہ وہ مرد اس سے سکون حاصل کرے) استعمال ہوا ہے۔ یہ رائے رکھنے والوں کا قول ہے کہ علماء کے نزدیک توالد بکری (یعنی نر کے نطفہ کے بغیر پیدائش) کا نظریہ مسلّم ہے وہ اس طرح کہ بعض حیوانات مادہ نر کی تخم ریزی کے بغیر کئی بچے جنم دیتی ہیں مگر شرط یہ ہے کہ ان کے بعض اصول میں بہت پہلے نر تخم ریزی کر چکا ہو۔ چنانچہ یہ احتمال ہو سکتا ہے کہ نر مادہ کی جنس سے ہو۔ اوپر جو ہم نے بیان کیا کہ نفس واحدہ ایک خلیہ پر مشتمل تھا اور وہ نر اور مادہ کے اعضاء کا جامع تھا۔ یہ علمی نقطہ نظر مذکورہ توجیہ سے قریب تر ہے۔

حواء کی تخلیق

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے و خلق منھا زوجھا (۴:۱) اور اس (نفس واحدہ) سے اس کا جوڑا تخلیق کیا۔ سورۃ اعراف (۷:۱۸۹) اور سورۃ زمر (۳۹:۶) میں خلق کی بجائے جعل کا فعل استعمال ہوا ہے ان دونوں کے درمیان جو فرق ہے اسے بیان کیا جا چکا ہے۔ آیت کے اس ٹکڑے کے بارے میں مفسرین نے دو اقوال نقل کیے ہیں۔

Marfat.com

ایک قول جو عام مفسرین کا ہے، یہ ہے کہ منھا میں ضمیر نفس واحدہ کی طرف لوٹ رہی ہے اور نفس واحدہ ان کے نزدیک چونکہ آدم ہی ہیں اس لیے اس کا مطلب ہے کہ آدم کے بدن یعنی ان کی پسلی سے حوا پیدا ہوئیں۔ بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ اس جگہ کو گوشت سے بھر دیا گیا۔ یہ روایت ابن عباس، مجاہد، سدی اور قتادہ کی طرف منسوب کی گئی ہے۔ یہ وہی روایت ہے جو عہد نامۂ قدیم (پیدائش، اصحاح ۲۔ آیت ۲) میں موجود ہے جس کا حوالہ پہلے دیا جا چکا ہے۔

مفسرین میں سے امام طبری نے سورۂ زمر (۶:۳۹) کی آیت کی تفسیر کے ضمن میں اس قول کو صحت کے قریب تر قرار دیا ہے۔ ان مفسرین نے منھا میں حرف جار من کو تبعیضیۃ (Splitting) تسلیم کیا ہے یعنی من جسدھا ۔ 'نفس واحدہ کے جسم سے' کسی قرآن پڑھنے والے کے دل میں یہ خیال بھی نہیں گزر سکتا کہ حوا آدم کی پسلی سے پیدا ہوئیں کیونکہ قرآن حکیم میں اس بات کا اشارہ تک موجود نہیں۔ ہاں تفسیر وں میں ایک حدیث کا ذکر ہے جسے بخاری اور مسلم نے حضرت ابو ہریرہؓ سے مرفوعاً روایت کیا ہے۔ حدیث کے الفاظ یہ ہیں: 'استوصوا بالنساء ان المرأۃ خلقت من ضلع وان اعوج شیئی فی الضلع أعلاہ فان ذھبت تقیمھا کسرتھا ان ترکت لم یزل اعوج فاستوصوا بالنساء ''عورتوں سے حسن سلوک کرو۔ بے شک عورت پسلی سے پیدا کی گئی اور پسلی میں سب سے ٹیڑھا حصہ اوپر والا ہوتا ہے۔ اگر تم اسے سیدھا کرنے چلے تو تم اسے توڑ دو گے اور اگر اسے چھوڑ دو تو وہ ٹیڑھی کی ٹیڑھی رہے گی۔ پس عورتوں سے حسن سلوک کرو'۔ توڑنے سے مراد مفسرین نے طلاق لی ہے۔ حدیث کے الفاظ بتا رہے ہیں کہ اس میں عورتوں کے ساتھ حسن سلوک کا حکم ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ اس کی کمزوریوں سے درگزر کرنا چاہیے۔ اس مفہوم کے برعکس ہم اس حدیث کو بنیاد بنا کر اس کی کمزوریاں بیان کرنے لگ جاتے ہیں کیونکہ اسرائیلی روایات کے زیر اثر ہمارے ذہن میں یہ بات سمائی ہوئی ہے کہ عورت برائی کی جڑ ہے اور مرد سے گھٹیا مخلوق ہے اسی لیے اسے آدم کی پسلی سے نکالنے پر تلے بیٹھے ہیں اور حدیث کے الفاظ کو توڑ موڑ کر اپنے تصور پر منطبق کرنا چاہتے ہیں۔

صاحب البحر المحیط نے حدیث نقل کرنے کے بعد کہا ہے 'احتمال یہ ہے کہ حدیث کا بیان تمثیلی ہے کیونکہ عورتوں کی عادت میں ایک گونہ اضطراب ہوتا ہے، وہ ایک حالت پر قائم نہیں رہتیں، سخت مزاج ہوتی ہیں، ٹیڑھی پسلی کی طرح ہوتی ہیں'۔ پسلی سے پیدا ہونے کا مطلب وہ بھی ہے جو عورت میں موجود ہوتی ہے۔ چنانچہ ابن حیان نے ابو ہریرہ سے روایت کی ہے: 'إن المرأۃ خلقت من ضلع أعوج' عورت ٹیڑھی پسلی سے پیدا کی گئی ہے۔ خلقت من ضلع کا جملہ ایسے ہی ہے جیسا کہ قرآن میں اللہ کا

Marfat.com

قول خُلِقَ الْاِنْسَانُ مِنْ عَجَلٍ (انبیا ۲۱: ۳۷) انسان کی تخلیق عجلت پر ہوئی ہے۔ حدیث کے الفاظ میں المرأة کا لفظ ہے نہ کہ حوا کا، اور صرف ضلع کا بلکہ دوسری روایت میں الضلع الأعوج ہے (ٹیڑھی پسلی)۔ یہ آدمؑ کی پسلی کہاں سے آگئی۔ یہ سب ان لوگوں کے ذہن کی اختراع ہے جو عورت کو گھٹیا مخلوق اور فساد کی جڑ قرار دیکر اس کو اس کے حقوق سے محروم کرنے کے درپے ہیں۔ حافظ ابن حجر نے مذکورہ حدیث کی تشریح یہ کہہ کر کی ہے کہ کہا گیا ہے (قیل) کہ حواء آدم کی بائیں پسلی سے پیدا ہوئیں گویا وہ خود بھی اس قول کو ضعیف سمجھتے ہیں۔ اور وہ وسعت حافظہ کے باوصف سلف وخلف میں سے کسی عالم کا نام لے کر کوئی قول پیش کرنے سے قاصر ہیں۔ سورۃ نساء کی آیت کے اس ٹکڑے کے بارے میں دوسرا قول ابن بحر اور ابو مسلم اصفہانی کا ہے جسے کم وبیش ہر مفسر نے پیش کیا ہے۔ ان کا قول ہے کہ منہا میں حرف تبعیضیہ نہیں بلکہ ابتدائیہ ہے اور اس سے مراد نفس واحدہ کی جنس سے ہے۔ انھوں نے قرآنی آیات ۱۶: ۷۲؛ ۳۰: ۲۱؛ ۴۲: ۱۱ سے استدلال کیا ہے جن میں خلق یا جعل لکم من أنفسکم أزواجا (اللہ نے تمہاری جنسوں سے تمھارے جوڑے بنائے یا پیدا کیے) کا جملہ استعمال کیا گیا ہے۔ اب نفس اور ازواج کے یہ معنی ہو ہی نہیں سکتے کہ تمھارے جسموں سے تمھارے جوڑے بنائے۔ اسی طرح آیت نمبر ۳: ۱۶۴ اور ۹: ۱۲۸ میں یہ کہا گیا ہے کہ رسولاً من انفسھم وہاں بھی یہی مراد ہے رسول کو تمہاری جنس سے بھیجا گیا ہے نہ یہ کہ رسول تمہارے بدن کا حصہ کاٹ کر بھیجا گیا ہے۔ یہ دلیل اس قدر قطعی ہے کہ اس سے انکار ممکن ہی نہیں۔ اگر مذکورہ آیات سے مراد لی جائے کہ یہ آدمی کی بیوی اس کے بدن یا پسلی سے پیدا کی گئی ہے (حالانکہ اس خیال کے لیے نفس اور ازواج کا استعمال قطعی غیر مناسب ہے) تو اس کا یہ مطلب ہوگا کہ انسان کا ایک حصہ دوسرے حصہ سے نکاح کرے گا۔ اس میں جو قباحت ہے وہ مخفی نہیں۔ اس سے حلت وحرمت کا سارا نظام تلپٹ ہو جائے گا اور معاشرتی زندگی برباد ہو جائے گی۔ یہی وجہ ہے کہ پسلی سے حوا کی پیدائش کے موید ین ابو مسلم اصفہانی کا قول پیش کرنے پر مجبور ہیں۔ امام رازی نے سورۃ روم کی آیت (۳۰: ۲۱) کی تفسیر میں اسی قول کو صحیح تر کہا ہے اور ابن العربی نے سورۃ اعراف کی آیت (۷: ۱۸۹) میں اس قول کو حق اور صدق سے قریب کہا ہے۔ اس قطعی نص کے باوجود بعض مفسرین پسلی والے افسانہ کا ان آیات کے تحت تذکرہ کرنے سے چوکتے نہیں۔ ابن بحر، ابو مسلم اصفہانی اور مفتی محمد عبدہ کا اعتراض یہ ہے کہ جو خدا آدم کو مٹی سے پیدا کرنے پر قادر ہے وہ حوا کو بھی مٹی سے پیدا کرنے پر قادر ہے اگر یہ بات مسلّم ہے تو پھر حوا کو پسلی سے پیدا کرنے کا فائدہ۔

صاحب البحر المحیط اور روح المعانی نے ایک قول نقل کیا ہے کہ منہا میں ضمیر

Marfat.com

طینۃ (گیلی مٹی) کی طرف لوٹ رہی ہے یعنی جو مٹی آدم کی مٹی کا جزو تھی اسی سے حوا کو پیدا کیا گیا۔ یہ قول بھی جنس والے قول کی تائید کرتا ہے۔ احکام القرآن اور البحر المحیط کے مطابق زیر بحث آیت عربوں کے اس عقیدے کی تردید کرتی ہے کہ کبھی کبھی انسان غیر جنس یعنی جنات سے شادی کرتا ہے اور ان سے جماع کرتا ہے جیسا کہ کہانی کے مطابق عمرو بن ھند نے ایک بھتنی سے شادی کر لی تھی۔ اس قول سے بھی جنس کے معنی کی تائید ہوتی ہے۔

ہو سکتا ہے کہ مفسرین کی نگاہیں اس بات تک پہنچی ہوں کہ آدم اور حوا ایمیبا (Amoebia) کے جرثومہ اولیٰ سے پیدا ہوئے۔ پہلے آدم پیدا ہوئے پھر وہ جرثومہ اپنی ذات پر تقسیم ہو کر آدم اور حوا کی شکل اختیار کر گیا اور پسلی والے قصے سے ان کی مراد یہی ہو۔ اگر بات یوں ہے تو ان کے اور ہمارے درمیان کچھ اختلاف نہیں رہ جاتا۔ ہم بھی تو یہی کہہ رہے ہیں کہ زندگی کا پہلا سلسلہ ایمیبا سے چلا جو تقسیم ہو کر توالد وتکاثر کا سبب بنا۔ نفسِ واحدۃ اجمال ہے، اس کی تفصیل یہ ہے کہ اسی نفس کی جنس سے اس کے زوج کی تخلیق ہوئی اور یوں نر اور مادہ کے اختلاط سے روئے زمین پر بے شمار آبادی پھیلا دی گئی جو مردوں اور عورتوں پر مشتمل ہے۔

جوڑے کے ہم جنس ہونے کی حکمت

تخلیق کے علاوہ اللہ کا احسان یہ ہے کہ اس نے ہماری جنس سے ہمارا جوڑا پیدا کیا۔ اگر یہ جوڑا کسی غیر جنس سے ہوتا تو اجنبیت کے باعث دونوں میں موافقت کی بجائے منافرت ہوتی۔ اللہ کی حکمت کا کمال ہے کہ اس نے آدم زاد کی دوسری مخلوق کی مانند ایک صفت کی بجائے دو صفتیں یعنی نر اور مادہ پیدا کیے جو ہم شکل اور ہم مزاج ہیں، انسانیت میں مشترک ہیں، دونوں کا سانچہ ایک سا ہے اور دونوں کو ایسی دلی محبت اور شفقت ودیعت کی گئی ہے کہ ایک کو دوسرے سے مل کر سکون ملتا ہے۔ یہ سکون دلی سکون ہے کیونکہ اللہ کے قول یسکن الیھا کا مطلب سکون قلبی ہے۔ جبکہ عربی محاورہ سکن عندہ جسمانی سکون کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ ہر زندہ وجود اپنے ہم جنس زندہ وجود کی طرف کھنچا چلا جاتا ہے۔ کیا انسان اور کیا حیوان اور کیا نباتات سب میں یہ باہمی کشش پائی جاتی ہے کیونکہ یہ سب نفس واحدہ کی نرسری میں پرورش پاتے ہیں۔

انسانی جوڑے میں انسانی فطرت کی یگانگت تخلیق کی اصل ہے جبکہ محبت والفت اس فطرت کا ثمرہ ہے۔ اسی لیے قرآن نے اسے جَعَلَ (بنایا) کے فعل سے تعبیر کیا ہے۔ دو ہم جنسوں کی ہر ملاقات محبت و شفقت کا ثمرہ پیدا نہیں کر سکتی۔ یہ ایک کو دوسرے سے قریب کر سکتی ہے۔ محبت والفت ایک دوسرے سے

Marfat.com

پیہم اختلاط، لگاتار تجربات اور جہد مسلسل کا نتیجہ ہوتی ہے۔ نفس انسانی بہت سے مراحل سے گزر کر اس منزل تک پہنچتا ہے۔ جتنی کاوش زیادہ ہوگی اتنا ہی ثمرہ بھی زیادہ ہوگا وگرنہ کتنے درخت ہیں جن پر پھل نہیں لگتا۔ اگر یہ ثمرہ حاصل نہ ہو تو ہم جنس جوڑے کو اپنے نفس کا محاسبہ کر کے اپنی سمت درست کرنی چاہیے تاکہ اسے سکون، محبت اور راحت مل سکے۔

دونوں انسانی اصناف یعنی نر اور مادہ میں سے کوئی صنف ہیٹی نہیں۔ ایک صنف دوسری کا تکملہ ہے اگر دونوں میں سے ایک نہ ہو تو دوسری بے کار ہو جاتی ہے۔ دونوں کے میل ملاپ کے لیے اللہ نے یہ انتظام کیا ہے کہ میاں اپنی نفسانی خواہشات کی تسکین اور دل بستگی کا سامان بیوی کے یہاں پاتا ہے اور بیوی میاں کے یہاں۔ یہ محبت یہ شفقت بقول مولانا اصلاحی کسی اندھے اور بہرے مادہ کی پیدا کردہ نہیں بلکہ علیم وقدیر ذات کی سوچی سمجھی سکیم ہے۔ دونوں اصناف میں سے کوئی صنف برائی کا سرچشمہ نہیں۔ دونوں خدا کی نعمتوں میں سے ایک نعمت ہیں، سکون قلب اور بقائے نوع کا ذریعہ ہیں۔ دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم وملزوم ہیں۔ قرآن کی زبان میں دو ہم جنس نر اور مادہ کے اشتراک سے سکون، مؤدت اور رحمت کے جذبات پنپتے ہیں۔ جب تک اشتراک کا نتیجہ ان جذبات کی صورت میں نہ نکلے زندگی اجیرن ہو جاتی ہے۔ ترجمان القرآن میں مولانا ابوالکلام آزاد سورۃ روم کی آیت (۲۱:۳۰) کے ضمن میں اس حکمت کو اپنے مخصوص انداز میں یوں بیان کرتے ہیں: 'تاکہ دو ہستیوں کی باہمی رفاقت و اشتراک سے زندگی کی محنتیں اور مشقتیں سہل وگوارا ہو جائیں، اللہ تعالیٰ نے تین چیزیں پیدا کیں جن کے بغیر انسان مطمئن اور خوشحال زندگی بسر نہیں کر سکتے:

۱۔ سکون۔ ۲۔ مؤدت۔ ۳۔ رحمت۔

سکون عربی میں ٹھہراؤ اور جماؤ کو کہتے ہیں مطلب یہ ہے کہ انساں کی طبیعت میں ایسا ٹھہراؤ اور جماؤ پیدا ہو جائے جسے زندگی کی بے چینیاں اور پریشانیاں ہلا نہ سکیں۔ مؤدت سے مقصود محبت ہے۔ قرآن مجید کے نزدیک ازدواجی زندگی کی تمام تر بنیاد محبت پر ہے لیکن یہ محبت کا رشتہ پائیدار نہیں ہو سکتا اگر رحمت کا سورج دلوں پر نہ چمکے۔ رحمت سے مقصد ہے کہ میاں بیوی نہ صرف ایک دوسرے سے محبت کریں بلکہ ایک دوسرے کی خطائیں اور کمزوریاں نظر انداز کر دیں۔ رحمت کا جذبہ خود غرضانہ محبت کو فیاضانہ محبت میں بدل دیتا ہے۔ خود غرضی میں انسان اپنی ہستی کو سامنے رکھتا ہے لیکن رحیمانہ محبت میں اپنی ہستی کو بھول جاتا ہے۔ رحمت کا تقاضا ہے کہ دوسرے کی غلطیاں بخش دے۔ غضب و انتقام کی پرچھائیں دل پر پڑنے نہ پائے'۔

Marfat.com

خلاصہ بحث

تمام کی تمام انسانیت ایک بیج نفس واحدۃ کا پھل ہے جسے اللہ نے اپنی قدرت اور حکمت سے بویا ہے اور اسی نفس کی جنس یا مادہ سے اُس کا جوڑا بنایا تا کہ وہ اس کی تکمیل کر کے افزائش نسل کا باعث ہو۔ یہ نفس واحدۃ ہے ایک فطرت والا، ایک سی خصوصیات والا، یہ خصوصیات اس کو باقی مخلوقات سے اس طرح الگ کرتی ہیں جیسے وہ اس کے تمام افراد کو اپنے دائرے میں ایک ساتھ جمع کرتی ہیں۔ نفس واحدہ زمین پر پھیلے ہوئے تمام انسانوں کی تمام نسلوں میں تمام مقامات پر ایک سا ہے اور اس کا جوڑا بھی انہی خصوصیات کا حامل ہے۔ اصل فطرت میں نر اور مادہ کے درمیان کوئی فرق نہیں۔ دونوں میں ایک جیسا ارادہ اور اختیار موجود ہیں۔ نفس واحدہ میں ازدواجیت کا خاصہ اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ نر اور مادہ دونوں میں یگانگت ہے یہ قاعدہ پوری کائنات میں جاری وساری ہے۔ عورت کے بارے میں بیہودہ لغو اور بے اصل تصورات گھڑ لیے گئے تا کہ اسے گندگی کا سرچشمہ اور برائیوں کی جڑ تصور کیا جائے اور اسے تمام انسانی حقوق و فرائض سے محروم کر دیا جائے۔ آدم کی پسلی سے حوا کو پیدا کرنے کا افسانہ عورت کی ثانوی اور کمتر حیثیت کو ثابت کرنے کے لیے اسرائیلیوں نے تراشا اور اس بات کو فراموش کر دیا گیا کہ وہ ایک انسان ہے جسے دوسرے انسان کی تکمیل کے لیے پیدا کیا گیا۔ وہ ایک نفس ہے جو دوسرے نفس کا جز ولاینفک ہے۔ وہ بھی ایک فرد ہے اور مرد بھی ایک فرد۔ دونوں ایک دوسرے سے سکون حاصل کرتے ہیں۔ دونوں ایک دوسرے کا زوج ہیں اور ایک دوسرے کو مکمل کرنے والے ساتھی۔ جب تک عورت کے ساتھ یہ یک رخا سلوک روا رکھا جائے گا خاندان ایک مضبوط بنیاد پر کھڑا نہ ہو سکے گا۔ ہمارے معاشرے میں پھیلا ہوا عورت کے بارے میں یہ رویہ زمانہ جاہلیت کا گھٹیا اور پست رویہ ہے جس کا دین فطرت سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔

نفس انسان میں مساوات

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "وَكَتَبْنَا عَلَيْهِمْ فِيهَا أَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ وَالْعَيْنَ بِالْعَيْنِ وَالْأَنْفَ بِالْأَنْفِ وَالْأُذُنَ بِالْأُذُنِ وَالسِّنَّ بِالسِّنِّ وَالْجُرُوحَ قِصَاصٌ" اور ہم نے ان (بنی اسرائیل) پر یہ بات مقرر کر دی تھی کہ نفس (جان) کے بدلے نفس اور آنکھ کے بدلے آنکھ اور ناک کے بدلے ناک اور کان کے بدلے کان اور دانت کے بدلے دانت اور خاص زخموں کا بھی قصاص ہے (المائدہ ۵:۴۵)۔

شانِ نزول

امام طبری نے سدی سے روایت کی ہے کہ انصار کے دو قبیلوں میں (بنو نضیر اور بنو قریظہ جو پہلے یہودی تھے) کے درمیان جنگ ہوئی دونوں کے لوگ قتل ہوئے۔ پہلے اِن میں سے ایک قبیلے کو دوسرے

Marfat.com

قبیلے پر اس قدر قدرت حاصل تھی کہ ان کے ایک مقتول کے بدلے دو کو قتل کیا جاتا تھا۔ وہ نبی کریم ﷺ کے پاس آئے انھوں نے آزاد کے بدلے آزاد، غلام کے بدلے غلام اور عورت کے بدلے عورت کا قاعدہ مقرر کیا تو سورۃ بقرۃ کی آیت نازل ہوئی' اَلْحُرُّ بِالْحُرِّ وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ وَالْاُنْثٰی بِالْاُنْثٰی '(۲:۱۷۸)' آزاد آزاد کے بدلے، غلام غلام کے بدلے اور عورت عورت کے بدلے۔ پھر انھوں نے سفیان کا قول نقل کیا ہے کہ سورۃ بقرۃ کی آیت کو المائدہ کی آیت النفس بالنفس سے منسوخ کر دیا گیا۔

یہ ناسخ و منسوخ والی بات درست نہیں۔ دونوں آیات کا ایک ہی مفہوم ہے۔ زمانہ جاہلیت میں ظلم کی ایک شکل یہ تھی کہ طاقت ور قبیلے کا کوئی مرد قتل ہو جاتا تو وہ صرف قاتل کو قتل کرنے کی بجائے قاتل کے قبیلے کی کئی مردوں کو بلکہ بعض اوقات پورے قبیلے کو تہس نہس کرنے کی کوشش کرتے اور عورت کے بدلے مرد کو اور غلام کے بدلے آزاد کو قتل کرتے۔ اللہ نے اس امتیاز کو ختم کرتے ہوئے سورۃ بقرۃ میں فرمایا کہ جو قاتل ہو گا بدلے میں صرف اسے قتل کیا جائے گا۔ قاتل آزاد ہے تو بدلے میں وہی آزاد، غلام ہے تو بدلے میں وہی غلام اور عورت ہے تو بدلے میں وہی عورت قتل کی جائے گی نہ کہ غلام کی جگہ آزاد اور عورت کی جگہ مرد یا ایک مرد کے بدلے میں بہت سے مرد۔ سورۃ بقرۃ کی آیت سے یہ غلط فہمی پیدا ہوئی ہے کہ عورت کے بدلے عورت کو قتل کیا جائے گا خواہ اس کا قاتل مرد ہی کیوں نہ ہو۔ اور غلام کے بدلے غلام کو قتل کیا جائے گا خواہ اس کا قاتل آزاد کیوں نہ ہو۔ حالانکہ آیت کا مفہوم ہے کہ بدلہ میں صرف قاتل ہی کو قتل کیا جائے گا چاہے مرد ہو یا عورت، غلام ہو یا آزاد کیونکہ سنن ابی داؤد کتاب الجہاد میں ایک حدیث کے الفاظ یوں ہیں: المسلمون تتکافا دماؤھم تمام مسلمانوں کے خون (مرد ہو یا عورت) برابر ہیں۔

کشاف اور تفسیر کبیر میں ابن عباس کی روایت نقل کی گئی ہے کہ جاہلیت میں عورت کے بدلے مرد کو قتل نہیں کرتے تھے اس لیے آیت زیر بحث کا نزول ہوا یعنی وہ اس آیت کو مستقل آیت مانتے ہیں نہ کہ ناسخ۔ آیت کا مطلب ہے کہ اسلام میں رنگ و نسل، جنس اور طبقات کی کوئی تمیز نہیں۔ اللہ کی شریعت کے سامنے سب برابر ہیں کیونکہ سب نفس واحدہ سے پیدا ہوئے ہیں پھر مرد اور عورت کے درمیان امتیاز کے کیا معنی؟ امام ابو حنیفہ نے اس آیت سے استدلال کیا ہے کہ مسلمان بھی ذمی کے قصاص میں قتل کیا جائے گا کیونکہ نفس کا بدلہ نفس ہے۔

Marfat.com

نفس انسانی قرآن کی صداقت کی دلیل

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ’سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْآفَاقِ وَفِي أَنفُسِهِمْ حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُ الْحَقُّ‘ (فصلت ۴۱:۵۳) ’عنقریب ہم انھیں اپنی نشانیاں آفاق میں بھی دکھائیں گے اور ان کی ذات میں بھی یہاں تک کہ ان پر واضح ہو جائے کہ حق یہی ہے‘۔ قرآن اور اسلام کی صداقت کے دلائل خارجی بھی ہیں جو ساری کائنات میں پھیلے ہوئے اور داخلی بھی جو ہمارے نفوس کے اندر موجود ہیں۔ آفاق کی آیات سے مراد کون و مکان میں پھیلی ہوئی نشانیاں ہیں۔ زمین و آسمان میں عناصر اربعہ کی آیات، موالید ثلاثہ کی آیات، روشنی اور تاریکی کی آیات، لیل و نہار کی آیات، سورج اور چاند کی آیات، بارش اور ہواؤں کی آیات، بر و بحر کی آیات، اشجار و انہار کی آیات اور نباتات و جمادات کی آیات آفاق میں پھیلی ہوئی یہ تمام نشانیاں گواہی دے رہی ہیں کہ اللہ اس کائنات کا خالق ہے اور قرآن بھی اس کی جانب سے نازل ہوا ہے۔ قرآن میں بار بار ان آیات کا ذکر آتا ہے۔

نفس کی گہرائیوں میں علم و معرفت کی نشانیاں کون و مکان میں پھیلی ہوئی نشانیوں سے کسی طرح بھی کم نہیں، جسم بشری، رحم مادہ میں نطفے کا ٹھہراؤ، اس کی تاریکیوں میں بچے کی پرورش، اعضاء کی تشکیل اور ان کا اعتدال، انسان کا وجود، اخلاط و حواس سے اس کی ترکیب کے بارے میں بہت کچھ معلوم ہو چکا ہے جس کی تفصیل علم تشریح میں موجود ہے۔ اس کی ترکیب و تدوین اس کے فرائض منصبی اور اعمال و حرکات کے بارے میں عجیب و غریب انکشافات ہوئے ہیں اور برابر ہو رہے ہیں لیکن نفس بشری کے بارے میں بہت کچھ جاننا ابھی باقی ہے کیونکہ انسان کے مادہ اور اس کے جسم کے میکنزم کی جانب اس کی عقل اور روح کی نسبت زیادہ توجہ دی گئی ہے۔ اس کی خصوصیات اور اس کے اسرار و رموز کے بارے میں جو تھوڑا بہت معلوم ہوا ہے وہ اس بات کی طرف اشارہ کر رہا ہے کہ انسان ابھی راستے میں ہے ابھی بہت سے انکشافات باقی ہیں اللہ کا قول ’وَفِي أَنفُسِكُمْ أَفَلَا تُبْصِرُونَ‘ (الذاریات ۵۱:۲۱) اور اپنے نفسوں کے اندر تم کیوں نہیں جھانکتے، اس بارے میں تحقیق کی دعوت دے رہا ہے۔ مسلمانوں کے لیے خاص طور پر یہ ایک بڑا چیلنج ہے مگر علمی تحقیق کا میدان انھوں نے کلیۃ نظر انداز کر دیا ہے۔

نفس کا نگہبان اللہ اور انسان

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ’بَلِ الْإِنسَانُ عَلَىٰ نَفْسِهِ بَصِيرَةٌ‘ (القیامۃ ۷۵:۱۴) ’بلکہ انسان خود اپنے اوپر آپ واضح حجت ہے‘۔ امام رازی نے کہا کہ اخفش کا قول ہے کہ انسان کو اپنے نفس پر واضح

Marfat.com

حجت ایسے کہا گیا ہے جیسے عرب محاورہ میں کہتے ہیں فلان جود و کرم یعنی فلاں سراپا جود وکرم ہے یعنی انسان کا وجود سراپا حجت ہے۔

بصیرۃ مؤنث ہے حالانکہ وہ انسان جو مذکر ہے اس کی خبر ہے۔ اس کی ایک وجہ بصرہ کے بعض نحویوں کے قول کے مطابق یہ ہے کہ عربی میں محاورہ میں کہا جاتا ہے کہ 'انت حجة علی نفسك' تو خود اپنے خلاف ایک حجت ہے۔ ایک قول فراء کا ہے کہ یہ مقدر حجۃ کی صفت ہے یعنی عبارت یوں ہے: 'علی نفسہ حجة بصیرة' بصیرۃ اس صورت میں 'واضح' کے معنی میں ہوگا۔ ابو عبید کا قول ہے کہ بصیرۃ میں تائے تانیث مبالغہ کے لیے ہے جیسا کہ راویة، طافیة اور علامة میں ہے۔ ایک قول ہے کہ جوارح (انسانی اعضا) کی مناسبت سے بصیرۃ مؤنث ہے یعنی اس کے جوارح اس کے نفس پر حجت ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ انسان اس بات کا محتاج نہیں کہ کوئی اور اسے اس کے بارے میں کچھ بتائے بلکہ اس کا نفس خود اس کے خلاف گواہی دیتا ہے اور اسے اس کی خوبیوں اور خامیوں کا پتہ دیتا ہے۔ اللہ نے انسان کو جو مخفی صلاحیتیں عطا کی ہیں مثلاً عقل، انسان ان کے ذریعہ سے جان لیتا ہے کہ جو چیز اس کو اللہ سے قریب کرتی ہے اور اللہ کی اطاعت اور عبادت میں مشغول رکھتی ہے وہ باعث سعادت ہے اور جو چیز اس کو نافرمانی پر آمادہ کر کے اسے اللہ کی اطاعت سے دور کرتی ہے باعث بدبختی ہے۔ ہوسکتا ہے کہ وہ ظاہراً جھوٹ بولے اور حق کو باطل کی صورت میں اور باطل کو حق کی صورت میں دیکھے مگر عقل سلیم کے ذریعہ سے وہ جان جاتا ہے کہ اس کا عمل اچھا ہے یا برا۔ اس اعتبار سے اس کا نفس اس کا نگہبان ہے اور وہ اس کا محاسبہ کرتا ہے۔

اس آیت مبارکہ کا ایک مطلب یہ ہے کہ انسان کے اعضاء اس کے کان، اس کی آنکھیں، اس کے ہاتھ اور اس کے پاؤں اس کے اعمال کی گواہی دیتے ہیں اور اس کی نگہبانی کرتے ہیں جیسا کہ سورۃ نور میں اللہ کا قول ہے: 'يَوْمَ تَشْهَدُ عَلَيْهِمْ أَلْسِنَتُهُمْ وَأَيْدِيهِمْ وَأَرْجُلُهُم بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ' جس دن اس کے خلاف ان کی زبانیں اور ان کے ہاتھ اور پاؤں ان کے اعمال کی گواہی دیں گے (النور ۲۴:۲۴) یعنی ہمارے اپنے اعضاء اور ہماری صلاحیتیں ہمارے خلاف گواہی دیں گے اگر ہم نے ان کو نیک کاموں میں استعمال کرنے کی بجائے انھیں برے کاموں میں استعمال کیا۔ انسان کی اچھائی، برائی کا فیصلہ یہ بات نہیں کرتی کہ وہ اپنے بارے میں کیا کہتا ہے، یا دوسرے اس کے بارے میں کیا کہتے ہیں؟ بلکہ یہ بات کرتی ہے کہ وہ حقیقت میں کیا ہے؟ اس کی مدح یا مذمت کی کسوٹی اس کی اپنی ذات ہے، اس کی شخصیت ہے، اس کا نفس ہے یا اس کے جسم کے اعضاء۔

Marfat.com

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: 'اِن كُلُّ نَفْسٍ لَّمَّا عَلَيْهَا حَافِظٌ' (الطارق ۸۶:۴) کوئی نفس ایسا نہیں جس پر کوئی محافظ نہ ہو۔ یہ اس قسم کا جواب ہے جو اللہ نے آسمان اور نجم ثاقب کی کھائی ہے کہ ہر نفس کا ایک محافظ ہے جو اس کی حفاظت کرتا ہے، زندگی کے تمام مراحل میں اس کے کاموں کا بندوبست کرتا ہے یہاں تک اسے موت آجاتی ہے۔ وہ محافظ اس کا رب ہے جو دنیا و آخرت میں اس کے کاموں کو کنٹرول کرتا ہے۔ اس آیت کے بارے میں کتاب التسہیل نے نبی کریم ﷺ کی ایک حدیث نقل کی ہے کہ ہر نفس کے لیے اللہ کی جانب سے محافظ مقرر ہیں۔ وہ اس کا دفاع ایسے کرتے ہیں جیسے شہر کا دفاع کیا جاتا ہے۔ اگر ہر انسان کو پلک جھپکنے تک اپنے نفس کے سپرد کر دیا جائے تو آفات اور شیاطین اس کو اچک کر لے جائیں۔ یہ محافظ کون ہیں؟ ایک قول ہے کہ یہ محافظ وہ فرشتے ہیں جو اس کے اچھے برے عمل لکھتے ہیں یا وہ فرشتے ہیں جو ہر انسان کی حفاظت کے لیے مامور ہیں جیسا کہ اللہ کا ارشاد ہے: 'لَهُ مُعَقِّبَاتٌ مِّن بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهِ يَحْفَظُونَهُ مِنْ أَمْرِ اللّٰهِ' (الرعد ۱۳:۱۱)۔ 'اس کے پہرے دار انسان کے آگے پیچھے مقرر ہیں جو اللہ کے حکم سے اس کی نگرانی کرتے ہیں۔'

صاحب البحر المحیط کے مطابق دوسرا قول یہ ہے کہ یہ محافظ عقل ہے جو انسان کے فائدے کی چیزوں کی طرف رہنمائی کرتی ہے اور اس کو نقصان پہنچانے والی چیزوں سے روکتی ہے۔ یا یوں سمجھئے کہ ہر نفس اپنے وجود کی نگہداشت کرتا ہے وہ اس طرح کہ اللہ تعالیٰ نے اسے مادی اور معنوی قوتیں عطا کی ہیں جو انسان کی زندگی میں پیش آنے والی رکاوٹوں کو دُور کرتی ہیں اور مدافعت اور حفاظت کے لیے بطور ہتھیار انجام دیتی ہیں۔ سب سے نمایاں محافظ انسان کی عقل ہے جس کے ذریعہ وہ خیر و شر اور پاک و ناپاک میں تمیز کرتا ہے۔ یہ قول زیادہ درست معلوم ہوتا ہے کیونکہ اس آیت کے فوراً بعد انسان کو دعوت دی گئی ہے کہ وہ عقل کا استعمال کرے۔

دونوں آیتوں کا لب لباب یہ ہے کہ اصل نگران تو اللہ ہی ہے مگر وہ ان صلاحیتوں کے ذریعہ نگرانی کرتا ہے جو اس نے انسانی نفس کو عطا کر رکھی ہیں۔ یہ نگرانی مرد کی بھی ہوتی ہے اور عورت کی بھی۔

نفس میں ازدواجیت کی صلاحیت اور اس کا نشوونما

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: 'وَنَفْسٍ وَمَا سَوَّاهَا ۝ فَأَلْهَمَهَا فُجُورَهَا وَتَقْوَاهَا ۝ قَدْ أَفْلَحَ مَن زَكَّاهَا ۝ وَقَدْ خَابَ مَن دَسَّاهَا ۝' (الشمس ۹۱:۷تا۱۰) 'قسم ہے نفس کی اور اس کی درستگی کی، سمجھ دی اس کو فسق و فجور کی اور تقویٰ کی جس نے اس کا تزکیہ کیا وہ کامیاب ہو گیا اور جس نے اسے دبا یا وہ ناکام ہوا'۔ ان آیات میں مطلقاً نفس انسانی کی قسم کھا کر اللہ نے اسے کائنات میں شرف بخشا ہے۔ نہ

Marfat.com

صرف نفس کی، بلکہ نشوونما کے ذریعہ اس کی درستگی اور اسے درجہ کمال کے لیے تیار کرنے کی۔ یہاں نفس واضح طور اس کی شان بڑھانے (تفخیم) کے لیے نکرہ استعمال ہوا ہے۔ اس کے باوجود بعض مفسرین نے نفس سے مراد نفس آدم والا قول نقل کیا ہے لیکن صاحب کتاب التسہیل اور روح المعانی نے اس قول کو غیر معقول قرار دیا ہے۔ غالباً یہاں نفس کو نفس آدم ٹھہرانے کی وجہ یہ ہے کہ نفس واحدہ سے آدم مراد لینے کا سودا ان کے سر میں سمایا ہوا ہے۔ نفس کی درستگی سے مراد عقل وفہم کی تکمیل ہے تاکہ انسان اپنی باطنی صلاحیتوں کو استعمال کر کے اس بلند ترین مقام پر پہنچ جائے جہاں اللہ اسے دیکھنا چاہتا ہے۔

الہام کا اصل 'لھم الشئی و الھمہ' کسی چیز کو نگلنا یا نگلوانا ہے پھر کہا جاتا ہے: 'الھمتہ ذاک الشئی' میں نے اس تک وہ چیز پہنچا دی یعنی الہام ابلاغ کے معنوں میں ہے۔ یہ اصل ہے پھر اس کا استعمال اس بات کے لیے ہونے لگا جو اللہ اپنے بندے کے دل میں ڈالتا ہے کیونکہ یہ بھی ایک طرح کا ابلاغ ہے۔ صحابہ اور تابعین میں سے ابن عباس نے الہام سے مراد سکھلانا اور معرفت عطا کرنا، ابن جبیر نے لازم کرنا، ابن زید نے واضح کرنا اور زجاج نے توفیق دینا مراد لیا ہے۔ یعنی نفس کو سمجھا دیا گیا ہے اور اس کے اندر ڈال دیا گیا ہے کہ یہ نیکی ہے اور یہ برائی ہے جو چاہے وہ اختیار کر لے۔ اس کے لیے واضح کر دیا گیا ہے کہ یہ نیکی اس نے کرنی ہے اور یہ برائی اس نے چھوڑنی ہے گویا اللہ نے اسے فرمانبرداری اور نافرمانی کا طریقہ بتا دیا ہے۔

نفس ہر انسانی بچے کو نر اور مادہ کی تخصیص کے بغیر غیر نشوونما شکل میں عطا ہوتا ہے اور اس کے اندر نشوونما پا کر درجہ کمال تک پہنچنے کی صلاحیت بھی رکھ دی گئی ہے اگر اس کی نشوونما نہ کی جائے تو نفس بے کار ہو جاتا ہے۔ آیات مبارکہ میں بتایا گیا ہے کہ تزکیہ یا نشوونما تقویٰ کے ذریعہ ہو گی اور اسی طرح وہ اوج کمال تک پہنچے گا۔ جبکہ فسق وفجور کی وجہ سے وہ دبا یا چھپا رہے گا۔ جو انسان وحی سے روشنی حاصل کرتا ہے اور ذات خداوندی کی صفات کا مظہر بن جاتا ہے اس کے متعلق ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس کے نفس کی نشوونما ہو رہی ہے خواہ وہ مرد ہو یا عورت۔

سورۃ کے آغاز میں چھ خارجی شہادتوں کے بیان کرنے کے بعد اللہ نے سب سے بڑی نعمت کا ذکر کیا ہے۔ یہ نعمت وہ فطرت صالحہ اور سلیمہ ہے جو انسان کے اندر موجود ہے۔ اسی کے ذریعہ سے انسان اس بات کا ادراک کرتا ہے کہ انسان کی کامیابی، خوشحالی اور نجات کا انحصار اس بات پر ہے کہ آیا وہ اس نفس کو ایسے ہی پاکیزہ رکھ رہا ہے جیسے اللہ نے اسے بنایا ہے اور اس کی ناکامی، زوال اور ہلاکت کا انحصار اس بات پر ہے کہ اس نے برائی کا راستہ اختیار کر کے اس نفس کو کس قدر ناپاک کر دیا ہے۔

Marfat.com

ازدواجیت

ان آیات مبارکہ میں نفسِ انسانی کی ایک بڑی حقیقت کا بیان ہے جسے ازدواجیت کہا جاتا ہے۔ ان آیات کا ربط ان آیات سے ہے جو انسانی فطرت میں ازدواجیت کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔ جیسے 'إِنِّي خَالِقٌ بَشَرًا مِّن صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَإٍ مَّسْنُونٍ ○ فَإِذَا سَوَّيْتُهُ وَنَفَخْتُ فِيهِ مِن رُّوحِي فَقَعُوا لَهُ سَاجِدِينَ' (الحجر ۱۵: ۲۸ تا ۲۹) 'میں ایک انسان کو خمیر کی ہوئی سانچے میں ڈھل جانے والی کھنکناتی ہوئی مٹی سے پیدا کرنے والا ہوں تو جب میں اسے پورا بنا چکوں اور اس پر اپنی روح پھونک دوں تو تم سب اس کے لیے سجدے میں گر پڑنا'۔ یعنی انسان تکوینی طور پر زمین کی مٹی اور نفحۂ ربانی سے مرکب ہے۔ پھر اللہ کا ارشاد ہے: 'إِنَّا هَدَيْنَاهُ السَّبِيلَ إِمَّا شَاكِرًا وَإِمَّا كَفُورًا' (الأنسان ۷۶: ۳) 'ہم نے اسے راہ دکھائی اب وہ خواہ شکر گزار بنے خواہ ناشکرا'۔ خیر و شر اور ہدایت و گمراہی دونوں کی صلاحیت اس میں ودیعت کی گئی ہے'۔ یہ بات اسلام کے اس نفسیاتی نظریہ کی نمائندگی کرتی ہے جس کی رُو سے زندہ وجود کی فطرت میں ازدواجیت رکھی گئی ہے۔ اس کی استعداد میں ازدواجیت ہے اور اس کے میلانات میں ازدواجیت ہے۔ وہ خیر و شر میں تمیز کرنے پر قدرت رکھتا ہے اور یہ قدرت اس کے وجود میں چھپی ہوئی ہے۔ قرآن کبھی اسے الہام سے تعبیر کرتا ہے اور کبھی ہدایت سے جیسا کہ اللہ کا قول ہے: 'وَهَدَيْنَاهُ النَّجْدَيْنِ' (البلد ۹۰: ۱۰) 'ہم نے اس کو دونوں راستوں کی ہدایت دی ہے'۔ وحی اور خارجی عوامل ان صلاحیتوں کو بیدار تو کر سکتے ہیں مگر ان کو پیدا نہیں کر سکتے کیونکہ انسان کی فطرت میں اس کی تخلیق ہو چکی ہے۔

اس فطرتی استعداد کے پہلو بہ پہلو انسان کی ذات میں قوت مدرکہ بھی موجود ہے جو اس کی رہنمائی کرتی ہے انہی کی وجہ سے اسے اپنے کیے کا ذمہ دار ٹھہرایا گیا ہے۔ جو بھی اس قوت کو نفس کی نشو و نما کے لیے استعمال کرتا ہے اور اس میں خیر کی صلاحیت کو نمایاں کرتا ہے اور شر کی صلاحیت پر غلبہ حاصل کرتا ہے، کامیابی اس کے قدم چومتی ہے اور جو اسے اس غرض کے لیے استعمال نہیں کرتا وہ اپنے نفس کو دباتا اور چھپاتا ہے اور اسے کمزور کر دیتا ہے تو ناکامی اس کا مقدر ہوتی ہے۔

ہر نفس اپنے کیے کا خود ذمہ دار ہے

اللہ تعالیٰ کا قول ہے: 'إِنَّ اللَّهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتَّىٰ يُغَيِّرُوا مَا بِأَنفُسِهِمْ' (الرعد ۱۳: ۱۱) 'کسی قوم کی حالت اللہ تعالیٰ نہیں بدلتا جب تک کہ وہ خود اسے نہ بدلیں'۔ اسی مضمون کو ذرا سی وضاحت کے ساتھ سورۃ انفال میں یوں پیش کیا گیا ہے: 'ذَٰلِكَ بِأَنَّ اللَّهَ لَمْ يَكُ مُغَيِّرًا نِّعْمَةً أَنْعَمَهَا عَلَىٰ قَوْمٍ

Marfat.com

حَتَّى يُغَيِّرُوْا مَا بِأَنفُسِهِمْ' ۔'یہ اس لیے کہ اللہ ایسا نہیں کہ کسی قوم کو کوئی نعمت عطا فرما کر پھر بدل دے جب تک کہ وہ خود اس کو نہ بدلیں جو ان کے نفسوں میں ہے' ۔(۸:۵۳)۔ اس آیت میں اللہ نے اصول یہ مقرر کیا ہے کہ وہ انسان کے ساتھ اپنے رویہ کو اس انسان کے افعال وحرکات کے مطابق مرتب کرتا ہے کیونکہ انسان صاحب اختیار وارادہ ہے۔ ہر فیصلہ وہ خود کرتا ہے اور اس کے نتائج بھی خود بھگتا ہے۔ جزا و سزا کا انحصار بھی اسی اصول پر ہے۔ اس موضوع کو قرآن نے مختلف آیات مثلاً (۶:۱۶۴)، (۱۰:۳۰)، (۱۴:۵۱)، (۳۰:۱۵)اور(۷۴:۳۸) میں بیان کیا ہے۔

آیت زیر بحث کے تحت مفسرین نے حضرت ابو بکرؓ سے ایک روایت نقل کی ہے جس کے الفاظ یہ ہیں: 'اذا راوا الظالم فلم یاخذوا علی یدیه یوشك أن یعمّهم' ۔'اگر لوگ ظالم کو دیکھیں اور اس کا ہاتھ نہ پکڑیں تو قریب ہے کہ اس کا ظلم سب پر چھا جائے' ۔گویا تغیر میں اللہ کا فعل بندے کے فعل سے مؤخر ہے یعنی اللہ نہ تو نعمت کو بدلتا ہے نہ نقمت کو، نہ عزت کو بدلتا ہے نہ ذلت کو، نہ تکریم کو بدلتا ہے نہ توہین کو، مگر اس وقت جب لوگ اپنے احساسات، اپنے اعمال وحرکات کو بدل دیتے ہیں۔ اگر چہ اللہ کو علم ہے کہ لوگ آنے والے وقت میں کیا کرنے والے ہیں مگر اپنا حکم اس وقت نافذ کرتا ہے جب کوئی کام ان سے سرزد ہو جاتا ہے۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جو نفسِ انسانی پر بہت بھاری ذمہ داری ڈالتی ہے۔ اللہ کی مشیت انسان کے افعال وحرکات کے نتیجے میں مرتب ہوتی ہے۔ اس ذمہ داری میں انسان کے عزت و احترام کا یہ پہلو مضمر ہے کہ مشیت الٰہی کا تقاضا ہے کہ انسان اپنے فعل سے اس مشیت کو بروئے کار لانے کا ذریعہ بنے۔

انسان جس راہ پر چلتا ہے وہ اسے خود اختیار کرتا ہے گویا وہ اپنی قسمت اپنے ہاتھ سے لکھتا ہے۔ اللہ نے اسے حرکت وعمل کی آزادی دے رکھی ہے وہ جب چاہے جیسے چاہے اپنی تفکیر اور تقدیر کے مطابق کام کر سکتا ہے۔ جو وہ کرتا ہے اللہ اسے نافذ کر دیتا ہے۔ یہی مطلب ہے ان الله لا یغیر مابقوم کا۔ بیج لوگ ڈالتے ہیں پھل اللہ لگاتا ہے۔ بیج اچھا ہو تو پھل اچھا، بیج برا ہو تو پھل برا۔ لوگوں کے حالات نفوس کے مطابق بدلنے میں اس بات کا اشارہ ہے کہ نفسِ انسانی ہی تفکیر وتقدیر کی مشینری ہے، ارادے اور ذہن سازی کا مرکز ہے۔ وہی با اختیار حاکم ہے۔ وہی انسان کے اقوال وافعال کا رخ متعین کرتا ہے۔ جب نفس اپنا چلن بدل لیتا ہے تو اس کے نتیجہ میں زندگی میں انسان کا چلن بدل جاتا ہے۔ انسانی ارادہ متحرک اور فعال ہے۔ وہ اللہ کے وسیع اور ہمہ گیر ارادے کے دائرے کے اندر پوری آزادی سے کام کرتا ہے۔

Marfat.com

نفس کی تین صفات

نفس مطلق کا اطلاق ذات اور حقیقت پر ہوتا ہے۔ یہ وہی ہے جس کی طرف ہم 'میں' کہہ کر اشارہ کرتے ہیں۔ اپنے نفس کے بارے میں خبر دیتے وقت ہم کہتے ہیں میں نے کیا، میں نے دیکھا، میں نے سنا، مجھے غصہ آیا، یہ اشارہ جسم کے ڈھانچے کی طرف نہیں ہوتا۔ امام رازی کا قول ہے کہ اس کے دو سبب ہیں:

۱۔ کبھی وہ مخصوص ڈھانچہ جس کی طرف اشارہ کیا جارہا ہے حقیقت میں نہ معلوم ہوتے ہوئے بھی معلوم ہوتا ہے اور معلوم غیر معلوم کے سوا ہوتا ہے۔

۲۔ اس ڈھانچے کے اجزا تغیر آشنا ہوتے ہیں اور جس کی طرف یہ کہہ کر اشارہ کیا جارہا ہے وہ تغیر نا آشنا ہوتا ہے۔ میں لازمی طور پر سمجھتا ہوں کہ میں وہی ہوں جو آج سے بیس برس پہلے تھا۔ بدلنے والی چیز نہ بدلنے والی چیز کے علاوہ ہوتی ہے چنانچہ نفس اس ڈھانچہ سے عبارت نہیں۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ نفس ایک لطیف اور شفاف جسمانی جوہر ہے جس کی عنصری اجسام سے دور کی بھی مشابہت نہیں۔ وہ نورانی اور آسمانی ہوتا ہے جو ماہیت میں سفلی اجسام سے متعارض ہے جب وہ اس بدن کثیف سے ملتا ہے بدن زندہ ہو جاتا ہے اور جب اس سے الگ ہوتا ہے وہ مرجاتا ہے'۔

نفس شریف ہے کیونکہ وہ روح ہے جو امر ربی ہے۔ اسی لیے اللہ نے اس کی قسم کھائی ہے۔ نفس مطلق کا ذکر قرآن میں یہ کہہ کر کیا ہے: تَعْلَمُ مَا فِي نَفْسِي وَلَا أَعْلَمُ مَا فِي نَفْسِكَ' (المائدہ ۵:۱۱۶) جو بات میرے نفس میں ہے تو جانتا ہے اور جو تیرے نفس میں ہے میں نہیں جانتا اور 'فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّا أُخْفِيَ لَهُم مِّن قُرَّةِ أَعْيُنٍ' (السجدہ ۳۲:۱۷) اور ان کے نفس کے لیے آنکھوں کی جو ٹھنڈک مخفی ہے اور نفس وماسواھا (الانسان ۸۶:۴) قسم ہے نفس کی اور اس کی درستگی کی۔

قرآن نے نفس کے تین وصف بیان کیے ہیں کبھی کہا وہ 'أَمَّارَةٌ بِالسُّوءِ' (۱۲:۵۳) کبھی کہا وہ لوامۃ (القیامۃ ۷۵:۲) ہے اور کبھی کہا کہ وہ 'الْمُطْمَئِنَّةُ' (الفجر ۸۹:۲۷) ہے۔

نفس امارہ

یہ نفس بدنی مزاج کی طرف مائل ہوتا ہے۔ جنسی لذتوں اور شہوتوں کی تسکین چاہتا ہے خواہ وہ اللہ کی رضا کے خلاف ہی ہوں کیونکہ اس میں جسمانی خواہشات اور نفسانی شہوات کے داعیے موجود ہوتے

Marfat.com

ہیں۔اس کی ترکیب میں وہ تمام قوتیں اور آلات موجود ہوتے ہیں جو لذتوں کے حصول،ان وسوسوں اور میلانات کے تکمیل کے لیے ضروری ہوتے ہیں جن کو شیطان مزین کرتا رہتا ہے۔نفس خواہشات کا غلام بن کر آخرت کے بدلے دنیا خرید لیتا ہے۔جب وہ اپنا توازن کھو بیٹھتا ہے تو انسان کی عقل اور اس کا علم، فکر و فن میں تبدیل ہو جاتا ہے۔وہ برائی اور برے اخلاق کا سرچشمہ بن جاتا ہے سوائے اس نفس کے جس پر اللہ اپنا رحم کرے اور اسے برائی سے موڑ دے جیسا کہ حضرت یوسف علیہ السلام کا نفس۔اسی نفس کو قرآن نے أَمَّارَةٌ بِالسُّوْءِ سے تعبیر کیا ہے۔اللہ کا ارشاد ہے:'وَمَا أُبَرِّئُ نَفْسِي إِنَّ النَّفْسَ لَأَمَّارَةٌ بِالسُّوءِ إِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّيَ '(الیوسف ۱۲:۵۳)'میں (یوسف) اپنے نفس کو بری الذمہ قرار نہیں دیتا بے شک نفس تو برائی کا حکم دینے والا ہے مگر یہ کہ میرا رب ہی رحم کرے'یعنی نفس کی شرارتوں سے وہی بچتا ہے جس پر اللہ رحم کرے یا بالفاظ دیگر جو وحی سے رہنمائی حاصل کرے۔اگر نفس امارہ کو روکا نہ جائے تو انسان کی ہلاکت یقینی ہے۔

نفس لوّامہ

یہ کوئی علیحدہ نفس نہیں بلکہ نفس انسانی ہی کی صفت ہے۔نفس انسانی کو اللہ نے نیکیوں کا شعور عطا کیا ہے جب تک بقول مولانا اصلاحی اس کا توازن برقرار رہتا ہے تو وہ برائی پر ملامت کرتا رہتا ہے۔اسی لیے قرآن کریم نے اس کی صفت لوامہ بتائی ہے۔اللہ کا ارشاد ہے:'وَلَا أُقْسِمُ بِالنَّفْسِ اللَّوَّامَةِ ' (القیامة ۷۵:۲)'میں قسم کھاتا ہوں اس نفس کی جو ملامت کرنے والا ہے'۔

مجاہد کا قول ہے کہ نفس لوامہ ایسا نفس ہے جو ہر اس چیز پر ملامت کرتا ہے جو گزر چکی ہو۔وہ اس بات پر نادم ہوتا ہے کہ اس نے برائی کیوں کی؟ اور نیکی پر اس لیے ملامت کرتا ہے کہ اس نے زیادہ نیکی کیوں نہیں کی؟ جس قدر بھی وہ اطاعت گزار ہو وہ ملامت کرتا رہتا ہے۔فراء نے نفس لوامہ کی تعریف یہ کی ہے کہ نفس نیک ہو یا بد، وہ اپنے آپ پر ملامت کرتا رہتا ہے۔اگر نیک کام کرے تو کہتا ہے اس نے زیادہ نیکی کیوں نہ کی اور اگر برا کام کرے تو کہتا ہے کہ کاش میں ایسا نہ کرتا! ملامت نفس کے لیے باعث ستائش ہے۔اسی لیے اللہ نے اس کی قسم کھائی ہے۔سب سے بہتر تعریف حسن بصری کی ہے وہ فرماتے ہیں بخدا مومن کو جب دیکھو اپنے نفس پر ملامت کرتا رہتا ہے۔وہ کہتا ہے یہ بات جو میں نے کی اس کا

Marfat.com

مقصد کیا ہے؟ یہ چیز جو میں نے کھائی اس کا مقصد کیا ہے؟ جو بات میں نے چھپ کر کی اس کا مقصد کیا ہے؟ اس کے برعکس فاسق و فاجر اپنے نفس پر سرزنش کیے بغیر بڑھتا چلا جاتا ہے۔ یہ نفس جوں جوں غفلت کی اونگھ سے بیدار ہوتا جاتا ہے توں توں وہ دل کے نور سے منور ہوتا جاتا ہے اور جب بھی ظلماتی جبلت کے زیرِ اثر اس سے برائی سرزد ہوتی ہے وہ اپنے آپ پر ملامت کرنے لگتا ہے اور برائی سے نفرت کرنے لگتا ہے۔ نفس لوامہ بیدار ہوتا ہے، متقی ہوتا ہے اور اپنا محاسبہ کرتا رہتا ہے، اپنے گردوپیش پر نظر ڈالتا ہے، اپنی خواہشات کی حقیقت پر غور کرتا ہے، اپنی ذات کو دھوکہ دینے سے بچتا ہے، ایسا نفس اللہ کے یہاں عزت والا ہوتا ہے جبھی تو اس کا ذکر قیامت کے ساتھ کیا گیا ہے۔ اس کے آثار قیامت کے روز ظاہر ہوں گے۔ اگر یومِ قیامت پر ایمان نہ ہو تو انسان گناہوں پر اپنا محاسبہ نہ کرے اور اس کے اندر وہ نفس لوامہ قائم نہ ہو جو یومِ حساب سے پہلے محاسب کا کام کرتا ہے۔

نفس لوامہ کی ملامت اس انسان کی وضع بدل دیتی ہے جو برابر گناہ کر رہا ہو اور جس کا رخ اقرار کی بجائے انکار کی جانب ہو۔ جورو انسان کو کفر و انکار کی طرف دھکیلتی ہے یہ اس کے خلاف بند باندھتا ہے۔ کہا تو یہ جاتا ہے کہ نفس لوامہ کا مقام نفس امارہ سے بلند ہے اور نفس مطمئنہ سے کم۔ لیکن بعض صوفیا کا قول ہے کہ نفس لوامہ ہی نفس مطمئنہ ہے جو نفس امارۃ پر ملامت کرتا رہتا ہے۔ بعض تو اس کے مقام کو مطمئنہ سے اس لیے بلند سمجھتے ہیں کیونکہ یہی وہ نفس ہے جسے دوسرے کی سرزنش کا اہل سمجھا گیا ہے۔

نفس مطمئنہ

یہ نفس کی تیسری صفت یا اس کے ارتقاء کی معراج ہے۔ جب نفس انسانی خلوص کے ساتھ احکام الٰہی کی پیروی کرتا ہے تو نفس تمیز (نفس ناطقہ) اور نفس روح کی باہمی کشمکش بالکل ختم ہو جاتی ہے اور وہ مطمئن ہو جاتا ہے۔ اسے قرآن نفس مطمئنہ سے تعبیر کرتا ہے۔ اللہ کا ارشاد ہے: 'یَا أَیَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ○ ارْجِعِي إِلَىٰ رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً ○ 'اے مطمئن نفس تو اپنے رب کی طرف لوٹ چل اس طرح کہ تو اس سے راضی وہ تجھ سے خوش (۸۹: ۲۷ تا ۲۸)۔

نفس مطمئنہ کیسا ہوتا ہے؟ اس سلسلہ میں حافظ ابن کثیر نے ابن عساکر کے حوالہ سے ایک دعا کے الفاظ نقل کیے ہیں جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک آدمی کو سکھلائی۔ الفاظ یوں ہیں: 'اللھم انی

Marfat.com

اسئلك نفسا بك مطمئنة تؤ من بلقاء ك و ترضی بقضائك و تقنع بعطائك 'اے اللہ!
میں تجھ سے ایسے نفس کا سوال کرتا ہوں جو تیرے ساتھ مطمئن ہو، تیری ملاقات پر یقین رکھے، تیرے فیصلے پر راضی رہے اور تیرے دیے پر قناعت کرے'۔ یہ نفس مطمئنہ ہے۔ اپنے رب کے سامنے مطمئن اپنے راستے پر مطمئن۔ اس حق سے مطمئن جس نے اس کے اندر بسیرا کیا اور اسے یقین کی ایسی ٹھنڈک عطا کی جس میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں۔ خوشی اور غم میں مطمئن تنگ حالی وخوشحالی میں مطمئن۔ نفس مطمئن ہے اس لیے منحرف نہیں ہوتا۔ مطمئن ہے اس لیے راستے میں ڈانواں ڈول نہیں ہوتا، مطمئن ہے اس لیے خوفناک دن سے نہیں ڈرتا۔ یہ اطمینان نفس انسانی کی معراج ہے۔

آیت میں نفس سے براہ راست ایسے خطاب کیا گیا ہے جیسے موسیٰ سے۔ یہ اس کے احترام کی دلیل ہے۔ انسان کو اس لیے مخاطب نہیں کیا گیا کیونکہ نفس اس کا جوہر سماوی ہے اور ایمان واطمینان کا مرکز۔ یہ اس بات کا حق دار ہے کہ اپنے رب کی طرف لوٹ جائے کیونکہ وہ زمین کی مٹی میں لتھڑا ہوا نہیں ہوتا جیسا کہ گمراہوں کے نفس ہوتے ہیں۔ نفس کی رضا اور اللہ کی رضا کو ایک ساتھ جمع کیا گیا ہے۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ جو رضا نفس کو حاصل ہوتی ہے وہ ہمیشہ رہنے والی رضا ہے کیونکہ اس کا سرچشمہ رضائے الٰہی ہے۔

بعض علماء نے ارجعی الی ربك (اپنے رب کی طرف لوٹ چل) سے دلیل پکڑی ہے کہ نفس ازلی ہے اور جسم پر مقدم ہے۔ انسانی نفس خواہ مرد کا ہو یا عورت کا ان تینوں مراحل سے گزر کر انسانیت کی معراج تک پہنچ سکتا ہے۔ مردوں کے لیے خوبیاں ہی خوبیاں ہیں اور عورت کے لیے خامیاں ہی خامیاں، یہ نفس انسانی کی صفات کے منافی ہے۔

Marfat.com

وَلَد (لڑکا۔لڑکی)

لغوی مفہوم

ابن فارس نے معجم مقاييس اللغة میں لکھا ہے کہ واو ، لام اور دال بنیادی طور پر اصل اور نسل پر دلالت کرتے ہیں پھر دوسرے الفاظ مثلاً ولد کو اسی پر قیاس کیا جاتا ہے۔

صاحب کشاف نے اللہ کے قول: 'وَلَدَ اللّٰهُ وَإِنَّهُمْ لَكَاذِبُونَ' (الصافات ۳۷:۱۵۲) میں لکھا ہے کہ وَلَدَ بمعنی مفعول ہے یعنی جسے کسی نے جنا ہو۔ لفظ وَلَدَ پر فتحه (وَلَد، وَلْد) ضمة (الوُلْد) اور کسرة (الولد) کی حرکت آتی ہے۔ ابن سیدہ کا قول ہے کہ فتحه کے ساتھ وَلد اور ضمة کے ساتھ وُلْد جو بھی پیدا ہو، اسے کہتے ہیں ایک قراءت میں مَنْ لَّمْ يَزِدْهُ مَالُهُ وَوَلَدُهُ (نوح ۷۱:۲۱) میں وَلَد کے بجائے وُلْد پڑھا گیا ہے۔ صاحب المفردات نے وُلْد اور وِلد کے معنی اہل وعیال کیے ہیں۔ فعل یوں آتا ہے: وَلَدتْ تلد ولادًا و ولادة مولدا۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ یہ فعل مؤنث کے ساتھ خاص ہے لیکن صفت میں یہ والد اور والدہ دونوں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ ولاد حمل کو کہتے ہیں اور ولادة (ھا کے ساتھ) وضع حمل کو۔ بعض علماء دونوں کو حمل کے معنوں میں لیتے ہیں۔ ولد اسم جمع ہے کبھی اس کی جمع اولاد، وِلْدَة اور وُلد (جیسے اسد کی جمع اُسُد) آتی ہے۔ اولاد کی جمع وَلْدَة آتی ہے۔ اس بات پر ابن سیدہ، صاحبِ لسان العرب اور صاحب المصباح المنير اور صاحب المفردات کا اتفاق ہے کہ ولد کا اطلاق واحد جمع، مذکر و مؤنث اور چھوٹے اور بڑے پر ہوتا ہے۔ المفرادات میں ابوالحسن کا قول نقل کیا گیا ہے کہ اس کا اطلاق بیٹے پر بھی ہوتا ہے اور بیٹی پر بھی، بیٹے کے بیٹے پر بھی ولد کا اطلاق ہوتا ہے جیسا کہ صاحب کشاف نے اللہ کے قول لَا يَجْزِیْ وَالِدٌ عَنْ وَلَدِهٖ (لقمان ۳۱:۳۳) میں کہا ہے کہ ولد کا اطلاق اپنے بچے اور بیٹے کے بچے پر ہوتا ہے جبکہ مولود صرف اپنے بچے کے لیے بولا جاتا ہے۔ جیسا کہ صاحب لطائف اللغة نے لکھا ہے اور جیسا کہ روح المعانی نے إِنْ كَانَ لَهُ وَلَدٌ (النساء ۴:۱۱) کے تحت لکھا ہے اور ابن عباس سے روایت کی ہے کہ بیٹے کے بیٹے کو ورثہ سے روکا نہیں جائے گا۔ قرآن حکیم میں اللہ کے قول إِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّهُنَّ وَلَدٌ' (النساء ۴:۱۲) ولد کا اطلاق صریحاً مذکر پر بھی ہو رہا ہے اور مؤنث پر بھی۔ جبکہ اللہ کے قول يُوصِيكُمُ اللّٰهُ فِيْ أَوْلَادِكُمْ' (النساء ۴:۱۱)، قَتْلَ أَوْلَادِهِمْ (الأنعام ۶:۱۳۷)، قَتَلُوْا

Marfat.com

أَوْلَادَهُمْ (الأنعام۶: ۱۴۰) میں لفظ اولاد مذکر اور مؤنث دونوں کے لیے استعمال ہوا ہے جبکہ اللہ کا قول: وَلَا تَقْتُلُوا أَوْلَادَكُم مِّنْ إِمْلَاقٍ (الأنعام۶: ۱۵۱) صرف اور صرف لڑکیوں کے لیے استعمال ہوا ہے۔

ولید

فعیل مفعول کے معنوں میں ہے اس اعتبار سے ولید اور مولود کے ایک ہی معنی ہیں المفردات میں اس کے معنی نوزائیدہ بچہ ہے اور لکھا ہے کہ لغت کے لحاظ سے ہر چھوٹے بڑے کو ولید کہنا صحیح ہے جیسا کہ تازہ چنے ہوئے پھل کو 'جنی' کہا جاتا ہے اور جیسا کہ تازہ دودھ کو لبن کی بجائے حلیب کہا جاتا ہے۔ پھر جب بچہ بالغ ہو جائے تو اسے ولید نہیں کہتے۔ ولید اور مولود کا لفظ مذکر اور مؤنث، جیسا کہ المعجم الوسیط میں ہے، دونوں کے لیے بولا جاتا ہے۔ اس کی جمع وِلْدان ہے قرآن مجید میں وَالْمُسْتَضْعَفِينَ مِنَ الْوِلْدَانِ (النساء۴: ۱۲۷) 'کمزور بچوں' میں۔ ولدان سے مراد نر اور مادہ دونوں بچے ہیں کیونکہ زمانہ جاہلیت میں چھوٹے کمزور بچوں اور عورتوں کو وراثت سے محروم کر دیا جاتا تھا۔ اس کی مؤنث ولیدۃ آتی ہے جس کے معنی خاص طور پر کنیز ہے خواہ وہ بڑی ہی کیوں نہ ہو۔

والدان

والد کا تثنیہ ہے اس کا اطلاق ماں اور باپ دونوں پر ہوتا ہے۔ صاحب البحر المحیط، سورۃ بقرۃ کی آیت 'وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا' (۲: ۸۳) کے تحت لکھتے ہیں 'ماں اور باپ میں سے ہر ایک پر والد کا اطلاق ہوتا ہے۔ ظاہراً یہ اطلاق حقیقی ہے انھوں نے ایک مصرع کا حوالہ دیا ہے: ع۔ ذی ولد لم یلدہ ابوان 'ایسے بچے والا جس کو ماں باپ نے جنم نہیں دیا'۔

ام کو والد بھی کہا جاتا ہے اور والدہ بھی۔ ایک اور قول کو انھوں نے قیل (جو قول کے ضعف پر دلالت کرتا ہے) کہہ کر لکھا ہے یعنی کسی کا قول ہے کہ والد صرف باپ کو کہتے ہیں دونوں کو والد تغلیب کے طور کہا جاتا ہے۔ جیسے مومنون ہے تو مذکر، مگر اس میں عورتیں بھی شامل ہیں۔ Lane نے لکھا ہے: والد= A woman or any pregnant animal۔ صاحب البحر المحیط کے قول مختار کی تائید اس محاورے سے ہوتی ہے۔ جسے فیروز آبادی نے القاموس المحیط میں نقل کیا ہے۔ کہا جاتا ہے: 'شاۃ والد یا شاۃ والدۃ' یعنی حاملہ بکری۔ 'اقرب الموارد' میں ہے ولدت الأنثى یعنی مؤنث نے بچے کو جنم دیا فھی والد و والدۃ اسے والد بھی کہیں گے اور والدہ بھی۔ مفردات اور صاحب لسان العرب نے بنو سعد کی ایک مثل کو نقل کیا ہے: ولدك من دمّى عقبيك تیرا بچہ تو وہی ہے جو تیری ایڑھیوں کو خون آلود کرے یعنی تیرے پیٹ سے پیدا ہو تو تجھے نفاس کا اتنا خون آئے کہ تیری ایڑھیاں خون آلود ہو جائیں۔ اس مثال میں بچے کو ماں کی طرف منسوب کیا گیا ہے۔ اسی طرح قرآن مجید میں بچے کو ماں اور باپ دونوں کی

Marfat.com

طرف علیحدہ علیحدہ منسوب کیا گیا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: 'لَا تُضَآرَّ وَالِدَةٌ بِوَلَدِهَا وَلَا مَوْلُودٌ لَّهُ بِوَلَدِهِ' (البقرہ ۲:۲۳۳) 'ماں کو اس کے بچہ کی وجہ سے یا باپ کو اس کی اولاد کی وجہ سے کوئی ضرر نہ پہنچایا جائے'۔

یہاں والد کی جگہ مولود لہ استعمال ہوا ہے جس کا مطلب ہے کہ ولد اصلاً ماں ہی کی طرف منسوب ہوتا ہے کیونکہ فعلاً وہی والد ہوتی ہے۔صاحب البحر المحیط نے سورۃ نساء (۴:۷) کی آیت کے ضمن میں لکھا ہے: 'أبوان' کو والد اور والدہ اس لیے کہا جاتا ہے کہ بچہ دونوں سے ہوتا ہے۔ابن عطیہ کا قول ہے جیسا کہ شاعر نے کہا ہے: بحیث یعیش الغراب البائض 'جہاں بچے والا کوا گھونسلہ بناتا ہے' کیونکہ انڈا مذکر اور مؤنث دونوں سے مل کر بنتا ہے۔غراب کے یہاں مذکر ہونے سے دھوکا نہیں کھانا چاہیے کیونکہ غراب مذکر بھی استعمال ہوتا ہے اور مؤنث بھی۔ یہ وہ لفظ نہیں جس کی مؤنث کی تمیز تاء سے کی جائے۔ رعوب کی طرح مذکر اور مؤنث دونوں پر اس کا اطلاق ہوتا ہے چونکہ اس کی صفت بائض مذکر ہے اس لیے غراب کو ترجیحاً مذکر نہیں کہا جائے گا۔مذکر صفت اس احتمال کی بناء پر ہے کہ لفظی اعتبار سے وہ مذکر ہے اور اس میں تائے تانیث نہیں جیسا کہ عنترۃ الفلحاء میں لفظی اعتبار سے اس کی صفت مؤنث ہے۔ المفرادات میں ہے کہ ولد کا لفظ متبنیٰ کے لیے بھی بولا جاتا ہے جیسا کہ قرآن میں ہے: 'أَوْ نَتَّخِذَهُ وَلَدًا' (الیوسف ۱۲:۲۱؛ القصص ۲۸:۹) یا ہم اسے بیٹا بنالیں۔

اب ان آیات مبارکہ کا ذکر ہوگا جن میں ولد، مولود، اولاد اور والدین کے لفظ اہم معاشی، معاشرتی اور اقتصادی معاملات کے سلسلہ میں وارد ہوئے ہیں۔جس طرح اولاد کے لفظ میں بیٹی اور بیٹے کے سوا نیچے تک سب شامل ہیں جیسے پوتا، پڑپوتا، دھوتا، پڑدھوتا۔اسی طرح لفظ والدین میں اوپر تک سب شامل ہیں جیسے دادا، پردادا، دادی، پردادی، نانا، پڑنانا، نانی، پڑنانی۔

بچے کی تربیت میں ماں اور باپ کا اشتراک

اللہ کا ارشاد ہے: 'وَالْوَالِدَاتُ يُرْضِعْنَ أَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ لِمَنْ أَرَادَ أَن يُتِمَّ الرَّضَاعَةَ وَعَلَى الْمَوْلُودِ لَهُ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ لَا تُكَلَّفُ نَفْسٌ إِلَّا وُسْعَهَا لَا تُضَآرَّ وَالِدَةٌ بِوَلَدِهَا وَلَا مَوْلُودٌ لَّهُ بِوَلَدِهِ' (البقرہ ۲:۲۳۳)۔ 'مائیں اپنی اولاد کو دو سال کامل دودھ پلائیں۔یہ ان باپوں کے لیے جن کا ارادہ دودھ پلانے کی مدت بالکل پوری کرنے کا ہو۔اور باپ پر ان کا کھانا اور لباس واجب ہے۔ہر نفس کو اتنی ہی تکلیف دی جاتی ہے جتنی اس کی طاقت ہو۔ماں کو اس کے بچہ کی وجہ سے یا باپ کو اس کے بچہ کی وجہ سے کوئی ضرر نہ پہنچایا جائے'۔

Marfat.com

آیت مبارکہ اگرچہ احکام طلاق کے فوراً بعد وارد ہوئی ہے۔ مگر اس کے الفاظ اور اسلوب عام ہیں اس لیے اس کا اطلاق ہر ماں باپ پر ہوتا ہے خواہ وہ شادی کے بندھن میں بندھے ہوں یا ان کے درمیان طلاق ہو چکی ہو، بچے کی تربیت کے سلسلہ میں ان میں سے ہر ایک نے اپنا فرض نبھانا ہے۔ رضاعت باپ پر واجب ہے نہ کہ ماں پر۔ جیسا کہ لمن اراد ان یتم الرضاعة کے الفاظ سے ظاہر ہے۔ اس پر واجب ہے کہ وہ دودھ پلانے والی کا بندوبست کرے ہاں اگر ماں اپنی خوشی سے بچے کو دودھ پلانے کے لیے راضی ہو جائے تو اور بات ہے لیکن اسے اس پر مجبور نہیں کیا جا سکتا۔ مصنوعی رضاعت کو بھی اسی پر قیاس کیا جا سکتا ہے۔ رضاعت باہمی رضامندی سے نہیں ہوگی اس کے لیے صرف ماں کی رضا واجب ہے۔ امام ابوحنیفہ کے نزدیک جب تک ماں بیوی ہو یا نکاح کی عدت گزار رہی ہو، اسے رضاعت کی اجرت نہیں دی جا سکتی مگر امام شافعی کے نزدیک اجرت دی جا سکتی ہے۔ عدت گزرنے کے بعد سب کے نزدیک اجرت دی جا سکتی ہے۔ لیکن ہر والدہ کو بچے کی پرورش کے لیے غذا اور لباس کی ضرورت ہوتی ہے۔ والدہ غذا کھائے گی تو بچے کے لیے دودھ بنے گا۔ اس لیے بچے کی پرورش کا بوجھ بچے کے باپ پر ڈالا گیا ہے اس پر واجب ہے کہ وہ ماں کی تمام ضروریات پوری کرے۔

المولودله

اپنے مفسر مرد کی برتری کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ المولود له قرآن میں والد کے معنوں میں استعمال ہوا ہے مگر اپنے مفسر اس سے یہ معنی نکالتے ہیں، کو بچہ تو ہوتا ہی باپ کے لیے ہے۔ ماں تو ایک برتن کا کام دیتی ہے۔ چنانچہ انھوں نے اس بارے میں ایک شعر نقل کیا ہے؛ جسے مامون الرشید کی طرف منسوب کیا گیا ہے:

وانما امهات الناس وعاء
مستودعات للآباء أبناء

لوگوں کی مائیں تو بس برتن ہیں جس میں چیز حفاظت کے
لیے رکھی جاتی ہے بیٹے تو باپوں کے ہوتے ہیں۔

اس شعر میں ماں کو برتن جیسی چیز سمجھا گیا ہے۔ اس شعر پر تبصرہ کرتے ہوئے علامہ رشید رضا نے تفسیر المنار میں لکھا ہے کہ مامون کا یہ شعر جاہلی معاشرے پر فٹ بیٹھتا ہے۔ اسلام کی تعلیم تو یہ ہے کہ بچہ والدین کا ہوتا ہے نہ کہ والد کا۔ وہ دونوں مل جل کر فطرت کے تقاضوں اور زوجیت کے حقوق کے مطابق اس کی پرورش کرتے ہیں۔ مولود له کی تعبیر والدات کے مقابلہ میں نفقہ کے وجوب کی علت

Marfat.com

سے آگاہ کرنے کے لیے اختیار کی گئی ہے گویا کہا گیا ہے کہ اے مرد! ان ماؤں نے اس بچے کا حمل اُٹھا کر تیری خاطر جنم دیا جس کو وہ دودھ پلا رہی ہیں۔ یہ بچہ تیری طرف منسوب ہے اور تیرے سلسلہ نسب کا محافظ نہ کہ ان کے سلسلہ نسب کا۔ اس لیے تم پر واجب ہے کہ تو ان کو اتنا روٹی اور کپڑا مہیا کرے جو ان کی معاشی ضروریات کو پورا کرے تا کہ وہ اپنا کام اچھی طرح سرانجام دے سکیں۔ اسی لیے والد کی جگہ مولود لہ کی تعبیر اختیار کی گئی ہے جو مفہوم اس سے ادا ہونا چاہیے تھا بلاغت کے تقاضے کے مطابق اس کے لیے یہی تعبیر موزوں تھی۔ قرآن کے علاوہ یہ دقت بیان آپ کو کہاں مل سکتی ہے؟

یہ امر واقعہ ہے کہ بچہ زیادہ تر ماں کا جزو بدن ہوتا ہے۔ اسی کے رحم میں اس کی پرورش ہوتی ہے اور اسی کے شکم میں وہ تنومند ہوتا ہے۔ ماں کو بس برتن کہنا اور بچے کو باپ کے کھاتے میں ڈال دینا جاہلانہ تصور ہے۔ اس کے باوجود اپنے مفسر عورت کو فروتر ثابت کرنے کے لیے اسی تصور کی طرف رجوع کرتے ہیں۔

آیت کے الفاظ 'جس مرد کا ارادہ دودھ پلانے کی مدت پوری کرنے کا ہو' سے معلوم ہوتا ہے کہ دو سال سے کم مدت تک بھی دودھ پلایا جا سکتا ہے۔ البتہ زیادہ سے زیادہ مدت دو سال ہے جب بچے کے دانت نکل آتے ہیں۔ یہ مدت اسی لیے مقرر کی گئی ہے کہ دو سال کے بعد دانتوں کی وجہ سے ماں کو تکلیف نہ ہو۔ لاتضار والدة بولدها۔۔۔ آیت کے اس ٹکڑے میں یہ بتایا گیا ہے کہ بچہ کو باہمی سودے بازی اور ایذارسانی کے لیے استعمال نہ کیا جائے بلکہ باہمی رضامندی سے معقول اور منصفانہ طریقہ اختیار کیا جائے مثلاً دودھ پلانے کی مدت اور دودھ پلانے والی کا بندوبست کرنے کے سلسلہ میں منصفانہ طرز عمل اختیار کیا جائے اور اس بات کا خاص خیال رکھا جائے کہ ماں کو تکلیف نہ ہو مثلاً ماں بچے کو اپنے پاس رکھنا چاہے مگر ممتا کے جذبہ کو نظر انداز کرتے ہوئے اس سے چھین لیا جائے یا نفقہ کی ذمہ داری اُٹھائے بغیر اسے دودھ پلانے پر مجبور کیا جائے۔ دو برس سے زیادہ جبراً دودھ نہ پلایا جائے۔ باپ کو تکلیف پہنچانے سے مراد یہ ہے کہ اس کی حیثیت سے بڑھ کر اس سے مال کا مطالبہ کیا جائے۔ بچہ دونوں کا ہے ولدھا اور ولدہ اس لیے ذمہ داری بھی مشترکہ ہے۔ لا تضار کا فعل مشارکت پر دلالت کرتا ہے اور اسے والدین میں سے ہر ایک کی طرف اس لیے منسوب کیا گیا ہے تا کہ یہ تنبیہ کی جائے کہ ایک دوسرے کو نقصان پہنچانا اپنے آپ کو نقصان پہنچانا ہے۔ ایسے والدین کے یہاں بچے کی تربیت کیسے ہو سکتی ہے جو ایک دوسرے کو ضرر یا ایذا پہنچانے کے درپے ہوں؟

Marfat.com

اولاد اور ورثہ

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''یُوصِیکُمُ اللّٰہُ فِی اَولَادِکُم لِلذَّکَرِ مِثلُ حَظِّ الاُنثَیَینِ'' (النساء ۴:۱۱) ''اللہ تعالیٰ تمھیں تمہاری اولاد کے بارے میں حکم دیتا ہے کہ ایک لڑکے کا حصہ دو لڑکیوں کے برابر ہے''۔

اس سے پہلے سورۃ نساء کی آیت نمبر ے میں دو اصول مقرر کئے گئے ہیں۔ ایک یہ کہ جو مال والدین یا قریبی رشتہ دار مرنے کے بعد چھوڑ جائیں، اس میں عورت اور مرد دونوں شریک ہیں۔ مال تھوڑا ہو یا زیادہ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا بلکہ دونوں کی شرکت کی تاکید کے لیے مِمَّا تَرَکَ الوَالِدَانِ وَالاَقرَبُونَ (جو مال والدین اور قریبی چھوڑیں) کا تکرار کیا گیا ہے۔ دوسرے یہ کہ دونوں کا حصہ مقرر ہے یعنی کوئی اس حصہ میں ذرہ برابر کمی کرنے کا مجاز نہیں۔ (۴:۱۱) البحر المحیط میں المروزی کا قول نقل کیا گیا ہے کہ اہلِ یونان ورثے کا سارا حصہ بیٹوں کو دے دیتے تھے کیونکہ عورتیں مردوں کی نسبت کمانے سے قاصر ہوتی تھیں جبکہ عرب عورتوں کو بالکل حصہ نہیں دیتے تھے۔ اللہ نے (عدل کرتے ہوئے) دونوں کو حصہ دے دیا۔

ظہورِ اسلام سے پہلے جاہلی معاشرے میں عورت کو وراثت سے محروم رکھا جاتا تھا کیونکہ وہ لوٹ مار اور غارت گری میں حصہ لینے کے قابل نہ تھی۔ اسی طرح اس بناء پر چھوٹے بچوں کو بھی حصہ نہیں دیا جاتا تھا۔ صرف بڑے لڑکے جو لڑنے کے قابل ہوتے سارے مال کے وارث قرار پاتے۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ مردوں کی طرح عورتیں اور چھوٹے بچے اپنے والدین اور قریبی رشتہ داروں کے ترکہ میں حصہ دار ہوں گے اور ان میں سے کسی کو محروم نہیں کیا جائے گا لفظ اولاد میں لڑکے چھوٹے ہوں یا بڑے، اسی طرح لڑکیاں چھوٹی ہوں یا بڑی سب شامل ہیں۔ یہاں تک کہ ماں کے پیٹ میں پرورش پانے والا بچہ بھی وارث ہوگا۔ شافعیوں کے نزدیک اولاد کے مفہوم میں بیٹے کی اولاد مجازاً داخل ہے جبکہ حنفیوں کا قول ہے کہ لفظ اولاد کا استعمال حقیقی ہے اس لیے اس کا اطلاق میت کی صلبی اور نسلی اولاد پر ہوگا۔

سب سے پہلے اولاد کے حصہ کا ذکر اس لیے کیا گیا ہے کیونکہ انسان کی وابستگی اولاد کے ساتھ شدید تر ہوتی ہے اسی لیے نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''فاطمۃ بضعۃ منی'' فاطمہ میرا ٹکڑا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اولاد کے ورثہ کا ذکر پہلے کیا گیا ہے۔

شریعت میں عورت کے حصے کو اصل تصور کر کے مرد کے حصہ کو اس پر محمول کیا گیا ہے اور حصہ کی اضافت عورتوں کی طرف کی گئی ہے۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو عبارت یوں ہوتی للانثی نصف حظ الذکر یعنی حظ کی اضافت ذکر کی طرف ہوتی۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ عورت کا حصہ مقرر اور معروف

Marfat.com

ہے۔ مفتی محمد عبدہ کی یہی رائے ہے۔ اس کے برعکس صاحب کشاف نے اپنے دماغ میں جمے ہوئے تصور کے تحت اس کی توجیہ یہ کی ہے کہ مرد کے حصہ کا پہلے ذکر کیا گیا ہے کیونکہ وہ افضل ہے اور اسی وجہ سے اس کا حصہ دگنا مقرر کیا گیا ہے۔ یہ توجیہ غیر منطقی ہونے کے علاوہ علم بیان کے اصول کے خلاف ہے کیونکہ مشبہ بہہ مشبہ سے افضل ہوتا ہے۔ یہی غلطی مفسرین سے سورۃ آلِ عمران کی آیت (۳۶:۳) وَلَيْسَ الذَّكَرُ كَالْأُنْثَىٰ کی تفسیر میں سرزد ہوئی ہے۔ لطف کی بات یہ ہے کہ خود صاحب کشاف نے آل عمران کی آیت کی تفسیر میں اس غلطی کی طرف توجہ دلائی ہے۔ جنسی تعصب صاحب کشاف کے پائے کے مفسرین کے منہ سے بھی کیا کیا باتیں نکلواتا ہے؟ یہاں اس تعبیر کو اس لیے اختیار کیا گیا ہے کہ دورِ جاہلیت کے اس دستور کو کہ عورت ورثے کی حقدار نہیں باطل قرار دیا جائے۔ اس بات کی تائید یوں ہوتی ہے کہ دونوں آیات (گیارہ اور بارہ) میں باقی فرائض کے سلسلہ میں یا تو عورت کے حصہ کو مطلقاً پہلے بیان کیا گیا ہے یا اس کو مرد کے حصہ کے مقابلہ میں بیان کیا گیا ہے جیسا کہ والدین بہن بھائی کے حصوں کے سلسلہ میں۔

نسلی بیٹے کا اور صرف ماں کے بیٹے کا ایک ہی حکم ہے

سورۃ نساء کی آیت نمبر ۱۱ میں ہے ان كان له ولد، اگر مرنے والے کی اولاد ہو تو ماں باپ کو چھٹا حصہ ملے گا اور اگر اولاد نہ ہو تو حصہ اور طرح ہوگا۔ بالکل یہی الفاظ آیت نمبر ۱۲ میں ہیں۔ ان كان لهن ولد یعنی اگر بیویوں کی اولاد ہو۔ یہاں بچے سے مراد ظاہری طور پر وہ بچہ ہے جسے ماں نے جنم دیا ہو خواہ وہ نر ہو یا مادہ، واحد ہو یا جمع۔ کہا یہ گیا ہے کہ اے وارثو! وہ بچہ خواہ تمہاری نسل سے ہو یا کسی اور نسل سے۔ دونوں کا ایک ہی حکم ہے کیونکہ شوہر کے لیے بیوی کے بچے کی صورت میں چوتھائی حصہ مقرر کیا گیا ہے اور یہ بچہ شوہر کے حصہ کا حاجب ہے جیسے آیت نمبر ۱۱ میں نسلی بچہ ماں باپ کے حصہ کا حاجب (نقصان کا سبب) ہے۔

دوسری اہم بات یہ ہے کہ بیٹے کی اولاد یعنی پوتا پوتی اولاد میں اجماعاً شامل ہیں اس کے لیے شوکانی کی فتح القدیر اور تفسیر ابن کثیر دیکھی جاسکتی ہے۔

مرد کا حصہ عورت سے دُگنا کیوں ہے؟

امام رازی نے تفسیر کبیر میں سوال اُٹھایا ہے کہ جب عورت کی کمزوری ایک مسلمہ امر ہے تو لازم آیا ہے کہ اس کا حصہ مرد سے زیادہ نہ ہو تو کم از کم برابر تو ہو۔ اس میں کیا حکمت ہے کہ اللہ نے اس کا حصہ

Marfat.com

آدھا رکھا۔اس کی انھوں نے تین طرح سے توجیہ کی ہے۔سب سے پہلے اُنہوں نے یہ وجہ بیان کی ہے کہ عورت کا خرچ کم ہوتا ہے کیونکہ اس کے نان ونفقہ کا ذمہ دار مرد ہوتا ہے۔مرد کا خرچ زیادہ ہے کیونکہ اپنے علاوہ اپنی بیوی پر بھی خرچ کرتا ہے اور جس کا خرچ زیادہ ہوتا ہے وہ مال کا زیادہ محتاج ہوتا ہے۔اس کے بعد وہ دوسری وجہ یہ بیان کرتے ہیں کہ مرد تخلیق میں یا عقل میں اور دینی مناسبت میں عورت سے زیادہ کامل ہوتا ہے۔عورت نہ قاضی ہوسکتی ہے نہ امام۔پھر عورت کی گواہی مرد سے آدھی ہے؛ جس میں یہ صلاحیت ہو لازم ہے کہ اس پر اللہ کا انعام بھی زیادہ ہو۔تیسرے عورت کی عقل ناقص ہے اور اس پر شہوت کا غلبہ ہوتا ہے اگر اسے زیادہ مال دیا جائے تو فساد کا سبب ہوگا اس کے بعد دلیل کے طور پر انھوں نے ایک شعر لکھا ہے:

ان الفراغ والشباب والجدة
مفسدة للمرء ای مفسدة

بے شک فراغت شباب اور تونگری
انسان کو کافی بگاڑ دیتی ہے!

حیران ہوں امام رازی کے پائے کے مفسر نے مندرجہ بالا شعر کو عورت پر کیسے چسپاں کردیا؟ حالانکہ شعر میں لفظ المرء ہے جس کا مطلب انسان ہے،اس لفظ کا اطلاق مرد اور عورت پر یکساں ہوتا ہے اسے عورت تک کیسے محدود کر دیا گیا۔یہ شعر معروف ہے لیکن کسی نے اس سے وہ مطلب نہیں نکالا جو امام صاحب نے جنسیؔ تعصب کی بنیاد پر نکالا ہے۔خدا لگتی یہ ہے کہ امام صاحب نے جو وجوہات بیان کی ہیں ان میں سے سب سے زیادہ منطقی وجہ وہی ہے جسے انھوں نے خود پہلے نمبر پر بیان کر دیا ہے۔مرد اپنے آپ پر بھی خرچ کرتا ہے اور اپنی بیوی پر بھی۔اس لیے اس کا حصہ دوگنا رکھا گیا ہے۔قرآن کا یہ حکم عدل و انصاف کے تقاضوں کے عین مطابق ہے یہ عورت پر ظلم نہیں کیونکہ بیوی کا نان ونفقہ میاں پر واجب ہے۔اس کی کفالت اس کے ذمہ ہے۔اس کے علاوہ عورت کے پاس جو مال حق مہر کی صورت میں یا جائیداد کی صورت میں ہوتا ہے وہ اسے اپنے گھر پر خرچ کرنے کی مکلف نہیں،وہ جیسے چاہے اس میں تصرف کرسکتی ہے۔مرد اس میں دخل انداز ہونے کا مجاز نہیں۔اگر مالی ذمہ داریوں کو مدنظر رکھا جائے تو عورت کا حصہ مرد سے بعض حالات میں زیادہ ہو جاتا ہے۔اللہ تعالیٰ کسی پر ظلم نہیں کرتا کیونکہ وہ عادل بھی ہے اور حکیم بھی۔جہاں مالی ذمہ داریوں کا مسئلہ نہ ہو وہاں عورت اور مرد کو برابر کا حصہ ملتا ہے۔مثلاً اگر متوفی صاحب اولاد ہو تو ماں باپ دونوں کو مساویانہ طور پر چھٹا حصہ ملے گا۔لیکن اگر اولاد نہ ہو اور صرف

Marfat.com

ماں باپ وارث ہوں تو ماں کو تیسرا حصہ ملے گا اور باپ کو دو تہائی۔ باپ ہونے کی حیثیت اسے ایک تہائی ملے گا دوسرا تہائی اسے عصبہ ہونے کی حیثیت میں مل رہا ہے نہ کہ باپ کی حیثیت سے۔ عصبہ ہونے کی حیثیت سے ذمہ داریاں بڑھ جاتی ہیں۔ اولاد کی موجودگی میں ماں باپ میں برابری اس لیے ہے کہ وہ ان کا برابر کا احترام کریں۔ مالی ذمہ داریوں کے پیش نظر ورثہ میں والدین کا حصہ اولاد سے کم ہے۔ کیونکہ والدین کو اس عمر میں مال کی چنداں ضرورت نہیں ہوتی کیونکہ وہ اپنی ذمہ داریوں سے فارغ ہو چکے ہوتے ہیں۔ اول تو ان کے پاس اپنے گزارے کے لیے اثاثہ ہوتا ہے۔ دوسرے ان کی اولاد پر ان کا نفقہ واجب ہوتا ہے۔ رہی اولاد وہ یا تو اتنے چھوٹے ہوتے ہیں کہ کما نہیں سکتے۔ اگر بڑے ہوں تو شادی بیاہ اور بچوں کی تربیت کے لیے ان کو مال کی ضرورت ہوتی ہے اس لیے ان کا حصہ والدین کے مقابلہ میں زیادہ ہوتا ہے۔ اسی طرح کلالہ (لاولد متوفی) کے ورثا میں بھی تذکیرو تانیث کا کوئی فرق نہیں۔ اگر اس کا ایک بھائی اور ایک بہن ہو تو ہر ایک کو چھٹا حصہ ملے گا اور اگر بہن بھائی زیادہ ہوں تو 1/3 میں سب برابر کے شریک ہوں گے۔

رہی امام صاحب کی دوسری توجیہات تو وہ اس زمانہ کے روایتی ذہن کی پیداوار ہیں ان میں سے اکثر کا جواب میں پہلے دے چکا ہوں، ویسے بھی اس زمانہ میں کون یقین کرے گا کہ عورت کی عقل ناقص ہے یا وہ قاضی بننے کی اہل نہیں یا یہ کہ ہر معاملہ میں ان کی گواہی آدھی ہوتی ہے۔ یہ باتیں طے ہو چکی ہیں ان پر بات کرنا ذہنی عیاشی کے مترادف ہے۔ کونسا ایسا منصب ہے جس پر عورت فائز نہیں؟ ہر میدان میں انھوں نے اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوایا ہے البتہ امام صاحب کا یہ قول کہ عورتوں پر شہوت کا غلبہ ہوتا ہے اور وہ کم عقل ہوتی ہیں اور ان کے پاس زیادہ مال کا ہونا غلط جگہوں پر انفاق کا سبب ہو سکتا ہے۔ یہ انتہائی خلاف واقعہ اور غیر منطقی قول ہے کہ عقل میں ضعف کا تقاضا یہ ہے کہ عورتوں کو زیادہ حصہ ملے کیونکہ وہ کمانے سے قاصر ہونگی۔ ان کی یہ کمزوری زیادہ حصے کا مطالبہ کرتی ہے نہ کہ کم حصے کا۔ یہ قول کہ مردوں کی نسبت عورتوں پر شہوت کا غلبہ ہوتا ہے باطل ہے جس کی بنیاد بیمار سوچ پر رکھی گئی ہے۔ مشاہدہ سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ مرد اپنی شہوت کی تسکین کے لیے بے دردی سے مال خرچ کرتے ہیں۔ بہت کم دیکھنے میں آیا ہے کہ کسی عورت نے ان شہوات کے لیے مال خرچ کیا ہو۔ مرد اس لیے مال خرچ کرتے ہیں کیونکہ وہ شہوت اور وحشت میں بڑھ کر ہوتے ہیں۔ اسی لیے ہمارے مذہبی رہنما مردوں کے اس مزاج کے پیش نظر ان کے لیے تعدد ازواج کا جواز ڈھونڈتے ہیں۔ تجربہ بتاتا ہے کہ عورت مرد کے مقابلہ میں کفایت شعار ہوتی ہے اگر گھر کا خرچ مرد کے ہاتھ میں ہو تو ان کے اسراف کی کوئی حد نہیں

Marfat.com

ہوتی۔اس لیے اکثر و بیشتر شوہر گھر کا خرچ بیوی کے حوالہ کر دیتے ہیں کیونکہ وہ خرچ کم کرتی ہے اور کچھ نہ کچھ بچا بھی لیتی ہے۔

قتل اولاد

سورۃ انعام میں تین مختلف مقامات پر قتل اولاد کا تذکرہ ہے۔پہلے دو مقام پر یعنی آیت نمبر (۶:۱۳۷) اور آیت نمبر (۶:۱۴۰) قتل اولاد کے ساتھ اِن جانوروں کی حرمت کا بیان ہے جن کو لوگوں نے خود ہی اپنی وہم پرستی کی بنیاد پر حرام قرار دے رکھا تھا۔اِن دونوں مقامات پر قتل اولاد سے مراد معبودوں اور بتوں کے لیے اولاد کو قربان کرنا ہے۔یہ مشرکانہ توہمات عربوں سے پہلے یہودیوں میں بھی رائج تھے۔وہ قتل اولاد کو عین عبادت اور قدرت الٰہی کا ذریعہ سمجھتے تھے۔شاید اس رسم کو شیطان نے ابراہیم کی سنت کو خلط ملط کر کے ان کے لیے مزین کر دیا تھا (دیکھیے استثنا باب ۱۲ آیت ۳۱)۔اس لیے وہ اپنے بیٹوں اور بیٹیوں کو دیوتاؤں کے نام پر آگ میں ڈال کر جلا دیتے تھے۔عربوں میں بھی بعض لوگ ایسی منت مان لیتے کہ اگر فلاں مراد پوری ہو جائے یا اتنے بیٹے ہو جائیں تو ایک بیٹا قربان کر دوں گا جیسا کہ عبدالمطلب نے اپنے بیٹے عبداللہ کے بارے میں قسم اُٹھائی۔اس قسم کی رسم پہلے ہندوؤں میں بھی مروج تھی۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ’’وَكَذَٰلِكَ زَيَّنَ لِكَثِيرٍ مِّنَ الْمُشْرِكِينَ قَتْلَ أَوْلَادِهِمْ شُرَكَاؤُهُمْ لِيُرْدُوهُمْ وَلِيَلْبِسُوا عَلَيْهِمْ دِينَهُمْ‘‘ (الانعام ۶:۱۳۷) ’اور اسی طرح بہت سے مشرکین کے لیے ان کے معبودوں نے ان کی اولاد کے قتل کرنے کو مزین کر دیا تھا تاکہ وہ انہیں ہلاک کر دیں اور ان کا دین ان پر خلط ملط کر دیں‘۔

اس آیت میں شرکاء سے مراد بقول مجاہد شیاطین یا بقول کلبی بتوں کے خادم اور دربان ہیں جو مشرکین کے لیے قتل اولاد کو مزین کرتے تھے۔دین کے نام پر مزین کرنے کے اس عمل میں جاہلانہ رسم و رواج نے بھی خوب کردار ادا کیا ہے۔وہ ایسا اس لیے کرتے تھے تاکہ وہ ان کے لیے ان کے دین کو خلط ملط کر کے ان کو برباد کر دیں۔چنانچہ بتوں کے سامنے بچوں کی قربانی پیش کرنے کا سبب یہ نہیں تھا کہ وہ اللہ کو رازق تصور نہیں کرتے تھے یا ان کو فقر کا ڈر تھا۔دوسری آیت میں واضح طور پر کہا گیا ہے: ’’قَدْ خَسِرَ الَّذِينَ قَتَلُوا أَوْلَادَهُمْ سَفَهًا بِغَيْرِ عِلْمٍ‘‘ (الانعام ۶:۱۴۰) ’یقیناً خسارے میں رہے وہ لوگ جنہوں نے اپنی اولاد کو محض براہ حماقت کسی سند کے بغیر قتل کر ڈالا‘۔سَفَهًا بِغَيْرِ عِلْمٍ میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ وہ کم عقل اور جاہل ہیں۔قتل اولاد کا سبب حماقت و جہالت اور توہم پرستی ہے۔اس جاہلانہ

Marfat.com

رسم کے مطابق وہ بیٹوں کو بھی بھینٹ چڑھاتے تھے اور بیٹیوں کو بھی۔

چنانچہ ان دو آیات میں قتل کو فقر یا غیرت کی طرف منسوب کرنے کی کوئی گنجائش نہیں جیسا کہ بعض مفسروں نے کیا ہے۔

بیٹیوں کو زندہ درگور کرنا

سورۃ انعام میں اللہ کا ارشاد ہے: 'وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ مِّنْ اِمْلَاقٍ نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَاِيَّاهُمْ' (۶:۱۵۱) 'اور اپنی اولاد کو مفلسی کے ڈر سے قتل نہ کرو ہم تم کو اور ان کو رزق دیتے ہیں'۔ اس مضمون کو سورۃ نحل (۱۶:۵۸تا۵۹) اور سورۃ تکویر (۸۱:۸تا۹) میں بھی بیان کیا گیا ہے، میں نے لفظ بنت کے تحت اس کی تفصیل بیان کر دی ہے۔ اختصار کے ساتھ یہاں بھی تذکرہ بے محل نہ ہوگا۔ آیت سے پہلے شرک سے اجتناب، والدین سے حسن سلوک، بچوں کا عدم قتل یعنی اُن کے حقوق کا احساس اور بعد میں ظاہری و باطنی بے حیائی سے بچاؤ، قتل ناحق سے دوری، یتیم کے مال کی حرمت، ناپ تول کو پورا کرنے کا حکم ہے۔ گویا پورے کا پورا نظام اخلاق ہے جو ایک دوسرے سے مربوط ہے۔ اسی میں فرد اور معاشرے کی مصلحت ہے۔ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور شفقت و بندہ پروری کا ادراک ماں باپ کی شفقت سے ہوتا ہے اور ماں باپ کی شفقت سے اولاد سے محبت کے چشمے پھوٹتے ہیں جو سوسائٹی کی بنیاد ہے۔ ظاہری و باطنی بے حیائی، قتل ناحق اور ناپ تول میں کمی اس سوسائٹی کی جڑیں کھوکھلی کر دیتے ہیں۔

آیت میں اولاد سے مراد صرف بیٹیاں ہیں جن کو عرب فقر کے خوف سے زندہ درگور کر دیتے تھے جیسا کہ سورۃ تکویر میں ہے: 'وَاِذَا الْمَوْءٗدَةُ سُئِلَتْ ○ بِاَيِّ ذَنْۢبٍ قُتِلَتْ' (۸۱:۸تا۹) اور جب زندہ درگور لڑکی سے سوال کیا جائے گا کہ کس گناہ کی وجہ سے اسے قتل کیا گیا؟

اس رسم کا آغاز کیسے ہوا؟ روح المعانی میں ایک حکایت نقل کی گئی ہے کہ نعمان بن منذر (والی حیرہ) نے کسی قبیلے پر حملہ کیا اور اس کی عورتوں کو قید کر لیا۔ ان میں سردار قیس بن عاصم کی بیٹی بھی تھی پھر دونوں کے درمیان صلح ہو گئی۔ عورتوں کو اختیار دیا گیا تو سب عورتوں نے اپنے قبیلے کا انتخاب کیا سوائے قیس کی بیٹی کے، اُس نے قید کرنے والے کا انتخاب کیا۔ اس کے بعد قیس نے قسم کھائی کہ اس کے یہاں جو بیٹی پیدا ہو گی اسے زندہ دفن کر دے گا۔ اس کے بعد سے یہ رسم چل نکلی۔ سارے کے سارے عرب بیٹیوں کو زندہ درگور نہیں کرتے تھے ربیعہ اور مضر کے بعض قبائل ایسا کرتے تھے۔ زیادہ تر لوگ فقر و فاقہ کی وجہ سے ایسا کرتے تھے جیسا کہ آیت زیر بحث سے ظاہر ہوتا ہے لیکن کچھ لڑکیوں کو بیاہنے یا ان کے قیدی ہونے کی عار کے خوف سے بھی ایسا کرتے تھے جیسا کہ سورۃ نحل میں اللہ کے قول سے ظاہر ہوتا ہے کہ

Marfat.com

وہ غیرت کی وجہ سے بھی ایسا کرتے تھے۔ اللہ کا ارشاد ہے: ' وَإِذَا بُشِّرَ أَحَدُهُمْ بِالْأُنْثَى ظَلَّ وَجْهُهُ مُسْوَدًّا وَهُوَ كَظِيمٌ ٥ يَتَوَارَى مِنَ الْقَوْمِ مِن سُوءِ مَا بُشِّرَ بِهِ أَيُمْسِكُهُ عَلَى هُونٍ أَمْ يَدُسُّهُ فِي التُّرَابِ أَلَا سَاءَ مَا يَحْكُمُونَ ' (۱۶: ۵۸تا۵۹) 'ان میں سے کسی کو جب لڑکی ہونے کی خوشخبری دی جاتی ہے تو اس کا چہرہ سیاہ ہو جاتا ہے اور وہ غمزدہ ہو جاتا ہے۔ اس خوش خبری کی برائی کی وجہ سے لوگوں سے چھپا پھرتا ہے (سوچتا ہے) کہ وہ اس برائی (لڑکی) کو ذلت کے باوجود تھامے رکھے یا اسے مٹی میں چھپادے۔ وہ کتنے برے فیصلے کرتے ہیں'۔

اس آیت سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ مشرکین بے جا غیرت کی وجہ سے بچیوں کو مٹی میں دفن کر دیا کرتے تھے۔ ان کے پاس دو اختیار تھے یا تو بے چاری لڑکی کو زندہ رہنے دیں اور اس کی وجہ سے حقارت اور ذلت کا سامنا کریں یا اسے مٹی میں دفن کر دیں اور اس سے نجات حاصل کر لیں۔

سورۃ تکویر کی آیت اسی بات کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ درد بھری اس دنیا میں کتنے ستم ڈھائے جاتے ہیں۔ جرم کا ثبوت چھوڑے بغیر کتنی معصوم اور بے بس جانیں قربان ہو جاتی ہیں لیکن مجرم کو انصاف کے کٹہرے میں کھڑا نہیں کیا جاتا۔ اس کی نمایاں مثال قریش کی آنکھوں کے سامنے بچیوں کو زندہ در گور کرنے کی رسم تھی۔ رسم ورواج کی آڑ میں یہ جرم کیا جاتا تھا، نہ کوئی انگلی اٹھتی تھی نہ احتجاج ہوتا تھا۔ مگر ایک جہاں ایسا ہے جہاں خالق کائنات مقتول سے سوال ضرور پوچھے گا۔ پوچھنے والے کو پوچھنے کی کیا ضرورت ہے وہ تو علیم وخبیر ہے، وہ تو مقتول کو بتانا چاہتا ہے کہ اب تم آزاد ہو تمھارے لب بھی آزاد ہیں بولو تمھیں کس پاداش میں قتل کیا گیا؟ عدل وانصاف کی اس دنیا میں مقتول بچی بولے گی کہ وہ بے گناہ ہے۔ جن ذرائع سے شواہد کو چھپانے کی کوشش کی گئی انھی ذرائع سے ثبوت اکھٹے کیے جائیں گے اور مجرم کو اس کے جرم کی سزا ضرور ملے گی۔

بیٹیوں کے زندہ در گور کرنے اور ضبط ولادت یا خاندانی منصوبہ بندی میں کیا کوئی مشابہت ہے؟

ضبط ولادت کے خلاف دلیل دیتے ہوئے ان قرآنی آیات کو پیش کیا جاتا ہے جن میں اولاد کو قتل کرنے سے منع کیا گیا ہے۔ قرآن حکیم نے مندرجہ ذیل چار مقامات پر قتل اولاد سے منع کیا ہے:

۱۔ ارشاد ربانی ہے: ' وَكَذَٰلِكَ زَيَّنَ لِكَثِيرٍ مِّنَ الْمُشْرِكِينَ قَتْلَ أَوْلَادِهِمْ ' (الأنعام ۶: ۱۳۷) 'اسی طرح بہت سے مشرکین کے لیے ان کے معبودوں نے قتل اولاد کو مزین کر رکھا ہے'۔

۲۔ ' وَلَا تَقْتُلُوا أَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ إِمْلَاقٍ نَّحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَإِيَّاهُمْ ' (الأنعام ۶: ۱۵۱) 'اور

Marfat.com

اپنی اولاد کو مفلسی کے ڈر سے قتل نہ کرو۔ہم تمھیں بھی رزق دیتے ہیں اور ان کو بھی'۔

۳۔ 'وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ اِمْلَاقٍ' (بنی اسرائیل ۱۷:۳۱)' اپنی اولاد کو مفلسی کی وجہ سے قتل نہ کرو'۔

۴۔ 'يَتَوَارٰى مِنَ الْقَوْمِ مِنْ سُوْٓءِ مَا بُشِّرَ بِهٖ اَيُمْسِكُهٗ عَلٰى هُوْنٍ اَمْ يَدُسُّهٗ فِى التُّرَابِ' (النحل ۱۶:۵۹)' اس خوشخبری (بچی کی پیدائش کی) سے اسے جو رنج پہنچتا ہے اس کی وجہ سے وہ لوگوں سے چھپتا پھرتا ہے کہ اس ذلت کو وہ اُٹھائے پھرے یا اسے مٹی میں دفن کردے'۔

مندرجہ بالا آیات مبارکہ کی رو سے لوگ تین وجوہات کی بنیاد پر اپنی اولاد کو قتل کرتے تھے۔

۱۔ دیوتاؤں کو خوش کرنے کے لیے۔

۲۔ نادار ہونے کی وجہ سے۔

۳۔ خودساختہ غیرت کی وجہ سے۔

ضبطِ ولادت کے مخالفین صرف ان آیات سے استدلال کرتے ہیں جن میں ناداری کے باعث اولاد کو قتل کیا جاتا تھا۔ان آیات میں کم وبیش سب مفسرین نے بیٹیوں کو زندہ درگور کرنا مراد لیا ہے۔یہ آیات بیٹوں کو قتل کرنے کے بارے میں نہیں۔اس لیے یہاں قتلِ اولاد کو خاندانی منصوبہ بندی پر چسپاں کرنا قرین قیاس نہیں۔

اولاد صرف اس کو کہا جاتا ہے جو ماں کے پیٹ سے جیتی جاگتی شکل میں باہر آجائے یا وہ ماں کے پیٹ میں موجود ہو اور اس کے زندہ باہر آنے کی توقع ہو۔چنانچہ کسی مقام پر بھی قتل اولاد سے یہ مراد نہیں کہ بتوں کو خوش کرنے کے لیے یا ناداری کے خوف سے یا خودساختہ غیرت کی وجہ سے اپنے مادہ تولید (Sperms) کو ضائع نہ کرو۔اگر مادہ تولید کے اولاد بننے کی امید ہو بھی تو جب تک وہ جیتی جاگتی شکل اختیار نہ کرلے اسے اولاد نہیں کہا جاسکتا۔اللہ کا ارشاد ہے: 'اَكَفَرْتَ بِالَّذِىْ خَلَقَكَ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ سَوّٰىكَ رَجُلًا' (الکھف ۱۸:۳۷)' کیا تو اس کا انکار کرتا ہے جس نے تجھے مٹی سے پیدا کیا، پھر نطفے سے، پھر تجھے پورا انسان بنایا'۔اللہ نے نطفہ کو انسان (اولاد) نہیں کہا ہے بلکہ نطفہ کے بعد کے مرحلہ کو انسان کہا ہے۔نطفہ کے ضیاع کو کسی طرح بھی قتل اولاد قرار نہیں دیا جاسکتا کیونکہ!

۱۔ جراثیم حیات (Sperms) اولاد نہیں ہوتے وہ صرف تخم حیات ہوتے ہیں جن کے اولاد بننے کی صرف امید کی جاسکتی ہے اولاد صرف وہ ہوتی ہے جو ماں کے پیٹ سے زندہ باہر آجائے۔

Marfat.com

۲۔ اگر تخم حیات کے اولاد بننے کی امید ہو تب بھی اس پر اولاد کا اطلاق نہیں ہوسکتا۔ ہر درخت کا بیج درخت بننے کی صلاحیت رکھتا ہے لیکن ایک بیج کے ضائع کرنے والے پر یہ الزام نہیں دھرا جاسکتا کہ اس نے پورا درخت برباد کر دیا۔

۳۔ صرف ایک جنسی ملاپ سے اربوں جراثیم خارج ہوتے ہیں ان میں سے صرف ایک کو اللہ اولاد بننے کے لیے منتخب کرتا ہے وہ بھی صرف ایک جنسی ملاپ کے بعد نہیں بلکہ کئی جنسی ملاپوں کے بعد اور بعض اوقات عمر بھر کے جنسی ملاپوں کے بعد بھی کچھ نہیں ہوتا۔ کیا انسان پر یہ الزام دھرا جاسکتا ہے کہ وہ ایک بچے کی تمنا میں ہر بار اربوں بچوں کو قتل کر دیتا ہے؟

۴۔ اگر جراثیم حیات کو ضائع کرنا قتل اولاد ہوتا تو بانجھ، حاملہ یا سن یاس کو پہنچی ہوئی ہر شریک حیات سے جنسی ملاپ حرام ہونا چاہیے کیونکہ ان صورتوں میں کئی ارب بچوں کو قتل کرنے کا سو فیصد یقین ہوتا ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو کتاب و سنت ان کے ساتھ مباشرت کو حرام قرار دے دیتی۔ جبکہ اللہ اور اس کے رسول نے کبھی بھی اسے قتل اولاد نہیں گردانا تو ہم اسے قتل اولاد گردانے والے کون ہوتے ہیں؟

مسلم نے حضرت جابرؓ سے روایت کی ہے کہ ہم عہد نبوت میں عزل (مادہ تولید کو رحم کے باہر خارج کرنا) کیا کرتے تھے۔ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ خبر ملی مگر آپ نے منع نہ فرمایا۔

امام ابن تیمیہ *مختصر الفتاوی* (ص ۴۳۰) میں فرماتے ہیں کہ حنفیہ، شافعیہ، حنابلہ اور مالکیہ کے نزدیک بیوی کی اجازت سے عزل کرنا جائز ہے۔ امام شوکانی نے نیل الاوطار میں لکھا ہے کہ عزل کے محرکات میں سے کثرت اولاد سے فرار ہے۔ امام غزالی فرماتے ہیں کہ عزل کے محرکات میں سے تیسرا محرک کثرت اولاد کی وجہ سے معاشی تنگی کا اندیشہ، کسب معاش میں تھکا دینے والی مجبوری اور اس کی وجہ سے برائی سے محفوظ رہنا ہے۔ ایسا عزل ممنوع نہیں کیونکہ معاشی تنگی جتنی کم ہوگی دینی اعتبار سے اتنی ہی مفید ہوگی۔

قرآن حکیم کا ایک اہم موضوع یہ ہے کہ اللہ کی کوئی اولاد نہیں۔ اللہ نے کائنات کو تولید سے پیدا نہیں کیا بلکہ اس کی تخلیق کی ہے۔ تولید کے عمل میں جیسا کہ امام رازی نے سورۃ زمر (۴:۳۹) کی تفسیر میں کہا ہے کہ اولاد عبارت ہے اس جزو سے جو کسی چیز کے اجزاء سے الگ ہوتا ہے۔ جس چیز کے اجزاء ہوسکتے ہوں اس کے بارے میں تو یہ تصور کیا جاسکتا ہے لیکن جو ذات فرد مطلق ہو اس کے بارے میں یہ بات نہیں کی جاسکتی۔ تولید میں پیدا کرنے والے کا ایک جزو مولود میں شامل ہوتا ہے اور جب وہ والد سے الگ ہو جاتا ہے تو والد میں اتنے حصہ کی کمی آجاتی ہے۔ جبکہ عملِ تخلیق میں پیدا کرنے والے کا کوئی جزو

Marfat.com

اس کی مخلوق میں نہیں آتا۔اس لیے اس عمل سے خالق کی ذات میں کوئی کمی نہیں آتی۔اس مضمون کو قرآن حکیم میں متعدد مقامات پر بیان کر کے مشرکین کے توہمات کی تردید کی گئی ہے۔وہ اللہ کے لیے اولاد مانتے تھے اس پر اکتفا نہیں وہ اللہ کے لیے وہ بات پسند کرتے تھے جو اپنے لیے ناپسند کرتے تھے۔مثلاً وہ کہتے تھے کہ فرشتے اللہ کی بیٹیاں ہیں حالانکہ خود بیٹی کی پیدائش پر ان کا چہرہ سیاہ پڑ جاتا تھا اور وہ شرم سے منہ چھپائے پھرتے تھے۔ان تمام توہمات کے لیے ان کے پاس کوئی عقلی دلیل تھی نہ نقلی۔

اللہ کی طرف اولاد کی نسبت

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: 'أَنَّى يَكُونُ لَهُ وَلَدٌ وَلَمْ تَكُن لَّهُ صَاحِبَةٌ وَخَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ' (الأنعام ٦:١٠١) 'اللہ کی اولاد کہاں سے ہو سکتی ہے حالانکہ اس کی کوئی بیوی تو ہے نہیں اور اس نے ہر چیز کو پیدا کیا اور وہ ہر چیز کو خوب جانتا ہے'۔

اس سے پچھلی آیت میں ہے: 'وَخَرَقُوا لَهُ بَنِينَ وَبَنَاتٍ بِغَيْرِ عِلْمٍ سُبْحَانَهُ وَتَعَالَى عَمَّا يَصِفُونَ' (الأنعام ٦:١٠٠) 'اور ان لوگوں نے اللہ کے حق میں بلا شبہ بیٹے اور بیٹیاں تراش رکھی ہیں اور وہ پاک اور برتر ہے ان اوصاف سے جو یہ بیان کرتے ہیں'۔

آیت نمبر ا، میں وَلَمْ تَكُن لَّهُ صَاحِبَةٌ حال واقع ہوا ہے جو پہلی ناممکن بات یعنی بیوی کے عدم وجود کی تاکید کر رہا ہے یعنی اللہ کا بچہ کیسے اور کہاں سے ہو سکتا ہے؟ جبکہ حال یہ ہے کہ اس کی تو بیوی ہی نہیں جس سے بچہ ہو۔مشرکین عرب اتنا تو مانتے تھے کہ اللہ کی بیوی نہیں۔اس پر قرآن نے سوال اُٹھایا ہے کہ تم بھی اللہ کی کسی بیوی کو نہیں مانتے تو پھر اس کے بیٹے اور بیٹیاں کہاں سے آگئیں؟ چنانچہ ساری کائنات کیا انسان کیا جنات اور کیا فرشتے اس کی مخلوق ٹھہری۔یہ سب باتیں تمہارے ذہن کی پیداوار ہیں اور بلاشبہ اللہ تعالیٰ ان باتوں سے پاک ہے جو تم کرتے ہو۔

اس خرافات پر مبنی ایک اور موضوع ہے جس کا ذکر قرآن حکیم میں سورۃ صافات (۳۷:۱۵۲) اور سورۃ زمر (۳۹:۴) اور کئی دوسرے مقامات پر ملتا ہے۔وہ یہ ہے کہ مشرکین فرشتوں کو مؤنث قرار دے کر انھیں اللہ کی بیٹیاں تصور کرتے تھے۔میں نے لفظ بنت کے تحت اس موضوع پر بحث کر دی ہے مگر ایک غلط فہمی کی طرف توجہ دلانا ضروری سمجھتا ہوں۔اللہ تعالیٰ نے ان آیات میں دلیل یہ دی ہے کہ جس چیز کو تم خود ناپسند سمجھتے ہو اسے اللہ کی طرف کیسے منسوب کیا جا سکتا ہے؟ تو تم عورت سے نفرت کرتے ہو اور اسے باعث ننگ سمجھتے ہو تو پھر اسے میری طرف کیوں منسوب کرتے ہو؟ سورۃ زمر میں ہے کہ اگر خدا اپنے لیے اولاد ہی بنانے کا ارادہ کرتا تو وہ بیٹیاں کو کیوں بناتا؟ وہ اپنی مخلوقات میں سے جس اچھی

Marfat.com

سے اچھی چیز کو چاہتا منتخب کر لیتا۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ اگر وہ لڑکوں کو اللہ کی طرف منسوب کر دیتے تو ٹھیک تھا۔ اللہ تو خالق ہے اس کے یہاں مرد اور عورت میں کوئی فرق نہیں۔ اس کے یہاں جنسی تمیز روا نہیں۔ یہاں اللہ تعالیٰ مذکر اور مؤنث کے بارے میں مشرکین کے تراشے ہوئے تصور کو بیان کر کے بتا رہا ہے کہ جس چیز کو وہ اپنے زعم میں گھٹیا سمجھتے ہیں اسی کو اللہ کی طرف منسوب کر رہے ہیں۔ اس سے بڑی جہالت اور کم عقلی کی بات اور کیا ہو سکتی ہے؟ یہاں اللہ مشرکین سے انہی کی منطق کے مطابق بات کر رہا ہے اور ان پر گرفت کر رہا ہے تا کہ ان کو بتائے کہ ان کا تصور انہی کے قائم کیے ہوئے اصول کے مطابق کتنا گھٹیا ہے، کتنا احمقانہ ہے۔

والدین کے ساتھ حسن سلوک

قرآن مجید کا ایک موضوع والدین کے ساتھ حسن سلوک ہے بلکہ یہ قرآن کے اخلاقی نظام کی اساس ہے۔ لغوی طور پر لفظ والدین میں ماں اور باپ دونوں شامل ہیں۔ ماں بھی والد ہے اور باپ بھی، کیونکہ دونوں بچے کو عدم سے وجود میں لانے کا ذریعہ ہیں اور دونوں اس کی تربیت میں شریک ہیں بلکہ تربیت میں ماں کا حصہ باپ سے کہیں زیادہ ہے۔ اس لیے تثنیہ کے صیغے میں دونوں کو والد کہہ کر شریک کیا گیا ہے۔ جیسے ابوین میں دونوں کو اَب کہا گیا ہے۔ عربی گرامر میں تثنیہ کے صیغہ میں مؤنث اور مذکر برابر ہیں جیسے ضمائر میں ھما اور انتما سے وہ دونوں مرد اور دونوں عورتیں، تم دونوں مرد اور تم دونوں عورتیں مراد ہیں۔ اسی طرح ماضی اور مضارع میں مذکر اور مؤنث کے تثنیہ کے صیغہ کی علامت مشترک طور پر الف اور الف نون ہے یہی وجہ ہے کہ صاحب البحر المحیط نے سورۃ بقرۃ کی آیت (۲:۸۳) کی تفسیر کے تحت فرمایا ہے ماں اور باپ ان میں سے ہر ایک پر والد کا اطلاق ہوتا ہے۔ واضح طور پر یہ اطلاق حقیقی ہے اور انھوں نے مثال کے طور پر ایک شاعر کا مصرع نقل کیا ہے:

وذی ولد لم یلدہ أبوان

(بہت کم بچے والے ہیں جنہیں والدین نے جنم نہیں دیا)

انھوں نے قرآن حکیم کا اتباع کرتے ہوئے والدان کو اُبوان کہا ہے اس سے ان لوگوں کا قول باطل ہو جاتا ہے جو کہتے ہیں کہ اصل میں والد باپ کو کہتے ہیں ماں کو والد تغلیب کے طور پر کہا گیا ہے جیسے مومنوں کے صیغہ میں تغلیباً عورتیں بھی شامل ہیں۔ مگر یہاں صاحب البحر المحیط نے والدان کو ابوان قرار دے کر اس خیال کی تردید کر دی ہے کیونکہ اس صورت میں ماں اور باپ دونوں کو اَب کہا جائے گا اس کے باوصف جو مفسر عورت کو دوسرا درجہ دینے پہ مصر ہیں انھوں نے ابوین کی تاویل یہ کی ہے

Marfat.com

کہ باپ کو اب کہتے ہیں اور ماں کو ابۃ، تغلیباً دونوں کو ابوین کہا گیا ہے۔ میں نے کسی لغت میں ماں کے لیے ابۃ کا لفظ نہیں دیکھا۔ کیونکہ اب کا لام کلمہ یعنی واو محذوف ہے۔ اس لیے اس کا تثنیہ ابوان ہی ہوگا۔ یہ ابۃ کا لفظ ان مفسرین کی ذہنی اختراع ہے جو عورت کو کسی صورت میں مرد کے برابر تسلیم نہیں کرتے خواہ اس کے لیے ان کو شواذ سے استدلال کرنا پڑے۔ اہلِ لغت نے ماں کو والد کہنے کی عربی محاورہ سے نظیر پیش کی ہے عربی میں کہتے ہیں: 'شاۃ والد یا شاۃ والدۃ' یعنی حامل بکری۔ بہرکیف قرآن نے ماں اور باپ کے لیے والدان اور ابوان کے الفاظ استعمال کر کے ثابت کر دیا ہے کہ فطرتاً دونوں کا مقام ایک جیسا ہے دونوں لازم وملزوم ہیں، دونوں ایک دوسرے کے بغیر بے کار ہیں۔

اللہ کی توحید اور عبادت پھر والدین کے ساتھ حسن سلوک

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: 'وَإِذْ أَخَذْنَا مِيثَاقَ بَنِيٓ إِسْرَآئِيلَ لَا تَعْبُدُونَ إِلَّا ٱللَّهَ وَبِٱلْوَٰلِدَيْنِ إِحْسَانًا' (البقرۃ ۲:۸۳) 'اور جب ہم نے بنی اسرائیل سے عہد لیا کہ تم اللہ کے سوا دوسرے کی عبادت نہ کرنا اور ماں باپ سے اچھا سلوک کرنا'۔ اسی طرح سورۃ نساء میں ارشاد ہے: 'وَٱعْبُدُواْ ٱللَّهَ وَلَا تُشْرِكُواْ بِهِۦ شَيْـًٔا وَبِٱلْوَٰلِدَيْنِ إِحْسَانًا' (۴:۳۶) 'اور اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو اور ماں باپ کے ساتھ اچھا سلوک کرو'۔

پہلی آیت میں بنو اسرائیل کے بارے میں جو بات کہی گئی دوسری آیت میں وہی بات سب اہلِ ایمان کے بارے میں کہی گئی ہے اور اس میں شرک سے اجتناب کا حکم ہے۔ قرآن حکیم نے دوسرے مقامات مثلاً سورۃ انعام (۶:۱۵۱) اور سورۃ بنیٔ اسرائیل (۱۷:۲۳) پر بھی اللہ تعالیٰ کی توحید و عبادت کے بعد والدین سے حسن سلوک کا حکم دیا ہے اور اس کی اہمیت کو واضح کیا ہے۔ مراد یہ ہے کہ جس طرح اللہ کائنات کو عدم سے وجود میں لایا اسی طرح والدین اولاد کو عدم سے وجود میں لائے۔ جس طرح اللہ سارے جہان کی پرورش کرتا ہے اور ان کو بھی نعمتوں سے نوازتا ہے جو اس کا انکار کرتے ہیں اور کوئی معاوضہ طلب نہیں کرتا بعینہ اسی طرح والدین اپنے بچے کی پرورش کرتے ہیں نہ مالی معاوضہ طلب کرتے ہیں اور نہ ثواب کے خواہش مند ہوتے ہیں کیونکہ آخرت کے منکر والدین بھی اپنی اولاد کی تربیت کرتے ہیں۔ بندہ خواہ کتنے ہی جرم کرے اللہ اسے اپنی نعمتوں سے نوازنے سے تنگ نہیں پڑتا یہی حال والدین کا ہے خواہ بچہ کتنی ہی بدسلوکی کرے ان کے حسن سلوک میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ان کا احسان جاری رہتا ہے۔ اس لحاظ سے والدین کا احسان اللہ کے احسان سے ملتا جلتا ہے۔ ان کی ربوبیت اللہ کی ربوبیت کا ایک ادنیٰ مظہر ہے۔ اللہ کی ربوبیت کے تقاضوں کو وہی شخص سمجھ سکتا ہے جو والدین کی خدمت اور

Marfat.com

اطاعت کے تقاضوں کو سمجھتا ہے۔ جو شخص یہ سمجھ نہیں سکتا کہ دنیا میں اس کا وجود والدین کا مرہون منت ہے اور اس کی تربیت والدین کی محبت کا نتیجہ ہے اس لیے مجھے ان کی خدمت میں کوئی کوتاہی نہیں کرنی چاہیے ایسا شخص لازماً خالق کائنات کو اور اس کی توحید و عبادت کے تقاضوں کو کیسے سمجھے گا؟

ایک حدیث میں ہے کہ والدین کی رضامندی اللہ کی رضامندی اور ان کی ناراضگی اللہ کی ناراضگی کا باعث ہے۔ اس لیے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اللہ کی اطاعت کے بعد والدین کی اطاعت، ان کی خدمت اور ان کے احترام کی کتنی اہمیت ہے۔ بالفاظ دگر ماں باپ کی اطاعت ان سے محبت ہمیں اللہ کی اطاعت اور اس سے محبت تک لے جاتی ہے۔ جب ماں باپ اپنی اولاد پر اتنے شفیق اور مہربان ہیں تو اللہ ہم پر کتنا شفیق اور مہربان ہوگا۔ اسی وجہ سے ان آیات مبارکہ میں روحانی اور اخلاقی فرائض کو ایک ساتھ جمع کر دیا گیا ہے۔ علماء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ والدین کی تعظیم واجب ہے خواہ وہ کافر ہوں۔ عقیدے اور عبادت کے معاملہ میں والدین کو کوئی حق حاصل نہیں کہ وہ اولاد کو شرک پر مجبور کریں۔ جہاں بندوں کا حق اللہ کے حق سے متصادم ہو تو اس کا مطلب ہوگا کہ بندے کے ارادہ و اختیار میں کوئی کمزوری یا غلطی ہے۔ اس وقت بندے کو چھوڑ کر ہمیں اللہ کی اطاعت کرنی پڑے گی۔ سعد بن ابی وقاص اور خالد بن سعید بن العاص جیسے کتنے اور صحابہ کرام تھے جن کے والدین ان کو شرک پر مجبور کرتے رہے مگر وہ انتہائی شائستگی سے ان کی نافرمانی کرتے رہے۔

سورۃ العنکبوت (۲۹:۸) میں اللہ کا ارشاد ہے: "وَإِن جَاهَدَاكَ لِتُشْرِكَ بِي مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا"۔ "اور اگر وہ یہ کوشش کریں کہ تم میرے ساتھ اسے شریک ٹھہرائیں جس کا تمھیں علم نہ ہو تو ان کا کہنا نہ مانیں"۔ سورۃ لقمان میں بھی کم و بیش یہی الفاظ ہیں لیکن اس کے بعد اس جملے کا اضافہ ہے: "وَصَاحِبْهُمَا فِي الدُّنْيَا مَعْرُوفًا" (۳۱:۱۵) "اور دنیا میں ان کے ساتھ اچھی طرح رہنا سہنا" یعنی اگر وہ شرک کا حکم دیں تو ہمیں ان کا کہنا نہیں ماننا چاہیے مگر یہ نافرمانی شائستگی کے دائرے کے اندر ہو۔ ہمارا رویہ ان کے ساتھ پیار و محبت کا ہو نہ کہ نفرت کا۔ ہیں تو وہ ہمارے ماں باپ۔

قرآن حکیم نے سعادت مند اولاد اور بدبخت اولاد کا خوب نقشہ کھینچا ہے۔ سورۃ احقاف میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "حَتَّىٰ إِذَا بَلَغَ أَشُدَّهُ وَبَلَغَ أَرْبَعِينَ سَنَةً قَالَ رَبِّ أَوْزِعْنِي أَنْ أَشْكُرَ نِعْمَتَكَ الَّتِي أَنْعَمْتَ عَلَيَّ وَعَلَىٰ وَالِدَيَّ وَأَنْ أَعْمَلَ صَالِحًا تَرْضَاهُ وَأَصْلِحْ لِي فِي ذُرِّيَّتِي إِنِّي تُبْتُ إِلَيْكَ وَإِنِّي مِنَ الْمُسْلِمِينَ ۝ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ نَتَقَبَّلُ عَنْهُمْ أَحْسَنَ مَا عَمِلُوا وَنَتَجَاوَزُ عَن سَيِّئَاتِهِمْ فِي أَصْحَابِ الْجَنَّةِ وَعْدَ الصِّدْقِ الَّذِي كَانُوا

Marfat.com

یُوعَدُون ' (۴۶:۱۵تا۱۶) 'یہاں تک کہ جب وہ (انسان) اپنی پختگی اور قوت یعنی چالیس برس کی عمر تک پہنچا تو کہنے لگا اے میرے پروردگار مجھے توفیق دے کہ میں تیری اس نعمت کا شکریہ ادا کروں جو تو نے مجھ پر اور میرے ماں باپ پر کی ہے اور یہ کہ میں ایسے نیک عمل کروں جس سے تو راضی ہو جائے اور تو میری اولاد بھی صالح بنا۔ میں تیری طرف رجوع کرتا ہوں اور میں مسلمانوں میں سے ہوں۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کے نیک اعمال ہم قبول کرتے ہیں اور جن کے برے اعمال سے درگزر کرتے ہیں۔ ان کا شمار اہلِ جنت میں ہوگا۔ اس سچے وعدے کے مطابق جوان سے کیا گیا تھا' ۔آپ نے غور کیا جب وہ ناتواں بچہ اپنے پاؤں پر کھڑا ہو گیا۔ اس کی بدنی اور عقلی قوتیں مکمل ہو گئیں تو اس کی سوچ کس قدر سعادت مندانہ ہے وہ اللہ کی ان نعمتوں کا شکر بجالاتا ہے جو اللہ نے اس پر کیں اور اس کے ماں باپ پر کیں۔ ماں باپ کا ذکر بطور خاص کیا حالانکہ جو نعمت بچے پر ہوتی ہے وہ دراصل ماں باپ پر ہوتی ہے۔ اس کا فائدہ ماں باپ کو ملتا ہے۔ جو بچہ متقی ہوگا وہ ماں باپ کے لیے سودمند ہوگا جیسا کہ شاعر کا شعر ہے:

۔ کم أب قد علا بابن لہ شرفا

کما علا برسول اللہ عدنان

'کتنے ہی باپ ہیں جو بیٹے کی وجہ سے مرتبہ اور شرف میں بلند ہو گئے جیسا کہ

عدنان اللہ کے رسول ﷺ کے باعث بلند ہو گیا'

اس کے بعد اس بچے کی سمت درست ہو گئی وہ اللہ کی طرف رجوع کر کے نیک کام کرنے لگا۔ یہ سب ماں باپ کی حسن تربیت کا ثمر تھا۔ وہ دعا کر رہا ہے کہ اس کی اولاد بھی ایسی ہو اور یہ سنت الٰہی ہے جو ماں باپ کا فرمانبردار ہوتا ہے۔ اس کی اولاد بھی فرمانبردار ہوتی ہے۔ تجربہ اور مشاہدہ اس کی تائید کرتا ہے۔ اللہ نے اسے کتنا بڑا اجر دیا، نیک کاموں کو شرف قبولیت بخشا، برائیوں سے درگزر کیا اور اپنے کیے ہوئے وعدے کے مطابق اسے جنت میں داخل کر لیا۔ اس کے فوراً بعد بدبخت اولاد کا ذکر ان الفاظ میں کیا گیا ہے: 'وَالَّذِیْ قَالَ لِوَالِدَیْهِ اُفٍّ لَّكُمَآ اَتَعِدَانِنِیْٓ اَنْ اُخْرَجَ وَقَدْ خَلَتِ الْقُرُوْنُ مِنْ قَبْلِیْ وَهُمَا یَسْتَغِیْثٰنِ اللّٰهَ وَیْلَكَ اٰمِنْ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ فَیَقُوْلُ مَا هٰذَآ اِلَّآ اَسَاطِیْرُ الْاَوَّلِیْنَ ٥ اُولٰٓئِكَ الَّذِیْنَ حَقَّ عَلَیْهِمُ الْقَوْلُ ' (احقاف ۴۶:۱۷تا۱۸) 'اور جس نے اپنے ماں باپ سے کہا کہ تم پر تف ہے۔ تم مجھ سے یہی وعدہ کرتے رہو گے کہ میں دوبارہ اٹھایا جاؤں گا حالانکہ مجھ سے پہلے بھی امتیں گزر چکی ہیں وہ دونوں اللہ سے فریاد کرتے ہیں۔ تیری خرابی ہو، ایمان لے آ، بے شک اللہ کا وعدہ حق ہے۔ وہ کہتا ہے کہ یہ سب پہلوں کے افسانے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جن پر اللہ کا وعدہ (عذاب

Marfat.com

کا) صادق آ گیا۔
ان آیات میں پہلی آیات کے مقابلہ میں اس اولاد کا ذکر ہے جو والدین کے ساتھ گستاخی سے پیش آتی ہے۔اف اسم فعل ہے جو کراہت اور ناپسندیدگی کے لیے استعمال ہوتا ہے یعنی میں تمھیں ناپسند کرتا ہوں۔ والدین کی ایذا رسانی کو روکنے کے لیے اس کلمہ میں انتہائی مبالغہ کے معنی پائے جاتے ہیں۔نافرمان اولاد ماں باپ کی نصیحت اور ایمان وعمل صالح کی دعوت پر سخت ناپسندیدگی کا اظہار کرتی ہے جس کی اولاد کو قطعاً اجازت نہیں۔وہ محبت کی بناء پر اس کے ایمان کی دعائیں مانگتے ہیں اور یہ کہتا ہے کہ سب ڈھکوسلے ہیں۔اللہ نے سزا یہ دی کہ ان پر عذاب نازل کر دیا۔یہ آیت عام ہے ہر نافرمان اولاد پر یہ صادق آتی ہے آج کل نئی اور پرانی نسل کے درمیان اس قسم کے مکالمے ہوتے رہتے ہیں۔ پرانی نسل کو اپنی اولاد کی تربیت اچھی طرح کتاب وسنت کے احکام کے مطابق کرنی چاہیے اور نئی نسل کو والدین کو پرانی طرز کے سمجھ کر ان کی ہر اچھی بات کی مخالفت نہیں کرنی چاہیے اور یہ بات اچھی طرح ذہن میں رکھنی چاہیے کہ نیکی اور بدی کی تمیز میں عمر اور تجربے کا بڑا دخل ہوتا ہے۔

حسن سلوک کے خدوخال

جو اولاد سعادت مندی کی خواہاں ہے اور جنت کی طلبگار، اس کی رہنمائی کے لیے قرآن نے والدین کے ساتھ حسن سلوک کے خدوخال واضح کر دیے ہیں۔اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِمَّا يَبْلُغَنَّ عِنْدَكَ الْكِبَرَ اَحَدُهُمَا اَوْ كِلٰهُمَا فَلَا تَقُلْ لَّهُمَا اُفٍّ وَّلَا تَنْهَرْهُمَا وَقُلْ لَّهُمَا قَوْلًا كَرِيْمًا ۝ وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ وَقُلْ رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيٰنِيْ صَغِيْرًا (بنی اسرائیل ۱۷:۲۳ تا ۲۴)۔"اگر تیری موجودگی میں ان میں سے ایک یا دونوں بڑھاپے کو پہنچ جائیں تو ان کے سامنے اُف نہ کہنا نہ انھیں ڈانٹ ڈپٹ کرنا بلکہ ان کے ساتھ بات ادب کے ساتھ کرنا اور ازراہِ شفقت ان کے سامنے عاجزی اور انکساری کا بازو پست تر رکھنا اور دعا کرتے رہنا کہ اے میرے پروردگار! ان پر ویسا ہی رحم کر جیسے انھوں نے میرے بچپن میں میری پرورش کی ہے"۔

ان دو آیات میں والدین کے بارے میں اولاد کے رویہ کی حد بندی بڑے خوبصورت انداز میں کر دی گئی ہے۔جو ان حدود سے تجاوز نہیں کرے گا وہی جنت کا سزاوار ہوگا۔ربوبیت الٰہی کے تقاضوں کے ساتھ ساتھ ربوبیت والدین کے تقاضوں کو نمایاں کیا گیا ہے اور واضح کیا ہے کہ والدین کی اطاعت ان کی خدمت اور ان کے ادب واحترام کی کیا اہمیت ہے؟ بچہ جب کمزور تھا، عاجز تھا، جاہل تھا نہ اس قابل تھا کہ اپنی ذات کو نفع پہنچا سکے اور نہ ہی اس لائق تھا کہ اپنی ذات کو ضرر سے بچا سکے۔والدین اس وقت

Marfat.com

طاقتور تھے وسائل معاش پر قادر اور متصرف تھے وہ دونوں انتہائی خلوص سے اس کی کفالت کرتے رہے، اس پر احسانات کی بارش کرتے رہے یہاں تک کہ وہ مضبوط اور طاقت ور ہو گیا اور وسائل معاش اس کے قبضے اور تصرف میں آ گئے۔ اب جبکہ والدین بوڑھے ہو گئے کمزور اور ناتواں ہو گئے۔ بے بس ولاچار ہو گئے۔ کیا اس پر واجب نہیں کہ وہ اسی شفقت اور محبت کا مظاہرہ کرے جس کا مظاہرہ والدین نے اس کے بچپنے میں کیا۔ وہ تکلیف اُٹھاتے رہے تا کہ اسے راحت ملے، جاگتے رہے تا کہ یہ سو جائے۔ انھوں نے اپنا سب کچھ اس پر وار دیا، کیا وہ اس بات کے مستحق نہیں کہ بچہ اپنا سب کچھ ان پر وار دے؟ ان کے سامنے اُف تک نہ کرے۔ ان سے بات کرے تو ادب و احترام کو ملحوظ رکھے۔ والدین کا مقام کیا ہے یہ پوچھنا ہو تو انبیاء علیہم السلام سے پوچھو۔ ابراہیمؑ سے پوچھو باپ نے ان پر کیا کیا ستم نہ ڈھائے۔ پھر بھی ان کا دل پسیج گیا اور اس کے لیے دعا کرتے رہے: 'رَبَّنَا اغْفِرْ لِي وَلِوَالِدَيَّ وَلِلْمُؤْمِنِينَ يَوْمَ يَقُومُ الْحِسَابُ' (ابراھیم ۱۴:۴۱)۔ 'اے ہمارے ربّ مجھے بخش دے، میرے ماں باپ کو بخش دے اور سب مومنوں کو بھی، جس دن حساب ہونے لگے'۔ یہ (دُعا) ایک ایسی دُعا ہے جو ہماری نماز کا جزو بن گئی ہے۔ ہر مسلمان پانچ وقت یہ دعا کرتا ہے اور قیامت تک کرتا رہے گا۔ یہ اسی برگزیدہ ہستی کی دعا ہے۔ باپ سنگسار کرنے (مریم ۱۹:۴۶) کی دھمکیاں دیتا رہا اسے اپنی قوم کے ساتھ مل کر آگ میں ڈال دیا (الأنبیاء ۲۱:۶۸) لیکن باپ آخر باپ ہوتا ہے پھر بھی اس کی مغفرت کے طلبگار رہے (مریم ۱۹:۴۷) لیکن جب ان کو یقین ہو گیا کہ باپ اللہ کا دشمن ہے تو اس سے براءت کا اظہار کر دیا (التوبة ۹:۱۱۴)۔ والدین کا مقام پوچھنا ہو تو یوسف سے پوچھو جنہوں نے ماں باپ کو تخت پر بٹھایا اور ان کے سامنے سجدہ ریز ہو گئے (۱۲:۱۰۰) اللہ تعالیٰ نے والدین کی فرمانبرداری کو پیغمبرانہ صفت قرار دیا ہے۔

سورۃ مریم میں یحییٰ کے متعلق فرمایا: 'وَبَرًّا بِوَالِدَيْهِ' (۱۹:۱۴) 'اپنے ماں باپ کے فرمانبردار' اور عیسیٰ کے متعلق فرمایا: 'وَبَرًّا بِوَالِدَتِي' (۱۹:۳۲) 'اپنی ماں کا فرمانبردار'۔ قرآن حکیم نے اولاد کو اپنے سایہ عاطفت میں لینے کے لیے ایک تشبیہ دی ہے۔ یہ تشبیہ ایک پرندے کی تشبیہ ہے جو اپنے بازو پھیلائے اونچا اُڑ رہا ہے اور جب نیچے اترتا ہے تو اپنے بچوں کی محبت اور شفقت کی وجہ سے بازو نیچے کر لیتا ہے۔ اس تشبیہ کے دو پہلو ہیں ایک تو یہ جب والدین قوی تھے اور بچہ کمزور تو اس پر والدین کی عنایت کی بارش ہوتی رہی اب جبکہ بچہ قوی ہے اور والدین کمزور تو اسے بھی اسی طرح ان کو اپنے سایہ عاطفت میں جگہ دینی چاہیے۔ دوسرے اسے عاجزی اور انکساری کا اظہار کرنا چاہیے۔ کیونکہ والدین کی شفقت اسے وہ شفقت یاد دلاتی ہے جس سے خالق کائنات اپنی مخلوق کو نوازتا ہے۔ یہاں صرف احسان شناسی کا

Marfat.com

مسئلہ نہیں ہے بلکہ اس کا تعلق بلند روحانی اقدار سے ہے۔ بڑھاپے کے وقت والدین کے ادب واحترام کو پیش نظر رکھنا بہت ہی مشکل کام ہے تاہم اللہ کے یہاں سرخرو وہی ہو گا جو ہر وقت اور ہر حال میں والدین کی اطاعت اور خدمت کا فرض پوری طرح ادا کرتا رہے گا۔

حسن سلوک کی علت

اولاد پر حسن سلوک کے وجوب کی صحیح علت وہ توجہ اور اہتمام ہے جو والدین ان کی تربیت اور دیگر مصلحتوں کی طرف خلوص دل سے مبذول کرتے ہیں، وہ بھی اس وقت جب وہ اتنا بے بس تھا کہ اپنی ذات کے بارے میں نفع اور نقصان کا شعور تک نہ رکھتا تھا یہاں تک کہ وہ اپنے پاؤں پر کھڑا ہو گیا اور بھلے برے میں تمیز کرنے لگا۔ یہ سب کچھ والدین اپنے ارادے اور اختیار سے محض اولاد کی فطری محبت کی خاطر کرتے رہے۔ اللہ کا قول ہے: 'هَلْ جَزَاءُ الْإِحْسَانِ إِلَّا الْإِحْسَانُ' (الرحمن ۵۵:۶۰) 'احسان کا بدلہ احسان ہی تو ہوتا ہے'۔

اللہ نے اس علت کا اجمالاً ذکر سورۃ بنی اسرائیل کی آیت میں یوں کیا ہے: 'وَقُلْ رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيَانِي صَغِيرًا' (۱۷:۲۴) 'اور کہو! اے میرے پروردگار! ان پر ویسا ہی رحم کر جیسا انھوں نے میرے بچپن میں میری تربیت کی'۔

بچے کی زبان سے یہ دعا کہلوا کر اللہ نے اسے حسن سلوک کی علت سمجھا دی ہے۔

اس علت کو قدرے تفصیل کے ساتھ سورۃ لقمان اور سورۃ احقاف میں بیان کیا گیا ہے۔ اللہ کا قول ہے: 'وَوَصَّيْنَا الْإِنسَانَ بِوَالِدَيْهِ حَمَلَتْهُ أُمُّهُ وَهْنًا عَلَىٰ وَهْنٍ وَفِصَالُهُ فِي عَامَيْنِ أَنِ اشْكُرْ لِي وَلِوَالِدَيْكَ إِلَيَّ الْمَصِيرُ' (لقمان ۳۱:۱۴) 'ہم نے انسان کو حکم دیا ہے اس کے والدین کے بارے میں اس کی ماں دکھ پر دکھ اٹھا کر اسے حمل میں اٹھائے رکھا، دو سال تک اسے دودھ پلایا (اور پھر چھڑایا) کہ تو میری اور اپنے ماں باپ کی شکر گزاری کر، تم نے میری طرف لوٹ کر آنا ہے'۔ اسی مضمون کو ایک اور مقام پر یوں بیان کیا: 'وَوَصَّيْنَا الْإِنسَانَ بِوَالِدَيْهِ إِحْسَانًا حَمَلَتْهُ أُمُّهُ كُرْهًا وَوَضَعَتْهُ كُرْهًا وَحَمْلُهُ وَفِصَالُهُ ثَلَاثُونَ شَهْرًا حَتَّىٰ إِذَا بَلَغَ أَشُدَّهُ وَبَلَغَ أَرْبَعِينَ سَنَةً قَالَ رَبِّ أَوْزِعْنِي أَنْ أَشْكُرَ نِعْمَتَكَ الَّتِي أَنْعَمْتَ عَلَيَّ وَعَلَىٰ وَالِدَيَّ' (احقاف ۴۶:۱۵)۔ 'ہم نے انسان کو اپنے ماں باپ کے ساتھ حسن سلوک کا حکم دیا۔ اس کی ماں نے اس کا حمل اٹھایا تو تکلیف جھیل کر اسے جنا تو تکلیف جھیل کر۔ اس کے حمل کا اور اس کے دودھ چھڑانے کا زمانہ تیس مہینے کا ہے پھر

Marfat.com

جب وہ اپنی قوت یعنی چالیس برس کی عمر کو پہنچا تو کہنے لگا میرے پروردگار مجھے توفیق دے کہ میں تیری اس نعمت کا شکر بجالاؤں جو تو نے مجھ پر اور میرے ماں باپ پر کی'۔ مذکور دونوں آیات میں اللہ نے والدین کے ساتھ حسن سلوک کا حکم دیا ہے دونوں میں اس کی پیدائش اور رضاعت کے سلسلہ میں ماں کی تکلیف کا تذکرہ ہے۔ مگر پہلی آیت میں اللہ نے بچے کی زبان سے دعائیہ الفاظ کہلوا کر اسے والدین کے احسان کا احساس دلا دیا ہے جبکہ دوسری آیت میں بدنی اور عقلی قوتوں کی تکمیل کے بعد بچے کو خود اس احسان کا احساس ہو گیا ہے۔

ماں کی فضیلت

حسن سلوک کا حکم ماں سے بھی ہے اور باپ سے بھی۔ مگر اس کی علت بتاتے وقت اللہ نے صرف اور صرف ماں کی تکلیفوں کا ذکر کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس حکم میں ماں باپ سے مقدم ہے کیونکہ وہ نو ماہ تک مسلسل حمل کی تکلیف برداشت کرتی ہے۔ رحم مادر میں جوں جوں بچہ بڑھتا جاتا ہے عورت پر بوجھ بڑھتا ہے اور وہ کمزور سے کمزور تر ہوتی چلی جاتی ہے۔ پھر زچگی کی تکلیف بھی صرف ماں اُٹھاتی ہے اور بعض حالات میں بچے پر اپنی جان قربان کر دیتی ہے۔ اسی طرح دو برس تک رضاعت کی تکلیف بھی تنہا ماں برداشت کرتی ہے۔ ان تمام مراحل میں باپ شریک نہیں ہوتا۔ بچہ جب بڑا ہو جاتا ہے تو بھی جذباتی اور فطرتی طور پر ماں سے قریب تر ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حدیث میں ماں کے ساتھ حسن سلوک کو اولیت دی گئی ہے۔ صحیح مسلم کتاب البر و الصلة میں حدیث ہے کہ ایک صحابی نے رسول کریم ﷺ سے پوچھا میرے حسن سلوک کا سب سے بڑھ کر حقدار کون ہے؟ آپ نے فرمایا تمہاری ماں۔ اس نے پھر یہی پوچھا آپ نے پھر وہی جوب دیا، تیسری مرتبہ یہ سوال پوچھا تو بھی جواب دیا تمہاری ماں۔ چوتھی مرتبہ سوال کرنے پر جواب دیا پھر تمہارا باپ۔ باپ کا درجہ تین درجے ماں سے نیچے ہے۔

کائنات کے خالق نے انسانوں میں سے صرف ماں کو تخلیقی قوت سے نوازا ہے یہی وجہ ہے کہ اللہ نے 'وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِیْ تَسَآءَلُوْنَ بِهٖ وَالْاَرْحَامَ' (النساء ۴:۱) کہہ کر رحم کو اپنے اسم جلالہ کے ساتھ منسلک کر دیا اور اس سورۃ کا نام بھی سورۃ نساء رکھ دیا۔

Marfat.com

ولی (دوست، مددگار، کارساز)

لغوی مفہوم

ابن فارس کا قول ہے کہ (علم اشتقاق کی رو سے) واو، لام اور یاء کی ترکیب بنیادی طور پر قریب ہونے کے معنی پر دلالت کرتی ہے۔ چنانچہ عربی محاورہ ہے تباعد بعد ولْیٍ وہ قریب ہونے کے بعد دور ہوگیا۔

ولِیتُہ، الیہ، ولْیاً یعنی میں قریب ہوگیا اور اولیتہ و تباعد ما بعد میں نے اسے قریب کیا بعد میں وہ دور ہوگیا۔

مساعد بن ہذیہ ہذلی کا مصرعہ ہے: ع وعدت عواد دون ولْیک تشعب '۔'تیرے قریب ہوئے بغیر میں نے احسان لوٹا دیا پھر بھی تو شور مچاتا ہے'۔ اور عربی روزمرہ میں کہا جاتا ہے داری تلی دارھا میرا گھر اس کے گھر سے قریب ہے اور کل ممایلیک اپنے قریب سے کھاؤ۔ وِلایۃ، عداوۃ کی ضد ہے کیونکہ ولایہ کے معنی قریب ہونا اور عداوۃ کے معنی تجاوز کرنا ہے۔ وَلِیّۃ پالان کے نیچے ڈالنے والے کمبل کو کہتے ہیں جو جانور کی پیٹھ سے قریب تر ہوتا ہے۔ موسم بہار کی بارش کے بعد دوسری قریب تر بارش کو بھی ولیّ کہتے ہیں اس کی جمع اولیۃ ہے۔

یتیم، مقتول اور شہر کا ولی (منتظم) جو کسی کا ذمہ لیتا ہے اور اس کی مصلحتوں کا خیال رکھتا ہے وہ اس سے قریب تر ہوتا ہے۔ اولیٰ بالشیٔ (کسی چیز کا زیادہ حقدار ہونا) میں بھی قرب کے معنی پائے جاتے ہیں جو جتنا کسی چیز کا حقدار ہوتا ہے اتنا اس سے قریب تر ہوتا ہے۔ اللہ نے اپنے آپ کو خاص طور پر مومنوں کا ولی کہا ہے کیونکہ وہ کافروں کی نسبت ان کے قریب تر ہوتا ہے۔

امام راغب نے مذکورہ قول کے برعکس یہ کہا ہے کہ ولی، ولاء اور توالی سے مشتق ہے جس کے اصل معنی دو یا دو سے زیادہ چیزوں کا اس طرح یکے بعد دیگرے آنا کہ ان کے درمیان کوئی ایسی چیز نہ آئے جو ان میں سے نہ ہو۔ اس لحاظ سے استعارۃً یہ قریب ہونے کے معنوں میں آتا ہے خواہ وہ قرب مکان یا نسب کے اعتبار سے ہو یا دین کے اعتبار سے ہو یا دوستی اور نفرت کے اعتبار سے ہو یا عقیدے کے اعتبار سے ہو۔ پہلے قول میں زیادہ وزن ہے۔ امام راغب نے قدرے باریک بینی سے کام لیا ہے۔ مفہوم دونوں کا ایک جیسا ہے۔

Marfat.com

ولیٌ فعیل کے وزن پر فاعل اور مفعول دونوں معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ فاعل کے معنوں میں کہا جاتا ہے وَلِیَہ اس نے اس کے کام کی ذمہ داری لی جیسا کہ اللہ کا قول ہے: 'اَللّٰہُ وَلِیُّ الَّذِیْنَ آمَنُوا' (البقرۃ ۲:۲۵۷) اللہ اہلِ ایمان کا کارساز ہے۔ فعیل کا وزن فاعل سے بلیغ تر ہوتا ہے۔ اس میں مبالغہ کے معنی پائے جاتے ہیں۔ فاعل کی نسبت یہ کثیر الاستعمال ہے اسی لیے قرآن مجید میں والی صرف سورۃ رعد (۱۳:۱۱) میں استعمال ہوا ہے باقی تمام مقامات پر ولی استعمال ہوا ہے۔ ولی مفعول کے معنوں میں مطیع اور فرمانبردار کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے پس کہا جاتا ہے: 'المؤمن ولی اللہ' مومن اللہ کا ولی ہے۔ یہاں ولی مفعول یعنی الموالی کے معنوں میں ہے۔ یہاں ولی کی جگہ مولاہ نہیں آئے گا جب کہ یہ کہا جا سکتا ہے: 'اللہ ولی المؤمنین و مولاہ'۔

ولایۃ

وَلِیَ یَلِی کا مصدر واو کی زیر کے ساتھ وِلایۃ بھی آتا ہے اور واو کی زبر کے ساتھ وَلایۃ بھی۔ اہل لغت کا اس کے معنوں کے بارے میں اختلاف ہے۔ ابوعبیدہ کا قول ہے کہ واو کی زیر کے ساتھ یہ سلطان کی امارت کے لیے استعمال ہوتا ہے اور واو کی زبر کے ساتھ یہ مولیٰ کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ زجاج کا قول بھی تقریباً یہی ہے کہ وِلایۃ امارت کے معنوں میں یا کسی چیز کا ذمہ اٹھانے کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے اور وَلایۃ نصرت اور نسب کے معنوں میں۔ زمخشری نے بھی زجاج کے قول کا اتباع کیا ہے۔ جبکہ امام راغب نے المفردات میں لکھا ہے وِلایۃ کے معنی نصرت اور وَلایۃ کے معنی کسی کام کا ذمہ لینے (جو امارت) کے ہیں۔ اخفش کا قول ہے کہ دونوں معنوں میں دونوں صورتوں کا استعمال جائز ہے۔ سورۃ انفال (۸:۷۲) میں جمہور نے واو کے فتحہ کے ساتھ وَلایۃ پڑھا ہے۔ حمزہ نے اسے واو کی کسر کے ساتھ وِلایۃ پڑھا ہے۔ فتحہ کے ساتھ وَلایۃ اطاعت، نصرت اسی طرح نسب اور دین کے ساتھ خاص ہے۔ اس کا زیادہ استعمال انہی معنوں میں ہوتا ہے اور کسرۃ کے ساتھ وِلایۃ امارت سے خاص ہے اور کسی کام کی ذمہ داری سے کیونکہ یہ ایک قسم کی صنعت و حرفت ہے جیسے تِجارۃ، کِتابۃ، نِجارۃ۔ ولی کی طرح مولیٰ بھی وَلایۃ سے مشتق ہے۔ وہ بھی فاعل اور اسم مفعول کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے یعنی مُوالِی و مُوالیٰ۔ اس کے معنی آزاد کرنے والا، آزاد شدہ، حلیف پڑوسی، مہمان، رشتہ دار، داماد اور چچا کا بیٹا ہے۔ مومن کو ولی اللہ تو کہہ سکتے ہیں مگر مولا نہیں کہہ سکتے البتہ اللہ کو مومنوں کا ولی بھی کہہ سکتے ہیں اور مولا بھی۔

تذکیر و تانیث

Marfat.com

ولی کی جمع اَولیاء ہے۔ المصباح المنیر میں ہے کہ ولی کا لفظ مذکر اور مؤنث دونوں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ مؤنث کے لیے ولیۃ کا لفظ استعمال ہو۔ ابوزید کے حوالہ سے بتایا گیا ہے کہ صرف ایک قبیلہ بنوعقیل 'ھن ولیّات اللہ وعدوات اللہ اولیاء ہ واعدائہ' دونوں طرح استعمال کرتا ہے۔ یہی بات صاحب المعجم الوسیط نے لکھی ہے۔ قرآن حکیم نے بھی یہ لفظ مؤنث کے لیے بھی استعمال کیا ہے اور مذکر کے لیے بھی۔ جیسا کہ سورۃ مائدہ کی آیت 'إِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللّٰهُ وَرَسُولُهُ وَالَّذِينَ آمَنُوا الَّذِينَ يُقِيمُونَ الصَّلَاةَ وَيُؤْتُونَ الزَّكَاةَ وَهُمْ رَاكِعُونَ ' (۵:۵۵) 'تمھارا ولی تو صرف اللہ ہے اور اس کا رسول ہے اور ایمان والے ہیں جو نماز کی پابندی کرتے ہیں اور زکوۃ ادا کرتے ہیں اور رکوع (خشوع وخضوع) کرنے والے ہیں'، کے ضمن میں امام طبری اور صاحب کشاف نے لکھا ہے کہ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ ولی کا اطلاق مرد اور عورت دونوں پر ہوتا ہے۔ اسی طرح سورۃ توبہ میں ہے: 'وَالْمُؤْمِنُونَ وَالْمُؤْمِنَاتُ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ ' (۹:۷۱) 'مومن مرد اور عورت ایک دوسرے کے ولی ہیں'۔ عربی میں ولیّۃ کا لفظ اس کمبل کے لیے استعمال ہوتا ہے جو سواری یا پالان کے نیچے استعمال ہوتا ہے نہ کہ ولی عورت کے لیے۔

اردو میں ولی کے معنی

لغوی تشریح سے واضح ہوگیا کہ لفظ ولی کے معنی اصالۃً قریب ہونے کے ہیں جبکہ استعارۃً اس کے کئی معانی ہیں۔ اُردو میں ان سب معانی کو یوں یکجا کیا جا سکتا ہے، کام کا ذمہ لینے والا یعنی متولی منتظم اور کارساز یا ناصر، مددگار، محبت کرنے والا، تابع وفرمانبردار، دوست، ساتھی، پڑوسی، آزاد کرنے والا، آزاد کردہ اور داماد۔ قرآن کی ایک آیت میں یہ لطیف اشارہ ملتا ہے کہ ولایت اصلاً اللہ کے لیے ہے اللہ کا ارشاد ہے: 'إِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللّٰهُ وَرَسُولُهُ وَالَّذِينَ آمَنُوا الَّذِينَ يُقِيمُونَ الصَّلَاةَ وَيُؤْتُونَ الزَّكَاةَ وَهُمْ رَاكِعُونَ ' (۵:۵۵) 'تمھارا ولی تو صرف اللہ، اس کا رسول اور اہلِ ایمان ہیں جو نمازوں کی پابندی کرتے ہیں اور زکوۃ ادا کرتے ہیں اور رکوع کرنے والے ہیں'۔ اس آیت میں اللہ، رسول اور مومنوں کا ذکر ہے مگر اولیاء کی بجائے مفرد کا صیغہ ولی استعمال ہوا ہے۔ اس کی اہم وجہ یہ ہے کہ ولایت دراصل اللہ تعالیٰ کے لیے ہے اور تبعاً اسے رسول اور اہلِ ایمان کی طرف بھی منسوب کیا جا سکتا ہے۔ اگر ولی کی جگہ اولیاء آتا تو اصالت اور تبعیت کا مفہوم واضح نہ ہوتا۔ اسی بنا پر اللہ کے اسماء حسنیٰ میں سے ایک نام الولیّ بھی ہے۔ بیضاوی نے بھی اس بات کی تائید کی ہے۔ چنانچہ قرآن کی کئی آیات میں اللہ کو بھی ولی کہا گیا ہے اور شیطان اور طاغوت کو بھی۔ ان مقامات پر ولی کے معنی یا تو متولی، منتظم اور کارساز

Marfat.com

(Manager of a thing or of the affairs of another, the guardian (Lane's Lexicon) Patron (Abdulla Ysuf Ali).

یا، ناصرو مددگار (Protector) لیے جائیں گے۔ اللہ کا قول ہے: 'اَللّٰہُ وَلِیُّ الَّذِیْنَ آمَنُوْا یُخْرِجُھُم مِّنَ الظُّلُمَاتِ اِلَی النُّوْرِ وَالَّذِیْنَ کَفَرُوْا اَوْلِیَآؤُھُمُ الطَّاغُوْتُ یُخْرِجُوْنَھُم مِّنَ النُّوْرِ اِلَی الظُّلُمَاتِ' (البقرہ ۲:۲۵۷) 'اللہ ان لوگوں کا متولی، منتظم اور کارساز ہے جو ایمان لائے۔ وہ ان کو اندھیروں سے روشنی کی طرف نکال لے جاتا ہے اور جنہوں نے کفر کیا وہ متولی، منتظم اور کارساز طاغوت کو قرار دیتے ہیں جو انھیں روشنی سے نکال کر اندھیروں کی طرف لے جاتے ہیں'۔ یہی مضمون سورۃ النحل (۱۶:۶۳) سورۃ بقرۃ (۲:۱۰۷)، سورۃ نساء (۴:۴۵) اور سورۃ اعراف (۷:۱۹۶) میں بیان ہوا ہے لیکن جب ولی کا لفظ بندوں سے اللہ یا شیطان کی طرف منسوب ہوگا تو اس صورت میں اس کے معنی تابع، فرمانبردار یا محبت کرنے والا، حمایتی اور ساتھی کے ہوں گے۔ جیسا کہ اللہ کا ارشاد ہے: 'اَلَا اِنَّ اَوْلِیَاءَ اللّٰہِ لَا خَوْفٌ عَلَیْھِمْ وَلَا ھُمْ یَحْزَنُوْنَ' (الیونس ۱۰:۶۲) 'یاد رکھو اللہ کے فرمانبرداروں محبت کرنے والوں یا حمایتیوں پر نہ کوئی خوف ہے اور نہ وہ غمزدہ ہوتے ہیں'۔ اسی طرح اللہ کا ارشاد ہے: 'اِنَّمَا ذٰلِکُمُ الشَّیْطَانُ یُخَوِّفُ اَوْلِیَائَہٗ' (آلِ عمران ۳:۱۷۵) 'یہ صرف شیطان ہے جو اپنے فرمانبرداروں، محبت کرنے والوں یا حمایتیوں سے ڈراتا ہے'۔ سورۃ نساء (۴:۷۶) میں یہی مضمون ہے۔ لفظ ولی اگر انسانوں کے باہمی تعلقات کے سلسلہ میں استعمال ہو تو اس کے معنی متولی، منتظم اور سرپرست کے بھی ہو سکتے ہیں۔ جیسے مسلمانوں کا ولی العہد، شہر کا ولی البلد، یتیم اور نابالغ کا ولی یا سرپرست جیسا کہ اللہ کا قول ہے: 'فَلْیُمْلِلْ وَلِیُّہٗ بِالْعَدْلِ' (البقرۃ ۲:۲۸۲) 'چاہیے کہ اس کا سرپرست عدل کے ساتھ لکھوا دے'۔ اسی طرح ولی کے معنی ان کے دوست، ساتھی، مددگار اور حمایتی کے ہوں گے مثلاً اللہ کا قول 'لَا یَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُوْنَ الْکَافِرِیْنَ اَوْلِیَاءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِیْنَ' (آلِ عمران ۳:۲۸) 'مومنوں کو چاہیے کہ ایمان والوں کو چھوڑ کر کافروں کو اپنا دوست اور مددگار نہ بنائیں کیونکہ اصل ولایت اور اصل قرب عقیدے کا قرب ہے'۔

اس لیے مومن مرد اور مومن عورتیں ایک دوسرے کے دوست اور مددگار ہیں (التوبۃ ۹:۷۱)۔ مہاجر و انصار مسلمان ایک دوسرے کے دوست ہیں (الانفال ۸:۷۲)۔ اگر دو مسلمانوں کے درمیان دشمنی ہو تو بدی کے بدلے نیکی کرنے سے ان کی دشمنی گہری دوستی میں بدل جاتی ہے (فصلت ۴۱:۳۴)۔ اسی طرح کافر کافروں کے دوست ہیں (الانفال ۸:۷۳)۔ منافق مرد اور منافق عورتیں ایک دوسرے میں سے

Marfat.com

ہیں (التوبۃ ۹:۶۷) اور ظالم ایک دوسرے کے دوست ہیں (الجاثیہ ۴۵:۱۹)۔

قرآن حکیم میں ایک مقام پر ولی کا لفظ استعمال ہوا ہے اور اس سے مراد بیٹا لیا گیا ہے۔ حضرت زکریا علیہ السلام نے اللہ سے دعا کی کہ 'فَهَبْ لِي مِن لَّدُنكَ وَلِيًّا' (مریم ۱۹:۵) 'پس تو مجھے اپنے پاس سے بیٹا عطا فرما'۔ امام راغب فرماتے ہیں یہاں ولی سے ایسا لڑکا مراد ہے جو اولیاء اللہ سے ہو۔ صاحب روح المعانی نے اس کی تفسیر ذرا کھل کر کی ہے۔ وہ فرماتے ہیں: 'میری نسل سے بیٹا'۔ ظاہری طور پر بھی یہی معنی ہیں اور اللہ کا قول 'رَبِّ هَبْ لِي مِن لَّدُنكَ ذُرِّيَّةً طَيِّبَةً' (آل عمران ۳:۳۸) 'اے میرے رب مجھے اپنے پاس سے پاک اولاد عطا کر'۔ اس ترجمہ کا شاہد ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ اس بارے میں ایک قول تو یہ ہے کہ 'سب لوگوں کے علاوہ وارث عطا کر جو بیٹے کی طرح میرا قائم مقام ہو'۔ ایک قول یہ ہے کہ 'وہ اس بات سے مایوس ہو چکے تھے کہ ان کی بیوی کے پیٹ سے اب کوئی بچہ ہو تو انھوں نے دعا مانگی کہ لوگوں میں سے کوئی ان کا وارث اور قائم مقام ہو'۔ اب وہ ان دونوں اقوال پر تبصرہ کرتے ہیں کہ یہ دونوں اقوال ناقابلِ اعتماد ہیں۔ گویا جو بات انھوں نے شروع میں کہی ہے وہی قابل اعتماد ہے۔ (۱۹:۵)

صاحب البحر المحیط نے زمخشری کے حوالہ سے کہا ہے کہ پچھلی آیت میں موالی سے مراد باپ کی طرف سے رشتہ دار اور وہ چچازاد ہیں جو بنی اسرائیل کے شریر لوگ تھے۔ حضرت زکریا علیہ السلام دین کے بارے میں ان سے خوفزدہ تھے کہ کہیں وہ دین کو بدل نہ دیں اور صحیح طور پر خلافت کا حق نہ ادا کریں اس لیے انھوں نے اپنی نسل سے صالح بیٹے کے لیے دعا کی تاکہ وہ دین کے احیاء کا سبب ہو۔

اب میں قرآن کریم کے ان تین مقامات کا بطور خاص ذکر کروں گا جن میں لفظ ولی دینی اور معاشرتی اعتبار سے خاص اہمیت کا حامل ہے۔ ایسا ہی ایک مقام وہ ہے جہاں اللہ نے واضح کیا ہے کہ مرد بھی صاحبِ اختیار و ارادہ ہے اور عورت بھی صاحبِ اختیار و ارادہ۔ دونوں اپنے کیے کے ذمہ دار ہیں، دونوں نیکی اور بدی میں برابر کے شریک ہیں، تبعیت اور ماتحتی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، دونوں مل جل کر شانہ بشانہ معاشرے کو بنا بھی سکتے ہیں اور بگاڑ بھی سکتے ہیں۔ دونوں ایک دوسرے کے دوست اور ساتھی ہیں اور دونوں میں اگر دوستی، محبت اور اخوت کے جذبات نہ ہوں تو معاشرہ کبھی سنور نہیں سکتا۔ معاشرے کی تعمیر یعنی قرآنی اصطلاح میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے لیے دونوں لازم و ملزوم ہیں۔ ان دونوں میں سے کسی ایک کو معاشرے سے نکال کر یہ کام کبھی بھی سرانجام نہیں دیا جا سکتا۔ اسی بات کے پیش نظر قرآن نے سوسائٹی میں مرد اور عورت کے میل ملاپ کے لیے آداب متعین کیے ہیں۔ ان کی آپس میں گفتگو کیسی ہو، ان کی چال ڈھال کیسی ہو، ان کا لباس کیسا ہو، یہ سب کچھ بتایا گیا ہے تاکہ وہ

Marfat.com

شانہ بشانہ اس کام کو سرانجام دیں جوان کے سپرد کیا گیا ہے۔ یہ مقدمہ ہے سورۃ توبہ کی ان دو آیات کا جن کو سمجھنے کے لیے ان کا تقابلی مطالعہ از بس ضروری ہے۔

مرد اور عورت ایک دوسرے کا جزو

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: 'اَلْمُنَافِقُونَ وَالْمُنَافِقَاتُ بَعْضُهُم مِّن بَعْضٍ يَأْمُرُونَ بِالْمُنكَرِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمَعْرُوفِ وَيَقْبِضُونَ أَيْدِيَهُمْ نَسُوا اللَّهَ فَنَسِيَهُمْ إِنَّ الْمُنَافِقِينَ هُمُ الْفَاسِقُونَ O وَعَدَ اللهُ الْمُنَافِقِينَ وَالْمُنَافِقَاتِ وَالْكُفَّارَ نَارَ جَهَنَّمَ خَالِدِينَ فِيهَا هِيَ حَسْبُهُمْ وَلَعَنَهُمُ اللَّهُ وَلَهُمْ عَذَابٌ مُّقِيمٌ' (التوبہ ۹: ۶۷ تا ۶۸) 'تمام منافق مرد اور عورتیں ایک دوسرے میں سے ہیں (ایک دوسرے کا جزو ہیں) یہ بری باتوں کا حکم دیتے ہیں اور بھلی باتوں سے منع کرتے ہیں اور اپنی مٹھی بند رکھتے ہیں۔ یہ اللہ کو بھول گئے اللہ نے ان کو بھلا دیا۔ بیشک منافق ہی فاسق ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان منافق مردوں اور عورتوں اور کافروں سے جہنم کی آگ کا وعدہ کر چکا ہے جس میں یہ ہمیشہ رہنے والے ہیں۔ جہنم ہی ان کے لیے کافی ہے ان پر اللہ کی لعنت ہے اور ان کے لیے ہمیشہ رہنے والا عذاب ہے'۔

آیت میں منافق مردوں کے ساتھ منافق عورتوں کا ذکر کیا گیا ہے حالانکہ قرآن کے اسلوب تغلیب کے مطابق اگر صرف المنفقون کہا جاتا تو بھی اس سے مراد مرد اور عورت دونوں ہوتے۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ مردوں اور عورتوں کی مستقل ذات ہے۔ نفاق کے جرم میں دونوں برابر کے شریک ہیں۔ جہنم کے عذاب سے نجات مرد اور عورت کی اپنی اپنی ذمہ داری ہے۔ تبعیت اور ماتحتی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ چنانچہ جیسا کہ ہمارے معاشرے کا تصور ہے کہ عورت بیچاری تو مرد کے تابع فرمان ہے اس کا کیا قصور! اللہ کے یہاں یہ عذر قابل قبول نہیں۔ یہ بتانا مقصود ہے کہ عورتیں مردوں کی طرح اپنے کیے کی ذمہ دار ہیں اسی لیے آیت مبارکہ میں عورتوں کا ذکر صراحت سے کیا گیا ہے۔ منافق مرد اور منافق عورتیں ایک دوسرے میں سے ہیں یعنی جیسے کسی چیز کے اجزا صورت اور حقیقت میں ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہیں اسی طرح منافق مرد اور عورتیں ایمان کے اظہار اور نفاق کے اخفاء میں ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہیں۔ حکم کے اعتبار سے بھی اور مرتبہ کے اعتبار سے بھی ان دونوں کی جبلت اور فطرت ایک ہے۔ عربی محاورے میں کہا جاتا ہے۔ اَنتَ مِنّی وانا منك یعنی تمہارا اور میرا معاملہ ایک سا ہے اس میں کوئی فرق نہیں۔

سورۃ آلِ عمران میں ذرية بعضها من بعض (۳: ۳۴) اولاد ایک دوسرے میں سے ہے۔ گویا

Marfat.com

ہر ایک دوسرے کا جزو ہے جیسا کہ شعر ہے:

تلك العصا من هذه العصية

هل تلد الحية الا الحية

وہ ڈنڈا انہی ڈنڈوں میں سے ہے

سانپ سانپ ہی کو جنم دیتا ہے

یعنی ان کا تعلق ایک ہی صنف سے ہے اور برے اور خبیث کاموں میں وہ ایک دوسرے جیسے ہیں۔ وصف کے لحاظ سے بھی اور عمل کے لحاظ سے بھی اور وہ ایک دوسرے کے نفاق کو خوب سمجھتے ہیں۔ پھر ان صفات کا ذکر ہے جو مومن کی صفات کے برعکس ہیں۔ 'یَأْمُرُوْنَ بِالْمُنكَرِ' وہ برائی کا حکم دیتے ہیں یہ جملہ کہہ کر ان کی باہمی مشابہت کو واضح کر دیا گیا ہے۔ قرآن میں معروف کا لفظ نیکی اور منکر کا لفظ بدی کے لیے استعمال ہوا ہے۔ امام طبری نے ابو عالیہ کا قول نقل کیا ہے' کہ قرآن میں جہاں جہاں امر بالمعروف کی ترکیب استعمال ہوئی ہے وہاں اس سے مراد شرک کو چھوڑ کر توحید اختیار کرنا اور نہی عن المنکر سے مراد بتوں کی پوجا سے ممانعت ہے'۔ حقیقت میں معروف سے مراد ہر حسین چیز ہے اور منکر سے مراد ہر قبیح چیز ہے مگر اس آیت میں سب سے حسین چیز رسول ﷺ کی تصدیق ہے اور سب سے قبیح اور بدصورت چیز رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی تکذیب ہے۔ منافق مرد اور عورتوں کی دوسری صفت یہ ہے کہ وہ اپنے ہاتھوں کو بند کر لیتے ہیں یعنی ہر کار خیر اور انفاق فی سبیل اللہ سے ہاتھ کھینچ لیتے ہیں اور نتیجتاً جہاد سے پیچھے ہٹنے کے بہانے تراشتے رہتے ہیں۔ نفاق عبارت ہے شک اور تردد سے، جس کا لازمہ بزدلی اور بخل ہے اور یہ دونوں عادتیں جان و مال کے ذریعہ سے باہمی نصرت کے راستہ میں حائل ہوتی ہیں۔ ہاتھ چونکہ قوت، امداد اور تعاون کی علامت ہوتے ہیں اس لیے ان کا بند کرنا مالی لحاظ سے بھی ہو سکتا ہے اور مدد و تعاون کے لحاظ سے بھی، یعنی وہ بنتے تو بہت ہیں مگر کسی کے کام نہیں آتے۔

نسیان ذکر کی ضد ہے۔ جب انھوں نے احکام خداوندی کو بھلا دیا اور جب انھوں نے عبادت اور حمد و ثنا میں اللہ کا ذکر چھوڑ دیا تو اللہ نے بھی احسان اور رحمت کے سلسلہ میں ان کا ذکر چھوڑ دیا۔ امام شوکانی نے فتح القدیر میں کہا ہے کہ نسیان کی اللہ تعالیٰ کی طرف نسبت بلاغت کے اصول مشاکلۃ کے لحاظ سے ہے ورنہ اللہ کی ذات نسیان (بھول جاتے) سے پاک ہے۔ قرآن نے اس مضمون کو دو مقامات پر پیش کیا ہے سورۃ اعراف میں ارشاد ہے: 'فَالْيَوْمَ نَنسَاهُمْ كَمَا نَسُوا لِقَاءَ يَوْمِهِمْ هَٰذَا' (۷:۵۱) 'آج ہم انھیں اس طرح بھلا دیں گے جس طرح انھوں نے اس ملاقات کے دن کو بھلا دیا'۔

Marfat.com

سورۃ الجاثیہ میں اللہ کا ارشاد ہے: 'اَلْیَوْمَ نَنسَاکُمْ کَمَا نَسِیتُمْ لِقَاءَ یَوْمِکُمْ هٰذَا' (۴۵:۳۴) 'آج ہم تمھیں اس طرح بھلا دیں گے جس طرح تم نے ہماری ملاقات کے اس دن کو بھلا دیا' یعنی جس طرح انھوں نے احکام الٰہی کو چھوڑے رکھا اسی طرح اللہ نے ان کو اپنے فضل و کرم سے محروم کر دیا۔ لفظ لعنت سے یہاں اور قرآن کے دوسرے مقامات پر اللہ کے فضل اور رحمت سے محرومی ہے جو کافروں کی طرف سے اللہ اور رسول پر عدم ایمان کا نتیجہ ہے۔

آخر میں اللہ نے منافق مردوں اور عورتوں کو ہمیشہ رہنے والے عذاب کی دھمکی دی ہے وہ اس دنیا میں بھی ضمیر کے عذاب میں مبتلا رہیں گے اور اس دنیا میں بھی جہنم کی آگ میں جھونکے جائیں گے کیونکہ دونوں مستقل شخصیت کے حامل ہیں دونوں صاحب ارادہ اور اختیار ہیں اس لیے دونوں الگ الگ اپنے اچھے اور برے اعمال کا نتیجہ بھگتیں گے۔ ایک دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا جیسا کہ ہماری سوسائٹی میں عورت کو مرد کا تابع مہمل قرار دینے والے سمجھتے ہیں۔

مومن مرد اور مومن عورتیں ایک دوسرے کے دوست ہیں

اللہ کا ارشاد ہے: 'وَالْمُؤْمِنُونَ وَالْمُؤْمِنَاتُ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ يَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ وَيُقِيمُونَ الصَّلَاةَ وَيُؤْتُونَ الزَّكَاةَ وَيُطِيعُونَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ أُولَٰئِكَ سَيَرْحَمُهُمُ اللَّهُ إِنَّ اللَّهَ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ٥ وَعَدَ اللَّهُ الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِن تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا وَمَسَاكِنَ طَيِّبَةً فِي جَنَّاتِ عَدْنٍ وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللَّهِ أَكْبَرُ ذَٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ' (التوبہ ۹:۷۱ تا ۷۲) 'مومن مرد اور مومن عورتیں ایک دوسرے کے دوست ہیں وہ نیکی کا حکم دیتے ہیں اور برائی سے روکتے ہیں، نمازوں کو پابندی سے ادا کرتے ہیں، زکوٰۃ ادا کرتے ہیں، اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرتے ہیں، یہی لوگ ہیں جن پر اللہ تعالیٰ جلد رحم فرمائے گا، بے شک اللہ تعالیٰ غالب اور حکمت والا ہے۔ اللہ نے ایماندار مردوں اور عورتوں سے ان جنتوں کا وعدہ کیا ہے جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہوں گی، وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے، ہمیشہ رہنے والی جنتوں میں (ان کے لیے) صاف ستھرے مکانات ہوں گے اور سب سے بڑی چیز اللہ کی رضامندی ہے یہ بہت بڑی کامیابی ہے'۔

منافق مرد اور منافق عورتوں کی بری صفات بیان کرنے کے بعد اللہ نے ان کو جہنم کی دھمکی دی ہے۔ جبکہ اس آیت میں اہلِ ایمان مرد اور عورتوں کی اچھی صفات بیان کرنے کے بعد ان کو جنت کی بشارت دی اور قسم قسم کی نعمتوں کا وعدہ فرمایا۔

Marfat.com

اللہ کا قول بعضہم اولیاء بعض (وہ ایک دوسرے کے دوست ہیں) پچھلی آیت میں اللہ کے قول بعضھم من بعض (وہ ایک دوسرے کے جزو ہیں) کے مقابلہ میں ہے۔ اسلوب کی تبدیلی اس بات کی طرف اشارہ کر رہی ہے کہ جہاں تک جنس ہونے کا اعتبار ہے۔ مرد اور عورت کی فطرت ایک ہے، جبلت ایک ہے خواہ منافق ہوں یا مومن کیونکہ دونوں انسان ہیں۔ اسی لیے اللہ کا قول ہے: 'لَاأُضِيعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنكُم مِّن ذَكَرٍ أَوْ أُنثَىٰ بَعْضُكُم مِّن بَعْضٍ' (آلِ عمران ۳:۱۹۵)۔ پچھلی آیت میں منافق مرد اور عورتوں کے لیے محض بعضکم من بعض کہا گیا ہے کیونکہ ان میں ایمان کا فقدان ہے اس لیے ان کے درمیان دوستی کا رشتہ استوار نہیں ہو سکتا۔ ان کا نفاق ان کے بزرگوں کے نفاق کی ایک شاخ ہے کیونکہ ان کی فطرت، عادت اور نفسانی خواہش کا تقاضا تھا کہ وہ ان کی تقلید کریں۔ مومن مرد اور عورتوں میں جو موافقت ہوتی ہے وہ عادت اور طبعی میلان کا نتیجہ نہیں ہوتی بلکہ توفیق، ہدایت اور استدلال کا نتیجہ ہوتی ہے۔ اس لیے اللہ نے منافق مرد اور عورتوں کے لیے بعضہم من بعض پر اکتفا کیا جبکہ اہلِ ایمان مردوں اور عورتوں کے لیے بعضہم اولیاء بعض کی ترکیب بھی استعمال کی ہے وہ اللہ کے دشمنوں کے خلاف ایک دوسرے کی مدد کرتے ہیں۔

منافق مرد اور عورتیں اپنی فطرتی یگانگت کے باوجود اس مقام تک نہیں پہنچ سکتے کہ وہ ایک دوسرے کے دوست بن سکیں، دوستی اور موالات کے لیے، شجاعت، نصرت، تعاون اور ذمہ داریوں کو پورا کرنے کی ضرورت ہوتی ہے جبکہ نفاق کا مزاج ان سب خوبیوں کی نفی کرتا ہے۔ منافق مرد اور عورت مزاج میں ہم آہنگی اور رویے میں یگانگت کے باوجود ایک مربوط اور مضبوط جماعت نہیں بن سکتے۔ مومن فرد کا مزاج، مومن امت کی طرح، وحدت و اتحاد کا مزاج ہوتا ہے۔ یہ اتحاد تحقیق حق اور برائی سے مدافعت کے لیے ہوتا ہے۔ تحقیق حق اور برائی سے مدافعت دوستی اور تعاون کی محتاج ہوتی ہے۔ مومن مرد اور عورتیں ایک ہی صف میں کھڑے ہوتے ہیں۔ ان کے درمیان تفرقہ کے عناصر داخل نہیں ہو سکتے اور جہاں ان کے درمیان تفرقہ ہو تو وہاں ایسے عناصر موجود ہوتے ہیں جو ان کی فطرت اور عقیدہ کے لیے اجنبی ہوتے ہیں اور وہی ان کے درمیان تفرقہ کا سبب ہوتے ہیں۔ کوئی غرض یا مرضی اس اصل صفت یعنی دوستی کے راستے میں حائل نہیں ہوتی جو علیم و خبیر ذات نے ان کے اندر ودیعت کی ہے۔ مومن مرد و عورت کی دوستی اخوت اور محبت پر مبنی ہوتی ہے، یہ ایک عقیدے پر قائم ہے، وہ ایمان باللہ اور دعوت رسول پر لبیک کہتے ہوئے ایک دوسرے سے ملتے ہیں، نیکی کا حکم کرتے ہیں اور برائی سے روکتے ہیں۔ مومن مرد بھی عقل رشید اور قلب سلیم کا مالک ہوتا ہے اور مومن عورت بھی عقل رشید اور قلب سلیم کی مالک ہوتی ہے۔ دوستی ان کی

Marfat.com

مضبوط ہوتی ہے جو عقیدے کے پکے ہوں۔ جب ہم عقیدہ اور ہم خیال اہلِ ایمان مرد اور عورت حق کے محاذ پر نیکی کے جھنڈے تلے ملتے ہیں تو وہ شانہ بشانہ اچھے معاشرے کی تعمیر کرتے ہیں۔

آیت زیرِ بحث میں مومن مرد و زن کی باہمی دوستی، نصرت اور محبت دونوں کی جامع ہے۔ نصرت میں کئی مالی، دینی اور ادبی ذمہ داریاں شامل ہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات اور صحابہ کرام کی بیویاں لشکر کے ساتھ نکلتی تھیں۔ یہ بات ذہن میں رہے کہ جہاد اس زمانہ کی سب سے بڑی اجتماعی سرگرمی تھی وہ مجاہدین کو پانی پلاتی تھیں۔ کھانا پکاتی تھیں۔ زخمیوں کی مرہم پٹی کرتی تھیں اور ضرورت پڑنے پر شمشیر بکف لڑائی میں حصہ لیتی تھیں۔ جبکہ اُم حکیم نے نبی ﷺ کا دفاع کیا۔ حضرت عائشہ اور اُم سلیم غزوہ احد میں پانی بھر بھر لاتی تھیں۔ مجاہدین کو پلاتی تھیں اور ان کے زخم دھوتی تھیں۔ مومن عورتیں مردوں کو جہاد پر اُکساتی تھیں اور شکست خوردہ لوگوں کو میدان کی طرف موڑ لیتی تھیں جیسا کہ حضرت حسان ؓ کا شعر ہے۔

۔ یظل جیادنا متمطرات
یلطمہ بالخمر النساء

ہمارے گھوڑے تیز تیز دوڑتے تھے (میدان جنگ سے)
جبکہ عورتیں اوڑھنیوں کے ساتھ ان کو تھپڑ مار کر واپس موڑتی تھیں۔

عہدِ نبوت اور خلافت راشدہ کے عہد میں مومن مرد اور مومن عورتوں کی باہمی دوستی ہر میدان میں نظر آتی ہے۔ مدینہ کے نخلستان ہوں یا دینی، علمی اور ادبی سرگرمیاں ہر جگہ یہ مرد اور عورتیں شانہ بشانہ نظر آتی ہیں۔ کسی مستند سیرت کی کتاب کو اُٹھا کر دیکھیں صحابہ اور صحابیات میں جا بجا اس دوستی اور اخوت کا رشتہ نظر آتا ہے۔ ہماری بدقسمتی ہے کہ ہم اخوت پر مبنی اس قرآنی دوستی کو گناہ تصور کرتے ہیں۔ معاشرے میں مسلمان مرد اور عورت کو دو الگ الگ خانوں میں بانٹ رکھا ہے۔ ان کے آپس میں میل جول کو فتنہ قرار دیتے ہیں کیونکہ ہم دونوں کو صرف جنس کے نقطۂ نظر سے دیکھتے ہیں۔ ہائے بیچارے کے اعصاب پہ عورت ہے سوار۔ ہمارے دل و دماغ میں یہ جاہلانہ تصور بٹھا دیا گیا ہے کہ عورت صرف جنسی آسودگی کا کام کر سکتی ہے باقی کسی کام کی اہل نہیں۔ اس نظریہ کو ثابت کرنے کے لیے کتاب و سنت میں تحریف سے بھی گریز نہیں کیا جاتا۔ عورتوں کی تنقیص کے لیے ڈھونڈ ڈھونڈ کر ضعیف اور وضعی حدیثیں پیش کی جاتی ہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مومن مردوں اور عورتوں کو جو جسد واحد سے تشبیہ دی ہے جس کا ایک عضو دوسرے عضو کو مضبوط کرتا ہے۔ صحیح بخاری (کتاب الصلاۃ) اور صحیح مسلم (کتاب البر) کی حدیث

Marfat.com

ہے: 'المؤمن للمؤمن کالبنیان یشد بعضہ بعضا'' مومن (مرد اور عورت) مومن کے لیے دیوار کی طرح ہے جس کی ایک اینٹ دوسری اینٹ کو مضبوط کرتی ہے۔ صحیح مسلم (کتاب البر) کی ایک اور حدیث ہے: 'مثل المؤمنین فی توادھم وتراحمھم وتعاطفھم مثل الجسد اذا شتکی منہ عضو تداعی لہ سائر الجسد بالسھر والحمّی 'مومنوں (مردوں اور عورتوں) کی مثال آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ محبت کرنے، رحم کھانے اور ایک دوسرے کے ساتھ مہربانی کرنے میں ایک جسم کی طرح ہے کہ جب جسم کے ایک عضو کو تکلیف ہوتی ہے تو سارا جسم بخار کا شکار ہو جاتا ہے'۔

اہلِ ایمان مردوں اور عورتوں کی پہلی صفت باہمی دوستی ہے۔ دوسری صفت یہ ہے کہ یہ دوستی حق اور عدل کے دفاع کے لیے ہوتی ہے۔ امر با لمعروف اور نھی عن المنکو کے لیے۔ چوتھی صفت نماز اور زکوٰۃ کی ادائیگی یا بالفاظ دگر حقوق اللہ اور حقوق العباد کی ادائیگی اور پانچویں صفت اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت ہے۔

یہ پانچ صفتیں منافقوں کے مقابلہ میں ہیں۔ مومنوں کو جنت کی بشارت دینے کے بعد دوبارہ مومن مردوں اور عورتوں کا ذکر کر کے فرمایا کہ سب کے سب اعلیٰ ترین جنت کی نعمتوں میں برابر کے شریک ہیں۔ یہ آیت ابتدا سے لیکر انتہا تک مومن مردوں اور عورتوں کے درمیان مساوات کے لیے نص قطعی کا درجہ رکھتی ہے۔

اولیاء اللہ کون ہیں؟

اللہ کا ارشاد ہے: 'اَلَا اِنَّ اَوْلِیَاءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ ٥ الَّذِیْنَ آمَنُوْا وَکَانُوْا یَتَّقُوْنَ ٥ لَهُمُ الْبُشْرٰی فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا وَفِی الْآخِرَةِ' (الیونس ۱۰: ۶۲ تا ۶۴) 'یاد رکھو اللہ کے ولیوں پر نہ کوئی خوف ہے اور نہ وہ غمزدہ ہوتے ہیں وہ ہی جو ایمان لائے اور جنہوں نے تقویٰ اختیار کیا۔ ان کے لیے دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی بشارت ہے'۔ امام طبری، صاحب کشاف اور البحر المحیط کا قول ہے اولیاء اللہ وہ ہیں جو اطاعت کے ذریعہ اللہ کے قریب ہوتے ہیں اور اللہ اُن کی عزت و تعظیم کے ذریعہ ان سے قریب ہوتا ہے۔ اولیاء اللہ مجمل ہے اس کی تفسیر اگلی آیت یعنی جو ایمان لائے اور جنہوں نے تقویٰ اختیار کیا ہے یعنی اللہ نے خود ہی اولیاء اللہ کی تعریف کر دی ہے اس لیے اپنی طرف سے کوئی تعریف تراشنے کی کوئی گنجائش نہیں۔ ابن عطیہ کا قول ہے جس پر ایمان اور تقویٰ

Marfat.com

کا اطلاق ہوگا وہ اولیاء اللہ میں شامل ہوگا۔ مکان اور جہت کے اعتبار سے تو اللہ کا قرب محال ہے۔ اس کا قرب اس وقت حاصل ہوگا جب وہ اللہ کی اطاعت کے لیے کوشاں ہوگا اور اللہ کی اطاعت میں وہ اس وقت کوشاں ہوگا جب اس کا عقیدہ درست ہوگا اور دلیل پر مبنی ہوگا اور جب وہ اللہ کے حکم کے مطابق نیک کام کرے گا اور برائیوں سے بچے گا۔ اگلی آیت میں اللہ نے خود اولیاء اللہ کی تعریف کی ہے کہ جو ایمان لائے اور جنہوں نے تقویٰ اختیار کیا اور ایسا شخص دیکھتا ہے تو اسے اللہ کی قدرت کے دلائل نظر آتے ہیں، جب وہ سنتا ہے تو اسے اللہ کی آیات سنائی دیتی ہیں، جب بولتا ہے تو اللہ کی حمد و ثنا کرتا ہے اور جب حرکت کرتا ہے تو اللہ کی اطاعت اور خدمت بجا لاتا ہے۔ اس وقت وہ اللہ سے انتہائی قریب ہوتا ہے۔ ایمان اور تقویٰ نظری اور عملی قوتوں کا معراج ہے۔ ولی کو یہ دونوں قوتیں حاصل ہوتی ہیں اس لیے وہ اللہ سے قریب ہو جاتا ہے اور اللہ اس کے قریب کیونکہ قرب دو طرفہ ہوتا ہے۔ اولیاء اللہ کی کوئی خاص اور علیحدہ جماعت نہیں۔ ہر مومن و متقی اللہ کا ولی ہے جو بھی اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لاتے ہیں اور اللہ کے قوانین کے مطابق زندگی گزارتے ہیں وہ سب ولی ہیں خواہ ان سے کسی کرامت کا ظہور ہو یا نہ ہو۔ قرآن میں اولیاء اللہ کی ترکیب اعداء اللہ کی ضد ہے۔ قرآن نے دونوں جماعتوں کو مقابلتاً پیش کیا ہے۔ ایک طرف مومن متقی ہیں تو دوسری طرف مشرک بدکار۔ قرآن نے اولیاء اللہ کو حزب اللہ کہا ہے (المجادلۃ ۵۸:۲۲) اور اعداء اللہ کو حزب الشیطان (اولیاء الشیطان) جیسا کہ آیت نمبر (البقرۃ ۲:۲۵۷) اور (نساء ۴:۷۶) دلالت کرتی ہیں۔ مراد اس سے اللہ یا شیطان کے تابعدار ہیں اللہ نے اولیاء اللہ کی یہ پہچان بتا دی ہے تاکہ دنیا میں بھی سرفرازیاں ان کا قدم چومیں اور آخرت میں بھی۔ اولیاء وہ نہیں جو دنیا سے کٹ کر ایک خاص وضع قطع اختیار کر کے لوگوں کو اپنی کرامتوں سے متاثر کرتے ہیں۔ ہمارے یہاں تو ہر اس مجذوب کو جس کے بال کھڑے ہوں گے، جس کی رال ٹپکتی ہوگی اور جس کا لباس گندہ ہوگا یا بغیر لباس پہنے ننگا ہوگا اُسے ولی تصور کیا جاتا ہے۔ بعض صوفیا اور ملحدین نے ولی کے بارے میں ایسے ایسے تصور تراشے ہوئے ہیں کہ کوئی مسلمان ان کا سوچ بھی نہیں سکتا مثلاً یہ کہ ولی نبی سے افضل ہوتا ہے۔ ابن عربی نے ولی کے بارے میں ایسی باتیں کی ہیں کہ الامان والحفیظ۔ خوف کا تعلق مستقبل سے ہے اور حزن (غم) کا تعلق ماضی سے ہے۔ مطلب یہ ہے کہ انھوں نے زندگی خدا خوفی سے گزاری ہوگی اس لیے قیامت

Marfat.com

کے روز ان کو کسی قسم کا خوف لاحق نہیں ہوگا بلکہ وہ اپنے ایمان اور تقویٰ کے باعث اللہ کے فضل کے امیدوار ہوں گے۔ اسی طرح دنیا کی زندگی میں جو لذتیں انھوں نے چھوڑیں ان کا ان کو کوئی رنج اور ملال نہ ہوگا اور اسی طرح جو چیزیں ان کو دنیا میں نہ مل سکیں ان پر وہ کسی حسرت کا اظہار نہیں کریں گے بلکہ وہ ہر حال میں شادماں و خوشحال ہوں گے اور ان کے دل مطمئن ہوں گے۔

کافروں سے ترک موالات کا مفہوم

اللہ نے رنگ و نسل کی تفریق اور زبان و مکان کے اختلاف کے بغیر تمام انسانیت کے لیے ہدایت ربانی کا اہتمام کیا ہے۔ سورۃ نمل (۲۶:۱۶) میں ارشاد ربانی ہے اور یہ واقعہ ہے کہ ہم نے (دنیا کی) ہر امت میں کوئی نہ کوئی رسول ضرور پیدا کیا تاکہ وہ امت اللہ کی بندگی کرے اور سرکش قوتوں سے بچے۔ اللہ کے تمام پیغمبروں نے بھی ایک عالمگیر پیغام کی تبلیغ کی۔ یہ پیغام ایمان اور عمل صالح کا پیغام ہے یعنی ایک پروردگار کی پرستش اور نیک عمل۔ یہ پیغام تمام مذاہب کی اصل اور بنیاد ہے۔ مذاہب میں جس قدر بھی اختلاف ہے وہ دین کا اختلاف نہیں بلکہ شرع و منہاج کا اختلاف ہے۔ قرآن حضرت آدم سے لے کر محمد صلی اللہ علیہ وسلم تک تمام انبیاء پر ایمان لازمی قرار دیتا ہے۔ کسی کا انکار سب کا انکار مانا جائے گا۔ اسی طرح کسی کی توہین کی اجازت نہیں۔ دنیا کی تمام اقوام کے درمیان محبت اور رواداری پیدا کرنے کے لیے اس سے بہتر اصول اور کیا ہو سکتا ہے؟

اہل کتاب سے قتال کا حکم کیوں دیا گیا؟

اسلام کا جب ظہور ہوا تو حجاز میں یہودیوں کی متعدد جماعتیں موجود تھیں لیکن عیسائی یا تو یمن میں تھے یا عرب اور شام کے سرحدی علاقوں میں۔ عیسائیوں کی حالت مختلف رہی ان کی طبیعت میں وہ سختی نہ تھی جو یہودیوں میں تھی۔ چنانچہ جب انھوں نے دعوت کا حال سنا تو وہ اس کی طرف مائل ہونے لگے۔ یمن کے عیسائیوں نے موافقانہ روش اختیار کی۔ تاریخ اسلام میں سب سے پہلے جو بادشاہ مسلمان ہوا وہ حبشہ کا عیسائی فرمانروا نجاشی تھا۔

سورۃ مائدۃ (۸۲:۵) میں ارشاد ہے اور ان مسلمانوں کے ساتھ دوستی میں قریب تر ان لوگوں

Marfat.com

کو پائیں گے جو کہتے ہیں کہ ہم نصرانی ہیں کیونکہ ان میں عالم اور درویش ہیں اور (عبادت کی وجہ سے) ان میں فروتنی اور عاجزی پیدا ہوگئی ہے۔ جب اسلام کی دعوت پھیلتی گئی تو وہ عیسائی ریاستیں جو عرب اور شام کے سرحدی علاقوں میں قائم تھیں اور رومی حکومت کے ماتحت تھیں اس تحریک کو پنپتے نہ دیکھ سکیں اور جنگ پر آمادہ ہوگئیں۔ موتہ میں شرحبیل بن عمرو غسانی نے حضرت حارث بن عمیر کو قتل کر دیا جو نبی کریم ﷺ کا نامۂ مبارک ان کی طرف لے کر گئے تھے۔ غزوہ تبوک میں پیغمبر اسلام بنفس نفیس نکلے۔ اس واقعے کے بعد سورۃ توبہ کی یہ آیت نازل ہوئی 'ان سے جنگ کرو جو اللہ پر ایمان نہیں لاتے اور نہ آخرت کے دن پر اور نہ ہی ان چیزوں کو حرام ٹھہراتے ہیں جو اللہ اور اس کے رسول نے حرام کیں اور نہ سچے دین کو اختیار کرتے ہیں۔ ان لوگوں میں سے جن کو کتاب دی گئی ہے یہاں تک کہ وہ ماتحت ہو کر جذبہ دیں اور محکوم ہوں' (۲۹:۹)۔ چونکہ مسلمانوں پر اس جانب سے حملہ ہونے والا تھا اور دوسری طرف عرب کے یہودی بھی اپنی سازشوں میں مشغول تھے۔ اس لیے مشرکین عرب کی طرح ان کے خلاف بھی جنگ کا اعلان کر دیا گیا۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ دنیا کے تمام یہودیوں اور عیسائیوں پر محض ان کے عیسائی اور یہودی ہونے کی وجہ سے حملہ کر دو جب تک وہ مسلمان نہ ہو جائیں۔

ترک موالات

قرآن میں جابجا اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ دشمنوں سے اعانت اور رفاقت کے رشتے نہ رکھو خواہ وہ تمہارے قرابت دار کیوں نہ ہوں۔ سورۃ آل عمران (۲۸:۳)، سورۃ نساء (۱۳۹:۴)، سورۃ مائدہ (۵۱:۵، ۵۷، ۸۱)، سورۃ توبہ (۲۳:۹) میں ایسے احکام موجود ہیں کہ کافروں، یہودیوں اور عیسائیوں کو اپنا رفیق اور مددگار نہیں بنانا چاہیے۔ لیکن اس طرح کے تمام احکام جنگ سے متعلق ہیں۔ یہ معیشت کے عام احکام ہرگز نہیں۔ مسلمانوں کو بتایا گیا ہے کہ میدان جنگ گرم ہو چکا ہے، دوست اور دشمن کی دو صفیں الگ الگ کھڑی ہیں۔ پس ہر شخص کے لیے ضروری ہے کہ ایک صف اختیار کرے اور جسے اختیار کرے اسی کا ہو کر رہے۔ یہ نہ ہو کہ ایک میں ہو کر دوسرے سے بھی ساز باز کرے۔ اپنے ذاتی تعلقات کو اجتماعی تعلقات پر ترجیح نہ دے اور دشمنوں کو اپنا رفیق اور مددگار نہ بنائے۔ جہاں تک ایک دوسرے کے ساتھ تعامل کا تعلق ہے اس میں اصل بات محبت و شفقت، ہمدردی، سلوک اور تعاون و

Marfat.com

سازگاری ہے۔ ہر انسان دوسرے انسان کا بھائی ہے خواہ اس کا ہم وطن ہو یا نہ ہو، ہم نسل ہو یا نہ ہو، ہم عقیدہ ہو یا نہ ہو، امتیاز وتفریق کی تمام باتیں انسانوں کی خود ساختہ ہیں اللہ کی طرف سے نہیں۔ پیغمبر اسلام نے اس حقیقت کے پیشِ نظر یہودیوں سے پیمان باندھا جسے تاریخ میں میثاق مدینہ کہا جاتا ہے اور اسی کے پیشِ نظر مشرکین سے معاہدہ کیا جسے صلح حدیبیہ کہا جاتا ہے۔ سورۃ ممتحنہ (۶۰: ۸تا۹) اسی صورت حال کی طرف اشارہ کرتی ہے: "اللہ تمھیں اس بات سے نہیں روکتا کہ تم ان لوگوں کے ساتھ اچھا سلوک کرو اور انصاف کے ساتھ پیش آؤ جنہوں نے دین کے بارے میں تم سے لڑائی نہیں کی اور تمھیں تمھارے گھروں سے نہیں نکالا۔ اللہ تعالیٰ انصاف کا سلوک کرنے والوں سے محبت کرتا ہے۔ اللہ تو تمھیں صرف ان لوگوں کی رفاقت اور سازگاری سے روکتا ہے جنہوں نے تم سے دین کے بارے میں لڑائی کی ہے (یعنی محض اس لیے کہ تم نے اپنا دین چھوڑ کر نیا دین اختیار کر لیا ہے، تم پر حملہ کر دیا ہے) اور تمھیں تمھارے گھروں سے نکالا ہے اور تمھارے نکالنے میں ایک دوسرے کی مدد کی اور جو شخص ایسوں سے دوستی کرے گا تو ایسے ہی لوگ ہیں جو ظلم کرنے والے ہیں"۔

ان آیات سے معلوم ہوا کہ قرآن میں جہاں کہیں مسلمانوں کو مشرکین یا یہود ونصاریٰ کی دوستی سے روکا گیا ہے اس سے مقصود صرف وہی جماعتیں تھیں جنہوں نے مسلمانوں سے محض اختلافِ دین کی بنا پر قتال کیا تھا اور جن کے ظلم وستم نے مسلمانوں کو ترکِ وطن پر مجبور کر دیا تھا۔ یہ بات نہ تھی کہ تمام مشرکین عرب سے یا یہود ونصاریٰ سے ترکِ تعلقات کا حکم دے دیا گیا ہو۔ قرآن کا یہ حکم کیونکر ہو سکتا ہے جب کہ اس کی دعوت سراسر انسانی اخوت اور مساوات کی دعوت اور اس کا پیغام شفقت واحسان کا عالمگیر پیغام ہے۔

☆......☆......☆

Marfat.com

الیتیم (یتیم لڑکے اور لڑکیاں)

لغوی مفہوم

اس کا فعل ثلاثی مجرد کے تین ابواب سے آتا ہے یَتَمَ یَتِمُ (ضرب یضرب) یَتِمَ یَیْتَمُ (علِمَ یعلَم) اور یتُمَ ییتُمُ (کرُم یکرُم)۔ یُتْماً اور یَتَماً اس کی مصدر ہے۔ یتمہ وَ ایتمہ یتیم بنانا۔ اَیتمت المرأہ عورت یتیم بچوں والی ہوگئی۔ اس عورت کو مؤتم کہا جاتا ہے جس کی جمع میاتیم آتی ہے۔

یتیم کی جمع یتامیٰ ہے جیسا ندیم کی جمع ندامیٰ۔ یہ جمع خلاف قیاس ہے کیونکہ فعیل کی جمع یا تو فِعَال کے وزن پر آتی ہے جیسے کریم کی جمع کرام یا فُعَلاء کے وزن پر جیسا امیر کی جمع امراء یا فُعَل کے وزن پر جیسا کہ نذیر کی جمع نُذُر یا فَعْلیٰ کے وزن پر جیسا مریض کی جمع مرضیٰ۔ امام طبری کے قول کے مطابق یتامیٰ میں مذکر اور مؤنث دونوں شامل ہیں۔ اس کی جمع ایتام بھی آتی ہے۔ یتیم کا اطلاق مؤنث پر بھی ہوتا ہے جیسا کہ مفضل کا شعر ہے:

یا فاطم انی هالك فتثبتی
ولا تجزعی کل النساء یتیم

اے فاطمہ! میں مرنے والا ہوں پس اپنے قدم جمائے رکھنا
گھبرانا مت سب عورتیں یتیم ہوتی ہیں

اسی طرح شاعر کا قول ہے:

ان القبور تنکح الأیامیٰ
النسوة الأرامل الیتامیٰ

بے شک قبریں بیواؤں کا نکاح کراتی ہیں (یعنی جب ان کے شوہر مر کر قبر میں پہنچ جاتے ہیں) بیوہ اور یتیم عورتیں۔

لسان العرب میں ابوعبید کا قول نقل ہوا ہے کہ جب تک لڑکی کی شادی نہ ہو وہ یتیم کہلائے گی۔ صاحب کشاف کا قول ہے کہ ﷺ کا حق ہے کہ اس کا اطلاق چھوٹے بڑے سب پر ہو کیونکہ باپ سے محرومی تو ہمیشہ قائم رہتی ہے ہاں اس کا استعمال عرف عام میں بلوغ سے پہلے پر ہوتا ہے۔ نبی کریم ﷺ کا قول ہے: تستامر الیتیمة' یتیم لڑکی کی رائے پوچھی جائے گی' رائے تو بالغ کی پوچھی جاتی ہے۔ رہا نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان کہ لا یتم بعد الحلم کہ بلوغ کے بعد یتیمی نہیں رہتی۔ اس کا مفہوم

Marfat.com

شریعت کے اعتبار سے ہے نہ کہ لغت کے اعتبار سے یعنی جب بچہ بالغ ہو جائے تو بچپن کے احکام اس پر لاگو نہ ہوں گے۔

عربی لغت میں یتیم کا لفظ ان بچوں تک محدود نہیں جن کے ماں باپ مر چکے ہوں بلکہ اس سے مراد وہ عورتیں بھی ہیں جو بے شوہر ہوں خواہ وہ یتیم، کنواریاں ہوں یا بیوہ۔ قرآن کریم نے 'یتامی النساء' (نساء ۴:۱۲۷) ان ہی کے لیے استعمال کیا ہے۔ یتیم عورتیں یعنی وہ عورتیں جو شوہر کے بغیر ہوں۔ قرآن میں ہے: 'و آتوا الیتامی اموالھم' (نساء ۴:۲) یتیموں کے مال ان کو دے دو۔ مال تو بلوغت کے بعد حوالے کیا جائے گا۔ اللہ کا قول ہے: 'فَاِذَا دَفَعْتُمْ اِلَیْهِمْ اَمْوَالَهُمْ فَاَشْهِدُوْا عَلَیْهِمْ' (نساء ۴:۶) یتیموں کو مال تو بلوغت کے بعد ہی حوالہ کیا جا سکتا ہے اور شہادت بھی بلوغت کے بعد میں جائز ہے، چنانچہ قرآن نے چھوٹے اور بڑے کے لیے یتیم کا لفظ استعمال کیا ہے۔ ابن عباس کا قول ہے کہ بلوغت کے بعد بھی یتیم کا اطلاق ہوتا ہے۔ لفظ یتیم کی بحث کے ضمن میں کم و بیش تمام اہلِ لغت نے کہا ہے کہ انسان کی اولاد میں یتیم اس کو کہا جاتا ہے جس کا باپ مر گیا ہو جبکہ حیوانوں کی اولاد میں یتیم اسے کہا جاتا ہے جو ماں سے محروم ہو جائے کیونکہ حیوانات میں بچے کی پرورش کی ذمہ داری ماں کے سپرد ہوتی ہے۔ ابن السکیت، زجاج، اصمعی اور امام راغب نے اسی رائے کا اظہار کیا ہے جبکہ ماوردی نے اس بات سے اختلاف کرتے ہوئے کہا ہے کہ انسانوں میں بھی جو ماں سے محروم ہو جائے اسے بھی یتیم کہا جاتا ہے۔

یتیم کے اصل معنی الگ اور تنہا ہونے کے ہیں جب یہ کہا جاتا ہے کہ بچہ یتیم ہو گیا تو اس کا مطلب ہوتا ہے کہ وہ اپنے باپ سے الگ ہو گیا۔ مجازاً گوہر یکتا کو درۃ یتیمۃ کہا جاتا ہے۔ ہر وہ چیز جس کی نظیر نہ ہو اسے یتیمۃ کہا جاتا ہے۔ مصری رمضان المبارک کے آخری جمعہ کو جمعۃ یتیمۃ کہتے ہیں اور اسے سرکاری طور پر مناتے ہیں۔ 'بیت یتیم' منفرد گھر کو کہتے ہیں۔ اس سے یہ تنبیہ کرنا مقصود ہے کہ اس کا مادہ انقطاع اور انفراد پر دلالت کرتا ہے۔ ثعلب کا قول ہے کہ یتیم کے اصل معنی غفلت کے ہوتے ہیں اور بچے کو یتیم اس لیے کہا جاتا ہے کیونکہ وہ اطاعت میں غفلت برتتا ہے۔ ابو عمرو کا قول ہے کہ اس کے اصل معنی ابطاء (تاخیر) کے ہیں کیونکہ اطاعت اور فرمانبرداری یتیم سے پیچھے ہٹ جاتی ہے۔

اپنے وسیع معنوں میں یتیم صرف وہ نہیں ہوتا جس کا باپ مر چکا ہو، جو بھی سوسائٹی میں تنہا ہو گا اسے مجازاً یتیم کہا جائے گا۔ کسی کو یہ احساس نہیں ہونا چاہیے کہ وہ معاشرہ میں تن تنہا ہے، اس کا کوئی مونس و غم خوار نہیں۔ اسلام ایسا معاشرہ قائم کرنا چاہتا ہے جو جسد واحد کی طرح بندھا ہوا ہو۔ یتیم وہ ہے جو پناہ سے

Marfat.com

محروم ہو ایسے شخص کو پناہ دینا معاشرے کی ذمہ داری ہے جیسا کہ اللہ کا قول ہے: 'اَلَمْ یَجِدْكَ یَتِیْماً فَاٰوٰی' (الضحی ۹۳:۶) 'بھلا اس نے تمھیں یتیم پا کر جگہ نہیں دی؟ (بیشک دی)'۔ اللہ کے حکم کو نافذ کرنا اسلامی معاشرے کا فرض ہے۔ عرف عام میں یتیم ان بچوں کو کہا جاتا ہے جن کے ماں باپ مر چکے ہوں لیکن عربی زبان میں اس کا مفہوم وسیع تر ہے جیسا کہ لغوی تشریح کے ضمن میں مفضل کا شعر نقل کیا گیا ہے جس کا ایک مصرع ہے: لا تجزعی کل النساء یتیم 'گھبراؤ مت سب عورتیں یتیم ہوتی ہیں'۔ یہاں پر یتیم اسے کہا گیا ہے جو بے بس، کمزور اور بھرے معاشرے میں تنہا ہو نہ کوئی اس کا پرسان حال ہو نہ مونس وغم خوار۔

قرآن ایسا معاشرہ قائم کرنا چاہتا ہے جس کے افراد کے دل ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہوں۔ اللہ کا ارشاد ہے: 'وَاِنْ تُخَالِطُوْهُمْ فَاِخْوَانُكُمْ' (البقرة ۲:۲۲۰) 'اگر تم ان یتیموں سے میل جول کرو تو تمھارے بھائی ہیں' یعنی یتیم تمھارے درمیان تنہائی محسوس نہ کرے۔ اس تنہائی کو دور کرنے کے لیے قرآن نے یتیم کی ایک جامع صفت بیان کی ہے اور کہا ہے: 'یتیما ذامقربة' (۹۰:۱۵) 'فاقہ والے دن ایسے یتیم کو کھانا کھلاؤ جو تمھارے قریب ہے' یہ قربت نسب کی بھی ہو سکتی ہے اور آس پاس رہنے کی بھی یعنی ایسا یتیم جو اتنے لوگوں کے قریب ہوتے ہوئے بھی اپنے آپ کو تنہا محسوس کرے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم خود یتیم تھے اور یتیمی کے درد کو سمجھتے تھے۔ اللہ نے انھیں مخاطب کر کے فرمایا کیا 'ہم نے تمھیں یتیم نہیں پایا؟ کیا ہم نے تمھیں پناہ نہیں دی؟' آپ تو اس مرحلہ سے گزر چکے ہیں اس لیے فرمایا: 'فَاَمَّا الْیَتِیْمَ فَلَا تَقْهَرْ' (الضحی ۹۳:۹) 'رہی بات یتیم کی تو اس پر سختی نہ کرنا'۔ کہیں اس کا احساس تنہائی شدت نہ اختیار کر جائے۔

یتیموں کی خیر خواہی اور ان کے ساتھ حسن سلوک کے بارے میں آیات پورے قرآن میں پھیلی ہوئی ہیں، ان میں سے کچھ تو مکی ہیں اور کچھ مدنی۔ مکی آیت میں بتایا گیا ہے کہ معاشرے میں یتیم کی کیا اہمیت ہے؟ اس کے ساتھ بدسلوکی اور اس کی توہین اجتماعی اور اقتصادی لحاظ سے کتنا برا اثر ڈالتی ہے؟ یتیم سے بدسلوکی دین کی تکذیب کے مترادف ہے۔ ایسے شخص کی نماز محض ریا کاری اور اس کے لیے تباہی کا باعث ہے۔ مکی سورة بنی اسرائیل میں اللہ کا ارشاد ہے: 'وَلَا تَقْرَبُوْا مَالَ الْیَتِیْمِ اِلَّا بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ حَتّٰی یَبْلُغَ اَشُدَّهٗ' (۱۷:۳۴) 'اور یتیموں کے مال قریب تک نہ جاؤ مگر اس طریق سے جو بہت اچھا ہو یہاں تک کہ وہ اپنی جوانی کو پہنچ جائے'۔ بالکل یہی الفاظ مکی سورت سورة انعام میں دہرائے گئے ہیں (۶:۱۵۲)۔ ان آیات کی مزید تشریح سورة نساء (۴:۶) کی آیت میں یوں کی

Marfat.com

گئی ہے: 'اور یتیموں کی جانچ پڑتال کرتے رہو یہاں تک کہ وہ نکاح کی عمر کو پہنچ جائیں پھر اگر تم ان میں عقل کی پختگی پاؤ تو ان کا مال ان کے حوالے کردو اور اس خیال سے کہ اب وہ بڑے ہو جائیں گے فضول خرچی سے جلدی جلدی نہ کھا جاؤ اور جو مالدار ہے اسے بچنا چاہیے اور جو نادار ہے تو وہ قاعدے اور قانون کے مطابق (حق خدمت) لے لے، پھر جب تم ان کے مال ان کے حوالے کرو تو اس پر گواہ بنا لو (اور یہ بات پیش نظر رکھو) کہ اللہ ٹھیک ٹھیک حساب لینے والا ہے'۔ اس سے پہلے (نساء ۴:۲) فرمایا 'اور یتیموں کو ان کے مال دو اور اچھی چیز کو نکمی سے نہ بدلو اور ان کے مال کو اپنے مال کے ساتھ ملا کر (خرد برد کر کے) نہ کھاؤ، یہ بڑا گناہ ہے' اور پھر دھمکی کے انداز میں کہا گیا 'جو لوگ ظلم سے یتیموں کا مال کھا جاتے ہیں وہ اپنے پیٹ میں آگ بھر رہے ہیں اور وہ بھڑکائی ہوئی آگ میں داخل ہوں گے' (نساء ۴:۱۰)۔

سورۃ الفجر (۸۹:۱۵ تا ۱۷) میں اللہ تعالیٰ نے بڑے زوردار انداز میں اس حقیقت سے پردہ اُٹھایا ہے کہ عزت اور ذلت کا مدار مال کی کثرت اور قلت پر نہیں ہوتا۔ انسان کے اس قول کی تردید کے لیے غائب کے صیغہ کو چھوڑ کر خطاب کا انداز اس قول کی برائی میں شدت بیان کرنے کے لیے اختیار کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ انسان کا فعل اس کے قول سے بھی بدتر ہے۔ 'وہ اس طرح کہ اللہ نے کثرت مال سے اسے عزت عطا کی مگر اس نے یتیم کو عزت نہیں بخشی جو اس پر واجب تھی۔

یتیم کی عزت کو ترک کرنے کی کئی صورتیں ہیں:

۱۔ آدمی اس کے ساتھ حسن سلوک نہیں کرتا۔ نہ خود اسے کھلاتا ہے نہ دوسروں کو کھلانے کی ترغیب دیتا ہے۔

۲۔ میراث میں اس کا ثابت شدہ حق نہیں دیتا اور سارے کے سارے ورثے کو لپیٹ کھاتا ہے۔

۳۔ یتیم کا مال اپنے مال کے ساتھ ملا کر کھا جاتا ہے کیونکہ مال سے ٹوٹ کر محبت کرتا ہے۔

حدیث کے الفاظ میں احب البیت الی اللہ بیت فیہ یتیم مکرم 'اللہ کے یہاں سب سے محبوب گھر وہ ہے جس میں یتیم ہو اور اس کی عزت و تکریم ہو رہی ہو'۔ جس معاشرہ میں یتیم کی عزت نہ ہو وہ کبھی پنپ نہیں سکتا۔

مال سے جدا ہونا نفس پر شاق گزرتا ہے اس لیے قرآن نے اسے دشوار گزار گھاٹی قرار دیا ہے اور اس گھاٹی کو وہی سر کر سکتا ہے جو آس پاس میں رہنے والے یتیم کے سامان زیست کا بندوبست کرے (الفجر ۹۰:۱۴ تا ۱۵) جو ہزاروں انسانوں کے درمیان رہتے ہوئے بھی اپنے آپ کو تنہا یعنی یتیم محسوس

Marfat.com

کرے۔ مکی سورتوں میں سے سورۃ ماعون میں یتیم کے ساتھ بدسلوکی کو دین کی تکذیب کے برابر قرار دیا ہے یعنی ایسا شخص زبان سے ایمان کا اقرار تو کرتا ہے مگر عملاً اس اقرار کی تکذیب کرتا ہے۔ اپنے آپ کو دین دار ظاہر کرنے کے لیے نمازیں پڑھتا ہے مگر نماز کے مقصد سے بے خبر ہوتا ہے، اس لیے اس کی نمازیں محض ریاکاری ہیں اور اس کے لیے تباہی کا باعث ہیں کیونکہ وہ نمازیں پڑھنے کے باوجود سامان زیست پر قبضہ جما کو ضرورت مندوں کو ان کی ضروریات سے محروم رکھتا ہے۔ نتیجتاً اس کا ٹھکانہ جہنم ہے جو دین کو جھٹلانے والے کا ٹھکانا ہے۔ گویا یتیم کی خبر گیری کرنا دین کا رکن قرار دیا گیا ہے۔ یتیم کو دھکے دینا اور مسکین کو کھانا کھلانے کی رغبت نہ دلانا جس طرح مروت اور انسانیت کے لحاظ سے بری بات ہے اسی طرح شریعت میں بھی یہ دونوں باتیں بری ہیں۔ اللہ کا ارشاد ہے: کیا تو نے اس شخص کی حالت پر غور نہیں کیا جو دین کو جھٹلاتا ہے؟ یہ وہی ہے جو یتیم کو دھکے دیتا ہے (عربی کا محاورہ ہے: دعت فلا ناعن حقه میں نے فلاں کو دھکا دے کر اس کو اس کے حق سے دور کر دیا)۔ اس میں یتیم کو اس کے حق اور مال سے پرے دھکیلنا اس کے ساتھ ہمدردی کو ترک کرنا اور اسے ڈانٹنا ڈپٹنا اور مارنا پیٹنا سب شامل ہیں اور مسکین کو کھانا کھلانے کی رغبت نہیں دیتا۔ پس ان نمازیوں کے لیے تباہی ہے جو اپنی نماز سے غافل ہیں (نماز کے مقصد کو نہیں سمجھتے) جو دکھاوا کرتے ہیں اور عام استعمال کی چیزوں کو روکتے ہیں (الماعون ۱۰۷:۱تا۷) اس کے مقابلہ میں اللہ کا ارشاد ہے جو اس کی (اللہ کی) محبت کی وجہ سے مسکین، یتیم اور قیدی کو کھانا کھلاتے ہیں (الدھر ۷۶:۸) اللہ نے ان کو جنت اور اس کے خوش ذائقہ چشموں کا حق دار قرار دیا ہے۔ بالفاظ دیگر معاشرے کے محروم طبقوں کو زیست کا سامان بہم پہنچانا بہت بڑی نیکی ہے جس کی جزا جنت ہے۔ سات آیات پر مشتمل اس مختصر سی سورۃ نے ایمان اور کفر کے تمام تصور کو بدل کر رکھ دیا ہے اور اس حقیقت سے پردہ اٹھایا ہے کہ عبادات کا اصل مقصود نوع انسان کی بھلائی ہے۔ عبادت میں خلوص اور ریاکاری کی اصل کسوٹی یہی ہے اور یہ کہ دین ایک وحدت ہے جس کی غرض و غایت بشریت کی بہبود ہے۔

یتیموں کے بارے میں تفصیلی احکام مدنی سورتوں میں بیان ہوئے ہیں۔ سب سے جامع اور تاکید کے اعتبار سے سب سے بڑھ کر احکام سورۃ نساء میں وارد ہیں لیکن اس سے پہلے کچھ احکام سورۃ بقرۃ میں بھی مذکور ہیں مثلاً والدین کے احسان کے ساتھ یتیموں کا ذکر خاص طور پر کیا گیا ہے۔ اللہ کا ارشاد ہے: وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَاناً وَذِي الْقُرْبَى وَالْيَتَامَى (البقرة ۲:۸۳) والدین، قرابت داروں اور یتیموں کے ساتھ حسن سلوک کرو۔ دوسری جگہ ارشاد ہے کہ اصلی نیکی یہ ہے: وَآتَى الْمَالَ

Marfat.com

عَلٰی حُبِّهٖ ذَوِی الْقُرْبٰی وَالْیَتٰمٰی '(البقرة ۲: ۱۷۷) اور اللہ کی محبت میں غریبوں اور یتیموں کو مال دے پایہ کہ مال سے محبت کرنے کے باوجود اسے یتیموں کی ضروریات پوری کرنے کے لیے دے دیا جائے۔

یتیموں کے بارے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال وجواب کو سورۃ بقرۃ میں بیان کیا گیا ہے۔ اللہ کا ارشاد ہے: 'وَیَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْیَتٰمٰی قُلْ اِصْلَاحٌ لَّهُمْ خَیْرٌ وَاِنْ تُخَالِطُوْهُمْ فَاِخْوَانُكُمْ وَاللّٰهُ یَعْلَمُ الْمُفْسِدَ مِنَ الْمُصْلِحِ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَاَعْنَتَكُمْ اِنَّ اللّٰهَ عَزِیْزٌ حَكِیْمٌ '(۲: ۲۲۰) آپ سے یتیموں کے بارے میں پوچھتے ہیں کہہ دیجئے کہ ان کی اصلاح کرنا اچھا ہے اگر تم ان سے میل جول کرو تو تمھارے بھائی ہیں اور اللہ تم میں سے اصلاح کرنے والے کو فساد کرنے والے سے خوب جانتا ہے اور اگر اللہ چاہتا تو تمھیں مشکل میں ڈال دیتا (یعنی تمھیں اس قسم کی ہدایات نہ دیتا) بے شک اللہ غالب حکمت والا ہے۔ حضرت ابن عباس سے روایت ہے جب یہ آیت نازل ہوئی: 'وَلَا تَقْرَبُوْا مَالَ الْیَتِیْمِ اِلَّا بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ حَتّٰی یَبْلُغَ اَشُدَّهٗ '(الأنعام ۶: ۱۵۳؛ بنی اسرائیل ۱۷: ۳۴) 'یتیم کے مال کے قریب مت جاؤ مگر عمدہ طریق سے یہاں تک کہ وہ جوانی کی عمر کو پہنچ جائے تو جس کے ہاں کوئی یتیم تھا تو اس نے اپنا کھانا پینا اس کے کھانے پینے سے الگ کرلیا، اس سے یتیم اور اس کے سرپرست دونوں کو مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا۔ جو کھانا بچ جاتا وہ خراب ہو جاتا۔ اس مشکل کا تذکرہ نبی پاک ﷺ کے سامنے کیا گیا تو یہ آیت نازل ہوئی۔ اس کے بعد انہوں نے اپنا کھانا پینا اُن سے ملا لیا۔ آیت کی تفسیر یہ ہوئی کہ اے محمد! تیرے صحابہ یتیموں کے بارے میں سوال کرتے ہیں، نان ونفقہ، رہائش اور خدمت کے بارے میں اپنے مال کو ان کے مال کے ساتھ ملانے سے متعلق پوچھتے ہیں تو کہہ دیجئے کہ تمہاری ترجیح کہ ان کے مال کی اصلاح اس طرح ہو کہ اس میں کوئی چیز کم نہ ہو اللہ کے یہاں تمھارے حق میں بہتر ہے اور تمھیں اس کا بڑا اجر ملے گا اور ان کے مال کے حق میں بھی بہتر ہے کیونکہ وہ بھی پھلے پھولے گا۔ ان کے مال کی دیکھ بھال اور اصلاح کے بدلے حق خدمت کے طور پر ان کے مال میں سے دستور کے مطابق کچھ لے سکتے ہو اگر اللہ تمھیں اس قسم کی ہدایات نہ دیتا تو تم مشکل میں پھنس جاتے۔

یتیموں سے میل جول کا مطلب یہ ہے کہ ان کو کھانے پینے، رہنے سہنے اور تجارت میں شریک کرلیا جائے۔ کھانے پینے میں شراکت اور میل جول نفوس کی اصلاح کے لیے اور تجارت میں شراکت ان کے مال کی اصلاح کے لیے ضروری ہے۔ میل جول سے ان کا احساسِ تنہائی ختم ہو جائے گا اور تجارت میں

Marfat.com

شرکت سے ان کا مال بڑھے گا۔ جب تم اپنا مال ان کے مال سے ملاؤ گے تو اللہ کو خوب معلوم ہو گا کہ تم اسے اصلاح کی غرض سے ملا رہے ہو یا فساد کی غرض سے۔ وہ تو دلوں کے حالات جانتا ہے۔ اس آیت میں ایک اور حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ یتیم تمھارے بھائی ہیں اور بھائی کا حق ہے کہ دوسرا بھائی اس سے ملے۔ وہ تو ایک دوسرے کے دست و بازو ہوتے ہیں۔ ان میں سے مالدار نادار کی مدد کرتا ہے اور طاقتور کمزور کی۔ بھائی تو معاشرتی زندگی میں مل جل کر رہتے ہیں۔ اُخ (بھائی) کا لفظ امام راغب کی تصریح کے مطابق ان پر بولا جاتا ہے جو ولادت میں ماں یا باپ یا دونوں طرف سے شریک ہو اور استعارۃً قبیلہ یا زمین یا صنعت یا معاملہ یا محبت کے شریک پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے۔ مذکر و مؤنث میں کوئی فرق نہیں۔

آج کل یتیم خانوں میں یتیموں کو الگ تھلگ رکھا جاتا ہے جس سے یتیم ہونے کا احساس تازہ ہوتا رہتا ہے اور اس کا اثر اخلاق پر بھی برا پڑتا ہے۔ قرآن حکیم کے احکام کے مطابق ان کو دوسرے بھائیوں کے ساتھ ملا کر رکھنا چاہیے اور بصورت طالب علم ان کو دوسرے طالبعلموں کے ساتھ ملا کر تعلیم دی جائے۔ اس پر اکتفا نہیں بلکہ ان کو بازاروں میں چندہ جمع کرنے کے لیے گداگری پر مقرر کیا جاتا ہے۔ یہ قرآن کی تعلیمات کے سراسر منافی ہے۔

یتیموں کے حقوق کے ضمن میں قرآن حکیم نے تعدد ازدواج کے مسئلہ کو بیان کیا ہے۔ سورۃ نساء میں اللہ کا فرمان ہے: وَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا فِي الْيَتٰمٰى فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ مَثْنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ ذٰلِكَ اَدْنٰٓى اَلَّا تَعُوْلُوْا (۴:۳) 'اگر تمھیں اندیشہ ہو کہ یتیموں کے بارے میں انصاف نہ کر سکو گے تو (ان میں سے) ایسی عورتوں سے نکاح کر لو جو تمھیں پسند ہوں۔ (حالات کے مطابق) دو دو تین تین اور چار چار۔ پھر اگر تمھیں اندیشہ ہو کہ عدل نہیں کر سکو گے تو ایک بیوی ہی کافی ہے یا وہ عورتیں جو (لڑائی کے قیدیوں میں سے) تمھارے ہاتھ آ گئی ہیں۔ بے انصافی یا کثرت اولاد کے بوجھ سے بچنے کے لیے ایسا کرنا زیادہ قرین صواب ہے۔'

اس آیت سے پہلے والی آیت میں یتیموں کا مال ناحق کھانے اور اس کو دوسرے مال کے ساتھ ملانے سے منع کیا گیا ہے اور ان کو بتایا گیا ہے کہ اگر وہ اس بارے میں اللہ سے ڈرتے ہیں تو انھیں یتیم بچوں اور یتیم عورتوں یعنی بے شوہر عورتوں کے بارے میں بھی ڈرنا چاہیے۔ ان کا خاص خیال رکھنا چاہیے اور ان پر ظلم سے بچنا چاہیے۔ تقویٰ کی تطبیق کے دو پہلو ہیں ایک اللہ کا تقویٰ اور دوسرے قرابت داروں کا تقویٰ

Marfat.com

جس کا ظہور عام طور پر کمزور قرابت داروں کی حق تلفی کی صورت میں ہوتا ہے اور وہ قرابت دار زیادہ تر وہ یتیم ہوتے ہیں جو اپنے قرابت داروں کی کفالت میں ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جس تقویٰ کی اللہ نے دعوت سورۃ کے آغاز میں دی ہے اس کا عملی اظہار یتیموں کے حقوق کی نگہداشت کر کے کیا جا سکتا ہے۔ ان کے نفس اور ان کے مال کے بارے میں اللہ کا خوف انسانوں کے پاس امانت ہے۔ یتیموں کے مال سے نہی کے بعد یتیموں کے نفس پر ظلم کرنے کی نہی اس لیے کی گئی ہے کہ یہ ظلم بھی مال ہی کی خاطر ہوتا تھا۔ قرآن ضمیر کو پاسبان بناتا ہے اور تقویٰ کو رقیب۔ عروہ کا قول ہے کہ مذکورہ آیت کے بعد لوگوں نے نبی کریم ﷺ سے عورتوں کے بارے میں فتویٰ پوچھا تو 'وَيَسْتَفْتُونَكَ فِي النِّسَآءِ' (نساء ۴: ۱۲۷) نازل ہوئی اور اس آیت میں وَمَا يُتْلَى عَلَيْكُمْ فِي الْكِتَابِ فِي يَتَامَى النِّسَآءِ' اور جو تم پر کتاب میں یتیم عورتوں کے بارے میں پڑھا جاتا ہے' سے مراد اللہ کا قول 'ان خفتم أن لا تقسطوا' ہے۔ سورۃ کے آغاز میں سب لوگوں کو مخاطب کیا گیا ہے جبکہ آیت زیر بحث کے آغاز میں خطاب یتیموں کے سرپرستوں سے ہے جیسا کہ امام طبری نے کہا ہے: 'اے یتیموں کے سرپرستوں کی جماعت' اور صاحب البحر المحیط ابوحیان اندلسی کا کہنا ہے کہ 'خطاب یتیم عورتوں کے سرپرستوں سے ہے'۔

شانِ نزول

آیت مذکورہ کے بارے میں مشہور روایت یہ ہے کہ عروہ بن زبیر نے حضرت عائشہؓ سے اس آیت کے بارے میں پوچھا تو انھوں نے فرمایا اے بھانجے! یہ اس یتیم عورت کے بارے میں ہے جو ایسے سرپرست کی زیر نگرانی تھی جو اس کے مال میں شریک ہوتا، اسے اس کا مال اور خوبصورتی بھا جاتی، وہ اس سے شادی کا ارادہ تو کرتا مگر حق مہر میں اس کے ساتھ انصاف نہ کرتا تو اسے شادی سے منع کر دیا گیا اور کہا گیا کہ دوسری اجنبی عورتوں سے شادی کر لو جو اپنی حق تلفی نہ ہونے دیں۔ امام بخاری نے اس روایت کو آیت نمبر ۴: ۳ اور آیت نمبر ۴: ۱۲۷ دونوں جگہ نقل کر دیا ہے۔ تفسیر ابن کثیر میں بھی اس روایت کو آیت نمبر ۴: ۱۲۷ کے تحت درج کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ آیت نمبر ۴: ۳ کا یہ شانِ نزول نہیں ہو سکتا مناسب یہی ہے کہ اسے آیت نمبر ۴: ۱۲۷ کا شانِ نزول قرار دیا جائے۔

زیر بحث آیت کی شان نزول یہ نہیں ہو سکتی، کیونکہ:

۱۔ ان خفتم شرط ہے اور اس کی جزاء فانکحوا ہے۔ مگر مذکورہ شان نزول کے مطابق اس شرط کا جواب فلا تنکحوھن کو محذوف مان کر فانکحوا ما طاب کو جملہ مستانفہ تسلیم کیا گیا ہے گویا انکحوا ما طاب کے پہلے جواب شرط کی علامت غلطی سے لگا دی گئی ہے۔

Marfat.com

شرط اور جوابِ شرط میں ربط یہ ہے کہ یتیموں کے ساتھ ناانصافی ایک اہم مسئلہ ہے اور اس مسئلہ کا حل یہ ہے کہ تم اپنی پسند کے مطابق انہی میں سے یتیم عورتوں سے شادی کرلو، جوان بچوں کی ماں، بہن ہوسکتی ہیں، جب وہ تمہارے ساتھ ذمہ داری میں شریک ہوجائیں گی تو یہ مسئلہ حل ہوجائے گا۔ یتیموں کے ساتھ عدل کبھی بھی اپنی پسند کی اجنبی عورتوں سے شادی کر کے نہیں ہوسکتا بلکہ یہ تو یتیم کے ساتھ ظلم اور اس کے مال کے ساتھ زیادتی کا سبب بنے گا تاکہ شادی کے بعد اور بہت سی بیویوں کی کثیر اولاد کے مطالبات کو پورا کیا جاسکے۔ اس صورت میں شرط اور جزا بے ربط ہوجائیں گے۔

۲۔ مذکورہ شانِ نزول میں النساء کے بعد سو اھن لگالیا گیا ہے حالانکہ النساء ال کے ساتھ معرفہ ہے۔ اس سے مراد یتیم عورتیں ہیں نہ کہ غیر یتیم عورتیں۔ ورنہ نساء نکرہ استعمال ہوتا۔ آیت نمبر۴: ۱۲۷ میں یتامی النساء کی ترکیب بھی اس مفہوم کی تاکید کرتی ہے۔

۳۔ حضرت عائشہ کی روایت کی بہتر تاویل یہ ہے کی اس روایت میں جو دوسری عورتوں سے شادی کا ذکر کیا گیا ہے ان سے مراد بھی وہ یتیم عورتیں ہیں جو کسی سرپرست کی زیرِ کفالت نہ تھیں۔ اس لیے روایت میں اجنبیات کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ اس سے مراد غیر یتیم عورتیں ہرگز نہیں کیونکہ ابتدائی زمانے کے ہنگامی حالات جوں کے توں موجود تھے اور ایسی عورتیں کثرت سے موجود تھیں۔ ان کو چھوڑ کر غیر یتیم عورتوں سے شادی کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ پس اللہ کا حکم ان خفتم کا خطاب ان لوگوں سے ہے جو آتوا الیتامی أموالھم کے حکم کو مانتے تھے یا جن سے یہ حکم ماننے کی توقع تھی۔ مطلب یہ ہے کہ اے یتیموں کے سرپرستو! جس طرح تم اللہ کی رضامندی کی خاطر یتیموں کا مال ناحق کھانے سے ڈرتے ہو بالکل اسی طرح یتیم لڑکیوں اور عورتوں کے نفس کے بارے میں بھی ڈرو اور ان پر ظلم روا نہ رکھو۔

آیت زیرِ بحث میں دو شرطیں اور ان کی دو جزائیں ہیں۔ پہلی شرط یتیموں کے ساتھ انصاف نہ ہو سکنے کا اندیشہ۔ اس کی جزاء یا اس کا حل یہ ہے کہ یتیموں کی بہنوں اور ماؤں سے تعدد ازدواج کی اجازت ہو۔ اگر یہ اندیشہ نہ ہوگا تو تعدد ازدواج کی اجازت بھی نہ ہوگی۔ یہ حکم عام نہیں بلکہ مشروط ہے۔ یہ آیت ان لوگوں کے بارے میں ہے جن کو یتیموں کی خبرگیری سے واسطہ پڑتا ہے نہ کہ عام لوگوں کے لیے۔ یہ بے معنی سی بات ہے کہ کہا جائے کہ اگر تمھیں یتیموں کے بارے میں انصاف نہ کرنے کا خوف ہو تو تم اپنی پسند کی دو، تین یا چار غیر یتیم عورتوں سے شادی کرلو۔ جو کام ایک صورت کے لیے جائز ہو وہ کسی ملتی جلتی

Marfat.com

ضرورت کے تحت تو جائز ہو سکتا ہے، لیکن یہ نہیں ہو سکتا کہ اس ضرورت کو بالکل صاف کر دیا جائے۔
دوسری شرط یہ ہے کہ اگر مذکورہ استثنائی حالت میں بھی ایک شخص کو دو بیویوں کے درمیان عدم انصاف کا اندیشہ ہو تو اس کا جواب اور حل یہ ہے کہ ان میں سے صرف ایک سے شادی کرے۔ اگر پہلی شرط کو لغو سمجھا جائے گا تو دوسری شرط کا بھی کوئی اعتماد نہ ہوگا۔ قرآن کریم تعدد ازدواج کی مذکورہ اجازت کو بھی شرط سے مشروط کرتا ہے اور ہم اس شرط کو اڑا کر نیا مفہوم نکالنے کی کوشش کرتے ہیں۔

آیہ مبارکہ میں شرط اور جزاء کے جملوں میں بعض الفاظ بھی تشریح طلب ہیں۔ البحر المحیط میں ابوعبیدہ کا قول نقل کیا گیا ہے کہ خفتم (تمہیں ڈر ہو) ایقنتم (تمہیں یقین ہو) کے معنوں میں ہے یعنی یہاں خوف سے مراد یقین ہے۔ ابن العربی نے احکام القرآن کی جلد اول میں آیت زیر بحث کے تحت کہا ہے کہ مفسرین کی ایک جماعت کا قول ہے کہ خفتم کے معنی ایقنتم اور علمتم ہیں مگر میرے نزدیک خوف کا تعلق ظن سے ہے یقین سے نہیں۔ مراد یہ ہوگی اگر تمہیں گمان غالب ہو۔

لا تقسطوا میں اقساط کا ہمزہ کسی چیز کے ازالے پر دلالت کرتا ہے۔ اس کے اصل معنی ہیں جور و ظلم کا ازالہ کرنا۔ آیت میں اہم ترین لفظ یتامیٰ ہے۔ آیت کا صحیح مفہوم سمجھنے کے لیے یہ بنیادی لفظ ہے۔ میں نے لغوی تشریح میں اس لفظ پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ لفظ یتیم لڑکے اور لڑکی دونوں کے لیے بولا جاتا ہے۔ صاحب کشاف کا قول ہے کہ مردوں کی طرح عورتوں کو بھی یتامیٰ کہا جاتا ہے۔ روح المعانی میں ہے یتامیٰ سے مراد شادی شدہ یتیم عورتیں ہیں۔ چنانچہ یتامیٰ کے معنی صرف یتیم بچوں اور بچیوں کے نہیں ہیں بلکہ بے باپ کی جوان لڑکیوں اور بے شوہر کی بیوہ عورتوں پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے۔ ابن العربی نے احکام القرآن میں امام ابوحنیفہؒ کا قول کہ یتیمۃ کا اطلاق بلوغ سے پہلے ہوتا ہے نقل کرنے کے بعد کہا ہے، ہمارا قول ہے کہ یتیمۃ سے مراد بالغہ ہے اور اس کی دلیل اللہ کا قول وَيَسْتَفْتُونَكَ فِي النِّسَاءِ (نساء ۴:۱۲۷) اور اسی طرح یتامی النساء ہے۔ امام ابوبکر الجصاص کا قول ہے: یتیم کا اطلاق بھی اس بچے پر بھی ہوتا ہے جو اپنے باپ کے مرجانے سے تنہا رہ جائے اور اس عورت پر بھی جو اپنے شوہر کے مرجانے یا اس سے طلاق ہو جانے کے بعد تنہا رہ جائے۔
چنانچہ شاعر کا قول ہے:

ان القبور تنکح الأیامی
النسوۃ الأرامل الیتامی

(قبریں) یتیم بیوہ عورتوں کے شوہروں کا قبروں میں پہنچ جانا

Marfat.com

ان کے دوسرے نکاح کا سبب بنتا ہے۔

یتیم مرد کے لیے اس کا بچپن کی عمر سے قریب تر ہونا ضروری ہے لیکن بوڑھی عورتیں جب اپنے شوہروں سے جدا ہو جائیں یتیم کہلاتی ہیں۔ ان کے لیے ان کے شوہر کا وجود وہی حیثیت رکھتا ہے جو چھوٹے بچوں کے لیے باپ کا۔ قرآن میں ارشاد ہے: وأن تقوموا لليتامى بالقسط ' یتیموں کی کفالت انصاف کے ساتھ کرو'۔ یتیم کے سرپرست کو یتیم کا کفیل اسی طرح قرار دیا گیا ہے جیسا کہ مرد کو عورت کا کفیل۔

بعض مفسرین کے نزدیک عورت غیر عاقل ہے

آیت زیر بحث میں طاب سے پہلے جو حرف ما استعمال ہوا ہے اس نے بعض مفسرین کو عورت کے بارے میں اپنی رائے ظاہر کرنے کا ایک موقع فراہم کر دیا ہے۔ زمخشری اور بیضاوی کے پائے کے مفسرین نے واشگاف الفاظ میں کہا ہے کہ یہاں من کی جگہ ما اس لیے استعمال ہوا ہے کیونکہ عورتیں دین اور عقل میں ناقص ہوتی ہیں اس لیے وہ بمنزلہ غیر عاقل کے ہیں اس لیے یہاں حرف ما استعمال ہوا ہے۔ جو عام طور پر غیر ذوی العقول کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

دوسرے مفسرین نے بھی اس قول کا ذکر کیا ہے مگر ان کے اسلوب سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اس قول کو اہمیت نہیں دیتے۔ صاحب روح المعانی نے تو یہ کہا ہے کہ موقع اور محل تو یہ ہے کہ عورتوں کے بارے میں ترغیب دی جا رہی ہے۔ ایسا قول اس موقع کے لیے کیونکر موزوں ہو سکتا ہے؟ تفسیر المنار میں علامہ رشید رضا لکھتے ہیں کہ 'یہ مقام جس میں عورت کی عزت و تکریم اور ان کے حقوق کی حفاظت کا تذکرہ ہے اور جس میں ان پر ظلم و ستم کرنے سے منع کیا گیا ہے اس مفہوم سے ابا کرتا ہے'۔ امام رازی نے لکھا ہے کہ قرآن حکیم میں ما اور من ایک دوسرے کی جگہ استعمال ہوئے ہیں جیسے 'وَالسَّمَاءِ وَمَا بَنَاهَا' (الشمس ۹۱:۵) 'قسم ہے انسان کی اور اس کی جس نے اس نے بنایا'۔ اسی طرح 'وَلَا أَنتُمْ عَابِدُونَ مَا أَعْبُدُ' (کافرون ۱۰۹:۳) 'نہ تم اس کی عبادت کرتے ہو جس کی میں عبادت کرتا ہوں'۔ اسی طرح 'فَمِنْهُم مَّن يَمْشِي عَلَىٰ بَطْنِهِ' (النور ۲۴:۴۵) 'پھر ان میں سے بعض جانور ایسے ہیں جو پیٹ پر چلتے ہیں'۔ صاحب البحر المحیط لکھتے ہیں: 'یہاں ما، مَن کے معنوں میں ہے۔ یہ ان کا مذہب ہے جو ما کا استعمال ذوی العقول کے لیے جائز سمجھتے ہیں اور یہی مذہب قابل ترجیح ہے۔ انھوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ ابن ابی عبلة نے یہاں ما کی بجائے من پڑھا ہے۔

عربی کا قاعدہ ہے کہ حرف ما صرف اس صورت میں غیر عاقل کے لیے استعمال ہوتا ہے جب مراد ذات ہو، لیکن جب مراد صفت ہو تو یہ قاعدہ لاگو نہیں ہوتا۔ جیسا کہ کہا جائے 'اکرم ما شئت من

Marfat.com

الرجال' یعنی باعزت اور کمینے لوگوں میں سے جس کی عزت کرنا چاہو عزت کرو اور قرآن میں ہے: 'قَالَ فِرْعَوْنُ وَمَا رَبُّ الْعَالَمِيْنَ' (الشعراء ۲۶:۲۳) فرعون نے کہا جہان کے پالنہار کی صفت کیا ہے؟ اہل لغت نے آیت زیر بحث میں حرف ما کی مختلف توجیہات پیش کی ہیں جو زمحشری اور بیضاوی کی پیش کردہ توجیہ سے کہیں بہتر ہیں۔ ابوالعباس کا قول ہے کہ ما بطور مبالغہ عام جنس کے لیے ہے۔ جیسے ایک سوال کرتا ہے ما عندك تیرے پاس کیا ہے؟ دوسرا جواب دیتا ہے رجل وامرأة۔ مراد یہ ہے کہ تمھارے پاس جو ہے اس کی حقیقت کیا ہے؟ جیسا کہ قرآن کریم میں ہے: 'قَالَ فِرْعَوْنُ وَمَا رَبُّ الْعَالَمِيْنَ' (الشعراء ۲۶:۲۳) فرعون نے پوچھا یہ رب العالمین کیا ہے؟ ما طاب لکم تمھیں پسند ہو جو نوعیت یعنی کنواری یا بیوہ جو تمھیں پسند ہو۔ صاحب البحر المحیط کا قول ہے کہ یہ قول ہمارے اصحاب کا مذہب ہے کہ ما کا اطلاق عاقل کی نوع یا جنس پر بھی ہوتا ہے۔ فراء کا قول ہے کہ یہاں ما مصدریہ ہے۔ یہ مصدر اسم فاعل کی صورت میں مقدر ہے یعنی 'فانکحو الطیب من النساء' پاکیزہ عورتوں سے نکاح کرو۔ مذکورہ بالا قواعد اور توجیہات کی روشنی میں یہ کہنا کہ عورت چونکہ عقل و دین میں ناقص ہوتی ہے اس لیے مَنْ کی جگہ ما استعمال ہوا ہے بعض مفسرین کے اپنے ذہن کی اختراع ہے جو سماجی دباؤ کا نتیجہ ہے۔ اسلام کا اس سے کوئی تعلق نہیں۔

آیت میں ایک اور اہم لفظ النساء ہے جس کا ترجمہ اکثر مفسرین نے ایسی عورتیں کیا ہے جو یتیم نہ ہوں۔ جیسا کہ میں پہلے بیان کر چکا ہوں کہ یہاں النساء معرفہ ہے نکرہ نہیں یعنی مراد متعین عورتیں ہیں جن کا ذکر آیت میں ہوا ہے۔ اور اسی سورۃ میں یتامی النساء کہہ کر بات واضح کر دی گئی ہے کہ مراد یتیم عورتیں ہیں۔ حضرت عائشہؓ نے بھی 'وَيَسْتَفْتُوْنَكَ فِي النِّسَاءِ' (۴:۱۲۷) کے بارے میں فرمایا ہے کہ اس آیت میں انہی عورتوں کا ذکر ہے جن کا ذکر 'ان خفتم في اليتامى' میں ہے۔

امام طبری نے حسن تابعی جیسے اہلِ علم کا قول نقل کیا ہے کہ اگر تمھیں ڈر ہے کہ تم ان یتیم عورتوں سے انصاف نہ کر سکو گے جو تمھاری زیر سرپرستی ہیں تو تم ان میں سے ان عورتوں سے شادی کر لو جو تمھاری زیر سرپرستی تو نہیں بلکہ یتیم ہیں، تمھاری قرابت دار ہیں اور تمھارے لیے حلال ہیں۔ اس سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ عورتوں سے مراد یتیم عورتیں ہیں خواہ وہ قرابت دار ہوں یا اجنبی۔

ذلك ادنى ان لا تعولوا

لغوی لحاظ سے آیہ مبارکہ میں ایک اہم لفظ تعولوا ہے۔ امام راغب نے اس کا مادہ عول لکھا ہے جبکہ ابن فارس نے عیل لکھا ہے اور ساتھ ہی کہا ہے کہ اس کے سب مشتقات واو سے پلٹے ہوئے ہیں۔

Marfat.com

چنانچہ اس کا مضارع یعول بھی ہے اور یعیل بھی یعنی واوی بھی ہے اور یائی بھی۔ اس کا اسم فاعل عائل ہے۔ امام راغب کے مطابق عول سے مراد ہر وہ چیز ہے جو گراں بار ہو اور بوجھ کے نیچے دبا دے۔ محاورہ ہے ما عالك هو عائل لی جو تجھ پہ گراں بار ہے وہ مجھ پر بھی گراں بار ہے۔ اسی سے عول بھاری مصیبت کو کہا جاتا ہے اور عیال ان افراد کو کہا جاتا ہے جن کے بوجھ کے نیچے انسان دبا ہوا ہو۔ ابن العرابی نے احکام القرآن میں لکھا ہے کہ عول کے سات معانی ہیں تقریباً تمام کے تمام معنی ثقل سے لیے گئے ہیں۔ اس کے مشہور ترین معنی میلان اور جھکاؤ کے ہیں۔ جن کو امام طبری نے ابن عباس اور جمہور تابعین کی طرف منسوب کیا ہے۔ عال المیزان اس وقت کہا جاتا ہے جب ترازو ثقل کی وجہ سے ایک طرف جھک جائے۔ چنانچہ ابو طالب کا شعر ہے:

ء وبمیزان قسط لا یقل شعیرة

له شاهد من نفسه غیر عائل

انصاف کے ترازو کے ساتھ جس میں رائی کے برابر کمی نہیں ہوتی

اس کا وجود اس کا شاہد ہے وہ (بوجھ تلے) ایک طرف جھکنے والا نہیں۔

اس لیے آیت میں یہ لفظ دل کے میلان پر بولا گیا ہے۔ کتاب العین میں ہے کہ عول حکم میں ظلم کی جانب میلان کو کہا جاتا ہے اور ابن عمر کا قول ہے کہ عول وزن اور پیمانے کے جھکاؤ کو کہتے ہیں۔ چنانچہ اس معنی کی بنیاد بھی بوجھ اور ثقل ہے۔ ایک معنی جور وستم اور بے انصافی کے ہیں یعنی اپنے حق سے زیادہ لے کر بے انصافی کرنا۔ حضرت عائشہ سے روایت ہے: "أن لا تجوروا" کہ تم ظلم نہ کرو۔ عال کے ایک معنی وہ ہیں جو ابن فارس نے عیل کے مادہ کے تحت دیئے ہیں یعنی وہ محتاج اور فقیر ہو گیا۔ کیونکہ عیلة فاقہ اور حاجت کو کہا جاتا ہے۔ اللہ کا ارشاد ہے ان خفتم عیلة (التوبة ۹:۲۸) اگر تمہیں مفلسی کا ڈر ہو۔ شاعر کا شعر ہے:

ء وما یدری الفقیر متی غناه

وما یدری الغنی متی یعیل

مفلس کو کیا پتہ کب مالدار ہو جائے گا؟

اور غنی کو کیا پتہ کب مفلس ہو جائے گا؟

سفیان بن عیینہ نے تعولوا کی تفسیر تفتقروا کی ہے۔ صاحب کشاف نے ایک محاورہ نقل کیا ہے عال عیاله یعنی اس نے اپنے اہل و عیال کا نان و نفقہ برداشت کیا۔ اسی لیے حدیث ہے: ابدا بمن تعول 'ان سے شروع کرو جن کا نان و نفقہ تمہارے ذمے ہے'۔ اسی سے عال کے ایک معنی کثر عیاله

Marfat.com

یعنی وہ کثیر العیال ہوگیا۔ امام راغب نے ایک محاورہ کا ذکر کیا ہے عالت الفریضة یعنی وارثوں کے مقررہ حصے زیادہ ہوگئے۔ جب بال بچے میں زیادتی ہوگی تو ان کا نان ونفقہ بھی زیادہ ہو جائے گا۔ اس صورت میں بقول زمخشری تقویٰ کی حدود کے اندر رہنا اور رزق حلال کمانا دشوار ہو جائے گا اور جور وستم اور ناانصافی کا ارتکاب ہوگا۔ جب آپ تعداد میں زیادہ نہ ہوں گے تو جور وستم کا شکار نہ ہوں گے۔ کثرت عیال سے میلان اور جور وستم لازم آتا ہے۔ اعال الرجل کے معنی ہیں کہ آدمی کے بال بچے زیادہ ہوگئے۔

امام شافعی کی تفسیر

امام شافعی نے جو امام جوینی کے نزدیک عربوں میں فصیح ترین ان لا تعولوا کے معنی تاکہ تمھارے اہل وعیال زیادہ نہ ہو جائیں، لیے ہیں۔ یہ معنی لفظ کے بنیادی معنوں سے قریب ترہیں۔ حریری جیسے لوگوں نے الدرّۃ میں امام صاحب کی تفسیر پر یہ کہتے ہوئے تنقید کی ہے کہ انھوں نے تعولوا کی تحریف کی ہے۔ زمخشری نے اس پر یوں تبصرہ کیا ہے 'بڑے علما، ائمہ اور مجتہدین کا کلام صحت پر محمول کرنا چاہیے اور اسے تعولوا کی تحریف تعیلو نہیں سمجھنا چاہیے۔ صاحب روح المعانی نے اس اعتراض کا مدلل جواب یہ کہتے ہوئے دیا ہے: 'امام شافعی کی طرف سے جواب دینے کی کوئی ضرورت نہیں کیونکہ کسائی نے عال یعول کے معنی فصحائے عرب سے کثرت عیال نقل کیے ہیں انہی معانی کو اصمعی اور ازہری نے بھی روایت کیا ہے اور یہی معنی تفسیر ابن ابی حاتم نے زید بن اسلم سے نقل کیے ہیں جو ایک جلیل تابعی تھے۔ طاؤس کی قرأت ان لا تعیلوا بھی اس کی تائید کرتی ہے اور الدوری نے امام لغت فرا کا قول نقل کیا ہے کہ یہ حمیر کی لغت ہے۔ امام طبری نے ابن زید کی روایت نقل کی ہے کہ ذلك ادنى أن لا تعولوا کا ترجمہ أهون عليك في العيال یعنی اہل وعیال کے اعتبار سے یہ بات تمھارے لیے کم بوجھ والی ہے، کیا ہے اور انھوں نے یہ شعر بھی نقل کیا ہے:

ان الموت یاخذ کل حی
بلا شك وان امشیٰ وعالا
بے شک موت ہر زندہ کو پکڑ لیتی ہے
خواہ اس کے مال مویشی یا کنبہ زیادہ ہو۔

امام شافعی کے اصحاب کا کہنا ہے کہ آیت میں یعول کے معنی میلان بے فائدہ دکھائی دیتے ہیں کیونکہ عورتوں کے کم یا زیادہ ہونے سے میلان میں کوئی فرق نہیں پڑتا، فرق تو حقوق میں پڑتا ہے۔ اگر

Marfat.com

وہ زیادہ ہوں گی تو حقوق کا بوجھ بھی زیادہ ہوگا۔ امام شافعی کی یہ تفسیر خاندانی منصوبہ بندی کے حق میں ایک قوی دلیل ہے جس کا ذکر میں قتل اولاد کے سلسلہ میں کر چکا ہوں۔ آپ نے دیکھا کہ عول کے معنی جھکاؤ، جور و ستم، فقر و تنگدستی، کثرت اولاد سب بنیادی معنی ثقل (بوجھ) کی طرف راجع ہیں۔ مذکورہ بالا لغوی تشریحات کی روشنی میں آیہ زیر بحث کا ترجمہ یوں ہوگا۔

'اگر تم کو خوف ہو کہ یتیموں کے ساتھ تم انصاف کا سلوک نہ کر سکو گے تو ایسی مذکورہ بے شوہر کنواری اور بیوہ عورتوں (جن کے وہ بھائی یا بچے ہیں) میں جو تمھیں پسند ہوں دو دو، تین تین یا چار چار کی تعداد میں شادی کرلو۔ اور اگر تمھیں خوف ہو کہ تم ان میں بھی عدل نہ کر سکو گے تو پھر ایک سے نکاح کرلو یا اس سے جس کے تمھارے داہنے ہاتھ مالک ہوئے ہیں۔ یہ تمھارے لیے مناسب ہے تاکہ تم ناانصافی نہ کرو یا تاکہ تم کثرت اولاد کے بوجھ سے بچ جاؤ'۔ مطلب یہ ہے کہ اگر تم تنہا انصاف کے تقاضے پورے نہیں کر سکتے تو اس ذمہ داری کے لیے ان یتیم بچوں کی ماؤں اور بہنوں کو شریک کرلو۔ یتیم کے ساتھ جو قلبی لگاؤ ماں اور بہن کو ہو سکتا ہے وہ کسی دوسرے کو نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ ان کے ساتھ مل کر تم انصاف کے تقاضے احسن طریقے سے پورے کر سکتے ہو۔ سورۃ نساء کی آیت "وَيَسْتَفْتُونَكَ فِي النِّسَاءِ" (۱۲۷:۴) وہ تم سے عورتوں کے بارے میں فتوی پوچھتے ہیں، کے بارے میں روایت ہے کہ یہ آیت ام کحت کے بارے میں نازل ہوئی جو یتیم بچوں کی والدہ تھیں۔ اس آیت میں آیت زیر بحث کی طرف اشارہ ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ یہاں بھی ان عورتوں کے نکاح کا ذکر ہے جو یتیموں کی مائیں ہیں۔ آیت کا اصل موضوع عورتوں سے نکاح نہیں بلکہ یتیموں کے ساتھ انصاف کا ذکر ہے۔ چنانچہ اس مقصد کے حصول کے لیے ان کی ماؤں بہنوں کے ساتھ نکاح کو ایک علاج کے طور پر تجویز کیا گیا ہے۔ مولوی محمد علی لاہوری نے بیان القرآن اور مولانا امین احسن اصلاحی نے تدبر قرآن میں یہی ترجمہ کیا ہے۔

تعدد ازدواج

آیت مبارکہ جنگ احد کے بعد نازل ہوئی۔ مدینہ میں مردوں کے مقابلہ میں عورتوں کی تعداد زیادہ ہوگئی تھی۔ یتیموں میں بچے، بے شوہر کنواری اور بیوہ عورتیں بھی شامل تھے۔ اس کے علاوہ مکہ سے بہت سی مسلمان عورتیں اپنے سابقہ غیر مسلم شوہروں کو چھوڑ کر ہجرت کر کے مدینہ آگئیں۔ اللہ کا حکم تھا کہ انھیں واپس نہ کیا جائے ان سے مسلمان شادی کرلیں۔ سوسائٹی میں عجیب حالات پیدا ہو گئے۔ بیوہ عورتیں، ان کے یتیم بچے غیر شادی شدہ نوجوان لڑکیاں، اتنی بڑی تعداد اور قانون ایک بیوی کا۔ اس کا ایک ہی حل تھا کہ اس اصول میں استثناء پیدا کر کے زیادہ بیویوں کی اجازت دے دی جائے۔ یہ اجازت یتیموں کے مفاد کی خاطر دی گئی۔ یتیموں کے ساتھ انصاف کرنے کو اس لیے کہا گیا کیونکہ وہ کمزور ہوتے

Marfat.com

ہیں۔ان پر ظلم ہوتا ہے۔ان کے ساتھ بدسلوکی کی جاتی ہے۔جن معاشروں میں مدنی حقوق طاقت پر مبنی ہوتے ہیں وہاں کمزوروں کا کوئی پرسان حال نہیں ہوتا۔اسلام عادلانہ نقطہ نظر کا حامل ہے۔وہ کمزور اور مظلوم کے حقوق کی ادائیگی پر بطور خاص زور دیتا ہے کیونکہ روحانی قوت وضعف کا انحصار جسمانی طاقت پر نہیں ہوتا۔آیت میں دراصل یتیموں کے حقوق کے بارے میں وصیت کی گئی ہے اور ان کے مال وجان کا خیال رکھنے کو کہا گیا ہے۔آیت کا اصل مضمون عورتوں سے نکاح کرنا نہیں بلکہ یتیموں کی خبر گیری ہے اور اس مشکل کو حل کرنے کے لیے یتیم عورتوں سے نکاح کو بطور حل پیش کیا گیا ہے۔یہاں تعدادِ ازدواج کا مشروط طور پر ضمناً ذکر ہوا ہے اصالتہً نہیں، یہ اجازت ہے نہ واجب ہے اور نہ مستحب۔اس کو بھی دو شرطوں سے مشروط کیا گیا ہے۔اولاً یہ اجازت ان لوگوں کے لیے ہے جن کو یتیموں کی خبر گیری سے واسطہ پڑتا ہے اور ان کو اندیشہ ہوتا ہے کہ وہ ان کے ساتھ انصاف نہیں کر پائیں گے۔ان کو اجازت دی گئی ہے کہ وہ یتیموں کی خبر گیری کے لیے ان بے شوہر کنواری اور بیوہ عورتوں سے شادی کر لیں جوان بچوں کی مائیں بہنیں اور قرابت دار ہوں۔ورنہ یہ کہنا بے معنی ہوگا کہ اگر تمھیں یتیموں کے بارے میں انصاف نہ کرنے کا ڈر ہو تو تم دوسری دو دو، تین تین یا چار چار عورتوں سے نکاح کر لو۔اس طرح تو یتیموں کے ساتھ ناانصافی اور بھی بڑھ جائے گی۔یہ اجازت ہنگامی حالت میں ایک ضرورت کے تحت دی گئی۔ازدواج کی اس اجازت کو ہنگامی حالات سے مشروط قرار دیا گیا ہے۔جس معاشرے میں جنگ وجدال کی وجہ سے مرد زیادہ مارے جائیں اور یتیم بچوں اور بے شوہر عورتوں کی تعداد بڑھ جائے اور ان سے انصاف کا سلوک نہ ہو سکنے کا ڈر ہو اور ان کی کفالت میں مشکل پیش آئے، وہاں تعدادِ ازدواج کی اجازت ہوگی اور جہاں یہ مشکل پیش نہ ہو وہاں اس کی اجازت نہ ہوگی۔بقول مفتی محمد عبدہٗ جہاں جور وستم کا اندیشہ نہ ہو وہاں تعدادِ ازدواج قطعی حرام ہے۔جو کام ایک ضرورت کے لیے جائز ہے وہ کسی ملتی جلتی صورت کے لیے تو جائز ہو سکتا ہے لیکن یہ نہیں ہو سکتا کہ اس ضرورت یا اس شرط کو بالکل نظر انداز کر دیا جائے۔ہنگامی حالت اس وقت تک جاری رہی جب تک ابتدائی ایام میں قتال کا سلسلہ جاری رہا۔اس سے متقدمین کو اس پر غور کرنے کی ضرورت ہی محسوس نہ ہوئی۔جب یہ سلسلہ رُکا اس وقت چونکہ اجتہاد کا دروازہ بند ہو چکا تھا اس لیے متاخرین نے ازرہ تقلید اس استثنائی حالت پر غور کرنا مناسب نہ سمجھا اور اسے عام حکم سمجھ لیا گیا۔

چار بیویوں کی حد بندی بھی یتیموں کے مال کی حفاظت کے لیے کی گئی تاکہ اعتدال کی حدود سے تجاوز نہ ہو اور اس لیے بھی کہ مالدار بے شمار بیویاں اپنے گھروں میں نہ ڈال لیں اور ان لوگوں کو بھی بیویاں مل جائیں جو تنگدستی کے باعث ایک بیوی سے شادی کی طاقت نہیں رکھتے۔جس ضرورت اور

Marfat.com

استثنائی حالت کا اوپر ذکر ہوا ہے وہ اجتماعی ہے اس کے علاوہ انفرادی طور پر بھی ایک سے زیادہ بیوی کی ضرورت ہو سکتی ہے مثلاً ایک آدمی کی بیوی بانجھ ہے یا مستقل مریض ہے تو اسے نسل کی افزائش کی خاطر دوسری شادی کی اجازت ہے مگر اس سلسلہ میں بعض لوگوں نے جو جنسی قوت اور عورت کے سن یاس کو پہنچنے کا جو سبب پیش کیا ہے وہ محض شہوت پرستی ہے اس کے علاوہ کچھ نہیں۔

ثانیاً یتیموں کی نگہداشت کی خاطر جو چار عورتوں سے شادی کی اجازت دی گئی ہے وہ عدل سے مشروط ہے۔ اگر ضرورت کے تحت ہنگامی حالات میں آدمی ایک سے زیادہ بیویوں سے شادی بھی کر لے مگر دو بیویوں میں عدل نہ کر سکے تو پھر ایک بیوی اور ایک شوہر کے اصول پر عمل ہوگا۔ قاعدہ یہی ہے کہ ایک بی بی کے ساتھ ایک شوہر ہو۔ ہاں ضرورت پڑنے پر تعداد ازدواج کی طرف بطور استثناء رجوع کر سکتا ہے لیکن وہاں بھی اگر عدل نہ کرنے کا خوف لاحق ہو تو ایک بیوی کافی ہے اور اگر عادلانہ طور پر اس کی کفالت بھی نہ کر سکے تو پھر لونڈی پر اکتفا کرے۔

ان خفتم أن لا تعدلوا (اگر تمہیں خوف ہو کہ عدل نہ کر سکو گے) کی علت یہ بیان کی گئی ہے کہ ذلك ادنی لا تعولوا 'یہ قریب تر ہے تا کہ تم ظلم نہ کرو یا تم پر بوجھ نہ پڑے'۔ یعنی جور و ستم کے عدم وجود کو قانون کا سبب گردانا گیا ہے۔ اس سے عدل کی شرط کی تاکید ہوتی ہے اور اس میں تنبیہ ہے کہ عدل اللہ کو بہت عزیز ہے۔ صرف عدل کے خوف پر اکتفا نہیں کیا گیا بلکہ فرمایا گیا ہے کہ ایک کے ساتھ شادی اس بات سے قریب تر ہے کہ بوجھ نہ پڑے۔ انسانوں کی طرف سے محض ناانصافی کے امکان کو زیادہ شادیوں سے منع کرنے کے لیے کافی سمجھا گیا ہے۔ اسلام اس لیے نہیں آیا کہ مرد کو اس کی خواہش کے مطابق آزادی دے دے بلکہ اس لیے آیا ہے کہ اس کی حد بندی کرے، تعدد کو عدل سے مشروط کرے ورنہ اجازت چھن جائیگی۔ اجازت اس لیے دی گئی ہے کہ انسان زمینی حقیقتوں کا ادراک کرے نہ کہ اس لیے کہ وہ ازدواجی زندگی کو جنسی لذت کا ذریعہ سمجھے اور بیویوں کے درمیان ایسے چکر لگائے جیسا کہ ایک آشنا آشناؤں کے درمیان چکر لگاتا ہے۔ جو لوگ ایسا کرتے ہیں ان کو اسلام کی روح کا ادراک نہیں۔

ان دو شرطوں پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ تعدد ازدواج کا دائرہ بہت تنگ ہے۔ اسے بوقت ضرورت اس شخص کے لیے جائز قرار دیا ہے جس کو اس کی ضرورت ہو اور اس پر مزید پابندی یہ عائد کی گئی ہے کہ عدل قائم کرے اور اپنے آپ کو جور و ستم سے محفوظ رکھے۔ عدل سے مراد برتاؤ میں عدل، نان و نفقہ اور باری میں عدل ہے جو انسان کے اختیار میں ہے۔ اس سے مراد جذبات کا وہ عدل نہیں جو انسان کے بس میں نہیں۔ اسی سورۃ کی آیت نمبر (نساء ۴:۱۲۹) میں ارشاد ہے۔ وَلَن تَسْتَطِيعُوا أَن

Marfat.com

تَعۡدِلُوۡا بَیۡنَ النِّسَآءِ 'تم عورتوں کے درمیان (جذباتی) عدل قائم نہیں کر سکتے'، کیونکہ یہ اختیار سے باہر ہے۔ چنانچہ فَلَا تَمِیۡلُوۡا کُلَّ الۡمَیۡلِ 'کا قرینہ موجود ہے یعنی جو عدل مقصود ہے وہ یہ ہے کہ بالکل ایک بیوی کی طرف جھک نہ جائے۔ آیت زیر بحث کے سوا پورے قرآن میں تعدد ازدواج کے بارے میں کوئی اور آیت موجود نہیں اور یہ دو شرطوں کے ساتھ مشروط ہے۔

۱۔ اگر معاشرہ میں یتیموں کی نگہداشت کا مسئلہ گھمبیر ہو جائے تو ان میں سے بے شوہر چار عورتوں کے ساتھ نکاح کیا جا سکتا ہے۔

۲۔ یہ اجازت اس شرط کے ساتھ مشروط ہے کہ ان عورتوں میں عدل کیا جائے۔

تفسیر المنار میں علامہ رشید رضا رقمطراز ہیں عدل، خانہ داری، لباس، کھانے پینے اور صحت میں واجب ہے نہ کہ معاشرت میں۔ اس اعتبار سے مرد، نامرد یا عضو کٹے، صحت مند اور بیمار میں کوئی فرق نہیں۔ علماء کا قول ہے عدل زوجیت کا حق ہے جو میاں پر دوسرے شرعی حقوق کی طرح واجب ہے۔ عدل نہ ہونے کی صورت میں مقدمہ جج کے سامنے پیش ہوگا۔ جج پر واجب ہے کہ میاں کو ناانصافی سے روکے۔۔۔ یہ سب کچھ شادی کے اصل مقصد کی حفاظت کے لیے ہے۔ وہ مقصد کیا ہے معاشرت اور رویے میں مساوات۔

اصل الأصول

قرآن کے مطابق اصل الأصول یہی ہے کہ ایک شوہر اور ایک بیوی ہو۔ اصل فطرت بھی یہی ہے کہ ایک مرد کی ایک بیوی ہو، ہاں جب ضرورت پڑے تو تعدد کی اجازت ہے لیکن اگر آدمی دو بیویوں کے درمیان عدل قائم نہ کر سکے تو ضرورت کے باوجود اسے بھی ایک بیوی پر اکتفا کرنا پڑے گا۔ مصطفیٰ السباعی نے امراۃ بین الفقہ و القانون کے صفحہ ۸۰ پر خوبصورت انداز میں لکھا ہے:

'ان وحدة الزوجة اولى و اقرب الى الفطرة واحصن للاسرة، وادعى الى تماسكها وتحاب افرادها ومن اجل ذلك كان هو النظام الطبيعي لا يفكر الأنسان المتزوج العاقل فى العدول عنه الا عند الظروف 'ایک بیوی ہی بہتر اور فطرت سے قریب تر ہے۔ یہ بات خاندان کے لیے محفوظ تر ہے اور اسے ایک بندھن میں باندھنے اور اس کے افراد کے درمیان باہمی محبت والفت کا باعث ہے۔ اس بناء پر یہی فطرتی نظام ہے۔ ایک عقلمند شادی شدہ آدمی اس سے انحراف کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا۔ ہاں خاص حالات میں وہ ایسا کر سکتا ہے۔ اس موضوع پر تھانوی صاحب نے فقہ القرآن جلد اول میں تعدد ازدواج کے تحت بڑی مدلل گفتگو کی ہے۔ قانون

Marfat.com

تخلیق کے عنوان کے تحت لفظ زوج پر بحث کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں:

'زوج کے معنی ہیں دو چیزیں جو ایک دوسرے کے مماثل ہوں جیسے جوتے کے دو پاؤں بالمقابل ہوں جیسے دن اور رات، میاں بیوی کا زوج ہے اور بیوی میاں کی۔ زوج کے بنیادی معنوں میں یہ بات پائی جاتی ہے کہ ایک مرد ہو اور ایک عورت۔ دونوں ایک دوسرے کا جوڑا بننے کا معاہدہ کریں نہ یہ کہ ایک طرف ایک مرد ہو اور دوسری طرف چار بیویاں۔ انسان کی تخلیق نفس واحدہ سے ہوئی اور اس کا جوڑا اس نفس واحدہ سے پیدا کیا گیا۔ پھر ان دونوں نر اور مادہ سے نسل انسانی کا سلسلہ چل نکلا۔ ابتدا میں ایک نر اور ایک مادہ تھی۔ ایک نر کے لیے چند مادائیں نہیں پیدا کی گئیں۔ حضرت آدم پہلے انسان ہیں جن کو زمین پر بھیجا گیا ان کے لیے اللہ نے ایک ہی بیوی حوا پیدا کی۔ پورے قصہ میں ان دونوں میاں بیوی کو مخاطب کیا گیا ہے۔ سورۃ قیامۃ میں ارشاد ربانی ہے: 'فَجَعَلَ مِنْهُ الزَّوْجَيْنِ الذَّكَرَ وَالْأُنْثَىٰ' پھر بنا دیا اس کا جوڑا مرد اور عورت۔ سلسلہ تخلیق میں ایک مرد کے مقابلہ میں ایک عورت ہے اگر کہیں کوئی گڑبڑ ہے تو وہ انسان کی خود ساختہ (۳۹:۷۵) ایسا استثنائی اور ہنگامی حالات میں ہوتا ہے'۔ دوسری دلیل انھوں نے یہ دی ہے 'قرآن نے پہلے تو مرد کو سمجھایا ہے کہ وہ اپنی ناپسندیدگی پر قابو پائے لیکن اگر وہ ایسا نہ کر سکے تو دوسرا راستہ صرف یہ ہے کہ اس کو طلاق دے کر اس کے بدلے دوسری بیوی لے آئے۔ وَإِنْ أَرَدتُّمُ اسْتِبْدَالَ زَوْجٍ مَّكَانَ زَوْجٍ (نساء ۴:۲۰) 'اگر تم ایک بیوی کی جگہ دوسری بیوی لانا چاہو (یعنی اسے طلاق دے کر دوسری بیوی) اور جو کچھ تم اس بیوی کو دے چکے ہو خواہ وہ مہر کی صورت میں ہو یا تحفے کی صورت میں، خواہ وہ سونے کا ایک ڈھیر ہی کیوں نہ ہو اس میں سے ایک پائی بھی واپس نہیں لے سکتے۔ غور طلب بات یہ ہے کہ قرآن نے یہ نہیں کہا کہ اس کی موجودگی میں جو عورت تمھیں پسند ہو اس سے شادی کر لو۔ عام حالات میں اسلام کا قانون یہی ہے کہ ایک مرد ایک بیوی رکھے'۔ مذکورہ آیات سے ثابت ہوتا ہے کہ قرآن کریم کی رو سے اصول ایک بیوی کا ہے۔

أو ما ملكت ايمانكم

یا وہ لونڈی جس کے تم مالک ہوئے۔ امام طبری، امام رازی، بیضاوی اور ابن حیان کے پائے کے مفسروں نے آیت کے اس جزو کا ترجمہ یہ کیا ہے کہ اگر تم کو اندیشہ ہو کہ دو یا زیادہ بیوی بچوں کے درمیان عدل نہ کر سکو گے تو ایک لونڈی سے نکاح کر لو یا جتنی چاہے لونڈیوں سے۔ سہولت اور آسانی کے لیے ایک آزاد عورت اور بہت سی لونڈیوں میں مساوات قائم کی گئی ہے۔ کیونکہ نان ونفقہ، لباس اور باری کے معاملہ میں لونڈیوں کے درمیان عدل واجب نہیں، اس لیے لونڈیوں کی تعداد متعین نہیں کی گئی۔ ان کا یہ خیال

Marfat.com

چار کی حد بندی کو توڑنے کے لیے ہے کہ لونڈیاں جتنی چاہے رکھ لو، اس سے اصل مقصد فوت ہو جاتا ہے۔ اگر حد بندی ضروری ہے تو اس کا اس طرح توڑنا ہرگز جائز نہیں کہ لونڈیوں کی صورت میں جتنی چاہے بڑھا لے۔

جملہ کی ایک صورت تو یہ ہے کہ 'او' کا عطف النساء' پر ہو یعنی 'فانکحوا ما طاب لکم من النساء او ما ملکت ایمانکم' یعنی نکاح کروان عورتوں سے جو تمھیں پسند ہوں اوران لونڈیوں سے جو تمھارے قبضہ میں ہوں۔ اس صورت میں لونڈیاں خود عورتوں والی حد بندی میں داخل ہوں گی' اور یہی رائے مفتی محمد عبدہ کی ہے جسے علامہ رشید رضا نے تفسیر المنار میں آیت زیر بحث کے سلسلہ میں نقل کیا ہے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ یہ عطف 'فواحدۃ' پر ہو یعنی اگر ایک بھی میسر نہ آئے تو لونڈی سے نکاح کر لو۔ اس کی تائید اس آیت سے ہوتی ہے: 'وَمَن لَّمْ يَسْتَطِعْ مِنكُمْ طَوْلًا أَن يَنكِحَ الْمُحْصَنَاتِ الْمُؤْمِنَاتِ فَمِن مَّا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُم مِّن فَتَيَاتِكُمُ الْمُؤْمِنَاتِ' (نساء ۴: ۲۵) اور جو شخص تم میں سے یہ طاقت نہیں رکھتا کہ آزاد مومن عورتوں سے نکاح کرے تو تمہاری ان جوان لونڈیوں سے نکاح کرے جن کے تم مالک ہو' آیت کے اس ٹکڑے میں دو چیزوں کا آپشن دیا گیا ہے جو حکمت مقصود کے لیے مساوات کا تقاضا کرتا ہے۔ عدل میں لونڈیوں کا حق بھی قائم ہے۔ ملکیت کو بھی عادلانہ طریقے سے رکھنا چاہیے۔ اللہ کے قول 'ذٰلك ادنی ان لا تعولوا' میں ایک بیوی یا ایک لونڈی سے نکاح کی حکمت بتائی گئی ہے۔ کثرت اولاد اور کثرت نفقہ کا اندیشہ بیوی کے بارے میں بھی اتنا ہی ہے جتنا لونڈی کے بارے میں۔ یہی توجیہ درست معلوم ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ سورۃ النساء کی آیت نمبر ۲۴ 'الا ما ملکت ایمانکم' سوائے ان کے جو تمھارے قبضہ میں ہیں، کے معنی منکوحہ عورتیں بھی لیے گئے ہیں یعنی وہ جن کے مالک تم ایک معاہدہ کے ذریعہ سے ہوئے ہو۔ امام طبری نے ان معانی کو ابن سیرین اور عبیدہ کے واسطہ سے عمر بن الخطاب کی طرف منسوب کیا ہے۔ اس کے علاوہ ابن عباس اور سعید بن جبیر کی روایت کو نقل کیا ہے اور کہا ہے: 'فزوجك مما ملکت یمینك' تیری بیوی وہ ہے جس کا تو حق مہر اور گواہوں سے مالک بنتا ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ملک یمین کی اصطلاح آزاد اور لونڈی کے لیے مشترک ہے۔

غلامی کا مسئلہ اور قرآن

قرآن حکیم انسان کو اللہ کی عبدیت کے سوا ہر طرح کی عبودیت سے نجات دلانے کے لیے نازل ہوا، اس کے نزدیک اللہ کی عبودیت انسان کے لیے سب سے اونچا مقام ہے۔ انسان دنیا میں کسی اور کا محکوم،

Marfat.com

مطیع اور غلام نہیں ہو سکتا۔

کس دریں جا سائل و محروم نیست
عبد و مولا حاکم و محکوم نیست

غلامی قرآن کے اس بنیادی فلسفہ سے متصادم ہے اسی لیے حضرت عمر بن الخطاب نے عمرو بن العاص سے کہا تھا کہ مائیں اپنے بچوں کو آزاد جنتی ہیں تم نے کب سے انھیں غلام بنالیا؟ نزول قرآن کے وقت جاہلی معاشرہ میں لونڈیاں اور غلام موجود تھے جو قبائل کی باہمی غارت گری کی پیداوار تھے۔ فاتح قبیلہ مفتوح قبیلے کی عورتوں کو قید کر کے لونڈیاں بنالیتا۔ ان لونڈیوں کا مالک ان کو بغیر نکاح کے تسرّی (رکھیل) کے طور پر استعمال کرتا۔ اگر ان غلاموں اور لونڈیوں کو فوراً آزاد کر دیا جاتا تو اخلاقی بے راہ روی اور جنسی انتشار کا راستہ کھل جاتا اس لیے قرآن نے ان کے بارے میں ایسے احکام صادر کیے جن سے رفتہ رفتہ یا تو وہ آزاد انسانوں کی طرح زندگی بسر کرنے لگے یا آزاد خاندانوں کا جزو بن گئے۔

سب سے پہلے قرآن نے احترام انسانیت کے پیش نظر ان کو غلام اور لونڈیاں پکارنے کی بجائے دو انتہائی شائستہ تعبیریں استعمال کیں۔ یعنی ماملکت ایمانھم (جو ان کے قبضے میں تھے) اس کے لیے ماضی کا صیغہ استعمال کیا یعنی جو اس سے پہلے تمھارے قبضہ میں آچکی ہیں۔ دوسری خوبصورت تعبیر فتاۃ (جوان لڑکی) ہے۔ ان تعبیروں سے قرآن نے مالکوں کو تنبیہ کی ہے کہ یہ لونڈیاں بھی انسان اور جوان لڑکیاں ہیں اور ان کے بھی حقوق ہیں۔

آیئے ان احکام کی طرف جن سے قرآن نے غلامی کے مسئلے کو حل کر کے آئندہ کے لیے اس کا دروازہ بند کر دیا۔ سب سے پہلے جنگی قیدیوں کے بارے میں فرمایا فَإِمَّا مَنًّا بَعْدُ وَإِمَّا فِدَاءً (محمد ۴:۴۷) پھر اس کے بعد یا تو بلا معاوضہ چھوڑ دینا یا معاوضہ لے کر چھوڑ دینا۔ ان قیدیوں کو ہر حالت میں چھوڑنا ہوگا، یا بطور احسان یا بطور معاوضہ یعنی قیدیوں کے بدلے میں قیدی یا مقرر کردہ فدیہ کی رقم لے کر۔ جنگ کے قیدیوں کے بارے میں قرآن کی صرف یہی آیت ہے۔ اس سے قرآن نے آئندہ کے لیے غلام اور لونڈیاں بنانے کا دروازہ بند کر دیا۔

غلامی کی زنجیروں سے آزاد کرانے کے لیے قرآن نے تحریر رقبہ کی تعبیر استعمال کی ہے۔ یعنی اس گردن کو چھڑوانا جو غلامی کے طوق میں جکڑی ہوئی ہو۔ بہت سے گناہوں کا کفارہ غلام آزاد کرنا ہے۔ مثلاً غلطی سے قتل کا کفارہ، تحریر رقبۃ (نساء ۹۲:۴) لغو قسموں کے توڑنے کا کفارہ تحریر رقبۃ (۸۹:۵) ظہار کا کفارہ تحریر رقبۃ (۳:۵۸) اسی طرح قرآن صدقات کے مصارف میں بھی فی

Marfat.com

الرقاب کو امداد کا حق دار قرار دیتا ہے۔ سورۃ البلد میں اللہ نے خود سوال کیا ہے۔ ما ادراك ما العقبة (۹۰:۱۲) پتہ بھی ہے کہ یہ دشوار گھاٹی کیا ہے؟ خود ہی جواب دیا ہے یہ گھاٹی فك رقبة (۹۰:۱۳) ہے یعنی گردن کو غلامی کے شکنجے سے نکالنا۔ اس آیت کی رو سے پہلا کام یہ ہے کہ کوئی انسان کسی دوسرے انسان کا غلام نہ ہو۔ محکومیت صرف اللہ کی ہو اور ہر ایک کو آزادی حاصل ہو۔ سورۃ نساء کی آیت نمبر ۲۵ میں لونڈیوں سے نکاح کا حکم دے کر ان کی عزت نفس کو بحال کیا ہے۔ ان کو اور ان کی نسل کو آزادی عطا کی ہے۔ اگر پہلے ان کا نکاح نہ بھی ہوا ہو اور ان کے یہاں بچہ پیدا ہو جائے تو اسلام کی نظر میں وہ ام ولد کہلاتی ہیں۔ مالک کے لیے انھیں فروخت کرنا ممنوع ہو جاتا ہے اس کی وفات کے بعد وہ آزاد ہو جاتی ہیں۔ بچہ تو پیدائش ہی سے آزاد ہوتا ہے۔

جہاں تک لونڈیوں کی خرید و فروخت اور محلات میں بطور حرم ان کے دخول، رامش و رنگ کی محفلوں میں ان کا رقص سرود اور ان سے جنسی لطف اندوزی کا تعلق ہے تو اس کا اسلام سے کوئی واسطہ نہیں۔ اور ان کے بارے میں فقہی احکامات کی بھی کوئی حیثیت نہیں۔ مثال کے طور پر ایک مسلک کی فقہ کے مطابق لونڈی کا ستر وہی ہے جو مرد کا ہے۔ وجہ یہ بیان کی گئی ہے کہ خرید و فروخت کے وقت ان کے سینوں کو دیکھنا پڑتا ہے۔ قرآن نے تو غلامی کا بتدریج خاتمہ کر دیا اور ہمارے فقہا نے اسے کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔

تعدد ازدواج کے نقصانات

تعدد کے نقصانات کا ذکر میں نے ایک بیوی کے اصول کے تحت کر دیا ہے۔ عدل کی شرط کو اگر سورۃ نساء کی آیت نمبر ۱۲۹ یعنی لن تستطیعوا ان تعدلوا کے ساتھ ملا کر دیکھا جائے تو دونوں آیات کے مجموعہ سے کسی نہ کسی طرح تعدد ازدواج کے خلاف نتیجہ نکلتا ہے۔ یا کم از کم اس سے تعدد کا دائرہ بہت تنگ ہو جاتا ہے۔ پہلے تو اسے اس شخص کے لئے مباح کیا گیا ہے جو یتیموں کی خبر گیری پر مامور ہو اور اسے اندیشہ ہو کہ وہ ان سے انصاف نہ کر پائے گا۔ اس پر پابندی ہے کہ وہ چار بیویوں میں عدل کرے اور ظلم سے گریز کرے۔ ابھی تک ایسا آدمی دیکھنے میں نہیں آیا جو ضرورت اور صحیح سبب کے بغیر دوسری شادی کرے اور ظلم سے محفوظ رہے۔ محض ذائقہ بدلنے کے لئے شادی کرنے والا تو ظلم کا عادی ہو جاتا ہے۔ اس سے انصاف کی کیسے توقع کی جا سکتی ہے؟

تعدد ازدواج کے سلسلہ میں مفتی محمد عبدہ کی تحریر بڑی فکر انگیز ہے وہ فرماتے ہیں: "صدر اسلام میں تعدد کے کئی فوائد تھے۔ سب سے اہم فائدہ یہ تھا کہ نسب اور سسرالی تعلق سے عصبیت مضبوط ہوتی تھی اور اس کے وہ نقصانات نہ تھے جو آج ہیں۔ اس وقت سوت کا ضرر آگے منتقل نہیں ہوتا تھا۔ کیونکہ اسلام اس

Marfat.com

کے دل ودماغ میں راسخ ہو چکا تھا مگر آج یہ ضرر سوت سے بچوں اور والد اور تمام عزیز وا قارب کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ سوت بچوں میں بغض وعناد کا بیج بوتی ہے اور خاوند کو آمادہ کرتی ہے کہ وہ پہلی بیوی اور اسکے بچوں کی حق تلفی کرے۔ وہ ازرہِ حماقت اپنی پیاری بیوی کا حکم مانتا ہے۔ اس طرح فساد سارے خاندان تک سرایت کر جاتا ہے۔ بچہ اپنے والد کو قتل کرتا ہے اور والد اپنے بچے کو۔ میاں بیوی کو قتل کرتا ہے اور بیوی میاں کو۔ کوٹ کچہری میں ان جرائم کا ہر روز مشاہدہ کیا جاسکتا ہے۔ دین تو لوگوں کی بھلائی اور مصلحت کے لیے آیا ہے۔ **لا ضرر و لا ضرار** (جیو اور جینے دو) اس کا اصول ہے۔ جب کوئی چیز کسی زمانے میں باعث فساد بن جائے جو پہلے زمانے میں نہ تھی تو حکم میں تغیر واجب ہو جاتا ہے اور اس حکم کی حالات حاضرہ سے مطابقت اس قاعدے کے مطابق ضروری ہے کیونکہ دفع مضرت جلب مصلحت پر مقدم ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ جہاں جور وستم کا اندیشہ ہو وہاں تعدد ازدواج قطعاً حرام ہے۔ جہاں عدل نہ ہوگا وہاں نہ محبت ہوگی نہ سلامتی۔ اسی لئے مصر میں دو شادیاں کرنے کے لیے دو شرطیں عائد ہیں۔ عدل اور نان ونفقہ کی قدرت۔ سوریا میں صرف ایک شرط عائد ہے نان ونفقہ پر قدرت۔ تونس میں تعدد بالکل ممنوع ہے۔

تعدد ازدواج ابتدائی معاشروں میں رائج تھا مگر اس کے لئے تین شرائط تھیں۔

۱۔ پہلی بیوی کا خاص مقام اور مرتبہ۔ ۲۔ ہر بیوی کے مساویانہ حقوق۔

۳۔ ہر بیوی کے لئے علیحدہ رہائش۔

اب عالم اسلام میں سوائے سعودی عرب کے تعدد ازدواج کا مسئلہ باقی نہیں رہا۔ ہر سوسائٹی میں ایک شادی کا رواج ہے۔ اس کے اجتماعی ثقافتی اور اقتصادی اسباب ہیں۔ اجتماعی اور ثقافتی بیداری نے اس رجحان کو تقریباً ختم کر دیا ہے۔ میاں کے پاس لذت پرستی کے لئے وقت نہیں رہا۔ اسے ایک بیوی اور اس کے اولاد کی ذمہ داریوں سے فراغت نہیں ملتی۔ وہ ان ذمہ داریوں کے ساتھ اور ذمہ داریوں کا اضافہ نہیں چاہتا۔ اس کے علاوہ معیار زندگی بلند ہو گیا ہے۔ معیشت تعلیم اور صحت کے اخراجات میں اضافہ ہو گیا ہے۔ رزق حرام کمانے والا ہی ان چونچلوں کو نبھا سکتا ہے۔ اب اس مسئلہ کی کوئی اہمیت نہیں رہی۔ آخر میں شیخ عبداللہ العلی الغزی الدمشقی کے اشعار اس موضوع کے بارے میں بے محل نہ ہوں گے۔

تزوجت اثنتین لفرط جهلی

میں نے فرط جہالت سے دو عورتوں سے شادی کر لی

وقد حاز البلی زوج اثنتین

Marfat.com

دو بیویوں کا خاوند مصیبت میں پھنس گیا

فقلت اعیش فیھما خروفا

میں نے سوچا ان دونوں کے درمیان ایسے رہوں گا

انعم بین اکرم نعجتین

جیسے دو اچھی نسل کی بھیڑوں کے درمیان ناز سے پلا ہوا لیلا رہتا ہے

فجاء الامر عکس الحال دوما

لیکن معاملہ برعکس ہوا

عذابا دائما ببلیتین

دو مصیبتوں کی وجہ سے مسلسل عذاب میں رہا

رضا ھٰذی یحرك سخط ھٰذی

ایک کی رضا دوسری کی ناراضگی

فما اخلو من احدی السخطتین

دو ناراضگیوں میں سے ایک ناراضگی سے علیحدہ نہیں رہ سکتا

محبت شراکت قبول نہیں کرتی۔ شراکت کے بعد پہلی بیوی کو کیسے قرار آئے گا؟ نئی بیوی کا درجہ پہلی کی دل آزاری کا باعث ہوگا۔ خاندان میں استقرار کیسے آئے گا؟ اسی بے چینی کی وجہ سے بچے گھر سے بھاگ جاتے ہیں۔ نظام تعدد صرف ضرورت کے تحت انہی شرائط کے ساتھ جائز ہے جن کا قرآن نے ذکر کیا ہے۔

یتیموں اور کمزوروں کے حقوق کے بارے میں ایک اور آیت ہے جس کا ربط مذکورہ آیت سے ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَيَسْتَفْتُونَكَ فِي النِّسَاءِ قُلِ اللَّهُ يُفْتِيكُمْ فِيهِنَّ وَمَا يُتْلَى عَلَيْكُمْ فِي الْكِتَابِ فِي يَتَامَى النِّسَاءِ اللَّاتِي لَا تُؤْتُونَهُنَّ مَا كُتِبَ لَهُنَّ وَتَرْغَبُونَ أَنْ تَنْكِحُوهُنَّ وَالْمُسْتَضْعَفِينَ مِنَ الْوِلْدَانِ وَأَنْ تَقُومُوا لِلْيَتَامَى بِالْقِسْطِ وَمَا تَفْعَلُوا مِنْ خَيْرٍ فَإِنَّ اللَّهَ كَانَ بِهِ عَلِيمًا (نساء ۴: ۱۲۷) اور تجھ سے عورتوں کے بارے میں فتویٰ پوچھتے ہیں اللہ تمہیں ان کے بارے میں فتویٰ دیتا ہے اور جو تم پر کتاب میں پڑھا جاتا ہے ان (یتیم عورتوں) کے بارے میں ہے جن کو تم جو

Marfat.com

کچھ ان کے لئے اور ناتواں بچوں کے لئے مقرر کیا گیا ہے۔ نہیں دیتے ہو اور نہ ان سے نکاح کرنا چاہتے ہو اور یہ کہ یتیموں کے معاملے میں انصاف پر قائم رہو اور جو بھلائی تم کرو اللہ اسے جاننے والا ہے۔'

پس منظر

یہ آیت اور آغاز سورت کی آیت وَآتُوا الْيَتَامَى أَمْوَالَهُمْ اور وَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا تُقْسِطُوا فِي الْيَتَامَى اور وَآتُوهن صَدُقَاتِهِنَّ نِحْلَةً سب ایک سلسلہ کی کڑیاں ہیں۔ پہلی آیت کے واضح بیان کے بعد ان احکام کی مزید وضاحت کی ضرورت تھی کیونکہ لوگ یتیم عورت اور بچوں کی حق تلفی کرتے تھے۔ اس آیت میں مہر اور وراثت کے سلسلہ میں عورت کے مسلمہ حقوق کا بیان ہے اور ان پر ظلم کو حرام گردانا گیا ہے۔ قرآن میں مردوں کو اپنی قوت کے بل بوتے پر عورتوں پر ظلم کرنے سے منع کیا گیا ہے اور ان کو ظلم کے برے انجام سے ڈرایا گیا ہے۔

شان نزول

اس بارے میں دو روایتیں ہیں ایک حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت ہے جو بخاری میں بیان ہوئی ہے کہ یہ اس یتیم لڑکی کے بارے میں ہے جس کا سرپرست اس کے مال کو اپنے مال کے ساتھ شریک کر لیتا۔ نہ خود اس سے نکاح کرنا چاہتا اور نہ دوسرے سے اس کا نکاح کرنا پسند کرتا۔ اس خوف سے کہ اس طرح سے وہ مال اس کے ہاتھ سے نکل جائے گا۔ چنانچہ اسے روکے رکھتا یہاں تک کہ وہ مر جاتی ہے اور وہ مال کا وارث بن جاتا۔ دوسری روایت ابن عباس کی ہے کہ یہ آیت ام کحۃ کی بچیوں کے بارے میں ہے جن کو اپنے باپ سے ورثہ ملا تھا۔

یستفتونك

اس طرح لوگوں کو ڈانٹ پلائی گئی ہے کہ وہ عورتوں کے بارے میں نبی کریم ﷺ سے فتویٰ پوچھتے ہیں حالانکہ اس بارے میں پہلے اللہ کا حکم صادر ہو چکا ہے جس پر انہوں نے پوری طرح عمل بھی نہیں کیا اور انہوں نے یتیم عورتوں سے انصاف نہیں کیا۔ مناسب تو یہ تھا کہ پہلے وہ عمل کرتے اور پھر مزید سوال کرتے۔

(وما يتلى عليكم في الكتاب في يتامى النساء) یہ ان احکام کی طرف اشارہ ہے جو سورۃ

Marfat.com

کے آغاز میں یتیم بچوں اور یتیم (بے شوہر) عورتوں کے بارے میں دیئے جا چکے ہیں۔ یتامیٰ النساء سے مراد بے شوہر عورتیں ہیں۔ اس سے مراد جیسا کہ مولانا اصلاحی نے صراحتاً کہا ہے یتیموں کی مائیں ہیں۔ لوگ یتیموں کے مصلحت کی خاطر ان سے نکاح تو کرنا چاہتے تھے لیکن مہر کی شرط ان پر شاق گزرتی تھی۔ یہ ایک پیش آمدہ مسئلہ کا حل تھا جب بہت سی یتیم بچوں والی بے شوہر عورتیں رہ گئیں تو اللہ نے حکم دیا کہ ایسی عورتوں سے دو دو تین تین اور چار چار تک نکاح کر لو۔ اس آیت کے بعد واضح الفاظ میں عدل کا ذکر کیا گیا ہے۔ اور بتایا گیا ہے کہ عدل سے مراد وہ عدل ہے جو تمہارے بس میں ہو۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ زیر نظر آیت میں بھی تعدد ازدواج کی طرف اشارہ ہے۔

لاتؤتوھن ما کتب لھن

تم انہیں وہ نہیں دیتے جو ان کے لئے مقرر کیا گیا ہے۔ ابن عباس، ابن جبیر اور مجاہد کے قول کے مطابق اس سے مراد ورثہ ہے۔ اور یہ آیت عورتوں اور بچوں کو وارث بنانے کے بارے میں ہے کیونکہ نہ وہ مال کی خاطر کوشش کر سکتے تھے اور نہ اس کا انتظام کر سکتے تھے۔ نہ وہ حملہ کرنے کے قابل تھے اور نہ مال غنیمت حاصل کرنے کے۔ چنانچہ اسی آیت میں والمستضعفین من الولدان یعنی کمزور بچوں کا ذکر ہے۔ وہ عورتوں اور بچوں کو ورثے سے محروم رکھتے تھے اللہ نے ان کو حکم دیا ہے کہ ہر حقدار کو اس کا حق ورثے سے دو خواہ وہ مرد ہو یا عورت ہو، چھوٹا ہو یا بڑا ہو۔

حسن قتادہ، سدی اور ابراہیم کا قول ہے کہ ما کتب لھن سے مراد نکاح کا حق مہر ہے یہاں ان لوگوں سے خطاب کیا گیا ہے جن کے ہاں یتیم عورتوں کی پہلے کی طرح بری حالت تھی۔ وہ یہ کہ یا تو مہر کی ادائیگی کے بغیر نکاح یا ان کو نکاح سے روکے رکھنا تاکہ ان کا مال ہاتھ سے نکل نہ جائے۔ اس کے بعد ترغبون ان تنکحوھن (وہ ان سے نکاح کی رغبت نہیں رکھتے) سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بدصورتی کی وجہ سے نکاح نہیں کرنا چاہتے تھے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ زمانہ جاہلیت میں کسی کی سرپرستی میں یتیم لڑکی ہوتی تو وہ اس پر کپڑا ڈال دیتا پھر کوئی اس سے شادی نہ کر سکتا تھا۔ اگر وہ خوبصورت ہوتی تو اس سے خود شادی کر کے اس کا حق مہر اور مال ہڑپ کر جاتا لیکن اگر وہ بدصورت ہوتی تو موت تک اسے روکے رکھتا۔ نہ خود شادی کرتا نہ کسی کو کرنے دیتا۔ اس ڈر سے کہ کہیں اس کا مال ہاتھ سے نہ نکل

Marfat.com

جائے۔ امام طبری نے اس روایت کو حضرت عائشہ رضی اللہ اور تابعی حسن سے نقل کیا ہے اور امام طبری نے اسی قول کو بہتر قرار دیا ہے۔

أن تقوموا للیتامی بالقسط جس طرح الرجال قوامون علی النساء میں مردوں کو عورتوں کا ذمہ دار ٹھہرایا گیا ہے بالکل اسی طرح آیت کے اس ٹکڑے میں سرپرستوں کو یتیموں کے ساتھ انصاف کی ذمہ داری سونپی گئی ہے۔ تفصیل سے ذکر کرنے کے بعد یتیم لڑکے اور لڑکیوں کے ساتھ انصاف کی خاطر یہ دعوت عام ہے۔

اگر والمستضعفین من الوِالدان کا عطف فی یتامی النساء پر مانا جائے تو یہاں کمزور بچوں) سے مراد یتیم بچے ہوں گے جن کی خبر گیری کے لئے ان کی ماؤں بہنوں سے نکاح کا حکم دیا گیا ہے۔ ان یتیم بچوں کے بارے میں بھی نبی ﷺ سے فتویٰ پوچھنے کا یہی مطلب تھا کہ اللہ نے ان کے ساتھ حسن سلوک کا جو حکم دیا تھا اس پر ابھی تک عمل نہیں ہوا تھا۔

امام طبری نے ابراہیم سے ایک روایت نقل کی ہے جو سرپرست کی طمع کا علاج ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ جب حضرت عمرؓ بن الخطاب کا کوئی پڑوسی کسی یتیم لڑکی کا سرپرست بنتا اور اگر وہ خوبصورت اور مالدار ہوتی تو حضرت عمرؓ اسے کہتے کہ اسے اپنے سوا کسی اور سے بیاہ دو اور اس کے لئے اپنے سے بہتر مرد تلاش کرو اور اگر وہ بدصورت ہوتی اور اس کے پاس مال بھی نہ ہوتا تو اسے کہتے اس سے نکاح کر لو کیونکہ تم اس کے زیادہ حق دار ہو۔ یہ سوچ کس قدر تعمیری ہے۔

Marfat.com

ہمارے ادارے کی خوبصورت اور معیاری کتب

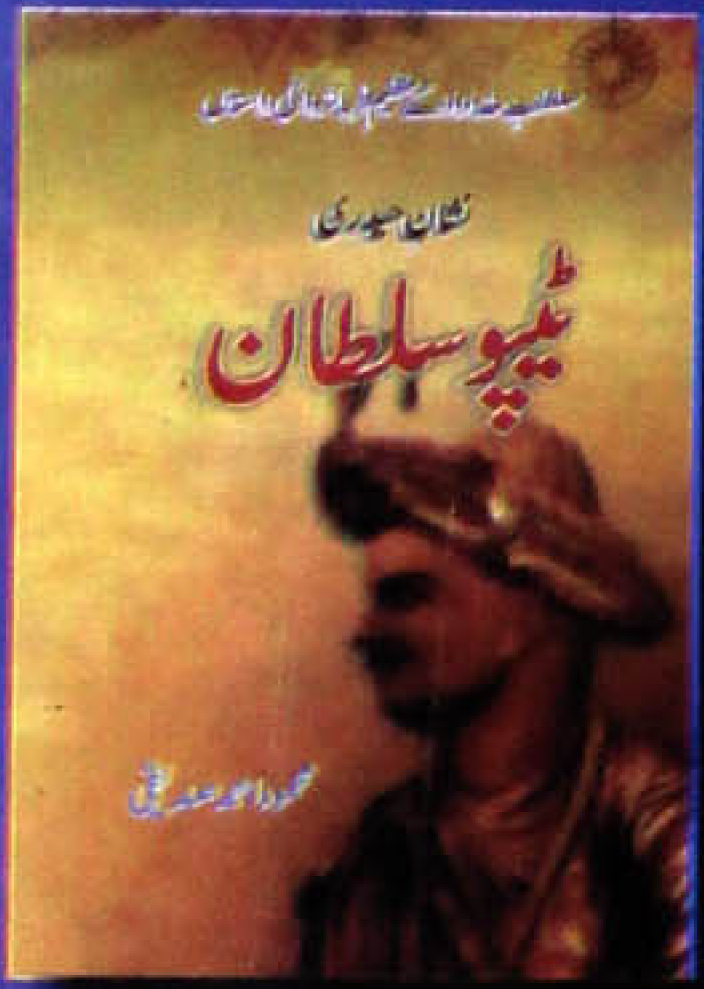

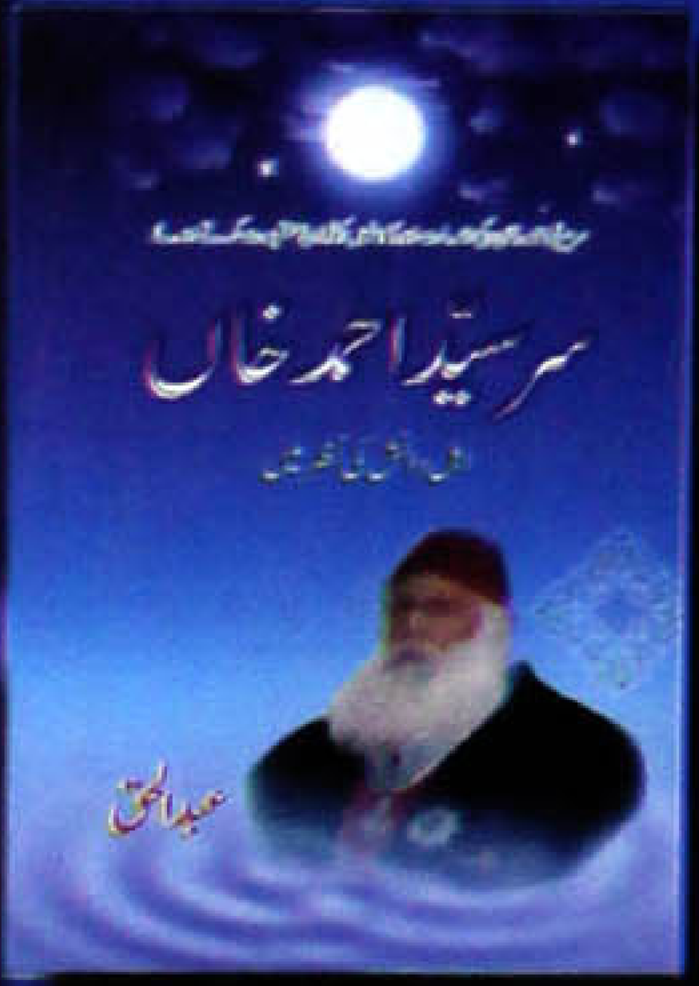

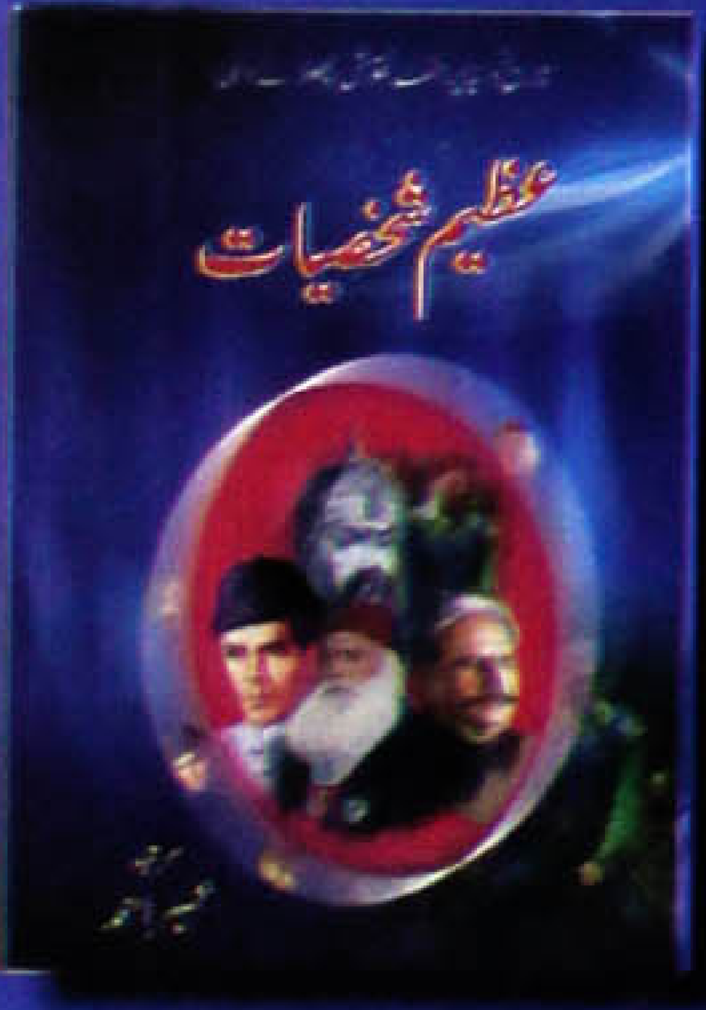

ISBN 978-969-582-022-8

چودھری غلام رسول اینڈ سنز

الکریم مارکیٹ، اُردو بازار، لاہور 042-37233909, 37243055

Email: mails@cgras.com Web: www.cgras.com